

ترجیح و وفا

نایاب جیلانی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✈ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✈ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



ناولٹ

## ترک و فنا

نایاب جیلانی

یہ ایک سرد سہ پہر کا منظر تھا۔ سرما کے آغاز سے بارشوں اور برف باری کا سلسلہ قریب قریب شروع ہو چکا تھا۔ جس کے باعث فضا خوشگوار مگر شہر بہت غلیظ ہو جاتا تھا۔ انتہائی بھگا اور غلیظ..... اسے کیلی کچھ زندہ سڑکوں سے نفرت تھی۔ اسے اسحق، بے وقوف اور جاہل لوگوں سے نفرت تھی۔ اسے آنسوؤں سے نفرت تھی کیلی آنکھیں، گیلے چہرے اور گیلی پلکیں..... اس کا دل چاہتا تھا وہ کیلی آنکھوں والے



## ترک وفا

فرش پر لڑھکا کا کاج کا گلاس اٹھاتے ہوئے چیخی۔  
”نہیں ہے، مون حسیب، بھاگ جاؤ یہاں  
سے ورنہ جان نکال لوں گی تمہاری۔“ وہ جنونی انداز  
میں فرش پر پڑی ایک، ایک چیز اٹھا کر ان پر حملہ کرتی  
دھاڑ رہی تھی اور وہ جیسے اس حملے پر تیار نہیں تھے۔  
ایک دم خوفزدہ ہو کر اٹھے قدموں بھاگنے لگے۔

”ارے..... بھاگ چلو، یہ تو پاگل ہے۔“ وہ  
چیختے ہوئے باہر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ جب گیلی  
آنکھوں والی لڑکی اذیت سے مسکرا دی۔

”میں پاگل نہیں..... میں تو منکشفے ہوں.....  
ڈونچ لینڈ پر قدم رکھنے والے شاہین کی منتظر.....“

☆☆☆

یہ ایک چمکتی ہوئی دھوپ سے گندھی دوپہر  
تھی..... سورج بہت دنوں بعد جو بن پر نظر آ رہا تھا۔  
آغاز گت کی یہ سویر یورپ میں بہت خوشگوار تھی۔

افراہیم کی Lexus ایک سو ساٹھ کلو میٹر فی  
گھنٹا کی رفتار سے من ہائیم کو جانے والی آٹو بان پر  
دوڑ رہی تھی۔ فریکوارٹ سے جنوب کے رخ جانے  
والی اس آٹو بان کا اختتام ایک گھنٹے کے اس پار  
ہرے، پیلے، نیلے، اودے پھولوں اور سبزے کے  
مکٹ تک ہو جاتا تھا۔ دور کہیں سبزے کے ٹیلے اور

مڑشکوہ ڈھلان پوری آن بان سے دکھائی دے رہے  
تھے۔ ڈھلانی سطحوں والے ہرے اور بھورے کھیت  
جن میں کسانوں کی جگہ کہیں کہیں ٹریکٹر اور مشینیں

کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ سرخ اور سفید اٹھائے جیسی  
ٹائل کی ڈھلوان چھتوں والی آبادیاں، دور آسمان کی

بلندیوں میں اڑنے والی مرغابیاں اور طویل  
پھاڑوں کے بلند سلسلوں پر چھائے پیلے کے جھنڈ

جو پلک جھپکنے سے پہلے ہی نگاہوں کی اوٹ سے  
اوجھل ہوتے پھر کچھ اور نئے مناظر کے ساتھ نمودار

ہوتے..... گویا فطرت کا حسن آنکھ بچولی کا کھیل  
مچا رہا تھا۔ بائیں سرے پر ایک سڑک کسی ناگن کی

”آپ کا تعلق بیدی نوگ سے ہے؟“ وہ اپنی  
ذہن آنکھوں کو اس کے چہرے پر جما کر سوال کر رہا  
تھا۔ بیدی نوگ کا نام سن کر اس کا چہرہ لٹھے کے مانند  
سفید پڑ گیا۔ وہ اپنی آئندہ زندگی میں بھی دوبارہ  
بیدی نوگ کا نام نہیں سننا چاہتی تھی۔

”نہیں.....“ اس نے روکھے اور انتہائی  
کھردرے لہجے میں جواب دیا تھا۔ اس کی گیلی  
آنکھوں میں غصہ بھر گیا تھا۔

”اوہ.....!“ ان تینوں کو جیسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔  
”ہم لوگ شوٹ لائنٹ اسکات لینڈ سے آئے

ہیں۔ پولی سیٹ بیامتے (پولیس افسر) ہیں۔ ان میں  
سے ایک اسٹیل فورسز کا بندہ ہے۔ ہماری جس اونچی  
سیل ایجنسی سے پیغام جاری ہوا ہے۔ اس میں

سرفہرست مون حسیب کا نام آیا ہے، وہ بیدی  
نوگ (ادارہ) چلاتی تھیں۔ ہم ان کو ایک کیس کے

لیے ہائر کرنا چاہتے ہیں..... ایجنسی ان کو شوٹ لائنٹ  
کا ریٹرن ٹکٹ دے گی اور دیگر مراعات کا شمار کوئی

نہیں..... انہیں ہمارے ساتھ معاہدے کے تحت کام  
کرنا ہوگا.....“ ان میں سے ایک آفسر اپنے آنے کا

مدعا بیان کر رہا تھا..... تب اس نے انتہائی درخشندگی کے  
ساتھ اپنی گیلی آنکھیں پونچھتے ہوئے بات کاٹ کر

کہا۔ وہ جانتی تھی یہ لوگ اسی مون حسیب کا پوچھ رہے  
تھے جو خدا داد غیر مادی توت متحرک کی مالک تھی۔

”مون حسیب نہیں ہے۔“ اس کے تیور  
غضبناک ہو گئے تھے۔ تب آفسر جیسے اور بھی حلیمی  
کے ساتھ کہنے لگے۔

”محترمہ.....! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔  
برائے مہربانی مون حسیب کو بلا دیں..... آپ کو شاید  
مون حسیب کا پتا نہیں۔ وہ جو mental

telegraphy اور clairvoyance کی  
ماہر ہیں۔ وہ جو انسانی پوشیدہ.....“ آفسر نے لجاجت  
سے التجا کی تھی جب گیلی آنکھوں والی لڑکی بھڑک کر

رگڑ کر دیکھا۔ دو تین اجنبی چہرے نظر آئے تھے۔ وہ  
گیلی آنکھوں کو رگڑتی رہی۔ یہ آنسو، یہ پانی، کسی سزا  
کی طرح اس کی آنکھوں سے پھوٹ پڑا تھا۔  
آنسوؤں کا ایسا چشمہ جو سات آنٹھ منٹ بعد خود بخود  
اٹا آتا۔

وہ جیسے اجنبی چہروں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔  
اس کا حافظہ ہرگز بھی کمزور نہیں تھا نہ اس کی یادداشت ہلکی  
تھی۔ اس نے ان چہروں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر

ایک دفعہ دیکھ لیتی تو پھر کبھی نہ بھولتی۔ وہ مہذب، باوقار  
اور تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ خوش پوشاک اور ذہین  
آنکھوں والے..... اسمارٹ، خوش شکل۔ لمحے کے

آخری حصے سے گزر کر جیسے وہ ان کی آمد کا مقصد جان  
چکی تھی۔ شاید اسی لیے اس کی پیشانی پر سلوٹیوں کا جال

ابھر آیا تھا۔ ان تین لوگوں کی آنکھوں میں تجسس تھا،  
کچھ کھوجنے، جاننے اور پرکھنے کی آرزو تھی۔ جیسے وہ

کسی کی تلاش میں آئے تھے۔ وہ کس کی تلاش میں  
آئے تھے؟ یہ جاننا ضروری نہیں تھا کیونکہ گیلی آنکھوں

والی لڑکی ان لوگوں کی آمد کا مقصد جانتی تھی۔ وہ ان کی  
تلاش کا مقصد بھی جانتی تھی۔

”گرس گوڈ.....“ ان تینوں میں سے ایک نے  
سلام جھاڑا تھا۔ انداز میں شائستگی نمایاں تھی اور  
آنکھوں میں ڈھیروں تجسس تھا۔

”تاگ..... (ہیلو)“ اب کے دوسرے نے  
بھی ہونٹ ہلائے تھے۔ وہ لوگ بڑی مشتاق نظروں

سے مورگن روک میں لپٹی گیلی آنکھوں والی لڑکی کو  
دیکھ رہے تھے۔ جس کا چہرہ بیروں کو چھوتا تھا۔ روک

کی فرل جگہ جگہ سے اُدھڑی تھی۔ بالوں کا گھونسلہ  
گردن کے پیچھے لٹک رہا تھا اور گھر کی حالت ایسی تھی

جیسے کسی کہاڑ خانے میں غلطی سے آنے کا اتفاق ہوا  
تھا۔ وہ تینوں معنی خیزی سے الٹ پلٹ ہوتی ایک،  
ایک چیز کو دیکھ رہے تھے پھر ان میں سے ایک نے

گفتگو کی ابتدا کی تھی۔

چہروں کو جھپٹا مار کر نوج لے۔ گیلی غلیظ شہر اور گیلی  
غلیظ آنکھیں..... اس کا دماغ گرما دیتی تھیں۔

مگر اب ایسا نہیں تھا، گیلی چہرے اب اسے  
مقناطیس کی طرح پھینچتے تھے۔ گیلی آنکھوں میں اسے

اب کہانیاں تیرتی نظر آتی تھیں۔ گیلی شہروں میں  
اب اسے امان نظر آتی تھی..... سکون نظر آتا تھا۔

اس نے سفید جالی دار نائیلون کا مہین سا پردہ ہٹا  
کر دیکھا۔ خلاف توقع آج شہر گیلیا نہیں تھا۔ دھوپ

چمک رہی تھی۔ کیا آج کچھ عجیب ہونے والا تھا؟  
بادل اوٹ میں کھسک گئے تھے۔ مرغابیاں نیلے کی  
طرف بھاگ گئیں۔ سنہری پریاں تالاب سے اڑ

بگیں..... تو کیا آج کچھ عجیب ہونے والا تھا۔  
☆☆☆

وہ اپنے شبستاں سے نکل کر لاؤنج کی گلاس  
وال کے قریب آرکی تھی پھر جیسے اس کے ذہن اور

دل میں گھنٹی سی بجی تھی۔ دماغ کو برقی رو کے ذریعے  
ایک پیغام ملا تھا۔ کوئی کوندا سا لپکا۔ اس کے خون کی

گردش تیز ہو گئی تھی۔ چہرے پر گرما ہٹ بھر گئی تھی۔  
اس کی نس نس میں انگڑائیاں لیتا انتظار مچل، مچل کر

رائل روڈ پر پھسل رہا تھا۔ کوئی اس کے کان میں چپکے،  
چپکے جیسے سرگوشیاں کر رہا تھا۔

”کیا وہ ڈونچ لینڈ..... پہنچ گیا؟“ اس کی گیلی  
آنکھوں میں خواب اتر آئے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے

عذاب اتر آئے تھے۔ شاہین لمبی اڑان بھر کر آ رہا  
تھا۔ شاہین اس کے خوابوں اور عذابوں کا حساب کرنے  
آ رہا تھا۔ شاہین جیسے اپنا شکار ڈھونڈنے آ رہا تھا۔ شہنشاہ

شاہین..... ادھیراج، خاقان، سلطان..... شکاریوں کا  
بادشاہ اپنے شکار کی تلاش میں بالآخر پہنچ گیا تھا۔  
☆☆☆

کئی ساعتیں چپکے سے کھسک گئی تھیں۔ لمحے  
دبے قدموں نکل رہے تھے۔ معاً بھاری بوٹیوں کی  
آہٹ نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے گیلی آنکھوں کو



طرح بل کھاتی ہوئی آٹو بان کی بلندی سے اتری اور اس راستے پر آڑی جو من ہائیم شہر کی طرف جاتا تھا۔ درختوں، شاخوں اور بلند اونچی عمارتوں کی چوٹیوں پر وہاں کے معتدل مزاج سورج کی شعاعیں اب ہلکی سنہری پڑ رہی تھیں۔ شہر میں داخلی شاہراہ کے آس پاس، دائیں، بائیں بھورے اور گلابی پتھر کی اونچی دیوہیکل عمارتیں کس شان سے کھڑی تھیں۔ عمارتوں کی زیادہ تعداد بینک، انشورنس کمپنیوں، تجارتی فرموں، پوسٹ آفسز، سپر اسٹورز وغیرہ کی تھیں۔ دور دوریہ سڑکوں کے درمیان سبزہ، پھول اور قد آور سرو کے درخت ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔

اس ایونیو کے اختتام پر افرایم کی lexus نصف دائرے کے محیط پر آنگلی۔ جس کا مرکز زرد پتھر کی نقاشی کا اعلیٰ ترین، خوب صورت اور بلندو بھاری بھر کم مینار آب تھا۔

پھر اس سے کچھ اور آگے نصف دائرے کے نشیب میں ایک ایسا طلسماتی منظر دکھائی دے رہا تھا گویا اسے پھولوں کے ساتھ گوندھ دیا گیا ہو۔ ایک وسیع و عریض پھلوری جس کے چہار اطراف سرخ، سنہری، نیلے، پیلے پھولوں کے تختے دکھتے تھے اور ان کے درمیان ان گنت فواروں کی آبشاریں چمک رہی تھیں۔ پھولوں کے جانے کتنے دکتے رنگ تھے..... اور پانی کی لہروں میں جانے کیسی قوس قزح بہتی تھی۔ ایک ایک منظر نگاہ کو مبہوت کر دینے کے لیے کافی تھا مگر وہ یہاں اپنی آنکھوں کو فطری حسن سے مبہوت کر دینے کے لیے تو ہرگز نہیں آیا تھا، نہ مغربی جرمنی کے حسن سے متاثر ہونے آیا تھا۔ وہ تو یہاں ایک نصب العین لے کر آیا تھا۔ ایک عظیم ترین مقصد لے کر آیا تھا۔ اسے کسی کا گریبان پکڑنا تھا۔ کچھ پرانے حساب کتاب تھے کچھ پچھلے دفتر تھے، جنہیں کھولنے آیا تھا۔ ماضی کی گرد و ہول جھاڑ کر بھولی بسری ایک کہانی میں پھر سے رنگ بھرنے آیا تھا۔ حالانکہ وہ

کہانی کوئی بہت پرانی تو نہیں تھی۔ صرف تین سال پہلے کا تو قصہ تھا۔ انھی تین سال ہی تو گزرے تھے مگر یہ تین سال بھلا بھلائے جاسکتے تھے؟ تین سال پہلے اس کے دل اور گھر پر قیامت کا وقت آیا تھا۔ تین سال پہلے شاید اپنی پوری زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے دکھ، غم اور اذیت کے زہر سے آشنائی حاصل کی تھی۔ اسے پہلی مرتبہ پتا چلا تھا کہ دکھ دراصل ہوتا کیا ہے؟ غم کے گھاؤ کہتے کسے ہیں؟ مرد بھلا روتے کیسے ہیں؟ اور مرد کیا روتے بھی ہیں؟ وہ تو ان تین سالوں میں کئی مرتبہ رویا تھا کبھی گھٹ گھٹ کر، کبھی سب سے چھپ کر اور کبھی سر محفل..... وہ جب جب مالا کو دیکھتا تھا اس کے وجود میں دوڑتا خون جوش کھانے لگتا..... اس کی خاموشی خون کے آنسوؤں کی تھی۔ اس کی پتھرائی بے رنگ آنکھوں کا حُزن اس کے سب گھر والوں کی نیندیں اڑا چکا تھا۔ مالا کے غم نے ان سب کو بے حال اور نڈھال کر رکھا تھا۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ مالا کے غم، خاموشی اور تنہائی کا زہر چکے، چکے جانے کیسے اس کی رگوں میں خود بخود اترنے لگا تھا۔ پچھلے تین سال وہ لمحہ بہ لمحہ ایک عہد کو اپنے وجود کے اندر مضبوط کرتا رہا تھا اور یہ وہی عہد تھا جس کی مقناطیسی قوت اور طاقت اسے کھینچ کر من ہائیم لے آئی تھی۔ اس میں کوئی بہت سوجھ بوجھ یا دانائی نہیں تھی مگر یہاں وہ ایک جامع منصوبہ لے کر آیا تھا۔ ایک طویل پلاننگ کے تحت آیا تھا۔ وہ مالا کے مجرم کا گریبان پکڑنے آیا تھا۔ وہ ظلم کرنے والے اس ظالم کے اس حسین شہر کی سر زمین پر انتقام کے گرم اور زہریلے جذبات لے کر آیا تھا۔

وہ جانتا تھا مالا کے مجرم تک پہنچنے کے لیے اسے اپنی بھرپور طاقت، زور، اختیارات کا استعمال کرنا ہوگا۔ اور وہ اپنا سارا زور، طاقت، قوت اور اختیارات کا استعمال کر کے مالا کے مجرم کو اس کے

انجام تک پہنچانے کا بھرپور ارادہ رکھتا تھا۔ وہ یہاں سے ناکام لوٹ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ ناکام ہونے اور شکست خوردہ ہو کر لوٹنے کے لیے آیا بھی نہیں تھا۔ آرام دہ اس بہترین سپر لکڑری lexus میں بیٹھ کر بھی اس کی سوچیں اپنے پیارے گھر کی طرف بہ رہی تھیں مگر اس کی زہریلی سوچوں کو بیک تب لگے تھے جب افرایم کی شگفتہ سی آواز سنائی دی تھی۔

”ذی شاہ.....! تم کیوں اتنے اب سیٹ دکھائی دے رہے ہو؟ اتنا حسن بھی کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر پائے تو اس حسن کا بھلا کیا فائدہ.....؟“

افرایم نے اس کا کندھا بھی ہلا دیا تھا۔ تب وہ کچھ چونک کر ذرا خفیف سا ہو گیا۔ گزشتہ سوچوں اور کچھ تکلیف دہ مناظر سے دامن چھڑا کر وہ افرایم کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”ایسی بات نہیں۔“ ذی شاہ نے اس کے خیال کی فوراً تردید کی تھی۔ وہ اس کی سوچ کو جھٹلا رہا تھا۔ در پردہ وضاحت کر رہا تھا کہ اس کا دھیان آس پاس کی خوب صورت طلسماتی دنیا کی طرف نہیں تھا۔ ”تو پھر کیسی بات ہے؟“ افرایم نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ یقیناً وہ اس کی طویل خاموشی سے اکتا گیا تھا۔ ظاہر ہے جہاز سے اترنے کے بعد سے لے کر اب تک وہ منہ میں گنگنیاں ڈالے بیٹھا ہوا جانے کیا کچھ سوچ رہا تھا۔ افرایم کے لیے اس کی خاموشی اچھنبھے کا باعث تھی۔

”میں سوچ رہا ہوں، تمہارا من ہائیم بہت خوب صورت ہے۔“ ذی شاہ کو بروقت اپنی خاموشی کا جواز سوجھ گیا تھا تب افرایم اس کے لہجے کی گہرائی میں اترے بغیر اس کی تعریف پر بھل اٹھا۔

”صد شکر کہ تمہیں میرا شہر پسند تو آیا..... ویسے تمہاری فرم کا صدر مقام بھی من ہائیم ہے، ایک چوکی جس فرم کی طرف سے تمہیں دعوتی خط ملا تھا اس کی دو اور برانچیں فرینکلرفٹ اور نیورن برگ میں بھی ہیں۔

تنگ وھا

من ہائیم سے زیادہ شہرت والے یہ دو شہر ہیں مگر چونکہ تم من ہائیم فرم کی طرف سے دعوتی خط کے ذریعے بلائے گئے ہو سو تمہیں یہیں رہنا ہے۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ تمہیں یہ مقام پسند آ گیا.....“ افرایم نے جذباتی سے انداز میں گفتگو آگے بڑھائی تھی۔ دراصل وہ اپنے شہر کے لیے ایسے ہی جذباتی تھا۔ پچھلی دونوں سالوں سے جرمنی میں افرایم کا خاندان مقیم تھا۔ وہ یہیں پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا تاہم اس کے آباؤ اجداد کا تعلق پاکستان سے تھا۔ وہ خود کو پاکستانی کہلوانا پسند کرتا تھا۔

افرایم سے اس کی دوستی خاصی پرانی تھی۔ وہ پاکستان گھومنے پھرنے اور ساحت کا شوق پورا کرنے آیا تھا۔ جب لارنس کالج آف گھوڑا نگلی کی رائل روڈ پر ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر یہ ملاقات طویل تردستی میں بدل گئی۔ وہ دونوں یک جان دو قالب ہو گئے۔ افرایم واپس آنے کے بعد بھی ہمیشہ اس سے رابطے میں رہا تھا۔ بہت سالوں سے ان دونوں کا ٹیلی فونک رابطہ قائم تھا۔

پھر جب ذی شاہ نے جرمنی بزنس کی غرض سے اپنی پلاننگ افرایم سے شیئر کی تو وہ بے ساختہ خوش ہو گیا تھا۔ اس کا پیارا دوست ایک ڈیڑھ سال کی مختصر مدت کے لیے جرمنی آ رہا تھا وہ بھلا کیونکر خوش نہ ہوتا۔ ذی شاہ کے آنے سے پہلے ہی افرایم نے اپنے گھر میں اس کے رہنے کا بڑا شاہانہ قسم کا بندوبست کر دیا تھا تاہم ذی شاہ نے اس کے گھر مستقل رہنے سے معذرت کر لی تھی۔ جس پر افرایم اس سے سخت خفا ہو گیا تھا اور یہ افرایم کی ناراضی کا خوف تھا جس کی بدولت اس نے کچھ دن قیام کرنے کے لیے حامی بھر لی تھی کم از کم تب تک کے لیے جب تک اس کی رہائش کا کوئی مناسب بندوبست نہ ہو جاتا۔

افرایم نے اسے کچھ یوں ڈرا دیا تھا کہ یہاں ہیرن فرم کے قرب و جوار میں جتنے بھی ہوٹلز تھے



اگر چہ رہائش و قیام کے لیے بہت اعلیٰ بہترین تھے، پرسکون، آرام دہ اور آسائش سے لبریز، تاہم زیادہ قریب مک تھا جو انتہائی عمدہ، اعلیٰ اور شاندار ہوٹل گارٹی تھا یعنی ہوٹلوں کی اس قسم میں سے تھا جہاں سونے کا کمر اور صبح کے ناشتے کا بندوبست ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں لچ اور ڈنر کے لیے مارا مارا پھرنا پڑتا ہے۔ سوڈی شاہ نے خود ہی ہوٹل میں رہائش رکھنے پر لعنت بھیج دی تھی مگر وہ زیادہ دن تک افرائیم کے کندھوں پر بھی سوار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے افرائیم کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس کے لیے علیحدہ رہائش کا انتظام کر دے..... افرائیم نے کچھ ناک بھوں چڑھا کر حاشی بھری تھی کیونکہ وہ جانتا تھا اگر ذی شاہ نے بات ایک دفعہ کہہ دی تو بس کہہ دی۔

من ہائیم کے خوب صورت شہر میں ہنگاموں سے ہٹ کر افرائیم کا ذاتی انتہائی خوب صورت مکان تھا۔ جب اس کی شاندار Lexus شیڈ کے نیچے آ کر رکی تب ایک طویل تھکن آمیز سانس خارج کر کے ذی شاہ گاڑی سے باہر آ نکلا تھا۔ وہ اپنی گردن کو ہولے ہولے جھٹک کر گویا سابقہ تمام زہریلی یادوں اور سوچوں کو کچھ دیر کے لیے پس پشت ڈال رہا تھا۔ وہ برے موڈ اور روڈ انداز میں افرائیم کے گھر والوں سے پہلی ملاقات نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس کی تمام سوچیں اور زہریلی یادیں غیر محسوس انداز میں اس کے چہرے کی تمام تازگی اور شگفتگی کا رس نچوڑ لیتی تھیں۔ وہ جانتا تھا جب مالا کا چہرہ اس کے تصور میں اپنا عکس چھوڑتا ہے تب اس کے اندر باہر اذیت بھرے سنائے گونجنے لگتے تھے۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مالا کی یادوں سے خود کو لہولہا کرنے لگا تھا جب اس کی نگاہ روڈ کے پار ڈرا اونچی پہاڑی پر شان سے کھڑے اس مکان کی طرف اٹھی تھی پھر لپٹے بھر کے لیے گویا پلٹنا بھول گئی۔

ارد گرد گھاٹیوں کے پار سبزے کے جھنڈ اور پھولوں

کے ڈھلان تھے۔ جن پر سنہری تتلیاں رقص کر رہی تھیں۔ دور مرغابیوں کے غول دکھائی دے رہے تھے۔ سورج کا زعفرانی عکس ہر پھول کے رنگ پر چمک رہا تھا۔ فضا میں کائی پھل کی باس رچی تھی۔ اودے رنگ کا پہاڑی پھل درختوں کی شاخوں سے جھلک دکھلا رہا تھا۔ ایک حسین تر اور نگاہ کو مبہوت کر دینے والا منظر تھا مگر ذی شاہ کے دل کو دھڑکانے اور نگاہ کو منجمد کر دینے والا منظر پھولوں، پتھروں اور آس پاس کی ایک، ایک شے سے قطعاً ہٹ کر بالکل الگ اور منفرد تھا۔ ذی شاہ کی زندگی گویا پہاڑی کے اس کنارے پر ختم ہو گئی تھی۔ حالانکہ زندگی ختم کہاں ہوئی تھی! زندگی کی تشریحات ہی اب ہوئی تھی یا پھر ہونے والی تھی۔

افرائیم کے ڈبل اسٹوری گھر کے بالکل سامنے ہی وہ مکان تھا انتہائی خوب صورت پتھروں سے آراستہ، جس کے سنہری کنکروں پر دھوپ چمک رہی تھی۔ سفید مرغابیاں اس کے آس پاس رقص کرتی تھیں۔ احاطے میں چھوٹا سا حوض تھا۔ کبھی کبھار کوئی مرغابی اس حوض کے شفاف پانی میں چونچ مارنے آسمان سے اتر آتی تھی۔

شفاف شیشے کی کھڑکیوں کے سامنے سے لے کر داخلی لکڑی کے اونچے منقش دروازے تک پھولوں سے لدی نوکریاں ایک عجیب رنگ دکھا رہی تھیں۔ دراصل یہ نوکریاں یقیناً مٹی سے بھرے گملے تھے مگر بظاہر نوکری کی شکل میں نظر آتے تھے اور پھولوں سے پور پور بھرے ہوئے تھے۔ ذی شاہ نے ایسی حسین نوکریاں آج تک نہیں دیکھی تھیں مگر اسے ان نوکریوں نے ٹھنکا یا نہیں تھا۔ حوض کے کنارے ایک پری و ش حسین بیٹھی تھی۔ اس کی سوتی اسکرٹ میں ڈھیروں پھول تھے جنہیں پتی پتی کر کے وہ پانی میں پھینکے جا رہی تھی۔ وہ اس کام میں اتنی محو تھی کہ کسی کی پُرشوق و حیران نگاہوں کا ارتکاز بھی اسے

ترک وفا

فروری 2014ء کے شمارے کی ایک جھلک

## سرگزشت

ماہنامہ

### طلوع صبح

اس اہم قلم کار کی داستان حسن نے ادب کی خدمت کے لیے زندگی وقف کر دی

### کہنے کا فن

دھند نے برطانیہ میں تباہی مچادی  
12000 انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا

### مغزور مسیحا

ایک ایسے معروف ڈاکٹر کی سوانح  
جس نے شہرت کی بلندی کو چھو لیا

### پابا رازی

دنیا کے تنازع ترین فوٹو گرافر کے حالات زندگی

### تنبیاتی

ایک ایسی لڑکی کی سچ بیانی جو خود میں منفرد تھی

### ان کے علاوہ

لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل کہانی ”سراب“  
فلمی و ادبی دنیا کی یادداشتیں ”فلمی الف لیلہ“ انتہائی دلچسپ سفر کہانی ”ترکی نمی دانم“ اور بھی بہت سی دلچسپ سچ بیانی سچے قصے تاریخی واقعات اور معلومات

اگر آپ علم و دانش بھرے مضامین، ادب، تاریخ اور سبق آموز سچ بیانی پسند کرتے ہیں تو آپ ہی کے لیے یہ شمارہ ترتیب دیا گیا ہے بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں آپ خود ہی گرویدہ ہو جائیں گے

چونکہ انے کا باعث نہیں بن رہا تھا۔ ذی شاہ کو اس لڑکی کے حسن نے بھی اتنا مبہوت نہیں کیا تھا جس قدر اسے لڑکی کے چہرے پر پھیلے حزن و ملال اور عجیب سے کرب نے ٹھنکا یا تھا۔ دراصل لمحے بھر کے لیے اسے لڑکی کا چہرہ بالکل مالا جیسا لگا تھا۔ ویسا ہی حزن کے سایوں سے انا ہوا، ویسے ہی دکھ کی دھول سے غبار آلود..... لمحے بھر کے لیے اسے لڑکی کے چہرے پر مالا کا گمان ہوا تھا۔ حالانکہ وہ مالا تو نہیں تھی مگر اس پل ذی شاہ کو مالا ہی نظر آرہی تھی۔ سب سے زیادہ حیران وہ تب ہوا جب اس لڑکی کا بھیگا چہرہ نگاہوں کی زد میں آیا۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ اس کے شفاف آنسو حوض کے پانی میں بارش کے قطروں کے مانند بوند، بوند گر رہے تھے۔ جانے وہ کس اذیت اور دکھ میں مبتلا تھی۔

لمحے کے ہزاروں حصے میں ذی شاہ کو اس لڑکی پر ڈھیروں ترس آنے لگا۔ اس نے اپنے دل میں اس انجان روتی ہوئی لڑکی کے لیے ڈھیروں ہمدردی محسوس کی تھی۔ جانے ابھی وہ اور کون، کون سے جذبات اجنبی سی اس لڑکی کے لیے محسوس کرتا کہ وہ ایک دم سارے پھول حوض میں اچھال کر پانی کو گھورتی ہوئی زیر لب بڑبڑاتی نظر سے اوجھل ہو گئی۔ وہ جو آنکھیں پھاڑے منجمد کھڑا اب خالی حوض کے کنارے کو گھور رہا تھا افرائیم کی بے ساختہ ہنسی کی آواز سن کر چونک گیا پھر اس نے نگاہیں موڑ کر شیڈ کے نیچے کھڑے افرائیم کو دیکھا تھا۔ وہ اس کا سارا سامان کار کی ڈیگی میں سے نکال کر جانے کب اندر پہنچا آیا تھا اور اب اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتا ہوا ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اسے بے تحاشا ہنسنے دیکھ کر ذی شاہ قدرے خفت زدہ رہ گیا تھا مگر اس کی ہنسی پھر بھی تھم نہیں رہی تھی۔ جب وہ شرمندگی کی دلدل میں گوڈے، گوڈے ڈوب چکا تھا افرائیم نے پیٹ پکڑ کر سنبھلتے ہوئے سرخ



چہرے پر ہاتھ پھیرتے بہ مشکل کہا۔

”تیرا بھی کوئی قصور نہیں دوست! جرمی میں ایسا حسن اور ایسا خصلی آئٹم کہیں نہیں ملے گا نہ نظر آئے گا۔ تو جی بھر کے دیکھ لیتا..... اب دوبارہ جانے یہ کب نظر آئے گی۔ ایک دم خصلی اور پاگل ہے۔“

افراہیم کو پھر سے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ یقیناً وہ اس کی نظروں کے ارتکاز کو انجوائے کر رہا تھا۔ اسے پاگلوں کی طرح ہنستے دیکھ کر ذی شاہ نے اپنی خفت مٹانے کے لیے فوراً جواب دیا تھا۔

”نی الحال تو، تو مجھے اس آئٹم سے بڑھ کر پاگل دکھائی دے رہا ہے۔“ وہ اسے گھورتا ہوا اب بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اسی منتقل دروازے کو دیکھنے لگا جہاں سے وہ خصلی لڑکی گزر کر اندر کی طرف غائب ہوئی تھی۔

”ہا ہا ہا..... ابھی ایک نظر دیکھ کر یہ حال ہے..... یعنی اپنے جگری یار کو پاگل کہہ دیا۔“ افراہیم اور بھی نہ جانے کون کون سے چٹکے چھوڑتا مگر اس کے چٹکوں کو افراہیم کی موٹر یعنی ماں نے بریک لگا دی تھی۔ وہ اسے ڈپٹتے ہوئے بڑے بھرپور انداز میں ذی شاہ کو دیکھ کر رہی تھیں۔ جانے وہ کب اندرونی حصے سے باہر آئی تھیں۔

”خوش آمدید بیٹے! اندر آؤ..... اس احمق کی باتیں تو پوری رات ختم نہ ہوں گی اور تمہیں یہ یہیں کھڑا رکھے گا۔“ افراہیم کی جرمی مدر جواب آدھی سے بھی زیادہ پاکستانی نظر آتی تھیں اسے بازو سے تھام کر اندر لے گئیں۔

جب وہ داخلی دروازے سے اندر آیا تب اس کے اوپر کوئی نرم نرم خوشبودار چیز کسی پھوار کے مانند گری تھی۔ ذی شاہ نے غور کیا تو پتا چلا کہ ایک مستطیل قسم کی پھولوں سے لدی ٹوکری دروازے کے اوپر اس رخ سے لگائی گئی تھی کہ جب کوئی مہمان پہلی مرتبہ گھر میں داخل ہوتا یہ پھول جھک کر اس کا

استقبال کرتے۔ اپنے اتنے بہترین استقبال پر وہ کچھ ہل کے لیے تو مبہوت رہ گیا تھا۔ پھر اسے ایک ”این سیل سیر“ میں بٹھایا گیا تھا۔ یہ نہایت دیدہ زیب فرنیچر سے سجا کرا تھا۔ بہت آرام دہ دیوان سجے تھے۔ یہاں بھی اسے جگہ جگہ پھول نظر آ رہے تھے۔ کرسٹل کے گلدان سے لے کر دروازے کے پاس رکھی ڈسٹ بن کی ٹوپی تک میں تازہ پھول سجے تھے۔ وہ ابھی ارد گرد کا ٹھیک طرح سے جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا جب اسے ٹھنڈے مشروبات پیش کیے گئے۔ انگور، کائی پھل اور ناریل کا مشروب تھا۔ ذی شاہ کو ناریل کا مشروب پسند تھا۔ اس نے دو بلوریں لے پیلے پیلے گلاس اطمینان سے خالی کر دیے تھے۔ مشروب پیش کرنے والی موٹر خود تھیں تاہم کھانے کے لیے اسے ایک دہلی تیلی انتہائی سفید لڑکی بلانے کے لیے آئی تھی۔ اس کے بال اخرونی رنگ کے تھے۔ شکل میں وہ موٹر جیسی لگتی تھی۔ نیلی آنکھیں، سرخ ہونٹ اور گوری رنگت انہوں نے بتایا یہ ان کی بیٹی ایمل تھی..... اور ایمل بہت باتوئی تھی، اسے انگریزی نہیں آتی تھی، اردو توئی پھوٹی بول سکتی تھی۔ تاہم اپنی مادری زبان ڈچ فرانے سے بول رہی تھی چونکہ ذی شاہ کو ترکش اور اطالوی زبان کی سمجھ بوجھ نہیں تھی سو بس وہ ایمل کے ہلتے بھرے بھرے سرخ ہونٹوں کو ٹرین کی سی رفتار میں ہلتے دیکھ رہا تھا پھر شاید موٹر نے تنگ آ کر ایمل کو ڈپٹا تھا۔

”برائے مہربانی آہستہ بولو۔“ ان کے ڈپٹنے پر وہ چابی والی گڑیا کی طرح بالکل ساکت ہو گئی تھی پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایک مرتبہ پھر سابقہ انداز میں بولتے ہوئے اٹھ گئی۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ وہ ماں کی خصلی کا تاثر مٹانی اب خاصی مدبر لگ رہی تھی۔ ذی شاہ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکا تھا کیونکہ وہ جلدی اٹھ گئی تھی یقیناً مزید ڈانٹ سننا نہیں

چاہتی تھی۔ ذی شاہ کو محسوس ہوا تھا اسے ماں کا ٹوکنا کتنا برا لگا ہے۔ وہ اسے کچھ باتوئی اور جذباتی سی لگی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن بندیا کی طرح..... وہ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسی طرح برا منا لیتی تھی۔ ایمل کے جاتے ہی موٹر نے اسے بہت محبت سے کہا تھا۔

”پہلے تم فریش ہو جاؤ..... پھر کھانا لگاتی ہوں۔“ انہوں نے اس کی تھکن کے خیال سے کہا تھا۔ افراہیم کی ماں بہت نرم مزاج، شائستہ اطوار اور بیٹے سے بڑھ کر مہمان نواز تھیں۔ افراہیم شکل صورت میں ان سے مختلف تھا۔ یقیناً اپنے والد جیسا تھا۔ گندمی رنگت، کالی آنکھیں اور کالے بال رکھتا تھا جبکہ مزاج اس کا ماں کی طرح تھا۔ وہ گھر والوں کے مزاج پر غور کرتا موٹر کی ہمراہی میں ایک انتہائی پُرغش ماسٹر بیڈروم میں آ گیا تھا۔ بیڈروم کیا تھا..... گویا کسی ہوٹل کا آرام دہ کمر تھا۔ اس کے پیروں تلے بھلتے ہوئے عنابی رنگ کا انتہائی نرم قالین بچھا تھا۔ فرنیچر کے ہم رنگ سفید چمکیلی بیڈروم چیئر بھی تھی۔ دیوار گیر الماری بھی سفید رنگ کی تھی۔ بیڈ شیٹ کا کلر بھی سفید تھا۔ ایسی اجلی بے داغ چادر پچھی تھی کہ ذی شاہ کچھ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ بھلا اتنے اچلے شفاف، بے سلوٹ بستر پر سو کر اسے خراب کیا جاسکتا تھا..... کمرے میں یہاں بھی سفید مستطیل ٹوکری موجود تھی، جس میں رنگا رنگ گلاب سجے تھے۔ بہت بھینی اور معطر خوشبو نتھنوں سے نکر رہی تھی۔ ایسا رومانوی ماحول تھا اور اس کی سجاوٹ میں کسی آرٹسٹک ذہن کا کمال نظر آتا تھا۔ ذی شاہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ایک طائرانہ نظر میں ہی اس نے پورے کمرے کا جائزہ لے لیا تھا۔

اس نے دیکھا تھا، کمرے کی واحد کھڑکی کے شیشے بھی سفید تھے جس کے آگے پردہ تھا سفید ٹائیلوں کی مہین نازک سی جالی کا..... ذی شاہ نے مڑ

ترک و تھا

کر غیر ارادی طور پر داخلی دروازے کو دیکھا تھا جس پر خوش خط تحریر میں کچھ لکھا تھا۔ کیا لکھا تھا؟ ذی شاہ کو ہرگز سمجھ نہیں آیا۔ تاہم وہ تحریر کی طرف دیکھے پتا نہ رہ سکا تھا۔

”ویلو مین ان من ہائیم.....“ بہت زیادہ غور کرنے کا اسے وقت نہیں مل سکا تھا۔ موٹر نے اس کی مشکل کو آسان کر دیا تھا۔ وہ اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے خود ہی بتانے لگی تھیں۔

”افریشمن نے تمہیں من ہائیم میں خوش آمدید بولا ہے۔“ وہ اسے وضاحتی انداز میں بتا کر واش روم کا ہینڈل گھما کر مزید بتا رہی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں بادے سیر یعنی غسل خانہ تھا۔ ویسا ہی شفاف، صاف چمکتا ہوا..... لشکارے مارتا ٹیب اور اینمیل شیشوں کی جگمگا ہٹ کے ساتھ ٹھنڈے اور گرم پانی کی سہولت بھی میسر تھی۔ وہ موٹر کے ”افریشمن نے تمہیں من ہائیم میں خوش آمدید بولا ہے۔“ جیسے جملے پر غور کرتا سب سے پہلے فریش ہونے کے لیے واش روم چل دیا تھا۔ سفر کی تھکن نہادھو کر اتارنے کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بناتے ہوئے اپنا اگلا لاکھ عمل سوچ رہا تھا۔ اسے کیا کرنا تھا..... کس طرح کرنا تھا؟ اور کیسے اپنے مجرم کے گریبان تک پہنچنا تھا؟ بہت ساری باریکیوں پر غور کرتا وہ غیر محسوس انداز میں کمرے کی اس واحد کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا تھا جس کے سامنے سفید ٹائیلوں کی مہین جالی کا پردہ پڑا تھا۔ اس نے چنگی کی مدد سے پردہ پیچھے کھسکا کر سلانڈ ہٹا دیے۔ سامنے دور تک سنہری زعفرانی حسین شام کا حسن بکھرا پڑا تھا..... سفید مرغابیوں کے غول نیلے کی طرف رواں دواں تھے۔ اس کی کھڑکی کے بالکل سامنے وہی دو منزلہ اٹلے جیسا سفید اور خوب صورت مکان تھا۔ جس کے پیرونی دروازے پر (ولیس ہاؤس) کی تختی آویزاں تھی۔ حوض کے کنارے خالی تھے۔ وہ روتی ہوئی غمزہ



## ترک و ہوا

ذی شاہ کے برابر ذیشان بیٹھا تھا جو برابر اسے لتاڑ رہا تھا۔

”تم احمق مت بنو..... مالا اپنے حالات سے سمجھتا کر چکی ہے۔ تمہیں جرمنی جا کر آگ میں ہاتھ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ مئی آپ اسے سمجھاتی کیوں نہیں؟“ ذی شاہ کو لعن طعن کرتا وہ خاموش بیٹھی مئی کو بھی بیچ میں گھسیٹ لایا تھا۔ مئی جو چپ چاپ ان دونوں کی تکرار سن رہی تھیں محض ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ذی کو اس کے ارادے سے باز رکھنا آسان نہیں۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا اب اس سے ہٹ نہیں سکتا تھا پھر اس نے کون سا محض تفریح پر جانے کا یا ہنی مون منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ انہیں یقین تھا ذی شاہ کچھ غلط فیصلہ ہرگز نہیں کرے گا نہ وہ کچھ الٹا سیدھا کرنے کی اس سے امید رکھتی تھیں۔ وہ بہت معاملہ فہم اور سمجھدار تھا..... یقیناً بہت سوچنے کے بعد اس نے کوئی پلان بنایا تھا تاہم حقیقت تو یہ تھی مئی خود بھی دل سے اسے جرمنی بھیجنے پر تیار نہ تھیں۔ اندر کہیں بہت سارے خدشات سانس لے رہے تھے۔ بھلا منحوس سا مغربی جرمنی ان کے خاندان کو بھی راس آیا تھا؟

”مئی مجھے کیا سمجھائیں گی؟ میں خود بہت سارے معاملات کا از سر نو جائزہ لے کر فیصلہ کر چکا ہوں۔ سوا ب اپنے ارادے توڑ نہیں سکتا..... رک نہیں سکتا..... تم اپنی انرجی ضائع مت کرو۔“ ذی شاہ نے ہاتھ اٹھا کر تیز لہجے میں کہا تھا۔ ذیشان کا رنگ اس کے ان الفاظ پر تیزی سے بدل گیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا غصہ چھلکنے لگا..... یہ مشکل اپنے بگڑے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے اس نے مزاج ترش کرنے سے روکا۔

”تم بھلا کون سے معاملات کا جائزہ لے چکے ہو؟“ ذیشان نے عینی کا اشارہ پا کر خود کو بھڑکنے سے روکا تھا۔ حالانکہ ذی شاہ کے الفاظ اسے آگ بگولا

سمجھتی اور سوچتی بھی تھی مگر بولنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ اس کی زبان کو گویا زنگ لگ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر نقل تھا اور یہ نقل کبھی نہ کھٹنے کے لیے اس نے جان بوجھ کر اپنے لبوں پر لگا لیا تھا۔ وہ طویل ترین اور مہنگے ترین علاج سے اگرچہ صحت مند ضرور ہو گئی تھی تاہم اس نے کسی سے بھی بولنا ترک کر دیا تھا۔ وہ اپنی ذات کے قید خانے میں دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے خود کو خاموشیوں کے جال میں مقید کر لیا تھا۔ گویا ایک چپ نے اسے ہر سوال کرنی نگاہوں سے بچا لیا تھا۔ وہ اپنی ذات کے اس قید خانے میں مطمئن اور پرسکون ہو چکی تھی۔ شاید اس نے قسمت کے لکھے پر صبر کر لیا تھا اور اپنی بدبختی پر شاکر ہو چکی تھی مگر ذی شاہ بھلا کیسے صابر اور شاکر ہو جاتا..... وہ کس طرح مالا کو ایک چپ کا عذاب بھگتنے دیکھ کر پرسکون رہتا؟ پچھلے تین سالوں سے مالا کو ایک قید خانے میں مقید تو دیکھ رہا تھا۔ بھلا اور کتنے سال اسے گھٹ گھٹ کر مرتے دیکھتا رہتا.....

ذی شاہ اس کی زندگی سے اس جس کو ختم کر دینا چاہتا تھا پھر جب اس نے اپنے فیصلے سے گھروالوں کو آگاہ کیا تو سب سے پہلے ذیشان اور عینی نے ہنگامہ مچا دیا۔ ”ذی! تم پاگل ہو گئے ہو..... وہ قصہ تین سال پہلے ختم ہو چکا..... اب گڑھے مردے اکھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں..... تمہارا جانا بیکار ہوگا.....“ ذیشان کھولتا ہوا چیخ رہا تھا۔ اسے اپنے چھوٹے بھائی سے ایسی بے عقلی کی امید نہیں تھی۔ یقیناً وہ اپنی بیوی کی زبان بول کر ذی شاہ کو اس کے خطرناک ارادوں سے باز رکھنا چاہتا تھا۔ ادھر عینی جلمے پیر کی ملی بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے اسے باہر جانے سے روک دینا چاہتی تھی مگر کوئی ٹھوس حل مل کر نہیں دے رہا تھا۔ شوہر کو سمجھا بھجا کر اس نے ذی شاہ کے پاس بھیجا تھا اور اب خود بھی اس کے پیچھے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس وقت سنگ روم میں مئی، بندیا اور

آیا ہی کیسے؟“ مئی کے لیے ذی شاہ کا یہ فیصلہ دھچکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اسے اپنی نظروں سے اوجھل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں مگر ذی شاہ چونکہ فیصلہ کر چکا تھا سوا اپنے اس فیصلے سے محض آگاہ کر رہا تھا وہ ان سے مشورہ ہرگز نہیں مانگ رہا تھا۔ دراصل اسے جرمنی جانے سے تقریباً گھر کے ہر ہر فرد نے روکا تھا۔ مئی سے لے کر بندیا تک..... اس کا بڑا بھائی ذیشان تو ناراض بھی ہو گیا تھا اور عینی بھابی نے بھی خوب واویلا کیا..... اصل میں ذی شاہ کے جرمنی چلے جانے سے عینی بھابی کی بہن کا مستقبل تھوڑا خدشات میں لپٹ رہا تھا سو عینی کو بھی اس کا فیصلہ قطعاً بھایا نہیں تھا۔ ذی شاہ کو سوائے مئی کے کسی اور کے واویلا کرنے کی پروا ہرگز نہیں تھی۔ اس نے ایک مرتبہ فیصلہ کر لیا تھا اب اس فیصلے پر عمل کرنے کا... بھرپور ارادہ رکھتا تھا۔ مئی کے ہزار دفعہ سمجھانے اور رونے چلانے پر اس نے محض ایک دلیل سے انہیں خاموش کروا دیا تھا۔ وہ اس کا ارادہ اور دلیل سن کر بالکل خاموش ہو گئی تھیں..... شاید پہلے انہوں نے سوچا تک نہیں تھا کہ ذی شاہ اس کام کے لیے بھی جرمنی جاسکتا ہے۔ جب اس نے مئی کو قائل کر لیا تو پھر بھائی کی اسے پروا نہیں تھی البتہ بندیا کے آنسوؤں نے اسے پیسجا ضرور تھا۔ اسے ڈھیروں دلا سے اور یقین دہانی کروانے کے بعد جب اس نے اپنا ارادہ نہ بدلنے کی وضاحت کی تھی تب بندیا کو بھی خاموش ہو جانا پڑا۔ اس سارے قصے میں سب سے زیادہ خاموش کردار مالا کا تھا۔ وہ گھر میں ہونے والی چہل پہل، کچھ کچھ بدمزگی اور جھگڑے کی فضا محسوس کر کے بھی اپنے خول میں بند تھی۔ گویا اسے کسی جھگڑے، لڑائی، فساد اور بدمزگی نے اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔ تین سال پہلے جو روگ اس کے دل کو لگا تھا اس کی چاٹ نے مالا کی قوت گویائی کو سلب کر دیا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھتی تھی، محسوس کرتی تھی،

اجنبی لڑکی وہاں نہیں تھی۔ مستطیل نوکریوں میں سفید گلاب نمایاں تھے۔ منظر پہلے کی طرح بھرپور اور مہبوت کر دینے والا تھا تاہم نہیں دور خالی پن ضرور محسوس ہوتا تھا..... یہ خالی پن کیوں تھا.....؟ یہ ادھور اپن کیوں تھا؟ شاید وہ سفید روئی جیسی حسین لڑکی اب کہیں نہیں تھی۔

وہ ویسے ہاؤس سے نگاہ ہٹا کر ڈھلوانوں پر بکھرے سبزے اور ہریالی کو دیکھنے لگا تھا۔ تب نہ جانے کہاں سے اس کی آنکھوں میں چمکیلا پانی اٹھنے لگا تھا۔ نادیدہ ریت اس کی آنکھوں کو چندھیا گئی تھی۔ وہ آسمان پر اڑتی سفید مرغایوں کو دیکھ کر... زیر لب بڑبڑایا۔

”تو بالآخر میں یہاں پہنچ گیا..... علی عینی میں تمہارے من ہائیم بالآخر پہنچ ہی گیا..... اب مجھے بس تمہارے گریبان تک پہنچنا ہے.....“ ویسے ہاؤس کی ساری خوب صورتی پس منظر میں چلی گئی تھی۔ موترے، آئیں اور شاہ بلوط کے درخت کھڑے پڑے تھے۔ رومان جو اس شہر کی فضا میں بسا تھا۔ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ محبت جو اس کی رگوں میں لہو بن کر بھی دوڑ رہی تھی۔ اب صنوبر کے گھنے جنگلات کے تاریک سائے میں سسک رہی تھی۔ (دریا کے کنارے پر پھیلا جنگل) تین سال پہلے عینی اور مالا کی محبت کے فنا ہونے پر کس طرح سے کڑ لایا تھا۔ یہ بات ذی شاہ کو پتا نہیں تھی، وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا اور وہ تو بے شمار سچائیوں سے اب بھی بے خبر تھا۔

☆☆☆

تین چار ماہ پہلے جب اچانک ذی شاہ نے جرمنی جانے کے متعلق اپنا خیال ظاہر کیا تو اس کے گھر میں محاورے نہیں حقیقتاً بھونچال آ گیا تھا۔ مئی نے سنا تو دل تھام لیا تھا۔

”ذی! تو جرمنی ہرگز نہیں جائے گا۔ ارے، ادھر جا کر کوئی واپس آیا ہے؟ یہ خیال تیرے دل میں



## ترک و وفا

”کم از کم اندر لگی آگ تو بجھ جائے گی۔ انتقام کے شعلوں پر چھینٹے پڑ جائیں گے اور سب سے بڑی بات میں کچھ حقائق ضرور جان لوں گا۔ آخر ہنستے بستے گھرانے میں اچانک آگ کیسے لگ گئی تھی؟ کیا تم لوگوں کے ذہنوں میں سوال نہیں اٹھتے؟ ہماری بہن شادی کے چھ مہینے اپنے شوہر کے ساتھ خوش باش رہتی ہے اور پھر اچانک ایک رات سب کچھ بدل جاتا ہے؟ آخر اس رات ہوتا کیا ہے؟ مجھے اس رات تک پہنچنا ہے؟ مجھے حقائق ڈھونڈنے ہیں؟ مالا کے مجرم کو انجام تک پہنچانا ہے۔“ اس کے لہجے سے شعلے لپک رہے تھے۔ آنکھ سے سرخی بہ رہی تھی۔ اس کے ارادے چٹان کی طرح مضبوط تھے۔ ان ارادوں کو بھلا ذیشان توڑ سکتا تھا مگر وہ اسے روک تو سکتا تھا۔ سمجھا تو سکتا تھا۔

”ہم نے پہلے مالا کو جرمنی بھیج کر کتنا نقصان اٹھایا ہے۔ اب تمہیں بھیجنے کا حوصلہ نہیں..... خود سوچو، اگر تم مالا کے مجرم سے انتقام لے بھی لیتے ہو تو اس سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ نہ مالا کی خوشیاں لوٹیں گی، نہ اس کے ماتھے پر لگا بد نما داغ دھل جائے گا۔ پھر بھلا کیا فائدہ اتنے عذاب سہنے کا۔“ ذیشان نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا تھا۔ وہ کسی بھی طرح ذی کو وہاں جانے سے روکنا چاہتا تھا۔ کچھ عینی کی طرف سے مجبور تھا اور کچھ چھوٹے بھائی کی فطرت سے بھی آگاہ تھا۔ وہ جس کام کے پیچھے پڑ جاتا اسے کبھی ادھورا نہیں چھوڑتا تھا پھر تو یہ مالا کے لیے، اس کی خوشی اور زندگی کے قاتل سے حساب لینے کا معاملہ تھا۔ وہ بھلا رک سکتا تھا؟

”میں فائدہ اور نقصان سوچ کر تو ہرگز نہیں جا رہا..... میں نے خسارے اٹھائے ہیں..... اور نقصان، ذلت اور کرب ہی اس کی جھولی میں ڈالوں گا۔ اگر ہماری جان پچھلے تین سال سے سولی پر لٹکی ہے تو علی عینی بھی سکھ نہیں پائے گا۔ یہ میرا خود سے

صورت نہ ذیشان کو بھیجتی، بھلا جرمنی جا کر کوئی واپس آیا تھا؟ اس کی ساس خود بتاتی تھیں ان کا دیور سالوں پہلے جرمنی گیا تو وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ پیچھے ماں مری باپ مرا..... بڑی بہن مر گئی مگر جانے والا کبھی نہ لوٹا..... حالانکہ سمندر پار بیٹھ کر اپنوں کی یاد میں رونے والے کی روح تو نہیں کہیں کر لارہی تھی پھر بیچ میں کئی سال گزر گئے تھے کہ اچانک ان کا دیور واپس لوٹ آیا مگر چہرے پر پہلے سی جوانی نہیں تھی، بہار نہیں تھی، وقت نے آزما کر جوانی کا رس نچوڑ لیا تھا..... بالوں میں چاندنی اتر آئی تھی۔ مضبوط چوڑے کندھے جھک گئے تھے۔ بڑھاپے کا موسم بڑا اداس کر دینے والا تھا۔

پھر بھلا کیا ہوا تھا؟ کس طرح سے ہوا تھا؟ تین سال پہلے کا تو قصہ تھا۔ اس نے کئی راویوں کی زبان سے سنا تھا..... مگر ہر دفعہ سنتے ہوئے الگ ہی جذبات ہوتے۔ کبھی افسردگی، کبھی لطف، کبھی رشک، کبھی کرب.. وہ تین سال پہلے کے واقعات... اذہر نور ذہن میں تازہ کر رہی تھی جب اچانک ذی شاہ کی آواز اسے اپنی طرف متوجہ کر گئی۔

”تین سال سے اسے کھوج رہا ہوں، تین سال سے اس کے گریبان تک پہنچنے کی پلاننگ کر رہا ہوں۔ یہاں بیٹھ کر سوائے سوچنے کے ہم کچھ نہیں کر سکتے، سو میں نے جرمنی جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ ذی شاہ غیر جذباتی، ٹھوس اور مستحکم لہجے میں بولا تھا تب ذیشان حد سے زیادہ بے چین ہو گیا اور پہلو تو عینی نے بھی بدلا تھا۔

”آخر فائدہ کیا ہوگا.....؟ جو اس ظالم ناپاک، غلیظ گدھ نے کرنا تھا کر دیا، تمہارے اس سفر سے حاصل کیا ہوگا؟“ ذیشان کا سوال بہت کڑوا اور حقیقت سے قریب تر تھا۔ سومی سمیت بندیا کی خاموش نظریں بھی ذی شاہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد سنجیدگی سے بولا۔

پڑی تھیں۔

”بہو! تم بات کو غلط رنگ مت دو، اچھی طرح سمجھ رہی ہو جو کچھ ذی شاہ کہہ رہا ہے..... اور ذی غلط نہیں کہہ رہا۔“ مئی کے الفاظ نے جہاں عینی کا منہ بند کر دیا تھا وہیں ذیشان پھر سے بھڑک اٹھا۔

”مئی.....! آپ ذی کی حمایت کر رہی ہیں، یہ کیا ٹھیک کہہ رہا ہے؟ تین سال پہلے آخر حالات کیسے تھے جو میں حساب کتاب لینے اس بے غیرت کے پاس جرمنی بھاگتا، جس کی شکل تک ہم نے دیکھی نہیں..... پھر جب مالا لٹی پٹی واپس آئی تھی تب اس کے حالات جان کر ڈیڈی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا..... بعد میں مالا کی بیماری کے ساتھ ڈیڈی کی موت کا اچانک ملنے والا دھچکا سہتے ہوئے کسے جرمنی جانے کا ہوش رہا تھا پھر ذی بھی تو کراچی سے واپس آچکا تھا یہ کیوں نہ مالا کے مجرم سے رو دو ہاتھ کرنے گیا.....؟ اب جب وقت بدل گیا ہے، سماعتیں گزر گئی ہیں، عم کی بھاری گھڑیاں ٹھسک گئی ہیں، ہمیں بھی صبر آ گیا ہے پھر گڑے مردے اکھاڑنے کا فائدہ.....؟ اس کا جانا سراسر بیکار ہے، یہ کس طرح جرمنی جائے گا؟ پھر اس ذلیل کو ڈھونڈے گا کیسے.....؟ ہمارے پاس تو اس ذلیل کی ایک تصویر بھی نہیں..... ہم میں سے کسی نے اس بے غیرت کو دیکھا تک نہیں تو اس کے گریبان تک کیسے پہنچ پاتے..... اور جس نے اسے دیکھ رکھا ہے، وہ کچھ بولنے سے ہی معذور ہو چکی ہے۔ جانے اس معصوم پر کیا ہوتی تھی۔ سوچتا ہوں تو خون کھولنے لگتا ہے۔“ ذیشان کی آواز حقیقت میں بھرا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں گرد اڑنے لگی تھی..... اجڑی بہن کی حالت پر صبر شکر کرنا آسان نہیں تھا مگر وہ بھی کیا کرتا.....؟ کئی طرح کی بیڑیوں میں جکڑا تھا۔ اور ایک بیڑی تو عینی کی صورت میں تھی۔ وہ اسے تنہا بھلا نہیں جانے دے سکتی تھی؟ خصوصاً جرمنی تو وہ کسی

کر رہے تھے مگر عینی نہیں چاہتی تھی کہ دونوں بھائی لڑائی کو بڑھادیں۔ اگر دونوں میں تکرار بڑھ جاتی تو ذی شاہ نے بول جال بند کر دینی تھی پھر عینی کے ہاتھ سے اگلے معاملات بھی چپکے سے پھسل پڑتے..... سو وہ شوہر کو کول ڈاؤن رہنے کا مسلسل اشارہ کر رہی تھی۔ اسے پتا تھا اول تو ذی شاہ کو غصہ نہیں آتا مگر جب غصہ آجائے تو پھر اتنی آسانی سے اترتا نہیں..... تین چار سالوں میں وہ اپنے بانکے جیلے دیور کا مزاج خوب سمجھ گئی تھی۔ پھر وہ جانتی بھی تھی ذی کو جو بات پیار و محبت سے سمجھائی جائے اسی کا وہ اثر بھی لیتا ہے۔ غصے کے بدلے غصہ اٹننے میں اسے قطعاً دشواری نہیں ہوتی..... اب بھی ذیشان کا سوال سن کر... ذی شاہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ وہ اپنی خواندگی کی خوب صورت آنکھوں میں ڈھیروں خشونت بھر کے بڑے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کے سوال کی چھین نے ذی شاہ کو تکلیف دی تھی۔

”بات تو تم ایسے کر رہے ہو، گویا تمہیں کچھ پتا ہی نہیں..... لٹی پٹی بہن کے نصیب برشا کر ہو کے بیٹھ جانے والے، کیا تمہیں اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی اپنی بہن کے مجرم سے فون پر ہی کچھ حساب کر لیتے..... کم از کم اتنا تو اس بے غیرت سے پوچھتے، کس جرم کی پاداش میں اس معصوم کو ایسی سزا سنائی ہے؟ آخر کون سی خطا مالا سے سرزد ہوئی تھی؟ آخر اتنا پوچھنے کا حق تو تم رکھتے تھے نا.....؟ ذی شاہ... کے غضبناک لہجے میں عجیب دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔ اس کے الفاظ نے جہاں ذیشان کو مشتعل کیا تھا وہیں عینی کی گوری رنگت دکھ اٹھی تھی..... وہ جو کب سے بھگی ملی بنی بیٹھی تھی ایک دم بھڑک اٹھی۔

”تمہارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ بھی مالا کے ساتھ ہوا، وہ ہم نے کروایا؟“ عینی کی کبواس نے مئی سمیت ذی شاہ کو بھی بھڑکا دیا تھا۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی مئی پر نم اور دھبی آواز میں بول



## ننگ و وفا

جبکہ بندیا کو وہ اس قابل ہی نہیں سمجھتی تھی جس کے اعتراض کی طرف گھروالے دھیان دیتے لیکن آندھی اسی جہت سے اٹھی تھی جس طرف یعنی کاگمان ہی نہیں تھا۔ فی الحال ذی شاہ کے جرنی جانے کو بھلا کر بندیا اس نئے غم میں مبتلا ہو گئی تھی۔

”مالا اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتی ہو، کچھ سنا تم نے، یعنی بھائی ذی شاہ بھائی کے لیے اپنی بہن آنیہ کو لانے والی ہیں دیکھنا کل کو زرشام بھائی کے لیے اپنی کسی بھانجی کو اٹھا لائیں گی۔“ بندیا نے غضبناک ہو کر ہاسٹل میں مقیم اپنے تیسرے بھائی کا ذکر بھی کیا جو تعلیم کے حصول کی خاطر ہاسٹل میں رہ رہا تھا مگر یہ ذکر مالا کو کون سا بولنے پر اکسا سکتا تھا۔ وہ اب بھی بے دھیانی سے نگر نگر دیکھ رہی تھی۔ گویا اس کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حالانکہ سمجھ تو اسے آ رہی تھی مگر وہ جواب دینا یا بولنا نہیں چاہتی تھی..... اسے خاموشی کی چادر اوڑھنا تھی مگر یہ بندیا بھلا ماحول کو خاموش اور پرسکون رہنے دے سکتی تھی۔

”میں یعنی بھائی کی ایک بھی آرزو کو پورا نہیں ہونے دوں گی۔ نہ ذی شاہ بھیا کو اس آنیہ کے ہتھے چڑھنے دوں گی نہ اپنے زرشام بھائی کو ان چڑیلوں کے حوالے کروں گی، ان کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ جائے گی۔ دیکھو، میں کرتی کیا ہوں۔“ وہ ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتی سخت بے چین تھی۔ اس کی بے چینی مالا خوب سمجھتی تھی مگر وہ اتنی بے بس تھی کہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ بس اندر ہی اندر کھل ضرور سکتی تھی، آنسو بہا سکتی تھی مگر بندیا کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ حالانکہ وہ بندیا سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟ وہ کیا کرے گی؟ اور وہ کچھ ایسا کبھی نہ کرے جو ان کی ماں کو تکلیف دے یا ان کے تینوں بھائیوں میں پھوٹ پڑ جائے۔

”یعنی بھائی کی چالاکی اور مکاری کی کوئی حد بھی ہے، اپنی بہن لے آئیں گی تو ہمیں اسٹور روم

اور دوسرے ان دنوں اس کا مزاج آسمانوں کو چھو رہا تھا۔ پہلے پہل جو یعنی نے ذی شاہ کے ساتھ دوستی گانٹھ رکھی تھی اس کا خاتمہ بھی بالآخر اس دن ہو گیا تھا جب بندیا اور یعنی کی تکرار ذی شاہ نے اپنے کانوں سے سن لی تھی۔ تب کا بدگمان ہوا ذی دوبارہ یعنی کے ساتھ دوستانہ رویہ قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ سو یعنی کے مزاج میں اور بھی کمی آ گئی تھی۔ ساس نند کو تو وہ لگی لپٹی رکھے بغیر کھری کھری سنا دیتی تھی تاہم ذی شاہ کے سامنے ہمیشہ مظلوم اور مسکین بن جاتی۔ دراصل وہ دیور کو بدگمان نہیں کرنا چاہتی تھی..... مگر اس کے سوچنے سے پہلے کون سا کچھ بہتر ہو رہا تھا۔ جو اب اس کی پلاننگ حسب منشا رزلٹ لے آئی..... وہ اپنی بہن کے لیے جتنی راہیں ہموار کر رہی تھی، معاملات اتنے ہی الجھتے جا رہے تھے۔ گھر کا ماحول بندیا کے فساد کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا۔ اس نے آنیہ کے متعلق جب سے سنا تھا تب سے شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ مئی کو بھی اس نے باور کروا دیا تھا کہ وہ یعنی کی بہن کو اس گھر میں لانے کے لیے ہرگز مت سوچیں۔

وہ لوگ تو پہلے ہی یعنی کی صورت میں ایک عذاب بھگت رہے تھے..... اب دوسرا عذاب اپنے سر پر مسلط کرنے کا ہرگز بھی رسک نہیں لے سکتے تھے۔ یہ تو بس بندیا کی دلیری تھی جو وہ یعنی کے سامنے تن گئی تھی ورنہ یعنی، مئی اور مالا کو تو کسی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس نے بالا ہی بالا مئی اور ذیشان کو رضامند کر لیا تھا۔ اس کی خواہش تھی مئی ذی شاہ کے کانوں میں بھی بات ڈال دیں کہ وہ یعنی کی بہن کو اپنی دوسری بہو بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ یعنی کو پورا یقین تھا مئی کی بات کو ذی شاہ... قیامت تک ٹال نہیں سکتا تھا نہ نظر انداز کر سکتا تھا سو وہ اس لحاظ سے کچھ مطمئن تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی تیز طرار نند نے آنیہ کا نام سن کر کیسا فساد مچا دینا ہے۔ دراصل مالا کی طرف سے تو اسے کوئی خدشہ لاحق ہی نہیں تھا۔ مالا تین میں تھی نہ تیرہ میں تھی

بندیا کے تلخ الفاظ نے یعنی کو تو آگ لگائی ہی تھی ذیشان کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ وہ جو ذی شاہ کے باسے میں سوچ رہا تھا ایک جھٹکے کے ساتھ بندیا کی طرف متوجہ ہوا..... پھر ماحول کی کشافیت محسوس کر کے اس نے یعنی کو سخت نگاہوں سے گھورا تھا۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ! اٹھ کر جاؤ یہاں سے، ذرا ادب لحاظ چھو کر نہیں گزرا.....“ ساس، نند کی موجودگی میں اپنی اس عزت افزائی پر جلتی کلستی، ذیشان کو تیور دکھائی وہ اٹھ کر پیر پختے ہوئے چلی گئی تھی پھر ذیشان بھی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بندیا کو گھورتے ہوئے بولا تھا۔

”تم بھی ذرا اپنی زبان کنٹرول میں رکھا کرو، بڑے چھوٹے کی تمیزی ہی نہیں۔“ ذیشان کے گھر کئے پر بندیا پھٹ پڑی تھی۔

”وہ مئی کو اتنی باتیں سنا گئی ہیں..... مئی اس کی چھوٹی بہن ہیں نا.....“ اس نے تڑختے ہوئے جتلیا تھا پھر تن ٹن کرتی مئی کے ڈپٹے پردہاں سے پیر پختی چلی گئی۔ اس کے پیچھے مئی، ذیشان کو منمناتے ہوئے صفائی پیش کر رہی تھیں۔

”چھوٹی ہے بیٹا.....! درگزر کر دیا کرو.....“ مئی کی صفائی نے ذیشان کو کچھ اور بھی شیر کر دیا تھا۔

”سمجھایا کریں اسے، یعنی سے منہ ماری نہ کیا کرے۔“ وہ النامی کو مشورہ دیتا دھب دھب کرتا کمرے سے نکل گیا تھا۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں موجود وہ خاموش سی لڑکی بس ٹکر ٹکر ماں کے چہرے پر پھیلی بے بسی کو دیکھ رہی تھی پھر جانے کہاں سے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اٹھ آیا تھا..... اب وہ سر جھکائے بے آواز رو رہی تھی۔ رونا اس کے نصیب میں جو لکھ دیا گیا تھا۔

☆☆☆

گھر کی فضا میں امن قائم نہیں رہ سکا تھا۔ امن قائم رہتا بھی کیسے.....؟ ایک تو ذی شاہ باہر جا رہا تھا

وعدہ ہے۔ اس کی زندگی بھی جہنم بنا کر آؤں گا۔“ اس نے گویا بات ختم کر دی تھی۔ وہ مزید، اس موضوع پر نہیں بولنا چاہتا تھا۔ سو اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ ذی شاہ کے جاتے ہی یعنی کو زبان لگ گئی تھی۔ وہ ذیشان پر غصہ کر رہی تھی اور ساس کو کھری کھری سنا رہی تھی۔ اسے بھی تو اپنا غصہ اٹھانا تھا۔

”اس کے دماغ میں آپ نے خناس بھرا ہے۔ آپ کے آنسو، سسکیاں، آپہں اور مالا کے لیے ہر وقت کے رونے نے آج ذی سے یہ فیصلہ کروایا ہے۔ یہ سارا کیا دھرا آپ کا ہے۔ نہ آپ اپنے روز روز کے رونے کو اس کے کانوں میں انڈیلتیں نہ وہ مجبور ہو کر علی عیسیٰ سے انتقام لینے کا سوچتا، آخر مالا کی نحوست کون کون سا دن دکھائے گی۔ اگر ذی شاہ باہر چلا گیا تو جانے کب لوٹے گا۔ میری بہن کے معاملے کو آپ نے لٹکا رکھا ہے، میں آپ سے کہے دیتی ہوں، ذی کے باہر جانے سے پہلے آپ کو کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔“ یعنی کی اصل کھولن کا سبب کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اسے اپنی بہن آنیہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اتنے عرصے سے ماں بہن کو ذی کے حوالے سے امید دلارکھی تھی۔ اب اس کے اچانک جرنی جانے کے فیصلے نے گویا معاملہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ذی شاہ کو جرنی جانے سے روکنا تو آسان نہیں تھا تاہم وہ ذیشان کو مجبور کر کے کچھ اور تو سوچ سکتی تھی مگر اس کی سوچ کی خوشگواریت کو بندیا کی تلخ آواز نے ختم کر دیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”بہت خود غرض ہیں بھائی آپ! میری دکھی اور بیمار بہن کو تو آپ نے کبھی بخشا ہی نہیں اب مئی کو براہ راست مجرم قرار دے دیا..... بہت گندی سوچ ہے آپ کی..... اور ذیشان بھائی.....! آپ سے تو ہمیں کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے..... بجائے بیوی کا منہ توڑنے کے نہ جانے کس سوچ میں گم بیٹھے ہیں۔“



تھا اور محض سونے کے لیے آتا۔ ڈیڈی کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی بزنس کو وقت دینے لگ گیا تھا۔ جب سے مالا صحت یاب ہو کر دوبارہ گھر آئی تھی اس کے بعد سے ذی شاہ نے دوبارہ آفس کی مصروفیات میں پناہ ڈھونڈ لی تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ مالا سے غافل ہو گیا ہے یا بندیا کی ضروریات سے نگاہ چرا گیا ہے۔ وہ پہلے سے بڑھ کر مری اور بہنوں کا خیال رکھتا تھا بلکہ ذیشان سے بھی زیادہ ان پر توجہ دیتا تھا مگر... اسے گھریلو معاملات میں انوالو ہونا پسند نہیں تھا۔ اگر بندیا اور عینی کی لڑائی ہو رہی ہوتی تو وہ ان کی لڑائی پر دھیان نہیں دیتا تھا۔ ہر گھر میں نند بھانج کی معمولی سکرار ہوتی ہے سو وہ ان کی لڑائیوں پر کیا غور و فکر کرتا، وہ جانتا تھا بندیا مزاج کی تیز ہے پر یہ نہیں جانتا تھا یعنی بھی مزاج کی تیز ہے۔ اس کے سامنے تو وہ کوئی اور ہی کیئرنگ قسم کا روپ لے کر آتی تھی پھر صبح سے لے کر شام تک گھر سے باہر رہنے والے مردوں کو گھریلو سیاست کا بھلا کیا پتا ہو سکتا تھا۔

انہی حالات کے دوران ایک دن اچانک مالا کو لان کے الگ تھلگ اور تاریک گوشے میں بیٹھا دیکھ کر کچھ الگ قسم کی سوچیں ذی شاہ کے دل و دماغ کو جکڑ گئی تھیں۔ اس کی بہن اس وقت اکیس سال کی تھی۔ تین سال پہلے ڈیڈی نے اچانک اس کی شادی اپنے بھتیجے سے کر دی تھی۔ ان کے بھائی عرصہ دراز سے جرمنی میں مقیم تھے۔ ایک دن اچانک پاکستان لوٹ آئے۔ تب ذی شاہ کراچی میں تھا۔ ایک صبح ڈیڈی کی فون کال آئی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے ہمراہ جرمنی جا رہے تھے اور ان کے ساتھ مالا نے بھی جرمنی جانا تھا۔ ذی شاہ، مالا کے جانے کا سن کر کچھ حیران تھا بھلا مالا کو ڈیڈی ساتھ کیوں لے جا رہے تھے... تب مالا اٹھارہ، انیس سال کی معصوم بھولی بھالی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ ہوشیار، چالاک تو جرمنی میں چھ ماہ کے قیام کے بعد بھی نہیں ہوئی تھی۔ خیر مالا کے جرمنی

نہیں بٹھا سکتیں۔“ ایسی تکلیف دہ باتیں سن سن کر اندر سے مرے ہوئے یہ لوگ عینی کو دلہن بنا کر گھر لے آئے تھے پھر عینی کوئی غیر بھی نہیں تھی ان کے اکلوتے ماموں کی بیٹی تھی۔ مئی نے دل پر پتھر رکھ کے ذیشان کی شادی کر دی حالانکہ لوگوں نے خوب باتیں بھی بنائی تھیں۔ ابھی تو ڈیڈی کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا اور نہ مالا کی طرف سے ملنے والا گھاؤ ہلکا ہوا تھا جو شادیاں نے بھی بجانے شروع کر دیے تھے۔ تب ذی شاہ نے تو نہیں البتہ شامی نے سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔

”چند مہینے شادی اور بھی تو ڈیلے ہو سکتی تھی۔ ابھی تو مالا اسپتال سے ڈسچارج بھی نہیں ہوئی۔“ شامی کی حلقی بجائی۔ مالا کی نازک کنڈیشن کے پیش نظر اسے اسپتال ایڈمٹ کروا دیا گیا تھا۔ اس کو شدید بہانی دورے پڑنے لگے تھے پھر اس کا دوسری مرتبہ بھی نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ مالا اسپتال میں ہی تھی جب نئی دلہن گھر بھی آگئی۔ تب ذی شاہ پورا دن اسپتال میں مالا کے پاس رہا کرتا تھا ان دنوں عینی بھی گھر والوں کے دلوں میں جگہ پانے کے لیے بھاگ بھاگ کر اسپتال جایا کرتی تھی مگر یہ اخلاقی کارروائیاں محض دنوں پر ہی محیط تھیں... پھر اس نے اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے شروع کر دیے تھے یہ اور بات تھی کہ وہ ذیشان اور ذی شاہ کے سامنے کوئی اور ہی روپ لے کر آتی تھی۔ ان دونوں کے سامنے وہ خود کو بہت مظلوم و معصوم ثابت کیا کرتی تھی البتہ بندیا اور شامی اس کی ہر، ہر چالاک سے واقف تھے۔ شامی ماں اور بہنوں سے ذی شاہ اور ذیشان کی نسبت زیادہ قریب تھا۔ ہاشل میں رہنے کے باوجود وہ بہن سے رابطے میں رہتا تھا جبکہ ذی شاہ بھی پہلے بورڈنگ میں رہنے اور پھر حصول تعلیم کی غرض سے زیادہ عرصہ گھر والوں سے دوری کے باعث اتنا قریب نہیں تھا۔ وہ زیادہ اپنے کام سے ہی تعلق رکھتا

شامی فوراً ٹھنک گیا تھا۔

”خیریت تو ہے ناں.....؟“ اس نے فکرمندی سے پوچھا..... ساری چونچالی وہ لمحوں میں بھول گیا تھا کیونکہ بندیا کی آواز خاصی سنجیدہ اور متفکر تھی۔ سو وہ پریشان کیوں نہ ہوتا۔

”خیریت کہاں ہے، عینی بھائی بھلا خیریت رہنے دے سکتی ہیں۔“ اس نے جملے کٹے انداز میں عینی کی سازش سے شامی کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ ادھر شامی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”یہ ممکن کی شو شا کس نے چھوڑا ہے؟ ذی تو جرمنی جا رہا ہے ناں میرا نہیں خیال وہ فی الحال اس جھنجٹ میں پڑے گا۔“ شامی نے متفکر سے انداز میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا تب بندیا نے بھرائی آواز میں کہا۔

”یعنی بھائی ذی بھیا کی ممکن کروا کر ہی دم لیں گی۔ مجھے تمہاری سپورٹ چاہیے۔ میں اس ممکن کو نہیں ہونے دوں گی۔ مئی اور مالا تو کچھ بھی نہیں کریں گی جو کچھ کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے۔ تم ہی گھر آ جاؤ تو ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔“ بندیا کی سوس سوس نے شامی کو بے قرار کر دیا تھا۔ وہ عینی کی سازشوں سے خوب واقف تھا۔ جس طرح ذیشان کو ورغلا کر زبردستی ان کی زندگیوں میں گھسی تھیں یہ سب کچھ ڈھکا چھپا تو نہیں تھا۔ مئی تو عینی کی تیزی طراری کے باعث انہیں بہو بنانا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ یہ تو ذیشان کی ضد کے باعث بیل منڈھے چڑھی تھی۔ ذیشان نے بانگ دہل اعلان کر دیا تھا کہ وہ عینی کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ تب ڈیڈی کی اچانک وفات کا غم بھی تازہ تھا اور مالا کے دکھ بھی ہرے تھے، زخم بھرے نہیں تھے۔ ابھی تو بہن کو اجڑے چھ ماہ بھی نہیں گزرے تھے جب عینی کے گھر والوں نے شادی کا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ بقول عینی کی ماما ”مالا نے تو اب اسی روگ کے ساتھ عمر گزارنی ہے سو وہ اپنی بیٹی کو مالا کے زخم سلنے تک گھر

میں گھسنا پڑے گا..... اور میں ایسا پرگز نہیں کروں گی۔“ بندیا تھک ہار کر بیڈ پر ڈھے گئی تھی پھر اس نے سیل فون اٹھا کر ذی شاہ کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ یقیناً وہ اکیلے بول بول کر تھک چکی تھی..... اور اپنی بھڑاس کے جواب میں کسی کی آواز سننا چاہتی تھی۔ ذی شاہ کا نمبر بند تھا، بندیا کا مزاج پھر برہم ہو گیا..... تھوڑی دیر بعد اس نے پھر سے ٹرائی کیا تھا..... اب کہ نمبر آن ہو چکا تھا مگر کال پک نہیں کی گئی تھی۔

”ذی بھائی! اللہ تمہیں پوچھے بندہ کبھی تو فون وقت پر سن لیتا ہے۔“ بندیا زیر لب بڑ بڑا رہی تھی جب اس کا موبائل ایک دم بجنے لگا تھا۔ ذی شاہ کے بجائے ہاشل سے زر شام کی کال آرہی تھی۔ اس نے جھٹ فون کان سے لگایا۔

”بندریا ڈیر..... کیسی ہو؟“ وہ اسے بندیا کے بجائے بندریا کہہ کر چھیڑتا تھا کچھ وہ بھی بھوری سی، صاف رنگت، بھوری آنکھیں، بھورے بال، شامی اسے بندریا ہی کہا کرتا تھا..... اور وہ اس طرز متخاطب پر آگ بگولا ہو جاتی تھی۔ زر شام بھی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔ جیسا کہ اب بھی چھیڑ رہا تھا۔

”بکو اس بند کر دو..... میرا دماغ پہلے سے تپا ہوا ہے۔“ بندیا داہڑی تھی اور داہڑے کی وجہ سے اس کے گلے میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔ اسے کھانتے سن کر زر شام چپک کر کہہ رہا تھا۔

”ہاؤ فنی..... تمہارے دماغ کب تپا ہوا نہیں ہوتا.....“ شامی کھلکھلا کر بولا تھا۔ دراصل ان دونوں بہن بھائی کی خوب چلتی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ سال کے کئی مہینے شامی کو گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ سو یہ اپنی چونچیں فون پر لڑا لیتے تھے۔

”کوئی ڈھنگ کی بات ہے تو کرو مجھے ذی شاہ... بھائی سے کچھ ارجنٹ کہنا ہے۔“ اس نے بہت بے چینی سے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ ذی شاہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ اس کی بات سن کر دوسری طرف



## توک و ما

کوسرا انگیز کر رہا تھا پھر تالیوں کی گونج میں عینی نے ایک کانٹا۔ شیفون کی سرخ ساڑھی میں اس کا بجلیاں گراتا حسنِ ذیشان کو کتنا گھائل کر رہا تھا۔ یہ تو ساری محفل کے لوگ جانتے تھے۔ اتنے مرفسوں ماحول میں آنیہ کی دلنشین مسکراہٹوں کو نظر انداز کرتا وہ جانے کیوں اتنا بے گل ہو رہا تھا۔ تب اچانک ہی اس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ طبیعت پر بیزاری چھا گئی تھی۔ دل میں اتنی اداسی ایک دم پھیلی تھی کہ ذی شاہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس ہنگامے سے کہیں دور بھاگ کر چلا جائے۔ آنیہ کی مسکراہٹوں سے لے کر محفل کی دلکشی تک وہ سر تپا... بیزاریت میں لپٹ گیا تھا۔ تبھی کزنز کے جھرمٹ سے نکل کر وہ اندرونی حصے کی طرف آیا تو اس کے پیچھے ہی عینی بھاگتی ہوئی چلی آئی۔

”تم کیوں چلے آئے ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ متفکری برابر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے ذی شاہ کا اتنی بھر پور محفل کو چھوڑ کر آنا پسند نہیں آیا تھا۔ عینی متفکر تھی کہ جانے ذی شاہ کو کون سی بات بری لگی ہے۔ وہ اس کے ادھر آنے کی وجہ معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔ دراصل اسے ماما اور آنیہ نے بھیجا تھا۔ وہ دونوں بھی ذی شاہ کے اچانک اٹھ آنے پر متفکر تھیں۔ خصوصاً آنیہ کو تو اپنی تمام تر تیاری پر کار محسوس ہو رہی تھی۔ جس کے لیے وہ بن سنور کر آئی تھی وہ اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں گھس گیا تھا۔ عینی کو تسلی دیتا وہ سردرد کا بہانہ کر کے سیرھیاں چڑھ رہا تھا جب عینی کی متفکر آواز ایک مرتبہ پھر اس کے پیچھے آئی۔

”تم آرام کرو ذی، میں تمہارے لیے کڑک سی جائے بھجوانی ہوں۔“ عینی اپنا اخلاق اس پر نچھاور کرتی چلی گئی۔ تب ذی شاہ سر جھٹکتا کارڈیڈور میں سے گزر رہا تھا جب آخری سرے پر موجود جالی والے دروازے کے اس پار اسے زر شام اور بندی کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ دونوں نیچے محفل میں بھی نہیں تھے۔ دراصل یہی ایک بے کلی تھی جسے محفل میں محسوس کرتا وہ

خوشیاں دوبارہ واپس لانی تھیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ لانی تھی۔ اسے پھر سے شاد و آباد دیکھنا تھا مگر اس سے بھی پہلے ذی شاہ کو اس بھیا تک رات کی کھوج کے لیے نکلنا تھا۔ آخر اس رات کیا ہوا تھا؟ علی عیسیٰ اور مالا کے درمیان آخر کیا ہوا تھا جو ان کا ہنستا پستا گھر ٹوٹ گیا تھا۔ مالا کس طرح لٹی پٹی واپس آئی تھی؟ اس کی بہن کے ساتھ آخر علی عیسیٰ نے کیا کیا تھا وہ ہنستا بھول گئی تھی۔ وہ بولنا بھول گئی تھی۔ اس کی پیاری سی بہن زندگی جینے کا قرینہ بھول گئی تھی۔

ذی شاہ کو ایک پل صراط سے گزرتا تھا۔ اسے اپنے اور اپنی بہن کے مجرم تک پہنچنا تھا۔ اسے مالا کی خوشیاں دوبارہ لے کر آنی تھیں اور اس کے لیے وہ ہر آزمائش اور ہر حد سے گزر سکتا تھا۔

یہی مرتبہ ذی شاہ کو احساس ہوا تھا کہ مالا کی خاموشی کے ساتھ سمجھوتا کر کے وہ لوگ اس کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں کر رہے۔ وہ محفلوں سے دور تو رہتی تھی اپنے بہن بھائیوں سے بھی دور رہنے لگی تھی۔ ایک الگ تھلگ کونے میں، ایک تنہا گوشے میں غم آنکھیں لیے جانے کس کس تکلیف دہ منظر کو سوچتی رہتی تھی۔ تب پہلی مرتبہ ذی شاہ کے دل کو گہری نہیں پہنچی تھی پھر یہ ٹیس وقتا فوقتاً آتی رہتی۔ مالا کو دیکھ کر اس کا دل کرب کی اتھاہ میں گرنے لگتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا وہ لوگ مالا کے دکھ کی تہہ کو کھوج ہی نہیں سکتے۔ اس کے غم کا بار اٹھا ہی نہیں سکتے۔ اس کے کرب کے ذائقے کو چکھ ہی نہیں سکتے۔ جو مالا اذیت محسوس کرتی تھی اس اذیت کو سمجھنا آسان کہاں تھا۔

☆☆☆

عینی کی ساگرہ والے دن جب اس کے میسے سے سب افراد آئے تھے۔ ذیشان کے کچھ دوست اور ان کی فیملیز بھی تھیں۔ خاندان کے کچھ لوگ بھی مدعو تھے۔ اس دن بڑا رو میٹک ماحول تھا۔ لان میں باربی کیو کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ دھیمادھیمامیوزک ماحول

باتیں ہی مٹھارتا ہے اس کی شکل صورت کیسی ہے؟ کم از کم ایک ادھ تصویر ہی لے آتے۔“ ذیشان نے کافی عقلمندانہ سوال اٹھایا تھا۔ دراصل اپنے بہنوئی کی تصویر تو وہ بھی دیکھنا چاہتا تھا مگر ڈیڈی اتنی شاندار شادی کی تصویروں والے المیز اور مووی ادھر ہی بھول آئے تھے۔ ڈیڈی نے بتایا تھا چاہو نے اپنے اکلوتے بیٹے کی بہت دھوم دھام سے شادی کی تھی۔ پورے من ہائیم کی ہائی جنٹری کو بلوایا تھا۔ بہت شاندار ولیمہ کیا تھا مگر ان خوب صورت لمحات کی فوٹو والا بیگ وہ ادھر ہی بھول آئے تھے پھر اس کے بعد بھی جب جب بندیا کی مالا سے فون پر بات ہوتی تھی۔ وہ علی عیسیٰ کی تصویروں کے لیے اصرار کرتی۔ ادھر مالا حافی بھی بھر لیتی تھی مگر اسے پھر یہ چھوٹا سا کام یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت خوش اور بہت مکن تھی۔ مٹی کے توسط سے مالا کی خوشحال زندگی کا اور اس کے سکھی شاد ہونے کا پتا چلتا رہتا تھا۔ ایک بھائی ہونے کے ناتے مالا کی بھر پور زندگی کا سن کر اس کا دل خوشی کے احساس سے معمور تھا۔ اس کی چھوٹی سی بہن اپنے گھر میں بہت خوش تھی۔ کبھی کبھار ذی شاہ سے بھی مالا کی بات ہو جاتی تھی۔ اس نے ہمیشہ مالا کو خوش اور مسرور ہی محسوس کیا تھا۔ وہ کھلکھلاتے لہجے میں بات کرتی تھی۔ بولتی بعد میں تھی پہلے ہنستی تھی پھر اس ہنستی مسکراتی مالا کو اچانک جانے کیا ہو گیا تھا۔ صرف چھ ماہ بعد ذی شاہ نے اسے اجڑی حالت میں حال سے بے حال دیکھا تھا۔ یوں کہ وہ کسی سے کلام نہیں کر رہی تھی۔ تاہم اس نے ایک بھیا تک رات کا ذکر ضرور کیا تھا۔ اس بھیا تک رات کیا ہوا تھا؟ یہ سب مالا نے نہیں بتایا تھا۔ وہ بہت کچھ بتائے بغیر خاموشی کی بکل مارے سر نیہوڑائے رہتی۔ پچھلے تین سال سے وہ لوگ مالا کی خاموشی کے ساتھ سمجھوتا کر رہے تھے مگر اب ذی شاہ کے ضبط کی طنائیں چھوٹ گئی تھیں۔ اسے اپنی بہن کی

جانے کا سن کر ذی شاہ کو بہت حیرت ہوئی تھی مگر وہ ڈیڈی سے سوال جواب نہیں کر سکا تھا۔ ڈیڈی نے اسے خود ہی بتا دیا تھا۔ وہ مالا کی شادی کرنے جرمی جا رہے تھے اور حسیب چاچو اپنی بہو لینے پاکستان آئے تھے۔ ڈیڈی کو بھلا وہ تینوں بھائی کیسے روکتے! ڈیڈی خود گھر کے سربراہ تھے، مالا کے باپ تھے اور اس کے لیے بہترین ہی سوچ سکتے تھے حالانکہ یہ عجیب سی شادی ذی شاہ کے اندر کہیں وسوسے ضرور جگا گئی تھی۔ اس کی معصوم سی، کچھ کچھ دبو، تھوڑی تھوڑی ڈرپوک بہن کو نکاح کے بعد ڈیڈی جرمی چھوڑ کر خود پاکستان خوش باش لوٹ آئے تھے۔ تب ڈیڈی کی آنکھوں میں مسرت کے دیے روشن تھے۔ گویا وہ مالا کو محفوظ ہاتھوں میں تھا کر خود ہر شہار تھے اور ان کے چہرے پر ایسی چمک تھی جو ایک بیٹی کے باپ کو اپنی بیٹی کے مستقبل کو محفوظ دیکھ کر مسرور کے رکھتی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی سسرال سے بھی خوب مطمئن تھے۔ چاچو کی جرمن بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بیٹا تھا، ایک بیٹی تھی البتہ ڈیڈی کے منہ سے چاچو کی بیٹی کا ذکر کم کم ہی سنا گیا تھا تاہم علی عیسیٰ کے تو ڈیڈی دیوانے بن کر آئے تھے۔ اس کی تعریفوں کے لیے انہیں الفاظ نہیں ملتے تھے۔ وہ ایسے چلتا ہے، وہ اتنا بیٹھا بولتا ہے۔ وہ اتنا بااخلاق ہے۔ اس کا مزاج ایسا ہے۔ ڈیڈی کے لیے اپنے بھتیجے کی تعریفوں کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ یقیناً حسیب چاچو پاکستان آئے ہی اس مقصد کے لیے تھے کچھ انہوں نے خود اپنے بیٹے کی تعریفیں کر کے ڈیڈی کو قائل کر رکھا تھا اور کچھ وہ خود اپنے داماد اور بھتیجے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے تھے۔ ڈیڈی کو یہاں آ کر رہ رہ کر افسوس ہوتا تھا کہ حسیب چاچو نے کیسے ہیرے سے بیٹے کو ان لوگوں سے دور کر رکھا تھا۔ ڈیڈی سے اتنی تعریفیں سن کر ذیشان نے مذاقاً کہا تھا۔

”ڈیڈی وہ صرف بیٹھا بولتا، اخلاق جھاڑتا اور



اچانک اٹھ آیا تھا۔ اس کے بہن بھائی وہاں موجود نہیں تھے سوا سے محفل میں جان اور رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس مئی وہاں مارے باندھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ سوچتا ہوا جالی کا دروازہ کھول کر میز پر نکل آیا تھا۔ تب اسے دیکھ کر بندیا اور شامی کچھ متحیر رہ گئے تھے۔

”تم یہاں.....؟“ یقیناً وہ دونوں بھی حیران تھے کہ ذی شاہ اتنی بھر پور محفل کیسے اور کس طرح چھوڑ آیا تھا۔ ان کی حیرت بجا تھی۔ ذی شاہ کو تو جان محفل سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کی پارٹیز کے پلان ذی شاہ کے لیے تو بنائے جاتے تھے۔ وہ کوئی بھی پارٹی، فنکشن، چھوڑتا ہی کہاں تھا پھر اس وقت اپنے ہی گھریلو فنکشن کو چھوڑ کر اس کا اوپر آنا دونوں کو حیران کر گیا تھا۔

”ہاں میں یہاں..... کیا میں تم لوگوں کے پاس نہیں آ سکتا؟ یہاں بیٹھ نہیں سکتا؟“ اس کی نظریں گم صم بیٹھی مالا کے ویران چہرے پر جمی تھیں جو دنیا بھلائے ریٹنگ کی درزوں میں سے کھلکھلاتی عینی کو دیکھ رہی تھی جو ذیشان کے کندھے پر جھکی جانے اس کے کان میں کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ اس نے اپنے اندر بیٹھی سی اٹھتی محسوس کی تھی۔ اس نے مالا کے چہرے پر حسرت جھلکتی دیکھی تھی۔ اس نے مالا کے چہرے پر عجیب سا کرب دیکھا تھا گویا لان کا منظر اسے ماضی کا کوئی حسین لمحہ یاد دلا گیا تھا۔ مالا کو دیکھ کر ان دنوں اس پر یاسیت کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ذی شاہ کو دنیا کی ہر خوب صورتی اپنی بہن کے کرب میں ڈوبی نظر آتی تھی۔ اسے لگتا تھا، مالا کا غم اسے پکھلا کر رکھ دے گا۔ شاید یہی بے کلی، اذیت اور بے چینی تھی جو اسے اٹھا کر اپنے بہن بھائیوں کے درمیان لے آئی تھی۔ وہ اپنے بھائی اور دونوں بہنوں کو برس کر رہا تھا اور مالا کی یہی نظریں لان میں بھی اسے مضطرب کر رہی تھیں۔

اس کی نظروں کا ارتکاز بھی مالا کو اس کی طرف

متوجہ نہیں کر پایا تھا۔ تب ذی شاہ کے اندر نہ جانے کیسا سکوت اتر آیا تھا۔ اسی سکوت اور اضطراب کو جھٹکتے ہوئے اس نے شامی کو مخاطب کیا تھا۔

”تم نیچے کیوں نہیں آئے؟“ وہ مالا کے برابر بیٹھ گیا تھا اور اس کی نظریں بھی مالا کے چہرے پر تھیں جو ابھی تک لان کے اسی جگمگاتے گوشے پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی جسے تابناکی عینی کے حسن نے بخش رکھی تھی۔ ذی شاہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ اس کی چھوٹی سی بہن جانے کس کس اذیت سے صبح شام گزرتی تھی۔ وہ جو مالا کے بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا شامی کے کھیلے سے لہجے پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں خود غرض لوگوں کی محفلوں کو پسند نہیں کرتا۔“ شامی بہت زہریلے لہجے میں بول رہا تھا۔ یقیناً بندیا نے اسے عینی اور اپنی تمام تر جھڑپوں کے بارے بتا دیا تھا۔ وہ بندیا کے ساتھ بیٹھ کر گھریلو سیاست پر روشنی ڈال لینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا تھا۔ ابھی اس کے پاس وقت تھا۔ وہ مئی اور بندیا کو بہت ٹائم دیتا تھا مگر چند ماہ تک اس کے فائل ایگزامز ہونے والے تھے۔ بعد میں اسے عملی زندگی میں قدم رکھنا تھا پھر وہ بھی ذیشان اور... ذی شاہ کی طرح مصروف ہو جانے والا تھا اور اس کی مصروفیت کے ساتھ ہی وقت کی قلت کا مسئلہ شروع ہو جاتا تھا پھر وہ اپنی بہنوں کے لیے وقت نکال نہیں پائے گا۔ یہ بات شامی نہیں جانتا تھا مگر ذی شاہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔ بندیا کو پھر شامی سے بھی بہت شکوے ہو سکتے تھے مگر بندیا کے لیے کڑھنے جلنے کے علاوہ اور بھی مصروفیات تھیں۔ ایک آدھ سال تک اس کی شادی ہو جانی۔ اس کے بعد مالا کتنی تنہا ہو سکتی تھی، ابھی تو بندیا سے گھسیٹ کر باہر لے آئی تھی مگر پھر بھلا مالا کا کون خیال رکھتا۔ کون اسے باہر گھسیٹ کر لاتا، کون اسے توجہ دیتا؟

ان تمام سوچوں نے ذی شاہ کو کتنا بے کل کر دیا تھا۔

اس نے اپنی تمام تر مصروفیات پس پشت ڈال دی تھیں۔ دراصل ڈیڈی کے بعد اس پر ڈہری ڈنٹے داریاں آپڑی تھیں۔ اسے گھر اور آفس دونوں کو توجہ دینا ان کے ڈیڈی ذوالفقار احمد کا ذاتی بزنس تھا۔ ان کا شمار اچھے سرمایہ داروں میں ہوتا تھا اور انہوں نے اپنی محنت کے بل بوتے پر اپنی فرم کی ایک اچھی ساکھ بنائی تھی۔

ڈیڈی اور چاچو بس دو ہی بھائی تھے۔ حبیب احمد تعلیم کی غرض سے جرمنی گئے تھے پھر عمر بھر کے لیے وہیں رہ گئے۔ انہوں نے شادی بھی وہیں کی پھر بائیس تیس سال تک واپس پلٹنے کا نام نہیں لیا تھا۔ حبیب احمد کے صرف دو ہی بچے تھے جنہیں محض نام کی حد تک یہ لوگ جانتے تھے۔ علی عیسیٰ اور اس سے چھوٹی مون۔ اکثر ڈیڈی ہی ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ انہیں علی عیسیٰ سے خصوصی محبت ہو گئی تھی۔

ذوالفقار احمد پر اولاد اور دولت کے حوالے سے قدرت بہت مہربان رہی تھی۔ اللہ نے انہیں پانچ بچوں سے نوازا تھا۔ ذیشان، ذی شاہ اور زر شام کے بعد مالا اور بندیا تھیں۔ ان کے بچے بہت لائق، ذہین اور خوب صورت تھے۔ تعلیم کے میدان میں ہمیشہ آگے آگے رہے۔ اپنی اولاد میں انہیں سب سے زیادہ ذی شاہ اور مالا سے محبت تھی۔ ذی شاہ تو زیادہ تر بورڈنگ میں رہا تھا تاہم مالا ان کے بہت قریب تھی۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا اور ماں نے اسے گھریلو امور میں بھی طاق کر رکھا تھا۔ وہ بہت سلیبھی ہوئی، نرم مزاج، موم میں ڈھلی لڑکی تھی۔ بھی جب باپ نے اپنے بچے سے رشتہ طے کر دیا تو چپکے چپکے باپ کے بن دیکھے بچے سے عشق کرنے لگی۔ اس نے علی عیسیٰ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی نہ باپ کے فیصلے پر اعتراض کرنے کی۔ باپ نے جیسا کہا جو کہا اس پر سر جھکا دیا۔ انٹر سے پہلے اس کی شادی کر دی گئی تھی اور وہ اپنی زندگی کے اس حسین موڑ پر

### غزل

قصہ ابھی حجاب سے آگے نہیں بڑھا  
میں آپ، وہ جناب سے آگے نہیں بڑھا  
مدت ہوئی کتابِ محبت شروع کیے  
لیکن میں پہلے باب سے آگے نہیں بڑھا  
لمبی مسافتیں ہیں مگر اس سوار کا  
پاؤں ابھی رکاب سے آگے نہیں بڑھا  
لوگوں نے سنگ و خشت کے قلعے بنا لیے  
اپنا محل تو خواب سے آگے نہیں بڑھا  
طولِ کلام کے لیے میں نے کیے سوال بہت  
وہ مختصر جواب سے آگے نہیں بڑھا  
مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں ضلع قصور

پوری طرح خوش بھی نہیں ہوئی تھی جب زندگی نے اس کے ساتھ اتنا بھیا تک مذاق کر دیا۔

دراصل مالا کے اجڑنے کی خبر نے سب سے زیادہ ذی شاہ کو شاکڈ کیا تھا۔ ابھی وہ مالا کے دکھ پر ہی متحیر تھا جب اچانک ڈیڈی بھی چل بے تھے مگر ڈیڈی کے مرنے اور مالا کے اجڑنے سے پہلے جرمنی میں مقیم ان کے اکلوتے چاچو بھی تو فوت ہو گئے تھے۔ اگر ذی شاہ زیادہ غور کرتا تو اسے لگتا کہ چاچو کی وفات کے فوراً بعد مالا کی زندگی طوفان اور آندھیوں کی زد میں چلی گئی تھی۔ جب تک چاچو زندہ رہے تھے تب تک سب کچھ ٹھیک تھا تو پھر جو کچھ بھی ہوا تھا چاچو کی وفات کے بعد ہوا تھا اور علی عیسیٰ ان لوگوں کے اصرار پر بھی چاچو کی ڈیڈی باڈی پاکستان نہیں لے کر آیا تھا۔ بقول اس کے پاپا کی وصیت تھی ان کو ماما کے ساتھ دفنایا جائے۔ یہ بات اس نے ڈیڈی کو فون پر بتائی تھی۔ علی عیسیٰ سے ان لوگوں کی تو کبھی فون پر بھی بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اکثر ڈیڈی کو کال کیا کرتا



تھا۔ چاچو کی فونگی اور تدفین کا بتانے کے بعد پھر علی عیسیٰ کی کوئی اور کال نہیں آئی تھی۔ مالا بتاتی تھی وہ بہت اپ سیٹ ہے۔ چاچو کی موت کے صدے کو بھلا نہیں پارہا۔ مالا سے باقاعدگی کے ساتھ می اور بندیا کی بات ہوا کرتی تھی۔ وہ علی عیسیٰ کے لیے بہت پریشان تھی۔

پھر کچھ ہی مہینے گزرے تھے کہ مالا اجڑ کر واپس وطن لوٹ آئی۔ یہ صدمہ بہت اذیت ناک تھا۔ مالا کے اجڑنے کا دکھ ایک طرف..... ڈیڈی اس نم کے بوجھ تلے دب کر ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے انہیں چھوڑ گئے تھے۔ مالا بیمار تھی، می بچھ کر رہ گئی تھیں۔ بندیا پہلے سے زیادہ تلخ ہو گئی تھی۔ زر شام کم کم گھر آنے لگا تھا گھر کا سوگوار ماحول ذی شاہ کے اندر بھی جس بھر دینا تھا۔ سوا اس نے بھی مصروفیات میں پناہ ڈھونڈ لی تھی اور وہ بے چاری بے بس سی سر جھکا کر آنسو بہانے لگتی۔ وہ آنسو بہانے کے علاوہ کچھ اور کر بھی تو نہیں سکتی تھی جبکہ ذی شاہ کو اب مالا کے آنسو ہی تو خشک کرنے تھے۔ اس کے چہرے پر پھیلی بے بسی کو ختم کرنا تھا۔ مالا کے چہرے پر مسکراہٹ سجانا تھی اور اس کام کے سلسلے میں وہ کچھ عملی قسم کے اقدام کرنے والا تھا۔

اس نے اپنے دن بھر کے شیڈول میں کچھ خاص اوقات مقرر کر لیے تھے۔ اسے ان اوقات میں مالا کو بھر پور وقت دینا تھا۔ اسے گھمانے لے جانا، ہونٹنگ، شاپنگ اور کچھ ہلا گلا..... وہ اس کی زندگی پر چھائے جمود کو توڑنے کا بھر پور ارادہ رکھتا تھا۔ مگر فی الحال اسے شامی اور بندیا کی بدگمانی دور کرنا تھی جو یقیناً اسے بھی ذیشان کی طرح کچھ کچھ... خود غرض سمجھتے تھے۔ فی الوقت کچھ تلخ سوچوں کو جھٹک کر وہ شامی اور بندیا کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”تم ذیشان سے اتنے بدگمان کیوں ہو.....؟“ اس نے براہ راست شامی کو مخاطب کیا تھا

جو نیچے سے منکوائے گئے تیخ کباب مالا کو پکڑا تا گھوم کر ذی شاہ کی طرف دیکھنے لگا تھا پھر اس کی بات سمجھ کر استہزائیہ انداز میں بولا۔

”اس لیے کہ ذیشان انتہائی سیلفش ہے، ہمیشہ اپنے بارے میں سوچتا ہے، اسے ماں اور بہنوں کی کوئی فکر نہیں۔“ شامی کی آواز میں ذرا غصہ اور عجیب سا دکھ بھی ہلکورے لے رہا تھا۔ بندیا بھی سر جھکائے یقیناً شامی کے بولے گئے الفاظ کی تائید کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ان دونوں کو بغور دیکھتا رہا تھا پھر سر جھٹک کر شامی کی بات کا جواب دینے لگا۔

”ذیشان سیلفش کیسے ہے.....؟ اگر وہ... خود غرض ہے تو مجھے کیوں نہیں لگتا۔“ اس کے جواب میں بھی ایک سوال تھا اور ذی شاہ کا سوال خاصا تیکھا تھا۔ بھی شامی بھی قدرے چبھتے لہجے میں ذرا بھڑک کر کہنے لگا۔

”تم ذیشان کے ہاتھ نہیں لگے ابھی..... دراصل اس میں ذیشان کا بھی قصور نہیں..... ماموں کی ساری فیملی کا اس پر اثر ہے اور چونکہ ماموں کی فیملی پر خود غرضی ختم ہے سو ذیشان پر بھی ان کا اثر پڑ چکا ہے اور ویسے بھی اپنی خوب صورت بیوی کے ناز اٹھانے کے ساتھ ساتھ اسے عینی بھابی کی زبان میں گفتگو کرنا پسند ہے اور عنقریب تمہیں بھی ذیشان کے ہاتھ لگنے والے ہیں۔ بھی کہہ رہا ہوں، ذرا بچ کر رہنا۔“ شامی کا انداز آخر میں معنی خیز ہو گیا تھا۔ تب ہی ذی شاہ کچھ الجھ گیا۔ اس کی پوری بات سمجھ لینے کے باوجود شامی کے آخری الفاظ اسے کچھ ٹھنکا گئے تھے۔

”میں بچ کر رہوں؟ مگر کیوں.....؟ ذیشان کے کیا ارادے ہیں کہ جن سے میں بے خبر ہوں؟“ ذی شاہ نے حیرت سے پوچھا۔ وہ تیخ کباب کی پلیٹ واپس رکھ کے کچھ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اسے شامی کے معنی خیز انداز چونکا رہے تھے۔ اسی طرح بندیا بھی کچھ کچھ بے چین بیٹھی تھی گویا ذی شاہ

”یعنی کی ایسی مجال، میری مرضی کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔“ ذی شاہ نے غصے سے کہا تھا فی الحال تو وہ اپنے بارے میں ایسا کچھ سوچنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا..... اسے سب سے پہلے مالا کے لیے سوچنا تھا پھر بندیا کی شادی کے بعد ہی وہ اپنے لیے کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے اپنی زندگی کے لیے وہ قطعاً کسی خوشگوار ریت کے متعلق نہیں سوچ سکتا تھا۔

”اب اپنی باتوں اور لفظوں کی لاج رکھ لینا۔ یہ نہ ہو ذیشان تمہیں مجبور کرے اور تم سہرا سجانے پر تیار ہو جاؤ۔“ شامی نے ذرا متکرب و لہجے میں یقین دہانی چاہی تھی۔ وہ اپنے خدشات ڈھکے چھپے لفظوں میں ذی شاہ پر ظاہر کر چکا تھا۔ تب ذی شاہ نے خاصی ناگواری بھرے لہجے میں وضاحت کی تھی۔

”میں تو نادان سا بچہ ہوں ناں..... ذیشان میرے ہاتھ میں لولی پاپ پکڑا کر اپنی مرضی سے مجھے استعمال کر لے گا جیسے.....“ وہ چڑ کر خفگی سے بولا تھا تب بندیا اور شامی کے دلوں میں ڈھیروں چین اتر آیا..... وہ ذی شاہ سے ایسی ہی دلیری کی امید رکھتے تھے..... اب چونکہ ان دونوں کی تسلی ہو چکی تھی سو وہ دونوں چین کی بانسری بجا سکتے تھے۔

”مجھے تم سے ایسی ہی بہادری کی امید تھی.....“ شامی اس کا کندھا تھپک کر دلا رہے بولا۔

”میں سرحد پر لڑنے جا رہا ہوں کیا.....؟“ اس کی بات سمجھ کر ذی شاہ ذرا مسکرا کر ماحول کا تناؤ کم کر رہا تھا مگر ساتھ ساتھ اسے ذیشان کی سوچ پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔ وہ بالا ہی بالا اس کی مرضی، پسند اور خواہش جانے بغیر کیسے اس کی زندگی کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا..... اگرچہ آئیہ خوب صورت تھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا ذی شاہ اس سے بغیر اپنی می کی مرضی جانے منگنی یا شادی کر لیتا..... اسے شادی تو کرنا تھی مگر آئیہ سے ہرگز نہیں..... وہ لاکھ گھر کے معاملات سے بے نیاز رہتا

سے اسی موضوع پر بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

”وہ تمہاری منگنی اپنی سالی سے کروانا چاہتا ہے اور تم ایسے انجان ہو گویا کچھ اتا پتا نہیں۔“ شامی نے کلس کر کنگڑا لگایا تھا۔ وہ اپنے اندر کی کھولن نکال رہا تھا۔ یقیناً ذیشان کے اس خیال اور سوچ نے بندیا اور شامی دونوں کو تپا رکھا تھا..... اور وہ دونوں ہی... ذی شاہ سے اپنی کھولن بیان کرنا چاہتے تھے۔

”ارے..... کیا سچ.....؟“ ان کی توقع کے عین مطابق ذی شاہ کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ گویا ذیشان کے نیک ارادوں کی بھٹک ابھی تک اس کے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔

”لو جی..... یہاں تو کمال کی بے خبری ہے۔“ شامی کلس کر پہلو بدل گیا۔ اب کہ بندیا بھی لب کشائی کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

”یعنی بھابی کی بھر پور کوشش ہے وہ آئیہ کو ہمارے سروں پر ضرور مسلط کر کے رہیں گی۔“ اس کو اپنے دکھ یاد آ رہے تھے۔ وہ جانتی تھی یعنی بھابی کی کوششیں اگر رنگ لے آئیں تو اس گھر میں سانس لینا بھی محال ہو جائے گا۔ وہ دونوں ذی شاہ کو نہ صرف خبردار کرنا چاہتے تھے بلکہ اسے آئیہ سے منگنی رکوانے پر مجبور بھی کرنا چاہتے تھے۔

”یہ بھلا ممکن ہے، آئیہ کے بارے میں ایسا ہرگز میں نے کبھی نہیں سوچا.....“ ذی شاہ کے الفاظ جہاں شامی اور بندیا کو مطمئن کر چکے تھے وہیں اندر کی کچھ کچھ بے چینی انہیں مزید بولنے پر بھی اکسار ہی تھی۔

”تم نہ بھی سوچو تو یعنی بھابی زبردستی تمہیں آئیہ کو سوچنے اور آئیہ کے لیے سوچنے پر مجبور کر دیں گی۔“ شامی نے جل بھن کر کہا تھا۔ وہ جو کچھ اسے سمجھانا یا بتانا چاہتے تھے، بتا چکے تھے۔ ذی شاہ کو الٹ تو کر دیا گیا تھا اب وہ خود ہی اپنی جنگ لڑ سکتا تھا اور ان دونوں کے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ ذی شاہ کے دل میں آئیہ کے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا۔



تھا مگر وہ اتنا ضرور جانتا تھا یعنی اچھی بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ نہ اچھی بہو ہے نہ بھابی ہے۔ اس کی بہنوں کے ساتھ تو یعنی کا رویہ بہت چٹک آمیز ہوتا تھا۔ مگر یا بندیا سے کچھ نہیں بتاتی تھیں اس کے باوجود وہ یعنی کے مزاج کو سمجھ گیا تھا پھر یعنی کی بہن کو بھلا اس گھر میں کیسے لے آتا؟ ویسے بھی وہ مالا اور بندیا کے بارے میں بہت حساس ہو رہا تھا اور ان دونوں سے پہلے اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ذیشان اور یعنی بھابی سے ٹکر لینا آسان نہیں..... سمجھو تو اس گھر میں نیا محاذ کھلنے والا ہے۔“ شامی نے معنی خیزی سے آنکھیں پٹی پٹی تھیں۔ تب ذی شاہ نے چھوٹے بھائی کو بھرپور سلی دینے والے انداز میں مسکرا کر بڑے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔

”اور مجھے محاذوں پر لڑنا اور فتح پانا آتا ہے، تم بالکل فکر نہ کرو، میں یعنی بھابی جیسی ایک خوب صورت بلا کو اپنی پیاری بہنوں کے سروں پر مسلط ہرگز نہیں کروں گا۔“ اس نے شرارتی انداز میں بندیا کو چھیڑا تھا۔ وہ دونوں ہی کچھ چھینپ کر نہیں پڑے تھے ذی شاہ

.... قدرے پرسکون ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بھائی اور بہن کے دل سے بدگمانی کو دور کر چکا تھا۔ وہ انہیں یقین دلا چکا تھا کہ وہ ذیشان کی طرح خود غرض نہیں..... نہ وہ کبھی انہیں چھوڑنے کی کوشش کرے گا۔ اس خوب صورت تاروں سے ڈھکی رات میں

ان تینوں کے درمیان اعتماد، اعتبار اور خلوص کی اک نئی فضا قائم ہوئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے اب بالکل کھل کر ہر بات ڈسکس کرنے لگے تھے۔ مالا کی تکلیف اور دکھوں سے لے کر یعنی کی سازشوں تک ایک، ایک بات تینوں کے درمیان شیئر ہونے لگی تھی۔ مالا چونکہ ان باتوں میں حصہ نہیں لیتی تھی تاہم ذی شاہ زبردستی اسے کھینچ کھینچ کر باہر لے آتا تھا۔

بندیا کو بھرپور سلی مل چکی تھی۔ اب آنیہ نام کا عفریت ان کو چھیننے والا نہیں تھا..... مگر وہ لوگ یہ نہیں جانتے

تھے۔ ذی شاہ کا انکار کس طرح ان کے گھر کی دیواروں کو ہلا گیا تھا۔ رشتوں میں کتنی بڑی بڑی بدنامی درازیں پڑ گئی تھیں تاہم ذی شاہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی نہیں ہٹا تھا۔ وہ ثابت قدم مضبوط اور مستحکم رہا تھا۔ وہ ذیشان کی بے جا ضد کے سامنے جھکا ہرگز نہیں تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے رشتوں کی قربانیاں ضرور دینی پڑی تھیں۔

☆☆☆

ان دنوں وہ آفس سے جلدی اٹھ آتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت مالا کے ساتھ گزرتا تھا۔ وہ مالا کو بہت ٹائم دینے کی کوشش کرتا تھا۔ مالا کے لیے رنگ رنگ کے رسائل لے آتا۔ خوب صورت میگزین اور اخباروں کے ڈھیر لگا دیتا۔ اسے باقاعدگی سے واک پر لے جاتا۔ کبھی لانگ ڈرائیو کا پروگرام بنا لیتا.....

کبھی شاپنگ کا اور کبھی بلا وجہ ہی سڑکوں پر نکل جاتا۔ اکثر بندیا بھی ان کے ہمراہ جاتی تھی۔ وہ بھی ان دنوں بھابی کی توجہ پا کر بہت خوش تھی اور مئی ان کو خوش دیکھ کر خوش ہوتی رہتی تھیں۔

ذی شاہ کی یہ نئی روٹین یعنی کے لیے سخت تکلیف دہ تھی۔ وہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو ذی شاہ مصروفیت کا بہانہ بنا دیتا۔ اسے مالا کے ناز اٹھانے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ یعنی کو یہ صورت حال دیکھ کر خفقان ہونے لگا تھا مگر وہ...

ذی شاہ کو روک بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی بہنوں کے ساتھ وقت گزارتا تھا یعنی اسے کس بل بوتے پر روکتی یا منع کرتی؟ پھر وہ اس کے کہنے میں آنے والا بھی نہیں تھا۔ ان دنوں یعنی سے خاصا اکھڑا اکھڑا ہوتا تھا۔ یہ حالات یعنی کے لیے خاصے تشویش ناک تھے۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے ذی شاہ کے گرد پرانا حصار قائم کرنا چاہتی تھی اور خوش قسمتی سے اسے موقع بھی مل گیا۔

اس دن بھی صبح، صبح وہ میز پر ذی شاہ کے لیے ناشتا سجا کر بڑی لگاؤ سے بولی تھی۔

## تذکرہ وفا

بہن کے لیے اس کے پاس وقت ہی وقت تھا اور یعنی کے لیے پندرہ بیس منٹ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی کو اتنا غیظ چڑھا کہ اس نے غصے میں دو تین گلاس توڑ ڈالے تھے۔ کالج کے گلاس ٹوٹنے کی آواز سن کر مئی اور بندیا دوڑی دوڑی آئی تھیں۔ ان کے پیچھے ہراساں سی مالا بھی کھڑی تھی جو یعنی کے غضبناک تیور دیکھ کر تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کا چڑیا جتنا دل لڑائی جھگڑے سے بہت سہم جاتا تھا مگر یہاں مالا کے خوف کی بھلا کے پروا تھی۔ یعنی کی تیوری چڑھی دیکھ کر مئی نے ہی لب کشائی کی کوشش کی تھی۔ دوسرے معنوں میں بھڑوں کے چھتے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ان کے استفسار کرنے پر یعنی چیخ پڑی۔

”یہ سب کیا دھرا آپ کا ہے، میری زندگی سے آپ سب نے سکون ختم کر دیا ہے۔ تم تینوں میری جان کو چھٹی ہوئی ہو..... اس گھر میں میری سانس بند ہونے لگی ہے۔“ وہ لال بھسوکا چہرہ لیے آنسو بھی... برسا رہی تھی۔ جانے اسے اچانک ہوا کیا تھا۔ مئی سمیت بندیا بھی حواس باختہ ہو گئی۔ تاہم یعنی کے الفاظ نے اسے اور بھی بھڑکا دیا تھا۔

”اس گھر میں آپ کی سانس بند ہوتی ہے تو چلی جائیں یہاں سے۔ شوہر سے کہیں آپ کو الگ گھر دے دے..... وہ تو ویسے بھی آپ کی ہر بات پر آنکھیں بند کیے عمل کیے جاتا ہے۔“ بندیا نے بے دھڑک جواب دے کر یعنی کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ مئی اسے برابر چپ رہنے کا اشارہ کر رہی تھیں مگر وہ بندیا ہی کیا جو چپ کر جاتی۔

”میں کیوں نکلوں یہاں سے، تم ماں بیٹیاں تو چاہتی یہی ہو، ذیشان مجھے چھوڑ دے۔ گھر سے نکال دے۔“ بندیا کی بات کو الٹ انداز میں لیتی یعنی نے بھلا بھلا کر کے رونا شروع کر دیا تھا۔ جانے یہ کیسی کھولن تھی جسے وہ بندیا پر نکال رہی تھی۔

”ہم کیوں ایسا چاہیں گے، اپنے جیسا.....

”ذی! مجھے ماما کی طرف تولے جاؤ، بہت دن سے چکر نہیں لگا۔“ وہ ملک ہیک کا جگ اس کے سامنے رکھ کر بڑی مصروف نظر آ رہی تھی۔ گویا اس گھر کے ڈھیروں کاموں میں الجھ کر اسے میکے جانے کا وقت نہیں مل پاتا تھا۔ اور آج اس نے بڑی مشکلوں سے وقت نکالا تھا۔ بظاہر وہ کچھ ایسا ہی جتانے پر تلی ہوئی تھی مگر چونکہ غیر محسوس انداز میں یعنی کی اصلیت اس پر کھل چکی تھی سو اب وہ اس کی شیریں بیانی کے جال میں نہیں پھنس سکتا تھا۔

”آئی ایم سوری..... یعنی بھابی.....! آپ ذیشان کے ساتھ ہی چلی جاتیں..... میرے پاس اتنا وقت نہیں..... میں آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں۔ مائنڈ مت کیجیے گا، شام کو وقت ہوا تو سوچوں گا۔

ویسے میرے لارے پر مت ریے گا۔ گاڑی اور ڈرائیو آفس پہنچ کر بھیج دوں گا۔ ٹھیک ہے نا..... آرام سے جائیں، آرام سے آئیں۔“ وہ بھی جواباً شیریں بیانی دکھاتا اخبار ایک طرف رکھ کر ملک ہیک

بے کے بعد کوٹ اور جا بیاں اٹھاتا غلٹ میں باہر نکل گیا تھا اور یعنی گویا پتھر کا مجسمہ بن گئی تھی۔ آج سے پہلے کب ذی شاہ نے اسے میکے لے جانے اور واپس لانے کی ڈیوٹی سے انکار کیا تھا پھر اب اسے کیا ہوا تھا؟ وہ کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا تھا۔ یقیناً ہاتھوں سے نکلنے والا تھا۔ یعنی کے آس پاس خطرے کے الارم بج رہے تھے۔ اسے سو فیصد یقین تھا ذی شاہ کے کان مئی اور بندیا نے بھرے ہیں۔ اسے اپنی دانست میں

مکار پھوپھی جو اس کی سانس بھی تھیں پر سخت تاؤ چڑھ رہا تھا اور پھر بندیا جیسی کتنی نند کی گردن مروڑنے کو بھی دل جا رہا تھا۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ آنیہ کو اس گھر میں لانے کا خواب ادھورا ہی رہے گا..... کبھی تعبیر نہیں پائے گا۔

ذی شاہ کے گورے جواب نے اسے دھچکا پہنچایا تھا۔ اپنی صدموں کی ماری..... اجڑی، ویران



خود غرض مت سمجھو ہمیں..... اپنے بھائی کا گھر ہم کیوں برباد کرنے کا سوچیں گے۔“ بندیا کے کھرے جواب نے ایک مرتبہ پھر یعنی کولا جواب کر دیا تھا۔ وہ بندیا کا منہ توڑ دینا چاہتی تھی مگر بے بس اتنی تھی کہ اپنی جگہ سے اٹل نہیں پارہی تھی۔

”بہت مکار ہوتی ماں بیٹیاں..... شامی اور ذی کے کان بھر رکھے ہیں میرے خلاف، ذیشان آتے ہیں تو انہیں بتاتی ہوں۔“ جب کچھ اور نہ سوچھا تو وہ اوجھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی تھی۔ بندیا اس کی بکواس پر اور بھی سیخ یا ہو گئی تھی۔

”جھوٹی تو آپ خود ہیں یعنی بھابی.....! جو مرضی کہہ دیں ذیشان بھائی سے..... میں نہیں ڈرتی ورتی.....“ اس نے حلق پھاڑ کر ایک مرتبہ پھر یعنی کولا جواب کر دیا تھا۔ یعنی بندیا کے اطوار نے اسے متوحش کر دیا تھا۔ آج تو وہ اس کی کسی بات کو خاطر میں نہیں لارہی تھی۔ پہلے کی طرح ڈرنے، دیکھنے کے بجائے مقابلے پر اتر آئی تھی۔ یعنی کامنہ کچھ اور کھل گیا تھا۔ یقیناً ذی شاہ اور شامی کی سپورٹ پا کر وہ اتنی بہادر اور منہ پھٹ بنی ہوئی تھی کہ یعنی کواک ایک مرتبہ پھر ذی شاہ پر بھی تاؤ آ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ذی کی سپورٹ نے بندیا کو اتنا دلیر کر رکھا ہے۔

”میں تم تینوں کو گھر سے نکلوا دوں گی۔“ یعنی کی آخری حد بس یہیں تک تھی۔ وہ فوراً اپنی اوقات پر اتر آتیں۔ ہمیشہ لڑائی میں اختتام تک آتے، آتے، آتے وہ آخری ہتھکنڈا ضرور استعمال کرتی تھیں۔ اپنے تئیں یعنی نے بندیا کا منہ بند کر دیا تھا مگر بندیا کا منہ بھلا بند ہو سکتا تھا۔ اس کے جواب نے یعنی کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔

”یعنی بھابی! سنہال کر رکھیں اپنی گندی زبان کو... اور اتنی اونچی اڑان بھی مت بھریں کہ واپس آنے میں دشواری ہو..... ہمیں آپ کس برتے پر نکالیں گی۔ اس گھر میں ذی شاہ بھائی اور شامی کا بھی حصہ ہے۔ ہم

آپ کے گھر میں نہیں رہتے..... ڈیڈی کے بعد اپنے بھائیوں کے گھر میں رہتے ہیں۔ ڈیڈی کے بزنس میں بھی شاہ بھائی اور شامی برابر کے حصے دار ہیں۔ ہم آپ کے شوہر کی خیرات نہیں کھاتے۔ آئندہ سوچ سمجھ کر بولیے گا۔ میں ذی شاہ بھائی کو آپ کی بکواس کا سلیس ترجمہ سنا دوں گی۔“ بندیا کے مفصل جواب نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ بندیا جیسی ڈر پوک اور دبولڑکی کے سامنے لاجواب ہونا پڑے گا۔ مارے اہانت اور غضب کے وہ لال انگارہ ہو گئی تھی۔ بندیا کی بک بک نے اس کا فشار خون بلند کر دیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ لے ہاتھ کے دوچار اس کے منہ پر لگا دے مگر یہ سب وہ محض سوچ سکتی تھی اس پر عمل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جو اپنی بھڑاس نکالنا چاہتی تھی مزید منہ کی کھا کر غضبناک ہو گئی تھی۔ اسے بندیا کو کرارا سا جواب دینا تھا۔ جسے سن کر اسے آگ لگ جاتی۔ کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد دروازے سے چپکی تھر تھر کا پتی مالا کو دیکھ کر اس نے انتہائی زہر میں بچھے الفاظ منہ سے باہر نکالے تھے۔

”بہت لمبی زبان ہے تمہاری..... سسرال جاؤ گی تو کاٹ کر ہاتھ میں پکڑا دیں گے۔ پھر یاد رکھنا، تمہارا انجام بھی مالا سے الگ نہ ہوگا۔ اس کی طرح اجڑ کر ہمارے سروں پر سوار ہو جاؤ گی۔“ یعنی اپنی کہی زہریلی باتوں سے ٹھیک طرح لطف بھی نہ لے پائی تھی جب ذی شاہ کی دہاڑنے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔ ذی شاہ اچانک گھر آ گیا تھا۔ وہ بالکل دبے قدموں گھر میں داخل ہوا تھا۔ یقیناً اس کی گاڑی گیٹ سے باہر تھی اور وہ کوئی فائل وغیرہ لینے نہیں آیا تھا۔ وہ تو یعنی کو اس کے میسے تک چھوڑنے کے لیے دوبارہ گھر آیا تھا۔ دراصل اسے جواب دے کر اس کا ضمیر خاصا بوجھل ہو گیا تھا۔ فطرتاً وہ صاف نیت کا بندہ تھا پھر بڑی بھابی کا یہ معمولی سا کام اتنا بڑا بھی نہیں تھا جو وہ دونوں انکار کر آیا تھا۔ کچھ ذیشان

## ترک وفا

دھونے والا حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا..... وہ ہر صورت ذی شاہ کے دل پر اچانک جھنے والی میل کو کھر چنا چاہتی تھی۔

”ذی.....! بندیا بہت بد زبان ہے، یقین کرو، مجھے اتنا کچھ.....“ وہ تیز لہجے میں بولتی ہوئی اچانک رک گئی تھی۔ مٹی کی مداخلت نے اسے مزید بولنے نہیں دیا تھا۔

”یہ تو روز کا قصہ ہے بیٹا! تم کب تک عدالت لگاؤ گے۔ جانے دو، اب تو عادت ہو چکی ہے۔“ وہ مالا اور بندیا کو لے کر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ مٹی اس لمحے کتنی اداس، ویران اور تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ گویا مردوں کی غیر موجودگی میں گھر کا ماحول ایسے ہی تکلیف دہ، پراذیت ہوا کرتا تھا۔ یعنی کو بھلا کیا پروا ہو سکتی تھی۔ وہ آگ لگا کر میسے چلی جاتی تھی یا سیرسپاٹوں پر نکل جاتی۔ اس کا تو یہ معمول تھا۔ یعنی نے اسی طرح بد زبانی کے جوہر دکھا کر سب پر تسلط قائم کر رکھا تھا۔ پہلے پہل بندیا بھی مٹی کی طرح چپ کی بکل اوڑھ لیتی تھی۔ یعنی کی ہر زیادتی پر خاموش رہتی مگر پھر آہستہ آہستہ یعنی کا بڑھتا دباؤ محسوس کر کے اس نے بھی کھرے کھرے جواب دینے شروع کر دیے تھے۔ ورنہ یعنی تو ان کی ناک میں دم کیے رکھتی تھی۔ بلاوجہ اسے پکن میں گھسا دیتی۔ نوکروں کی موجودگی میں بھی اس سے فضول کام کرواتی، کپڑے دھلواتی، استری کرواتی، یہاں تک تو ٹھیک تھا، اس نے ذرا کام خراب ہونے پر اس کی بے عزتی بھی کرنا شروع کر دی تھی پھر وہ بے ضروری مالا کو بھی بے نقط سناتی تھی۔ جب اس نے مالا پر طنز کرنے اور اسے ایذا دینی شروع کی تھی تب سے بندیا بھی یعنی کو دو بدو جواب دینے لگی تھی۔ مالا نے پلٹ کر کچھ کہا جو نہیں تھا۔ بھی یعنی سر جڑھتی جا رہی تھی۔ اب چونکہ بندیا کو دونوں بھائی خود سپورٹ کر رہے تھے تب سے وہ خاصی دلیر ہو گئی تھی۔

کے حوالے سے یعنی قابل احترام تھی۔ بس انہی نزاکتوں کو سوچتا وہ واپس گھر آیا تھا جب اچانک یعنی کی بکواس کوسن کر اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ یقیناً بندیا اور یعنی کے درمیان ٹکراؤ ہو رہی تھی مگر تکرار کی نوعیت اتنی فضول اور بے ہودہ ہو گئی یہ ذی شاہ نے ہرگز نہیں سوچا تھا۔ یعنی کے الفاظ نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ وہ اس کی بہنوں کے بارے میں اتنا غلط اور غلیظ سوچتی تھی یہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

”بہت خوب، بہت اعلیٰ۔“ ذی شاہ نے تلے قدم اٹھاتا یعنی کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ اس کے دو ٹوک کیلئے الفاظ نے یعنی کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ لٹھے کے مانند سفید پڑ گئی تھی..... اور گھبرا تو مٹی کے ساتھ بندیا بھی گئی تھی۔

”آپ میری بہنوں کے لیے اتنا بہترین سوچتی ہیں یعنی بھابی...! آج سے پہلے میں جان ہی نہیں سکا۔“ ذی شاہ کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کے بھیجنے لہجے میں بلا کا غیض ابل رہا تھا۔ یعنی کی تو روح فنا ہو گئی تھی۔

”میری باتیں تم نے سن لی ہیں۔ بندیا کی بکواس نہیں سنی۔“ وہ خاموش رہ کر خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی صفائی پیش کرنا تھی، ذی شاہ کی بدگمانی دور کرنا تھی۔ وہ اسے ہاتھوں سے نہیں نکالنا چاہتی تھی۔ یعنی کی جلد بازی نے بنا بنایا معاملہ بگاڑ دیا تھا۔ زبان سے نکلے الفاظ اگرچہ واپس نہیں آسکتے تھے تاہم وہ اپنی چکنی چڑی باتوں سے ذی شاہ کی بدگمانی کم ضرور کر سکتی تھی۔

”مجھے جو سننا تھا سن لیا..... آپ کی سوچ اور ذہن کی گندگی جان کر بڑا افسوس ہوا ہے، تاہم آپ کی اصلیت واضح ہو گئی۔ سو یہ اچھا ہی ہوا۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر یعنی کو مزید بولنے سے روک دیا تھا۔ اسے مزید کوئی وضاحت یا صفائی نہیں چاہیے تھی۔ تیجھی یعنی پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس نے رونے



## ترک و تھا

اسے اگلے لائحہ عمل کی فکر تھی۔ چونکہ ایک بات تو طے تھی کہ وہ ذی شاہ کو دھمکا کر بھی آئیے سے منگنی پر مجبور کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ ذی شاہ اس کی پلاننگ پر چاروں شانے چت گر جائے گا۔

”میں اپنے ساتھ اچھا کروں یا برا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ ذی شاہ نے فائل پر نگاہ جما کر ذیشان کو روک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ نہ صرف رکا تھا بلکہ پلٹ بھی آیا تھا۔

”یہ تو وقت آنے پر پتا چلے گا۔“ ذیشان نے چبا چبا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا تب وہ سچی سے سر جھٹک کر زہر خند ہوا۔

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“ ذی شاہ کا دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔ اسے بھائی سے ایسی بکواس کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ وہ غضبناک تیور لیے اسے گھور رہا تھا۔

”یہی سمجھ لو۔“ ذیشان سرخ آنکھیں لیے اسے گھورتا ہوا دروازہ ایک دھماکے سے بند کرتا ہر نکل گیا تھا جبکہ ذی شاہ بے بس سا بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا تھا پھر اس نے سر جھٹک کر کمپیوٹر اسکرین کی طرف اپنی توجہ مبذول کر لی تھی۔ اسے ذیشان کی بکواس پر کڑھنا نہیں تھا مگر وہ اس کی سوچوں کو منتشر ضرور کر چکا تھا۔ اب اس کا خاک کام میں دل لگنا تھا۔ اپنے گھریلو حالات کو سوچتا وہ مالا کے لیے بہت رنجیدہ ہو رہا تھا اور ابھی مالا کے لیے اس نے کچھ سوچا ہی نہیں تھا..... جو..... اب ذیشان اور عینی نے نیا محاذ کھول لیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا ذیشان کو عینی نے اپنی باتوں میں لگا رکھا تھا۔ اور وہ بھی بیوی کی بتائی ایک، ایک لائن کو پوری جانفشانی کے ساتھ دہراتا تھا مگر چونکہ ذی شاہ ان دونوں کی نیت کا کھوٹ سمجھ چکا تھا سو وہ قیامت تک بھی ذیشان کی خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا۔

(باقی آئندہ)

کی شادی کے سلسلے سے منسوب کر رہا تھا۔ اسے بہنوں سے بھی زیادہ سالی کی فکر کھا رہی تھی۔ نہ بہن کی پریتھی۔ نہ چھوٹی بہن کی شادی کے لیے متشکر تھا۔ فکر تھی تو بس لاڈلی بیگم کی نازک اندام بہن کی..... ذی شاہ کا دل کچھ اور بھائی کے رویے سے کھٹا پڑ گیا تھا۔

”تو اب سوچ لو.....“ ذیشان اسے اکسارہا تھا۔ کچھ لہجے کو نرم کر کے اس کا دل موم کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ذی شاہ کا دل موم کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ اپنے دل کی وہ گزیر سے کسی کو گزرنے ہی نہیں دیتا تھا۔

”مجھے فی الحال اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچنا..... پہلے مالا اور بندیا کے لیے سوچوں گا۔“ اس نے دونوں کے انداز میں ذیشان پر بہت کچھ واضح کر دیا تھا مگر چونکہ ذیشان نے آنکھیں اور کان بند کر رکھے تھے سو وہ کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اب بھی اس کے انکار کی اصل وجہ پر توجہ دیے بغیر وہ ایک دم بھڑک اٹھا تھا۔ یقیناً وہ اس انکار کو اتنا مسئلہ بنا رہا تھا۔ اور عینی نے بھی اسے ذی شاہ کے انکار کو سن کر بعد والی صورت حال سے نمٹنے کے لیے پہلے سے ہی تیار کر دیا تھا۔

”یعنی تم انکار کر رہے ہو؟“ ذیشان نے بہت دیر کی خاموشی کے بعد زہریلے لہجے میں کہا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ اور اکھڑ نظر آنے لگا تھا۔ ذی شاہ نے قدرے تحمل سے کہا۔

”یقیناً میں انکار ہی کر رہا ہوں۔“ اس کے لہجے میں بھی خاصی ناگواری تھی۔ اسے ذیشان کے اکھڑ تیور بہت برے لگ رہے تھے۔ وہ کیونکر اپنے فیصلے اس پر ٹھونس سکتا تھا۔ پھر جب اس نے واضح لفظوں میں انکار کر دیا تھا تب اس کا اصرار فضول تھا۔

”تم اپنے لیے اچھا نہیں کر رہے.....“ ذیشان نے پھینچی آواز میں سچی سے کہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر جانے لگا تھا۔ یقیناً وہ بہت غصے میں تھا۔ اب

”دیکھو یار.....! شادی تو تم نے کرنی ہی ہے تو پھر مال منول سے کام کیوں لے رہے ہو..... آئیے میں کی کیا ہے؟ پھر اپنے رشتے دار بھی ہیں۔ عینی کی خواہش ہے.....“ ذیشان ابھی بہت بیٹھے لہجے میں گفتگو کا آغاز کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب ایک دم ذی شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا تھا..... وہ اس موضوع پر کھل کر بات کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ ویسے بھی وہ ذیشان کی غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا تھا۔ یہ لوگ خواہ مخواہ اس سے امیدیں وابستہ کر رہے تھے جبکہ وہ آپ تو کیا کسی میں بھی انٹرنیشنل نہیں تھا اور نہ ہی شادی کی فی الحال خواہش رکھتا تھا۔

”مجھے فی الحال نہ منگنی کرنی ہے نہ شادی.....“ ذی شاہ نے دونوں لہجے میں انکار کر دیا تھا۔ ”اور آئیے کے ساتھ تو بالکل نہیں..... میرا اور آئیے کا مزاج ہی نہیں ملتا.....“ اس نے بھی آج صاف صاف بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ ذیشان کی رنگت پل پل بدل رہی تھی، وہ ہکا بکا اپنے چھوٹے بھائی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اسے ذی شاہ سے ایسے کھرے جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ذی شاہ آئیے کے لیے انکار کر دے گا۔ وہ تو اپنے تئیں تمام معاملے نمٹا چکا تھا۔ سب کچھ طے کیے ہوئے تھا۔ اسے تو صرف آگاہ کرنا تھا مگر ذی شاہ نے تو بازی ہی الٹ دی تھی۔ ذیشان کو بھلا غصہ کیوں نہ آتا۔

”مزاج تو شادی کے بعد مل ہی جاتے ہیں۔ تمہیں اعتراض کس بات پر ہے؟“ بہت سنبھل کر ذیشان نے تیز لہجے میں پوچھا تھا۔ ذی شاہ کو امید نہیں تھی وہ اس کے انکار پر بھی جرح کرنے لگے گا۔

”بس میں آئیے کے لیے اس انداز میں نہیں سوچ سکتا۔“ ذی شاہ نے نہایت ناگواری سے۔ یہ مشکل جواب دیا تھا۔ وہ اسے کس چیز کا احساس دلانا چاہتا تھا اور ذیشان بات کو کسی اور طرف گھما پھرا کر لے گیا تھا۔ اپنے گھریلو ماحول کی کشیدگی کو وہ ذی شاہ

ادھر ذی شاہ کے لیے عینی کی بدزبانی ہضم کرنا سہل نہیں تھا۔ عینی کو مزید کچھ کہے بغیر وہ واپس آفس آ گیا تھا مگر اس نے ذیشان سے اپنی ٹینشن ضرور شیئر کی تھی۔ وہ اسے گھر کے ماحول سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر ذیشان کے اٹنے جواب نے کچھ بل کے لیے اسے متحیر کر دیا تھا۔

”وہ بہت ڈپریشن کا شکار ہے یار! تبھی بندیا کو کچھ کہہ دیا ہوگا۔ بڑی بھابی ہے، بندیا کو ذرا کچھ کہہ دیا تو کیا ہو گیا؟ بات بڑھانے کا کیا فائدہ۔“ ذیشان نے بڑے سکون سے بیوی کے ڈپریشن پر روشنی ڈالنی شروع کی۔ ذی شاہ قدرے ہونق سا اپنے بدھو بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کی سُدھ بُدھ عینی سے بیاہ کے بعد کھو چکی تھی۔ اس کی ساری بکواس ذیشان کے سر پر سے گزر چکی تھی اور وہ آرام سے عینی نامہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔

”تم نے بھی تو معاملہ لٹکا رکھا ہے، کچھ اپنے بارے میں بھی سوچ لو..... تبھی عینی کی ٹینشن بھی ختم ہو گئی۔“ ذیشان گھما پھرا کر مطلب کی بات تک آ گیا تھا۔ وہ تو کب سے موقع کی تلاش میں تھا۔ کب یہ ذکر چھڑے اور کب وہ عینی کی تمنا ذی شاہ کے کانوں میں اٹھیلے۔ بیوی کا ڈپریشن اسے نظر آتا تھا۔ معصوم بہن کی اجڑی صورت اسے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ تھے خون کے رشتے، خود غرضی میں لپٹے ہوئے..... وہ ذیشان کو ہزار مرتبہ بتا چکا تھا۔ جب تک مالا کی زندگی کا کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا تب تک وہ ہرگز بھی شادی، منگنی کے جھنجٹ میں پڑنے والا نہیں تھا..... مگر ذیشان کی بک بک کے تار پھر عینی کے ڈپریشن سے جڑتے ہوئے اس کی منگنی پر آپہنچے تھے۔ وہ ذیشان کو کس طرح سمجھاتا.....؟ کس طرح مطمئن کرتا؟ وہ بغیر کسی پدمیزی کے دونوں کو انکار کرنا چاہتا تھا مگر سمجھ نہیں آتی تھی بات کا آغاز کیسے کرے..... ادھر ذیشان نے اپنی تان لگا رکھی تھی۔



ناولٹ

ترک و بنا

نایاب جیلانی

دوسرا حصہ



اس کا انکار کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جو گھر کی  
فضا پر امن رہ جاتی۔ یعنی تک اس کا انکار من و عن  
پہنچ چکا تھا سو اس کے تیور بگڑتے دیر نہیں لگی تھی۔  
اس نے اپنے تئیں کھلم کھلا اعلان جنگ کر دیا تھا۔  
پہلے مارے باندھے کچن میں چلی جاتی تھی اب  
اعلانیہ طور پر بائیکاٹ کر چکی تھی۔ اور بات صرف  
کھانا بنانے تک محدود نہیں تھی۔ اس نے کچھ دن  
بعد کچن الگ کرنے کا بھی شوشا چھوڑ دیا۔ وہ اوپر



والے پورشن میں الگ ہونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ابھی بات صرف می کے کانوں میں اس نے انڈیل دی تھی۔ فی الحال اس پر عمل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ چونکہ وہ ذی شاہ کو آخری حد تک منانے کی کوشش کرنا چاہتی تھی اور ذی شاہ تو گویا ان لوگوں سے قطعاً بے نیاز ہو چکا تھا۔ آفس کے علاوہ اس کی صرف ایک ہی مصروفیت تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت مالا کے ساتھ گزارتا تھا۔ اس سے بے معنی ڈھیروں باتیں کرتا، اسے لطیفے سنانا، بار بار ہنساتا..... اور وہ بہت ہنستی بھی تھی، اس کی باتوں کو انجوائے بھی کرتی تھی مگر بولتی پھر بھی نہیں تھی۔ ذی شاہ کے پاس مالا کی پچھلی زندگی سے متعلق کوئی تصویریں، مووی وغیرہ نہیں تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ مالا سے اس کی گزشتہ زندگی کی باتیں کرے۔ اسے پچھلی باتیں یاد دلائے۔ تاکہ مالا کچھ ردعمل ظاہر کرے..... وہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کرے..... اپنی زبان کے زنگ اتارے..... کچھ نہیں تو اپنے سگے بھائی سے کچھ دل کے دکھ کہے..... اپنے دل کا سارا جس، ٹھن اور زہر باہر نکال دے۔ اندر کے غبار کو، آنسوؤں کو لفظوں میں بہا دے مگر وہ کچھ بولتی ہی نہ تھی۔

اس دن بھی ذی شاہ، مالا کو زبردستی ایک قریبی پارک میں لے آیا تھا۔ یہاں چھوٹے، چھوٹے بچوں نے ہنگامہ مچایا ہوا تھا۔ بے فکر خوش باش چہرے، ہنستے کھلکھلاتے لوگ تھے۔ شاید ان لوگوں کو غم چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ مالا بہت ترسی ہوئی نظروں سے ان معصوم بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ خصوصاً اس بچے کو جو پرانے میں لیٹا قلعاریاں مار رہا تھا۔ اس کی ماں قریب ہی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ مالا ایک ٹک اس معصوم سے بچے کو دیکھ رہی تھی جو بار بار اپنی ماں کی طرف ہمکتا تھا۔ بچے کے چہرے کو پیاسی نظروں سے دیکھتی مالا کی آنکھوں میں حسرت گرلا رہی تھی۔

ذی شاہ سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا۔ اس نے اپنی نگاہوں کا رخ موڑ لیا تھا پھر اس نے مالا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”کیا دیکھ رہی ہو مالا! یہ بچے تمہیں اچھا لگ رہا ہے! چلو میں تھوڑی دیر کے لیے اسے تمہارے پاس لے آتا ہوں۔“ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا فاصلے پر موجود اس بچے کی ماں تک آیا تھا۔ مالا کے چہرے پر جو متاسی لپک رہی تھی، گویا وہ بچے کو گود میں اٹھانا چاہتی تھی کم از کم اس کے تاثرات سے ذی شاہ یہی اندازہ لگا پایا تھا جیسے ہی وہ مالا کی دلی خواہش کو جان چکا تو اس نے عمل کرنے میں لمحے بھر کی دیر نہیں کی تھی۔ مالا حیران آنکھوں سے اسے اٹھ کر بچے کی ماں کے قریب جاتا دیکھ رہی تھی پھر اس نے اپنے بھائی کو اس اجنبی عورت سے ہم کلام ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اس عورت سے بہت ہی لجاجت کے ساتھ گویا تھا۔

”میں کچھ دیر کے لیے آپ کا بچہ لے جاؤں؟“ صرف اس سامنے والی بیٹی تک میری بہن کچھ وقت آپ کے بچے کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔“ جانے وہ اسے کون سے جواز دے رہا تھا۔ وہ عورت کچھ دیر تو ذی شاہ کو حیرت سے دیکھتی رہی پھر شاید اس کی پرسنالٹی، شائستگی اور باوقار انداز سے متاثر ہو گئی تھی۔ اس نے ذی شاہ کی التجا پر غور کرتے ہوئے ذرا فاصلے پر موجود اس بیٹی کی طرف دیکھا جہاں ایک بہت ہی کامنی سی کچھ کچھ کھوئی لڑکی ایک ٹک پرانے کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ بچے کی ماں نے کچھ تذبذب کے عالم میں سر ہلا کر بچہ پرانے میں سے نکال کر ذی شاہ کے ہاتھوں میں تمہا دیا پھر جب وہ بچہ لے کر مالا کی طرف آیا تو اس کی آنکھوں میں ایک الگ سی جوت اک عجیب سی چمک دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے بچہ مالا کی گود میں ڈالا تو وہ بے قرار نظروں سے بچے کے نقش کھوجنے لگی۔ گویا بچے کے

معصوم نقوش میں کچھ تلاش رہی تھی۔ کچھ دیر مالا کی بے قراری کا مشاہدہ کرنے کے بعد ذی شاہ نے بہت پیار سے اسے مخاطب کیا تھا۔

”مالا! تمہیں بچے اچھے لگتے ہیں؟“ مالا کو بہت ہی مضطرب سے انداز میں بچے کو والہانہ پیار کرتے دیکھ کر وہ پوچھ رہا تھا۔ مگر ظاہری بات تھی، مالا نے اس کی بات کا جواب نہیں دینا تھا لیکن اس نے اثبات میں سر ہلا کر جو ردعمل ظاہر کیا تھا مالا کے اندر اس تحریک نے ذی شاہ کی آنکھوں میں امید کے دیے، ستارے روشن کر دیے تھے۔ وہ صحت مندی کی طرف تو پلٹ چکی تھی تاہم نارمل لوگوں کی طرح اب ردعمل بھی ظاہر کرنے لگی تھی۔ منہ سے اب بھی اگرچہ نہیں بولتی تھی تاہم وہ اس کے تاثرات سے اندر کا حال جان لیتا تھا..... وہ مالا کے مزاج کو بہت اچھی طرح سے سمجھنے لگا تھا۔ بن کے اس کے دل کی خواہش کو جان لیتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں کے تاثرات کو بھی پڑھنے لگا تھا۔ اسے افسوس ہوتا تھا پچھلے تین سال سے انہوں نے مالا کو اس کے حال پر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اپنے اندر کے غلوں کو اس نے کبھی اپنی ماں سے بھی شیئر نہیں کیا تھا اور اب ذی شاہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے اندر کے غبار، دھند، کرب و اذیت کو اسے اپنی ماں، بہن، دوست، بھائی سب کچھ سمجھ کر شیئر کرے..... اسے اپنے اوپر بیتی اذیت کی کہانی سنائے۔

اس وقت ایک اجنبی بچے پر والہانہ پیار لٹاتی مالا کو وہ کس کرب کے عالم میں دیکھ رہا تھا، ذی شاہ کے دل میں درد کی ٹیسس اٹھنے لگی تھیں.... وہ دکھ کی جانے کون سی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ یقیناً یہ متا کا پل صراط تھا۔ وہ جسے کھوجتی تھی، اس کے غم کو اس بچے کی صورت میں تازہ کر رہی تھی۔ کیسا پُر اذیت، تکلیف دہ منظر تھا۔ ذی شاہ کی آنکھوں کی سطح کیلی ہونے لگی۔ تب اسے اپنے پیچھے ایک ہلکی سی آواز

**سنہری کرنیں**

☆ پریشان ہونا انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے لیکن پریشان رہنا انسان کے اللہ پر یقین نہ ہونے کی دلیل ہے۔  
☆ ہمیشہ قدر کریں، ان تین چیزوں کی۔ اعتبار، وعدہ اور رشتہ۔ یہ سب جب ٹوٹتے ہیں تو کوئی شور سنائی نہیں دیتا مگر دل میں ایک گہری خاموشی اتر جاتی ہے۔  
از: عروہ تاز، کوئٹہ

سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ بچے کی ماں تھی جو ان لوگوں پر ہی نگاہیں جمائے کھڑی تھی۔ اب بچے کو لینے یقیناً ان کے قریب آئی تھی۔

”کیا میں اپنا بچہ لے سکتی ہوں؟“ اس نے ذی شاہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا تب وہ نگاہوں کا رخ موڑ کر بچے کی ماں کو دیکھنے لگا جو مضطرب سی اپنا بچہ واپس لینے آئی تھی۔ یقیناً بچہ بھی ماں کو سامنے دیکھ کر اس کی طرف ہنسنے لگا تھا۔ ذی شاہ نے مالا کی گود سے بچہ لے کر بے قرار کھڑی خاتون کو تمہا دیا تھا جو بچے کو گود میں لے کر کچھ... پُرسکون ہو گئی تھی۔ وہ اپنے فطری تجسس کی بدولت کچھ پوچھے بنا رہ نہیں سکی۔

”آپ کی بہن کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے کیا.....؟“ اس نے مضطرب سی مالا کو دیکھ کر ذی شاہ سے سوال کیا تھا جو مالا کی بے قرار نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر چکنے کے باوجود بھی کچھ بے نیاز کھڑا تھا۔ یقیناً وہ بچے کی ماں سے اس کے بچے کو دوبارہ نہیں لے سکتا تھا۔

”بس یہی سمجھ لیں۔“ وہ مبہم سے انداز میں بولا تھا۔

”کیا ان کے بچے نہیں ہیں؟“ خاتون کی یقیناً



تسفی نہیں ہوئی تھی۔ وہ مزید سوال کرنا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر مالا کے لیے ہمدردی تھی جو ذی شاہ کو اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

”نہیں.....“ اس نے ایک لفظی جواب دے کر نالنا چاہا تھا مگر یہ خاتون فی الحال ٹلنے والی نہیں تھی۔ اب وہ اسے مالا کے علاج کا مشورہ دے رہی تھی، اس کے شوہر کا پوچھ رہی تھی۔ کسی مایہ ناز گانا کالوجسٹ کا ذکر کر رہی تھی۔ ذی شاہ عجیب مصیبت میں پھنسا جھنجھلا رہا تھا۔ اس نے خاتون کو محل سے جواب دیا۔

”آپ کے نیک مشوروں کا بہت شکریہ۔“ وہ بہت نرمی سے ہم کلام تھا کیونکہ خاتون اس کی محنت تھی۔ کچھ دیر پہلے اس نے ذی شاہ پر احسان کیا تھا سو وہ اپنے لب و لہجہ کو سخت نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کا انداز یقیناً جان چھڑوانے والا تھا۔ سو وہ معذرت کر کے جلد ہی مالا کو ساتھ لیے وہاں سے اٹھ گیا تھا مگر اس نے محسوس کیا تھا کہ مالا پہلے کی نسبت آج کافی خوش اور پُر جوش نظر آ رہی تھی گھر آ کر بھی وہ پہلے کی طرح کمرے میں بند نہیں ہوئی تھی بلکہ بند یا کے پاس بچن میں کھڑی سلا د کے لیے بزمی وغیرہ کاٹنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر سچی الوہی سی مسکراہٹ ذی شاہ کو اگلی صبح تک بھی دکھائی دیتی رہی تھی اور شاید مالا کے روئے میں پہلی مرتبہ تبدیلی محسوس کر کے می اور بند یا بھی بہت پُر امید ہو چکی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اگلی سہ پہر مالا بغیر کسی کے کہے لان میں بیٹھی ذی شاہ کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ زندگی کی طرف دھیرے دھیرے ہی سہی لوٹنے لگی تھی اور یہ خوش آئند عمل تھا۔

اس سے اگلے دن ذی شاہ مالا کو پارک لے جانے کے بجائے شاپنگ کے لیے لے آیا تھا مگر مالا بجائے بوتیکس کی طرف ٹوائے شاپنگ کو دیکھ، دیکھ کر ان کی طرف بڑھ رہی تھی کچھ سوچ کر وہ

اسے ٹوائے شاپ کی طرف لے آیا تھا تب مالا نے کتنے ہی جوش اور جذبے کے ساتھ ڈھیروں کھلونے خرید لیے تھے..... اب وہ چھوٹے چھوٹے کپڑے خرید رہی تھی۔ چونیاں اور فیڈر لے رہی تھی۔ ڈول ہاؤس اور پی ہاؤس پیک کر وار رہی تھی۔ آج وہ عام دنوں سے ہٹ کر بہت خوش تھی۔ اس کی سرخ رنگت میں عجیب سی چمک نظر آ رہی تھی۔ چمکیلی آنکھیں خوشی سے دمک رہی تھیں۔ اور ذی شاہ بہن کو خوش دیکھ کر اندر تک خود ہی سرشار ہو رہا تھا۔ اس کی کوششیں رنگ لارہی تھیں۔ جب وہ ڈھیروں شاپنگ بیگ کے ساتھ مالا کو لیے گھر واپس آیا تب اس کی پہلی بڈبھیڑ عینی سے ہوئی تھی۔ وہ اس کی طنزیہ نظروں سے بے نیاز اپنے کمرے میں چلا گیا تھا جبکہ بند یا بہت جوش کے عالم میں عینی کو نظر انداز کر کے مالا کی شاپنگ دیکھ رہی تھی مگر ایک، ایک چیز کو شاپر سے نکالتے ہوئے اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا جبکہ عینی اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتی مسخرانہ انداز میں ہنس رہی تھی۔

”تمہاری بہن ابھی تک ان لوگوں کے سحر سے نہیں نکلی..... ابھی تک ان لوگوں کے سحر میں گرفتار ہے جن لوگوں نے اسے کتے کی طرح دھتکار دیا، انہی کی یاد میں دن رات مرتی ہے۔“ عینی کے جھپٹے ہوئے الفاظ نے بند یا سمیت مالا کو بھی متوجس کر دیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی عینی کو اور کبھی چھوٹے چھوٹے کھلونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں ریت چھیننے لگی تھی۔ ان ننھے منے کھلونوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

”اسے یقین دلاؤ، کس کے خواب و خیال میں گم ہے یہ.....؟ اور جو اتنے پیے اجاڑ کر یہ ڈھیر اٹھا لائی ہے آخر کس کے لیے.....؟ اسے تم لوگ احساس

کیوں نہیں دلاتے؟ وہ بچہ تو کب کا مر چکا..... جس کے لیے ابھی تک خریداری کرتی پھرتی ہے۔“ عینی کے سفاک جملوں نے اور زہریلے لہجے نے بیڑھیاں اترتے ذی شاہ کو بھی جامد کر دیا تھا۔ لمحے بھر کے لیے تو وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسے عینی کے منہ سے نکلے شعلوں کا سارا عکس مالا کے چہرے پر دکھائی دے رہا تھا۔ مالا جو اب بھی ساکت کھڑی عینی کو دیکھ رہی تھی۔ عینی کے الفاظ دیکتے انکارے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ گویا کسی بھڑکتے گڑھے پر کھڑی تھی جس میں عینی نے اسے دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ اب وہ منہ کے بل گری کر رہی تھی، چلا رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ اس کے وجود پر چھالے ابھر رہے تھے۔ آنکھوں سے خون نکل رہا تھا۔ دل درد کے احساس سے پھٹ رہا تھا۔ وہ اذیت کی انتہا پر کھڑی تھی۔ اس کی نگاہیں جانے کون، کون سا دردناک منظر دیکھ رہی تھیں۔ شاید وہ ایک مرے ہوئے نومولود کو دیکھ رہی تھی یا اپنے محبوب شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ یا ایک خونخاک آنکھوں والی حسینہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایسی خونخاک آنکھیں کسی کی نہیں دیکھی تھیں۔ اس نے زندگی میں آج تک اتنی بریلی اور روح تک کو خوف میں مبتلا کر دینے والی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ ایسی ہی خوف و ہراس میں مبتلا کر دینے والی آنکھیں تھیں۔ اس نے بڑی، بڑی خوب صورت آنکھیں دیکھی تھیں۔ غزالی آنکھیں، خواب ناک آنکھیں، تابناک آنکھیں، خمار آلود آنکھیں، گہری آنکھیں، لمبی آنکھیں، بولتی آنکھیں مگر اتنی سرد اور بریلی آنکھیں کسی کی نہیں دیکھی تھیں۔

علی عیسیٰ کی بہن کے چہرے پر ایسی ہی آنکھیں بچی تھیں۔ روح کو سننا دینے والی، خوف میں جکڑ دینے والی، اندر تک کو کھوج لینے والی، جاسوس آنکھیں، کھوجتی آنکھیں، ذہنوں میں گھس جانے والی، سوچ کو کھرچ دینے والی، مقابل کو اندر تک پڑھ لینے

والی آنکھیں۔ وہ کسی کی سوچ کو اندر سے نوج لانے کی صلاحیت رکھتی تھی، اس کو ذہن کھوجنے کا چسکا تھا مالا نہیں جانتی تھی علی عیسیٰ کی بہن کو ذہنوں اور سوچ میں گھسنے کا اسم آتا تھا۔ ان آنکھوں کا خوف اور بریلی ہر آج تین سال گزر جانے کے بعد بھی مالا کے دل کو دہلا گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ عینی کے چہرے پر بھی ویسی ہی آنکھیں سج گئی ہیں مگر مومن کی آنکھوں جیسی یہ آنکھیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ وہ اس منظر سے بھاگنا چاہتی تھی وہ کسی تنہا گوشے کی طرف لپکتا چاہتی تھی۔ وہ خود کو ایک کمرے میں بند کر لینا چاہتی تھی مگر وہ کچھ بھی نہیں کر پائی۔ وہ اپنے بھائی کو قریب آنے سے بھی روک نہیں پائی تھی۔ وہ اسے اونچا بولنے سے بھی منع نہیں کر پائی تھی۔ حالانکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ذی شاہ، عینی پر چلائے، اس پر غصہ کرے..... عینی نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ عینی شاید ٹھیک ہی کہتی تھی۔ مالا ابھی تک انہی لوگوں کے حصار میں تھی جن لوگوں نے اسے کتے کی طرح دھتکار دیا تھا۔ وہ عینی کے تلخ مگر سچے الفاظ کو تسلیم کرنے کے باوجود بہت اذیت میں تھی۔ عینی نے آج اس کے ہر زخم سے کھرٹ جواتا رہا تھا۔ عینی نے آج تین سال پہلے کی ساری اذیتوں کو اس کی آنکھوں میں بھر دیا تھا۔

اس نے نم آلود آنکھوں سے اپنے بھائی کو دیکھا جو اس کے اندر کے اضطراب اور ٹوٹ پھوٹ کو محسوس کر کے بھائی پر چلا رہا تھا۔ وہ اسے ٹوٹا کھرتا دیکھ کر تحمل کا مظاہرہ نہیں کر سکا تھا۔ وہ عینی پر الٹ پڑا تھا۔ ”میری بہن کو کچھ ہوا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ مالا کی پٹلیاں اٹتے دیکھ کر چلا رہا تھا۔ وہ عینی کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ عینی، دیور کو اچانک آتا دیکھ کر خفت زدہ رہ گئی تھی۔ اسے اپنی صفائی میں بولنے کے لیے کوئی الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ذی شاہ کو اب کوئی وضاحت بھی نہیں چاہیے تھی۔ وہ بہن کی



مارچ 2014ء کے شمارے کی ایک جھلک

# سرگزشت

ماہنامہ

## شہزادی

برصغیر کی اس شہزادی کا تذکرہ جس نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے

## بابائے ادب

اس ایب کا زندگی نامہ جسے ہر ملک میں احترام حاصل ہے

## داسراپسینا

ایک ایسی دبا جس نے یورپ کو ہلا دیا تھا

## جہاز بیٹی

پی آئی اے کے ایک ملازم کا دلچسپ احوال زندگی

## دیس سی پینا

ایسی سبق آموز سچ بیانی جسے پڑھنا ضروری ہے

## لڑکی اور عورت

لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل کہانی ”سراب“ فلمی دنیا کی کئی کئی داستانیں ”فلمی الف لیلہ“ اور بھی بہت ساری سچ بیانیاں سچے واقعات۔

اگر آپ علم و دانش بھرے مضامین، ادب، تاریخ اور سبق آموز سچ بیانیاں پسند کرتے ہیں تو آپ ہی کے لیے یہ شمارہ ترتیب دیا گیا ہے بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں آپ خود ہی گرویدہ ہو جائیں گے

اس شہر کی نس، نس میں سانس لیتی تھی اور میرین جرج کے اونچے نچے کیسے کلس پر سسکاریاں لے لے کر دم توڑ دیتی تھی۔

یہ علی عیسیٰ کا من ہائیم، واٹن ہائیم تھا۔ من ہائیم سے بارہ میل پر واقع یہ چھوٹا سا پہاڑی شہر تھا۔ واٹن ہائیم یعنی شراب کے نشے میں مخمور یہاں انسان نہیں، طلسماتی رومانوی کردار بنا کرتے تھے۔ کالی چمکتی سڑکوں پر چلتے پھرتے نظر آیا کرتے تھے۔ اس شہر کی فضا میں محبت رچی ہوئی تھی۔

سرستی سڑکوں پر خوش پوشاک خوب صورت لوگ جلتے تھے..... اور شیشوں کی دکانوں میں چینی کی گڑیا جیسی سیلز گزراہ چلتوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں۔ اس شہر کے پس منظر میں بلند پہاڑوں کی سرستی چوٹیاں تھیں اور انہی پہاڑوں پر کہیں کہیں سفید خوب صورت مکان... جانے ان پتھروں پر یہ مکان کھڑے کیسے تھے۔

کشم سے فارغ ہو کر جب وہ ڈیڑی اور چاچو کی ہمراہی میں اتر پورٹ کی جگمگاتی دنیا سے باہر آئی تو آس پاس وہی اپنائیت بھری مہک چکرانی ہوئی اس کے نختوں سے نکرانی تھی۔ کچھ بولتی کچھ کہتی، کچھ مدہوش کرتی خوشبو..... اس نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا تو وہ اپنائیت بھری مہکار مجسم انسانی روپ میں دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ ایک دم متحیر رہ گئی تھی۔ اس کی نگاہوں نے پہلی مرتبہ علی عیسیٰ کو دیکھا تھا۔

وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے بعد علی عیسیٰ کو دیکھا تھا، وہ اسے دیکھ کر مایوس ہرگز نہیں ہوئی تھی جبکہ مایوس تو علی عیسیٰ بھی اسے دیکھ کر نہیں ہوا تھا۔ اس نے باپ اور تایا کی موجودگی میں صرف ایک مرتبہ بالاک کی طرف دیکھا تھا۔ اسے مالا بہت ڈری سہمی نظر آئی تھی۔

ان کے درمیان باقاعدہ بات چیت کا آغاز کچھ دیر بعد ہوا تھا۔ تعارفی مرحلے کی ضرورت تو نہیں

شاید اس لڑکی نے مالا کے وجود پر کوئی اسم پڑھ کر پھونک دیا تھا۔ اس لڑکی نے مالا کے ساتھ کیا اچھا کیا تھا؟ وہ اپنے بھائی کو بھلا کیا بتاتی؟ وہ اپنے بھائی کس طرح بتاتی.....

اسے دودھ جیسے بگولوں میں بھیکتی اس شام ایک ایک منظر یاد تھا جب لاہور سے اڑنے والا جہاز من ہائیم کی سر زمین سے پہلے فرنیکلرٹ کے نواحی جنگلات پر اڑ رہا تھا۔ اس دن کچھ دیر کے لیے آسمان صاف ہو گیا تھا۔ زمین پر ہریالی بکھری تھی۔ اور سبزے کے چوکور ٹکڑے فرش پر جلوہ افروز تھے۔ جنگلات کا رنگ سیاہی مائل تھا، مرغزار ہرے تھے اور کھیتوں کی طویل چادر بھی پھیلی تھی۔ دور کہیں پہاڑوں کے بیچ چاندنی کی لہریں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ شاید آبشاریں تھیں۔ کہیں پانی کی وسیع ٹکڑے دریاؤں کے مانند نظر آ رہے تھے۔ سر زمین جرمین یوں لگتی تھی گویا سبزے کا کوئی وسیع کھیت ہو جس میں بھوری سبز سنہری، زعفرانی بنستی فصل کی تروتازہ کٹائی ہوئی ہو..... سبزے میں گھرے سفید مکانوں والے دیہات اور شہری آبادیاں سرخ بتیوں کے مانند نظر آتی تھیں۔ جہاز بلندی سے پستی کی طرف آ رہا تھا۔ منزل بہت قریب تھی، گویا دو ہاتھ کا درمیان میں فاصلہ ہو..... چہار سو دھکنی ہوئی روٹی دکھائی دیتی تھی۔ سفید نرم نرم گولے اڑ رہے تھے۔ اس اجنبی دیس کی فضا میں بھی اپنائیت بھری مہک رچی تھی۔ یہ مہک نہ جانے کہاں سے اٹھ رہی تھی۔ یہ نرم نرم محبت بھری باس کہاں سے آرہی تھی۔ شاید دریاؤں کے قریب ”سینیلے پیر ہارٹ کا موسم گزر رہا تھا۔ رنگ رنگ کے پھول لہرا رہے تھے۔ خوشبو کی مہکار میں محبت کہاں سے گوندھی گئی تھی۔

یہ نگر کسی شاعر کا خواب اور کسی مصنف کی کہانی کا مرکزی کردار بن سکتا تھا۔ اسی من ہائیم میں جانے کیسی، کیسی محبت کی کہانیاں پروان چڑھی تھیں۔ محبت

بگڑی حالت کو دیکھ کر مزید زہر پھونکنا ترک کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ مالا کا سہا دل ان بھاری لفظوں کی اذیت نہ سہتے ہوئے مدھم پڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی کچھ بھولے سرے مناظر کھوج رہی تھیں۔ کبھی اک مہرا ہوا نولود سامنے آ جاتا۔ کبھی علی عیسیٰ کا مسکراتا چہرہ دل دھڑکا دیتا..... کبھی جون کی بریلی نگاہیں اسے خوف میں مبتلا کر دیتیں اور کبھی اسے اپنے بھائی کا چہرہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ وہ آج بھی بہت دن پہلے کی طرح سے مالا سے التجا کرتے کہہ رہا تھا۔

”تو اپنے دکھ مجھ سے کیوں نہیں کہتی؟ مجھے بتا، تیرے ساتھ علی عیسیٰ نے کیا کیا تھا؟ آخر تین سال پہلے کیا ہوا؟ مجھے بتا مالا.....! میں تیرے سارے دکھوں کا مدد ا کروں گا، میں تیرے مجرم کو انجام تک پہنچاؤں گا۔“ اس کا بھائی آج بھی سوال کر رہا تھا، مالا آج بھی خاموش تھی، وہ اسے کیا بتاتی؟ وہ اپنے بھائی کو بھلا کیا بتا سکتی تھی اسے کسی کی بریلی نگاہوں نے محمد کر دیا تھا۔ وہ کسی کی خوفناک ترین آنکھوں کی دہشت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کی حسین تر آنکھوں سے بھی خوف آیا تھا۔

کیا خوب صورت آنکھیں بھی کسی کو سہا سکتی ہیں؟ کیا حسین چہرے بھی دہشت زدہ کر دیتے ہیں؟ شاید ایسا نہیں ہوتا..... مگر مالا کے ساتھ ایسا ضرور ہوا تھا۔ وہ ایک ملکوئی حسن رکھنے والی اپنی ہی ہم عمر ایک لڑکی سے پہلے ہی روز ہر اسان ہو گئی تھی۔ مالا کو اس لڑکی کے سحر انگیز حسن نے خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی آنکھوں کے سہا دینے والے تاثر سے پہلی ملاقات میں ہی دہشت زدہ رہ گئی تھی۔

اسے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک حسین آنکھیں رکھنے والی لڑکی نے خوف کے قعر میں گرا دیا تھا۔ وہ تین سال گزر جانے کے بعد بھی اس لڑکی کی آنکھوں کے اس پہلے تاثر کے حصار سے نکل نہیں پائی تھی



تھی تاہم حسیب چاچو نے یہ رسم پھر بھی بھائی تھی۔ وہ بہت تباہی سے اپنے لاڈلے بیٹے کو دیکھ کر ڈیڈی سے کہہ رہے تھے۔

”میں ناں کہتا تھا عیسیٰ ضرور آئے گا۔ چاہے کتنا بھی مصروف کیوں نہ ہو۔ ساری میٹنگز بھاڑ میں جھونک کر بھی چلا آئے گا۔ میرا یقین کچھ غلط نہیں تھا۔“ وہ بیٹے سے گلے مل کر اب بہت جوش سے ڈیڈی کو بتا رہے تھے۔ ڈیڈی اپنے بھائی کے یقین پر ان کے اس بھروسے کی تکمیل پر مسکرا رہے تھے۔ اسے حسیب چاچو کچھ جذباتی سے لگے تھے تاہم علی عیسیٰ ان سے بہت مختلف تھا۔ اس میں بہت ضبط، حل اور ٹھہراؤ نظر آ رہا تھا۔ وہ سنجیدہ نہیں تھا تاہم بہت سلجھا ہوا نظر آتا تھا۔ جلد باز نہیں تھا، ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا تھا جبکہ چاچو نہ صرف تیز گفتار تھے بلکہ کچھ جلد باز بھی نظر آتے تھے۔ ہر کام عجلت اور جلد بازی میں کرنے والے تھے..... مگر اپنی ان خامیوں سے الگ بہت شفیق اور محبت کرنے والے باپ تھے..... اور مالا کو لگتا تھا وہ علی عیسیٰ کے عشق میں گرفتار تھے۔ پورے سفر کے دوران اور اب تک وہ علی عیسیٰ کے گہمت گانے میں ہی مصروف تھے۔ ڈیڈی اس کی تعریفوں پر بہت خوش نظر آ رہے تھے تاہم وہ اپنے باپ کے بے لاگ تبصروں پر کچھ جھینپا جھینپا بیٹھا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ انہیں خود لینے آیا تھا اور بہت اہم میننگ چھوڑ کر آیا تھا حالانکہ چاچو نے اسے منع بھی کیا تھا اگر وہ بہت مصروف ہے تو نہ آئے مگر علی عیسیٰ ان کے منع کرنے کے باوجود بھی چلا آیا تھا۔

”بھائی جان! آپ کو میرا بیٹا کیسا لگا؟ یقین مائیں پورے مشرق سے لے کر مغرب تک میرے بیٹے جیسا فرمانبردار داماد آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ میں دعوے سے کہہ رہا ہوں۔“ چاچو مزہ مزہ کر ڈیڈی کو مخاطب کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو اردو میں ہو رہی تھی۔ مالا کو لگا، علی عیسیٰ اردو سمجھتا ہے اور وہ ان کی

باتوں کو زبرد لب مسکرا کر انجوائے بھی کر رہا تھا مگر چاچو کی طرح مزہ مزہ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ تاہم جب چاچو مسکراتے ہوئے اپنی عجلت پسندانہ فطرت کے باعث اگلا لائحہ عمل بھی دہرانے لگے تھے تب علی عیسیٰ نے کچھ چونک کر پیچھے ایک نظر دیکھا تھا۔ وہ مرمر میں دیکھنے کے بجائے گردن موڑ کر دیکھنے کے بعد دوبارہ سے سیدھا ہو گیا تھا جبکہ چاچو اپنی دھن میں مگن کہہ رہے تھے۔

”کل کا دن آپ کا ریسٹ ہوگا..... پرسوں شام کو نگاہ جما کر میرے بیٹے کا تفصیلی ایکسرے ملاحظہ کر کے نکاح کا وقت مقرر کر لیجئے گا۔“ وہ بہت ہلکے ہلکے لہجے میں کہتے ہوئے اچانک سنجیدہ ہو گئے تھے اور مالا کی تو چاچو کی جلد بازیاں دیکھ کر سانس تک رک گئی۔ تبھی علی عیسیٰ نے بھی مزہ کر دیکھا تھا پھر چاچو کی طرف متوجہ ہو گیا جو اسے ڈپٹے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”تم نے کارڈ چھپوائے یا نہیں؟“ یہ اہم بات پوچھنے کا انہیں اب خیال آیا تھا اور جوں ہی انہیں خیال آیا وہ ساری باتیں بھلا کر علی عیسیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”یہ کام میں بھول سکتا تھا کیا.....؟“ اس نے زبرد لب مسکرا کر باپ کو مطمئن کرنا چاہا تھا مگر وہ مطمئن ہرگز نہیں ہوئے تھے۔

”کارڈ چھپ گئے تھے تو انہیں تقسیم بھی کر دیتے۔ یہ کام تم نے سوزن کے ذمے لگا دینا تھا۔ ویسے تو سارے زمانے میں پھرتی رہتی ہے۔“ انہوں نے اس کی خالہ زاد بہن کا ذکر کیا تھا۔ سوزن اس کی کزن اور مومن کی بیسٹ فرینڈ تھی۔ عموماً انہی کے گھر میں رہتی تھی۔ آج کل نہ جانے کہاں غائب تھی۔ سننے میں آیا تھا کہ اپنے باپ سے ملنے گئی ہے۔

”یہ کام بھی ہو چکا ہے۔“ علی عیسیٰ نے باپ کو تسلی دی تھی۔ یقیناً وہ ان سے بھی زیادہ عجلت پسندی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ مالا ان باپ بیٹے کی عجلت پسندی

ر سخت حیران تھی۔ کچھ دیر پہلے والی علی عیسیٰ کے متعلق اس کی رائے بھی بدل چکی تھی۔ یقیناً وہ اپنے باپ کی طرح ہی عجلت پسند تھا مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی وہ فرمانبردار بھی بہت تھا..... باپ کے حکم کو کیسے نظر انداز کر دیتا جبکہ وہ اس کی شادی طے کرنے سے پہلے ہی کارڈ چھپوانے کا حکم نامہ جاری کر چکے تھے۔

”دش ویری گڈ میری جان.....! تم نے آدھی فکر میری مکادی ہے۔“ اب وہ ایک مرتبہ پھر پرانی جون میں آچکے تھے۔ مگر علی عیسیٰ کے چہرے پر خاصی فکر مندی نظر آرہی تھی۔ وہ کچھ پریشان اور مضطرب تھا۔ مالا نے پہلے بیٹھ کر کن اکھیوں سے علی عیسیٰ کے چہرے پر پھیلے فکر کا اندازہ لگا لیا تھا۔ جانے وہ ایک دم پریشان کیوں ہو گیا تھا اور جانے اسے پریشان دیکھ کر مالا کا دل کیوں بچھنے لگا تھا۔ اسے علی عیسیٰ کا پریشان ہونا پریشان کر رہا تھا۔ اسے اس کے چہرے کی بے چینی مضطرب کر رہی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا ایک دم متفکر کیوں ہو گیا تھا۔ مالا کتنی بے بس تھی، وہ علی عیسیٰ کو براہ راست مخاطب نہیں کر سکتی تھی مگر کچھ دیر بعد چاچو کے پوچھنے پر علی عیسیٰ نے اپنی فکر اور پریشانی کو ظاہر کر دیا تھا۔ وہ چاچو سے انتہائی خفا لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”آپ نے جو کارڈ ز پر ڈیٹ لکھوانے کو کہا تھا، وہ کل کی ہے جبکہ نکاح آپ پرسوں کریں گے۔ حد ہے پاپا! تایا جان نے جو ایکسرے پرسوں کرنا ہے وہ آج ہی کر لیں تاکہ نکاح اپنے وقت پر ہو جائے۔“ وہ بالکل چاچو جیسا ہی تھا سنجیدگی سے بولتا ہوا کہیں کہیں مزاحیہ انداز میں گفتگو کو موڑ دیتا ہوا۔ اب بھی بہت سنجیدگی سے بات کرتے ہوئے آخر میں وہ تھوڑا اشارتی سا ہو گیا تھا۔ اس کی انتہائی شستہ رواں اردو کوسن کر جہاں مالا کی جان میں جان آئی تھی وہیں ڈیڈی اور چاچو بھی بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔

ترک وفا

”تمہارا بھی کوئی جواب نہیں حسیب.....“ ڈیڈی نے مسکرا کر چاچو کو چھیڑا تھا۔ وہ ان کی جلد بازی پر مالا کی طرح کچھ کچھ تھیر بھی تھے تاہم مالا کو لگتا تھا وہ دونوں بھائی پاکستان میں ہی سب کچھ طے کر کے آئے تھے۔

”تایا جان! میں نے پاپا سے کہا تھا کہ آپ لوگ آجائیں پھر باقی کے معاملات دیکھ لیں گے مگر پاپا کی ایک ہی ضد تھی۔ اگر میرے آنے تک کارڈز نہ چھپوائے..... تو تمہیں جرمنی سے بے دخل کرادوں گا۔“ علی عیسیٰ کی مسکراتی آواز ایک مرتبہ پھر انہیں اپنی طرف متوجہ کر چکی تھی۔ تمام سفر بہت ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران کٹا تھا۔ چاچو اور اس کی چھیڑ چھاڑ نوک جھوک میں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اسی سفر کے دوران اسے پتا چلا تھا کہ کل شام اس کا نکاح ہے۔ یہ ایک عجیب سی شادی تھی۔ کم از کم مالا کو تو بہت عجیب لگ رہی تھی۔ جس میں ایک دلہن اپنے دولہا کے پاس سمندر پار سے آئی تھی۔ حالانکہ اس میں کچھ عجیب نہیں تھا مگر ایسے تجربے سے وہ پہلی مرتبہ گزر رہی تھی سوسب کچھ بہت نیا، الگ اور عجیب نظر آ رہا تھا۔

اسی سفر میں علی عیسیٰ نے دو چار مرتبہ خود ہی اسے مخاطب بھی کیا تھا۔ ڈیڈی اور چاچو کی موجودگی میں وہ کچھ جھینپ رہی تھی تاہم اسے ہوں ہاں میں جواب تو دینا ہی تھا۔ وہ نہ بھی بولتی تب بھی چاچو نے زبردستی ہر بات میں اسے گھسیٹ لینا تھا۔ اس پورے سفر کے دوران بیٹھا بیٹھا نہایت شیریں انداز میں بولتا علی عیسیٰ ڈیڈی کو ہی نہیں بلکہ مالا کو بھی اپنا گرویدہ کر چکا تھا۔ چاچو نے سچ کہا تھا ان کے بیٹے کو دیکھ کر وہ دونوں باپ بیٹی اس کے عشق میں مبتلا ہو چکے تھے۔ وہ ایسا ہی تھا جسے دیکھ کر بس اس سے محبت کی جاتی۔

سرمنی سڑک پر فرارٹے بھرتی اس کی لاڈلی



benz ایک بہت ہی خوب صورت مکان کے سامنے آرکی تھی۔ benz سے عشق کی بھی ایک الگ کہانی علی عیسیٰ نے اسے سنائی تھی۔ دوران سفر بہت کم گفتگو ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی اس کے باوجود جب گیراج سے ڈیڑی اور چاچو نکل کر اندر چلے گئے اور وہ ان لوگوں کا سامان ڈگی میں سے نکال رہا تھا تب مالا ایک دم رک گئی تھی۔ اسے منہ اٹھا کر اندر چلے جانا کچھ مناسب نہیں لگا تھا وہ بھی اس صورت میں جب اتنا ڈھیر سامان وہ اکیلے ہی ڈھونے والا تھا۔

تب مالا نے سوچا، وہ کچھ سامان اٹھانے میں اس کی مدد کرے گی، اسے رکتا دیکھ کر وہ کچھ ٹھنک گیا تھا۔ مگر سامان اٹھا کر اندر لے جانے سے پہلے اس نے اپنی پیاری benz کی ونڈ اسکرین بہت اچھی طرح چیکادی تھی حالانکہ اس کی گاڑی پر ذرا سی گرد بھی نہیں تھی اس کے باوجود..... دُجھی سے گاڑی صاف کر کے مالا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”تمہارے آنے سے پہلے میری زندگی میں بس benz تھی۔ مجھے اس سے لافانی محبت ہے مگر اب میں اس محبت کرنا چھوڑ کر بس تم سے محبت کروں گا۔ مجھے تم بہت اچھی لگی ہو، ایک دم معصوم اور دلنشین..... لگتا ہے، تمہاری سوچ پر کسی کے نام کی ہلکی سی بھی گرد نہیں پڑی۔ میں جو ہر شناس ہوں ڈیر..... اتنا حیران کیوں ہوتی ہو..... چلو تم اندر آؤ..... میں سامان اٹھاتا ہوں..... benz کو تو چکا دیا ہے..... اب یہ صبح آفس جانے کے لیے تیار ہے..... خیر، آفس سے تو کل چھٹی کروں گا۔ آفٹر آل، اتنی دور سے مہمان آئے ہیں۔ ان کو ٹائم دینا تو بنتا ہے، مہمان بھی چونکہ خاص الخاص ہیں..... سو وقت بھی زیادہ دینا ہوگا۔ میری باتیں تو ختم نہ ہوں گی۔ چلو اندر چلتے ہیں..... تم بھی کیا سوچتی ہوگی، گاڑی میں کیسا پیبا بنا ہوا تھا۔“ وہ بغیر رکے بولے

گیا۔  
”دراصل تایا جان کی موجودگی میں ذرا کم ہوا رہا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں باپ، بیٹا بہت منہ پھٹا ہوا باتونی ہیں۔ تم ہماری باتیں سن کر کبھی بور نہیں ہوتی۔ میں یہ دعوے کے ساتھ کہتا ہوں۔“ علی عیسیٰ نے benz سے زیادہ تیز بولنے والا تھا۔ مالا نے فی الفور ایک مرتبہ پھر اپنی رائے بدل لی تھی۔ وہ منہ کھولے حیرانی سے اسے بولتا سن اور دیکھ رہی تھی۔ اسے علی عیسیٰ کا بولنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بہت نرم ملائم لہجے میں بولتا تھا..... بہت میٹھا اور دل آویز انداز..... اسے دلوں میں گھر کرنا آتا تھا۔ اسے مالا کے دل میں گھر بنانا تھا۔ اسے دلوں میں گھر بنانا اور دلوں میں بسنا آتا تھا۔ وہ مالا کے دل میں ہمیشہ کے لیے رچ بس گیا تھا۔ وہ عمر بھر کے لیے سمندر پار سے آئی اس چھوٹی سی لڑکی کے دل میں ٹھہر گیا تھا۔ وہ اس لڑکی کی آنکھ کا پہلا خواب تھا۔ وہ benz سے محبت چھوڑ کر سمندر پار سے اپنے بہت پیاروں کو چھوڑ کر آئی اس ڈری سہی لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ benz سے محبت مذاقاً نہیں کرتا تھا۔ اسے اپنی گاڑی سے بہت پیار تھا اور وہ اس کی حفاظت بھی بہت کرتا تھا۔ مالا کو اچھی طرح یاد تھا۔ ایک دن کسی جذباتی لمحے کی قید میں اس نے مالا سے کہا تھا۔ ”خدا نخواستہ تم میری زندگی سے چلی گئیں تو یہ benz بھی میرے ساتھ نہیں رہے گی۔“ وہ جو کہتا تھا ٹھیک ہی کہتا تھا اور اکثر اپنی کہی باتوں پر عمل بھی کر دکھاتا تھا۔ اس نے سچ کہا تھا۔ مالا اس کی کہنی میں کبھی بور نہیں ہوئی تھی..... اور نہ وہ اس کی کہی بات کو کبھی جھٹلا پائی تھی۔

اس بھینتی سرسی شام محض گیراج سے لے کر اندرونی حصے تک کے دوران علی عیسیٰ نے کتنی... بے تکلف فضا قائم کر لی تھی۔ اجنبیت کی گویا ایک، ایک دیوار کو ہمیشہ کے لیے گرا دیا تھا۔ یہاں آتے ہوئے جتنے اس کے دل میں

خدشے تھے سب ایک، ایک کر کے فنا ہو گئے تھے۔ اگلی صبح اتنی چنگیلی، تابناک اور روشن تھی کہ مالا کی زندگی میں ایسی کوئی سحر آج سے پہلے طلوع نہیں ہوئی تھی۔ علی عیسیٰ کے خوب صورت گھر میں یہ اس کی پہلی سویر تھی انتہائی دلنشین اور جگمگاتی ہوئی..... آج ڈیڑی اور چاچو بھی بے انتہا خوش تھے۔ رات کو شادی کی تقریب تھی تاہم یہ گھر شادی والا ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ یہاں ڈیڑی، چاچو اور علی عیسیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ حیران تھی، رات سے اس نے چاچو کی اکلوتی بیٹی مون کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ وہ ان لوگوں سے ملنے آئی تھی۔ جب وہ صبح اٹھ کر نیچے آئی تب بہت ہی اشکس سے جگمگ کرتے کچن میں علی عیسیٰ کھڑا ناشتا بنا رہا تھا۔ وہ بہت ہی مصروف نظر آ رہا تھا اور اس کے برابر یقیناً کلینر (ملازمہ) کھڑی تھی۔ وہ علی عیسیٰ کی ناشتا بنانے میں مدد کر رہی تھی اور یقیناً علی عیسیٰ اس کے ناشتے بنانے سے مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ بھی اسے مختلف قسم کی ہدایات دینا خود بھی کام میں لگا ہوا تھا۔ اسے موجود پا کر وہ کچھ حیران سا مڑا۔

”اتنی جلدی اٹھ گئیں تم، میں تو سوچ رہا تھا کہ لہج نام تک اٹھو گی۔ ادھر بربیک فاسٹ کم سچ ریڈی ہو رہا ہے۔“ وہ مسکراتا ہوا اس کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ گویا ناشتے کے بجائے لہج کرنا تھا۔ ”میں بھوک کی چکی نہیں، ڈرنیک کا بھی انتظار کر سکتی ہوں۔“ مالا نے کندھے اچکا کر علی عیسیٰ کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ کچن میں جائزہ لینے نہیں آئی تھی۔ بلکہ مختلف پکوانوں کی خوشبو کا پیچھا کرتی علی عیسیٰ کو تلاش رہی تھی۔ کچن تک آنے میں اسے دشواری نہیں ہوئی۔ وہ علی عیسیٰ کی آواز پہچان چکی تھی۔ یقیناً وہ ملازمہ کے ساتھ کسی اور زبان میں بات کر رہا تھا۔ اب چونکہ وہ کچن میں آچکی تھی سو فارغ بیٹھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ دو قدم کا فاصلہ مٹاتی کو کنگ ریج تک آگئی۔ تب اس جرمن ملازمہ

نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا تھا۔ وہ چھبیس ستائیس سال کی لڑکی تھی۔ ذرا موٹی سی مگر خاصی خوش اخلاق تھی اس سے مسکرا کر اپنی زبان میں پوچھنے لگی۔ مالا جو اس کی عمر کا اندازہ کر رہی تھی کچھ چونک سی گئی۔ اس کا اخلاق لہجے سے چھلک رہا تھا۔ بہت میٹھے لہجے میں نہ جانے کیا بول رہی تھی۔ مالا ہونٹ سی علی عیسیٰ کا منہ تھکنے لگی۔ تب اس نے فراننگ پین میں آلؤ کے قتلے فرائی کرتے ہوئے اسے بتایا تھا۔ ”نئی تمہارا حال پوچھ رہی ہے۔ اسے تم سے مل کر بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔“ علی عیسیٰ کے وضاحتی انداز کو ملاحظہ کر کے جو اب مالا نے بھی خاصے جوش کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اخلاق کے بدلے... بد اخلاقی نہیں دکھا سکتی تھی۔ اس کے نرم رویے کو محسوس کر کے نئی کچھ اور پھلتی نہ جانے پھر کون سی رگت مت کرنے لگی تھی۔ اب کہ نئی نے بولتے ہوئے سنگترے کا جوس اس کے سامنے کیا تھا۔ مالا نے یہی سمجھا وہ اس سے پوچھ رہی ہے کہ جوس لوگی یا نہیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تب ایک مرتبہ پھر علی عیسیٰ نے مداخلت کی تھی۔ وہ اسے بغیر شرمندہ کیے بہت نرمی سے بتا رہا تھا۔ ”نئی پوچھ رہی ہے تم کیا کھانا پسند کرو گی؟“ علی عیسیٰ گویا ان دونوں کے درمیان گفتگو بڑھانے کا سبب بن گیا تھا۔ اس نے مالا کو بتایا تھا نئی کو انگلش نہیں آتی، وہ صرف اپنی مادری زبان میں بات کر سکتی تھی۔ تب مالا کو لگا اسے دیواروں سے ہی زیادہ ہم کلام ہونا پڑے گا۔ ظاہر سی بات تھی چند دن تک علی عیسیٰ گھر میں تھا بعد میں اسے دفتر بھی جانا تھا۔ تب نہ جانے اس کا کیا بنتا.....؟ مگر وہ بعد کی باتوں کو ابھی سے نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد نئی نے جوس اور فرائی شدہ قیمہ سلاکس میں سجا کر اس کے سامنے رکھا تھا۔ ”لہج بس تیاری کے آخری مراحل میں ہے تب



تک تم جوس اور سینڈویچ کھا لو۔“ علی عیسیٰ، نینی کو برتن لگانے کا کہہ کر اس کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ اس کے سامنے بھلا کیسے کھاتی؟ جو ایک گھونٹ جوس کا بھرا تھا۔ وہی حلق میں پھنس گیا تھا۔ اسے لگا، وہ کبھی اس کے سامنے کچھ کھانہ نہیں سکے گی۔ وہ بہت پر شوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر شاید وہ اسے نہیں سینڈویچ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے سینڈویچ کو چکھا تک نہیں تھا۔

”کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟ آج تو سب کچھ ویسی بتایا ہے، تم اسے چکھو تو سہی۔“ اب وہ اتنے پیار سے مجبور کر رہا تھا تب مالا کو سینڈویچ چکھنا ہی پڑا۔ وہ تو شاید اسے پورا سینڈویچ کھلا کر اٹھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ سو مالانے اس کا دھیان بنانے کی غرض سے کہا۔

”مون کہاں ہے؟ وہ نظر نہیں آئی؟“ مالا کو موضوع بدلنے کے لیے اتنا اچھا مون کے علاوہ ٹاپک نہیں مل سکتا تھا۔ اس کا سوال سن کر علی عیسیٰ قدرے بچھ سا گیا تھا۔ اس کے چہرے کی جوت بھی ہلکی پڑی گئی تھی۔ وہ اتنا اداس اور مضطرب نہ جانے کیوں ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا وہ اپنا سوال پھر سے دہرائے مگر اس کے سوال دہرانے سے پہلے ہی علی عیسیٰ نے بہت بچھے لہجے میں بتایا تھا۔

”مون ہماری نانی کی طرف ہوتی ہے۔ می کے بعد اسے نانی نے اپنے پاس رکھ لیا تھا پھر بعد میں پاپا اسے لے آئے مگر اب وہ پھر نانی کے گھر چلی گئی ہے۔ ہماری گروس موٹر بہت ناکس ہیں۔“ علی عیسیٰ نے مون کے متعلق بتاتے ہوئے شاید بہت ساری باتوں کو چھپا لیا تھا۔ اس نے مالا کو یہ نہیں بتایا تھا مون ان باپ، بیٹے کے ساتھ لڑائی کر کے گئی ہے اور وہ ان دونوں سے ناراض تھی۔ علی عیسیٰ نے مزید مون کے متعلق بات کرنے سے گریز کرتے ہوئے نینی کے بلانے پر اسے باہر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ کچھ دیر بعد ڈیڈی اور چاچو بھی آگئے تھے۔ کھانا بہت ہی

خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ جانے کون کون سی ڈشز تھیں۔ ان کے نام جانے بغیر کھانے کی لذت اور ذائقے کو انجوائے کرتے ہوئے وہ علی عیسیٰ اور چاچو کی مزید اگفتگو سن رہی تھی۔ تب چاچو نے مالا کو دیکھ کر شرارتی انداز میں کہا۔

”تم بہت خوش ہو رہی ہونا..... کہ جرمن فوڈ ویسی کھانوں جیسا ملا جلا ہے تو بیٹا.....! زیادہ خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا..... یہ تو آج میرے بیٹے نے خاص الخاص تم لوگوں کے لیے ہائل براتن، سوپن، گے میٹس ترسالات، اور دوت کوئل جیسے آٹم بنوائے ہیں۔ بالکل ویسی کھانوں جیسی لذت اور ذائقہ ہے تاکہ تم آتے ساتھ فاتے کرنے نہ لگ جاؤ۔“ چاچو کی شرارتی نظریں محسوس کر کے مالا کچھ چھینپ گئی تھی جبکہ علی عیسیٰ نے فوراً مالا کی طرف داری کی تھی۔

”پاپا! یہ ہمارے کھانے بھی اتنے ہی ذوق شوق سے کھائے گی مجھے پورا یقین ہے۔“ علی عیسیٰ نے نہ جانے کس رو میں اس کی طرف داری کرتے ہوئے اتنا بڑا دعویٰ کر لیا تھا۔ ادھر تو چاچو فوراً اس کا امتحان لینے پر تیار ہو چکے تھے۔ وہ شاید بیٹے کا دعویٰ بوجھ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ وہ تو ہائل براتن کو یہ مشکل نکل رہی تھی..... اب وہ ان باپ بیٹے کی گفتگو سن کر مزید دہل گئی۔ چاچو نے ایک پیالے میں ڈھیروں کریم سے گندمی ایک میٹھی چیز ڈال کر مالا کی طرف بڑھا دی تھی۔ سفید کریم میں تھڑی وہ کوئی ناخ تیش تھی شاید برنی یا گلاب جامن کی موٹی سی گولی۔ مالا بیٹھا بہت کم کھاتی تھی اور یہ عجیب سی سویٹ ڈش تو اس کے حلق سے نیچے اتر ہی نہیں سکتی تھی مگر چونکہ چاچو نے علی عیسیٰ کو چیلنج دے دیا تھا سو وہ علی عیسیٰ کی ہنسی کیسے گوارا کر سکتی تھی۔

اس نے بہت خوشگوار انداز میں (دل ہی دل میں نہایت تکلیف اور مشقت سے) چیچ بھر کے منہ میں رکھ لیا تھا..... اور مالا کی یہ کوشش علی عیسیٰ کو مسکرانے

پر مجبور کر گئی تھی، اب وہ دوسرا اسپون بھر کر منہ میں رکھ رہی تھی۔ اسے یہ کرشل کی شیوسل (پیالہ) خالی کرنا تھی جو ناخ تیش کی گولی ارد ہیرے، انٹناس، لیغرزخ اور کریم سے بھری ”کے کے“ سے تیار اور لبالب بھری تھی۔ اتنی مٹھاس کو ہضم کرنا آسان نہیں تھا..... مگر وہ علی عیسیٰ کے ثبوت دینے اور منع کرنے کے باوجود بھی مسلسل کھائے جا رہی تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مالا سے اتنا بیٹھا بہ مشکل کھایا گیا ہوگا مگر وہ اس کے منع کرنے کے باوجود بابا کا چیلنج پورا کر چکی تھی۔ اس نے علی عیسیٰ کے کہے لفظوں کی لاج رکھ لی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر موجود سب افراد حیران تھے۔ تب چاچو نے فوراً اسے انعام کے طور پر ایک بوسے کے ساتھ کچھ بڑے نوٹ بھی دیے تھے۔ وہ اس انعام پر ایک مرتبہ پھر جھینپ گئی تھی تاہم اگلے تین ماہ تک چاچو مالا کو اسی بات پر چھیڑتے رہے تھے۔

اسی خوشگوار اور گلابی شام وہ علی عیسیٰ کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ نقرتی آبشاروں کے درمیان موجود اس سرخ ہوٹیل میں ان کی شادی اور نکاح کی تقریب بہت دھوم دھام سے انجام پائی تھی۔ سیکڑوں لوگوں نے شادی میں شرکت کی تھی۔ نہ جانے چاچو کے کس کس بندے سے گہرے مراسم تھے۔ یہاں تو رنگ و بو کا سیلاب اتر آیا تھا۔ حسین تر جگمگاتے ملبوسات میں تتلیاں اڑتی پھر رہی تھیں۔

یہاں کلاسیکی موسیقی کا ایک پروگرام بھی ہونے والا تھا۔ علی عیسیٰ کے کئی دوست سرنگیت کی تانیں لگا رہے تھے۔ ماحول بہت خوشگوار تھا۔ بھی مشرقی لبادے میں لپٹی سرخ لہنگے کو زیب تن کیے مالانے محسوس کیا تھا کہ علی عیسیٰ اس کے آس پاس نہیں نہیں ہے۔ جانے وہ نکاح کے بعد کہاں چلا گیا تھا؟ مالا کے دل میں کہیں دور بے چینیاں چکیاں بھر رہی تھیں۔ یہ سحر انگیز محفل موسیقی بھی اس کا دل خوش نہیں کر پار ہی تھی۔ اس کے دل کی ہر خوشی علی عیسیٰ کے ساتھ ہی تو

بڑی تھی۔ اس کی سوچیں وسوسوں کے گرد چکر کھا رہی تھیں۔ جب ایک دم پورا ہال اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ اس کا دل لمحے بھر کے لیے رک سا گیا تھا پھر کچھ دیر بعد ہوٹل کا ہال موم بتی کی مدھم روشنیوں سے سحر انگیز طور پر روشن ہو گیا تھا۔ ویٹرز ادھر ادھر گھوم رہے تھے کچھ موم بتیوں کو روشن کر رہے تھے۔

پھر مالا کی آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا تھا۔ انٹرنس ڈور سے داخل ہوتا علی عیسیٰ ریڈ کارپٹ پر کسی کا ہاتھ تھامے چل رہا تھا۔ اس کے برابر ریشمی روک پر سیاہ موتیوں سے بھری شرٹ پہنے ایک بہت خوب صورت لڑکی کچھ، کچھ قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے ہال بہت لمبے تھے، اتنے لمبے اور سرخ تھے گویا ریٹیم کی سرخ آبشار ہو..... اس نے بالوں کی بہت اونچی پونی کر رکھی تھی اور اس پونی میں نگینے بڑے تھے۔ سر پر یا قوت اور ہیرے سے سجا۔

کراؤن پہن رکھا تھا۔ اس لڑکی کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور وہ اسٹج تک سر جھکائے ہی آئی تھی۔ اس کے بالوں کی لمبائی دیکھ کر مالا کو اپنے گھنے، لمبے سیاہ بال کچھ چھوٹے محسوس ہونے لگے تھے اور اس کے کراؤن سے نکلتی روشنیوں کا کوئی انت نہیں تھا۔

علی عیسیٰ اس لڑکی کو بالکل اس کے سامنے لے آیا تھا۔ اب وہ بہت خوشگوار موڈ میں اس لڑکی کا مالا سے تعارف کروا رہا تھا۔

”یہ مون ہے میری چھوٹی بہن۔“ علی عیسیٰ کے لہجے میں اپنی بہن کے لیے بہت محبت تھی تو گویا وہ مون کو منا کر بالآخر لے ہی آیا تھا۔ جانے وہ اس کے ساتھ آ کیسے گئی تھی؟ مالانے سنا تھا، وہ بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہے، اپنی کئی بات سے پیچھے نہیں ہٹی۔ وہ بہت غصہ و راور عجیب سا مزاج رکھتی تھی۔ اتنی مختصر سی دیر میں بھی مالا اس کے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھی۔ اسے مون بہت نخریلی محسوس ہوئی تھی۔ ایک دم مغروری، کچھ کچھ اکھڑا اور بہت ہی عجیب..... وہ



عجیب کیوں تھی؟ پہلی ملاقات میں ہی وہ مالا کو بہت عجیب لگی تھی۔ دراصل وہ بہت ہی عجیب تھی۔ مالا کو وہ ساحرہ یا جادو گرئی لگی تھی۔ وہ تھی ہی کوئی..... جادو گرئی۔ اس نے اپنے باپ اور بھائی پر کوئی جادو پھونک رکھا تھا..... وہ ان سے لڑتی، جھگڑتی، غصہ کرتی مگر وہ دونوں اس کے سامنے مٹی کا بت بن جاتے تھے۔ وہ جو مرضی کہتی، بولتی، باتیں سناتی، دل کی بھڑاس نکالتی، کبھی چاچو اور علی عیسیٰ کی مون کے سامنے بولنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس کے سامنے سانس تک روک لیتے تھے۔ کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیتے تھے۔ مون کے سامنے ان دونوں کے تمام الفاظ گم ہو جاتے تھے۔ یہ ساری چیزیں اس نے کچھ ہی عرصے میں شدت سے نوٹ کر لی تھیں۔

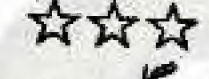
یہ باتیں اگرچہ بہت معنی رکھتی تھیں، مون کا رویہ نظر انداز کیے جانے والا تو کبھی نہیں رہا تھا تاہم جس چیز نے پہلی مرتبہ مالا کو ٹھنکا یا تھا، وہ مون کی جھکی آنکھیں تھیں۔ مون اپنی آنکھوں کو اٹھاتی ہی نہیں تھی۔ وہ کسی کی طرف بھی نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے سر جھکا رکھا تھا۔ وہ اپنی پلکیں اوپر اٹھا کر کسی کی سمت نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے مالا پر ایک اچھتی سی سرسری نگاہ تک نہیں ڈالی تھی۔ تب مالا کو پہلی مرتبہ بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ گویا وہ اس قابل تھی ہی نہیں کہ مون اپنی اکلوتی بھابی کو عام سی نگاہ سے ہی دیکھ لیتی۔ وہ اپنی مشرور تھی کہ اپنے سامنے کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتی تھی۔ اسے سرسری لہجے میں بھی اس کا احوال دریافت کرنا نہیں آیا تھا اور دیکھنے کی بات تو بہت دور تھی۔ مالا کو مون کا اندازا نارٹل نہیں لگا تھا۔ دراصل وہ نارٹل تھی ہی نہیں۔ اس کی حرکتیں، انداز بہت عجیب تھے مگر جب اس نے مدہم روشنیوں سے سجے ہال میں وائلن بجانا شروع کیا تو یوں لگا گویا دیوالدی وئیس کے سان مار کو گرجے میں وائلن بجا رہا ہے۔ موسیقی کی زبان اسے سمجھ ضرور آتی تھی مگر

مون نے آلات موسیقی سے جانے کون، کون سے نکالے تھے۔ اس نے پورے ہال کو منجھ کر دیا تھا کہ کون سے بلکی سی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ مون نے دیوالدی کے سُروں کا سحر پھونک دیا تھا کسی تنفس کی آواز تک کانوں میں سنائی نہیں دیتی تھی۔ کہیں کہیں چمکیلے فغانوں، بلوریں گلاسوں کی کھٹک فضا میں ارتعاش پیدا کرتی تھی۔

سفید رنگت والی دل آویز مسکراہٹوں کو روکنے ہوئے ہونٹوں پر سجائے ویٹریسز مختلف اور مینگے ترین مشروب کے جام لیے ادھر ادھر گھوم رہی تھی جو مہمانوں کو ٹیسٹ، ڈائننگ لڈت اور خواہش کے مطابق فوراً فراہم کیا جا رہا تھا۔ یہ بہت بڑے پیمانے پر تقریب تھی۔ اتنے مہمانوں کا مالا نے تصور بھی نہیں کیا تھا گھر میں تو کوئی زیادہ لوگ نہیں تھے۔ تاہم ہوٹل میں رنگ، رنگ اور نسل، نسل کے لوگ اکٹھے ہوئے تھے اور یہ لوگ دیوالدی کے سُروں کی محبت میں جتنا تھے۔ کچھ مون کوفن کا مظاہرہ کرنے میں مہارت بھی بہت تھی۔ وہ سر جھکائے لائبریلوں کی جھار تلنے اپنی دھن میں لگن تھی۔ اس کا یاقوت اور ہیروں سے سجا کر اڈن سرخ بالوں کی جگمگاہٹ بڑھا رہا تھا۔ یہ طلسم تب ٹوٹا جب اس نے دیوالدی کے بعد اگلے کچھ نمبر باخ موسیقاروں کے سُروں کی لے میں سنائے۔ باخ باپ اور باخ بیٹے کی موسیقی کا ذائقہ بھی ہو مر اور ہیرنگ جیسا تھا۔ بوڑھے باخ کے سُراگ رنگ رکھتے تھے، الگ سُرا، ذائقہ اور لذت رکھتے تھے جبکہ جوان باخ کے سُروں کی لذت کچھ اور تھی۔

مالا نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا یہاں سب موسیقی کے دلدادہ بیٹھے تھے۔ موسیقی کے دیوانے اور موسیقی کے عشق میں گرفتار حاضرین محفل کو سانپ سوکھ گیا تھا۔ یہ لہجائی طلسم تب ٹوٹا جب مون نے وائلن بجانا ترک کیا اور ریکارڈ پلیئر سے سُرا ایک مرتبہ پھر بکھرنے لگے تھے۔ موسیقی میں کتنی غذائیت

تھی یہ پہلی مرتبہ مالا نے یہاں آکر جانا تھا۔ مالا کو اس تقریب میں مون کی شمولیت بس یوں لگی گویا وہ انہیں وائلن کے سُرنانے آئی تھی۔ ڈنر سے پہلے ہی وہ اپنے بھائی کو جانے کون سے جواز دے کر چلی گئی تھی تاہم علی عیسیٰ کی تانتے (خالہ) کافی دیر تک رکی..... وہ بھی اگرچہ اپنی بھانجی کی طرح خاصی اکھڑی، اکھڑی تھی البتہ وہ تقریب کو چھوڑ کر گئی نہیں تھی جبکہ مون تو یوں لگتا تھا گویا جان چھڑا کر بھاگ گئی ہے۔ یہ علی عیسیٰ کی لاڈلی بہن سے مالا کی پہلی عجیب تر ملاقات تھی اور اس نے مون کی تانتے کے ہمراہ ایک اور چہرہ بھی دیکھا تھا جانے وہ کون تھی؟



مون سے اس کی اگلی ملاقات شادی کے دو مہینے بعد ہوئی تھی۔ یہ دو مہینے کتنے خوشگوار گزرے تھے۔ مالا ان کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی تھی۔ ڈیڈی واپس چلے گئے تھے جبکہ وہ علی عیسیٰ کی ہمراہی میں گویا بادلوں کے رتھ پر سوار تھی۔ چاچو نے کہا تھا علی عیسیٰ مالا کو پورا من ہائیم، وائن ہائیم گھما کر لائے۔ دراصل یہ ان کا نئی مون پیرید تھا۔ علی نے کہا تھا وہ جتنا مرضی اس کی فراغت سے فائدہ اٹھالے کیونکہ اگلے بہت سارے دنوں میں وہ ڈھیر سارا مصروف ہونے والا تھا مگر یہ دن اس نے مالا کے نام کر دیے تھے تب ہیروں کے مانند دکتی مالا کا رنگ روپ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ عیسیٰ اسے اکثر چھیڑتا۔

”اسم باسکی ہو تم، سچ میں میرے گلے کا ہار بن گئی ہو۔“ اس کے نام کا حوالہ علی عیسیٰ کی چھیڑتا تھا۔ وہ کبھی اسے ہار سنکا رکھتا، کبھی گلو بند، کبھی موتیوں کی مالا..... کبھی گلابوں کی مالا، کبھی موہیے اور جوہی کی مالا۔ ان دو ہفتوں میں عیسیٰ نے اسے سوپر مارکیٹ سے لے کر کوندی تورے، پارفیومیری، کاؤف ہاؤس تک ایک، ایک جگہ دکھا دی تھی۔ مالا کو ان بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں سے جو جگہ سب سے

بڑھ کر پسند آئی تھی وہ شینیل وارن لادن تھی یعنی کھلونوں کی دکان..... شیشے کے چمکتے شیلف پر سجے رنگ، رنگ کے کھلونے، چینی کی گڑیا، کالج کی مورتیاں، اس کا دل چاہ رہا تھا وہ کھلونوں کا پورا ڈھیر خرید لے۔ اس نے بے شمار کھلونے خریدے بھی عیسیٰ کچھ حیران تھا۔ اس کی کھلونوں سے دلچسپی کو متحیر کر رہی تھی۔ جب وہ شاپنگ بیگز لے کر کاؤف ہاؤس سے نکل رہے تھے تب عیسیٰ نے حیرت بھرے لہجے میں مالا سے پوچھا تھا۔

”کیا پاکستان میں تمہارے بھائی کے بچے ہیں؟ میرا مطلب ہے، یہ کھلونے.....؟“ وہ خاصا حیران تھا، گویا اس کے خیال میں مالا یہ کھلونوں کی شاپنگ اپنے بھتیجے، بھتیجیوں کے لیے کر رہی ہے مگر مالا نے اس کا خیال غلط ثابت کر دیا تھا۔

”میرے تو کسی بھائی کی شادی نہیں ہوئی۔“ اس نے فوراً عیسیٰ کی حیرانی دور کی تھی۔ وہ کھلونوں کے ڈھیر کو اب بھی محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تب علی عیسیٰ نے حیرت سے کہا تھا۔

”تو پھر یہ سب.....؟“ یقیناً اس کی الجھن دور نہیں ہو رہی تھی۔ اگرچہ مالا خاصی کم عمر تھی مگر پھر بھی کھلونے اکٹھے کرنے اور گڑیا کھیلنے کی عمر سے تو نکل چکی تھی پھر اس ڈھیر کو خریدنے کا نہ جانے کیا مقصد تھا۔ ”یہ تو میں نے اپنے لیے.....“ مالا کچھ بولتے ہوئے دانتوں تلے زبان کو داب چکی تھی۔ یقیناً وہ کچھ انہونی بولنے والی تھی مگر بروقت احساس ہو جانے پر ایک دم چپ کر گئی تھی مگر علی عیسیٰ اس کی ادھوری بات کا مفہوم بھی سمجھ چکا تھا۔ کبھی ایک معنی خیز تبسم اس کے چہرے کو انتہائی روشن کر گیا تھا پھر وہ جانے لگی دیر تک ہنستا رہا۔ اپنی لاڈلی benz میں بیٹھ کر بہت پیار سے ڈرائیونگ کرتا ہوا اب بھی وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بہت کھلی، کھلی، تروتازہ اور چمکیلی تھی۔ وہ پیار بھری نظروں سے مالا کو دیکھ رہا تھا۔ گویا



اس کے کہے گئے الفاظ کو انجوائے کر رہا تھا۔ اس کے لہجے کے معصومانہ پن سے محفوظ ہو رہا تھا۔ اس کی بے ساختگی اور سادگی سے حفا اٹھا رہا تھا۔ اس کی بڑبستی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتا پا کر مالا بہت کنفیوز ہو گئی تھی۔ وہ اس کی... بے باکانہ نظروں سے گھبرا جاتی تھی۔ عیسیٰ کو یک نیک اپنی طرف دیکھتا یا کر اس نے بہت بوٹی سی دلیل دی تھی۔

”مجھے کھلونے اچھے لگتے ہیں، اسی لیے خریدے ہیں۔“ مالا جانتی تھی اس کا جواز بوجس ہے..... اس کی دلیل ہلکی ہے اور الفاظ ایسے نہیں جو علی عیسیٰ کو قائل کر لیں۔ وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا مگر اس کی وضاحت ملاحظہ کر کے کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

”میں نے تم سے وضاحت تو نہیں مانگی۔“ عیسیٰ نے بہ مشکل مسکراہٹ سمیٹ کر کہا تھا۔ وہ اب بھی معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا تب وہ کچھ جھنجھلا گئی تھی۔

”تو پھر.....؟“ اس کا اشارہ اس کی معنی خیز مسکراہٹ کی طرف تھا۔ وہ بہت جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ بہت کنفیوز ہو رہی تھی۔ تب عیسیٰ نے سابقہ کھلکھلاتے لہجے میں اسے ایک مرتبہ پھر چھیڑا تھا۔

”تم تو پاپا اور مجھ سے بھی زیادہ فیوچر پلاننگ کے لیے اتا ولی ہو..... اتنی تیز رفتاری..... ایسی جگت پسندی..... اتنی دوراندیشی..... ویسے یہ کھلونے ایک دو سال تک مہنگے نہیں ہونے والے تھے۔“ اب وہ اس کے جملوں کو پکڑ کر کتنا ستائے گا، یہ بات مالا پہلے سے سوچ نہیں پائی تھی اور اسے یہ بھی خبر نہیں تھی۔ عیسیٰ نہ صرف اسے تنگ کرے گا بلکہ چاچو کو بھی اس کی دوراندیشانہ شاپنگ کی تفصیل سنا دے گا۔ مالا تو اتنے پیارے، پیارے کھلونے لا کر پچھتائی تھی۔

ادھر چاچو بھی گویا عیسیٰ کی تفصیل سن کر بہت پرجوش ہو گئے تھے۔

”آخر میری بھتیجی ہے، نہایت سمجھدار اور...“

دوراندیش... میں تمہارے لیے رشتہ مانگنے جانے سے پہلے کارڈ تک چھپوانے کی بات کر گیا تھا پھر وہ میری غلط فہمی سے متاثر کیوں نہیں ہوتی۔“ چاچو اور عیسیٰ کے درمیان نوک جھوک چلتی رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت بے تکلف تھے جبکہ مالا کچھ جھینپ کر وہاں سے اٹھ گئی تھی مگر عیسیٰ نے اس کی اگلے بہت سارے دن تک بھی گت بنائے رکھی تھی۔ کبھی وہ اتنی سنجیدہ گفتگو کے درمیان اچانک کہتا۔

”یار مالا! تم نے بے بی ڈر۔ سز تو لیے ہی نہیں۔ بس کھلونے اٹھالائیں..... کسی دن پھر چکر لگاتے ہیں۔“ اس قسم کے جملے ہمہ وقت عیسیٰ کی زبان پر رہتے..... وہ اسے تنگ کرنے، زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا..... اکثر بہت اہم دفتری فائل کا مطالعہ کرتے ہوئے چونک کر اسے مخاطب کرتا، وہ جو سمجھتی تھی شاید اسے کوئی ضروری بات یاد آگئی ہے مگر عیسیٰ کی ضروری بات سن کر بھٹا اٹھتی تھی۔ وہ بہت معصومیت بھرے لہجے میں اسے جتاناتا۔

”اب کے کچھ فیڈر اور چونسٹیاں بھی لے آنا۔“ عیسیٰ کی معصومیت بھری تشریحات محسوس کر کے وہ زچ ہو اٹھتی تھی پھر خود ہی بھٹا بھٹا کر کھلکھلا کے ہنس پڑتی۔ عیسیٰ کی ہمرائی میں ایک دن بھی اس کی پلکیں جھنجھنی قطروں سے بھیگی نہیں تھیں۔ وہ اپنے بھائی، بہن کو یاد کرنے کے بہانے بھی روئی نہیں تھی۔ دراصل عیسیٰ اسے اتنا مصروف رکھتا تھا کہ مالا کو اپنے گھر والوں کو یاد کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

☆☆☆

ایک دن عیسیٰ اسے ہوہن موس کا جنگلاتی میلا دکھانے لے آیا تھا۔ جنگل میں سے کئی راستے گزرتے تھے جو ایک چھوٹی سی آبادی کی طرف لے جاتے تھے۔ جنگل میں سے گزر کر اس آبادی تک جانا مالا کو خاصا خوفناک لگ رہا تھا۔ مگر عیسیٰ کی تسلیاں، دلا سے اسے بہادر بنائے ہوئے تھے۔ عیسیٰ نے بتایا

تھا کہ آبادی کی طرف جانے والے رستے شہری سڑکوں کی طرح ہر قسم کے نشانات اور اشاروں سے مزین ہیں۔ رات کو بھی سفر دشوار نہیں تھا۔ سڑکوں پر گہرے رنگوں کے تیر بنے ہوئے تھے جو رات کو لٹکارے مارتے تھے۔ یعنی سفر کٹھن نہیں آرام دہ تھا۔ اور دیہی علاقوں میں ایسی سہولیات مالا کے لیے حیران کن تھیں۔

وہ سچ کے بعد گھر سے نکلے تھے پھر طویل جنگل کی سرنگ سے نکل کر کھلے آسمان تلے آئے گویا مالا کی جان میں جان آئی تھی۔ اسے پورے رستے یہی خوف لاحق رہا تھا کہ جنگلی جانور کہیں سے نکل کر ضرور بد مزگی پھیلائیں گے اگر زیادہ غصیلے ہوتے تو انہیں چیر پھاڑ بھی سکتے تھے مگر یہ محض مالا کے اندیشے تھے۔ سارے سفر میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ آبادی کے قریب ہی ہوہن موس کے گریجا گھر کی گھنٹیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ جانے یہ کس قسم کا میلا تھا۔ مالا کے ذہن میں تو پاکستان میں مختلف علاقہ جات میں ہونے والے میلے گھوم رہے تھے مگر یہاں ویسا کچھ بھی نہیں تھا۔ پان والوں کے اسٹال تھے نہ تلفی والوں کی پکار، نہ چھولے، نہ جانوروں کے کرتب..... یہاں بہت رش ضرور تھا۔

”اتنے لوگ قطار در قطار کہاں جا رہے ہیں؟“ مالا نے حیرانی سے عیسیٰ کو مخاطب کیا۔ اس کی حیرت بجاتی تھی۔ وہ مختلف ٹولیوں میں موجود لوگوں کو ڈھلوان سے اترتے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ جانے یہ لوگ کہاں جا رہے تھے؟

”آج گولڈ ڈیفنٹ ہے ناں.....“ عیسیٰ کے بتانے پر وہ ہکا بکا سی اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ڈھیروں ناگواری اتر آئی تھی۔ اس کی سفید پیشانی بل دار ہو گئی..... ہونٹ ایک دوسرے میں چھینچ گئے۔

”مگر ہمارا یہاں کیا کام.....“ وہ بہت چاہ کر

# کیا آپ شکر موزی مرض سے نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے بیزار پریشان فکر مند ہے۔ ہم نے ایک طویل عرصہ دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا ہربلز شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جو کہ انشاء اللہ آپ کو شوگر سے نجات دلا سکتا ہے۔ شفا منجانب اللہ پر ایمان رکھیں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ یاد رکھیں شوگر کی مرض تو انسان کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھوکھلا کر رہے جان بنا دیتی ہے۔ اگر آپ بھی شوگر سے نجات چاہتے ہیں تو آج ہی فون پر تمام علامات بیان کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوائیں۔ خدارا ہمارا شوگر کورس آزما کر تو دیکھیں

## المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)  
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان  
0300-6526061  
0301-6690383  
صبح 9 بجے سے دوپہر 1 بجے تک  
عصر 4 بجے سے رات 10 بجے تک  
فون اوقات

آپ صرف فون کریں شوگر کورس ہم پہنچائیں گے







طرف موڑ کر باندھا ہوا تھا۔ سیفور کو باندھنے کا اسٹائل بھی بڑا منفرد سا تھا۔ مالا نے اس اسٹائل میں تو کبھی اسٹائل نہیں لیا تھا۔ حالانکہ اس نے آج تک سربکھی رنگا نہیں کیا تھا۔ تاہم اس لڑکی کے سیفور لینے کا اسٹائل مالا کو بہت اچھا لگا تھا۔ پھر اس کے دونوں کان بھی سیفور میں چھپے نہیں تھے۔ اس نے دونوں کانوں میں سفید گول، گول اور ہرینگے (پالیاں) پہن رکھی تھیں جس کے نیچے موٹا سا سنہری موتی لٹک رہا تھا۔

وہ اس لڑکی سے نگاہ تب ہٹا پائی تھی جب علی عیسیٰ اسے اٹھا کر ایک ہجوم کی طرف لے آیا تھا۔ یہاں شیشے کے بڑے، بڑے صندوقے نصب تھے۔ کیمیائی پانی سے بھرے ہوئے..... اس کیمیائی واٹر میں انسانی ڈھانچے کھڑے تھے۔ قدیم زمانے کے کچھ بڑے بڑے عظیم پادریوں کی ہڈیاں اور ڈھانچے تھے۔ اتنا ہیبت ناک منظر دیکھ کر وہ عیسیٰ کے روکنے، بلانے اور آوازیں دینے پر بھی رکی نہیں تھی جبکہ اسے اٹنے قدموں باہر نکلتے دیکھ کر علی عیسیٰ بھی اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ تب مالا کو ایک جگہ ہال میں رکھ دیکھ کر وہ خود بھی رک گیا تھا۔ اس نے مالا کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر لیا تھا۔ وہ ایک روتی ہوئی سیفور ڈھکے سر کو جھکتی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ علی عیسیٰ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا تھا پھر اس نے مالا کے چہرے پر پھیلتے تاسف کو دیکھ کر کہا۔

”یقیناً تم اب اس لڑکی سے رونے کا سبب پوچھنا چاہتی ہو؟“ وہ مالا کی رقیق القلبی اور نرم دلی سے اتنی کم مدت میں ہی واقف ہو گیا تھا۔ وہ بہت نرم دل تھی۔ بہت سادہ فطرت رکھتی تھی۔ بہت نرم مزاج رکھتی تھی۔ بہت حلیم الطبع تھی۔ وہ کسی کو بھی تکلیف میں دیکھ کر آگے بڑھ جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ ”یہ لڑکی.....“ مالا کو اس لڑکی کے رونے نے تکلیف دی تھی۔ جانے وہ کب سے یہاں بیٹھی رو رہی تھی۔ دورانِ سروں بھی روتی رہی تھی۔ اب پورا

ہال خالی ہو جانے کے بعد بھی تنہا بیٹھی رو رہی تھی۔ تب اس کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے علی عیسیٰ بتایا تھا۔

”یہ لڑکی سوزن ہے، تانتے کی بیٹی..... شادی میں بھی آئی تھی۔ شاید تمہیں یاد نہیں۔“ سانس کھینچ کر اسے متحیر کرتا وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ تعارف کے بعد سوزن کی طرف بڑھا تھا نہ ہی اسے دریافت کرنے کی اس نے ضرورت محسوس کی تھی۔ اسے عیسیٰ کا رویہ عجیب لگا تھا۔ بھلا ایسی بھی کیا بی بی عیسیٰ؟ بندہ رشتے داری کا تقاضا ہی بنا رہا ہے۔ اب جبکہ وہ اس کی کزن کو دیکھ چکی تھی سوزن آگے بڑھ جانا کچھ مناسب نہیں تھا مگر جب علی عیسیٰ نے سلام دعا کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی تو پھر مالا کیسے رک جاتی۔ حالانکہ سوتی روک میں ملبوس اس لڑکی کے آنسوؤں نے مالا کو قدرے بے چین کر دیا تھا مگر وہ رک کر اس لڑکی سے رونے کا سبب پوچھ سکتی تھی پھر اس لڑکی کی زبان اس کے پلے پڑنے والی نہیں تھی۔ سو ہمدردی کا جذبہ اس نے دل میں ڈال دیا لیا تھا۔

”سوزن رو کیوں رہی تھی.....؟“ علی عیسیٰ کے برابر چلتی مالا کا دل تاریخی تہ خانے نما گرجے کے ہال میں روتی ہوئی سوزن میں اٹکا ہوا تھا..... اس کے بے تکے سوال نے علی عیسیٰ کو خاصا بیزار کر دیا تھا۔ شادی کے بعد اتنی کم مدت میں پہلی مرتبہ مالا کے کسی سوال پر علی عیسیٰ بیزار ہوا تھا۔

”مجھے اس کے من کی کیا خبر.....؟ اللہ جانے کیوں رو رہی تھی۔ شاید عبادت کے دوران آخرت کے خوف سے روتی ہوگی۔“ اس کا انداز سراسر تالے والا تھا اور وہ سوزن پر مزید بحث نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی سوزن کے رونے پر روشنی ڈالنا چاہتا تھا۔ اسے بیزار دیکھ کر مالا چپ کر گئی تھی۔ یعنی وہ اس کا بدلتا موڈ دیکھ کر اچھی بیویوں کی طرح سمجھ گئی تھی کہ اسے اس

کاپک پر مزید نہیں بولنا۔ کچھ دیر کی معنی خیز خاموشی کے بعد علی عیسیٰ نے خود ہی بتانا شروع کر دیا۔ ”سوزن کے ساتھ مون بھی آئی تھی۔ شاید تم نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر فوراً یہاں سے چلی گئی تھی۔“ اس کے ایک دوسرے انکشاف نے مالا کو ہکا بکا کر دیا تھا۔

”مون کا یہاں کیا کام تھا؟“ اس نے بہت تیز لہجے میں بے ساختہ پوچھا تھا۔ اسے مون کا چرچ آنا بہت عجیب لگا تھا۔ وہ مسلمان تھی اور ایک مسلمان کی بیٹی تھی پھر گرجے میں کیا کر رہی تھی؟ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں کی طرح محض چرچ دیکھنے آئی تھی۔ وہ اس علاقے میں رہتی تھی یہ عمارت تو اس نے سیکڑوں مرتبہ دیکھ رکھی ہوگی پھر یہاں کیا لینے آئی تھی؟ اس کا چبھتا سوال سن کر علی عیسیٰ نے بہت تکلیف دہ لہجے میں کہا۔

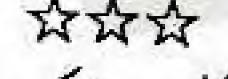
”وہ سوزن کے ہمراہ ہر اس جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں اس کا جانا مناسب نہیں ہوتا۔ اسے سوزن سے محبت جو بہت ہے۔“ مالا کو علی عیسیٰ کے لہجے میں دبا، دبا غصہ اور عجیب سی ناگواری محسوس ہوئی تھی۔

”مون اتنے دنوں سے گھر بھی نہیں آئی؟“ اس نے قدرے حیرانی سے کہا تھا۔ یہ سوال تو جانے کب سے اس کی نوک زبان پر چل رہا تھا۔ آج موقع پا کر اس نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔ اندر سے وہ کچھ ڈری بھی تھی شاید علی عیسیٰ کو اس کے سوال پر غصہ آجائے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ علی عیسیٰ کو اس کے سوال پر غصہ نہیں آیا تھا۔

”مون کچھ عرصے پہلے پایا اور مجھ سے لڑ بھگڑ کر گھر چھوڑ گئی ہے..... اب وہ کم، کم ہی واپس آتی ہے، میں ہی اسے مجبور کر کے واپس لاتا ہوں۔ وہ ظہرنے کے لیے نہیں بس گھڑی دو گھڑی کے لیے آتی ہے۔“ اس کے انکشاف پر مالا ایک مرتبہ پھر دم بخود رہ گئی تھی تو گویا مون گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ مگر

کیوں.....؟ آخر وجہ کیا تھی؟ بہت چاہنے کے باوجود بھی مالا اس سے یہ سوال نہیں پوچھ پائی تھی پھر کچھ دیر بعد علی عیسیٰ نے موضوع بدل دیا تھا۔

”ہم کچھ دیر تک گروس موٹر کی طرف چلتے ہیں۔“ وہ سنجیدہ سا اپنی لاڈلی benz کی طرف بڑھ گیا تھا۔ یقیناً اسے کھانے پینے کا سامان ڈگی میں سے نکالنا تھا۔ مالا بھی سر جھٹک کر علی عیسیٰ کے پیچھے چلی آئی تھی۔



سورج اپنے پگھلے سونے کو دوبارہ سمیٹ رہا تھا۔ آپس کے پہاڑوں پر مرغائیاں اب کہیں نہیں تھیں۔ یقیناً جنگل کی طرف رواں دواں ہو چکی تھی۔ گرجے کا سنہرا کلس اب رات کے چھٹپٹے کی زد میں تھا۔ ماحول کچھ کچھ ہیبت ناک ہو رہا تھا۔ مالا کا ننھا سادل سہم رہا تھا۔ حالانکہ ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی کیا بات تھی؟ علی عیسیٰ اس کے ہمراہ تھا مگر وہ رات کو واپسی کے سفر کی وجہ سے کچھ پریشان تھی۔ پھر اس کی پریشانی محسوس کر کے علی عیسیٰ نے مالا کو بتایا تھا۔

”ہم آج کی رات یہیں رکیں گے۔ واپسی کل سویرے ہوگی۔“ عیسیٰ کے بتانے پر مالا کچھ ہونق پن سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”ہم کیا اس جنگل میں رات بسر کریں گے؟“ جنگلی جانوروں کے خوف سے اس نے ایک بے تکا سوال کیا تھا تب علی عیسیٰ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ یقیناً مالا کے سوال کو اس نے بہت انجوائے کیا تھا۔ پھر وہ اسے ہونق مونس کے جنگلاتی میلے کے متعلق بتانے لگا تھا پھر اس کے واپس جانے کی رٹ سن کر ملائمت سے بولا۔

”تو کیا تم میلا دیکھے بغیر چلی جاؤ گی؟ میں تمہیں یہاں لایا کس لیے ہوں۔“ اس کے نرمی سے ڈپٹے پر وہ ایک مرتبہ پھر ہونق ہو گئی۔



”میلا دیکھنا بھی باقی ہے؟ مگر یہ میلا لگا کہاں ہے؟“ مالا کے برجستہ ہونق پن کے مظاہرے کو دیکھ کر علی عیسیٰ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ اسے مالا کی بے ساختگی بہت بھائی تھی۔ وہ اس کی باتوں کو بہت انجوائے کرتا تھا۔

”ابھی میلا آپ نے دیکھا کہاں ہے محترمہ؟“ کھانے کے برتن سمیٹ کر وہ مالا کو لیے ایک ایسی کھلی جگہ پر آیا تھا جہاں رات جگمگ رہی تھی۔ یقیناً وہ پہلے بھی یہاں آتا رہتا تھا کیونکہ اسے دیکھ کر بہت سے جرمن نوجوان ملنے کے لیے آئے تھے۔ یہ درختوں کے جھنڈ میں کوئی وسیع جگہ تھی۔ ایک اونچا لکڑی کا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ جس کے چہار اطراف میزیں اور کرسیاں لگی تھیں۔ پیچھے ایک مکان نما عمارت تھی جس کی بالکونی میں بینڈ گروپ، انجنائی ٹیس یونیفارم میں ملبوس چاق و چوبند بیٹھا تھا۔ تانبے کے بگل اور ٹرامبون کے ساتھ نغیریاں، ہر قسم کے ڈرم وغیرہ بھی نظر آ رہے تھے۔ مالا کو سب سے زیادہ پُرکشش اس تمام منظر میں بینڈ والوں کے نیلے پیلے، ربن اور سبز رنگ کے ہیٹ لگے تھے۔ ان لوگوں نے وائٹ شرٹس پہن رکھی تھیں نیچے نیلے رنگ کی شینیل کی برجمیں تھیں۔ اس رنگیلے بینڈ کا لباس اتنا کلر فل، یونیک اور جھالروں سے مزین تھا کہ نظر ان سے ہٹ نہیں رہی تھی۔ تو یہ ہو، ہن موس کا جنگلاتی میلا تھا۔ پاکستان کے تقریباً ہر میلے سے ہٹ کر..... یہاں فلنی والوں کی پکار نہیں تھی نہ کوئی اسٹال تھا نہ ٹھیلا..... بڑا سحر انگیز خوابناک ماحول تھا۔ کہیں کہیں موسیقی کی ہلکی گونج سنانے کو چیر دیتی تھی۔ خصوصاً اسٹیج کو مصنوعی روشنیوں نے اجالا بخش رکھا تھا۔ طلسماتی روشنیوں میں نیلی لہریں عکس چھوڑ رہی تھیں۔ لوگ جوق در جوق میلے میں شرکت کرتے آ رہے تھے اور انہی لوگوں میں مالا نے تقریباً دو ہفتے بعد ایک مرتبہ پھر اس جھکی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس نے

نیلی روک پر موتیوں سے بھری شرٹ پہن رکھی تھی اس کی اونچی پونی سے بالوں کی سرخ آبشار رواں ہوتی نظر آ رہی تھی۔ اس کے سر پر آج بھی یا قوت سے ہیرے سے سجا کر اؤن تھا۔ انتہائی روشنیوں میں اس کے کمر اؤن سے چمکدار لہریں نکل رہی تھیں۔ اس کے سرخ بال روشنی میں بے انتہا چمکیلے نظر آ رہے تھے۔ آج وہ سرخ بالوں والی لڑکی اکیلی نہیں تھی اس کے ہمراہ تاریخ کے تہ خانے میں دبے اس کے فرش پر بیٹھ کے زار زار روتی لڑکی بھی کچھ چلی آ رہی تھی۔ ویسا ہی سیفورا اس کے سر پر بندھا تھا۔ وہ سوتی فراک میں ملبوس تھی اور اس کے فراک کی فرل زمین کو چھو رہی تھی۔ آج بھی اس کے کانوں میں وہی انیر رنگ جھول رہے تھے۔

وہ دونوں مالا کے قریب سے گزر کر ایک دوسری ٹیبل پر بیٹھ گئی تھیں۔ تب علی عیسیٰ کی نگاہ نے ان دونوں کو فوراً کھوج لیا تھا۔ یقیناً وہ دونوں بھی اس ورلڈ فیسٹ کو دیکھنے آئی تھیں۔ کچھ دیر بعد علی عیسیٰ ان دونوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ یقیناً وہ اپنی بہن سے ملنے گیا تھا۔ اسے دیکھ کر ان دونوں لڑکیوں کے چہروں پر جگمگاہٹ آ گئی تھی کچھ غور کرنے پر مالا کو لگا تھا جگمگاہٹ صرف سوزن کے چہرے پر تھی۔ مون پہلے کی طرح بے نیازی پلکیں جھپکائے بغیر زمین کو دیکھتی، علی عیسیٰ سے محو کلام تھی۔ یقیناً اس کی گفتگو کا اسٹائل ہی یہی تھا۔ وہ مقابل کو دیکھے بغیر گفتگو کرتی تھی۔ اسے مون کا طرز کلام کچھ عجیب نہیں بے انتہا عجیب لگا تھا۔ یقیناً وہ لڑکی بہت ہی عجیب تھی۔

ایک مرتبہ پھر وہ مالا کو نظر انداز کر چکی تھی۔ مالا کو نظر انداز کیوں کرتی تھی؟ اس کا مالا کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ سفید گلاب اور سوسن کے پھولوں سے گندھی مالا کی آنکھوں میں نشینی قطرے اٹا آئے تھے۔ اسے اپنی اکلوتی تند کے کٹھور رویتے نے نہیں پہنچائی تھی۔ اس کا ننھا سادل بچھ گیا تھا۔ آخر وہ اس



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، ہارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو بیسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تذکرہ

جاری تھا۔ علی عیسیٰ خاصی دلچسپی لیے زمین تک چھوٹے فرائگ پہنے لڑکیوں کے رقص کو دیکھ رہا تھا۔ جو قابل اعتراض حد تک کھلے گلے پہنے ہوئے تھیں۔

مالا کو علی عیسیٰ کی یہ دلچسپی کچھ بھائی نہیں تھی مگر وہ اس کی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھ سکتی تھی۔ کچھ دیر بعد اسٹیج سے کسی نے اعلان کیا..... مالا کے لیے کچھ نہیں پڑا تھا تاہم اس کا ترجمان قریب ہی بیٹھا تھا سو فوراً اسے رقص کے کسی اگلے آئٹم کے متعلق بتانے لگا تھا۔ علی عیسیٰ یہاں آکر بہت الجوائے کر رہا تھا۔ کم از کم مالا نے تو یہی محسوس کیا تھا۔ یہ علاقائی رقص ان لوگوں کے محبوب ترین ڈانس میں شمار ہوتا تھا۔

کچھ دیر بعد جب محفل کا رنگ کچھ اور بدلا تو مالا نے علی عیسیٰ کو اٹھنے کے لیے اصرار کرنا شروع کر دیا تھا پھر جب وہ روشنیوں سے اٹھ کر ایک دم اندھیرے میں آئے تب مالا کچھ سم گئی تھی۔

”اگر کسی جنگلی درندے کے ہتھے چڑھ گئے ہم تو ہمارا کفن دفن بھی کوئی نہیں کرے گا۔“ مالا کی خوفناک بات سن کر علی عیسیٰ نے مصنوعی خوف بھرے لہجے میں کہا۔

”اللہ کی بندی.....! ڈراؤ مت، ویسے میں ہوں ناں تمہارے ساتھ..... کسی درندے کی جرات نہیں ادھر نگاہ ڈالے۔“ وہ اس کی طرف جھک کر شرارتی لہجے میں بولا تھا۔ تب اس کا رویٹنگ موڈ ملاحظہ کر کے مالانے قدرے مسکرا کر کہا۔

”آپ مجھے بیونہ پر ناچتی فرولائن تو نہیں سمجھ رہے.....؟“ اس کی ٹوک جھوک اور ہلکی پھلکی گفتگو علی عیسیٰ کا موڈ کچھ اور خوشگوار کر گئی تھی۔ وہ باتوں کے دوران ہی سرخ چھت والے اس خوب صورت مکان تک پہنچ گئے تھے جس کے دروازوں اور کھڑکیوں کے سامنے پھولوں سے لدی ٹوکریاں آویزاں تھیں۔ ایک طرف پہاڑ کے قعر سے آبشار پھوٹ رہی تھی اور دوسری طرف سفید گلابوں کے

کے ساتھ اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں تھی؟ جب بواریا کی ٹیاریں ایک جیسے لباس میں اپنے حسن کے جلوے دکھائی دیتے تمام مہمانوں کو شراب کے بلوری جام پیش کر رہی تھیں تب مالا چپکے، چپکے اپنے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

دیہات کے صحت مند ماحول میں پروان چڑھی یہ لڑکیاں بہت تروتازہ اور دلقریب تھیں۔ وہ مالا کے پاس بھی وہسکی کے گلاس لے کر آئیں۔ اس نے فوراً بک کر انکار کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک گوری دو شیزہ علی عیسیٰ کو بھی مشروب دینے پہنچ گئی تھی۔ علی عیسیٰ نے بھی شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ کچھ ایسا ہی انکار مومن اور سوزن کے چہروں پر بھی لکھا تھا۔ ان کے چہروں پر وہسکی کی طلب یا چاہ نہیں تھی۔ کچھ فاصلے پر موجود مالا کے دل کو جانے کیوں اطمینان محسوس ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بواریا مردوں نے باقاعدہ ڈانس کر کے محفل کا آغاز کیا تھا پھر لوگوں کے ہجوم پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یہ لوگ ہر کام بڑے نظم و ضبط سے کرتے تھے۔ چاہے عبادت تھی یا رقص و سرود کی محفل..... اب بھی ماحول پر سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اپنے محبوب رقص، شوہ پلاٹر کو انجوائے کر رہے تھے۔ بینڈ کے سُر بھی گونج رہے تھے۔ یقیناً ان لوگوں کے لیے یہ محفل بہت معنی رکھتی تھی مگر مالا کا جی اچاٹ ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد علی عیسیٰ واپس آ گیا تھا۔ اس نے بتایا تھا مومن اور سوزن واپس چلی گئی ہیں اگرچہ وہ کوئی بہانہ کر کے گئی تھیں تاہم مالا جانتی تھی وہ محض اس کی موجودگی اور علی عیسیٰ کو دیکھ کر محفل ادھوری چھوڑ کر چلی گئی تھیں مگر یہ بات وہ علی عیسیٰ سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس نے ان دو مختصر ملاقاتوں میں ہی مومن کے رویے کی وجہ کھوج لی تھی۔ یقیناً وہ علی عیسیٰ کی مالا کے ساتھ شادی پر ناخوش تھی۔

بواریا مردوں کے بعد دو شیزاؤں کا رقص



وسیع باغ تھے۔

”تم بھلا بیوی ہونے پر ناچتی کوئی فرد لائن ہو سکتی ہو؟ تم تو علی عیسیٰ کی محبت ہو اور علی عیسیٰ کی محبت بیوی ہونے پر ناچے یہ اسے تصور میں بھی گوارا نہیں ہو سکتا۔“ ڈور بتل پر ہاتھ رکھنے سے پہلے علی عیسیٰ نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا تھا۔ یوں کہ مالا اس خوب صورت اظہار پر اندر تک سرشاری ہو گئی تھی۔ ایک دن علی عیسیٰ نے اسے بتایا تھا کہ وہ بہت عرصے پہلے سے مالا کے تصور اور اس کے ان دیکھے وجود سے محبت کرنے لگا تھا۔ پاپا نے اس کے ذہن میں مالا کا جو تصور قائم کیا تھا وہ ہو بہو ویسی تھی۔ علی عیسیٰ کو مالا جیسی لڑکیاں متاثر کرتی تھیں اور اس نے مالا سے محبت اسے بغیر دیکھے کی تھی۔ وہ اظہار میں جھجکتا نہیں تھا۔ نہ فضول سی انا کا شکار ہوتا تھا۔ وہ اسے اپنے فطری اور دلی جذبات کے متعلق سچ بتا دیتا تھا۔ علی عیسیٰ کی محبت میں مالا نے بہت شدت پائی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ کچھ شدت پسند ہے۔ وہ ٹوٹ کر چاہنے والا بیٹا، بھائی اور شوہر تھا۔ مالا کو لگتا تھا اگر اس نے ذرا سی بھی علی عیسیٰ کو ٹھیس پہنچائی تو وہ ٹوٹ جائے گا۔ اپنی گروس موٹر کے گھر آ کر وہ بہت خوش تھا۔ اس نے مالا کو بتایا تھا کہ وہ ہر چھٹیاں یہیں گزارتا تھا۔ اسے اپنے گروس کے گھر سے والہانہ محبت تھی۔ اس گھر میں علی عیسیٰ کی ماں کا بچپن گزارا تھا۔ اسے اپنی ماں اور نانی دونوں سے بہت محبت تھی اور پاپا سے تو عشق تھا۔

گروس، مالا سے بہت محبت اور والہانہ انداز میں ملی تھیں۔ البتہ تانتے کا رویہ مون جیسا سرد تھا جبکہ سوزن تو سامنے آئی ہی نہیں تھی۔ گروس نے بتایا تھا۔ سوزن عبادت کر رہی ہے۔ یہ ایک مذہبی گھرانہ تھا۔ گروس خود بہت مذہبی خاتون تھیں۔ گروس کے بتانے پر اسے خبر ہوئی تھی۔ سوزن کسی سنڈکیٹ کی کارکن تھی اور تبلیغ کے لیے شہر، شہر گھومتی تھی۔

گروس کے بتانے پر ہی اسے سوزن کچھ اچھی مون حد سے زیادہ بری لگی تھی۔ وہ لوگ چونکہ کھانا کھا چکے تھے سو صرف پی کر سونے چل دیے۔ دن بھر کی آوارہ گروس انہیں خاصا تھکا دیا تھا۔ گروس ان کی تھکاوٹ پیش نظر انہیں آرام کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔ حالانکہ علی عیسیٰ کو ابھی اپنی نظروں سے دور کر کے انہیں خواہش نہیں تھی۔ وہ اس سے بہت ساری بات کرنا چاہتی تھیں مگر اس کی تھکن کا خیال غالب تھا۔ علی عیسیٰ، گروس کو بہت پیار سے گوتے کرتے بول کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ اس گھر چپے، چپے سے واقف تھا سو کسی کی رہنمائی اور دکھانے کے لیے کسی گاڈ کی اسے ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کے ہمراہی میں بیڈروم میں آگئی تھی۔ ایک دوپہل سیر تھا۔ کسی گاڈ کا کمرہ تو دکھائی دے رہا تھا۔ اعلیٰ ترین فرنیچر سے مزین، انتہائی اور صاف ستھرا..... کھڑکی کے سامنے وہی جالی تالیون کا پردہ تھا جس کے گنڈے پر پھولوں تو کری لگی تھی۔

عیسیٰ تو لباس تبدیل کیے بغیر اسے لاڈ رات کا سلام دے کر نیند میں گم ہو گیا تھا۔ وہ بہت تھک چکا تھا تاہم مالا کو اس اجنبی گھر میں بھی نیند آنے والی نہیں تھی۔ حالانکہ تھکن سے انکے انگ ٹوٹ رہا تھا مگر نیند کروٹیں بدلنے پر بھی نیند آنے والی تھی۔ یہاں پاکستان سے ہزاروں میل دور، ایک اجنبی گاڈ کے پرتیش بیڈروم میں لیٹ کر وہ اپنی گزشتہ زندگی کو سوچ رہی تھی۔ اسے اپنی می اور ڈیڈی یاد آنے لگے تھے۔ اپنے پیارے بھائی ذیشان، ذی شاہ اور زر شام یاد آرہے تھے۔ لاڈ کی سیٹ کھٹ بہن بندیا کی یاد پلوں کو بھگونے لگی تھی۔ حالانکہ یہ لوگ کبھی بھولتے تو نہیں تھے مگر مشرقی ہونے کی وجہ سے اپنی سسرال آ کر اسے پچھلوں

بھلانا ہی تھا۔ اسی بات کا درس دے کر ماں نے اسے سندر پار بھیجا تھا۔ اسے ماں کے لفظوں کی لاج رکھنا تھی۔ اسے سسرال کو آباد کر کے میکے کو بھلانا ہی تھا۔ چپکے چپکے ڈھیر سا رارو لینے کے بعد من کو ہلکا کر کے وہ بستر سے اٹھ گئی تھی۔ نیند تو چونکہ آنے والی نہیں تھی۔ سو وہ کمرے میں موجود ایک دوسرا دروازہ کھول کر باہر آگئی تھی۔ یقیناً یہ بالکونی میں کھلتا تھا۔ رات کو بواریہ کا حسن کالی چادر کی بکل میں چھپ گیا تھا۔ پہاڑ کے قعر سے پھوٹنے والا چشمہ بھی نظر نہیں آتا تھا اور گلابوں کے کھیت بھی خاموش اور اندھیرے میں گم تھے۔ بس پھولوں کی دلفریب خوشبو فضا میں رچی تھی۔ مالا کو لگ رہا تھا وہ خوشبو کے کسی دلیں میں بھول کر آگئی ہے۔ اتنی سحر انگیز گلابوں کی مہک تھی جی چاہ رہا تھا کہ بالکونی سے چھلانگ مار کر پھولوں کے کھیت میں گھس کر چادر تانے وہیں آنکھیں موند کر لیٹ جائے وہ گویا تصور میں گلابوں کی پرنم پتوں پر ٹہل رہی تھی جب اچانک اس کے پیچھے کوئی چپکے سے آکھڑا ہوا تھا۔ مالا نے گردن موڑ کر دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا..... اس کے بیڈروم کا بند دروازہ کھول کر وہ کمرے میں سے گزرتی ہوئی بالکونی تک آنے والی مون کو دیکھ رہی تھی۔ بھلا مون نے لاکڈ دروازہ کیسے کھول لیا تھا اور بلکے سے کھٹکے کی آواز بھی نہیں آئی تھی پھر مون کی اس قدر غیر اخلاقی حرکت پر مالا کو بہت غصہ بھی آیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے کمرے میں پناہ اجازت رات کی تاریکی میں گھس آئی تھی یا تو اس کمرے کی ایکسٹرا چابی اس کے پاس تھی یا پھر دروازے کے لاک کھولنے کا فن اسے آتا تھا۔ جو بھی تھا، یہ قطعاً غیر اخلاقی حرکت تھی۔ مالا کا دل چاہا، وہ اسے اتنی گھٹیا حرکت پر باتیں سنائے..... مگر اسے ڈبچ آتی نہیں تھی۔ دوسرے وہ مالا کی بات شاید اردو میں سمجھ نہ پاتی مگر یہ بھی مالا کی سراسر بھول تھی۔ سارے ماحول پر چھائی سامنے کھڑی یہ لڑکی کوئی فنکارہ تھی یا

**یادیں**

تم نے مجھ سے مجھے جدا کر کے  
شیشہ دل کو آئینہ کر کے  
عکس اس میں اتار کر اپنا  
رکھ دیا بھولی بسری چیزوں میں  
وقت کی ادھ کھلی درازوں میں  
کسی بے نام سے گماں کے پاس  
اک ادھوری داستان کے پاس  
جس جگہ  
گشادہ خطوں میں چھپے  
آنسوؤں کی طرح چمکتے ہوئے  
یاد کے بے شمار جگنو ہیں  
درد کے بے حساب پہلو ہیں  
خشک پھولوں کی پتیوں میں کہیں  
کسی برسات کی نمی ہے جہاں  
زندگی کی بہت کمی ہے جہاں  
ٹوٹی چوڑی کے ساتھ رکھی ہوئی  
اک دسمبر کی شام کے ہمراہ  
کچھ خزاں کے بھی دن بڑے ہیں کہیں  
خواب کی دھیوں سے لپٹے ہوئے  
چاند راتوں کے سلسلے ہیں کہیں  
اور کچھ عہد و فائدہ ہوئے  
قرض سانسوں کے  
جو ادا نہ ہوئے  
اتنی چیزوں کے سچ رکھا ہوا  
آئینہ ٹوٹ بھی تو سکتا ہے  
سچ بھی چائے تو آئینے پہ پڑی  
سیکڑوں عم زدہ خراشوں میں  
کوئی صورت کہاں ابھرتی ہے  
سانس کا کیا ہے چلتی رہتی ہے

شاعرہ: ناہیدہ قمر  
مرسلہ: مہرین کنول، لیہ



جادو گرنی.....؟ مالا سمجھ نہیں پائی تھی تاہم اس کے الفاظ نے مالا کے پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔  
”تم بہت جلد علی عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو اور میرا بھائی عنقریب تمہیں طلاق دے گا یہ مت بھولنا، مون کے کہے گئے لفظ بھی غلط نہیں ہوتے۔“ وہ بہت شستہ اور رواں اردو میں مالا کے پورے وجود کو پتھر کر رہی تھی۔

☆☆☆

مون حسیب اس کی زندگی میں انتہائی پُراذیت موڑ لے کر آئی تھی۔ وہ عجیب لڑکی تھی، عجیب باتیں کرتی تھی۔ عجیب باتیں منواتی تھی اگر غور کیا جاتا تو اس عجیب لڑکی کی زندگی ایک لفظ عجیب سے گندمی تھی۔ اس کی چال ڈھال، بول چال، دیکھنے، سنانے، تاڑنے کا ہر طریقہ ”عجیب“ تھا اور خصوصی طور پر مالا سے گفتگو کرتے ہوئے وہ اور بھی عجیب لگتی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں اچانک آئی تھی اور اس کی ہر ملاقات اچھبے کا باعث تھی۔ وہ اچانک آتی تھی یعنی جہاں اس کے آنے کا کوئی گمان بھی نہیں ہوتا وہ وہاں کسی جتن زادی کی طرح ٹپک پڑتی تھی۔

مون کی آمد اسے ہمیشہ خوف کے عذاب میں دھکیل دیتی تھی۔ یہ ایسا خوف تھا جسے بہت چاہ کر بھی وہ علی عیسیٰ سے شیر نہیں کر سکتی تھی حالانکہ گروسی کے گھر اس گہری شب بلی کی چال چلتی مون چکے سے لاکڈ دروازہ کھول کر اس کے پیچھے ٹیرس پر آگھڑی ہوئی تھی تب بھی ایک بھیانک خوف اس کے معصوم دل کو بچوں میں جبکڑچکا تھا اور اس خوف کے جڑ پکڑنے سے لے کر مون کی انتہائی غیر اخلاقی حرکت پر برہمی محسوس کرنے کے باوجود اس کی ہمت نہیں پڑی تھی وہ مون کی شرانگیز بکواس کا ایک لفظ بھی علی عیسیٰ کو بتا سکے۔ کیا وہ اس کی بات کا یقین کرے گا؟ کیا وہ مان لے گا کہ رات کے دوسرے پہر اس کی بہن بے دھڑک اس کے کمرے میں گھس آئی تھی تو

پھر مالا کو اپنی بات کہہ کر گنوا بی تھی۔ ابھی اس کی شادی کو دو ہفتے ہوئے تھے اور یہ اتنی کم مدت تھی کہ علی عیسیٰ کیا اس پر اعتبار کر سکتا تھا؟ مون کے کہے پر یقین کر سکتا تھا؟ وہ الفاظ جو نیرے کی انی تھے یا تھوڑے کی ضرب تھے۔ ان الفاظ کی تکلیف محض محسوس کر سکتی تھی۔ سمندر پار سے آئی دو ہفتوں کی بیابانی چھوٹی سی لڑکی جسے اس کی ہم عمر ایک لڑکی پر کرفر سے دھمکا رہی تھی۔

”تم بہت جلد علی عیسیٰ کی زندگی سے جانے والی ہو.....“ ان الفاظ کی بازگشت نے پوری رات مالا کو ہراساں رکھا تھا۔ رات بھر ایک گھڑی کے لیے علی عیسیٰ آپس میں نہیں جڑی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے بھی نیند مہربان نہیں ہوئی تھی۔ ساعت بھر کے لیے بھی چین نے دل کو نہ چھوا تھا۔ ان دو ہفتوں میں پہلی مرتبہ اسے شدید خوف اور تہائی کا احساس ہوا تھا۔ خوف مون کے الفاظ کا مرہون منت تھا۔ بھلا وہ علی عیسیٰ کی زندگی سے نکل کر کہاں جائے گی؟ بھلا وہ علی عیسیٰ کے بنا کیسے رہ پائے گی؟

صرف دو ہفتوں میں کوئی اتنا رگ جان کے قریب ہو جاتا ہے؟ کوئی اتنا عزیز ہو جاتا ہے؟ کہ محبت اس کو کہتے ہیں؟ کسی سے کبھی نہ جدا ہونے کا احساس، کسی کو بن دیکھے چاہے چلے جانے کا احساس..... اگر محبت یہی تھی تو پھر مالا ذوالفقار کو علی عیسیٰ سے شدید ترین محبت ہو گئی تھی۔ جانے کب سے؟ جانے کس وقت سے؟ جانے کس گھڑی، کس ساعت وہ پھولوں سے گندمی مالا کے دل کی سلطنت پر ہمیشہ کے لیے قابض ہو گیا تھا اور اب اسی علی عیسیٰ کی بہن اسے دھمکا رہی تھی کہ عنقریب اسے علی عیسیٰ کی زندگی سے نکلتا ہوگا مگر کیوں.....؟ کس لیے.....؟ آخر اس کا تصور کیا تھا؟ اس کی غلطی کیا تھی؟ اس کا جرم کیا تھا؟ اسے کون سے گناہ کی پاداش میں وہ کھو پتھر دل فرعون کا عکس لیے منکیر لڑکی دھمکا رہی تھی۔

یہ اس کا چپکے چپکے بہنے والا درد تھا..... یا بے آواز سسکاریوں کی جھنکار جس نے علی عیسیٰ کی نیند ختم کر دی تھی۔ وہ سر اٹھائے بغیر آنکھیں کھولے کمرے کے خاموش ماحول میں کسی کی سانسوں کا شور محسوس کر رہا تھا۔ پھر کئی منٹ دیے پاؤں گزر گئے، علی عیسیٰ نے مالا کو آواز نہیں دی تھی مگر وہ جان چکی تھی عیسیٰ جاگ رہا ہے تبھی اس نے اپنی سانس تک روک لی تھی..... حالانکہ علی عیسیٰ کے سونے سے لے کر مالا کے اٹھ کر ٹیرس تک جانے اور پھر واپس آنے تک اس نے بہت احتیاط برتی تھی۔ یقیناً یہی احتیاط مون نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اور پھر اس کے حواسوں پر بجلی گرانے کے بعد چپکے سے واپس جاتے ہوئے بھی برتی تھی اور تب کا سو یا علی عیسیٰ اس کی ہلکی سی سسکاری کو سن کر اٹھ گیا تھا۔ یقیناً تھکن نے اس پر نیند طاری کر دی تھی اور اب اس کی نیند پوری ہو چکی تھی بھی وہ اٹھ گیا تھا۔ حالانکہ اٹھا تو وہ مالا کی آواز سن کر تھا۔ جانے کب ضبط کا دامن چھوٹ گیا تھا اور تمام احتیاطیں بکھر گئیں..... ورنہ وہ بھی عیسیٰ کی نیند خراب نہ کرتی..... اور عیسیٰ نہ صرف اٹھا تھا بلکہ اس نے لائٹس بھی آن کر دی تھیں..... تب مالا کا دل دھک سے رہ گیا۔ یقیناً اب وہ روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ لے گا..... اس کا بھیگا چہرہ اور روئی آنکھیں..... وہ اپنے رونے کا کیا جواز پیش کرے گی؟ کون سی دلیل دے گی؟ کون سا جواب گڑھے گی؟ اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی جبکہ عیسیٰ نے اٹھنے اور لائٹس آن کرنے کے بعد بھی اسے مخاطب نہیں کیا تھا جانے وہ کیا کر رہا تھا؟ مالا نے عیسیٰ کے اٹھتے ہی درمیان میں سجاوٹ کے لیے رکھا انتہائی نرم، ملائم سفید فروالا کشن اٹھا کر اپنے منہ پر رکھ لیا تھا۔ یہ قطعاً بے اختیارانہ قسم کی حرکت تھی۔ وہ کسی بھی طریقے سے اپنے تاثرات علی عیسیٰ سے چھپا لینا چاہتی تھی مگر کیا وہ اس میں کامیاب ہوئی تھی بہر

کمرے میں رنگ، رنگ کی روشنائی عکس چھوڑ رہی تھیں..... اس نے کشن ہٹا کر پلکوں کی جھری میں سے دیکھا۔ علی عیسیٰ چھت پر گئے فانوس اور لیپ کو بھی آن کر رہا تھا۔ جب پورا کمراروشنی سے بھر گیا تب اس نے ساکت لیٹی مالا کو مخاطب کیا تھا۔ وہ یقیناً اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کی آواز ہمیشہ کی طرح نرم تھی۔ نیند ٹوٹنے پر اس کا مزاج برہم نہیں تھا۔

”رونا ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔“ اسے علی عیسیٰ کی آواز اب کچھ ہی فاصلے پر سے سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ اس کے قریب آکھڑا ہوا تھا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر نرم فروالا سفید کشن اس کے چہرے سے ہٹا دیا۔ غیر واضح چیزیں واضح ہونے لگی تھیں۔ سرخ چہرہ، بھگی پلکیں، کپکپاتے ہونٹ..... وہ ابھی ضبط اور صبر کی منزل سے کوسوں دور تھی۔ اسے ضبط کے مرحلے سے گزرتا آسان نہیں لگ رہا تھا۔ یقیناً اسے ضبط کی ریزیں سمجھنا ابھی نہیں آتا تھا پھر بھی وہ خود پر جبر کرتے ہوئے ضبط کر رہی تھی۔ اس کی یہ کیفیت علی عیسیٰ کے لیے نئی تھی تاہم اسے خود پر جبر کرتے دیکھ کر وہ گہری سانس کھینچ کر بولا تھا۔

”پھر بھی اگر دل بہت بھر آئے تو کھل کر رو لینا چاہیے..... تم میرے سامنے بہ آسانی اور بخوشی رو سکتی ہو..... میں تمہیں روکوں گا نہیں..... مگر اتنا ضبط نہ کرو..... خود پر جبر نہ کرو.....“ کشن کی نرم فر کو چھوتا وہ حلیم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس نے مالا سے رونے کی وجہ نہیں پوچھی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس بات پر اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی اگر وہ وجہ پوچھ لیتا تو مالا بھلا کیا بتاتی؟ عائلی زندگی کی شروعات میں ہی بدگمانیاں، ججی جھگڑے اور گھریلو سیاست بر مبنی باتیں..... پھر اس کے رونے کی ہر کڑی تو مون کی گفتگو سے جا ملتی تھی جبکہ مون کی باتیں اس کے بھائی کے سامنے دُہرانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

یہ ممکن ہے؟ اس نے تو آج تک کسی کے تاثرات جانچ کر کچھ بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں لگایا تھا مگر یہ دونوں بہن بھائی اس کے ذہن میں بلا اجازت گھس آتے تھے۔ اسے ماننا ہی پڑا..... یہ دونوں بلا کے ساحر تھے اور وہ دھیرے دھیرے ہی سبھی ان دونوں بہن بھائی کے سحر میں گرفتار ہونے لگی تھی۔

”تم محبت کو جادو سمجھتی ہو؟“ اس کے کان اس کی آنکھیں اور حتیٰ کہ اس کا منہ بھی کھل گیا تھا.... وہ بڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ اسے لگا، وہ دوسری سانس بھی نہیں لے سکے گی۔ تو کیا اس کی سوچیں کتاب کے لفظ تھے جو چہرے پر آنسوؤں کی صورت بکھرے تھے جسے کوئی بھی پڑھ سکتا تھا یا پھر یہ خاص ہنر محض علی عیسیٰ کے پاس تھا؟ اور اس کی بہن کے بھی تو پاس تھا؟ وہ ساکت رہ گئی تھی اور ٹھوڑی پر اترے آنسو بھی پونچھ نہیں پائی تھی۔ اسے اپنی طرف ایک ہجان آمیز حیرانی میں جتلا دیکھتے پا کر علی عیسیٰ اب کے ذرا سا مسکرا دیا تھا۔

”تم..... تم اتنا حیران کیوں ہوتی ہو..... موتیوں کی سفید مالا.....!“ وہ اب ہنستا ہنستا پاکتی کی طرف بیٹھ گیا تھا۔ سفید فر والا کٹن اس نے اپنے بازوؤں میں دیوچ رکھا تھا اور وہ اسی طرح سہولت سے ٹانگیں نیچے لٹکائے بیڈ پر نیم دراز ہو گیا..... مگر اس نے ہنستا ترک نہیں کیا تھا..... اور ہنستے ہنستے اس کی خوب صورت آنکھوں کے کنارے شفاف پانی سے بھر آئے تھے..... وہ اس لمحے مالا کو اتنا حسین لگا کہ اس کی نگاہ ہٹ نہ پائی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے دل کے چھوٹے سے ٹکڑے میں علی عیسیٰ کی ساری محبت کو پور پور بھر لے۔

مالا اور علی عیسیٰ کے بیچ کیا ہوا..... کیا ذی شاہ جلد از جلد اس کی کھوج لگانے میں کامیاب ہو جائے گا؟ ترک و فاکا سبب کون بنا..... یہ سب جاننے کے لیے پڑھیے اگلا حصہ

وہ بھلا مالا کے بارے میں کیا سوچتا؟ اس کی کوئی چالاکی، عیاری، مکاری یا کوئی چال.....؟ کم از کم ایک بات تو طے تھی اس نے مون کے بارے میں کچھ بھی سن کر مالا پر اعتبار ہرگز نہیں کرنا تھا۔ گویا پہلے روز ہی بالانے یہ خود سے فرض کر لیا تھا سو وہ دل کو سمجھا رہی تھی کہ اسے مون کی ہر بات کو چپکے سے سہہ جانا ہوگا بنا چاچو اور علی عیسیٰ کو بتائے..... اور کیا اس کا یہ فیصلہ ٹھیک تھا؟

”رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“ وہ اپنی قیص کے کف فولڈ کر رہا تھا۔ اس کے سفید بازوؤں کا رُواں واضح تھا۔ اس کی بات کا مفہوم بھی واضح تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی تھی۔ کیا وہ جانتا تھا کہ اس کے دل پر کوئی بوجھ ہے؟

”دل پر بوجھ ہو تو رونا آتا ہے، بلا وجہ تو کوئی نہیں روتا۔“ علی عیسیٰ گویا اس کے چہرے کا ایک، ایک تاثر بہت غور سے پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر دھک سے رہ گئی تھی۔ تو کیا وہ اس سے بدگمان ہوگا؟ رات کے آخری پہر..... شوہر کے پہلو میں لیٹ کر چپکے چپکے رونے والی بیوی..... اسے اپنی فاش غلطی کا فوراً احساس ہو گیا تھا کم از کم اسے رونا نہیں چاہیے تھا۔ رات کے اس پہر بالکل نہیں..... اور وہ رونے کے لیے ہاتھ روم میں بھی تو جاسکتی تھی۔ اس نے پہلے کیوں نہ اس پہلو پر غور کیا؟ وہ خود کو ملامت کرنے لگی تھی اور وہ جانے کب تک خود کو ملامت کرتی رہتی۔ علی عیسیٰ کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

”رونا کوئی بڑی غلطی یا نادانی نہیں..... جس پر پچھتایا جائے..... ویسے میرے پاپا کہتے ہیں، نرم دل والوں کی ہی آنکھیں بہتی ہیں۔“ علی عیسیٰ کے الفاظ اس کی سماعتوں کو پھر سے متحد کر گئے تھے تو گویا وہ اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا یا پھر یہ دونوں بہن بھائی جادوگر تھے؟ بھلا کوئی کسی کی سوچ میں کیسے اتر سکتا ہے؟ کیا





ناولٹ



ترک و فنا

نایاب جیلانی

تیسرا حصہ

”پتا ہے، تم مجھے کبھی، کبھی کیا لگتی ہو؟“ علی عیسیٰ نے مسکراہٹ روک کر اپنا چہرہ اس کی طرف موڑ لیا تھا..... مالا کا دل پھر سے دھک، دھک کرنے لگا..... قاتل کی ساری ادائیں ہی قتل کرنے والی تھیں۔ اس کا معصوم دل سہہ نہ پاتا..... یہ توجہ کے انداز، یہ چاہتوں بھرے جام پھر اس کی نرم گفتار، شیریں کلام، وہ مٹھاس کا دریا تھا اور مالا اس شیرے میں ڈوبنے والی جل پری..... وہ کریم





شب تاب تھا اور مالا اس کی دیوانی..... کبھی جو علی عیسیٰ کی صبح پیشانی پہ ناگواری کے جھٹے ابھرتے تب بھلا مالا ذوالفقار کا کیا بنتا.....؟ شاید اس کا دل ہی بند ہو جاتا..... مگر وہ تب کی بات اب کیوں سوچ رہی تھی؟ اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ چہرے پر رگڑے..... شاید خود کو سنبھالنے کی کوشش تھی۔

”آپ..... آپ مجھے ہونق، بدھو، اجس اور بے وقوف ہی نہیں خطی بھی سمجھتے ہوں گے۔ کیا میں آپ کو پاگل، پاگل لگتی ہوں؟“ اس نے بڑی معصومیت سے مناسا سوال کیا تھا۔ اتنی دیر سے علی عیسیٰ اکیلے ہی بولے چلا جا رہا تھا۔ اسے مالا کی لب کشائی نے ڈھارس سی پہنچائی تھی۔ اس کا بولنا علی عیسیٰ کو بہت اچھا لگا اور مالا خوش تھی کہ اس کا دھیان اس کے رونے سے ہٹ گیا ہے جبکہ علی عیسیٰ کچھ وضاحت دے رہا تھا۔

”میں نے یہ کب کہا.....؟“ علی عیسیٰ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ایسا ہرگز نہیں سمجھتا۔“ وہ ایک مرتبہ پھر اس کا چہرہ حرف بہ حرف پڑھنا چاہتا تھا۔ مالا کچھ جھنجھلا گئی..... اب وہ اسے اپنا چہرہ پڑھنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ ایک تو عیسیٰ کو اس کا چہرہ پڑھنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہو چکا تھا۔ شاید وہ چلتی پھرتی کوئی کتاب تھی۔

”میں تمہیں نہ پڑھوں تو کسے پڑھوں؟“ مالا کے دائیں طرف سے آواز ابھری۔ وہ پھر سے اچھل پڑی تھی یعنی چہرہ موڑ کر بیٹھنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس کے قریب بیٹھا بندہ غضب کا قیافہ شناس تھا۔ ایسے کنگے اور اندازے لگاتا کہ مالا دھک سے رہ جاتی۔

”ہائے میرے اللہ جی! یہ بندہ ہے یا.....؟“ وہ ذرا سا گھبرا گئی۔ ”ان کے قریب بیٹھ کے تو سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“ آج اس نے ایک دوسرا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ پہلا فیصلہ یہ تھا کہ وہ مون کی باتیں چاچو اور عیسیٰ کو نہیں بتائے گی اور دوسرا فیصلہ ابھی ابھی.....

اسے علی عیسیٰ کے قریب بیٹھ کر کچھ نہیں سوچنا تھا مگر وہ اپنے اس دوسرے فیصلے پر زیادہ دیر تک قائم رہنے والی نہیں تھی۔

”اچھا تو..... میں تمہارے رونے کی وجہ..... پوچھ سکتا ہوں.....؟“ عیسیٰ کے سوال پر اس کی سانسیں یہیں کہیں حلق میں ایک گئی تھیں تو کیا وہ بات کو گھما پھرا کر وہیں پر لے آیا تھا جہاں سے بات کی ابتدا ہوئی تھی۔

”ہائے وجہ؟ ہلا کیا وجہ بتاؤں گی؟“ وہ حق دق رہ گئی، چہرے پر سرا سیمگی پھیل گئی تھی اور مون کی آواز لہروں کی صورت میں ایک مرتبہ پھر اسے سرسوں کا پھول بنا گئی۔ مون کو سوچنا ہی اس کا خوف بڑھا دیتا تھا۔ مون کیا تھی؟ مون کیسی تھی؟ مون ایسی کیوں تھی؟ بھلا مون کی شخصیت اور انداز کی کوئی تشریح کر سکتا تھا؟

”مم..... مجھے می اور ڈیڈی یاد آ رہے تھے اور میرے بھائی، بہن سب.....“ اس کے پاس اتنی مضبوط دلیل تھی۔ عیسیٰ کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا..... مگر وہ مطمئن نہیں ہو پایا تھا..... مالا کی دلیل نے اسے مطمئن نہیں کیا تھا، گویا دلیل کمزور تھی..... حالانکہ دلیل کمزور نہیں تھی..... لہجہ کمزور تھا..... تاثرات سرا سیمگی میں کھوئے تھے۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ عیسیٰ نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا تھا۔ اسے جھوٹ پکڑنے آتے تھے، مالا کو جھوٹ بولنے نہیں آتے تھے۔

”کیا ہیمیل (آسمان) کے شیترن (ستارے) بھی جھوٹ بولتے ہیں؟“ علی عیسیٰ کا لہجہ ناراض نہیں تھا۔ تاہم جتانے والا ضرور تھا۔ مالا کی پلکیں جھک گئیں۔ شادی کے دو ہفتوں میں اس کا پہلا جھوٹ کھلا تھا جو پکڑا بھی گیا۔ وہ عموماً جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ اسے سکھایا بھی یہی گیا تھا، جھوٹ بولنا ہلاکت ہے۔ جھوٹ ہلاک کر دیتا ہے مگر کبھی کبھی مصلحتاً

جھوٹ..... اس میں بھلا حرج کیا تھا؟ گرج بتا دیتی تو اس میں نقصان تھا۔ علی عیسیٰ کی پہلی بدگمانی کا نقصان..... اور وہ ایسا خسارہ اٹھا نہیں سکتی تھی۔ وہ اس کی بات پر یقین نہ کرتا..... کر بھی لیتا تو مون سے ضرور باز پرس کرتا..... اگر مون مکر جاتی تو پھر مالا کا ج کہاں جاتا؟..... وہ نتائج کا سوچ رہی تھی۔ وہ حد سے زیادہ بے وقوف تھی۔ بھلا امتحان سے پہلے کیا نتیجہ آ سکتا تھا؟ اور نتیجے کے لیے امتحان دینا ضروری تھا۔ وہ امتحان دیے بغیر نتیجے سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ وہ انتہا کی اجس تھی۔ وہ سچ بولنے سے خوفزدہ تھی۔ حالانکہ سچ میں کتنا سکون تھا۔ وہ جھوٹ بول کر بھی سرا سیمہ تھی عجیب دورا ہا تھا۔ وہ جھوٹ اور سچ کے درمیان لنگ گئی۔

”میں نے سیل بر (چاندی) کے بیلد سولے (بت) پر زنگ جتے دیکھا۔ مجھے یہ دیکھنا پسند نہیں آیا۔“ کچھ دیر بعد علی عیسیٰ کی بہت سنجیدہ آواز ابھری تھی۔ وہ کیا بات کہہ رہا تھا؟ وہ کتنی مشکل بات کہہ رہا تھا..... مگر حیرانی یہ تھی علی عیسیٰ کی مشکل بات پہلی مرتبہ مالا آسانی سے سمجھ گئی تھی پھر اس کا سر بھی جھک گیا۔ اس کا اشارہ اس کے جھوٹ کی طرف تھا۔ جھوٹ بولنا بہت تکلیف دہ امر ہے۔ جھوٹ پکڑا جائے تو اس سے بھی تکلیف دہ المیہ بن جاتا ہے۔

”تم بتایا جان یا گھر والوں کو یاد کر رہی تھیں تو یاد کرنے سے بہتر تھا ہاتھ بڑھا کر ساڈ نیبل پر رکھا میرا سیل فون اٹھائیں اور انہیں کال کرتیں، فون آدھی ملاقات ہوتا ہے۔ بات کرنے سے یاد دہنی نہیں کم ضرور ہو جاتی ہے مگر تم نے ایسا نہیں کیا..... میں جب شہر سے یا ملک سے باہر ہوتا ہوں تو اپنے پاپا کو بہت مس کرتا ہوں اور جب انہیں مس کرتا ہوں تو فوراً کال کرتا ہوں..... میرے دل کو سکون مل جاتا ہے۔ ماں باپ کی آواز اتر فریشو لگن ہے۔ تازگی، منٹھاس، سکون، اطمینان، کیف، سرور تو پھر تم نے

انہیں فون کیوں نہیں کیا.....؟ اس تازگی سے خود کو محروم کر کے روتی رہیں..... رونا مسئلے کا حل نہیں ہوتا..... مگر مجھے لگتا ہے تمہیں یہ بات پریشان نہیں کر رہی..... بات کچھ اور ہے اور میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا..... ہم کتنے بچے گروسی کے گھر میں آئے، سورج ڈوبنے کے بعد یعنی گہری رات نیچے ہوئی..... تب تمہارا موڈ بہت خوشگوار تھا..... کمرے میں آنے کے بعد بھی خوشگوار رہا..... پھر میں سو گیا، تم جانے سوئی یا نہیں..... جب میری آنکھ کھلی تب رات کے تین بج رہے تھے۔ تم ضبط کرتے، کرتے بھی رو رہی تھیں۔ کوئی بلا وجہ نہیں روتا..... اور تم ان دو ہفتوں میں تو بلا وجہ نہیں روئیں پھر اس وقت کیوں.....؟ میں تمہارے لیے فکر مند ہوں اور تمہیں اس بات کا احساس ہے مگر تمہیں جرمنی اور پاکستان کے اوقات کا نہیں پتا..... ہمارے تمہارے وقت میں چار گھنٹے کا فرق ہے۔ یہاں تین بجے ہیں تو پاکستان میں صبح کے سات..... اور یہ وقت کال کرنے کے لیے غیر مناسب نہیں مگر میں جانتا ہوں تم بتایا جان کے لیے اتنی اداس نہیں..... تو پھر یہ رونا اور اداسی کیوں.....؟ یعنی جو کچھ بھی ہو میرے سونے کے بعد..... سچ کے ان چند گھنٹوں میں.....؟ یعنی میری نیند کے دوران کیا تم تنہائی محسوس کر رہی تھیں یا تمہیں اجنبی جگہ پر نیند نہیں آرہی تھی؟ یا ڈر لگ رہا تھا؟ ایک خیال تو بالکل غلط ہے..... یعنی تمہیں کسی نے کچھ کہا ہوگا۔ یہ ممکن نہیں..... سب اس وقت سو رہے ہیں۔ کسی سے ملاقات کا تو سوال ہی نہیں پھر کرا میں نے سونے سے پہلے خود چیک کیا تھا، دروازہ لاکڈ تھا۔ کوئی آ بھی نہیں سکتا پھر کیا؟ کیا اب بھی نہیں بتاؤ گی؟ مجھے لگتا ہے تم ضرور ڈر گئی ہو؟“ سارے آپشن ایک، ایک کر کے دھڑا دھڑ گراتے ہوئے وہ جس آخری بات پر اڑکا تھا مالا کی گویا وہیں سانس بحال ہونا شروع ہو گئی تھی۔ تاہم دل میں پھانس سی چھبی تھی۔ تو گویا کرا



اس نے خود لاکھ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کوئی کمرے میں نہیں آیا..... کسی نے مالا کو کچھ نہیں کہا، کوئی کمرے میں آکر اتنی غیر اخلاقی حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خصوصاً اس کی فیملی کے لوگ..... تو پھر مالا کیا احمق تھی جو علی عیسیٰ کو سچ بتا کر بھی جھوٹی بڑتی؟ اس کی بہن اچانک اس کے کمرے میں آئی، چپکے سے اسے دھمکا بھی گئی مگر وہ ایسی بے بس تھی کہ اصل حقیقت بتا ہی نہیں پائی۔ بتا دیتی تو کیا حرج تھا؟ علی عیسیٰ بس یقین نہ کرتا اور جب وہ مالا کی بات پر یقین نہیں کرتا تو وہ کانسج کے بت کی طرح ٹوٹ جاتی۔ چاندی کے بت پر زنگ آ بھی جاتا تو خیر تھی اگر چاندی کا بت ٹوٹ جاتا تو علی عیسیٰ بھلا اسے کیسے جوڑ پاتا؟ اتنی سی تو بات تھی، وہ غضب کا قیافہ شناس اور سو فیصد درست اندازے لگانے والا اتنی سی بات ہی نہ سمجھ پایا۔

”بولتی کیوں نہیں ہو مالا! کیوں پریشان کر رہی ہو؟“ اس کی آواز میں مالا کے لیے ٹھکر تھا..... مالا کی جان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اسے مالا کی فکر تھی اور وہ گہری نیند سے مالا کی خاطر اٹھ آیا تھا۔ کیا یہ کم تھا؟ کیا اتنی محبت..... اتنی چاہت اور اتنا احساس کم تھا؟ اس کا قناعت پسند دل تو علی عیسیٰ کے اتنے احساس اور محبت پر ہی لبالب بھر گیا۔

”میں ڈر رہی تھی..... مجھے جنگلی جانوروں کی آواز نے خوفزدہ کیا.....“ اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ ”وہ آواز بہت تکلیف دہ تھی، بہت عجیب اور بھیا تک، مجھے لگا دل کے ٹانگے ادھڑ جائیں گے۔“ مالا نے خود کو بے خیالی میں پھر سے ٹیس پر پایا تھا اور اس کے سامنے کھڑی مون..... اس نے سچ بتایا مگر انداز اور تھا..... علی عیسیٰ شاید سمجھا نہیں..... وہ بات کی تہ میں اترا نہیں تاہم اس کے خوف کو وہ خوب سمجھ گیا تھا۔

”میں جان گیا تھا تم خوفزدہ ہو، تمہارے چہرے پر خوف لکھا ہے، تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے تھا۔“

جنگلی جانور آبادی کی طرف آتے ضرور ہیں مگر گھروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس نکتے پر سوچتی تو کبھی نہ ڈرتیں اور اگر تھوڑا مزید ذہن پر زور ڈالتیں تو نائیون کا پردہ ہٹا کر ونڈوز کی سلائڈ کے ہٹا دیتیں، کھڑکی بند ہو جاتی تو کوئی آواز بھی اندر نہیں آ سکتی تھی۔ ”وہ بہت نرم لہجے میں بولتا ہوا اٹھا تھا پھر اس نے نائیون کا پردہ ہٹا کر کھڑکی کا ہٹا دیا۔ کھڑکی خود بخود بند ہو گئی تھی۔ علی عیسیٰ واپس آنے کے بجائے اپنا ہینڈ کیری بیڈ کے نیچے سے گھسیٹ کر اسے کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ ہٹکا ہٹکا اس کی کارروائیاں دیکھ رہی تھیں۔ اب وہ کیا کرنے والا تھا؟ بلکہ کیا کر رہا تھا۔ اس نے گردن اچک کر علی عیسیٰ کے ہینڈ کیری کو دیکھا اس نے اپنی پینٹنگ خود ہی کی تھی بلکہ وہ اسے کام بھی خود کرنا پسند کرتا تھا۔ سو مالا دیکھ نہیں سکی تھی اس نے ہینڈ کیری میں کیا رکھا تھا؟ سو اب تفصیل سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اس کا ذہن ہرگزشتہ خوف اور باتوں سے ہٹ گیا تھا۔ اس کے ذہن سے مون کا خیال بھی محو ہو گیا۔ بس یاد تھا تو اتنا کہ گھنٹوں کے بل کارپٹ پر بیٹھا یہ بہت مصروف سا علی عیسیٰ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ مالا کو بھلا اور کس چیز کی چاہ تھی؟ کسی کی بھی نہیں..... اسے زمانے مل گئے تھے علی عیسیٰ کی صورت میں خزانے مل گئے تھے۔

وہ بڑی دلچسپی سے گردن اچکا اچکا کر دیکھ رہی تھی۔ علی عیسیٰ نے شاید کوئی باکس نکالا تھا۔ اس میں جانے کیا تھا۔ سیاہ رنگ کا خوب صورت باکس پھر اس نے کچھ اور تلاش کرنے کے چکر میں سارا سامان الٹ دیا۔

”اس..... یہ کیا کر رہے ہیں؟“ مالا حیران رہ گئی۔ وہ سارا سامان الٹنے کے بعد زیر لب بڑ بڑا رہا تھا۔

”ہاؤ شو.....؟“ اس نے جھنجھلا کر اپنے

کپڑے اٹھا، اٹھا کر ہینڈ کیری میں بیٹھے..... مالا کو اس کے جھنجھلانے کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی مگر ہاؤ شو کی خوب سمجھ آ گئی۔

”اوہ، تو یہ اپنا لپ ٹاپ ڈھونڈ رہے ہیں..... یقیناً اب اس پر کچھ کام کرنا ہوگا..... کام بھلا کیا کرنا ہوگا؟ کوئی شو، مووی وغیرہ دیکھنا ہوگی..... اب نیند جو نہیں آئے گی۔ اللہ کرے نہ ہی ملے یہ رقیب میرا..... اس پر نظر جما کر تو زمانہ بھول جاتا ہے انہیں..... پھر فرولانسوں کے سارے کنسرٹ اور شوں جی جان سے پسند ہیں۔ واہیات عورتیں نہ ہوں تو..... ناچتی، گاتی، اٹھلاتی..... ہونہہ.....“ مالا نے منہ بنا کر گویا جرمن کی فرولانسوں کو بے نقط سنائیں مگر دل میں..... لیکن بھلا ہو علی عیسیٰ کی غضب کی سماعتوں کا..... اس کا بدبیدارنا بھی سن لیا۔

”یہ تم کیا شیج پڑھ رہی ہو.....؟ ابھی تک سوئی نہیں، فنانٹ سو جاؤ اب۔“ اس نے پچکار کر اسے پناہ دیکھے ہی اپنا کام جاری رکھا تھا تب مالا سے اس کی جھنجھلاہٹ دیکھی نہ گئی۔

”آپ جو چیز ڈھونڈ رہے ہیں، یہاں ملنے والی نہیں۔ گھر بھول آئے ہیں شاید۔“ مالا کی مداخلت پر اس نے گردن اشارت میں ہلا کر گویا تائید کی تھی۔

”یقیناً میں گھر ہی بھول آیا ہوں..... حالانکہ میں اپنی چیزیں بھولتا ہرگز نہیں.....“ وہ متفکر سا تھا یقیناً لپ ٹاپ کے بغیر صبح ہونے تک کا وقت گزارنا مشکل لگ رہا تھا اسے..... مالا کو ذرا ہمدردی محسوس نہ ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھی۔ چاچو بھی مالا کی طرح اس کے لپ ٹاپ سے خوب چڑتے تھے۔ دراصل وہ قارغ اوقات میں اسی سے جو چمٹا رہتا تھا۔

”اس..... تم پھر بول پڑیں، سوئی نہیں ابھی تک..... آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ..... نیند پوری نہ ہوئی تو طبیعت بوجھل ہو جائے گی پھر کل سفر کیسے

کرو گی؟“ سیاہ رنگ کا خوب صورت باکس اٹھا کر اب وہ باہر جانے لگا تھا جب مالا نے فوراً ایک مرتبہ پھر مداخلت کی۔

”آپ..... آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ اس کا دل کپکپا سا گیا۔ کمرے میں تنہا رہنے کا احساس فوراً سابقہ خوف جگا گیا تھا۔ علی عیسیٰ جاتے جاتے رک گیا۔

”میں ایک منٹ میں آیا.....“ اسے تسلی دے کر وہ پھر باہر نکلنے لگا تھا جب مالا بستر سے اٹھ کر اس کے سامنے آ گئی۔

”آپ لپ ٹاپ لینے جا رہے ہیں؟ اگر ایک دن اس کے بغیر گزاریں گے تو قیامت نہیں آجائے گی، میرے رقیب کو خبردار جو اٹھا کر لائے.....“ اس کا انداز اتنا بے ساختہ اور دلقریب قسم کا تھا کہ علی عیسیٰ رک سا گیا۔ اسے مالا کی یہ دھولس بھری بے تکلفی بہت پسند آئی تھی۔ گویا وہ دھیرے، دھیرے اپنے خول سے نکل کر بے تکلف ہو رہی تھی۔ یہ بہت خوش آئند عمل تھا۔

”گوت..... میرا مطلب ہے اچھا، اچھا یعنی رقیب؟“ وہ گویا اس کی بات سمجھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ اس کی ہنسی رک ہی نہیں رہی تھی۔ اسے برابر ہنستا دیکھ کر مالا خفیف سی ہو گئی۔ گویا اس نے بے ساختگی میں کچھ الٹا سیدھا بول دیا تھا۔ وہ شرمندہ تھی، عیسیٰ اسے شرمندہ نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ اسے تنگ ضرور کرنا چاہتا تھا اور وہ تھوڑا زچ بھی ہو رہی تھی۔

”تو لپ ٹاپ رقیب ہی ہونا..... ہر وقت اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔“ مالا نے اپنی خفت مٹانی چاہی۔

”سو تو ہے..... پر تمہیں کس نے کہا میں لپ ٹاپ لینے جا رہا ہوں؟“ وہ بڑی شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستاروں کی سی



اپریل 2014ء کے شمارے کی ایک جھلک

# سمرگزشت

ماہنامہ

## درویش عالم

ایک درویش صفت صاحبِ قلم کا زندگی نامہ

## شاعر اعظم

اس شاعر کا تذکرہ جسے غالب و اقبال نے استاد مانا

## بے پنا

دودھائی سے الجھا کیس جو آج بھی حل طلب ہے

## پراسرار پسینا

موت بن جانے والی دبا جو یورپ میں پھیل گئی تھی

## بزدل کون

سبق آموز سچ بیانی جو دل دہلا دے گی

## الکاحی حلالہ

لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل کہانی "سراب"  
فلمی دنیا کی کہی ان کہی داستانیں "فلمی الف لیلہ"  
اور بھی بہت ساری سچ بیانیاں سچے واقعات۔

اگر آپ علم و دانش بھرے مضامین، ادب، تاریخ اور سبق آموز سچ بیانیاں پسند کرتے ہیں تو آپ ہی کے لیے یہ شمارہ ترتیب دیا گیا ہے بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں آپ خود ہی گرویدہ ہو جائیں گے۔

باہر آ گیا تھا۔ مالا بھی اس کے پیچھے، پیچھے باہر آئی۔ علی عیسیٰ نے اپنا سامان دوبارہ ترتیب سے بند کیری میں سیٹ کر لیا۔ وہ چیزوں کی ترتیب اگر غصے یا جذباتیت میں بگاڑ لیتا تب بعد میں سکون کے ساتھ بگڑی ترتیب کو درست بھی کر لیتا تھا، یہ بھی اس کا کوئی اصول تھا جس کے بارے میں وہ مالا کو چیزیں درست کرتے ہوئے بتا رہا تھا۔

"تو آپ ترتیب بگاڑا ہی نہ کریں..... جب آپ کو پتا تھا ہاؤ شو کیری میں رکھے ہی نہیں تو پھر ترتیب کیوں الٹی؟" مالانے اس کی پوری بات سن کر رمان سے جواب دیا تھا۔ تب وہ اس کی سمجھدارانہ بات سن کر قائل سا ہو گیا۔

"وقتی طور پر مجھے غصہ آ گیا تھا، آخر میں جوتا ہی کیوں بھولا؟ بس یہی غصہ چیزوں پہ اتار دیا۔" اس نے گویا اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی۔ اسے ترتیب نہیں بگاڑنی چاہیے تھی۔ غصے کو خود پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے تھا مگر وہ اپنے مزاج کا کیا کرتا؟ اپنی جذباتیت اور جلد بازی کا کیا کرتا؟ اسے عجلت پسندی اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔

"لیکن یہ بھی تو دیکھو نا، اگر آج میں جوتے نہ بھولتا تو کل کے لیے محتاط کیسے ہوتا؟ مجھے اپنی چیزوں کو بھول جانا گوارا نہیں، یہ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا، کسی قیمت پر بھی نہیں۔" وہ سامان سیٹ کرنے کے بعد بڑے مستحکم اور ٹھوس لہجے میں اپنا نقطہ نظر اس پر واضح کر رہا تھا۔ مالانے مزید علی عیسیٰ سے بحث نہیں کی تھی۔ ماں نے شروع سے ایک بات ٹھنی میں پلا دی تھی، باپ اور بھائیوں سے بحث نہیں کرتے اور شوہر سے تو بالکل بھی نہیں، سو ماں کے اتنے پرانے بڑھائے سبق کو وہ جرمی آ کے چار دن میں بھلا تو نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

"گروسی! رات بھر مالا ڈرتی رہی، نیلے کے

پندرہ منٹ بعد بھی اس کی واپسی نہ ہوئی تب مالا کو سخت بھلا کر اٹھنا ہی پڑا تھا۔ وہ بھی دبے قدموں واش روم کی طرف آ گئی۔ دروازہ کھلا ہی تھا اس نے جھری میں سے جھانکا تب اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ وہ چیخا چاہتی تھی مگر چیخ نہ پائی۔ رات کے تیسرے پہر اس کا شوہر بڑے اطمینان کے ساتھ منہ پر رازیر کر کے یعنی شیونگ کریم ملے بڑے موڈ میں شیو بنانے کی فل تیاری میں تھا۔ اسے تا نکا جھانکی کرتے عیسیٰ نے دیکھ لیا تھا اب کے آنکھیں کھولنے کی باری علی عیسیٰ کی تھی۔ وہ اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا جو بجائے دیکھے جانے پر خفت زدہ ہونے کے ڈھٹائی سے کھڑی تھی۔

"اس..... تم پھر بھی نہیں سوئیں؟ کمال ہے۔" وہ موٹیل کی طرح رگڑ رگڑ کر شیو بناتا حیرت سے بولا۔

"کمال ہے، یہ کام صبح نہیں ہو سکتا تھا؟" مالا نے بھی اسی کے انداز میں کہنا چاہا تھا۔ تب عیسیٰ نے ابرو اچکا کر اسے چھیڑا۔

"غالبا آپ مجھ پر طنز کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔" اس کا انداز تپانے والا تھا تب واش روم کے دروازے کو پورا کھول کر مالانے بتایا۔

"غالبا نہیں، یقیناً میں آپ پر طنز کر رہی ہوں۔" اس نے بھر پور طنز یہ لہجہ اپنانا چاہا تھا مگر وہ اس... کوشش میں ذرا بھی کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ علی عیسیٰ نے قہقہہ لگا کر بے احتیاطی کی وجہ سے کریم تھوڑی منہ میں چلی گئی۔ اب وہ نل کھول کر برابر کئی کیے جا رہا تھا۔ مالا کی ہنسی نکل گئی۔

"توبہ، آپ اور چاچو تو کمال کے بندے ہیں۔ کل کے کام آج اور آج کے کام ایک دن پہلے کر لیتے ہیں۔" اس نے بہ مشکل ہنسی روک کر کہا تھا۔

"اس میں سہولت بھی تو ہوتی ہے۔" وہ منہ دھو کر ٹاول اٹھاتا لشکارے مارتے چہرے کے ساتھ

چمک تھی۔

"آپ نے خود۔" مالا زور دے کر بولی۔  
"مگر میں تو سلپر لینے جا رہا ہوں، ہاؤ شو یعنی جوتے... پر جوتے تمہارے رقیب کیسے ہوئے؟" وہ ڈھیروں ڈھیروں شرارت آنکھوں میں بھر کے معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ مالا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ خفت زدہ رہ گئی تھی۔

"کک..... کیا.....؟" اس کے منہ سے پھنسی، پھنسی آواز نکلی۔ وہ بے انتہا شرمسار تھی۔ بغیر سمجھے بولنے کی عادت..... ڈھیروں خفت اٹھانی پڑی۔

"جی ہاں، میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے سلپر تک ساتھ لے کر جاتا ہوں، مجھے دوسروں کی استعمال شدہ چیزیں پسند نہیں۔ گروسی اور تانتے بھی جانتی ہیں..... بھی اس روم میں سلپر موجود نہیں..... انہیں پتا ہے، میں اپنے جوتے ساتھ لے کر آتا ہوں۔ مگر جانے کیسے بھول ہو گئی۔" اسے شرمندہ دیکھ کر وہ زیادہ دیر مالا کو تنگ نہیں کر سکا تھا۔ وہ اسے خفت زدہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ یقیناً ڈنچ میں بڑ بڑایا تھا اور مالا کو سمجھ کہاں آتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا مالا کو لینکوتیج کورس ضرور کروائے گا۔ یہاں رہنے کے لیے ڈنچ سمجھنا اس کے لیے بہت ضروری تھا۔

"تو اب میں جوتے لے آؤں.....؟" وہ اجازت چاہ رہا تھا۔ ہونٹوں پہ اب بھی مسکراہٹ تھی۔ مالانے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کچھ دیر کے لیے علی عیسیٰ کی شرارتی نظروں سے بچنا چاہتی تھی پھر جب وہ سلپر لے کر واپس آیا تب تک مالا کھیل میں غروب ہو چکی تھی۔ عیسیٰ نے اطمینان محسوس کیا۔ وہ رات بھر سے جاگ رہی تھی، کچھ دیر سو جاتی تو اس کے حق میں بہتر تھا۔

وہ دبے قدموں باکس اٹھا کر واش روم میں گھس گیا تھا۔ اب جانے وہ کیا کرنے والا تھا۔



کہاں سے بھول کر آگئی تھی۔ پہلی دفعہ جب اس نے سوزن کا ذکر کیا تو سوزن نے منہ سے سنا تھا تب وہ اسے کچھ اچھی نہیں لگی تھی، وہ ذکر بھی سرسری سا تھا، سننے اور دیکھنے میں ویسے بھی بڑا فرق ہوتا ہے، یہ فرق آج اسے بہت واضح محسوس ہو رہا تھا۔

ناشتے کے بعد جب تاتنے پیشانی پر ہل ڈالے اٹھ گئیں اور ان کے پیچھے گروسی بھی اپنے پالتو جانوروں کو دیکھنے چلی گئیں۔ تب مالا نے فوراً عیسیٰ کو مخاطب کیا تھا۔ اس کے لہجے میں دہلی دہلی بے چینی اور جوش واضح تھا۔

”سوزن نے میرے بارے میں کیا کہا تھا، جسے سن کر آپ مسکرا دیے تھے حالانکہ اسے پہلے گھور، گھور کر دیکھ رہے تھے۔“ مالا نے جس بے ساختہ انداز میں بات کا آغاز کیا تھا عیسیٰ کو اچھو لگتے، لگتے رہ گیا۔ وہ انناس کا جوس پی رہا تھا بلکہ پی کیا رہا تھا پورا جگ چڑھا چکا تھا۔ اب تو کچھ قطرے ہی جگ میں بچے تھے۔ وہ جس شوق سے جوس پی رہا تھا مالا کو اندازہ ہو گیا، اسے انناس کا رس بہت پسند تھا اور مالا بھی کیے چکے، چکے عیسیٰ کی پسندنا پسند کو نوٹ کرتی جا رہی تھی۔ یہ کام بھی اس کے لیے بڑا ہی دلچسپ تھا۔ عیسیٰ کی ایک، ایک چیز کو نوٹ کرنا، ویسے تو وہ دیکھی ٹیرین تھا تاہم اسے اتنی کم مدت میں بھی اندازہ ہو چکا تھا وہ چوزے کا سالن شوق سے کھاتا ہے اور اسی حساب سے مالا کو یہ بھی پتا چل گیا تھا وہ چاچو اور گروسی سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ سوزن اسے اتنی پسند نہیں تھی نہ جانے اسے ناپسند کرنے کی وجہ کیا تھی؟ اور مون سے اس کا کوئی جھگڑا چل رہا تھا۔ مون واحد شخصیت تھی جس کے بارے میں عیسیٰ بہت کم بات کرتا تھا اور سوزن کے حوالے سے تو بات ہی نہیں کرتا تھا مگر اس وقت وہ سوزن کے ذکر پر مسکرا دیا۔

”اچھا تو تمہارا دھیان میری طرف تھا؟ ویسے میں نے کب سوزن کو گھور، گھور کر دیکھا ہے؟“ وہ

تاہم وہ علی عیسیٰ کے سامنے کچھ بولنا نہیں چاہتی تھیں۔ کچھ ایسا جو بھانجے کو بہت برا لگتا۔ تبھی ایک بڑی طشتری میں ہن خون کا سالن نکال کر سوزن باہر نکل آئی۔ اس نے تاتنے کی بات سن لی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی نرم اور پیاری مسکراہٹ چمکنے لگی۔ اس نے جوس کا جگ اور طشتری بیچ میں جگ بنا کر رکھی پھر جاتے، جاتے وہ مالا پر نرم نگاہ ڈال کر واپس مڑ گئی۔

”ابن فاخ.....“ سوزن نے ایک لفظ میں گویا مالا کی تعریف مکمل کر دی تھی۔ اس کے گلابی بھرے بھرے سرخ کچھ پھولے گالوں میں ڈھیل ابھرائے تھے۔ اس کی آواز سن کر جہاں تاتنے کا موڈ مزید بگڑ گیا تھا وہیں علی عیسیٰ کے لبوں پر پہلی مرتبہ سوزن کے لیے نرم مسکراہٹ ابھرائی تھی۔ پھر یوں ہوا کے ناشتے کا دور پورا ہونے کے بعد بھی علی عیسیٰ کا موڈ بہت خوشگوار رہا تھا۔ جانے سوزن نے کون سا لفظ مالا کے لیے بولا تھا جو عیسیٰ کا موڈ اتنا خوشگوار ہو گیا تھا۔

مالا نے سوزن کو بہت غور سے دیکھا تھا، اس کا سر سفید سے آج بھی ڈھکا ہوا تھا، ابھرے ابھرے سرخ گال بہت نمایاں تھے، سفید گول، گول اوہریٹے (بالیاں) جن کے نیچے موٹا سا سنہری موتی لٹک رہا تھا۔ اس نے آج بھی سوتی روک (چونڈ) پہن رکھا تھا، لمبا سا پیروں کو چھوتا ہوا... مجموعی طور پر وہ بہت نرم خو، باوقار، مہذب، شائستہ اطوار لڑکی تھی اور مذہب کے معاملے میں بہت پختی..... بہت عبادت گزار اور نیک۔ پہلی نظر میں ہی بہت سلیقہ مند اور سکھڑ دکھائی دیتی تھی۔ مون کے مقابلے میں وہ بہت اچھی تھی بلکہ بہت ہی اچھی تھی۔ مون ایک خوب صورت بلا بھی جبکہ سوزن کوئی نیک دل پری، اگر اس کے نام کا آخری حرف ہٹا دیا جاتا تو اس کی پوری شخصیت ایک لفظ سوز سے عبارت تھی۔ سوز و گداز سے گندھی، ادا سیوں کی مٹی سے تخلیق کی گئی نہایت حلیم، مہربان، شفیق، خلیق!..... وہ اس نگر نہ جانے

جاگتے اور خیال رکھتے۔“ وہ خفگی سے کہہ رہی تھی تب علی عیسیٰ نے ان کی بات درمیان سے اچک کر بر جتہ کہا۔

”میں اس کے ساتھ تو تھا، البتہ جاگنا اور خیال رکھنا ذرا مشکل کام تھا۔“ مالا کی طرف شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ برابر مسکرا بھی رہا تھا۔ تب گروسی کی خفگی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

”تم اپنے باپ جیسے اچھے شوہر ثابت نہیں ہو رہے۔“ گروسی کی جھاڑ پر علی عیسیٰ کا منہ اتر گیا تھا۔

”میں پاپا جیسا نہیں ہوں مگر ان جیسا بننے کی کوشش ضرور کروں گا۔“ اس نے ذرا ٹھوس لہجے میں اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ تب گروسی کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ یہ مسکراہٹ علی عیسیٰ کی فرمانبرداری کے لیے تھی۔ وہ بہت اچھا، بہت نیک اور فرمانبردار بیٹا تھا۔ اس بات سے کوئی بھی ناواقف نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ اس سچائی سے بھی کوئی ناواقف نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد سوزن کچن سے نکل آئی تھی پھر رفتہ رفتہ اس نے میز کو انواع و اقسام کے کھانوں سے بھر دیا تھا۔ مالا کی خواہش تھی وہ سوزن کے ساتھ کچن میں کام کروائے..... کم از کم برتن ٹیبل تک پہنچا دے مگر علی عیسیٰ نے اسے اٹھنے ہی نہیں دیا تھا۔

”چپ کر کے بیٹھی رہو۔“ علی عیسیٰ نے اسے اشارے سے منع کر دیا تھا تب وہ چپ چاپ دوبارہ بیٹھ گئی تاہم ان کے اشارے گروسی کی نظر میں ضرور آگئے تھے پھر انہوں نے علی عیسیٰ سے اشاروں کناپوں میں وجہ پوچھی تھی، علی عیسیٰ نے وجہ بتا دی۔ تب انہیں مالا پہ نوٹ کے پیار آ گیا تھا۔

”تمہاری بیوی بہت اچھی ہے۔“ وہ بر ملا تعریف کر رہی تھیں، اسے ساتھ لگا رہی تھیں۔ تاتنے کو محبت کے یہ مظاہرے سخت برے لگ رہے تھے

جانوروں کی خوفناک آوازوں سے۔“ اس کے برابر بیٹھا علی عیسیٰ مقامی زبان میں گروسی سے مخاطب ہوا تھا۔ اس کے بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ گروسی نے بھی گردن موڑ کر مالا کو دیکھا تھا یوں مالا کو خود بخود محسوس ہو گیا تھا کہ علی عیسیٰ نے اسی کے متعلق بات کی ہے۔ تاہم وہ ان کی گفتگو سمجھ نہیں پاتی تھی۔ ناشتے کی میز پر آنے والے وہ دونوں پہلے افراد تھے۔ ان کے بعد گروسی اور تاتنے آئی تھیں۔ سوزن، مالا سے خاصی گرم جوشی سے مل کر اب ان کے لیے ناشتا بنا رہی تھی۔ وہ کل سے آج بہت بہتر لگ رہی تھی۔ کل والی سوگواریت آج اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ وہ اپنی ماں سے بہت مختلف تھی، مالا کو سوزن بہت حلیم الطبع محسوس ہوئی تھی جبکہ تاتنے سخت، کرخت مزاج عورت تھیں۔ البتہ مالا نے ایک چیز نوٹ کی تھی، علی عیسیٰ کو سوزن خاص پسند نہیں تھی۔ ان کے درمیان بس ہیلو پوائے تک بات چیت کے علاوہ طویل گفتگو نہیں ہوتی تھی، سوزن شاید اس کا حال احوال پوچھنا چاہتی تھی مگر علی عیسیٰ کی رکھائی دیکھ کر پلٹ کر کچن میں چلی گئی تھی تاہم مالا نے اس کے چہرے پر خفت کی ہلکی سرخی ضرور محسوس کر لی تھی۔

علی عیسیٰ سوزن کے چلے جانے کے بعد گروسی کو مالا کے ڈرنے کا احوال بتا رہا تھا تب گروسی نے اسے ساتھ لگا کر بہت پیار سے کہا۔

”واقعی.....؟“

اب وہ علی عیسیٰ سے حیرانی کے عالم میں پوچھ رہی تھیں۔ ان کے خیال میں علی عیسیٰ مذاق کر رہا تھا مگر وہ مذاق میں بات نہیں کر رہا تھا۔

”مجھے افسوس ہے۔“ گروسی نے پریشانی سے کہا۔ انہیں افسوس تھا، مالا پہلی مرتبہ ان کے گھر آئی تھی اور ساری رات بے آرام رہی..... وہ علی عیسیٰ کو ڈپٹ رہی تھیں۔ ناراض ہو رہی تھیں۔

”تمہیں چاہیے تھا اس کے ساتھ رہتے،

66 ماہنامہ پاکیزہ اپریل 2014ء



**سالگرہ کا تحفہ**

کوئی دکان ایسی ہو تو بتاؤ بہنو  
جہاں چوری کا زیور ملتا ہو  
ہاتھ میں میرے ہیں صرف دو ہزار روپے  
اور اپنی بھابی کو سیٹ دینا ہے  
شاعرہ: عظمیٰ آفاق سعید  
مرسلہ: عرشہ جنید، کراچی

خبری اور سابقہ کیفیت پر حد سے زیادہ شرمندہ تھی۔  
”میں سو تو نہیں رہی تھی۔“ اس نے وضاحت  
دینا ضروری سمجھا تھا مگر یہ وضاحت نری بیکار گئی تھی۔  
وہ اسے ساتھ لیے اسی ڈبل روم میں آیا تھا جو رات  
سے ان کی خواب گاہ رہا تھا۔ وہ بغیر اس کے کچھ کہے  
سمجھ گئی تھی کہ عیسیٰ اسے یہاں کیوں لایا ہے۔

”اب تم آرام سے سوتی رہو، کوئی بھی ڈسٹرب  
نہیں کرے گا۔“ عیسیٰ نے نرمی سے کہتے ہوئے  
ٹائیلوں کا پردہ ہٹا کر ایک مرتبہ پھر گلاس ونڈو کی  
سلائڈ بند کر دی تھی جو صبح کھول لی گئی تھی۔ اپنے  
تئیں وہ اس کے لیے بڑا پرسکون ماحول بنا کر گیا تھا۔  
باہر سے دروازہ بھی اچھی طرح بند کر گیا تھا مگر ڈبل  
روم میں تنہا بستر پر لیٹے، لیٹے وہ پینہ، پینہ ہو گئی  
تھی۔ دراصل اسے رات کے تکلیف دہ منظر نے  
گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ جب وہ اپنے بھائی کی  
موجودگی میں رات کو اندر کمرے میں آگئی تھی تو پھر  
اسے اکیلا یا کربھلا کیوں نہ آتی؟ حالانکہ مالانے  
اسے ناشتے کی میز پر دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے  
اس کا ذکر کیا تھا۔ جانے وہ رات بھر سے کہاں  
تھی؟ مون کے بارے میں سوچتے ہوئے اس نے  
کروٹ لی تو اسے اپنے دماغ پر عجیب سا بوجھ محسوس  
ہوا تھا۔ یہ بوجھ کسی بھاری وزن سے مشابہ تھا۔ جیسے

ایک لفظ میں تمہاری پوری شخصیت کو اجاگر کر دیا ہے  
اور تم یوں بھی سمجھو کہ بس تمہاری اسی ایک خوبی نے  
مجھے عمر بھر کے لیے تمہارا اسیر کر دیا ہے۔“ عیسیٰ کیا  
کہہ رہا تھا؟ کیا بول رہا تھا؟ مالا کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی  
تھی۔ بس اسے اتنی خبر تھی وہ دھیرے، دھیرے ہوا  
کے رتھ پر سوار ہو رہی ہے..... اس کے ہاتھ نرم  
بگولوں کو چھو رہے تھے یا ریشم کے لچھے اس کے  
رخساروں کو چوم رہے تھے۔ کبھی اسے لگتا وہ پھولوں  
کی پھلاری میں سے گزر رہی ہے۔ کبھی اسے لگتا وہ  
ہوا میں تیر رہی ہے اور کبھی وہ آپس کے پہاڑوں کی  
طرف رواں دواں ہونے لگتی۔ وہ سنہری خوابوں کے  
دیس رستہ بھٹک کے آگئی تھی۔ وہ کالج کے شہر بھول  
کر آگئی تھی۔ وہ علی عیسیٰ کے من ہائیم آگئی تھی۔ وہ  
من ہائیم جہاں محبت سانس لیتی تھی۔ پیلے (دریا کے  
کنارے موجود جنگل) میں دم لیتی تھی۔ جہاں خوش  
پوشاک بے فکرے لوگ چمیلیں کرتے تھے۔

یہ خوابوں کا دیس تھا۔ یہ سنہرے ریشم جیسے  
لوگوں کا دیس تھا۔ جہاں دھوپ میں چشمے پھونٹتے  
تھے، جہاں رات میں بلوے کھلتے تھے، خوش نما، خوشبو  
میں مہکتے، جہاں ”ساخابوں“ میں کنول کھلتے تھے۔  
وہ خواب کے اتنے حسین اور مختصر سفر کو طے  
کرتے ہوئے خاردار جھاڑی میں الجھ گئی تھی تب اس  
کی بے ساختہ چیخ اٹھ آئی۔ اس نے آنکھ کھول کر ذرا  
حواسوں میں آ کر دیکھا تو علی عیسیٰ فکر مند سا اسے  
جنجھوڑ رہا تھا۔

”ارے لڑکی! تمہیں کیا ہوا؟“ وہ حد درجہ متفکر  
تھا اور اسے کھڑے کھڑے سوتا دیکھ کر سخت جھنجھلایا  
بھی تھا۔

”میں نے کہا تھا نا..... نیند پوری کر لو، دو  
تین گھنٹے سولو مگر تمہیں تو میری جاسوسی کرنا تھی، اب  
چلتے چلتے نیند پوری کرنا.....“ وہ خفگی سے کہہ رہا تھا،  
اب کہ مالا فل حواسوں میں آچکی تھی اور اپنی بے

پلے تو کچھ نہیں پڑتا تھا۔

”مشکل کام میں ہی تو مزہ آتا ہے، دیکھو، مالا  
میں ہر وقت تو تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا۔ آفس  
جاؤں گا، آفیشل ٹورز پر جاؤں گا اور تمہیں جگہ، جگہ  
کسی ترجمان کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میں چاہتا  
ہوں تم اطالوی اور ترکی کی بھی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھو  
تاکہ مشکل وقت پر آسانی ہو جائے۔ یہاں کی  
سرکاری زبان ڈچ ہے۔ تمہیں جگہ، جگہ مشکل پیش  
آئے گی۔ یہاں مشکل سے ہی لوگ انگریزی سمجھتے  
ہیں۔“ عیسیٰ کے سمجھانے پر اس کا نفی میں ہلتا سر  
قدرے اثبات میں ہل گیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی اسے  
کبھی ڈچ زبان نہیں آسکتی۔ اسے دنیا کی سب سے  
مشکل زبان یہی لگ رہی تھی۔ وہ خود کو ان لوگوں کے  
درمیان گونگا، بہرہ سمجھتی تھی اور ویسے بھی اسے  
انگریزی کہاں آتی تھی۔ بس گزارہ ہو جاتا تھا۔

”میں جلد ہی تمہارا کسی انسٹی ٹیوٹ میں  
ایڈیشن کروادوں گا۔“ عیسیٰ اپنے ارادے... ظاہر  
کر رہا تھا اور مالا کا دل ابھی سے گھبراہٹ میں جتلا  
پور رہا تھا مگر وہ اپنی گھبراہٹ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔  
تجسبی بات بدل گئی۔

”اچھا، ابھی تو بتادیں، سوزن نے میرے  
بارے میں کیا کہا؟“ وہ ذرا بعقد ہوئی تو عیسیٰ نے  
صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”کچھ اور پوچھو گی تو بتا دوں گا، یہی کہ گروسی  
اور میرے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ بھی تمہارے  
متعلق تھیں لیکن یہ بات ہرگز نہیں بتاؤں گا، اسے تم  
خود کھوجنا، معنی ڈھونڈنا، مطلب نکالنا، اس سے تمہیں  
ڈچ سیکھنے کا شوق بھی ہوگا۔“ عیسیٰ کے بھکارنے پر  
وہ چپ کر گئی تھی۔ اب یہ عیسیٰ کی خواہش تھی وہ بھلا  
کیسے نال جانی؟

”اور ہاں! تم سوزن سے کچھ بھی پوچھ لینا، کم  
از کم اس لفظ کے معنی نہ پوچھنا، یوں سمجھو اس نے

بڑے بھولپن سے پوچھ رہا تھا۔ گویا حد سے زیادہ  
معصوم بننے کی کوشش کر رہا تھا..... اس کی چالاکی پر وہ  
قدرے برہم ہو گئی تھی۔

”جیسے میری آنکھوں پر توٹی بندھی تھی۔ وہ بے  
چاری جتنی مرتبہ میز پر ڈسٹر رکھنے آئی، آپ نے  
اسے کڑی نگاہوں سے گھورا، وہ خفت زدہ سی پلٹ  
جاتی تھی، بس آخری مرتبہ اس نے کچھ ایسا کہا، جس  
پر آپ مسکرا دیے تھے۔“ مالانے گزشتہ منظر کا کچھ اس  
طرح سے نقشہ کھینچا تھا کہ عیسیٰ کو مانتے ہی بنی پھر وہ  
فوراً گفتگو کا رخ بدل گیا تھا۔

”وہ تمہاری تعریف کر رہی تھی اور تمہاری  
تعریف اس کے منہ سے سن کر مجھے بہت اچھا لگا تھا۔“  
عیسیٰ نے گھور یوں پر روشنی ڈالے بغیر مالا کو بالکل  
سچ، سچ بات بتائی تھی مگر وہ پھر بھی کچھ مشکوک ہو گئی  
تھی۔

”کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“  
”علی عیسیٰ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔“ وہ مسکرا کر  
بڑے مستحکم لہجے میں وضاحت دے رہا تھا تب مالا  
بھی دھیرے سے مسکرا دی تھی۔ اس لمحے اسے سوزن  
کچھ اور بھی اچھی لگی تھی۔

”اس نے میری کیا تعریف کی؟“ مالانے  
چمکتی آنکھوں سے پوچھا۔

”یہ میں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔“ علی عیسیٰ نے  
صاف جواب دے دیا۔ مالا کا منہ اس جواب پر اتر  
سا گیا۔

”مگر کیوں؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔  
”تمہیں خود کھوجنا ہوگا، ڈچ کو سمجھنا ہوگا،  
لوگوں کے لفظوں پر غور کرنا ہوگا تاکہ تمہیں پتا چل سکے  
لوگ تمہارے بارے میں کیا بات کر رہے ہیں۔“  
عیسیٰ کے الفاظ نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔

”مگر یہ تو بہت مشکل کام ہے۔“ وہ گویا رو  
دینے کو تھی۔ ایسی کچھ کچھ قسم کی زبان تھی۔ اس کے



تھوڑے کا بھاریا چکی کے پاٹ..... کچھ دیر بعد اسے اپنی آنکھوں میں چھین محسوس ہوئی تھی۔ یہ چھین جنگلی کانٹوں سے مشابہ تھی۔ اسے بے حد تکلیف محسوس ہوئی۔ مالا کو لگ رہا تھا دماغ کے اوپر والے حصے میں کوئی چپکے سے کھس آیا ہے، اسے لگ رہا تھا دو عجیب ترین آنکھیں اس کے دماغ میں کھس گئی ہیں۔ وہ ان آنکھوں کو اپنے دماغ میں سے نکالنا چاہتی تھی مگر اس کی یہ کوشش بیکار تھی۔ اس کی ہر کوشش بیکار تھی۔ اس کے وجود پر نیند طاری ہو رہی تھی۔

اگرچہ وہ کمرے میں سونے کے لیے آئی تھی۔ اسے نیند نہ بھی آتی تب بھی وہ علی عیسیٰ کا حکم کہاں ٹال سکتی تھی؟ حالانکہ اس نے کوئی حکم تو نہیں دیا تھا۔ بڑے پیار سے اسے سونے کی تاکید کر کے گیا تھا مگر وہ علی عیسیٰ کے منہ سے نکلے ہر لفظ کو اپنے لیے حکم کا درجہ دیتی تھی۔ گویا یہ اس کی محبت اور فرمانبرداری کی انتہا تھی۔

علی عیسیٰ چاہتا تھا کہ وہ آرام کر لے تاکہ سفر کے لیے فریش ہو کر نکلے۔ سو مالا نے اس کی بات مان لی تھی حالانکہ تب نیند اس کی آنکھوں میں نہیں نہیں تھی..... مگر اب..... اب جانے کیا ہو رہا تھا؟ وہ بستر پر پہلے کی طرح کروٹ کے بل لیٹنا چاہتی تھی مگر کسی معمول کی طرح سلپپر پہنے اٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ وہ سونا چاہتی تھی مگر چل رہی تھی۔ ڈبل روم کے دروازے کا لاک کھول کر وہ واپس اپنی جگہ آنا چاہتی تھی مگر اس کا پیر اپنے ہی دوپٹے میں الجھ گیا تھا۔ بس ساعت بھر کے لیے یوں لگا، اس کے ذہن نے بہت زور سے جھٹکا کھایا ہو، مالا کو لگا وہ دو عجیب ترین اور حسین ترین آنکھیں بہت عجلت میں اس کی کھوپڑی میں سے نکل گئی ہیں۔ الجھے دوپٹے نے اسے منہ کے بل کارپٹ پر گر ادیا تھا۔ فرش کی سطح چمکی کارپٹ کی وجہ سے گداز تھی بھی اسے چوٹ نہیں آئی۔ اور وہ اپنے دونوں گھٹنوں پر

زور ڈال کر اٹھتے ہوئے حیرت سے سوچ رہی تھی۔

”ارے..... میں تو بیڈ پر سوئی تھی پھر فرش پر کیسے گری؟“ اسے اپنے ہی سوال کا جواب پھر بھی نہیں ملا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ مالا کو کبھی یاد نہیں آیا وہ بیڈ سے فرش پر کیسے گری؟ اسے لگا، شاید وہ کارپٹ پر ہی سو رہی تھی۔ وہ اپنے ہی جواز پر مطمئن ہو گئی..... حالانکہ یہ عجیب نیند تھی، جس نے اسے فریش کرنے کے بجائے پڑمردہ کر دیا تھا۔ اس کے منہ کا ذائقہ بھی بدل گیا تھا۔ تب وہ اٹھ کر ہاتھ روم میں چلی گئی۔ نہانے سے طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو وہ دوپٹا اچھی طرح اوڑھ کر نیچے چلی آئی حالانکہ اس کے ذہن میں نہانے سے لے کر نیچے آنے تک ایک کشمکش چھڑی ہوئی تھی۔ ایک دنی دبی جنگ جاری تھی۔

”میں بیڈ پر سوئی تھی یا کارپٹ پر؟“ اس کے ذہن سے یہ سوال کبھی محو نہیں ہو سکتا تھا۔ دراصل وہ آج تک کبھی نیچے نہیں سوئی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک تو پھر ایک اجنبی جگہ پر کیسے نیچے سو گئی تھی؟ پھر اسے خیال آیا شاید وہ بہت تھک گئی تھی نیچے ہی سو گئی۔ ایسے ہی سوالوں میں الجھتی جب وہ نیچے آئی تب اچانک شیئیر سیال (ڈائننگ روم) سے عیسیٰ نکلتا دکھائی دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا پھر اس کی نگاہ اپنی رسٹ وائچ پر پڑی..... مالا نے واضح طور پر عیسیٰ کی سفید پیشانی پر جھٹتے بڑھتے دیکھے تھے، اس کا دل لمحے بھر کے لیے سٹکر گیا تھا۔ وہ عیسیٰ کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بالآخر بول ہی پڑا۔

”تم ایک ضدی لڑکی ہو، ذرا بھی بات نہیں مانتیں..... میں نے کہا تھا کہ دو تین گھنٹے سولینا اور تم دو تین منٹ بھی نہیں سوئی ہوگی، نہا کر نیچے آگئیں..... یعنی دو تین منٹ واش روم میں گزر گئے اور تم لمحے بھر کے لیے بھی نہیں سوئیں۔“ عیسیٰ کے لہجے میں خفگی نمایاں تھی.... گویا اسے مالا کا بات نہ ماننا برا لگا تھا..... یقیناً اسے برا لگا تھا۔ وہ اس کا اتنے خلوص

اور پیار سے خیال رکھ رہا تھا جبکہ مالا شاید اپنا خیال رکھانا نہیں چاہتی تھی۔ شاید عیسیٰ کے ذہن میں آنے والا خیال یہی تھا مگر مالا اس کی خفگی پر حیران رہ گئی تھی۔ وہ کیوں بلاوجہ خفا ہو رہا تھا؟ جبکہ مالا دو تین گھنٹے سو کر نیچے آئی تھی۔

”میں تو کب سے سو رہی تھی، کیا اب بھی نہ اٹھتی؟“ اس نے بوجھل آواز میں صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔ علی عیسیٰ نے چھتی نظر سے اسے دیکھا۔

”کب سے سو رہی تھی؟ کیا دو تین دن گزر گئے؟“ اس نے چبا، چبا کر اس کی سرخ بوجھل آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا۔ وہ مضمحل اور پڑمردہ نظر آرہی تھی۔ بھٹی، بھٹی اور تھکی، تھکی عیسیٰ کم از کم اس روپ میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بھی چاہتا تھا کہ وہ آرام کر لے پھر اسے خیال آیا شاید وہ رات کی طرح اکیلے ہونے کے خوف سے سو نہیں پائی۔ یقیناً یہ خیال قوی تھا۔ بھی اس کا بگڑتا مزاج معتدل ہو گیا۔ ان دونوں کی گفتگو خاصی بلند آواز میں ہو رہی تھی اسی لیے سوزن کارڈور سے گزرتی ان تک آگئی۔

”کیا ہوا؟“ سوزن نے فکر مندی سے پوچھا، وہ عیسیٰ کی طرف دیکھ رہی تھی جبکہ مالا کی نظر اس کے پھولے، پھولے سرخ گالوں پر تھی۔ اس کے گال دور سے ہی بہت نمایاں نظر آتے تھے، روئی جیسے نرم مگر ابھرے، ابھرے اس کے چہرے پر ان دونوں کے لیے فکر مندی تھی، جو بہت بھلی نظر آرہی تھی پھر عیسیٰ نے نہ جانے سوزن سے کیا کہا تھا، وہ اثبات میں سر ہلا ہلا کر گویا اسے کوئی یقین دہانی کروا رہی تھی۔

”ماخت نشتس.....“ سوزن نے نرمی سے مالا کے چہرے کی طرف دیکھ کر عیسیٰ سے کہا تھا پھر وہ دونوں اسی سچ سچ زبان میں جانے کون سے مذاکرات کرنے لگے تھے۔ ایک تو ان کی باتیں اسے سمجھ نہیں آرہی تھی، دوسرا اس پر جانے کیوں جھنجھلاہٹ سوار تھی۔ کہاں علی عیسیٰ صاحب سوزن کی

طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور کہاں اب چارمنٹ سے بغیر ر کے گفتگو جاری تھی۔ اللہ، اللہ کر کے بات ختم ہوئی تو عیسیٰ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”گروسی اور سوزن کی خواہش ہے، ہم دو پہر کا کھانا کھا کر یہاں سے جائیں، اتنی دیر تک میں تمہیں اپنی ماں کا یہ علاقہ دکھاتا ہوں۔“ وہ گزشتہ خفگی بھلائے سابقہ نرمی سے بات کر رہا تھا۔ عیسیٰ کو وہ اپنی گفتگو کے دوران بھی چپ، چپ سی لگی تھی، یقیناً نیند کی کمی کا شکار اور بے آرامی کے باعث پڑمردہ تھی۔ تاہم عیسیٰ نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ مزید یہاں رکنے کا سن کر کچھ مضطرب ہو گئی ہے۔

”ہم گھر واپس کب جائیں گے؟“ اس نے... فی الفور اپنے من کی بات کہہ دی تھی، یقیناً اجنبی جگہ پر خود کو بے آرام محسوس کر رہی تھی۔

”انشاء اللہ سہ پہر تک، میں گروسی سے وعدہ کر چکا ہوں، ورنہ ابھی نکل جاتے۔“ یقیناً وہ اس کے تاثرات کا مطالعہ کر چکا تھا۔ مالا کو ذرا مسکراتا ہی بڑا۔ وہ مزید بوجھل پن کا مظاہرہ کر کے عیسیٰ کو مشکوک نہیں کرنا چاہتی تھی نہ اس سے ڈانٹ کھانا چاہتی تھی اسی لیے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ عیسیٰ کی ہمراہی میں اس جادو مگرمی سے باہر آگئی تھی۔ یہ خوب صورت مکان جسے دور سے دیکھنے کے بعد وہ چل سی گئی تھی، قریب آ کر کچھ پراسرار سا لگا تھا۔ حالانکہ مکان پراسرار نہیں تھا۔ اس مکان میں رہنے والی وہ عجیب سی لڑکی جسے مالا نے دوبارہ اس رات کے علاوہ گھر میں نہیں دیکھا تھا حد سے زیادہ پراسرار اور عجیب تھی اور مالا کی خواہش تھی وہ دوبارہ بھی نہ اسے دیکھ پاتی لیکن بعض خواہشیں پوری کہاں ہوتی ہیں؟

وہ اس وقت عیسیٰ کی ہمراہی میں مون کو ہرگز بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی سو عیسیٰ کے پیچھے سفید گلابوں کے باغ میں سے گزر رہی تھی۔ عیسیٰ اسے اپنے بارے میں



بوریہا کا آسمان آن کی آن میں بادلوں کے  
مہرے بگولوں سے ڈھک گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا  
بوندیں اب برسیں کہ تب برسیں۔

مالا کا ننھا سادل سہم گیا جبکہ عیسیٰ کو قطعاً پروا نہیں  
تھی۔ وہ ایسے موسموں کا عادی تھا۔

”موسم خراب ہو گیا ہے۔ ہم گھر واپس کیسے  
جائیں گے؟“ اسے من ہائیم واپس جانے کی بے  
چینی تھی، وہ کم از کم ایک اور رات یہاں گزارنے کا  
تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور عیسیٰ جو اتنے آرام سے  
جھلیں کر رہا تھا مالا کو پورا گمان ہونے لگا تھا وہ آج کی  
رات بھی یہیں رہے گا۔

”گھر ہی تو جا رہے ہیں۔“ عیسیٰ نے اطمینان  
سے کہا تھا، وہ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس  
کے برابر چل رہا تھا۔ مالا اس کا اطمینان ملاحظہ کر کے  
خفگی سے بولی۔

”اس گھر کی نہیں، میں تو اپنے گھر کی بات  
کر رہی ہوں۔“ مالا قدرے جتا کر بول رہی تھی عیسیٰ  
اس کے جتانے پر چونکا۔

”اپنا گھر.....!“ اس کے لبوں پر مسکان چمک  
اٹھی تھی تو گویا وہ عیسیٰ کے گھر کو اپنا گھر تسلیم کر چکی  
تھی۔ اس کے لیے مالا کے یہ الفاظ بہت قیمتی تھے۔

”مگر اب تو موسم خراب ہو چکا ہے۔ ہم صبح ہی  
نکل سکیں گے۔“ گروسی کے گھر تک پہنچ کر عیسیٰ نے  
بے چارگی سے کہا تھا۔ بھی آسمان سے ٹپ ٹپ  
مونی، مونی بوندیں گرنے لگی تھیں۔ مالا کا چہرہ پھیکا سا  
پڑ گیا۔ وہ لوگ آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئے

تھے۔ اسی اثنا میں گروسی اٹھ کر ان کے قریب  
آگئیں۔ وہ بہت پریشان اور متشکر لگ رہی تھیں اور  
انہوں نے جو بات عیسیٰ کو بتائی تھی اسے سن کر وہ ایسا  
پریشان ہوا کہ لمحے بھر کے لیے بھی یہاں ٹھہرنے والا  
نہیں تھا پھر اس نے اپنا سیل فون جیب سے نکالا۔ وہ

ایک گھریلو سی لڑکی تھی، کالج اور گھر کے علاوہ کوئی اور  
مصروفیت نہیں تھی، کچھ ڈیٹان بھائی کو لڑکیوں کا  
گھومنا پھرنا پسند نہیں تھا۔ کبھی کبھی شامی آؤٹنگ  
موڈ ہوتا تو لے جاتا، ڈیڑی سے زیادہ بھائیوں کی  
روک ٹوک انہیں ایک حد میں رکھا کرتی تھی۔ خصوصاً  
ڈیٹان بھائی کو تو کچھ زیادہ ہی ان دونوں بہنوں کے  
بگڑنے کا خدشہ تھا، ہر وقت کا غصہ اور بلاوجہ روک  
ٹوک نے مالا کو کچھ زیادہ ہی خاموش طبع بنا دیا تھا،  
بندیا فطرتاً کچھ مختلف تھی اور شاید کچھ منہ بھٹ بھی۔

وہ لڑکی جسے تہا مارکیٹ تک جانے کی اجازت  
نہیں تھی صرف ایک بندے سے رشتہ بدلنے کی  
بدولت کہاں ایک دوسرے دیس میں چھوٹے سے  
گاؤں میں گھوم رہی تھی..... یہ قدرت کے کیسے  
کرشمے تھے..... اس کے ہونٹوں پر مسکان سی چمک  
گئی تھی، علی عیسیٰ نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔

”تم چپکے، چپکے اس لیے مسکراتی ہوتا کہ میں  
تمہیں نظر نہ لگا دوں۔“ وہ مالا سے کچھ آگے نکل گیا  
تھا، اب دوبارہ اس کے برابر چل رہا تھا۔ مالا ایک  
مرتبہ پھر مسکرا دی۔ وہ اس کی ہمراہی پر فخر کر رہی تھی۔

علی عیسیٰ اسے ایک الگ بستی میں لے آیا تھا،  
جہاں سے ایک سرخ عمارت بہت واضح نظر آرہی  
تھی۔ یہ خوب صورت عمارت اپنی انفرادیت کے  
باعث مالا کی نگاہ میں آگئی، وہ ایک مرتبہ پھر اس  
عمارت کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر اندر سے  
دیکھنے کے لیے نکل گئی تھی، حالانکہ وہ ایک مرتبہ پھر  
غلطی کر رہی تھی، اس نے پہلے بھی ایک خوب  
صورت مکان کو دیکھ کر اندر سے نظارہ کرنے کی  
خواہش دل میں پالی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر ویسی ہی  
خواہش دل میں رکھتی تھی۔ اس کے اصرار پر علی عیسیٰ  
نے قدرے برہم سے لہجے میں کہا۔

”ضروری نہیں، جو چیز باہر سے اتنی خوب  
صورت ہو، اندر سے بھی ویسے ہی اٹریکٹ کرے۔“

بتا رہا تھا۔ اس کے بچپن کی ہر چھٹیاں یہاں گزرتی  
تھیں، اس کے پاپا اور ماما کی لومیرج تھی۔ ممانے  
اسلام قبول کیا پھر پاپا سے شادی کی، تاہم اس کی  
گروسی نے ان سے ملنا جلنا نہیں چھوڑا تھا۔ عیسیٰ نے  
بتایا تھا کہ اس کے پاپا نے یہاں آکر بہت محنت کی  
تھی، حالانکہ پاکستان میں وہ ایک خوشحال گھرانے  
کے فرد تھے، پاپا نے جو کچھ بھی کمایا تھا اپنی محنت اور  
ایمانداری کی بدولت کمایا تھا، ان کا آج بزنس کمیونٹی  
میں ایک نام ایک مقام تھا۔ سچائی، ایمان داری اور  
انتھک محنت اس کے باپ کا سب سے بڑا وصف تھا  
اور یہی وصف انہوں نے عیسیٰ کے اندر گھول کر ڈال  
رکھا تھا، عیسیٰ بتا رہا تھا کہ اس کا حلقہ احباب اتنا وسیع  
نہیں، کتنی کا بھی کوئی دوست نہیں، وہ آفس کے بعد کا  
وقت گھر میں گزارتا تھا، اسے پارٹیز، کلب، ہنگامے،  
شور وغل پسند نہ تھے۔

ان چند گھنٹوں میں مالا کو عیسیٰ کی تمام پسندنا  
پسنداز برہو چکی تھیں۔ وہ اس کی ایک، ایک بات سن  
کر حفظ کر رہی تھی، اسے عیسیٰ کو سننا بہت اچھا لگ رہا  
تھا۔ عیسیٰ کا بولنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے  
لفظوں میں کتنی مٹھاس تھی، کتنی چاشنی تھی، وہ سحر زدہ  
سی سن رہی تھی۔ اسے لمحے بھر کے لیے بھی خیال نہیں  
آیا تھا، وہ عیسیٰ سے پوچھتی تو سہمی، اتنے محبت کرنے  
والے والدین کے اتنے فرمانبردار بیٹے کی اکلوتی  
بہن اتنی باغی کیوں لگتی ہے؟ مون ایسی کیوں لگتی  
ہے؟ وہ اتنی اکھڑا پڑا سرار کیوں تھی؟ وہ اپنے گھر  
کیوں نہیں رہتی؟ آخر جھگڑے کی نوعیت کیا تھی؟

پھولوں کی رہ گزر سے سبک قدموں اور کسی  
بہت اپنے کی ہمراہی میں گزرتا ایک دلنشیں خواب کا  
کوئی حسین منظر تھا۔ وہ حقیقتاً ایک جادوگری میں آگئی  
تھی۔ اس نے ڈیڑی اور بھائیوں کے ہمراہ بس مری  
وغیرہ کا علاقہ دیکھا تھا، سوات، کاغان کی طرف  
جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا، دیکھا جائے تو وہ

بے احتیاطی کی وجہ سے آف پڑا تھا، اس نے فون آن  
کر کے کان سے لگایا۔ اب وہ جانے کس سے تیز  
لہجے میں بات کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کوئی  
اور نمبر پر بس کیا، تقریباً پندرہ منٹ تیز لہجے میں  
انتہائی غصے سے چنگھاڑتا رہا تھا پھر اس نے فون بند  
کر دیا۔ اب وہ اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔ benz  
کی چابی اور بریف کیس اٹھا کر جب وہ تیز تیز قدم  
اٹھاتا نیچے آیا تب سوزن نہ جانے کس کونے سے نکل  
کر اس کے سامنے آگئی تھی۔

”کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتی ہوں؟“ وہ  
قدرے پریشان تھی اور عیسیٰ کی پریشانی کو بہت اچھی  
طرح سمجھ سکتی تھی۔

”نہیں، میں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔“ وہ بغیر  
رکے گروسی تک آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر عجلت  
پریشانی، تشکر اور جانے کیا، کیا تاثر پھیلے تھے، اس  
نے کم صم کھڑی مالا کی طرف توجہ تک نہیں دی تھی،  
شاید پریشانی کی وجہ بہت بڑی تھی۔ اب وہ گروسی  
سے کچھ بات کر رہا تھا۔ یقیناً اجازت چاہ رہا تھا۔ مالا  
نے غور کیا تو پتا چلا، وہ اس کا سامان بھی اٹھا کر نیچے  
لے آیا تھا۔ یعنی وہ دونوں من ہائیم واپس جا رہے  
تھے۔ مالا کا دل جو کچھ لمحے پہلے سکڑ کر سہم رہا تھا اب  
قدرے مطمئن ہو چکا تھا مگر گروسی کی عیسیٰ کے ساتھ  
طویل ہوتی بحث کو دیکھ کر پھر سے غیر مطمئن ہونے لگا  
تھا۔ اب کہ سوزن بھی جانے کون سے دلائل دینے کی  
غرض سے میدان میں اتر آئی تھی۔ عیسیٰ کچھ اور جھنجلا  
گیا تھا پھر اسی جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں اس سے  
مخاطب ہوا۔

”مالا! مجھے جلدی میں واپس جانا ہوگا، کمپنی کی  
گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے کئی ورکرز شدید زخمی  
ہیں۔ گروسی اور سوزن کی خواہش ہے تم یہیں رک  
جاؤ، موسم خاصا خطرناک ہے، ان کے خیال میں  
تمہارا ساتھ جانا اس وقت مناسب نہیں۔ تم فکر مت



کرنا..... میں صبح ہوتے ہی تمہیں لے جاؤں گا۔“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا گویا گروسی اور سوزن نے مالا کے حوالے سے اسے قائل کر لیا تھا۔ وہ ان کی بات سمجھ چکا تھا۔ موسم انتہائی خراب اور طوفانی تھا، مالا کا ساتھ جانا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ ادھر مالا کا ننھا سا دل اس خیال سے ہی سہم گیا۔ وہ عیسیٰ کے بغیر اس جادوگری میں اکیلی رہے گی۔ وہ خوف زدہ ہو گئی تھی اور عیسیٰ اس کے خوف کو سمجھ رہا تھا۔ وہ اس کی زرد ہوتی رنگت دیکھ کر کچھ متفکر ہو گیا..... اس نے سوزن کو دوبارہ مخاطب کیا۔

”تم مالا کے ساتھ سو جانا، اسے اکیلا مت چھوڑنا، خیال رہے، تمہیں مالا کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہے۔“ وہ بجائے جرمن کے اردو میں سوزن سے مخاطب تھا۔ مالا حیران رہ گئی، شاید عجلت میں کبھی اردو اور کبھی دوسری زبان میں بول رہا تھا مگر مالا کی حیرانی اس وقت بڑھ گئی تھی جب سوزن نے اردو سمجھتے ہوئے بے ساختہ اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

”تم فکر مت کرو، میں مالا کا بہت خیال رکھوں گی۔“ صبح سے لے کر اب تک گچ گچ کرنے والی ابھرے سرخ پھولے گالوں والی اور سینور سے ڈھکے سروالی اس لڑکی نے پہلی مرتبہ اردو میں بات کر کے مالا کو حیران کر دیا تھا۔ وہ اس انکشاف پر دم بخود تھی کہ سوزن نہ صرف اردو سمجھتی ہے بلکہ بول بھی سکتی ہے۔ وہ جو اس خیال سے پہلی پڑتی جا رہی تھی کہ گچ گچ بولنے والے لوگوں میں صبح ہونے تک کا وقت کیسے گزارے گی اب قدرے مطمئن ہو گئی تھی اور مالا کے چہرے پر سکون پھیلتا دیکھ کر عیسیٰ خود بخود مطمئن ہو گیا تھا۔

بس ایک لمحے کی بات تھی، بس ایک بل کی بات تھی، بس ایک ساعت کی بات تھی، عیسیٰ چلا گیا اور وہ اس جادوگری میں رک جانے پر مجبور کر دی گئی تھی، اسے لگ رہا تھا گویا اسے یہاں مجبوس کر دیا گیا ہے،

اپنی مرضی اور اپنی خواہش سے حالانکہ وہ خود بخود عیسیٰ سے اصرار کرتی تو وہ ضرور مان جاتا۔ پھر نہ طوفانی موسم کو دیکھتا نہ آندھی کے جھکڑ کو..... اسے ساتھ ضرور لے جاتا مگر مالا کو زبردستی روکا گیا تھا۔ وہ بھی کیسے..... جیسے کوئی اس کے ذہن میں گھس گیا تھا..... ہاں..... بالکل یہی کیفیت تھی کچھ دیر پہلے اس کی..... وہ آنکھیں اور سر دباتے ہوئے کچھ متوشش ہی بیٹھی تھی آخر اس کے ساتھ ہوا کیا تھا.....؟ اور کیسے بعد دیگرے اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ کچھ دیر پہلے اس کے ذہن پر بوجھ تھا مگر اب یہ بوجھ غیر محسوس انداز میں خود بخود ہٹ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سوزن اس کے لیے بلیک کافی بنا لائی تھی۔

”یواریا آنا کیسا لگا.....؟“ وہ خوش اخلاقی کا عمدہ نمونہ تھی، اسی اخلاق بھری نرم مسکراہٹ کے ساتھ اس نے گفتگو کا آغاز کیا تھا، تب بلیک کافی کے گک کو پکڑنے کے بعد سابقہ کیفیت سے نکل کر مالا نے سوزن سے پہلا سوال کیا..... وہ اس کی بات کو قطعاً نظر انداز کر چکی تھی۔

”تم نے اردو بولنا کس سے سیکھا.....؟“ مالا حقیقتاً حیران تھی، وہ کبھی یقین نہیں کر سکتی تھی مغربی جرمنی کے کسی گمنام چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والی کوئی جرمن لڑکی اتنی شستہ اردو بول سکتی ہوگی۔

”مون سے.....“ سوزن کے بھرے بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس کا اوپر والا ہونٹ نچلے ہونٹ سے کچھ زیادہ موٹا تھا اور پھر سرخ غبارے جیسے گال، مجموعی طور پر وہ خوب صورت لڑکی تھی۔ پہلی نظر میں اچھی لگتی والی، وہ قطعاً فیشن ایبل نہیں تھی۔

ہمیشہ سوتی روک میں نظر آتی تھی۔ اس کے بال بھی رومال میں ڈھکے رہتے تھے یقیناً اسے بھی مالا کی طرح سرنگا کرنے کی عادت نہیں تھی۔ سوزن کے مقابلے میں مون بہت ماڈرن تھی، سر سے لے کر پیروں تک میچنگ کرتی تھی۔

”مجھے حیرت ہے۔“ مالا نے اپنی حیرانی کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ وہ دل میں آئی بات زیادہ دیر تک چھپا نہیں سکتی تھی۔

”تم حیران اس لیے ہو کہ تمہیں ہمارے بارے میں کچھ پتا نہیں..... دراصل، میں بہت عرصے تک مون کے ساتھ رہی ہوں پھر حسیب انکل اور میری آنٹی دونوں اپنے بچوں کے ساتھ اردو میں بات کرتے تھے سو مجھے بھی اردو بولنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ ویسے میں نے اور مون نے اور بھی بے شمار زبانوں پر عبور حاصل کیا ہے۔“ سوزن کا تفصیلی جواب مالا کی تشفی کے لیے کافی تھا..... مگر ایک انگریز لڑکی کو اپنی زبان میں اتنی خوب صورتی کے ساتھ بات کرتے دیکھنا بھی انوکھا تجربہ تھا۔ مالا کو لگا اب عیسیٰ کے بغیر وقت شاید جلد کٹ جائے..... وہ دل ہی دل میں عیسیٰ کے لیے دعا کر رہی تھی تاکہ اس طوفانی بارش میں وہ خیریت کے ساتھ پہنچ جائے۔

”مجھے تم سے بات کر کے بہت اچھا لگا ہے۔“ مالا نے دل سے کہا تھا، وہ حقیقتاً سوزن کی کمپنی کو انجوائے کر رہی تھی۔

”اور مجھے بھی۔“ سوزن بھی مسکرائی۔

”تم ہماری شادی میں نہیں آئی تھیں کیا.....؟“ مالا نے کچھ سوچتے ہوئے بات آگے بڑھائی، اس نے بلیک کافی کے دو سوپ لے کر گنیل پر کھسکا دیا تھا۔

”میں آئی تھی، اپنی موٹر کے ہمراہ.....“ سوزن نے سینٹرل ٹیبل پر رکھی کافی دیکھ کر کہا تھا۔ ”کیا تمہیں کافی پسند نہیں آتی؟“ اس کا اشارہ گک کی طرف تھا جسے دوبارہ نہ اٹھانے کا مالا نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے سوال پر وہ قدرے ہٹکا بکا رہ گئی تھی۔

”کافی اچھی ہے، پر میں نے کبھی پی نہیں۔“ مالا نے قدرے شرمندگی سے وضاحت کی۔

”کوئی بات نہیں، تم اگر چائے پینا چاہو تو میں بنا کر لاتی ہوں۔“ سوزن نے سابقہ نرمی سے کہا۔

## پاکیزہ کے لیے

نہ رنگ آنکھوں کا لال رکھنا  
نہ ویراں ویراں سا حال رکھنا  
جو چاہتوں میں لکھے تھے ہم نے  
وہ لفظ سارے سنبھال رکھنا  
مچل مچل کے ادا دکھانا  
ادا کے اندر کمال رکھنا  
تجھے دلوں کی طے حکومت  
تو شاہوں جیسا جلال رکھنا  
میری دعائیں ہیں ساتھ تیرے  
بس اپنا بہت خیال رکھنا



## دعا

وقت دعا میں اک دعا کروں  
میں رب سے اک التجا کروں  
تو خوش رہے، تو شاد رہے  
تیرے دل کا آگن آباد رہے  
تو ہر پل یونہی ہنسا کرے  
تو پھول کے مانند کھلا کرے  
تیری زندگی میں کوئی غم نہ ہو  
تیری آنکھ کبھی نم نہ ہو  
تجھے کسی سے کوئی گلہ نہ ہو  
تجھے بن مانگے وہ عطا کرے  
تیری معاف ہر اک خطا کرے

مرسلہ: اُمّ ایمان، ڈیرا غازی خان



”نہیں، مجھے طلب نہیں۔“ اس نے فوراً انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے کسی کو بھی پریشان نہیں کرتی تھی پھر ایک گھنٹا مزید باتیں کرنے کے بعد سوزن نے اٹھ کر سفید ٹائیوں کے پردے ہٹا کر ونڈوز کھول دی تھیں۔ باہر طوفان حیرت انگیز طور پر رک چکا تھا اور چمکتی دھوپ مالا کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر رہی تھی..... اس کی حیرانی ملاحظہ کر کے سوزن نے بتایا تھا۔

”یہاں کے طوفان اسی طرح اچانک آتے اور اچانک چلے جاتے ہیں بھی رات بھر بارش برتی ہے اور کبھی گھنٹا ڈیڑھ بعد دھوپ نکل آتی ہے۔ تم یہاں کے موسموں کی ابھی عادی نہیں ہو، آہستہ، آہستہ ہو جاؤ گی۔“ سوزن نے مسکرا کر اسے باہر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پیچھے چلی آئی۔ باہر کا منظر انتہائی دل آویز تھا کھرا، کھرا سبزہ اور پھولوں کے خوب صورت ڈھلے ڈھلائے رنگ..... وہ اسے لیے میسر پر چلی آئی۔ نیلگوں آسمان کی چھایا میں ٹھنڈی ہوا کا لطیف ہونا اچنبھے کا باعث نہیں تھا۔ مالا کا دل گویا ہوا کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ بلاشبہ اتنی اونچائی پہ کھڑے ہو کر اس جنت نظیر خطے کا نظارہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ دونوں میسر پر کھڑی تھیں اور ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ تاحد نگاہ اونچے پہاڑوں کا سلسلہ تھا، طویل تر سلسلہ..... شاید آسٹریا... کی سرحد سے جا ملتا ہوا..... اس کی بھلتی نگاہ نے سرخ عمارت کو جلد ہی کھوج لیا تھا۔ یہ سرخ عمارت بہت خوب صورت تھی..... تین منزلہ انتہائی عالیشان، ایک گاؤں میں ایسی خوب صورت عمارت کا تصور ہی حیران کن تھا۔

”یہ کس چیز کا انسٹی ٹیوٹ ہے؟“ مالا نے بالآخر مچلتا سوال پوچھ لیا۔ تب سوزن نے اپنی فطری سادگی بھرے لہجے میں اس کو کچھ اور بھی حیران کر دیا تھا۔

”یہاں لیکنوٹج کورسز کروائے جاتے ہیں۔ یہ

ایک پرائیویٹ ادارہ ہے، جسے دو سال پہلے سوزن نے ایک لارڈ سے خریدا تھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی اور سوزن نے پہلے وہی لارڈ اس انسٹی ٹیوٹ کو عمرگی سے چلا رہا تھا پھر وہ بیمار ہو گیا اور شہر چلا گیا بعد میں اسے سوزن نے خریدا لیا۔“ سوزن کے جواب نے مالا کو اگرچہ حیران تو بہت کیا تھا تاہم وہ ان کی شہر اردو کے علاوہ مختلف زبانوں پر عبور حاصل کرنے کی وجہ بھی سمجھ گئی تھی۔

”کیا تم یہ انسٹی ٹیوٹ دیکھنا چاہو گی؟“ اس کی دلچسپی محسوس کر کے سوزن نے سوال کیا..... مالا نے نفی میں ہلکا سا سر ہلایا۔

”شاید نہیں، دراصل عیسیٰ کی خواہش ہے کہ میں ترکش اطالوی زبان سیکھوں، کیا پتا وہ میرا ایڈمیشن اسی انسٹی ٹیوٹ میں کروادیں..... یہ علاقہ اور جگہ بہت خوب صورت ہے۔“ نہ جانے کس جھونک میں مالا کے لبوں سے یہ الفاظ پھسل گئے تھے۔ حالانکہ وہ یہاں مستقل رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ شاید اس پراسرار نگری میں رہ کر ہم کر رہ جاتی۔

”ہرگز نہیں، عیسیٰ تمہارا اس انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن نہیں کروائے گا۔“ سوزن کے الفاظ اسے بری طرح چونکا گئے تھے۔

”مگر کیوں.....؟“ وہ بحث نہیں کرتی تھی مگر کر رہی تھی۔ ایک فطری تجسس اٹھ آیا تھا۔ عیسیٰ اسے انسٹی ٹیوٹ کی طرف لے کر بھی تو نہیں گیا تھا۔ سو یہ تجسس خود بخود اس کے من میں اٹھ آیا تھا۔

”یہ سوزن کا انسٹی ٹیوٹ ہے نا..... اور عیسیٰ کی سوزن کے ساتھ ان بن چل رہی ہے۔“ وہ مختصر بول کے لمبی، لمبی سانس لینے لگی تھی۔ اس کوشش میں سوزن کے کانوں کی بالیاں جھولنے لگی تھیں۔ مالا کچھ ٹھنک گئی۔

”کیا ابھی تک ناراضی ہے؟ مگر کیوں.....؟“ اس نے آنکھیں میچ کر حیرت سے پوچھا۔ وہ ابھی

سبک مون اور عیسیٰ کی لڑائی یا ناراضی کی وجہ نہیں جان پائی تھی..... اب اگر خوش قسمتی سے موقع مل گیا تھا اور اردو بولنے والی ایک خوش اخلاق خاتون کی کمپنی بھی میسر تھی سو وہ یہ سنہری موقع کیسے گنوا دیتی؟

”عیسیٰ کی خواہش تھی سوزن..... بزنس کی فیلڈ میں آئے اور اپنی تعلیم مکمل کرے..... مگر اس نے پڑھائی چھوڑ کر انسٹی ٹیوٹ بنا لیا..... پھر وہ گھر پر نہیں رہتی تھی اور یہاں بھی کم کم آتی ہے..... جب وہ گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ پھر ہمارے پاس بھی نہیں رہی بلکہ بیدی نوگ، انسٹی ٹیوٹ میں جانے کون سا ہنر سیکھنے چلی گئی۔ دراصل وہ ایک غیر معمولی ذہن رکھنے والی لڑکی تھی۔ اسے ہجوم پسند نہیں تھا..... اور پڑھائی میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ غیر معمولی کام سیکھنا چاہتی تھی۔ کچھ ایسا جو اس کے ارد گرد رہنے والوں میں سے کسی نے نہ سیکھا ہو..... بس انہی باتوں پر عیسیٰ کا اس سے اختلاف تھا۔“ سوزن نے کب سے اس کے ذہن میں لگی گرہ کو کھول دیا تھا تو اتنی معمولی بات پر وہ باپ اور بھائی سے خفا تھی۔ حالانکہ یہ کوئی بڑی بات تو ہرگز نہیں تھی۔

”عیسیٰ تو اب بھی کہتا ہے، وہ گھر آ جائے مگر وہ مانتی نہیں..... دراصل آنٹی کی وفات نے اسے ذہنی طور پر بہت تباہ کر دیا تھا۔ پھر وہ گروسی کے پاس چلی آئی..... انکل اور عیسیٰ مطمئن ہو گئے..... انہیں گروسی پر بڑا اعتبار تھا مگر سوزن یہاں بھی اتنا نہیں رہی..... وہ بیدی نوگ چلی گئی.....“ سوزن اسے بتا رہی تھی وہ مزید اب سوزن سے کیا پوچھتی؟ اس نے ذہن کو آگے، پیچھے دوڑانا چاہا..... اس کی سوچوں کے درمیان ہی سوزن نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑ دیا تھا۔

”اس انسٹی ٹیوٹ کو خریدنے کے لیے سرمایہ تو حسیب انکل نے ہی دیا تھا۔ انہیں اپنے بچوں سے بڑا پیار ہے۔“ یہ بات مالا کو بتاتے ہوئے اس کا لہجہ حسرت کی کمی سے بھر گیا تھا۔ شاید اسے اپنا باپ یاد

آ گیا تھا۔ سوزن کی مہی، پاپا میں کب سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ شاید وہ اس بات کو بہت محسوس کرتی تھی مالا کو سمجھ نہ آئی، وہ اسے افسردگی کی اس کیفیت سے کیسے نکالے؟ کچھ دیر بعد مالا کو گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے ایک بے ضروری بات مل گئی تھی۔

”اور تم کیا کرتی ہو؟“ اس نے ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے پوچھا۔ سوزن اس بل مالا کو اور بھی اچھی لگی تھی۔

”فیر کی فرین.....“ وہ اپنے ہی دھیان میں بولتے ہوئے ایک دم ٹھنکی جیسے کچھ یاد آیا ہو..... ”میں سیلز گرل ہوں..... کاؤف ہاؤس میں کام کرتی ہوں۔“ اسے خیال آیا تھا مالا ترکش نہیں سمجھتی تھی سنبھل کر اردو میں بولی تھی۔

”کیا شہر جاتی ہو؟“ مالا نے مزید پوچھا۔

”نہیں، سڑک کے پار اسٹور ہے کسی کا، اس انسٹی ٹیوٹ کے اسٹوڈنٹس کے لیے..... بھانت بھانت کے لوگ آتے ہیں زبانیں سیکھنے، نہ جانے کس، کس مگر اور وطن سے۔“ سوزن نے سنجیدگی سے بتایا تھا۔ مالا کو یہ جان کے دھچکا سا لگا تھا۔ یعنی عیسیٰ اور سوزن کی کزن معمولی سی سیلز گرل تھی۔ سوزن جو انٹرنیشنل لیول کا انسٹی ٹیوٹ چلا رہی تھی اور عیسیٰ جس کا اتنا وسیع بزنس تھا۔ وہ شاکڈ نہ ہوتی تو کیا کرتی.....؟

”ویسے میں سال کے دو تین ماہ ایک سنڈیکیٹ کے ساتھ تبلیغ کے لیے بھی جاتی ہوں۔“ وہ بہت مذہبی لڑکی تھی۔ حقیقت میں اسے اپنے مذہب سے بہت لگاؤ تھا۔ سوزن نے اسے بتایا تھا کہ وہ اپنے باپ کی طرح کرسمس تو م تھی یعنی عیسائیت کی پیروکار..... اور وہ اپنے مذہب سے بہت مطمئن تھی، چرچ اس کے لیے تفریح گاہوں سے زیادہ سکون مہیا کرنے والے تھے۔ مالا کو یاد آیا، سوزن کو اس نے پہلی مرتبہ چرچ میں دیکھا تب وہ ہچکچوں سے رو رہی تھی، مالا کے



استفسار پہ عیسیٰ نے بے نیازی سے کہا تھا۔

”شاید آخرت کے خوف سے دو رہی ہے۔“ جانے عیسیٰ نے ٹھیک کہا تھا کہ یا محض اندازہ لگایا تھا مگر مالا کو لگا یقیناً وہ آخرت کے خوف سے ہی رو رہی تھی۔ وہ بہت سادہ اور باوقاری لڑکی تھی۔ ہر قسم کی بناوٹ سے پاک، مالا کا دل خود بخود اس کی طرف مٹچ رہا تھا۔ گروسی کے بعد اس گھر میں سوزن ہی وہ فرد تھی جس کے ساتھ مالا کا اچھا وقت گزر سکتا تھا۔ اسے گروسی کے بعد سوزن بہت اچھی لگی تھی۔

”تم..... تم بہت اچھی ہو سوزن.....! تمہارے وجود سے اپنائیت کی مہک آتی ہے۔“ مالا زیادہ دیر تک اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ اس نے بے ساختہ سوزن کی تعریف کر دی تھی۔ مالا کے بے ساختہ پن میں چھپی سجائی سوزن کو مسکرانے پر مجبور کر گئی تھی۔ اس نے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”جہاں محبت اور اپنائیت ہوتی ہے، وہاں خدا ہوتا ہے اور یاد رکھنا، خدا ہمیشہ یہاں ہوتا ہے۔“ اس نے اپنے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کی سچی بات نے مالا کو گویا خرید لیا تھا۔ وہ حق دق کھڑی رہ گئی تھی۔ اسے شاید سوزن سے اتنی گہری بات کی امید نہیں تھی۔

”اور جہاں ایمان اور امید ہوتی ہے، وہاں بہار ہوتی ہے..... اور یاد رکھنا، بہار کو موسموں میں تلاش نہیں کرتے..... اسے روٹیوں، نیت اور جذبوں میں ڈھونڈتے ہیں۔“ اس نے ٹیرس کے بائیں جانب موجود گرل سے لنگی گلابی پھولوں والی تیل سے ایک پھول توڑ کر مالا کی طرف بڑھا دیا تھا۔

”گلابی پھولوں کی مالا کے لیے، سوزن کی طرف سے پہلا تحفہ۔“ اس کا انداز بالکل عیسیٰ کی طرح تھا۔ گویا وہ اس انداز میں عیسیٰ کی کاپی کر رہی تھی۔ ہو بہو عیسیٰ کا انداز، اسی کے الفاظ.....

جالانکہ یہ بات عیسیٰ نے مالا سے بالکل تنہائی میں کی تھی پھر سوزن کو بھلا کیسے پتا چلا.....؟ شاید یہ بھی ٹائیلوں کے سفید جالی والے پردوں اور گھروں کے سامنے پھولوں سے لدی ٹوکریوں والا ایک جیسا کوئی انداز ہو۔

”بہت شکریہ، کیا ہماری دوستی ہو سکتی ہے؟“ مالا نے بہت خوش دلی اور دبے، دبے جوش کے ساتھ کہا تھا۔ مغربی جرمنی میں اس کی سہلی سہلی..... یہ احساس کتنا اٹو کھا تھا، اتنا منفرد اور دلنشین..... اجنبیوں کے دلیس میں ایک جرمن لڑکی، ایک مغربی لڑکی کا اپنی زبان میں گفتگو کرنا کتنا دلنشین احساس تھا۔

”میرا خیال ہے، ہماری دوستی اب تک ہو چکی ہے سوزن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا تھا پھر آہستگی سے بھرائی آواز میں بولی۔

”تم میری دوسری سہلی ہو.....“ اس کا لہجہ کتنا نرم نم ہو گیا تھا۔ جانے کیوں ایک دم اداس ہو گئی تھی۔ ایک دم افسردہ ہو گئی تھی۔

”اور پہلی کون تھی؟“ مالا نے بے ساختہ پوچھا۔

”مون.....“ اس کے بھرے، بھرے ہونٹ.....

بے آواز بے، اس کے چہرے پر ہلکا سا سایہ لہرا گیا تھا۔

”کیا وہ اب تمہاری سہلی نہیں؟“ مالا نے حیرت سے کہا تھا۔ اس کے سوال پر وہ کچھ دیر کے لیے چپ کر گئی تھی پھر اس کا سر بے ساختہ نگی میں ہلا تھا۔

”نہیں.....“

”کیوں.....؟“ اس نے پھر حیرت کا اظہار کیا..... وہ بہت سوال نہیں کرتی تھی مگر یہ سوزن کی اپنائیت تھی جو ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔ اسے لگا وہ برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتی آئی ہیں۔

”وہ اب کسی کی بھی سہلی نہیں..... بہت بدل گئی ہے۔“ سوزن نے افسردگی سے بتایا۔ ”ہماری اب



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ تمام پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پہلے جیسی دوستی نہیں رہی۔" وہ اسے مزید بتا رہی تھی۔ اس کا لہجہ اب بھی پھیگا، بھیگا تھا گویا وہ مون کی دوستی کو بہت مس کر رہی تھی۔

"کیوں.....؟" مالا نے بے چینی سے کہا۔ تصور کے پردے پر کسی کی حسین تر اور عجیب تر آنکھیں عکس بنا گئی تھیں۔ اس کے پورے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی..... وہ مون کو نہیں سوچنا چاہتی تھی مگر اسی کو سوچ رہی تھی۔ وہ مون کی بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کی بات کر رہی تھی۔ بعض کوششیں کتنی بیکار ہوتی ہیں۔

"تم نہیں سمجھو گی....." اس نے گہری سانس سمجھ کر کہا تھا تب اچانک مالا کو خیال آیا۔ حالانکہ یہ بات اسے بہت پہلے پوچھنا چاہیے تھی مگر اب پوچھ رہی تھی، وہ کتنی کم فہم تھی۔

"کل رات مون آئی تھی یہاں.....؟" اس کا دل لمحے بھر کے لیے بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ مون کا ذکر اس کا ہر اس بڑھا دیتا تھا۔

"کل رات.....؟ نہیں تو..... وہ پچھلے ایک ہفتے سے گھر نہیں آئی۔ انسٹی ٹیوٹ کی ایک تجربے گاہ میں رہتی ہے۔" سوزن نے فوراً نفی میں سر ہلایا تھا اور اس کا انکار مالا کے چہرے کی رنگت کو پل بھر میں کیا سے کیا بنا گیا تھا۔

"کیا تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟" اس نے بہ مشکل ہکلائے لہجے میں کہا۔ اس کی رنگت سفید سے زرد پڑ رہی تھی۔

"ہاں، مجھے غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت ہے، ویسے مون تم سے ملنے بھی نہیں آئی۔ وہ ایسی ہی موڈی ہے، تم دل پر مت لینا۔" سوزن نے اسے پچکارے ہوئے کہا۔ وہ سمجھی، مالا اس کے روپے سے ہرٹ ہوئی ہے، مون کے انداز ہی ہرٹ کرنے والے ہوتے تھے۔ وہ جانتی تھی عیسیٰ اور مالا یہاں آئے ہیں پھر بھی ملنے نہیں آئی تھی۔ اس نے خود رشتوں میں دراڑیں ڈال رکھی تھیں..... وہ ایسی ہی

تھی بالکل نہ سمجھ میں آنے والی۔ کچھ دیر بعد سوزن اسے نیچے لے آئی تھی پھر ان دونوں نے مل کر کھانا بنایا، ڈھیروں باتیں کیں، کچھ دیر بعد عیسیٰ کا فون آ گیا تھا۔ اگرچہ وہ بہت مصروف اور پریشان تھا مگر اسے مالا کی بہت فکر تھی۔

"میں کل صبح ہوتے ہی پہنچ جاؤں گا، تم فکر نہ کرنا..... سوزن تمہارا خیال رکھ رہی ہے؟" عیسیٰ نے عجلت میں کہا تھا، وہ شاید تیز تیز چل رہا تھا۔

"ہاں، سوزن بہت اچھی ہے۔" مالا اس کی آواز سن کر اداس ہو گئی تھی۔ وہ اس سے کتنے قاصطے پر چلا گیا تھا۔

"میں تمہارے لیے موبائل بھی لیتا آؤں گا۔ مجھ سے کتنی بھول ہو گئی۔ اتنی اہم چیز تمہیں لے کر نہیں دی۔" وہ کسی اور سے کچھ بات کر کے دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ مالا کی بات سنے بغیر وہ بس اپنی کہے جا رہا تھا۔

"ابھی میں مصروف ہوں، تم سے رابطے میں رہوں گا۔ سونے سے پہلے کال کروں گا۔" اب وہ خدا حافظ کر کے فون بند کر رہا تھا۔ مالا کے دل پر غبار چھا رہا تھا۔ وہ پہلے خود دور گیا تھا، اب اس کی آواز بھی دور ہو رہی تھی..... مگر دوری سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ اس کے دل میں ہمیشہ کے لیے موجود تھا..... یہ احساس زندہ رہنے اور یہ وقت گزارنے کے لیے کیا کم تھا۔ وہ عیسیٰ کو سوچتے ہوئے سفید ٹائیلوں کے جالی دار پردے کو ہٹا کر کھڑکی میں جھانکنے لگی تھی۔ باہر کے منظر ہی ایسے تھے جی چاہتا تھا کہ عمر بھر کے لیے دیکھتے ہی رہیں۔

گروسی کے گھر کی دوسری طرف ایک صلیبی مجسمہ ٹنکا تھا۔ کمزور، ناتواں سا سج، کیلوں سے جڑا ہوا، ایک طرف کو سر گرا ہوا جیسے ڈھلکی ہوئی گردن، کیلوں کی جگہ پر ہاتھوں اور پاؤں سے لال خون برس برس کر پھینکتا ہوا..... مالا کو اس منظر سے خوف نہیں آیا



تھا۔ جس قدر ایک اپنے ہی جیسی عورت سے آیا تھا۔ اس نے دیکھا اور محسوس کیا تھا، یواریا کے لوگ بہت سادہ مزاج، باوقار، ہنس کھ اور مخنتی تھے۔

”اب تم آرام کرو، ورنہ عیسیٰ میری جان کو آجائے گا۔ اللہ، اللہ کر کے تو اس کا موڈ کچھ بہتر ہوا ہے، ورنہ میرے ساتھ تو بولتا ہی نہیں تھا۔“ سوزن کے اگلے الفاظ نے مالا کو سخت بے چین کر دیا تھا۔ وہ اس سے مزید کچھ پوچھنا چاہتی تھی بلکہ سوزن کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تھکاوٹ محسوس کرنے کے باوجود نیند کو اپنی آنکھوں میں اترتا نہیں پارہی تھی۔ اس کی خواہش تھی سوزن کچھ دیر تک یہیں بیٹھی رہے۔ لیکن دن بھر کی مصروفیت نے سوزن کو بھی تھکا دیا تھا۔ وہ بھی یقیناً آرام کرنا چاہتی تھی۔

”میں اپنے لیے کافی اور تمہارے لیے دودھ لاتی ہوں پھر تم سو جانا، آج میں تمہارے ساتھ ہی سوؤں گی۔“ سوزن نے نرمی سے کہا تھا جبکہ مالا کی تو گویا من کی مراد بر آئی تھی۔ وہ اکیلے سونے کے تصور سے ہراساں تھی اور اپنے خوف کو سوزن کے ساتھ شیئر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

سوزن کے چلے جانے کے بعد وہ اس کے انتظار میں کھڑی رہی۔ وہ مون کے بارے میں سوچ رہی تھی تو گویا مون کل رات گھر والوں سے چھپ کر یہاں آئی تھی۔ کسی کو مون کے آنے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ وہ یہاں کیوں آئی تھی؟ محض اسے خوفزدہ کرنے، دھمکانے؟ یا یہ باور کروانے کہ اس کے بھائی کی زندگی میں سے مالا کو نکالنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔

کافی دیر ایسی ہی تکلیف دہ سوچوں میں گھرے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر نیچے چلی آئی تھی۔ اکیلے رہنے سے گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تھی پھر تکلیف دہ سوچوں سے بچنے کے لیے واحد عمل یہی تھا کہ وہ سوزن کے قریب رہتی۔

وہ جونہی بیٹھیاں اتر کر نیچے آئی تو سوزن کی تیز آواز سن کر ٹھنک گئی۔ وہ بچن میں تھی اور نہ جانے کس سے تیز لہجے میں بات کر رہی تھی۔ وہ اسی کی زبان میں بات کر رہی تھی۔ مالا بھلا کیسے بچھتی..... مگر دیکھ تو سکتی تھی ناں..... وہ نرم قدموں سے چلتے ہوئے کیوخ کے دروازے تک آئی تھی۔ پھر اندر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ سیاہ ریشمی پھولاً پھولاً سلک کا پیروں کو نہیں بلکہ زمین کو چھوتا فراک پہنے، وہی سرخ انتہائی لمبے سلی بالوں کی پونی کیے مون ہی کھڑی تھی۔ اس کی طرف اس کی پشت تھی تھی لمبے ریشمی سیدھے بال اس کی نگاہ میں آگئے تھے۔ اونچی پونی میں جڑے چمکتے گلینے اور اونچا سا باقوت اور ہیرے سے سجا کر اون، مالا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

وہ دونوں کی بات پر جھگڑ رہی تھیں..... گویا مون، سوزن سے کچھ منوانا چاہ رہی تھی یا پھر دھمکا رہی تھی۔ سوزن کی آواز تیز تھی جبکہ مون کا لہجہ پہلے جیسا دھیما، نرم اور پُر اسرار قسم کا تھا۔ ادھر سوزن سر کو دائیں بائیں ہلا کر بس ایک ہی بات کیے جا رہی تھی۔

”این فاخ، این فاخ.....“

☆☆☆

”این فاخ.....“ اس کے ذہن میں کلک سا ہوا تھا..... اسے آج ناشتے کی ٹیبل کا منظر یاد آیا۔ سوزن نے آج صبح بھی اس کے لیے یہی الفاظ بولے تھے پھر وہ ہاؤس فراؤ جس نے انہیں قبوہ بلایا تھا۔ وہ بھی تو مالا کے لیے یہی کہہ رہی تھی۔ تو گویا سوزن اور مون کے درمیان جو بھی بات ہو رہی تھی مالا کے متعلق تھی۔ ان کی باتیں سننے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ مالا کون سا ان کی گفتگو سمجھ سکتی تھی۔ وہ اپنے قدموں واپس آگئی تھی مگر اس کا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ گیلری میں سے گزری تو اچانک ایک کمرے سے گروسی کی بوڑھی سی آواز سنائی دی۔

وہ کھلے دروازے سے اسے دیکھ کر اشارے سے بلانے کے ساتھ کچھ کہہ بھی رہی تھیں۔

”آزوف، آزوف،“ انہوں نے مالا کو ہی شاید بلایا تھا وہ تیزی سے گروسی کے کمرے میں آئی تب انہوں نے اشارے سے مالا کو بتایا۔

”آزوف۔“ وہ کارڈ لیس کی طرف اشارہ کر رہی تھیں گویا ”آزوف“ کا مطلب ٹیلی فون تھا۔

مالا نے کارڈ لیس اٹھایا تو عیسیٰ کی مسکراتی آواز سنائی دی..... وہ جو ذہن میں ”آزوف“ کو دہرا رہی تھی علی عیسیٰ کی آواز سن کر اندر تک مہک اٹھی۔

”تم ابھی تک نہیں سوئیں؟“ علی عیسیٰ کا پہلا سوال یہی تھا۔ مالا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”سونے لگی تھی۔“ اس نے متوقع ڈانٹ کے خیال سے پیش بندی کے طور پر کہا تھا..... تب علی عیسیٰ گویا چیخ پڑا۔

”میرے فون کا انتظار کیے بغیر.....؟“ اسے شاید دھچکا لگا تھا بھی بلند آواز میں کراہا۔ مالا اس کی ایکٹنگ پر ایک مرتبہ پھر مسکرا دی تھی۔ اس نے ارادہ کیا، وہ اسے چڑائے گی مگر پھر اپنے ارادے کو بدل گئی۔ وہ علی عیسیٰ کو مذاق، مذاق میں بھی پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”کیا یہ ممکن تھا، میں آپ کا فون سے بغیر سو جاتی؟“ اس کے بیٹھے سے اظہار نے من ہائیم کے علی عیسیٰ کا پورا من سرشار کر دیا تھا۔

”آں..... ہاں، یہ ممکن نہیں تھا۔“ وہ بھی مسکرایا۔ پھر اس کے دن بھر کی روٹین پوچھنے کے بعد بولا۔

”تم ابھی کیا کر رہی تھیں؟“

”میں نیچے تھی، ابھی مون آئی ہے ناں.....“ اس نے جان بوجھ کر مون کا ذکر کیا تھا اور مون کا نام سننے ہی علی عیسیٰ چونک گیا۔

”مون آئی ہے صلح ہوگئی اس کی سوزن کے ساتھ؟“ وہ حد درجہ حیران تھا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا.....“ اس نے برجستہ کہا تو گویا مون اور سوزن کی چپقلش بھی کوئی معمولی ہرگز نہیں تھی۔

”کمال ہے، مجھے تو سوزن نے بتایا ہے ان دونوں کی بات چیت بند ہے۔ یہ سوزی کس قدر جھوٹی ہے، چالباز اور مکار.....“ علی عیسیٰ کی... ٹیڑھاہٹ نے مالا کو سرتاپا کیکپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت کڑوے لہجے میں سوزن کے لیے بات کر رہا تھا۔ مالا کو اس کی بات بری لگی تھی۔ اپنی نئی، نئی سہیلی کے لیے ایسے القابات سننا اس سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ پھر سوزن جیسی لڑکی، حلیم، نرم اور مہربان..... وہ کب چالباز یا مکار تھی؟

”سوزن ایسی نہیں.....“ مالا نے فوراً وکیل صفائی بننے کی کوشش میں علی عیسیٰ کو ذرا خفا کر دیا تھا۔

”سوزی کیسی ہے؟ یہ مجھے پتا ہے تمہیں نہیں..... میں نے خواہ مخواہ اس سے صلح کر لی..... بات چیت بند ہی رہتی تو بہتر تھا۔“ وہ خفگی سے بول رہا تھا۔

”جالا کو لڑکی، اس نے تمہاری تعریف کی تو مجھے اچھی لگی سو میں نے اس سے صلح کر لی..... اندر سے تو وہ تم سے جیلنس ہی ہوگی۔“ عیسیٰ اپنے دھیان میں بولتا ہوا ایک دم چونک گیا تھا۔ گویا بات کر کے اسے احساس ہوا کہ جانے جذباتیت میں کیا، کیا بول گیا ہے۔

”وہ مجھ سے جیلنس کیوں ہوگی؟“ وہی فطری سا تجسس عود آیا تھا۔ مالا نے کارڈ لیس زور سے پکڑ کر گروسی کو دیکھا..... وہ اس کی گفتگو سے انجان بکے پر سر رکھے بیڈ پر نیم دراز تھیں۔ مالا بے فکری سے بولتی رہی۔ جس طرح وہ ان کی کچھ کچھ سے انجان تھی۔ اسی طرح گروسی بھی تو اس کی اردو سے ناواقف تھیں۔ اس نے تو کل سے لے کر آج رات تک گروسی کو اردو بولنے نہیں دیکھا تھا۔ سو وہ قدرے مطمئن ہو چکی تھی۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم ڈائری، نارل کوالٹی، کمپیوٹر کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے  
 ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں  
 ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**  
 Online Library for Pakistan  
 Like us on Facebook [fb.com/paksociety](https://www.facebook.com/paksociety)  
 twitter.com/paksociety1

رکھا تھا۔“ اس نے قدرے وضاحت بھرے لہجے میں کہا تھا جبکہ دوسری طرف عیسیٰ گویا چیخ پڑا۔  
 ”تم گروسی کے پاس ہو؟“  
 ”جی.....“ وہ کچھ گھبرائی۔ عیسیٰ کی چیخ ہی اس کی ایسی تھی۔

”اوہ میرے اللہ.....“ عیسیٰ پھر سے چیخا تھا۔  
 ”کیا ہوا ہے.....؟“ مالا اور بھی گھبرائی۔  
 ”تم گروسی کے کمرے میں ہو، وہ ہماری بلکہ تمہاری باتیں سن رہی ہوں گی۔“ عیسیٰ نے اپنے چیخنے کی وجہ بتائی تھی تب مالا نے حیرت سے کہا۔  
 ”پر وہ میری بات کہاں سمجھ سکتی ہیں؟“ اس کو پھر سے ہکھلانا پڑا۔

”سبحان اللہ..... گروسی نانی ہیں میری، ماما کی ماما..... ایک عرصے سے ہم ان کے ساتھ ہیں ایک دوسرے کو سمجھتے، بولتے، کہتے، سنتے، دیکھتے رہے ہیں۔ وہ اردو اگرچہ بول نہیں سکتیں مگر سمجھ خوب لیتی ہیں۔“ عیسیٰ نے مرے مرے لہجے میں وضاحت کی تھی۔ اب کہ چیخنے کی باری مالا کی تھی مگر وہ چیخ کر گروسی کو ڈسٹرب بھلا کیا کرتی؟ اس نے بھی مرے مرے انداز میں کارڈ لیس رکھ کر کمرے سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اسے اپنی گفتگو میں سب سے قابل اعتراض ایک ہی جملہ لگا تھا سوزی مجھ سے جیلنس کیوں ہے، اب ان الفاظ کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ وہ سخت شرمندہ تھی اور دعا کر رہی تھی کہ گروسی سچ سچ سوچتی ہوں۔ اس نے احتیاطاً ان کا انگوٹھا ہلا کر دیکھا پھر گویا مطمئن ہو کر باہر نکل آئی تھی۔ گروسی سچ سچ سوچتی تھیں۔

مالا کے سہمے ہوئے دل میں کیا تھا جو علی عیسیٰ نہیں جان پارہا تھا..... مون حسیب آخر معصوم مالا سے کیا چاہتی تھی؟ یہ سب ضرور جانیے مگر اگلے ماہ

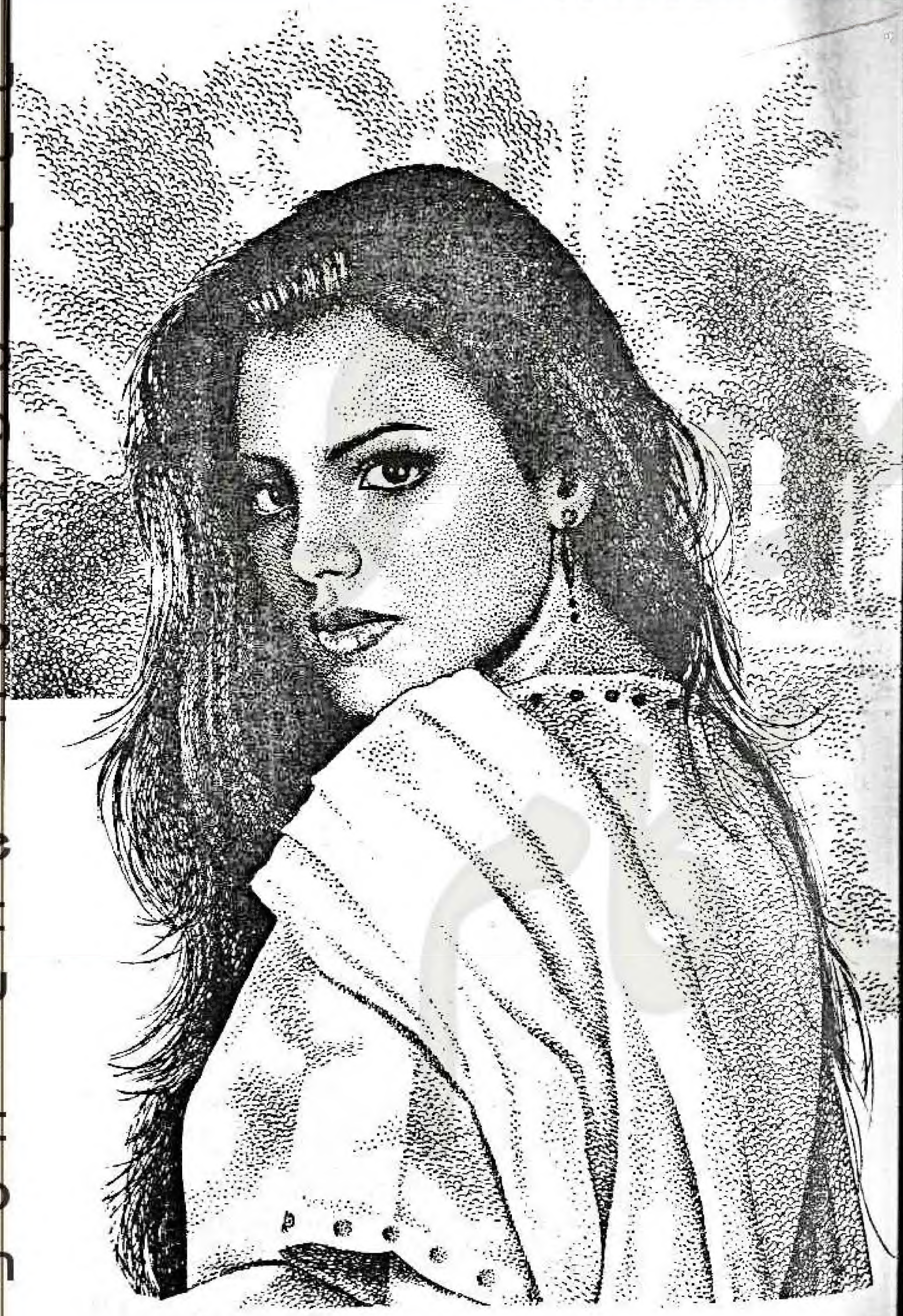
”آں..... ہاں، چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ، میرے بغیر دل لگ گیا؟“ عیسیٰ نے اس کی توقع کے عین مطابق موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی۔ مالا جانتی تھی اب وہ ایسے ہی کرے گا۔ وہ عیسیٰ کو زیادہ نہیں مگر کچھ، کچھ جان ضرور گئی تھی۔

”آپ کے بغیر دل کا کیا حال ہے، یہ مت پوچھیں..... حکایت دل سن کر آپ کا دل من ہانیم میں ہرگز نہیں لگے گا۔ سو اس کتابچے کو مت کھولیں، جو پوچھا ہے، قنافت بتائیں۔ شاباش، اچھے لڑکے جلدی بولوں۔“ مالا کے روانی سے بولنے اور برجستہ گفتگو کا انداز ملاحظہ کر کے عیسیٰ شاکڈرہ گیا تھا۔  
 ”ایں..... یہ تم ہو مالا.....! چند گھنٹوں میں آخر کیا ہوا، جو تمہاری زبان کے زنگ اتر گئے۔“ وہ حیران در حیران تھا اور مالا کو اس کی حیرانی ملاحظہ کر کے ہنسی آرہی تھی۔ وہ عیسیٰ کو تصور کی آنکھ سے بخوبی حیران ہوتا دیکھ سکتی تھی۔

”بواریا کے حسن کارنگ چڑھ گیا ہے۔“ مالا نے مسکرا کر بڑے دل آویز انداز میں کہا تھا۔  
 ”اللہ..... میرے اللہ اگر بواریا کے حسن میں گم ہو گئیں تو میرا کیا بنے گا؟“ عیسیٰ کی آہ نے مالا کو کھلکھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ تاہم وہ اسے موضوع سے ہٹنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

”آپ نے بتایا نہیں، سوزی مجھ سے جیلنس کیوں ہے؟“ اس نے گروسی کی طرف دیکھ کر اپنی بات دوبارہ دہرائی تھی۔ گروسی منہ پر سیفور رکھے شاید سو گئی تھیں۔ مالا ان کا چہرہ دیکھ نہیں سکتی تھی مگر اسے لگ رہا تھا کہ گروسی سوئی نہیں جاگ رہی ہیں۔  
 ”یہ بتاؤ، تم اس وقت کہاں ہو.....؟“ عیسیٰ نے کچھ چونک کر خیال آنے پر پوچھا تھا۔ مالا نے شان بے نیازی سے کارڈ لیس گودائیں سے بائیں کان تک منتقل کیا اور مزے سے بولی۔  
 ”گروسی کے روم میں، کارڈ لیس ادھر ہی تو





نیو کی لائبریری اینڈ فرینٹنگ پوائنٹ  
 سائڈ سسٹم اور جلد سازی کی ہولٹ موجود ہے  
 سٹے اور پرائے ڈیپارٹمنٹ کی جانی ہے  
 دوکان

ناولٹ



تیرک مونا

نایاب جیلانی

چوتھا حصہ

ڈبل روم میں پہنچ کر وہ ایک مرتبہ پھر حیران ہوئی تھی۔ سوزی بیڈ کے ایک کونے میں سکڑی سمٹی سوری تھی۔ سائڈ ٹیبل پر دودھ کا گلاس رکھا تھا، یقیناً دودھ مالا کے لیے رکھا تھا۔ تاہم اس کا دودھ پینے کو ہرگز دل نہیں چاہ رہا تھا۔  
 ”گو یا مون چلی گئی!“ اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے آرام سے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موند لی تھیں۔ اب وہ پرسکون ہو کر سوزن اور مون کے



بارے میں سوچ سکتی تھی۔ ان کے رویے، جھگڑے اور سوزن کے آخری الفاظ..... این فاخ.....؟ تو جب سوزن، گروسی وغیرہ اس کی پیاری اردو کو سمجھ اور بول سکتی تھیں تو پھر مالا کیوں نہیں زبان سیکھ سکتی؟ اس نے ارادہ کر لیا تھا..... من ہائیم پہنچ کر جرم سیکھنے کا..... ان لوگوں کے رویے سمجھنے کے لیے ہم زبان ہونا بہت ضروری تھا۔

”بھلا مون نے سوزن سے کیا کہا؟ یہ جھگڑا کیوں کر رہی تھیں؟ پھر سوزن نے کیا کہا.....؟“ وہ یہی باتیں سوچتی نیند کی گہری وادی میں اتر گئی تھی۔ نیند بھی قدرت کا حسین تحفہ ہے، ایک تھکا دینے والے دن کے بعد رات کا پہلا انعام، نیند جو ذہن کو سکون دیتی ہے، آرام پہنچاتی ہے، اعصاب کی تھکن نچوڑ لیتی ہے۔ مالا پر سکون نیند میں گم ہو چکی تھی۔ وہ گزشتہ رات سو نہیں پائی تھی مگر آج رات بہت مطمئن اور پرسکون نیند لے رہی تھی۔ وہ پوری رات اطمینان سے سوئی رہی..... جب اس کی نیند پوری ہوئی تب فجر کے قریب اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بستر سے اٹھی تو سوزن اسے اپنے برابر کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ مالا واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ وضو کیا، نماز پڑھی، اگر چہ جائے نماز کہیں نہیں تھی مگر مالا نے قالین پر ہی نماز ادا کر لی۔ وہ سلام پھیر کر دعا مانگنا چاہتی تھی مگر بائیں طرف کاؤچ پر مون بیٹھی تھی اس کی ہلکی سی چیخ ابھری مون وہی سلک کی پھولی فراک پہنے، سفید انگلیوں کو گھماتی ہوئی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی بلکہ ونڈو کے جالی دار نائیلون کے پردے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کب اندر آئی تھی؟ اور کتنے آرام سے اندر آئی تھی۔ مالا کو ذرا سی آہٹ نے بھی نہیں چونکا یا تھا۔ یقیناً مون بہت دبیز چیل پہنتی تھی۔ انتہائی نرم، چلنے کی آواز تک نہیں آتی تھی۔ وہ لمبی کی چال چلنے والی لڑکی مالا کو آخر ہراساں کیوں کرنا چاہتی تھی۔ دبے پاؤں کمرے میں آنے کا

مقصد آخر بھلا کیا تھا... یقیناً مالا کو خوفزدہ کرنا تھا۔ عام حالات میں بھی جب بندہ کمرے میں اکیلا ہو اور کسی کی بھی موجودگی کا گمان نہ ہو تو اچانک کوئی دبے قدموں اندر آجائے ایسی صورت میں پہلا احساس بھیانک خوف کا ہوتا ہے تو یقیناً مون اسے خوف زدہ کرنا چاہتی تھی۔ مالا کو یہ خبر نہیں تھی وہ اس کی زندگی میں بھیانک خوف بن کر ہی داخل ہوئی تھی۔

”یہ کس وقت کی نماز پڑھ رہی ہو؟“ اس کی چیخ کا نوٹس لیے بغیر وہ بڑے آرام سے پوچھ رہی تھی۔ آج اس کا لہجہ اتنا کھردرا نہیں تھا۔ مالا جو چیخنے کے بعد قدرے گم صم اٹھ کھڑی ہوئی تھی بے دم ہو کر اسے دیکھے چلی گئی۔

”تم نے بتایا نہیں۔“ وہی سرد قسم کا پراسرار لہجہ۔ وہ اب بھی اسے دیکھے بغیر نائیلون کے پردے کو دیکھ رہی تھی۔ آج مالا نے اسے بہت غور سے دیکھنے کی کوشش آخر کر ہی لی تھی۔ یہ چہرہ آج اس کے بہت قریب تھا اور حیرت انگیز طور پر مون کے نقوش عیسیٰ سے خاصے ملتے جلتے تھے۔ یوں لگتا تھا اللہ پاک نے مون کا چہرہ اور اس کے ایک، ایک نقش کو کسی خاص قسم کے سانچے میں رکھ کے بنایا ہے۔ نفیس اور انتہائی خوب صورت خدو خال، گل جام جیسا چہرہ، چینی جیسی رنگت، مکھن جیسی چہرے پہ پھیلی چکنائٹ وہ کنول تھی؟ گل بکاؤلی تھی؟ گوہر تاب تھی؟ یا کنگلوں تھی؟ اس کے موتی جیسے چمکیلے ہاتھ، سنہری مائل سرخ بال، چیری میں ڈھلے ہونٹ قدرے بھرے بھرے اور خم دار، وہ سفید پھولوں کے باغات کا سب سے حسین، شگفتہ، تروتازہ اور مغرور ترین پھول تھی۔ وہ عیسیٰ جیسی تھی مگر عیسیٰ سے انتہائی مختلف۔ بھلا اتنے حسین چہرے کو دیکھ کر کوئی خوف زدہ ہو سکتا ہے؟ کبھی حسن بھی خوف میں مبتلا کرتا ہے مگر مالا کے ساتھ یہاں آکر بڑے انوکھے واقعات پیش آرہے تھے۔ وہ اتنے حسین اور دلچ چہرے سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔

لوگ بد صورتی سے ڈرتے ہیں۔ جلے چہرے، بیماری سے مسخ شدہ چہرے، بد صورت چہرے، بھیانک چہرے سے خوف کھاتے ہیں اور مالا ذوالفقار کتنی عجیب لڑکی تھی وہ ایک حسین چہرے سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہ مون حسیب سے ڈر گئی تھی۔ اس کے دل میں ہی نہیں اس کی آنکھوں میں بھی خوف منجمد ہو گیا۔ وہ اس کے چہرے پر سے نگاہ ہٹا ہی نہیں پائی تھی۔

علی عیسیٰ کے نقوش دیکھ کر اس سے محبت کرنے کو دل کرتا تھا اور مون کے چہرے کو دیکھ کر خوف آتا تھا، آخر ایسا کیوں تھا؟ اسے کسی تجسس کی طرح ساکت دیکھ کر مون نے پھر سے بنا اس کی طرف دیکھے عجیب انداز میں کہا۔ وہ اسے دیکھ نہیں رہی تھی پھر بھی اس کے تاثرات از بر کر رہی تھی۔

”مجھے حفظ کر لیا ہے تو میری بات کا جواب دو۔“ مون نے سابقہ سرد کاٹ دار لہجے میں اپنی بات دہرائی تھی۔ مالا کا پورا وجود کپکپا گیا تھا۔ اس نے ہکلاتے لہجے میں کہا۔

”فجر..... فجر کی نماز۔“ اس کی ہکلاہٹ نے مون کو کچھ اور سرد کر دیا تھا حالانکہ مالا اپنا خوف اس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی مگر اس لڑکی میں مقناطیس کی سی کوئی کشش تھی۔ مالا اس کے سامنے اعتماد سے کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے خود کو مون کے سامنے بے بس پایا تھا۔ یہ بے بسی کیوں تھی، وہ اتنی خوف زدہ کیوں تھی؟

”فجر کی نماز؟“ مون زپر لب بڑبڑائی۔ مگر یہ فجر کی نماز کا وقت نہیں۔“ تو گویا مون نماز کے تمام اوقات کا ر سے واقف تھی مگر یہ فجر کا وقت کیوں نہیں تھا؟ مالا نے گھڑی کی طرف دیکھا پھر اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ابھی رات کا ڈبڑھ بجا تھا تو پھر رات کے ڈبڑھ بجے سوزن کہاں گئی تھی؟ مالا تو سوزن کی غیر موجودگی کو محسوس کر کے وضو کرنے لگی تھی۔ اس نے وقت دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں

کی تھی۔ سوزن کے اٹھنے کا مطلب یہ تھا شاید صبح ہو گئی۔ وہ بہت سویرے اٹھتی تھی۔ صبح صادق کے وقت..... مالا اسی وجہ سے بنا وقت دیکھے واش روم کی طرف بڑھ گئی تھی اور اب اس وقت مون بتا رہی تھی کہ فجر کا وقت ابھی دور ہے۔

”سبس... سوزن کہاں ہے؟“ مالا نے اپنی ترپیشانی کو بغیر چھوئے ہکلائے سے لہجے میں کہا تھا۔ سوزن کی موجودگی میں اس کے دل کو کتنی ڈھارس تھی تبھی وہ سب کچھ بھلائے گہری نیند سو گئی تھی اور سوزن کی غیر موجودگی نے کیا ستم ڈھایا تھا، وہ صاف محسوس کر سکتی تھی۔

”شاید باہر گئی ہے۔“ اسے امید نہیں تھی کہ مون جواب دے گی مگر اس نے جواب دے دیا تھا اور اب وہ نائیلون کے پردے سے نگاہ ہٹا کر سامنے دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ مالا نے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں کو دیکھا تھا۔ جانے اس کی آنکھوں کا رنگ کیا تھا؟ سبز، سرخی، ہیزل، گہرا ہرامالا کو سمجھ ہی نہ آئی مگر جوں ہی مون نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر اپنی ساحرانہ آنکھیں اس کے وہمی، معصوم، لٹھے کے مانند سفید چہرے پر گاڑیں تب لمبے بھر کے لیے مالا کو لگا وہ منجمد ہو گئی ہے۔ وہ مون کی آنکھوں کی تیز لپک سے ساکت ہو گئی تھی۔ دو عجیب تر آنکھیں لگے کے ہزاروں حصے میں مالا کے دماغ میں گھس گئی تھیں۔

”تم عیسیٰ سے محبت کرتی ہو؟“ لپکتا ہوا سوال آیا تھا مالا کا سر اثبات میں ہل گیا۔ وہ بے بس کسی مکڑی کے مانند تھی۔ جسے عجیب ترین آنکھوں والی اس لڑکی نے جالے تان کر قید کر لیا تھا۔ اب وہ ان جالوں کو بھانڈ نہیں سکتی تھی۔ ان جالوں کو ہٹا کر بھاگ نہیں سکتی تھی۔

”تم محبت کرتی ہو تو کیا ہوا؟ سوزی بھی تو عیسیٰ سے محبت کرتی ہے۔ کیا سوزی کو عیسیٰ مل گیا، نہیں ناں؟ تو پھر تمہیں کیسے مل سکتا ہے؟“ سامنے کھڑی ساحرہ



اپنا جادو پھونک رہی تھی اور مالا کسی بت کے مانند... بے جان ہو رہی تھی۔ کڑی کا جیسے بے جان بت، وہ مون کے انکشاف پر قطعاً دم بخود نہیں ہوئی تھی گویا مون اس سے معمول کی گفتگو کر رہی تھی۔

”سوزی کو تو ایثار کرنے کی بیماری ہے۔ پر مجھے ایسی کوئی بیماری نہیں۔ ایثار کرنے کی تمہیں بھی بیماری نہیں ہونی چاہیے۔“ وہ گویا اسے باور کروا رہی تھی۔ مالا کے ہونٹوں پر تالا لگ گیا تھا۔ اس کی زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ اس کی پتلیاں ساکت نہیں تھیں مگر وہ یہ ضرور سوچنا چاہتی تھی کہ جھگی آنکھوں والی یہ ساحرہ پلکیں کیوں نہیں جھپکار رہی۔ وہ اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر کیوں کھڑی ہے؟ وہ کمرے کی کسی اور چیز کو کیوں نہیں دیکھتی؟ وہ لیمپ کو دیکھ لے، فانوس دیکھ لے، وہ ٹائیلوں کے پردے کو دیکھ لے، کرسٹل کی گڑیا دیکھ لے، دیوار میں نصب شراک کو دیکھ لے مگر کم از کم مالا... کونہ دیکھے مگر مون تو ہنا پلکیں جھپکائے مالا کو یک ٹک دیکھ رہی تھی۔

”میں کسی سے محبت نہیں کرتی، تمہیں بھی کسی سے محبت نہیں کرنی چاہیے۔ آخر محبت میں رکھا کیا ہے؟ جلن، کڑھن؟“ اس کے چہرے جیسے ہونٹوں پر انتہائی برقیلی تہ جم رہی تھی۔ شاید اس کے لفظ برف جیسے تھے یا اس کے تاثرات برف جیسے تھے۔ مالا کچھ سمجھ نہ پائی۔

”یہ فورہا ٹنگ دیکھ رہی ہو؟“ اس نے ٹائیلوں کے جالی دار پردے کی طرف اشارہ کیا۔ ”دیکھو، اس میں کتنے چھید ہیں، کتنے سوراخ ہیں بظاہر ڈیزائن والے خوشنما مگر چھید تو چھید ہوتا ہے خوشنما ہو یا بدنما... میں ایسا ہی چھید چاہتی ہوں... ایسا نہیں بلکہ اس سے بڑا چھید جو تمہیں علی عیسیٰ سے دور کر دے۔ مجھے سوزی کا علی عیسیٰ اُسے واپس لوٹانا ہے۔ یہ میرا اس سے وعدہ ہے۔ میں اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑتی۔ مجھے ادھورے کام پسند نہیں... جس

کام کو چھوڑوں پائیہ تکمیل تک پہنچا کر ہی سانس لیتی ہوں۔ میں وہ لوہا ہوں جس سونے کو چھوڑوں اسے لوہا کر دیتی ہوں۔ میں وہ آگ ہوں جس آگ کو چھوڑوں اسے برزخ بنا دیتی ہوں اور میں وہ مٹی ہوں جس ہیرے کو چھوڑوں اسے زہر بنا دیتی ہوں۔“ وہ مون تھی اور کیا آگ برسا رہی تھی۔ وہ اس کے ذہن کو بواریا کی غلام گردشوں میں چکر لگوا رہی تھی۔ وہ اسے خوف و ہراس کے جنگل میں بھنکار رہی تھی۔

”یہ میرا لائٹ (ملک) ہے، یہاں تمہاری اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔“ وہ دھیمی آواز میں پھنکار رہی تھی۔ ”لوگ تمہیں سلوٹ کرتے اور مبارک باد بولتے ہیں۔ تم علی عیسیٰ کو پا کر زمانہ پائے بیٹھی ہو اور وہ جو چرچ کی دیواروں سے سرنگرائے دیوانی پھرتی ہے، اس کی محبت کرخ کے قدیم دیواروں میں سر پختنے کے لیے ہے؟ وہ خدا سے عیسیٰ کو مانگتی ہے اور عیسیٰ اس کو نہیں ملتا، عیسیٰ اس کو کیوں نہیں ملتا؟ اس لیے کہ بیچ میں میرے خود غرض باپ نے تمہیں لاکھڑا کیا ہے۔ یہ کیسا اندھیر ہے، یہ کیسا ظلم ہے۔“ مون کی دھیمی آواز کسی تلوار سے مشابہ تھی۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے دل کو کاٹ، کاٹ کر قیمہ کر رہی تھی۔ وہ مالا کے وجود کو پیروں تلے روند رہی تھی۔

”کرخ کے مناروں کا نوک دار کس سوزی کی محبت کا گواہ ہے۔ کیسی پاک محبت کی تھی اس نے علی عیسیٰ سے اور میرا بھائی کتنا خود غرض اور ذلیل نکلا پاکستان سے گند اٹھالایا... آخر تھو۔“ اس نے کارپٹ پہ تھوکا نہیں تھا مگر مالا کو لگا اس کے منہ سے نکلنے والی آوازیں اور تیزابی چھینٹیں اس کے منہ پر آپڑی ہیں۔

”میں تمہیں علی عیسیٰ کی زندگی سے اکھاڑ دوں گی، یہ میرا سوزی کی محبت سے وعدہ ہے اور مون جو وعدہ کر لے پھر نبھا کر چھوڑتی ہے۔ مون اچھوں کے ساتھ اچھی اور بروں کے ساتھ بہت بری ہے۔

سوزی نے اپنا حق چھوڑ دیا، خاموش ہو گئی... محبت پر صبر کر لیا مگر میں اسے اجاڑا اور ویران نہیں دیکھ سکتی۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس کی خوشی کو دوسرے سے چھین بھی سکتی ہوں۔ سوزی میری ماما کی خواہش تھی۔ ممانے اپنی زندگی میں عیسیٰ کا رشتہ سوزی کے ساتھ طے کر دیا تھا مگر میرے پاکستانی بے وفا، خود غرض باپ نے ماما کے مرتے ہی رشتہ توڑ دیا۔ آہ... میرا بے وفا باپ بیوی کے مرتے ہی اسے بھول گیا۔ میرا بھائی بھی تو اسی شخص کا بیٹا ہے۔ انتہا کا خود غرض۔“ آج وہ سینے کا زہر اگلنے آئی تھی۔ انکشاف در انکشاف تھے۔ مالا اب ایک مری ہوئی کھڑی کے مانند جالے سے اٹک گئی تھی مگر یہ کیا؟ ابھی اس کی کچھ سانسیں نکل رہی تھیں مگر ہر سانس کیسے گھٹ گھٹ کر آ رہی تھی۔

”آہ سوزی...“ مون کسی جذب کے عالم میں بولی۔ ”اس کی الوہی عبادت اور دعائے بھی اسے محبت سے دور کر دیا مگر میں اس کی محبت لوٹا سکتی ہوں۔“ اس کا عزم اور ارادہ قابل دید تھا۔ پتھرائی ہوئی ہر رنگ کی جھلک دیتی آنکھیں اب سنہری گھڑی پر جم گئی تھیں پھر وہ نپے تلے قدم اٹھاتی وہاں تک گئی۔ اس کا ریشمی پھولا پھولا فراک زمین کو چھو رہا تھا۔ اس کے لمبے سلکی سرخ بال کمر پر خم کھا رہے تھے۔ اونچی پونی اسے مغرور ثابت کرتی تھی۔ کیسا غرور تھا اس لڑکی کو اپنے لہجے، اپنے ارادے پر گویا سب کچھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔

”اس گھڑی کو دیکھو۔“ اس نے سنہری گھڑی کو ہاتھ میں لیا۔ چابی گھمائی اور دو بجاتی سوتی کو ساڑھے پانچ تک لے آئی۔ ”اگر میں اس کا وقت پیچھے کر کے تمہیں اہم ترین ثابت کر سکتی ہوں تو تمہیں علی عیسیٰ کی زندگی سے بے دخل بھی کر سکتی ہوں۔“ گھڑی کا وقت اب کیا تھا... ساڑھے پانچ یعنی صبح صادق کا وقت۔ اب وہ ریشمی پھولے فراک کو لہراتی ونڈ ورتک گئی تھی۔

اس نے کھڑکی کے دونوں پردے ہٹا دیے۔ سفید ٹائیلوں کی جالی والا پردہ اور ریشمی سلک کا پھولدار پردہ اب وہ سلائیڈ ہٹائے کھڑی تھی۔ باہر جھلگاتا سوریا تھا۔ رات ڈھل چکی تھی، صبح پھوٹ پڑی تھی۔

مالا ذوالفقار نے مالا علی عیسیٰ بننے تک کا وقت کیسا بے خبری اور بھولپن میں گزار دیا تھا۔ اس نے ایسی جادوگری اور شاطرانہ چالیں کہاں سیکھی تھیں؟ تو گویا مون حسیب نے اسے پہلے ہی مقام پر پچھاڑ دیا تھا۔ وہ اسے لفظوں کے جال میں الجھا کر بے وقوف ثابت کر چکی تھی اور مالا علی عیسیٰ، مون حسیب کی زندگی کا سب سے آسان ترین چیلنج اور مشکل ترین شکار تھی۔ اس نے چیلنج آسان سمجھ کر قبول کیا تھا حالانکہ آسان نظر آنے والی چیزیں، مقابلے اور چیلنج اتنے آسان ہوتے نہیں۔

تو گویا آج سے ایک سرد جنگ کا آغاز ہونے والا تھا۔ مالا کا ساکت وجود اور محمد ذہن کچھ سوچ نہ پایا۔ اسے لگ رہا تھا دو عجیب ترین آنکھیں اس کے ذہن کی ہر سوچ کو اکھاڑ پچھاڑ کے چلی گئی ہیں۔ دو عجیب ترین سرد آنکھیں اس کے ذہن کی ہر سوچ کو کھنگال آئی تھیں۔ اب اس کے پاس سوچنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا پھر جانے کتنا وقت دے پیر گزر گیا۔ مون چلی گئی اور سوزن آندھی طوفان کی طرح اندر آ گئی۔ مالا پہلے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ کسی بے جان کھڑی کی طرح جالے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ گویا پور لگانے سے گرنے کے قریب تھی۔ سوزن بھاگتی ہوئی مالا تک آئی۔

”مالا! تم ٹھیک ہو، تمہیں کیا ہوا؟ کیا ابھی مون آئی تھی تمہارے پاس؟“ سوزن نے اسے کسی سنگی جیسے کی طرح ساکت دیکھ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ وہ بہت زرد، پریشان اور حد سے زیادہ متشکر لگ رہی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا، بولتی کیوں نہیں؟“ سوزن مزید گھبرا گئی۔ وہ اس کے ٹھنڈے ہاتھ پکڑے کھڑی



مئی 2014ء کے شمارے کی ایک جھلک

# سمرگزشت

ماہنامہ

## عقل نشین

ایک معروف سائنس دان کی داستان حیات جس نے ثابت کرنا چاہا تھا کہ انسان بندر کی اولاد ہے

## شہرگزشت

بھولے بسرے کراچی کے ایک دن کا احوال جب اس شہر میں محبت و انفرینٹی تھی

## تاریخ عکس

تصویر بتاں نے، ترقی کی منزلیں کیسے طے کیں

## منی

ماہ مئی میں رونما ہونے والے اہم واقعات و سائنحات

## دماغی توازن

محبت حد سے بڑھ جائے تو جانی لاتی ہے

## ادبی حیرانہ

لہو کی گردش تیز کر دینے والی طویل داستان، سراب، فلمی دنیا کی بھولی سری یادوں سے سجی فلمی الف لیلہ تاریخی واقعات سچے قصے اور انوکھی سچ بیانیاں

اگر آپ علم و دانش بھرے مضامین، ادب، تاریخ اور سبق آموز سچ بیانیاں پسند کرتے ہیں تو آپ ہی کے لیے یہ شمارہ ترتیب دیا گیا ہے اس ایک بار پڑھ کر دیکھیں آپ خود ہی گرویدہ ہو جائیں گے

باتیں کر رہی تھی۔" مالا کے دل میں نیزہ سا چبھتا تھا۔ "تم مون کی باتوں پر توجہ مت دیا کرو، وہ تو پاگل ہے یوں سمجھو۔" سوزن نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں، مون یہاں نہیں آئی تھی، تمہیں وہم ہوا ہے۔ مون رات کو واپس انسٹی ٹیوٹ چلی گئی تھی۔" سوزن نے نگاہ چرا کر اس کا خوف کم کرنے کی کوشش کی تھی مگر مالا کا خوف کم ہونے کے بجائے بڑھ گیا تھا۔

"نہیں، وہ ابھی یہاں آئی تھی۔ میرا وہم نہیں..... اس نے مجھ سے اتنی باتیں کیں۔" مالا نے مضطرب لہجے میں کہا تھا۔ وہ اسے یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی مگر سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یقین آخر دلائے کیسے؟ اور سوزن شاید یقین کرنے والی بھی نہیں تھی۔

"اچھا..... مون نے تم سے کیا کہا؟" سوزن نے کسی خدشے کے تحت محتاط انداز میں پوچھا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق مالا نے بے چاری سی صورت بنائی تھی۔ اسے مون کی بکواس یکسر بھول چکی تھی حالانکہ کچھ دیر پہلے اس کے ذہن پر کچھ دھندلے، دھندلے منظر بکھر رہے تھے۔ مون کا سیاہ ریشمی زمین کو چھوتا فراق، اس کی اونچی پونی میں جڑے گنگینے، سر کے عین وسط میں رکھا یا قوت اور ہیرے کا کراؤن، اس کے سرخ ریشمی بال مگر اب ذہن صاف سلیٹ کے مانند ہور ہا تھا۔ ہر بوجھ اور ہر نقش سے آزاد۔ وہ قدرے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ پہلے والی بے چینی اور اضطراب اندر کہیں نہیں تھا۔

"تم نے بتایا نہیں؟" سوزن نے ایک مرتبہ پھر محتاط سے انداز میں پوچھا تب مالا نے بے چارگی کے عالم میں بے ساختہ کہا تھا۔

"یار! میں بھول گئی ہوں، جانے کیا کچھ بول کے گئی ہے مگر وہ آئی ضرور تھی۔" دوپٹے کو نماز کے اسٹائل میں سر پر لپیٹے مالا کتنی معصوم، کتنی پاکیزہ اور

"مجھے کیا ہونا تھا، میں ایک دم ٹھیک ہوں۔" مالا نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ ایک دم فریش اور تروتازہ تھی مگر سوزن کے چہرے کو دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ کچھ ٹھیک یا فریش تھی۔ "تمہیں کیا ہوا ہے؟" مالا نے نرمی سے پوچھا۔ اتنے تھوڑے سے وقت میں سوزن اس کے بہت قریب آ گئی تھی۔ مالا اس کی تکلیف یا کسی بھی پریشانی کو محسوس کر سکتی تھی۔ شاید یہی ہمدردانہ احساس دوستی کی سیڑھی کا پہلا قدم تھا۔

"آں..... ہاں، کچھ نہیں۔" وہ گڑبڑا سی گئی۔ "تم مون کا ذکر کر رہی تھیں ناں۔" مالا کو خیال سا گزرا پھر کچھ دیر پہلے کا منظر ذہن میں روشن ہوا حالانکہ منظر روشن کہاں تھا، دھندلا، دھندلا سا تھا۔ شاید وہ اور مون اسی کمرے میں کھڑی تھیں؟ جانے مالا نے نیند میں مون کو دیکھا تھا یا وہ حقیقت میں یہاں آئی تھی؟ وہ شک میں مبتلا ہو گئی یا وہم میں پڑ گئی۔ اسے لگ رہا تھا مون اس کے حواسوں پر سوار ہوتی جا رہی ہے۔ یقیناً سونے سے پہلے وہ مون کے متعلق سوچ کر سوئی تھی تبھی تو مون..... مگر مون تو یہاں موجود تھی کچھ دیر پہلے۔ وہ اس سے کیسی باتیں کر رہی تھی؟ عجیب، فضول، خوف ناک بھلا عیسیٰ اور سوزن..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اسے دھمکیاں دے رہی تھی۔ عیسیٰ کی زندگی سے نکل جانے کا کہہ رہی تھی۔ یہ ممکن تھا کیا؟ مون پاگل تو نہیں تھی یا کوئی نفسیاتی مریض؟

"کس ابھن میں ہو؟" سوزن نے دھڑکتے دل کے ساتھ مالا کو مخاطب کیا۔ وہ واقعی کسی ابھن میں تھی۔ سوزن کو بتانے لگی۔

"ابھی مون آئی تھی کچھ دیر پہلے..... یہ دیکھو گھڑی کا وقت بدل گئی۔ پہلے دو پر سوئی تھی پھر پانچ پر کر گئی۔ خیر اب تو چھ بج رہے ہیں۔" مالا نے کچھ بے ربط سے انداز میں کہنا شروع کیا تھا۔ "اتنی عجیب

تھی۔ سوزن کے چہرے پر اسے خاموش دیکھ کر سراسیمگی پھیل گئی تھی پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔

"اوہ..... نو، یہ مون تھی ناں۔" وہ گویا لہجوں میں ساری کہانی سمجھ گئی پھر اس نے ایک خاص انداز میں مالا کو بڑے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔

"تم کیا محسوس کرتی ہو مالا؟" اس کے سوال کو جادو اثر بھی کہا جاسکتا ہے۔ وہ کسی ٹرانس کے عالم میں سوزن کے سوال کا خود بخود جواب دیتی گئی۔ مون کی خوف ناک باتوں سے لے کر ایک، ایک گرہ کھولتی گئی۔ جو مون نے کہا، وہ سب کسی الہامی یا خیالی کیفیت میں اس نے سوزن کے گوش گزار کر دیا تھا۔ اس کی پوری بات سن کر سوزن زرد پھیکے پھول کے مانند کھلا گئی۔ اس کی آنکھیں پانی کے نمکین قطروں سے بھر گئی تھیں۔ وہ افسردگی کی تہوں میں دب گئی مگر سوزن نے خود کو سنبھالنا تو تھا ہی۔ اسے امید نہیں تھی..... مون اس کے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی یہ سب بکواس مالا سے کر دے گی اور جس طرح وہ اس پر سحر پھونک کر کر گئی تھی سوزن کو سو فی صد یقین تھا وہ اپنا کوئی نیا تجربہ کر کے گئی ہے۔ اس نے آخر کار تمام سوچوں کو جھٹک کر مالا کی طرف رخ کیا تھا۔ اسے مالا کی ذہنی کیفیت کو بحال کرنا تھا۔

"تم اب بہت اچھا اور خود کو تروتازہ محسوس کر رہی ہو مالا..... ایک دم فریش اور ہلکا پھلکا، ہے ناں؟" سوزن کے لفظوں میں ایسی مشاس تھی کہ پتھر بنی مالا کے بے جان مکڑی جیسے بت میں جان پڑ گئی تھی۔ اس نے جھٹکا کھا کر پاس کھڑی متفکر سی سوزن کو دیکھا تھا۔ وہ گویا کسی خواب یا بھیانک نیند سے جاگی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہوناں...؟" سوزن نے بہت محبت سے مالا کو مخاطب کیا۔ تب وہ بڑی حیران، حیران سی اسے دیکھے گئی تھی۔



مقدس لگ رہی تھی۔ سوزن کو اس لمحے مالا پر رشک آیا۔ اگر علی عیسیٰ مالا کو اس کیفیت میں دیکھ لیتا تو عمر بھر کسی اور کی طرف نگاہ نہ ڈالتا۔ اسے مالا کی مصومیت، سادگی اور بھولپن پر ٹوٹ کر پیار آ گیا تھا۔

”این فارخ پوپے۔“ سوزن نے بے ساختہ اس کے گال کو چھوا تھا اور نرمی سے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ مالا دنگ رہ گئی تھی۔

”این فارخ پوپے۔“ یہ لفظ اب مالا کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ تاہم سوزن کے منہ سے سن کر اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ ان کے معنی سوزن سے پوچھ سکتی تھی مگر چونکہ عیسیٰ نے منع کیا تھا سو اسے خود ہی ان الفاظ کو کھوجنا تھا۔ وہ ابھی انہی الفاظ پر غور کر کے سابقہ بہت سی باتوں کو نظر انداز کر رہی تھی جب سوزن اسے نیچے آنے کا کہہ کر باہر نکل گئی تھی۔ کچھ دیر بعد مالا بھی سر جھکتی نیچے آگئی تب ایک مرتبہ پھر گروسی نے اسے آواز دے کر بلایا تھا۔

”آنر ف۔“ ان کی آواز اور اشارہ سمجھ کر مالا جھٹ پٹ فون تک آگئی تھی۔ اسے یقین تھا عیسیٰ کا فون ہوگا اور وہ اسے لینے کے لیے آنے والا ہوگا مگر فون کے دوسری طرف حسیب چاچو تھے جو بڑے ہی بے قرار اور مضطرب لگ رہے تھے۔

”وہ نالائق تمہیں ادھر ہی چھوڑ کر آ گیا ہے۔ میں نے خوب کلاس لی ہے اس کی۔ صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ تم تیاری پکڑو، عیسیٰ کو بھیجتا ہوں اگر چہ وہ رات سے اسپتال ہی میں ہے۔“ وہ اپنی عجلت پسندی کے باعث تیز، تیز بول رہے تھے اور مالا کو عیسیٰ کی مصروفیت کے متعلق بتا رہے تھے۔ کہنی کے کچھ ورکرز از حد زخمی تھے۔ ان کی حالت تشویش ناک تھی تو پھر بھلا عیسیٰ ان کو چھوڑ کر کیسے آسکتا تھا؟

”اور تم وہاں پریشان رہی ہوگی، گروسی تو بہت ناکس ہیں جبکہ روسی (تانتے) خاصی بد مزاج ہے۔“ حسیب چاچو کی تیز گفتگو میں بھی اپنائیت کی مہک

محسوس ہو رہی تھی۔ مالا کو لگا وہ اپنے ڈیڈ سے ہم کلام ہے۔ اس کا من اندر تک شانت ہو گیا تھا۔

”نہیں چاچو، میں پریشان نہیں رہی۔ یہاں سب نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔“ مالا نے سچے دل سے حسیب چاچو کو یقین دلانا چاہا تھا پھر محض انداز میں آس پاس دیکھا۔ گروسی کہیں نہیں تھیں۔ عیسیٰ اپنے جانوروں کی سیوا کرنے چلی گئی تھیں۔

”اچھا۔“ وہ بے ساختہ خوش ہو گئے۔ ”گروسی بہت اچھی ہیں، عیسیٰ سے بہت پیار کرتی ہیں اور عیسیٰ کے حوالے سے تم بھی انہیں بہت پیاری ہوگی مگر وہ روسی اور سوزن؟“ وہ بولتے بولتے پھر سے ایک گئے تھے۔ مالا کے ذہن میں ان کے اکتنے سے جھماکا سا ہوا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے سن ہو گئی۔ یوں لگا تھا ذہن کی اسکرین پر سے کوئی دھندلا سا پردہ کھسکا ہے۔ اسے اچانک مون کی باتیں یاد آگئی تھیں۔ جیسے برت در برت، تہ در تہ کوئی انکشاف سا ہوا تھا، کوئی گرہ سی کھلی تھی۔

”روسی اور سوزن۔“ یقیناً انہیں عیسیٰ کی خالہ اور کزن کی طرف سے کوئی خدشہ تھا۔ یہی کہ وہ شاید عیسیٰ کی بیوی کو برداشت نہ کر سکیں مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ سوزن تو بہت ہی اچھی تھی جبکہ تانتے نے بھی محض رکھائی دکھانے کے علاوہ کوئی بد مزگی نہیں پھیلانی تھی مگر مون کی کہی باتیں جو اس نے ایک مرتبہ پھر مالا کے کمرے میں زبردستی کھس کر کی تھیں وہ نظر انداز نہیں کی جاسکتی تھیں۔ آخر مون نے اپنی تمام تر جلن اور کھولن باہر نکال ہی دی تھی..... تو گویا مون کی اصل ناراضی کا سبب صرف یہی تھا مگر وہ کتنی کم فہم تھی اتنی سی بات سمجھ نہیں پائی کہ مقدر کا لکھا بھی نہ مٹ سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے تو پھر جب عیسیٰ کے ستارے سوزن کے ساتھ کبھی مل نہیں سکتے تھے پھر زبردستی یہ کیسے ملا سکتی تھی؟ مگر بعض لوگ تقدیر کے فیصلوں سے نکرانے کھڑے ہو جاتے ہیں یہاں تک

کہ تقدیر ان کا پانسہ پلٹ دیتی ہے۔ شاید مون انہی کم فہموں میں سے ایک تھی۔ اس کی سوچوں کو رکنا جب پڑا جب چاچو کی حلیم آواز سنائی دی۔

”میری بیٹی کے بغیر گھر بہت سونا لگ رہا ہے۔“ چاچو کی محبت نے مالا کے اندر چہار گنا..... خوشگواریت اتار دی تھی۔ اس کی آنکھیں ان کی محبت پر چمکنے لگیں۔

”چاچو میں خود بھی گھر آنا چاہتی ہوں۔“ مالا نے سرشاری کیفیت میں کہا تھا۔ چاچو کی آواز اس لمحے ڈیڈی کی آواز سے مشابہ ہو گئی تھی۔ ڈیڈی جیسی نرمی، محبت، حلاوت اس کا دل اپنے بائبل کی یاد سے بھر بھر آیا مگر کمال ضبط سے خود پر قابو پانی رہی تھی۔

”دلے چاچو، میری یہاں مون سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔“ ہر چند کہ مون سے ملاقات کوئی خوشگوار ماحول میں نہیں ہوتی تھی پھر بھی اس نے مون کا ذکر کرنا مناسب سمجھا تھا۔ مون چاچو کی اگلوٹی بیٹی تھی اور مالا کی کزن بھی پھر اسے مون کے ساتھ کوئی پر خاش بھی نہیں تھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ مون اسے قطعاً پسند نہیں کرتی۔ مون کا ذکر مالا کے لبوں سے سن کر چاچو فطری محبت سے مغلوب ہو گئے تھے۔ مالا نے محسوس کیا جب چاچو نے بولنا شروع کیا تو ان کے لہجے میں ڈھیروں پیارا تر آیا۔

”مون تم سے ملی، اس نے کچھ کہا تو نہیں؟“ جانے وہ کیوں تجسس بلکہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ان کا انداز کھوجی، سرانگی قسم کا تھا۔ گویا وہ کچھ جانچتا اور پوچھ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ کچھ ایسا جو غیر فطری یا غیر متوقع ہو سکتا تھا۔

”کچھ نہیں کہا بلکہ اچھے طریقے سے ملی تھی۔“ مالا ان کے خدشات کی تہ میں پتا ان کے کچھ کہے چکے سے اتر گئی تھی حالانکہ عام روٹین میں چاچو بلا کے تفریح طبع، ہنسوز اور فرحت مزاج تھے تاہم یہ مون کا ذکر تھا جس نے انہیں کچھ اپ سیٹ کر دیا تھا۔

”جانے مون کے حوالے سے کیسی بھول ہوگی مجھ سے۔“ وہ گویا خود سے ہم کلام تھے اور اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے۔ اپنی ناکردہ خطا، قصور یا لغزش پر وہ دل برداشتہ تھے۔ وہ خود کو ہی مجرم ٹھہرا رہے تھے حالانکہ ان کا بھلا تصور کیا تھا؟ ہر بچہ اپنی فطرت پہ پیدا ہوتا ہے۔ عیسیٰ بھی تو انہی کا بیٹا تھا، فرمانبردار، نیک، ذہین..... اگر مون کچھ الگ یا منفرد تھی تو اس میں بھی چاچو کا تصور کہاں نکلتا تھا۔

”مون نے ایسا کیا کر دیا؟“ اس کے لبوں سے غیر ارادی طور پر پھسل گیا تھا حالانکہ یہ سوال وہ کم از کم چاچو سے نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اب بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ زبان سے نکلی بات پلٹ نہیں سکتی تھی۔ ویسے بھی اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے غیر ارادی طور پر یہ بات کہی تھی۔

”آں.....“ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے تھے۔ جانے کیا سوچنے لگ گئے تھے یا انہیں مون کی شخصیت کے بارے میں بات کرنا کچھ مشکل لگ رہا تھا۔

”وہ بہت مختلف ہے بیٹا..... شاید عام لوگوں سے بہت ہی مختلف۔“ یقیناً وہ اس سے اچھی کوئی اور وضاحت اپنی بیٹی کے لیے نہیں دے سکتے تھے جبکہ مالا ان کی بیٹی کے لیے بہت اچھی اور بہت جامع وضاحت محض چند الفاظ میں بیان کر سکتی تھی اور شاید وہ مون کی ہر بات کو نظر انداز بھی کر دیتی مگر جو وہ مالا کو اچانک ہراساں کرنے بیٹا اجازت کمرے میں کھس آتی تھی۔ ان باتوں کو سوچ کر مالا کے اندر گرہ سی پڑ گئی تھی۔ دراصل مون کے غیر اخلاقی اقدام نے مالا کے اندر حد درجہ خوف و ہراس بھر دیا تھا۔ جانے مون کے مقاصد کیا ہیں؟ تاہم مالا اتنا جان پائی تھی کہ مون اسے خوف زدہ کرنا چاہتی تھی اور اس نے مون کی شخصیت کی تشریح ایک طرفہ انداز میں کچھ اس طرح سے کی تھی۔

”چاچو! آپ کی بیٹی تو ساحرہ ہے اللہ کی قسم!



بولتی ہے تو سحر پھونک دیتی ہے۔“ اس کے نرم الفاظ نے دوسری طرف چاچو کے وجود پر کیسا بارود گرایا تھا یہ محض آنکھوں سے دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ کسی کئے ہوئے شہتر کے مانند ڈھے گئے تھے جبکہ مالا.... بے چاری نا سنجی کے عالم میں ہیلو، ہیلو کرتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

لائن شاید ڈراپ ہو گئی تھی۔ مالا نے بے دلی سے فون رکھ دیا اور پلٹ کر کیوخ کی طرف بڑھ آئی مگر کیوخ کی خاموشی اور کھٹ پٹ کی نہ آنے والی آوازیں بتا رہی تھیں کہ سوزن یہاں نہیں۔ میز پر ناشتے کا سامان رکھا تھا۔ اناس کی فلاٹسے رس سے بھری تھی۔ ایک پلیٹ میں بیرنے کے قتلے کئے ہوئے پڑے تھے۔ انڈے اور سلاٹس بھی تھے۔ مالا نے اناس کا بس رس پیا تھا حالانکہ سبز لویہ کا سالن بھی موجود تھا اور میدے کا پراٹھا بھی۔ سوزن نے ہمیشہ کی طرح ناشتے پر خاصا اہتمام کیا تھا۔ وہ جوس پی کر سوچ رہی تھی کہ عیسیٰ کو فون کرے۔ اسی اثنا میں سوزن چلی آئی۔

”گرس گوٹ۔“ اس نے بوار یا کا مخصوص سلام پیش کیا تھا۔۔۔ جیسے انگریزی کا گڈ مارننگ اور اردو کا صبح بخیر۔ سوزن کے ساتھ اتنے مختصر وقت میں مالا نے بہت کچھ نہ سہی تھوڑا بہت سیکھ لیا تھا۔ جیسے کوئی فون کے لیے بلاتا تو وہ سمجھ کے فوراً آجاتی۔ جیسے گرس گوٹ یعنی پورے دن کی سلامتی کے لیے دعا۔ عیسیٰ نے کہا تھا وہ لوگوں کے لفظوں اور باتوں کی طرف توجہ دیا کرے تاکہ اسے لفظ سمجھنے میں آسانی ہو۔ کوئی بھی زبان مشکل... نہیں ہوتی اگر اسے سمجھ لیا جائے تو اور یہ علی عیسیٰ کی خاص ہدایت تھی پھر مالا اسے کیسے نظر انداز کر دیتی۔

ادھر سوزن اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اب گرس گوٹ کے جواب میں جانے کیا بولتے تھے؟ مالا کو کچھ سمجھ نہ آیا تو اس نے بڑے

جذب کے ساتھ ”وعلیکم السلام“ بول کر سوزن کی سلامتی کو لوٹا دیا۔ مالا کے اس انداز پر سوزن کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی تھی پھر اس نے اسٹول سے اٹھ کر مالا کی طرف کیا۔ اب وہ اپنی سوتی روک سمیٹ کر مالا کے قریب بیٹھ گئی تھی اور مالا اسے اتنے قریب سے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

”بھلا علی عیسیٰ نے سوزن پر اسے کیوں ترجیح دی؟ کیا خوب صورتی کی بنا پر مگر عیسیٰ نے تو مالا کو دیکھا ہی نہیں تھا تو پھر آخر کیا وجہ تھی؟ شاید چاچو کی محبت یا اصرار؟ ہاں، شاید یہی ٹھوس وجہ ہو سکتی تھی مگر جو بھی تھا مالا اس انداز میں سوچ کر بھی سوزن سے حسد محسوس نہیں کرتی تھی اور نہ ہی اسے علی عیسیٰ کے اپنے ساتھ رشتے پر مان جانے کی کسی بھی خاص وجہ کو جاننے کے متعلق تجسس تھا۔ گویا وہ علی عیسیٰ کو پا کر ہی سرشار تھی۔ وہ اسے کیوں ملا، کیسے ملا اور یہ شادی کس طرح ہوئی؟ مالا کو یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے لیے اہم یہ تھا کہ علی عیسیٰ سفید پھولوں کی مالا سے بے انتہا محبت کرتا ہے اور جب وہ اس سے محبت کرتا تھا تو باقی چیزیں قطعاً فضول اور بے معنی تھیں۔ مالا کے لیے یہی احساس پوری زیست کا سرمایہ تھا۔ مون کیا چاہتی تھی؟ تانتے اور سوزن کی کیا خواہش تھی؟ یہ پوری کہانی مالا کے یہاں آنے سے پہلے کی تھی اور مالا کو ماضی کریدنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلے اتار چڑھاؤ کو ملاحظہ کر کے سوزن نے اسے سوچوں کے گرداب سے باہر نکالا۔

”عیسیٰ کا فون آیا تھا، وہ آج بھی نہیں آسکے گا۔“ سوزن کے الفاظ نے مالا کی رنگت پل بھر میں زرد کر دی تھی۔ اس کی سانس رک سی گئی چونکہ سوزن اس کے بہت قریب بیٹھی تھی اور مالا کا چہرہ بھی کھلی کتاب جیسا تھا سو وہ اس کے تاثرات کا فوراً جائزہ لے کر نرمی سے بولی۔

”گھبراؤ مت، عیسیٰ نے مجھے کہا ہے کہ میں

تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ آؤں۔ وہ تمہیں آگے سے لے کر لے گا۔ وہ بہت پریشان ہے اور انکل بھی تمہارے لیے اداس ہیں۔ میں نے آفاق کو بلایا ہے مگر اس کی کلاس نہ ہوئی تو تمہیں من ہائیم چھوڑ آئے گا۔ اگرچہ عیسیٰ کو یہ پسند نہیں مگر میں چاہتی ہوں تم اکیلے سفر نہ کرو۔ آفاق بہت اچھا لڑکا ہے۔ پاکستانی ہے، یہاں جا ب کرنے آیا ہے آج کل ڈنچ سیکھ رہا ہے ادھر اسٹی ٹیوٹ میں۔ آفاق کے ساتھ جانے میں دشواری نہیں ہوگی۔ وہ تمہاری بات سمجھے گا اور تم اس کی ہم وطن ہونا پردیس میں ایک نعمت ہے۔“ سوزن نے سابقہ نرمی اور حلاوت سے کہا تھا۔ مالا جہاں اپنے واپس جانے کا بہت خوش ہو کر پروگرام سن رہی تھی وہیں آفاق کے نام پر ٹھنک گئی۔ اس پوری گفتگو کے دوران اسے صرف ایک بات چونکا گئی تھی۔ ”اگرچہ عیسیٰ کو یہ پسند نہیں۔“ عیسیٰ کو کیا پسند نہیں؟ آفاق کے ساتھ جانا یا پھر کسی کے ساتھ بھی سفر کرنا؟ اس نے کہا تھا وہ اکیلی چلی آئے۔ عیسیٰ آگے سے پک کر لے گا تو پھر کسی بھی آفاق کے ساتھ جانا بیکار اور فضول تھا جبکہ سوزن آفاق کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ وہ شاید اس کا تذبذب سمجھ چکی تھی۔

”آفاق بہت شریف جوان ہے۔ بہت نیک اور ایمان دار ہے۔ پہلے ہمارے گھر میں ہی رہتا تھا۔ اب ادھر قریب ہی ایک گھر کرائے پر لیا ہے اس نے۔ آفاق کے ساتھ جانے میں کوئی پرانہ نہیں، میں عیسیٰ کو بتا دوں گی ویسے وہ بھی آفاق کو جانتا ہے۔ تم یہاں اجنبی ہو، ڈنچ سے ناواقف ہو میرا نہیں خیال کہ اکیلے سفر کر پاؤ گی۔“ سوزن بلاشبہ بہت ہمدرد اور احساس کرنے والی لڑکی تھی۔ اسے مالا کی پریشانی کا خیال تھا مگر مالا، سوزن کی بات بھلا کیسے مان لیتی جب عیسیٰ نے کہا تھا وہ اکیلی آجائے۔ اگر وہ چاہتا تو کہہ دیتا کہ کوئی اسے چھوڑ جائے۔ وہ کتنی

پریشان اور تذبذب کا شکار ہو چکی تھی۔ سوزن کچھ دیر کے لیے چپ سی ہو گئی پھر اندر سے اپنا موبائل اٹھالائی۔ اس نے عیسیٰ کا نمبر ملا کر پہلے پندرہ منٹ عیسیٰ سے خود بات کی شاید اسے سمجھانی رہی تھی کہ مالا اس ملک میں اجنبی ہے اور اکیلے سفر نہیں کر سکتی پھر کافی لمبی گفتگو کے بعد اس نے موبائل مالا کو پکڑا دیا تھا۔ مالا نے سیل فون کان سے لگایا تو عیسیٰ کی متشکر آواز سنائی دی۔

”مالا! میں خود تمہیں لینے آجاتا مگر بورٹ (ارکان کمیٹی) کے دو لوگ مرچکے ہیں۔ یہاں خاصا لمبا چوڑا کام ہے۔ حادثے کے باعث ایک دو کی مزید حالت تشویش ناک ہے۔ پایا کو ڈاکٹر نے ڈرائیونگ سے منع کر رکھا ہے ورنہ وہ خود تمہیں لینے پہنچ جاتے۔ میں نے بہ مشکل روک رکھا ہے انہیں۔ سوزن تمہیں اسٹیشن تک چھوڑ جائے گی، تم آفاق کے ساتھ آجانا۔ بہت اچھا لڑکا ہے تم ڈنچ سے ناواقف ہو راتے میں پریشانی ہو سکتی ہے۔ دھیان سے آنا، اپنا خیال تم اچھی طرح رکھ سکتی ہو۔“ وہ عجلت میں مگر محتاط سا بول رہا تھا۔ اس کے آخری الفاظ میں ایک پوشیدہ سی تنبیہ تھی۔ اس تنبیہ کو مالا اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ وہ نہ بھی کہتا تب بھی مالا اپنا خیال بہت اچھی طرح سے رکھ سکتی تھی۔ اپنا وقار، نسوانی پندار، عزت اور آبرو کی حفاظت کرنا اسے خوب آتا تھا۔ ایک یہی تو خاص تربیت تھی جسے ان کی مشرقی مائیں کھٹی میں پلا دیتی تھیں۔ فون بند ہو گیا تھا اور شاید فیصلہ بھی ہو چکا تھا۔ اسے سوزن کی بات اب ماننی ہی تھی کیونکہ عیسیٰ نے آفاق کے ساتھ چلے آنے کی اجازت دے دی تھی سو مالا کو اب اپنی چیزیں سمیٹنا تھیں جو تقریباً پہلے سے ہی سمٹی رکھی تھیں پھر بھی تھوڑی بہت پکینگ سوزن نے کروادی تھی پھر مالا، گروسی سے ملنے ان کے جانوروں والے باڑے میں پہنچ گئی۔ یہاں گوبر کے بھبھکوں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ تانتے مشین میں



چارہ کاٹ رہی تھی۔ ایک سخت دل، روکھے مزاج کی محنت کش عورت۔ اس نے پہلی مرتبہ تانتے کو کام کرتے دیکھا تھا۔ تانتے گھر میں کم کم نظر آتی تھی۔ یقیناً اس کا زیادہ وقت باڑے میں گزرتا تھا۔ یہاں پنیر اور تازہ دودھ کی باس تھی۔ گروسی اور تانتے اسے دیکھ کر کام چھوڑ کر حیران کھڑی تھیں پھر تانتے تو نہیں البتہ گروسی اس کے قریب آگئیں۔ انہوں نے اپنے کھر دے سفید ہاتھ کو اس کے سر پر رکھا تھا پھر گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔

”کیا ہوا تو ختر (بہنی)؟“ گروسی کی سبز گدلی بہت کشادہ آنکھوں میں سوال تھا تب مالا کو سمجھ نہ آئی کہ وہ انہیں کیسے بتائے، وہ جارہی ہے اور ان سے ملنے کے لیے آئی ہے۔ اس کی مشکل سوزن نے آسان کر دی۔ وہ اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔ یقیناً سوزن جان گئی تھی مالا، گروسی سے ملنے باڑے تک گئی ہوگی۔ گروسی نے سوزن کی بات سن کر کچھ کہا تھا شاید یہی کہ وہ کچھ اور دن ان کے پاس رک جائے۔ گروسی کی محبت پر مالا کو کوئی شک نہیں تھا تاہم اتنا وہ جانتی تھی کہ تانتے اس کے جانے کا سن کر بہت خوش ہوگی۔ سوزن کی بات سن کر تانتے نے مشین کا پنڈل گھما کر اندر کی طرف رخ کر لیا تھا۔ مشین خود بخود چارہ کاٹ رہی تھی اور تانتے کا یوں مالا کو دیکھ کر اندر چلے جانا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کیا وہ تانتے کو اتنی ہی بڑی لگتی تھی کہ ملنا تو دور اس نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ مالا کا کانچ سادل ٹوٹ ہی گیا۔ اب اگر عیسیٰ نے سوزن سے شادی نہیں کی تھی تو اس میں بھلا مالا کا کیا قصور تھا؟ گروسی سے مل کر اور ان کی دعائیں سمیٹ کر جوں ہی وہ پٹی تب تک تانتے دوبارہ باڑے تک آگئی تھی۔ سوزن نے اشارے سے مالا کو روک جانے کا کہا تھا۔ اب وہ حیران نظروں سے تانتے کو دیکھ رہی تھی جس نے ہاتھ میں ایک شون روک پکڑ رکھی تھی۔ پھول داری خوب صورت

اسکرت جس پر دھاگے کا کام تھا پھرتانتے نے اس کی حیرانی سے پھٹی پڑتی آنکھوں کو دیکھے بغیر ایک انتہائی نفیس آرمبائٹ مالا کی کلائی میں پہنا دیا تھا۔ اگرچہ آرمبائٹ (برسلٹ) نقلی ٹیکنوں سے سجا تھا مگر انتہائی خوب صورت اور نفیس تھا۔ یہ تانتے اور گروسی کی طرف سے تحفے تھے۔ مالا کی خوشی کے مارے آنکھیں بھرا آئیں۔ اسی روکھے مزاج والی... بد اخلاق تانتے نے گروسی کے انداز میں مالا کو پیار کر کے اچھی قسمت کے لیے دعاوی تھی۔

”فیل گلوک۔“ تانتے نے سابقہ انداز میں کہا تھا پھر واپس باڑے کی طرف چلی گئی۔ گروسی اسے باہر تک چھوڑنے آئی تھیں۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ... گروسی اور سوزن کی محبت سمیٹ کر اور تانتے اور مون کو سمجھے بغیر واپس جانے والے راستوں پر رواں دواں تھی۔ سوزن اس کے ہمراہ آئی تھی۔ اب وہ جنگلی پھولوں کی پاڑ پھلانگ کر ایک ہاؤس فراؤ کے گھر کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ وہیں سوزن نے آفاق کو آواز دے کر باہر بلایا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک ہینڈ سم جوان خوب تیار شیار ہو کر ہنستا مسکراتا باہر آیا تھا۔ اس نے خوب رگڑ رگڑ کر شیو کر رکھی تھی۔ گورا چٹا، کالی آنکھیں، کالے بال... شکل سے ہی مالا کا ہم وطن لگ رہا تھا۔ آتے ساتھ بڑا گرم جوشی بھرا سلام کیا۔ حال احوال پوچھا اور محض پندرہ منٹ کے اندر اندر لاہور سے لے کر یہاں تک کا سفر نامہ سنا ڈالا۔ انتہا کا باتونی یہ لڑکا آفاق تھا۔ اس کا تعلق بھی لاہور سے تھا۔ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی، مستقبل سنوارنے کی خواہش لیے جرمنی آیا تھا۔ اپنی ماں اور بہنوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسے بہنوں کی شادیاں کرنا تھیں، ماں کو حج کروانا تھا اور دادی کو سونے کے کنگن بنوا کر دینے تھے۔ اس کے علاوہ آفاق پر اپنے دو بہنوئیوں کو جرمنی لے کر آنے کی ذمہ داری تھی اور ایک بہنوئی کو کاروبار سیٹ کر کے دینا تھا۔ اس کی اگلی جان بے شمار سیاہوں

میں پھنسی ہوئی تھی اور پھر بھی فی الحال کوئی اس سے خوش نہ تھا۔ وہ پچھلے آٹھ ماہ سے جرمنی میں تھا۔ سوزن کے اسٹور میں کام کرتا تھا ساتھ ساتھ یہاں کی زبان بھی سیکھ رہا تھا۔ یہ تمام گفتگو ٹھیکہ پنجابی میں آفاق نے مالا کے گوش گزار کی تھی۔ وہ مالا کی توقع سے بھی زیادہ ہنس مکھ اور زندہ دل تھا۔ اس کی چلتی زبان کے جوہر دیکھ کر سوزن نے برجستہ کہا۔

”اہل بواریا کی زندہ دلی آفاق کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔“ سوزن کے منہس آفاق کو مسکرانے پر مجبور کر گئے۔ وہ اب مالا کو بتا رہا تھا۔

”آہ، بواریا کا حسن... تم ساری دنیا بھی دیکھ لو تب بھی بواریا کے حسن کا سحر ایسا نہیں جس سے خود کو آزاد کر پاؤ گی۔“ وہ دور تک پھیلی ہریالی کو دیکھتا، سبزے پھولوں، پہاڑوں، چشموں، جھیلوں کی داستان سنا رہا تھا۔ جو آس پاس بکھرے پڑے تھے۔ یہاں سفید مرغابیاں بھی کثرت سے پائی جاتی تھیں۔ اس وقت سورج پلھل رہا تھا۔ ہر چیز روشن اور چمک دار تھی۔ وہ لوگ اسٹیشن تک ایک منی بس کے ذریعے آئے۔ مالا ایک گاؤں میں عالیشان سا چمکتا دمکتا اسٹیشن دیکھ کر رنگ رہ گئی تھی۔ انتہائی صاف شفاف، ایک طرف بڑے... بڑے ڈیپارٹمنٹ اسٹورز تھے۔ جس روڈ پر بس رکی تھی وہاں پیٹرول پمپ اور سی این جی اسٹیشن بھی تھا۔ دو تین ہوٹلز اور گیسٹ ہاؤسز بھی تھے۔ یہ ایک چھوٹے سے معمولی گاؤں کی ترقی کا حال تھا۔ مالا کی آنکھیں جانے کیا کچھ دیکھ کر حیران ہوئیں۔ بھی ایک ٹرین کے آنے کی دسل ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین قریب آگئی۔ مسافر سوار ہونے لگے تھے۔ مالا نے دھندلی آنکھوں سے سوزن کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اپنی زندگی کا ایک اور خوب صورت انتہائی یادگار تھوڑا سا وقت یہاں گزار کر واپس جارہی تھی۔ وہ سوزن کو کبھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ اس کی محبت، ایثار اور پیار کا کوئی مول

نہیں تھا۔ مالا نے فرط محبت سے اسے گلے لگایا تھا جو اب سوزن نے بھی اسی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ”میں آج کل خاصی غریب ہوں، تمہیں کوئی تحفہ نہیں دے سکی۔ مگر تحفہ تمہارا ادھار رہا۔“ اس کے گال پر بوسہ دے کر سوزن نے سرگوشی کی تھی۔ تب مالا سے منع کرنا چاہتی تھی مگر اچانک دسل سنائی دی۔ آفاق نے چیخ کر اسے بلایا اور مالا عجلت میں ہاتھ ہلاتی ٹرین میں سوار ہوگئی۔ اس کی آنکھیں سیٹ پر بیٹھنے کے بعد بھیگ رہی تھیں۔ وہ سوزن کی محبت کو کبھی بھلا نہیں سکتی تھی۔ وہ سوزن کے ساتھ گزارے وقت میں اس قدر محو تھی کہ اپنے ساتھ آئے آفاق کو بھی بھول چکی تھی۔

”جس دن میں بواریا چھوڑوں گا، مجھے بھی ایسا ہی دکھ ہوگا۔“ آفاق نے اس کی افسردگی محسوس کر کے آہستگی سے کہا۔ ”یہ بواریا... یہ ہے ہی ایسا۔ اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ بندے کو اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچتا ہے۔ یہاں کے لوگ بہت سادہ طبیعت، ہمدرد، مخلص اور مذہبی ہیں۔ میں نے اہل مغرب میں اس علاقے جیسے لوگ کہیں نہیں دیکھے۔ لگتا ہے، یہاں افسانوی کردار بستے ہیں۔“ وہ باتونی لڑکا بالآخر سوسوں، سوں کرتی مالا کو اپنی طرف متوجہ کر ہی چکا تھا۔ مالا نے اس کی بات سے... بے خیالی میں اتفاق کر لیا۔

”میں یہاں بس ایک مہینے تک ہوں پھر من ہائیم میں جاؤں ڈھونڈوں گا۔“ وہ بولے جانے کے خطبہ میں مبتلا تھا۔ جواب نہ پا کر بھی بولے چلا جاتا تھا۔ اسے خاموش رہنا گویا پسند نہیں تھا۔ ”عیسیٰ بہت اچھا ہے، اس نے میری بہت مدد کی تھی۔ یقیناً میرا کورس مکمل ہونے کے بعد جاؤں گا۔“ وہ اب عیسیٰ کی تعریفوں میں رطب اللسان تھا اور عیسیٰ کی تعریف ایک ایسا موضوع تھا جو مالا کو اندر تک سرشار کر دیتا تھا۔ وہ گویا جی جان سے



آفاق کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اسے عیسیٰ کے بارے میں کسی سے بھی کچھ سننا بے حد پسند تھا۔

”میرا اسٹی ٹیوٹ میں مون نے فری ایڈمیشن کروایا تھا۔ یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ ہمدرد اور مخلص خصوصاً ان لوگوں میں سب سے زیادہ سوزن انتہائی مخلص اور ایثار کرنے والی لڑکی ہے کاش کہ وہ عیسائی نہ ہوتی۔“ بولتے بولتے اچانک وہ ایک دم رک گیا تھا۔ زیادہ بولنے کا ایک یہی نقصان ہوتا ہے جو کچھ زبان بول دیتی ہے وہ پھر واپس نہیں پلٹ سکتا۔ وہ بھی قدرے خاموش اور شرمندہ ہو گیا تھا مگر مالانے گویا اس کی بات پکڑ لی تھی یعنی انسانی فطری تجسس..... حالانکہ وہ اجنبی لوگوں سے زیادہ تو کیا کم بھی بے تکلف نہیں ہوتی تھی اور اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ آفاق سے بالکل بات نہیں کرے گی مگر یہ آفاق کی سادگی، خلوص یا اپنائیت بھرا انداز تھا جو مالا کو رکھائی دکھانے سے روک رہا تھا۔ وہ چاہ کر بھی بد اخلاقی نہیں دکھا سکتی تھی اور نہ ہی آفاق سے بدتمیزی کر سکتی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک تمیزدار، بااخلاق اور شائستہ اطوار لڑکا تھا۔

”وہ عیسائی نہ ہوتی تو؟“ مالانے اس تمام گفتگو میں ایک جملہ بالآخر پکڑ ہی لیا تھا۔ آفاق ایک دم جھینب سا گیا تھا پھر شاید بات بنا کر بولا تھا۔

”یقیناً گفتگو کو کسی بھی موڑ سے اپنے حق میں کرنے کا ہنر اسے آتا تھا۔ مالا سراپے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

”سوزی بہت اچھی لڑکی ہے۔ کسی بھی انسان کا آئیڈیل، ویسے میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اگر وہ عیسائی نہ ہوتی تب بھی عیسائی ہی ہوتی، اپنے مذہب پر جان دیتی ہے۔ میں نے بہت کم مغربی لڑکیاں سوزی کی طرح، سوزی کے مزاج والی، سوزی جیسے کردار والی دیکھی ہیں۔“ آفاق یقیناً سچ بول رہا تھا۔ سوزی ایسی ہی تھی، قابل تعریف، محبت کرنے والی، ایثار لوانے والی۔ کچھ دیر بعد آفاق پھر سے سوزی کے متعلق گفتگو

کو بڑھا رہا تھا۔

”مجھے سوزی کے ہم سفر پر رشک آتا ہے۔ یقیناً وہ خوش قسمت انسان ہوگا جسے سوزی پسند کرے گی۔“ آفاق کے لہجے میں حسرت سی در آئی تھی۔ مالا ایک مرتبہ پھر سے ٹھٹکی بھلا اس حسرت آمیز لہجے کا مفہوم کیا تھا۔

”سوزی بھی میری طرح سیلز گرل ہے یعنی میں سیلز بوائے، وہ سیلز گرل۔ یہ جاب بڑی مشکل سے مجھے ملی ہے ویسے میں کبھی کبھی حیران ہوتا ہوں بلکہ مجھے رشک آتا ہے۔“ اس نے اپنا کندھے پر لٹکایا لیڈر کا بیگ کھول کر اس کے اندر تانکا جھانکی شروع کر دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک چپس کا پیکٹ کھول کر مالا کی طرف بڑھانے لگا۔ مالا جھجک سی گئی تھی اس نے چپس کا پیکٹ نہیں پکڑا تھا۔

”شکریہ، میرا موڈ نہیں ہے۔“ اس نے انکار کر دیا۔ آفاق نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا تھا۔ وہ پہلے جیسی بے تکلفی کے ساتھ مسلسل بول رہا تھا اور برابر چپس کھائے جا رہا تھا۔

”تم نے پوچھا نہیں، مجھے رشک کس پر آتا ہے؟“ اب وہ مالا کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جس کی مسلسل خاموشی شاید آفاق کے لیے اچھے کا باعث تھی۔

”کس پر رشک آتا ہے؟“ مالانے میکانگی انداز میں پوچھا تھا۔ دراصل وہ زیادہ بولنے کی عادی نہیں تھی اور اسے آفاق کا بلا تکان بولنا بھی گراں گزر رہا تھا۔

”علی عیسیٰ پر۔“ آفاق نے لمحوں میں چپس کا پیکٹ خالی کر کے گول مول سا گولا بنایا اور اسے ایک چھوٹی کورپ (ڈسٹ بن) میں اچھال دیا۔ شاید وہ اسی لیے ایک کنڈے میں لٹکائی گئی تھی۔

”اچھا! مالا کی دلچسپی دیدنی تھی۔“ بھلا وہ کیوں؟“ اب وہ حیرانی سے بول رہی تھی۔

”وہ اس لیے کہ علی عیسیٰ بہت اچھا ہے، بہت

امیر ہے۔ اس نے کچھ بھی محنت سے نہیں بنایا۔ اسے سب بنانا ملا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ہمدرد دل رکھتا ہے۔“ آفاق کی کچھ باتیں مالا کو اچھی اور کچھ بری لگی تھیں۔ وہ چپ ہوا تو مالا بولی۔

”اس کے باپ نے تو بہت محنت کی ہے ناں اور اسی بزنس کو عیسیٰ نے مزید وسعت دی ہے۔ ہمارے پچھلے، اگلوں کے لیے کچھ نہیں کرتے، اسی لیے پیچھے رہ گئے ہیں۔“ مالانے بے ساختہ جواب دیا تھا اسے آفاق کی بات بھائی نہیں تھی۔

”ہاں، یہ تو میں بھی کہتا ہوں۔ ویسے حسیب انکل جیسا انسان بھی کوئی نہیں..... مگر مون کی خود سری نے انہیں بیمار کر ڈالا ہے۔ تم جانتی ہو گی وہ ہارٹ پیڈنٹ ہیں۔ انہیں دوسرا ٹیک تمہاری شادی سے کوئی ایک مہینہ پہلے ہوا تھا۔ سبھی تو انہوں نے عیسیٰ کی جھٹ پٹ شادی کر دی تھی۔“ آفاق اپنی رو میں بولتا جا رہا تھا اور مالا کی گویا سانس سینے میں اٹک گئی۔

”کیا چاچو اتنے سخت بیمار تھے؟“ مالا کو اس انکشاف نے حیران کر ڈالا تھا۔ وہ اندر تک آزرده ہو گئی۔

”بیمار تھے نہیں، بیمار ہیں۔“ آفاق نے اپنی بات پر زور دے کر کہا تھا پھر مالا کی نم آنکھوں اور ڈھیروں رنجیدگی کو محسوس کر کے قدرے گڑبڑا گیا۔

”ارے..... اب تو وہ بالکل ٹھیک ہیں۔“ آفاق کو سمجھ نہ آئی کہ اسے تسلی کیسے دے۔ مالا کی آنکھیں ٹپ ٹپ برسنے لگی تھیں۔ اسے اب پتا چلا تھا کیوں چاچو نے آنا فانا عیسیٰ کی شادی اس کے ساتھ کر دی تھی۔ یقیناً وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چلے تھے۔

”ویسے عیسیٰ کی جلدی شادی کا موجب یہی تھا۔ وہ تو پہلے مون کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر وہ مانی نہیں۔“ آفاق ان کی فیملی کو اتنے قریب سے جانتا تھا۔ یہ مالا کو پہلے نہیں پتا چل سکا تھا۔ وہ تو ان کے گھر کی بہت پرسنل باتوں کو بھی جانتا تھا تو پھر وہ مون

نہا۔ وہا

کے متعلق بھی جانتا ہوگا۔ عیسیٰ اور سوزن کے نام نہاد رشتے کو بھی جانتا ہوگا اور مون کی ساحری، جادوگری کے فن سے بھی واقف ہوگا۔ مالا اچھے سے آفاق کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس سے کچھ پوچھنے اور نہ پوچھنے کی کشمکش میں مبتلا تھی اسی اثنا میں بارش گارڈننگٹ فروخت کرنے آ گیا۔ اس غریب بے تکلف لڑکے نے فوراً دو ٹوک خرید لیے تھے۔ اب ٹرین گلابوں کے ٹکڑے سے گزر رہی تھی۔ وسیع پھولوں سے سجے فیلڈ تاحہ نگاہ پھولوں کی رنگ برنگی تو س قزح پھیلی تھی۔

ایسا مہکیلا، جان فزا منظر تھا کہ کچھ بل کے لیے آفاق بھی بولنا بھول گیا تھا حالانکہ وہ ایک منٹ بھی چپ رہنے والا نہیں تھا ادھر مالا پھولوں کی مالاؤں پر نگاہ جمائے آفاق سے کچھ پوچھنے کے لیے لفظوں کو توڑ مروڑ رہی تھی۔ دراصل اسے گفتگو کی ابتدا کے لیے کوئی مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ بھلا وہ کیسے اتنی اہم بات انجان لڑکے سے پوچھ لیتی۔ ویسے بھی جس طرح مون نے دو دفعہ مالا کو اچانک ہراساں کیا تھا اس بات سے سبھی ناواقف تھے اور سوزن تو مانتی ہی نہیں تھی کہ مون ان کے گھر اچانک آئی تھی بلکہ گھر نہیں، مالا کے کمرے میں..... سوزن کا خیال تھا مون اس کے کمرے میں نہیں آئی جبکہ مالا کو پورا یقین تھا وہ اسے پہلی شب کی طرح ہراساں کر کے گئی ہے۔ اب جانے آفاق کو بتانا مناسب تھا یا نہیں۔ وہ اسی کشمکش میں مبتلا بات بدل کر بولی تھی۔

”کیا تم جانتے ہو کبھی عیسیٰ اور سوزن کا رشتہ یا ممکنہ وغیرہ ہو چکی ہے؟“ مالانے حتی المقدور لہجے کو سرسری بنایا تھا تا کہ آفاق کو شک بھی نہ گزرے۔

”آں.....“ آفاق پھولوں کے حسن سے نگاہ چرا کر فوراً چونکا۔ ”ممکنہ.....“ اسے بھی اچھا ہوا۔ وہ دائیں بائیں سرئی میں ہلا کر ایک مرتبہ پھر اپنا لیڈر کا بیگ کھولنے لگا تھا۔ اب کے اس نے جوس کاشن نکالا تھا۔ پہلے مالا کی طرف بڑھایا پھر کچھ سوچ کر فوراً



## آزادی نسوان

مغربی عورت نے، مرد کے شانہ بشانہ گھر گرہستی چھوڑ کر ہر قسم کی صنعت میں کام کیا اور معاشی طور پر مستحکم، آزاد، خوشحال اور خود مختار ہوئی۔ اب شوہر اس کی مجبوری صرف خرچے کے لیے نہیں رہے، مردوں نے بھی آزادی کی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کیونکہ اس میں ان کا ہی فائدہ تھا۔ آہستہ آہستہ خاندانی بندھن ٹوٹنے لگے اور تصور خاندان یکھرنے لگا۔

single parenty خاندان کا رواج عام ہوا۔ آج مغربی معاشرے میں عورت کی نسوانیت کی تلاش ہے، جو عنقا ہو چکی ہے۔ نکتہ در اس سوال پر غور کر رہے ہیں کہ جہاں عورت مکمل طور پر آزاد اور مشرقی ماحول کے بالمقابل نہایت پُر اعتماد ہے پھر اس قدر عدم تحفظ کا شکار کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب آج تک آزادی نسوان کی کوئی تحریک نہیں دے سکی اور نہ ہی مغرب کا وہ طبقہ دے سکا جو مسلم عورت کی "آزادی" کے لیے بھی سرگرم عمل رہتا ہے۔

مرسلہ: عربیناز، کوئٹہ

## محبت کی امر بیل

محبت کی امر بیل میں ہمیشہ تم کے پھول کھلتے ہیں، ستم کا پھول جس کی پتھریوں پر تاسف کے آنسو ٹپکتے ہوتے ہیں جس کی تھلیں جلد سے جدائی کی خوشبو آتی ہے۔ ستم کے پھول کی کہانی سنی ہے کبھی تم نے یہ تو دکھ کے پھول کی داستان ہے، ایک ایسا پھول جس میں محبت کا مدفن ہوتا ہے، دیوتا ابالو اور ونس کی محبت بادام کے شکوفوں کی طرح معطر نازک مگر ہر خوب صورت چیز تمام خوب صورت لمحے صرف چند روزہ کیوں ہوتے ہیں ونس کی قبر پر پالو کے اتنے آنسو گرے کہ اک دن اس میں سے اک پودے نے سر نکالا اور اس میں ایک پھول کھلا اور غوانی رنگ کا یہ ستم کا پھول تھا، ستم کا پھول پچھتاوے کا پھول محبت کا مدفن اس کی ہر ایک پتھری پر لکھا ہوتا ہے افسوس صد افسوس۔

بالو قد سیر کی تصنیف امرتیل سے انتخاب  
پسند: ماہ نور قیصر، راولپنڈی

ہوئی ماں کے سامنے خود کو سرخرو سمجھنے لگا تھا۔ اس کا ضمیر مطمئن ہو گیا۔ دراصل وہ انکل کی بیٹی کو چاہتا تھا یعنی تمہیں..... بہت پہلے سے انکل نے کہہ دیا تھا کہ عیسیٰ کی شادی مالا سے ہوگی یعنی تم سے..... سو اس کے ذہن میں تمہارا خیال تھا۔ "آفاق پرت در پرت انکشافات کی بو چھاڑ کر رہا تھا۔ اس باتونی لڑکے نے اس کی حیران آنکھوں میں جلتی جوت کو دیکھ کر شرارتا کہا تھا۔

"تم سوچتی ہوگی اتنی اندر کی باتیں مختصر سے آٹھ، نو مہینوں میں مجھے کیسے پتا چلیں؟" آفاق نے چپ رہنا کہاں سیکھا تھا۔ مالا کو اس لمحے آفاق کا بہت بولنا بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ آفاق یوں ہی بنا اس کے کچھ پوچھے بولتا رہے۔ "ایکچوٹی مجھے یہ سب سوزن نے بتایا تھا اور سوزن کبھی جھوٹ نہیں کہتی۔" آفاق کے لہجے میں واضح سچائی تھی۔ مالا پور پور قائل ہو گئی پھر اس نے بہت خوف زدہ انداز میں مون کا ذکر خیر چھیڑا تھا تب مالا کی طرح آفاق بھی مون کے ذکر پر قدرے سہم گیا۔

"اس کی بات نہ ہی کرو، پوری جادو گرئی ہے، اللہ کی قسم مجھے بہت ڈر لگتا ہے مادام مون سے۔" آفاق نے سہم کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "اور میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ مون کے بارے میں زیادہ کھوج اور تفتیش میں نہ پڑنا۔ جس کا پیچھا لے لیتی ہے اس کی سانسیں کھینچ کے دم لیتی ہے۔ من ہائیم کی سارہ ہے۔" آفاق کے اگلے الفاظ نے مالا کے چڑیا جیسے دل کو بری طرح سہا دیا تھا۔

☆☆☆

"تم بہت اچھے ہو آفاق۔" اسٹیشن پر اترنے سے پہلے مالا نے تہ دل سے اپنے احساسات آفاق تک پہنچا دیے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اجنبیوں سے اتنی جلدی بے تکلف نہیں ہوتی تھی مگر آفاق میں کچھ بہت ہی انفرادیت تھی۔ اس کی شخصیت میں کچھ

اندر پھڑ پھڑاتے سوال مزید بڑھ گئے۔ وہ آفاق سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھی مگر اسے خدشہ تھا کہ آفاق یہ نہ سمجھے کہ وہ اپنی نیملی سے اتنی انجان ہے۔ "پھر؟" مالا کے ہونٹ بے آواز پھڑ پھڑائے۔ "ایکچوٹی، عیسیٰ نے شرط رکھی تھی شاید میری آئی کی خواہش سے متاثر ہو کر اس نے آخری شرط بتائی کہ سوزن اسلام قبول کرے۔ تب وہ اپنی ماما کی خواہش پوری کرتے ہوئے سوزی سے شادی کر لے گا۔" آفاق نے پتا کوئی خاص تاثر دینے مالا کے ہر سوال کا جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ سادہ کے مزید کچھ بھی بولے بغیر وہ خود ہی بتانے لگا۔ بہت باتونی ہونا شاید اسی کو کہتے ہیں، وہ چپ نہیں رہ سکتا تھا اور مالا کے لیے اس کا بولنا بہت ضروری تھا۔

"تب سوزی نے انکار کر دیا۔ وہ عیسائیت کے عشق سے نکلنے والی نہیں تھی۔ اس نے کہا تھا، وہ دنیا کے لیے آخرت نہیں ختم کر سکتی۔ وہ عیسیٰ کے لیے عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب اور ان سے عشق کو نہیں چھوڑ سکتی مگر وہ علی عیسیٰ سے محبت کرنا بھی ختم نہیں کر سکتی۔ بے چاری کو وقت نے دوار ہے پر لاکھڑا کیا تھا۔" آفاق کے الفاظ میں سچائی کے ساتھ سوزی کے لیے بے انتہاد دکھ اور کرب تھا۔ وہ اس چھوٹی سی لڑکی کے لیے دل میں بہت نرم جذبات رکھتا تھا۔ وہ یہ بات کسی سے تو کیا خود سے بھی شہسز نہیں کر سکتا تھا۔ سوزی اس کی محسنہ تھی اور احسان کرنے والوں کے دلوں کو نہیں نہیں پہنچائی جاتی۔ ادھر مالا اس انکشاف پر دم بخود رہ گئی تھی۔

"سوزی نے علی عیسیٰ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا؟" مالا کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ اسے سوزی اس لمحے بہت عظیم لگی تھی۔ اس نے مذہب پر محبت کو قربان کر دیا تھا۔ اس کے لیے محبت اہم نہیں تھی، مذہب اہم تر تھی۔

"ہاں، تب عیسیٰ مطمئن ہو گیا۔ وہ اپنی مری

بولی۔ "یقیناً تمہارا موڈ نہیں ہوگا۔" وہ گویا پورے وثوق سے کہہ رہا تھا جیسے مالا فوراً انکار ہی تو کرنے والی تھی۔ مالا کو اس سے ایسی صاف گوئی کی امید نہیں تھی۔ سبھی جوس کاشن پکڑ کر بولی۔

"میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔" اس کی حیرت سے باہر نکلی آنکھوں میں دیکھے بغیر اس نے آرام سے جوس پکڑ کر پینا شروع کر دیا تھا۔ آفاق نے مسکراہٹ دبا کر اپنی زینیل میں پھر سے منہ دے دیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک اور جوس کاشن نکالے منہ سے لگا کر گھونٹ، گھونٹ پی رہا تھا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" مالا کو جواب جاننے کی بے چینی تھی اور آفاق کو جوس پینا۔۔۔ فی الحال جواب دینے سے زیادہ ضروری لگ رہا تھا پھر جوس کاشن خالی کر کے ڈسٹ بن میں اچھالنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اگر ہم اپنے ملک میں بھی ایسی صفائی کا خیال رکھیں تو پاکستان جنت نہ بن جائے۔" آفاق درمیانے سائز کے ڈسٹ بن دیکھ کر خود کو ملامت کر رہا تھا اور پھر اچھی طرح خود کو اور اپنی عوام کو سنے کے بعد مالا کی بات کے متعلق سوچنے لگا۔

"منگنی تو نہیں، البتہ میری آئی (عیسیٰ کی ماما) کی خواہش تھی سوزن ان کی بہو بنے۔" آفاق کچھ سوچ، سوچ کر بول رہا تھا۔ یہ باتیں خاصی پرانی تھیں مگر آفاق کو پھر بھی پتا تھا۔ یقیناً وہ گروسی کے گھر میں ایک فرد کی طرح رہتے ہوئے بہت کچھ جان گیا تھا۔

"تو پھر؟" مالا کی آنکھوں میں بے چینی اتر آئی تھی۔ "پھر یہ کہ میری آئی اور عیسیٰ کی یہ بھی خواہش تھی کہ اگر سوزن اسلام قبول کر لے ویسے میں نے یہ بھی سنا تھا عیسیٰ، سوزن سے رشتے پر تیار نہیں تھا۔ مطلب وہ سوزی کے لیے ایسے جذبات نہیں رکھتا تھا کہ اس سے شادی کر لیتا۔" آفاق نے اس کی... بے چینی محسوس کیے بغیر سادگی سے بتا دیا تھا۔ مالا کے



مگر آفاق کا جواب قطعاً مختلف تھا۔

”میں تمہیں من ہائیم تک چھوڑنے آیا ہوں کسی اور بس یا ٹرین سے فوراً ہی واپس چلا جاؤ گا۔“ آفاق کے سادگی سے بتانے پر مالا اس احسان مند ہو گئی تھی یعنی وہ اپنا تمام کام، مصروفیت چھوڑ کر آیا تھا۔ مالا کے دل میں اس کی جگہ بن گئی۔ اچھے لوگ خود بخود دلوں میں اپنی جگہ بنا کرتے تھے۔ آفاق بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ٹرین اپنے مقررہ وقت اسٹیشن کی حدود میں رک گئی تھی۔ آفاق نے دور سے ہی عیسیٰ کو دیکھ کر آواز لگا دی تھی۔ پاکستانی کہیں بھی چلیں جائیں۔ خود کو بدل نہیں سکتے۔ ایک مصروف اسٹیشن پر ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں بھی ذرا سا شور ہنگامہ یا بد نظمی نہیں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آفاق کی اونچی چہکار نے بہت سارے لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کر دیا تھا مگر وہ ڈھٹائی سے بولتا، مسکراتا کھلکھلاتا عیسیٰ سے بھینچ بھینچ کر مل رہا تھا۔ وہ حد سے زیادہ بے تکلف قسم کا لڑکا تھا جبکہ عیسیٰ اس افتاد پر ایک دم بوکھلا گیا تھا پھر کچھ دیر بعد سنبھلنے کا موقع ملے ہی عیسیٰ نے آفاق کا شکریہ ادا کیا تھا اور آفاق بھی ٹوٹی پھوٹی ڈیج میں جانے عیسیٰ سے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ آفاق کو رخصت کرنے کے بعد عیسیٰ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو آفاق کے محبت بھرے والہانہ مظاہروں پر دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھی۔

”یہ ایسا ہی ہے..... تم حیران مت ہونا..... جہاں موقع ملتا ہے میرے ساتھ ڈیج بولنے کی پریکٹس کرتا ہے۔“ عیسیٰ نے مسکراتے ہوئے اس کا بیگ پکڑا اور اس کے برابر چلنے لگا۔ ”تمہارے ساتھ ڈیج بول کر ڈیجیں تو نہیں مارتا رہا؟“ اچانک خیال آنے پر عیسیٰ نے مسکرا کر پوچھا تھا۔ مالا اس کے برابر چلتی ہوئی نشی میں سر ہلانے لگی۔

”میرے ساتھ تو پنجابی اور اردو میں بات

خاص قسم کی اپنائیت تھی۔ کوئی بھی بندہ اس سے رکھائی یا غیریت برت ہی نہیں سکتا تھا۔ سوزن نے ٹھیک کہا تھا، آفاق قطعاً بے ضرر قسم کا بندہ تھا۔ پُر خلوص، سادہ اور انتہائی باتوئی..... مالا کو آفاق سے بات کر کے بہت ساری ایسی باتوں کا بھی پتا چلا تھا جو عام حالات میں عیسیٰ ہرگز اسے نہ بتاتا۔ اگرچہ وہ فطرتاً ہی گہرائی میں اترنے والی کھوجی قسم کی لڑکی نہیں تھی مگر پھر بھی ایک ہلکا سا تجسس نما مادہ ضرور اپنے اندر رکھتی تھی سو اسی تجسس کے تحت وہ مون کے رویے کی ابھی گہروں کے بارے میں بھی جاننے کے لیے تجسس تھی۔ اگرچہ آفاق نے اسے پرت پر پرت روپیہ رکھنے والی مون کے متعلق دلچسپی رکھنے سے منع کیا تھا مگر مالا کنویں میں سے مٹی نکالنے کو۔ بے تاب ضرور ہو گئی تھی۔

نی الوقت آفاق، مالا کی بات سن کر کورنش بجالایا تھا۔ مالا کی تعریف نے اسے یواریا کے سیوتی پھولوں کی طرح مہکا دیا تھا۔ وہ اپنی تعریف پر بہت خوش نظر آیا پھر اس نے اپنے لیڈر بیگ میں سے ایک چاکلیٹ نکال کر مالا کی طرف بڑھائی۔

”اسی بات پر منہ بیٹھا کریں۔“ آفاق خود کینڈی کار پیر پھاڑ کر منہ میں رکھ رہا تھا۔ وہ بچوں جیسی سرخوشی کے ساتھ دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔ ”کیا یہ تعریف تم نے دل سے کی ہے؟“ آفاق نے کسی خدشے کے تحت ذرا خوف زدہ ہو کر پوچھا تھا۔ مالا نے فوراً شد و مد سے سر ہلایا۔

”ہاں، دل سے۔“ اس کے جواب نے آفاق کو اور بھی خوش کر دیا تھا پھر اس نے اپنی رسٹ و ایج پر نگاہ ڈال کر مالا کو الٹ کر دیا تھا کہ وہ اترنے کے لیے تیار ہو جائے۔ مالا نے اپنا چھوٹا سا بیگ گود میں رکھ لیا تھا پھر آفاق کو مخاطب کر کے بولی۔

”کیا تم من ہائیم میں ہی رکو گے؟“ مالا سوچ رہی تھی شاید وہ اپنے بھی کسی کام کے سلسلے میں آیا ہوگا



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ پریم کوالٹی، ہارل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کر رہا تھا۔“ مالا نے بھی مسکرا کر وضاحت کی تھی تب علی عیسیٰ اسے آفاق کے متعلق بتانے لگا تھا۔

”پہلے یہ بولنے سے گھبراتا تھا، آفاق کہتا تھا اسے کبھی یہ اونگی بونگی زبان نہیں آسکتی مگر اب اچھا خاصا ایکسپرٹ ہو چکا ہے۔ عموماً راہ گیروں سے بھی علیک سلک کر لیتا ہے۔ اسے زبان و بیان پر عبور حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ ڈیج بولنے کا بھی ایک طریقہ سمجھ میں آیا ہے۔“ عیسیٰ اسے تفصیلاً بتاتا اپنی لاڈلی benz تک لے آیا تھا۔ اس کا سامان رکھ کر وہ مالا کے لیے فرنٹ ڈور کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں، تم بھی روزمرہ کے جملوں پر غور کیا کرو، ٹی وی دیکھتے ہوئے، میوزک سنتے ہوئے، شاپنگ کرتے ہوئے، مجھے امید ہے تم بھی جلد ہی یہاں کی زبان سیکھ جاؤ گی۔ جہاں رہنا ہو، وہاں کی زبان ضرور سیکھنی چاہیے۔“ عیسیٰ اسے نرمی سے بتا رہا تھا۔ تب مالا نے قدرے خشکی سے جتایا تھا۔

”نہ سلام دعا، نہ حال نہ احوال پوچھا آتے ساتھ گچ گچ سیکھنے پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ مجھے نہیں آسکتی یہ فضول قسم کی زبان۔“ مالا کے بے تکلفی بھرے روٹھے، روٹھے ناراض لہجے کو ملاحظہ کر کے عیسیٰ بے ساختہ حیرت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ گردن موڑے بڑے ہی شگفتہ تاثرات کے ساتھ مالا کے پھولے، پھولے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور ہنسی تھی کہ اس کے لبوں پر پھول مہکائے جا رہی تھی۔ اسے۔۔۔ بے ساختہ ہنستے دیکھ کر مالا کا منہ کچھ اور پھول گیا تھا۔

”اس طرح کیوں ہنس رہے ہیں؟ میرے منہ پر کیا لطیفہ لکھا ہے؟“ مالا کچھ چڑ کر خشکی سے بولی تھی حالانکہ یہ خشکی قطعاً مصنوعی تھی۔ اسے علی عیسیٰ کو ہنستا دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا اور پھر وہ خاص الخاص مالا کے لیے ہی تو ہنس رہا تھا۔ اسی کی باتوں کو انجوائے کرتا مسکرا رہا تھا۔

”ایک مرتبہ پھر اسی طرح بولوناں کتنی کیوٹ لگ رہی ہوتی، روٹھی روٹھی سی۔“ عیسیٰ نے بڑی محبت سے اصرار کیا تھا۔ مالا بجائے کچھ بولنے کے۔۔۔ بے ساختہ ہنس پڑی اور اسے مسکراتا دیکھ کر عیسیٰ بھی ہنسنے لگا تھا پھر کچھ دیر مزید بلاوجہ ہنسنے کے بعد عیسیٰ نے کس قدر حسرت سے کہا تھا بلکہ اتنے عرصے کے دوران پہلی مرتبہ ایک عجیب بات کہی تھی۔

”پتا ہے، میری بڑی خواہش تھی مون کے ساتھ میری اچھی فرینڈ شپ ہو سکے۔ وہ ڈھیروں کے حساب سے ہنستی رہے۔ مجھ سے فرمائشیں کرے، کبھی روٹھ جائے، کبھی مان جائے، کبھی ہنسنے، کبھی روئے، ہم مل کر آؤنگ پر پورا جرمنی گھومیں مگر میری یہ خواہش کبھی نہیں پوری ہو سکی تھی، مجھے فطری طور پر ایک عجیب بہن ملی ہے جو غیر معمولی ذہن رکھنے والی، بہت عجیب سی لڑکی تھی، آدم بیزار قسم کی۔ جب تک ماما نہیں سب ٹھیک رہا مگر ماما کے چلے جانے کے بعد اس کی شخصیت میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ وہ مجھ سے اور پاپا سے ہمیشہ دور رہی تھی مگر ماما کی وفات کے بعد گویا صدیوں کی دوریاں درمیان میں حائل ہو گئیں۔ وہ پھر کبھی ہمارے قریب آ ہی نہ سکی۔“ عیسیٰ کا حسرت زدہ لہجہ گہرے کرب میں ڈوب گیا تھا۔ جانے کس جذباتی لمحے اس نے مالا سے مون کا رویہ شیئر کر لیا تھا ورنہ وہ بہت گہرا سا بندہ تھا۔ اتنی جلدی کھلنے والا نہیں تھا اور اسے شاید اپنے دکھوں کی تشبیہ بھی پسند نہیں تھی حالانکہ انہوں نے دل کی باتیں کرنا اپنا نیت کو مزید بڑھا دیتا ہے مگر عیسیٰ کے اس معاملے میں اصول کچھ اور قسم کے تھے۔ وہ سمجھتا تھا جو پریشانی، دکھ یا تکلیف اس کا اکیلا وجود سہہ سکتا ہے پھر وہ اپنے پیاروں کو کیونکر اس تکلیف میں حصے دار بنائے۔ اس نے ہمیشہ اپنی تکلیف، دکھ یا کسی بھی قسم کی پریشانی کو خود اپنے تک ہی محدود رکھا تھا اور وہ اپنے اس اصول پر بہت مطمئن بھی تھا۔۔۔



فی الحال وہ مزید مون کے بارے میں گفتگو سے اجتناب کرتے ہوئے ذرا ہلکے پھلکے خوشگوار لہجے میں کہہ رہا تھا۔ دراصل اسے فوری طور پر احساس ہوا تھا کہ اس نے مون کا ذکر بالکل بھی ٹھیک وقت پر نہیں چھیڑا تھا۔ یہ معاملہ کچھ ایسا تھا کہ مالا اس پر سوال بھی اٹھا سکتی تھی مگر عیسیٰ فی الوقت اس کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا سو گفتگو بدلتے ہوئے ذرا چھیڑنے والے انداز میں بولا۔

”تو جناب! اب بتائیں کیا حال احوال ہے آپ جناب کا۔ بڑے عرصے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ شاید تین یا چار سو سال بعد..... اس دوران ایک مرتبہ بھی خط کتابت پر رابطہ نہیں ہو سکا۔ نہ آپ نے کوئی ٹیلی فون کیا، نہ مجھے فون کال کرنے کی فرصت مل سکی۔“ علی عیسیٰ کی کھلکھلاتی مسکراہٹ نے مالا کی ہنسی کے سرگامی میں بکھیر دیے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر تک ہنستی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں شفاف پانی کی ننھی مٹی بوندوں سے لبالب بھر گئیں۔

”آپ بھی کمال کے بندے ہیں۔“ مالا بہ مشکل ہنسی روک کر بول سکی تھی۔

”کہاں مجھ میں کمال رکھا ہے..... ایک پردہ سا ڈال رکھا ہے۔“ عیسیٰ کچھ شاعرانہ موڈ بنا کر بولا تھا۔

”تو کیا شاعری سے بھی شغف ہے؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔

”جی، کیوں نہیں آپ کچھ سننا پسند فرمائیں گی؟“ علی عیسیٰ گویا نہال ہو گیا تھا۔ اسے مالا کے چھوٹے، چھوٹے سوال بہت پسند تھے۔ اسے مالا کا بولنا، ہنسا اور ہنسنے پھنسنے آنکھوں میں پانی بھر آنا بہت پسند تھا۔ علی عیسیٰ کو لگتا تھا، پاپا اس کے لیے پاکستان سے دنیا کا حسین ترین تحفہ اٹھالائے تھے اگرچہ وہ خوب صورت تھی مگر ایسی حسین بھی نہ تھی کہ عیسیٰ دیوانہ ہوا تھا۔ یہ تو اس کے چہرے کی ملاحظہ، سادگی اور

معصومیت تھی جس نے پہلی نگاہ میں علی عیسیٰ کو اپنا دل لہجہ کر لیا تھا اور نہ بوار یا کی عورتوں سے بڑھ کر پورے خطے میں کوئی حسین عورت نہ تھی۔ صحت مند، دلنشین، حسین اور انتہائی ہنس مکھ.....

”یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ یوں فضا مہکی کے بدلا میرے ہم راز کا رنگ!“

علی عیسیٰ نے فوراً ہی اس کی فرمائش پوری کر دی تھی۔

”سایہ چشم میں حیراں رخ روشن کا جمال سرخی لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ“

من ہائیم کے سارے تالابوں پر سفید مرغابیاں اتر آئی تھیں۔ سنہری پریوں نے من ہائیم کے دیوتا کی پچارن کو دیکھ کر رقص کرنا شروع کر دیا تھا۔ تتلیاں رنگ بدل رہی تھیں، اکسوں کے موٹی بکھر رہے تھے یا قوت کی بوندیں گر رہی تھیں۔

”بے پیے ہوں اگر لطف کرو آخر شب شیشہ سے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ“

علی عیسیٰ کی انگلیاں اسٹیرنگ و جیل پر تھم رہی تھیں۔ وہ بن پے اک نٹے، اک سرور میں تھا۔ جیسے بلوریں فجانوں میں انگور کا رس قطرہ قطرہ، بوند بوند گر رہا تھا۔

”اک سخن اور کہ پھر رنگِ تکلم تیرا حرف سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ“

فضا نے سانس روک لی تھی اور ہونہن موس کے جنگل میں مورنیوں نے باجماعت عشقیہ سلام پڑھے تھے۔ اس کا دل diskothek جرمن پب کی طرح کا ایک حیرت کدہ تھا جس میں دل کے سازوں کی موسیقی برابر بجتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی نہ رکنے کے لیے، کبھی نہ تھمنے کے لیے۔ یہ قرین (سوزج اور چاند) کے طنز کی خوشی میں سنگیت چھیڑے گئے تھے۔ یہ دلوں کے قلب (کنویں) میں محبت کے معجزاتی چشمے پھوٹ پڑنے کے اعزاز میں سر بکھر رہے تھے اور نمیس (سمندر) میں طوفانی گرم

جوش لہریں اُتر رہی تھیں۔ یہ فردوس کے جلوے تھے جو اب زمین کو معتبر کر رہے تھے۔

benz کی بھینٹی مہک والی فضا کا ظلم بھی بالآخر ٹوٹ گیا تھا۔ علی عیسیٰ کے خاموش ہونٹ اس ظلم کو پاش پاش کر چکے تھے۔ مالا کو لگا وہ کسی خواب کی میٹھی نیند سے اچانک بیدار کر دی گئی ہے۔ اس نے کچی نیند سے بھری گلابی آنکھوں سے علی عیسیٰ کا مسکراتا چہرہ دیکھا تھا۔

”کیسی لگی یہ مدہوش کن غزل؟“ علی عیسیٰ نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”میں حیران ہوں اور کچھ محرزہ بھی۔“ اس نے بنا جھجک کے پہلی ہی خواب آگئیں کیفیت میں کہا۔

”کس لیے؟“ عیسیٰ کو اچھنچا ہوا۔

”فیض کی غزل کے لیے۔“ مالا مسکرائی تھی۔

عیسیٰ نے گہری سانس خارج کی۔

”کیا مجھے فیض کی غزل یاد نہیں ہو سکتی؟“ اس نے آنکھیں میچ کر پوچھا۔

”امید تو نہیں تھی مگر.....“ مالا نے نچلا لب دانتوں میں دبا کر شرارتی لہجے میں کہا۔

”مگر.....؟“ عیسیٰ نے بھویں اچکائیں۔

اگرچہ وہ اس کی شرارت کو سمجھ رہا تھا تاہم جان بوجھ کر اسے بولنے کے لیے اکسانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”مگر آپ نے حیران کر دیا۔“ مالا کے ساتھ عیسیٰ بھی گہری سانس لے کر مسکرا دیا پھر سامنے اشارہ کر کے بولا۔

”میڈم مالا، گھر آچکا ہے۔“ اس نے احتیاط سے موڑ کاٹ..... کر انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ benz کو کیراج میں لاکھڑا کیا تھا اور مالا اپنے گھر کی جنت میں پہنچ کر گویا شانت ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”مالے! تم تو مجھے بھول ہی گئیں۔“ یہ چاچو کی آواز تھی بالکل ڈیڈی سے مشابہ آج کتنے عرصے بعد

کسی نے اسے ڈیڈی کے سے انداز میں مالے کہہ کر پکارا تھا۔ شاید چاچو نے تازہ ترین ڈیڈی کے منہ سے مالے سنا تھا پھر اس کے خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔

ڈیڈی، بندیا اور مگی کی کتنی ہی فون کالز آئی تھیں۔ اس کے بوار یا سے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی ڈیڈی کا فون آیا تھا۔ وہ اپنی مالے کے لیے شدید ادا اس تھے اور مالا نے سب سے پہلے پاکستان اپنے گھر والوں سے فون پر بات کی تھی اور اب کھانے کی میز پر چاچو کی بے قراریاں ملاحظہ کر رہی تھی۔ عیسیٰ کو بھی چاچو کا طرزِ مخاطب یعنی ”مالے“ بہت پسند آیا تھا اور وہ ”عیسیٰ میٹھی نظر سے دیکھا دھیرے دھیرے زبرد لب بڑایا تھا۔

”مالے۔“ اس کی بڑبڑاہٹ اتنی اونچی ضرور تھی کہ برابر بیٹھی مالا اور اس کے دوسری طرف سربراہی کرسی پر بیٹھے چاچو بھی سن لیتے۔ جہاں مالا اس شہد آگئیں طرزِ مخاطب پر گڑبڑائی تھی وہیں چاچو نے علی عیسیٰ کی گت بنا دی تھی۔

”آلام فرتر کے مصنف گوسے کی شارلوت کے عاشق! مالے صرف ہماری ہے۔ تم اپنے لیے کوئی اور رنگ نیم سوچ لو۔“ جس طرح چاچو نے اس کی بڑبڑاہٹ سن کر آڑے ہاتھوں لینے کے بعد بڑا بیٹھا طنز کیا تھا وہیں مالا کو علی عیسیٰ کی ایک پرانی بات یاد آئی تھی جس کو بتاتے ہوئے علی عیسیٰ نے کہا تھا کہ

ہم دونوں باپ بیٹا خاصے منہ پھٹ ہیں اور مالا کو یقین تو پہلے بھی آچکا تھا اب کچھ اور یقین ہو چلا تھا۔ مالا جہاں چاچو کی لطیف گفتگو پر جھینپ رہی تھی وہیں علی عیسیٰ نے زور دار قسم کا قہقہہ لگایا تھا۔

”آں..... ہاں، آپ غلطی کر رہے ہیں پاپا۔ میں گوسے کی شارلوت کا عاشق نہیں جسٹ ایک فین ہوں اور ویسے بھی گوسے جیسا دل پھینک نہیں ہوں۔“ وہ احتجاجاً چیخا تھا۔

”جو بھی ہو، ایک بات یاد رکھنا مالے! یہ صرف ہمارا حق ہے۔“ حسیب چاچو اسے سخت قسم کی



چڑچڑاہٹ میں مبتلا کر رہے تھے اور وہ بری طرح چڑ بھی رہا تھا۔

”آپ بھی یاد رکھیے، مالے صرف میری ہے۔“ دونوں باپ بیٹا حد سے زیادہ جذباتی تھے۔ اب بھی علی عیسیٰ نے جذباتی پن کی انتہا کر دی تھی۔ مالا اس نوک جھوک سے محظوظ کیا ہوئی الٹا شرمندہ ہوئے جا رہی تھی۔ چاچو کی موجودگی میں علی عیسیٰ کے بے باک جملے اسے بے حد شرم دلا رہے تھے۔

”اچھا، اچھا..... حوصلہ کرو۔“ اب جان بوجھ کے چاچو اسے پچکار رہے تھے۔ اسی دل فریب نوک جھوک اور خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا تھا پھر نئی کافی بنا لائی تھیں کافی کا طویل تر دور چلا تھا۔ ان دونوں باپ، بیٹے نے کافی کے بعد گرین ٹی بھی پی تھی پھر آخری مرتبہ اٹھنے سے پہلے قبوہ بھی مالا سے بنا کر پیا۔ اس دوران انہوں نے دنیا جہان کی باتیں کر لی تھیں۔ آفیشل گفتگو کے علاوہ گھریلو، سیاسی، سماجی ہر قسم کا موضوع زیر بحث لائے تھے۔ گروسی کے گھر سے لے کر یہاں تک مالا سے بھی چیدہ، چیدہ باتیں پوچھی تھیں پھر عیسیٰ نے چاچو کو دوا کھلائی اور انہیں کمرے تک چھوڑنے چلا گیا۔

مالا نے اگلے بہت سارے دنوں میں بہت سی باتیں نوٹ کی تھیں۔ سب سے پہلے یہ کہ عیسیٰ کو چاچو سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ ان کا خیال اپنے ہر ضروری کام کو ادھورا چھوڑ کر بھی رکھتا تھا۔ چاچو کی بہترین خوراک، جوسز، دودھ، فروٹس وہ ان کا ڈائنٹ چارٹ بنا کر گھر سے نکلتا۔ کس وقت انہیں جوس دینا ہے، دودھ دینا ہے یا ٹھوس غذا دینی ہے۔ اس طرح ان کی صبح، دوپہر اور شام والی دوا میں بھی الگ، الگ رکھ کے جاتا تھا بعد میں نئی وقت پر سب کچھ ایک روٹین کے مطابق دے دیتیں مگر اب مالا نے یہ ساری ذمے داری غیر محسوس طریقے سے سنبھال لی تھی۔ وہ کوکنگ سے لے کر چاچو کا خیال

رکھنے تک سب چھوٹے بڑے کام خود کرتی تھی۔ چاچو نے کہا تھا اب وہ اس گھر کی ہاؤس فراڈ ہے۔ یہ گھر مالا کا ہے سوائے اپنے گھر اور گھروالوں کا خود ہی خیال رکھنا تھا۔ نئی اب بھی صفائی ستھرائی کے لیے آتی تھی مگر اس کا کام بہت مختصر ہو گیا تھا۔ علی عیسیٰ کے کپڑوں سے لے کر چاچو کا لباس تیار کرنے تک مالا بہت دل جمعی سے دھیان رکھتی، بڑی محبت سے کپڑے پریس کرتی، الماریوں میں لٹکانی حالانکہ چاچو اور علی عیسیٰ منع بھی کرتے تھے مگر مالا کو یہ مصروفیت دل و جان سے بے حد پسند تھی..... اور جہاں اس کے لباس کی بات آتی تھی وہیں عیسیٰ ہمیشہ خود اس کے لیے کپڑے منتخب کرتا۔ اسے کون سا لباس سوٹ کرتا تھا، اسے کیسے کپڑے پہننے چاہیے اور یہاں آج کل کیسا فیشن چل رہا تھا! عیسیٰ کی انفارمیشن اس حوالے سے بہت اب ڈیٹ تھیں۔ وہ اس کے لیے خوب شاپنگ کرتا، اکثر اسے آؤٹنگ پر لے جاتا۔ بعض ایسی جگہوں پر جہاں ہنگامے، شور کی وجہ سے وہ خود جانا پسند نہیں کرتا تھا مگر اسے لگتا تھا مالا ہنگاموں اور شور و غل کو بہت پسند کرتی ہے حالانکہ وہ پہلے ایسی نہیں تھی مگر یہاں آ کر اکثر گھر کی خاموشی سے گھبرا جاتی تھی۔ اپنے گھر میں اس کی چھوٹی بہن بندیا اور شامی بہت ہنگامہ بجائے رکھتے تھے۔ ذیشان اور ذی شاہ مزاج مختلف تھے مگر بندیا اور شامی کی موجودگی میں ان کے گھر ہمہ وقت ہنگامہ مچا رہتا تھا۔ سو یہاں کے سنانے اکثر اسے پریشان کر دیتے تھے۔ خصوصاً جب چاچو آرام کر رہے ہوتے تھے تب نئی اخبار پڑھتی پانی وی دیکھتی۔ مالا اس کی بات سمجھ نہیں سکتی تھی اور رات تک خاموش رہ، رہ کر اس پر اکتاہٹ سوار ہو جاتی۔ گھر میں اتنا کام نہیں ہوتا تھا۔ بس پاکستان فون کالز کرتی یا بے مقصد ٹی وی کو گھورے جاتی۔ ہاں، جب عیسیٰ گھر آ جاتا تھا تب گویا زندگی پھر سے دھڑک جاتی تھی۔

وہ اسے کئی دفعہ کلیمز اور کنسرٹس، فیشن شوز بھی دکھانے لایا تھا۔ ایک مرتبہ سینما میں مووی بھی دیکھی تھی۔ جسے سمجھنے کے لیے اسے پورا ایک سال بھی لگ جاتا تب بھی سمجھ نہ آتی۔ وہ یہاں کی مشہور جھیلوں کی سیر کر کے بھی آئی تھی۔ مختلف پارکس اسٹورز، شاہراہیں، گارڈنز چھان مارنے کے بعد ایک مرتبہ پھر زندگی پر جمود طاری ہونے لگا تھا۔ محض اس وقت تک، محض اتنی ہی دیر تک جب مردانہ بوٹوں کی دھمک سنائی نہ دیتی۔ عیسیٰ کے آتے ہی زندگی کے رنگ بدل جاتے تھے۔ مالا کا دل۔ گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ چلتا تھا۔ جہاں گھڑی آخت، نوٹن کے ہند سے پہ آتی اس کا دل پتکھ لگا کر اڑنے لگتا تھا۔ وہ سنہری ہندسوں پر نگاہ جما کر بیٹھ جاتی تھی۔

وہ ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے وقت سے پہلے ہی گھر پہنچ جاتا تھا اور مالا کا بنا میک اپ، بنا ہار سنکار والا سادہ چہرہ اس کی نگاہوں میں عکس بنانے لگتا۔ کچھ ایسے ہی محبت سے گندھے رشتے میں وہ دونوں ہمیشہ کے لیے بندھ گئے تھے۔

علی عیسیٰ نے مالا کا ایڈمیشن ایک چھوٹے انسٹی ٹیوٹ میں کروا دیا تھا۔ اسے مصروف رہنے کے لیے ایک اور جواز مل گیا تھا۔ اب وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر انسٹی ٹیوٹ چلی جاتی تھی حالانکہ جرمن زبان سیکھنا کم از کم مالا کے لیے آسان نہیں تھا۔ اسے پہلی کلاس میں پہلے جرمنی کے تعارف پر رونا آ گیا تھا۔ وہ اگلے دس دن تک بھی یہ ملک جرمنی ہے کو صحیح جرمن تلفظ کے ساتھ ادا نہیں کر سکتی تھی۔

”یہ ملک جرمنی ہے اور میں پاکستانی ہوں۔“ ٹیچر فرولائن ایکس کی ہزار مرتبہ بتائی ایک لائن کو بھی مالا ٹھیک سے بول نہیں پاتی تھی تب اسے رونا آ جاتا۔ عیسیٰ کہتا تھا وہ سیکھنا چاہے تو سیکھ سکتی ہے مگر مالا کو یہ کام انتہائی مشکل لگتا تھا۔ وہ گھر آ کر نینی کے ساتھ ایک ایک لائن کی سیکڑوں مرتبہ مشق کرتی تھی۔

**خوابوں جیسی باتیں**

بھولی لڑکی

مت اس خواب کے پیچھے بھاگو  
پتھر بن کے رہ جاؤ گی  
تیز بہت ہے وقت کا دریا  
تم بھی اس میں بہہ جاؤ گی  
نشر جیسی یہ رسوائی  
بولو، کیسے سہہ پاؤ گی  
کیا بچوں جیسی باتوں سے  
تم سب کو بہلا سکتی ہو؟  
کیا تم اپنے من کی منطق  
دنیا کو سمجھا سکتی ہو؟  
خوابوں جیسی باتیں کر کے  
کیا تعبیریں پاسکتی ہو؟  
جس گھر میں پروان چڑھیں تم  
اس کو چھوڑ کر آ سکتی ہو؟  
ایسی باتیں ناممکن ہیں  
تم اپنی تنہائی میں  
ہجر کے گیت ہی گاسکتی ہو

از: سیمار خسار دا، کراچی

یہ حقیقتا بہت مشکل مرحلہ تھا مگر مالا کو یہ سب کرنا ہی تھی۔ اپنے لیے نہیں..... محض علی عیسیٰ کے لیے۔ یہاں قریب ہی ایک ٹائز شو لے بھی تھا یعنی ڈانس سکھانے والا اسکول۔ مالا کے گھر سے کچھ فاصلے پر ہی تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ماؤں کے ساتھ آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ مالا کو بچوں کے ساتھ خصوصی لگاؤ تھا مگر وہ ان بچوں کو مخاطب نہیں کر سکتی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ آتے اور جاتے



ہوئے اس کی واحد مصروفیت بس یہی تھی۔

شروع میں علی عیسیٰ اسے خود چھوڑنے اور لینے آتا تھا مگر اب وہ خود ہی پیدل آتی جاتی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ چونکہ قریب ہی تھا۔ پہلے کچھ دن نئی ساتھ آجاتی تھی مگر اب مالا... کو گھر کے راستے ازبر ہو چکے تھے۔

اس کی عادت تھی، وہ جس چیز کو سیکھتی، جس لفظ کو یاد کر لیتی اسے ڈائری میں لکھ لیتی تھی اور واپس آنے تک اسے ذہن میں ڈہرائی رہتی۔ مالا نے ابتدائی جملوں کے بعد ایک خاص قسم کا جملہ سیکھا تھا۔ "اش لیے دن"۔ وہ اس جملے کی کئی مرتبہ مشق کرتی تھی تاکہ اسے بھولے نہیں۔ اسے ڈیج میں یہ لائن بولنا بہت پسند تھا۔ جس کے معنی تھے میں تم سے پیار کرتا ہوں یا تم سے پیار کرتی ہوں۔ مالا نے سوچ رکھا تھا جس دن عیسیٰ کا ہاتھ ڈے ہوگا وہ اسے کسی انوکھے طریقے سے دس کرے گی۔ وہ عیسیٰ کی سالگرہ کے دن کا شدت سے انتظار کر رہی تھی پھر یہ دن پورے تین ہفتوں بعد بالآخر آ ہی گیا تھا۔

اس نے اور حبیب چاچو نے پورا دن چکے، چیکے تیاری کرنے میں گزار دیا تھا۔ وہ دونوں عیسیٰ کو سر پر اتر دینا چاہتے تھے۔ چاچو کی خواہش تھی کہ اس موقع پر مون بھی شامل ہو مگر مالا کو امید نہیں تھی کہ مون ان کی خوشیوں میں شریک ہوگی مگر وہ چاچو کو روکنا نہیں چاہتی تھی۔ چاچو نے خوشی، خوشی مون کو فون کال کی تھی پھر جانے اس نے کیا کہا تھا جو چاچو بے ساختہ خوش ہو گئے تھے۔ ان کی خوشی محسوس کر کے مالا کو اندازہ ہو گیا تھا مون نے یقیناً آنے کی ہامی بھر لی ہے۔ وہ اگرچہ حیران تھی کہ مون نے کیسے آنے کی ہامی بھر لی؟ مگر وہ اپنی حیرت چاچو پر واضح نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ بھی حقیقت تھی کہ مون کے آنے کا سن کر کہیں اندر اس کے دل میں خوف پنپنے لگا تھا لیکن وہ اپنے اس خوف کو بھی چاچو پر منکشف

کرنا نہیں چاہتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ بھیکتی ہوئی مہکی ہوئی یہ انوکھی شام ان کے خوب صورت گھر میں اتر آئی تھی۔ مالا نے آج تانتے کی دی ہوئی خوب صورت روک پہنی تھی۔ آج اس نے خوب دل سے میک اپ بھی کر رکھا تھا پھر چاچو نے اس کی خوب تعریف بھی کی۔ وہ آج ایک مکمل ہاؤس فراؤ لگ رہی تھی۔ نئی کے تعریفی جملے اور پھر علی عیسیٰ کی میٹھی نگاہوں نے مالا کو بتا دیا تھا کہ آج کی محنت و وصول ہو گئی ہے۔

کچھ دیر بعد مون بھی چلی آئی۔ ریشمی سلک کا لمبا فرائک پہنے، وہ نزاکت، وہی حسن، وہی دلکشی کے ساتھ غرور سے تتی گردن، اس کے بلونٹ... (سنہرے بال) آج بھی کھلے تھے۔ نیچے سے کھلے اور اوپر گینٹوں سے سجی پونی میں جکڑے۔ سر پہ تاج نما کلب بالوں میں کھسکا ہوا تھا۔ یہ کراؤن اس کے غرور کو کچھ اور واضح کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں آج بھی جھکی تھیں۔ عجیب تر آنکھیں اور حسین تر آنکھیں۔ ہمیشہ کی طرح مالا کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

آج علی عیسیٰ بھی بہت خوش تھا گویا اس کی فیملی آج کی شام مکمل ہو گئی تھی۔ یہ چھوٹا سا گھریلو فنکشن تھا۔ ایک کتنے کے بعد مالا اور نئی ڈنر سرور کر رہی تھیں جب ایک اجنبی تھنٹی نے ان سب کو چونکا دیا تھا۔ علی عیسیٰ بڑی ترنگ کے عالم میں گیٹ تنگ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہو گئی تھی۔ عیسیٰ کے ہاتھ میں ایک خوب صورت گفٹ پیک تھا۔ اس نے مالا کی طرف وہ پیکٹ بڑھا دیا۔ مالا کچھ حیران اور کچھ متوحش ہو رہی تھی بھلا عیسیٰ نے اسے پیکٹ کیوں پکڑا یا تھا؟ اب سب کی نگاہیں خود پر جمی دیکھ کر مالا کو گفٹ پیک کھولنا پڑا تھا۔ پیکٹ میں سے ایک نقلی گینٹوں کا بریسلیٹ نکلا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چمکنی خوب صورت سلپ بھی تھی۔ خالصتاً اردو میں لکھی گئی۔ "پیاری میڈیشن مالا! تمہارے لیے حقیر سا

گفٹ۔ تم بوار پیا آئیں اور چلی گئیں مگر تمہاری یادیں کبھی مٹ نہ پائیں گی۔" مالا سے سلپ کے نیچے لکھا نام پڑھا نہ گیا تھا کیونکہ سلپ عیسیٰ نے محتاط سے انداز میں بے ساختہ مالا کے ہاتھ سے اچک لی تھی۔ مالا کو لگا اس کا ذہن ایک دم گول، گول گھومنے لگا ہے۔

"کیا کچھ غلط ہونے والا تھا؟" مالا کا چڑیا جتنا دل سہم، سہم گیا۔ ایک خوف کی بھیانک لہر تھی جس نے مالا کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔

چمکنی خوب صورت سلپ اسے کسی اژدھے کے مانند لگ رہی تھی اور مون کی نگاہوں میں شارک جیسی شکاری تیز لپک اس کے وجود میں آر پار ہو رہی تھی۔

"کیا ہونے والا تھا؟ اور کیوں ہونے والا تھا؟" کیا ضروری تھا بوار پیا کے چھوٹے سے قصبے میں رہنے والا کوئی بھی فرد اسے پارسل بھیجتا؟ ابھی چند دن پہلے ہی تو وہ بوار پیا سے آئی تھی پھر کسے اس کی یاد اس قدر شدت سے آئی، جس نے گھر کے پتے پر گفٹ بھیج دیا تھا اور پھر اس چمکنی بھیانک سلپ پر لکھے الفاظ "تم بوار پیا آئیں اور چلی گئیں مگر تمہاری یادیں کبھی مٹ نہ پائیں گی۔" مالا کی گویا سانسیں رکنے لگی تھیں۔ ان الفاظ کے نیچے بھلا کس کا نام ہو سکتا تھا؟ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھا گیا۔

"سوزن؟ تانتے؟ گردوی مگر ان لوگوں کو گفٹ بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر بھلا پارسل بھیجنے والا کون تھا؟ جس کی طرف مالا کی چھٹی حس اشارہ کر رہی تھی وہ اس کے بارے میں کم از کم اس کنڈیشن میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ آفاق؟" اس کا دل خوف کے عالم میں پھڑ پھڑانے لگا اور جسم سے گویا جان نکلنے کے قریب تھی۔ یہ نام اس کے لیے اب اجنبی نہیں تھا۔ وہ آفاق کو اتنا جان گئی تھی جتنا کسی بھی اجنبی کو جاننا ضروری تھا مگر سوال تو یہ تھا کہ آفاق نے اسے تحفہ کیوں بھیجا۔ آفاق کی بھلا ایسی جرات کیوں ہوئی؟ اس کا آفاق سے رشتہ ہی کیا تھا جو وہ اتنی دیدہ دلیری سے اسے گفٹ

بھیج رہا تھا۔

دل چاہ رہا تھا وہ نقلی گینٹوں سے سجا بریسلیٹ اٹھا کر اس چرب زبان، شاطر لڑکے کے منہ پر مار آئے اور ایسی بے نقط سا کر آئے کہ اپنی ساری تیزی طراری اور چرب زبانی بھول جائے۔ اس کے دل میں آفاق کے خلاف کچھ ایسا ہی غصہ اور نفرت ابھر رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کوئی تیزاب سے بھری بوتل ہو تو مالا نتائج کی پروا کے بغیر اس کے منہ پر الٹ آئے۔ آفاق نے مالا کو تحفہ بھیج کر کچھ ایسا ہی گناہ تو کیا تھا حالانکہ یورپ میں تحائف کے لین دین کو بہت اچھا سمجھا جاتا تھا اور گفٹ دے کر یا لے کر کوئی غلط قسم کا خیال یا وسوسہ بھی دل میں نہیں پہنچتا تھا مگر مالا جس معاشرے سے آئی تھی جس وطن سے تعلق رکھتی تھی یا جس سوسائٹی سے اٹھ کر آئی تھی وہاں انجان لوگوں کی طرف سے ملنے والے تحفے کیسی، کیسی قیامت ڈھا دیتے ہیں۔ وہ گفٹ لینے اور دینے کے معاملے میں بہت محتاط تھی۔ اس کی کوئی غیر ضروری سہیلیاں بھی نہیں تھیں۔ یہاں پر بھی وہ صرف سوزن کے ساتھ دوستانہ جوڑنے کی خواہش مند تھی مگر یہ آفاق نہ جانے بیچ میں کہاں سے فیک آیا تھا۔ محض چار گھنٹے کے سفر کا فائدہ اٹھا کر اپنی چرب زبانی کا مظاہرہ کر کے مالا کی ذہنی سطح پر مثبت تاثر چھوڑنے کے بعد اب جانے کیسے تعلقات بحال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو شرارے پھوٹنے لگے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ آفاق کا منہ طمانچوں سے رنگ دے مگر وہ اپنے کسی بھی ارادے کو پائیہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اس وقت صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ مالا کو اپنا آپ انہجائی کتر لگ رہا تھا۔ بھلا اس کے بارے میں حبیب چاچو کیا سوچتے؟ علی عیسیٰ کے دل میں کس قسم کے خیال آسکتے تھے؟ وہ ایسی کردار کی ہلکی یا مردوں سے فری ہونے والی تھی جو چار پارچے گھنٹے کے سفر میں ایک غیر مرد سے دوستانہ جوڑ چکی تھی جس



نے چند ہی دن بعد... تجدید تعلقات کے لیے پہلا تحفہ بھیج دیا تھا؟ مالا کا شرم کے مارے برا حال تھا۔ ایک لمحے میں جانے اس پر کیسی، کیسی قیامتیں گزر گئی تھیں۔ شاید سے بدلنے والا تھا اور اس پر مہربان ہوئی تقدیر اپنا پانسہ الٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی مکھیں ایسی طاقت ور نہیں تھیں جو بدلتے سے کی نبض جان جاتیں۔ زندگی مالا ذوالفقار پر شاید تنگ ہونے والی تھی مگر جانے کیسے اس کی ساعتوں نے کچھ ایسا سا جو اس کی سوچوں سے قطعاً الگ اور انوکھا تھا۔ وہ حیرت سے منجمد ہوتی حسیب چاچو کو نگر نگر دیکھنے لگی۔ حسیب چاچو یہ کیا بول رہے تھے؟ یا مالا کے وجود میں نئی روح پھونک رہے تھے یا سانس کھینچ رہے تھے۔

”تمہارا اس شہر میں کون سا ایسا دوست ہے جس نے تمہیں برتھ ڈے گفٹ بھیج دیا؟“ چاچو بہت حیرانی کے عالم میں علی عیسیٰ سے مخاطب تھے اور مالا کو لگا تھا اس کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے۔ جانے اب علی عیسیٰ کون سا جواب دینے والا تھا؟ مالا ابھی تک سن کھڑی تھی۔

”یہ عورتوں والا بریلیٹ میرے لیے نہیں آیا۔“ علی عیسیٰ نے سلف ایک مرتبہ پھر مالا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر؟“ چاچو حیران ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر اچھٹھا تھا۔

”یہ گفٹ مالا کے لیے آیا ہے شاید سوزن نے بھیجا ہے۔ اپنا نام لکھنا بھول گئی۔“ علی عیسیٰ اب وضاحت کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے کی طرح نارمل تھا۔ وہاں برہمی کے آثار نہیں تھے۔ علی عیسیٰ کا جواب سن کر جہاں چاچو اور مالا کے اندر سکون کی لہریں اٹھی تھیں وہیں مالا نے غور کیا تھا کہ مون پہلو بدل کر رہ گئی ہے۔ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات سمجھنا آسان نہیں تھا۔ عموماً مون کا چہرہ سپاٹ ہوتا تھا ہر قسم

کے تاثرات سے عاری۔

مالا کو حیرانی اس وقت زیادہ ہوتی تھی جب مون، چاچو اور عیسیٰ کو جو بھی کہتی وہ بلاچوں و چرا مان جاتے۔ اکثر وہ دعویٰ کرتے کہ اب مون آئی تو اسے زبردستی روک لیں گے مگر جب اس سے روبرو بات کی جاتی تو وہ ان دونوں باپ بیٹے پر کوئی ایسا سحر پھونکتی تھی کہ دونوں ایسے بے بس ہو جاتے گویا کبھی اس کے سامنے بول ہی نہ پائیں گے۔ نہ بولنے کی جرأت کر سکیں گے۔ نہ اپنی بات کبھی مون سے منوائیں گے۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی بہت سارے دن چاچو ایسے ہی بے بس رہتے۔

مون کی ایک اضافی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ باپ اور بھائی سے جھگڑا نہیں کرتی تھی۔ جتنی بھی نہ چلائی تھی۔ نہ غصے کا اظہار کرتی تھی۔ شاید مالا کے آنے سے پہلے وہ ایسا بھی کرتی رہی ہو مگر فی الحال ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ، روک ٹوک، دھمکی، ملامت، غصہ اور بدزبانی کے بجائے لفظوں کے تیر پھینکتی تھی وہ بھی شہد میں ڈبو ڈبو کر۔ ویسے بھی جو شیرینی سے گھائل ہونے والے تھے انہیں زہر بھلا کیا دینا تھا۔ اسے مقابل کو تنگ، عاجز، لاچار... اور زچ کرنا بخوبی آتا تھا۔ وہ کم بولتی تھی دوسروں کی طرف کم دیکھتی تھی عموماً لوگوں سے ملتی بھی نہیں تھی۔ وہ حقیقت میں مالا کی زندگی میں آنے والا بے انتہا عجیب کردار تھی۔

پاپا نہیں جانتے تھے، عیسیٰ نہیں جانتا تھا بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا مون کس قدر انا پرست، خود پسند، متمم مزاج، کینہ پرور اور حاسد لڑکی تھی۔ کوئی اس کے باپ کی اور بھائی کی صحبتوں میں حصے دار بن آیا تھا۔ وہ بھی اس کی مرضی اور چاہت کے بغیر..... بھلا یہ کوئی معمولی بات تھی؟ اس کے اندر لگی آگ کے شعلے آہستہ آہستہ باہر آرہے تھے۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اب آگ کا کھیل رچانے والی تھی۔

اسے آگ سے کھیلنا پسند تھا چاہے خود جلتی یا دوسروں کو جلاتی۔ بعض لمحے خنجر کی دھار جیسے ہوتے ہیں۔ غلط فیصلہ ہو جائے تو ان کی کاٹ سے نہ جان بچتی ہے اور نہ ایمان بچتا ہے اور اب چاہے بازی جان کی لگتی یا ایمان کی وہ اپنے فیصلے سے ہٹنے والی نہیں تھی۔

دراصل خود کو ہر لحاظ سے عقلمند، ہوشیار اور چالاک سمجھنے والے ہی اکثر خطا کھاتے ہیں اور جان سے بھی جاتے ہیں۔ شاید مون انہی لوگوں میں سے تھی بغیر نتائج کی پروا کیے سردھڑکی بازی لگا دینے والی..... مون چونکہ فطرتاً غیر معمولی ذہانت رکھنے کے ساتھ بہت عجیب لڑکی تھی اور اس کی قوت مشاہدہ بھی کمال کی تھی سو وہ ایک ہی نظر میں بندے کے اندر کا احوال پڑھ آتی تھی۔ اسے ذہن کھوجنے میں انتہا کی حد تک کمال حاصل تھا۔ مون نے کہیں پڑھا تھا کہ انسان کا بہترین مطالعہ، انسان ہی کا مطالعہ ہے جانے یہ لفظ اس کی سوچ میں کہاں سے آکر جم گئے تھے۔ شاید اسی ایک لمحے کی گرفت مضبوط ہونے پر اس نے کتابیں آرام سے اٹھا کر اپنے باپ اور بھائی کے کتب خانے میں سجا دی تھیں۔ اس نے کتاب کا مطالعہ چھوڑ کر انسانوں کے ذہن پڑھنے شروع کر دیے تھے۔ اسے غیر فطری کاموں میں مزہ آتا تھا حالانکہ علم کی طلب عبادت اور اس کی تلاش جہاد ہے جب اس نے عبادت اور جہاد کے مفہوم پر غور کرنا چھوڑ دیا تب وہ منزل، منزل بھٹکنے لگی۔

جسبھی اس غیر فطری عجیب لڑکی نے اس حسین شام کے اس سنہرے پل دو لوگوں کے ذہنوں کو لمحے کے ہزاروں حصے میں چھاننی کی طرح چھان لیا تھا تب اس پر ایک برا سا انکشاف ہوا یعنی اعتبار کا انکشاف، اعتماد کا انکشاف اور شاید محبت کا بھی تو گویا ایک لاوارث پارسل ملنے پر اس کا بھائی بڑے اطمینان سے جواب پیش کر رہا تھا۔

”شاید سوزن نے بھیجا ہے، اپنا نام لکھنا وہ

تو کہ وفا

بھول گئی۔“ علی عیسیٰ کے اعتبار کی کوئی حد بھی تھی۔ اتنا اندھا اعتماد، ایسی اندھی محبت تو گویا بواریا کے چھوٹے سے قصبے میں دوراتیں گزارنے والی علی عیسیٰ کی بیوی کو کوئی بھی اجنبی اپنا نام لکھے بغیر تحفہ ہی نہیں بھیج سکتا تھا۔ یہ علی عیسیٰ کے اعتبار کی انتہا تھی۔

پھر یوں ہوا کہ یہ سنہری شام بنا بد مزگی کے بہت سبک خرامی سے گزر گئی۔ کھانے کے بعد ہمیشہ کی طرح مون نے مصروفیت کے کئی بہانے کیے اور چاچو بے چارے بے بس مون کو جاتا دیکھتے رہے۔ عیسیٰ اسے روکنا چاہتا تھا مگر روک نہیں پایا۔

وہ گفٹ والا پارسل رات بھر مالا کے ذہن میں کھلبلی مچائے رہا تھا حالانکہ چاچو اور عیسیٰ نے دوبارہ کوئی سوال نہیں اٹھایا تھا بلکہ سوزن کے بھیجے تحفے کی خوب تعریف بھی کی تھی۔ تاہم مالا اپنے ذہن اور دل کو مطمئن نہیں کر پائی تھی۔ اس کا ذہن کئی حصوں میں الجھا ہوا تھا۔ کبھی خیال آتا محض دو ہفتے گزرنے کے بعد سوزن کو گفٹ بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ کبھی وہ دل کو تسلی دے لیتی کہ یقیناً سوزن نے ہی گفٹ بھیجا ہوگا مگر رات بھر اتنی خوشگوار شام گزارنے کے باوجود بھی اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

بڑی مضحل سی صبح طلوع ہوئی تھی، عجیب سی پڑمردگی سے بھری۔ انتہائی ست، ست..... مالا کا بستر چھوڑنے کو دل نہ چاہ رہا تھا مگر وہ علی عیسیٰ کو آفس بھیجنے کے لیے تیاری میں مدد کروانا بھی چاہتی تھی گوکہ عیسیٰ نے بھی اسے فورس نہیں کیا تھا نہ تنگ کیا تھا کہ وہ اپنی نیند خراب کر کے عیسیٰ کو ناشتا بنا کر دے یا دوسرے چھوٹے موٹے کام کرے۔ یہ سب مالا کے اپنے دل کی خوشی تھی۔ وہ عیسیٰ سے اتنی محبت کرتی تھی کہ اس کا بس چلتا تو رات کو بھی نہ سوتی بلکہ چپکے، چپکے قریب بیٹھ کر اس کے نقوش حفظ کرتی رہتی اور عیسیٰ میٹھی نیند میں گم رہتا۔



نے اسے بوکھلا دیا تھا۔  
 ”مالے! کیا تم بھی عیسیٰ کے ساتھ چلی گئیں؟“ چاچو کی شوخ آواز سن کر وہ دوڑتی ہوئی واپس لاؤنج میں آئی تھی۔ چاچو گلاسز لگائے اخبار پڑھنے میں مصروف نظر آ رہے تھے مگر ان کا دھیان مالا کی طرف ہی تھا جو انہیں کچھ ابھی، ابھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی الجھن کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے وہ مسکرا کر چھیڑ رہے تھے۔  
 ”میں سمجھا تھا کہ عیسیٰ نے تعریفی ڈائیلاگز کچھ طویل کر دیے ہیں؟ ابھی میری بیٹی واپس آتا بھول گئی۔“ ان کے چہرے پر صاف شرارت نظر آ رہی تھی۔ وہ اسے دن بھر میں کئی طرح سے ستاتے اور تنگ کرتے تھے خصوصاً اس وقت جب وہ پورے دل سے عیسیٰ کے انتظار میں گھڑی پر نگاہ جمائے بیٹھی ہوتی تھی اور چاچو آتے جاتے اسے جتنا نہ بھولتے تھے۔  
 ”ابھی تین گھنٹے رہتے ہیں مالے، اتنی دیر میں کوئی فیشن شو ہی دیکھ لو۔“ گھڑی کی طرف بڑھتا اس کا اٹھنا دیکھ کر وہ کچھ نہ کچھ ضرور بولتے تھے اور مالا بڑی طرح جھینپ جاتی تھی۔ کبھی وہ اس قدر ٹائم ٹیس پر نگاہ جما کر کھو جاتی تھی کہ چاچو اندر سے الارم والا گھنٹا اٹھالاتے تھے پھر چاچو کی ہنسی اور مالا کی شرمندگی کا دورانیہ طویل ہو جاتا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ چاچو اس کی حرکتوں سے خاصے محفوظ ہوتے ہیں تب مالا نے گھڑی پر چپکے، چپکے نگاہ رکھنی شروع کر دی تھی اور اس کے علاوہ مالا نے نئی انتظار کی مصروفیت ڈھونڈ لی تھی یعنی لاؤنج سے گیٹ تک کے بے مقصد چکر اور یہ کام وہ چاچو کے سامنے بھی کر لیتی تھی حالانکہ چاچو کی زیرک نظروں سے کچھ بھی چھپانہ رہتا تھا۔ نہ اس کی بے تابی، نہ اس کی بے قراری۔ سو وہ بھی نئے نئے انداز سے مالا کو زچ کرتے۔  
 ”کیوں جوتے گھسار ہی ہو بیٹا۔ عیسیٰ اپنے وقت پر ہی گھر آئے گا۔“ وہ مالا کے پیچھے ہی باہر

اسے بھی کچھ خیال سا آیا یا کچھ یاد سا آیا۔ اس کے لب سختی سے بھینچ گئے تھے بھی نہ ٹھلنے کے لیے۔ وہ غصے کو شدید ضبط کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ لمحوں میں رنگ بدل گیا۔ آخر ان باپ بیٹے کو ہوا کیا تھا؟ مالا ناگہی کے عالم میں حق دق کھڑی تھی۔  
 ”ہاں تو اس نے اپنا کوئی تجربہ کر لیا ہو گا تم پر، بس ہم ہی دونوں نہیں مانتے، زمانہ تو سارا کہتا ہے میری بیٹی غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک ہے۔“  
 حسیب چاچو کی آواز میں اب بھی گہرا کرب ہلکورے لے رہا تھا حالانکہ اگر ان کی بیٹی غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھی تو اس بات پر انہیں فخر کرنا چاہیے تھا مگر یہ اداسی نہ جانے کیوں تھی؟ شاید مالا کا سر پرانز خراب ہو جانے کی وجہ سے..... مالا کچھ سمجھ نہیں پاتی تھی اور اپنی عقل کے مطابق خود کو دلیل دے کر مطمئن بھی کر چکی تھی پھر یوں ہوا کہ علی عیسیٰ نے صورت حال کو سنبھال لیا۔ وہ اس وقت متنی خیز کیفیت ماحول کو اپنی ہنسی اور چٹکوں سے بدل چکا تھا۔ کچھ دیر بعد مہون بھی آگئی تھی اور محض مون کے چلے آنے سے اس کا باپ اور بھائی اتنے خوش ہوئے کہ سابقہ ناراضی یا غصہ انہوں نے فوراً بھلا دیا تھا۔ شاید یہ ماحول ایسا ہی سازگار یا خوشگوار رہتا مگر اس پارسل کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر بد مزگی ہوتے، ہوتے رہ گئی تھی۔ اگر عیسیٰ اس پارسل پر ہنگامہ کھڑا کر دیتا یا بے نام ہی اس سلسلے پر لکھے الفاظ کو دیکھ کر مٹھوک ہو جاتا یا پھر وہ سرے سے سمجھتا ہی نہیں کہ یہ پارسل سوزن نے بھیجا ہے۔ وہ اگر شک میں مبتلا ہو جاتا تب بھلا مالا کیا کر سکتی تھی؟ اسے کیسے یقین دلاتی؟ عیسیٰ کو کیسے مطمئن کرتی؟ اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی نہ عیسیٰ کھوج میں پڑا اور نہ ہی چاچو نے تفتیش کی مگر مالا اپنی چھٹی حس کا کیا کرتی جو اسے کسی انہونی سے ڈرا رہی تھی۔ وہ اس پارسل پر اب مطمئن نہیں تھی اور عیسیٰ کے دفتر چلے جانے کے بعد مسلسل اسی پہلو پر غور کر رہی تھی جب چاچو کی آواز

روکھے، طنزیہ لب و لہجے کو سن کر عیسیٰ قطعاً حیران ہوا ہو لگا تھا بلکہ اہتیار رہے کا حیران نظر آ رہا تھا۔  
 ”میں تو خود حیران ہوں، پندرہ بیس منٹ پہلے مجھے قطعی طور پر اپنی سالگرہ یاد نہیں تھی پھر اچانک میرے ذہن میں خیال آیا، یوں سمجھیں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا اور میرے سامنے سالگرہ کی ڈھیل آگئی۔“ وہ اپنی حیرانی کا اظہار بہ آواز بلند کر رہا تھا۔ مالا بھی ایک دم ٹھنک گئی تھی حالانکہ اس میں ٹھنکنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ اکثر اچانک بے خیالی میں پرانی اور بھولی ہوئی باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ علی عیسیٰ کو کبھی سالگرہ یاد آگئی سو اس میں اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں تھی مگر جس چیز نے مالا کو ٹھنکایا تھا وہ چاچو کے کرب انگیز تاثرات تھے۔ ان کے چہرے پر ایک دم صدیوں کی... جھکن اتر آئی تھی۔ وہ لمحوں میں بہت تھکے، تھکے، پشمرہ اور غمناک نظر آنے لگے تھے۔ آخر چاچو کو کیا ہوا تھا؟ مالا زیادہ دیر سوچ بھی نہیں سکی تھی چاچو کی تھکی، تھکی خود کلامی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا وہ گویا علی عیسیٰ اور مالا کو نظر انداز کیے خود سے مخاطب تھے۔  
 ”تو یہ کارستانی مون کی ہے۔ اس سے مالا کی چھوٹی سی خوشی بھی برداشت نہیں ہو سکی۔ میں مون کو نہ ہی بتاتا کہ مالا نے عیسیٰ کی سالگرہ کا اہتمام کر رکھا ہے۔ اسے سر پرانز دینے کے لیے۔“ ان کی آواز عجیب سی تکلیف میں بھیگ رہی تھی۔ چہرے پر دکھ کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ بہت اذیت میں نظر آ رہے تھے گویا مون کے عمل نے ان کے دل کو سخت ٹھیس پہنچائی تھی۔ جانے مون نے کیا، کیا تھا؟ ٹیلی فون کر کے عیسیٰ کو اطلاع دے دی تھی یا کسی اور ذرائع سے مطلع کر دیا تھا؟  
 ”مون نے فون تو نہیں کیا، یہ تو اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آ گیا.....“ عیسیٰ بھی کچھ بولتے، بولتے ایک دم ٹھنک کر چپ ہو گیا تھا۔ گویا

وہ ناشتے سے فارغ ہو کر بھی عیسیٰ کو خوب صورت طریقے سے سی آف کر کے سرخ گلابوں کے کارڈن میں کھڑی پھولوں کی روح میں اترنے والی خوشبو کو سینے میں اتار رہی تھی۔ اسے کل شام کے مناظر یاد آ رہے تھے۔ کل عیسیٰ کی سالگرہ جو تھی۔ وہ پورا دن مصروف رہی تھی۔ چاچو اور وہ دونوں ایک چکر مار کیٹ کا بھی لگا کر آئے تھے۔ اپنی طرف سے وہ اس کے لیے سر پرانز پلان کر رہے تھے۔  
 پھر یوں ہوا کہ چاچو کی ڈھیروں بوکھلاہٹوں کے باوجود کھانا وقت پر تیار ہو گیا تھا۔ سب سے زیادہ حیرانی تب ہوئی جب عیسیٰ وقت سے پہلے گھر آ گیا۔ مالا تو کیا مینی اور چاچو بھی حیران رہ گئے تھے حالانکہ کچھ دیر پہلے چاچو، مالا کو بتا رہے تھے کہ عیسیٰ کو کبھی اپنا ہاتھ ڈے یاد نہیں رہا۔ بچپن سے لے کر آج تک وہ ہمیشہ اسی اہم دن کو بھول جاتا ہے اور یہ بھی کہ عیسیٰ کی سالگرہ پر اتنا اہتمام نہیں ہوتا بس ایک کاٹا جاتا ہے جبکہ مالا نے عیسیٰ کو سر پرانز دینے کے لیے بہت اہتمام کر رکھا تھا اور وہ دونوں بہت خوش بھی تھے کہ عیسیٰ ایک دم سر پرانز ڈرہ جائے گا مگر ان سب کو حیرت کا جھنکا تب لگا جب عیسیٰ اپنے موبائل پر یہ رنگ ٹیون سیٹ کر کے ہنستا مسکراتا اندر داخل ہوا۔  
 ”آج ہماری سالگرہ ہے ناں دیکھو ہم کو یاد ہے ناں۔“ وہ برابر مسکراتا ہوا گنگنا رہا تھا جبکہ چاچو تو کیا مالا بھی ہونق رہ گئی تھی تو گویا یہ سارے اہتمام میں سر پرانز کا پہلو کہیں سے بھی نہ نکلتا تھا۔ وہ حضرت اپنی سالگرہ کے دن کو خوب یاد رکھے ہوئے تھے۔ مالا کی اتری صورت دیکھ کر چاچو فوراً تنگ کر بول اٹھے تھے۔  
 ”پچھلے تیس سالوں میں تو تمہیں سالگرہ کا دن کبھی یاد نہیں رہا۔ آج بائیس، تیس سال بعد کیسے سالگرہ کا دن یاد آ گیا؟“ چاچو بھی سر پرانز کر کر ہونے کی وجہ سے سخت بد مزہ ہو رہے تھے۔ ان کے



ہمارے ہوں سوڈ ہن کچن کی طرف چلا گیا۔ "مالا کو اپنی بے دھیانی کا جواز پیش کرنے کے لیے بروقت بہانہ مل گیا تھا۔

"او..... تو یعنی آپ معدے سے ہو کر دل میں براجمان ہونے کا پورا پورا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔" عیسیٰ نے مسکرا کر اسے چھیڑا تو مالا خاصے اعتماد سے دو بدوبولی۔

"دل میں براجمان تو ہم ہو چکے، ایسی کوششیں تو بس محبت کو اور بڑھانے کے لیے کی جاتی ہیں۔" اتنے عرصے میں بلکہ شادی کے بعد مالا کی طرف سے پہلا خوب صورت اظہار عیسیٰ کی روح تک کو شانت کر گیا تھا بھی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"مارولس۔" عیسیٰ نے ہنسی کے دوران ہی ذرا رک کر کہا تھا پھر تھوڑی عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "دل تو چاہ رہا ہے تم سے تھوڑی اور لمبی بات کروں، ابھی میں تمہی کو سوچ رہا تھا، تمہی کو یاد کر رہا تھا۔ دل چاہتا ہے کہ اس دل کو پتہ لگیں اور اڑتا ہوا تمہارے پہلو میں جا کر غم روزگار....." عیسیٰ کو پٹری سے اترتا دیکھ کر مالا جلدی سے سنبھل گئی تھی اور جو بے چارہ سادل تھا، عیسیٰ کی بات کے مفہوم میں الجھتا دھڑک، دھڑک کر بے حال ہو رہا تھا۔

"دیے ایک بات کہوں؟" سوزن کا نمبر لکھوا کر عیسیٰ نے فون رکھنے سے پہلے ذرا تنگ کرنے والے انداز میں مالا کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جو فون رکھنے لگی تھی، عیسیٰ کی بات سن کر رک سی گئی۔

"رقیبوں کو فون کر رہی ہو، ذرا دھیان سے۔" وہ اسے چھیڑ رہا تھا یا تنبیہ کر رہا تھا۔ مالا سمجھ نہیں پائی تھی مگر وہ خود کو کچھ بولنے سے روک نہیں پائی تھی۔ ایک دم آفاق کی باتیں یاد آنے لگیں۔ یہ اللہ نے اوپر جو کھوپڑی نما میموری باکس بنا رکھا ہے یہاں سارا ڈیٹا ایک دم سیف ہو جاتا ہے کبھی کمپیوٹر کی خرابی کے باعث بھول چوک

"مالے! یہ تم ہوناں!" علی عیسیٰ کے لہجے میں یقین تھا مالا اسے تنگ کرنے کے موڈ میں نہیں تھی اسی لیے کچھ پھینکی سی آواز میں کہنے لگی۔

"جی! میں ہوں اور بھلا کون ہو سکتا ہے؟" "اور کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔" عیسیٰ گویا کھل کر مسکرا دیا۔ "کہیے ملکہ عالیہ! فون کس لیے کیا؟" وہ بڑی فرصت سے بات چیت کرنے کے موڈ میں لگ رہا تھا حالانکہ وہ اس وقت بہت مصروف تھا کچھ دیر بعد اسے ایک میسج آئی تھی پھر ایک آفیشل منج کے لیے نکلتا تھا مگر مالا کی فون کال نے اسے روک لیا تھا۔

"مجھے سوزن کا نمبر چاہیے۔" مالا نے تمہید باندھے بغیر ڈائریکٹ نمبر مانگ لیا تھا۔ شاید وہ محسوس کر چکی تھی کہ عیسیٰ اس وقت خاصا مصروف ہوگا جبکہ وہ فون دریافت ہو جانے پر عیسیٰ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

"ظالم نے یاد بھی کیا تو رقیب کو..... آہ۔" اس کا انداز ایسا مسکین سا تھا کہ مالا کو اتنے کشیدہ سے ماحول میں بھی ہنسی آگئی تھی۔ دراصل اس وقت مالا کے سر پر صرف سوزی سے بات کرنے کی دھن سوار تھی۔ وہ اپنی پریشانی کم کرنا چاہتی تھی یہ پوچھ کر کہ آیا سوزن نے ہی اسے گفٹ بھیجا ہے یا پھر مالا کسی کی سازش یا شرارت کا شکار ہونے والی تھی۔

"آج لگتا ہے، آپ خاصے فراغت کے موڈ میں ہیں۔" مالا کو کچھ تو بولنا ہی تھا حالانکہ ذہن سوزی میں اٹکا ہوا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پارسل اور نعلی ٹکینوں کا بر۔ سلیٹ ناچ رہا تھا۔ ذہن کہیں تھا اور گفتگو بے ربط سی ہو رہی تھی۔ عیسیٰ نے اس کی..... بے توجہی فوراً نوٹ کر لی تھی۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" وہ فوراً پریشان ہوا تھا اور اس کی پریشانی محسوس کر کے مالا کو سنبھلانا ہی پڑا۔ "مجھے کیا ہونا ہے اکیچوٹی، انسان کی پڈنگ

"مجھے امید ہے میری بیٹی مجھ سے کچھ نہیں چھپائے گی۔" چاچو کی محبت اور مان بھرے لہجے نے اسے بھر بھری ریت بنا دیا تھا۔ اسے لگا وہ حقیقت میں چاچو سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے خدشات تو نہیں البتہ رات والے پارسل کا ذکر ضرور کر دیا تھا جسے سن کر چاچو مطمئن انداز میں بولے تھے۔

"ہاں تو بیٹا تم سوزن کا شکر یہ ادا کر دو، اسے کال کر لو۔" اس کی بات سمجھے بغیر انہوں نے وہی بات کہی تھی جو مالا کی خواہش میں شامل تھی۔ وہ سوزن کو فون کرنا چاہتی تھی مگر مالا کے پاس اس کا نمبر نہیں تھا اور مالا کی الجھن سوزن ہی دور کر سکتی تھی۔

"کیا سوزن کا نمبر مل سکتا ہے؟" مالا نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "عیسیٰ کے پاس ہوگا تم عیسیٰ کو فون کر کے نمبر لے لو۔" چاچو کے مشورے نے مالا کو تھوڑا ریلیکس کر دیا تھا۔ وہ سر ہلا کر میز پر سے برتن اٹھانے لگی تھی۔ آج نئی نے نہیں آنا تھا اور ویسے بھی برتنوں کے علاوہ اور کوئی کام بھی نہیں تھا۔ صفائی تو یہاں دو ہفتے بھی نہ ہوتی تو گرد، دھول کا نشان نظر نہیں آتا تھا مگر مالا نے عادتاً پہلے برتن دھوئے پھر کچن صاف کیا اور پھر فارغ ہو کر فون تک آگئی۔ فون کے اوپر ہی عیسیٰ کا نمبر لکھا تھا یقیناً سہولت کے لیے لکھ دیا گیا تھا کہ کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ مالا نے جھجکتے ہوئے نمبر ڈائل کیا چونکہ یہ عیسیٰ کا پرسل نمبر تھا سو فون بھی عیسیٰ نے ہی اٹھایا۔ یقیناً وہ گھر کا نمبر دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا بھی اس نے پہلی بیل پر کال ریسیو کر لی تھی۔ "پاپا تو ٹھیک ہیں؟" اس نے ڈیج میں بہت عجلت بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ یقیناً وہ سمجھا ہوگا کہ نئی نے اسے فون کیا ہے جبکہ دوسری طرف خاموشی محسوس کر کے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ فون نئی نے نہیں کیا بھی بلکہ پھلکے لہجے میں ذرا مسکرا کر بولا۔

آجاتے تھے۔ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے حالانکہ مالا کی عیسیٰ کے لیے بے قراری انہیں دل و جان سے پسند تھی مگر وہ نہیں چاہتے تھے کہ مالا فضول میں چکر لگا لگا کر ٹھکتی رہے اور مالا کی ڈھٹائی بھی اس لمحے عروج پر ہوتی تھی۔

"میں تو واک کر رہی ہوں چاچو آپ بھی اپنے بیٹے کی طرح خاصے خوش فہم ہیں۔" مالا بھی دو بدو جواب دے کر اپنے تئیں انہیں لا جواب کر دیتی تھی مگر چاچو کی آنکھوں میں چھپی شرارت اسے باور کروا دیتی کہ چاچو قطعاً قائل نہیں ہوئے بلکہ خوب زچ کرنے والی نظروں سے دیکھتے رہتے تھے۔

"میرا بیٹا ضرور خوش فہم ہوگا مگر میں نہیں..... یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے بیٹا جی۔" چاچو نے ہار ماننا کہاں سیکھی تھی۔ یہ تو علی عیسیٰ تھا جو انہیں لا جواب کر دیتا تھا۔ مالا تو اکثر اپنی کہی باتوں میں خود ہی گرفتار ہو جاتی تھی۔

"یہاں دھوپ نکلتی کہاں ہے چاچو کبھی کبھار اگر موڈ ہوا تو جھلک دکھا دی۔" مالا کو موضوع بدلنے کا موقع مل جاتا تھا اور چاچو اس کی چالاکی پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے تھے۔

اس وقت بھی وہ مالا کو چھیڑنے کے موڈ میں تھے مگر اس کے چہرے پر پھیلی الجھن دیکھ کر رک سے گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے گلاسز اتار کر میز پر رکھے، اخبار بھی سمیٹ دیا پھر اس کا چہرہ کھوجنے والے انداز میں دیکھ کر بولے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا، کوئی پریشانی ہے کیا؟" ان کے لہجے میں گہرا نظر تھا۔ اس کی چپ انہیں ہولا رہی تھی۔

"نہیں۔" وہ گویا خواب کی کیفیت سے جاگی تھی۔ ایک دم ہڑبڑا کر بولی۔ چاچو پُرسوج نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے پھر کچھ دیر تک دیکھتے رہے۔ مالا کو ان کی نظروں سے الجھن ہو رہی تھی۔



ہو جاتی ہے تاہم ڈیٹا ڈیلیٹ ہرگز نہیں ہوتا۔ کچھ دن بعد یادداشت کے خانوں سے پٹ پٹ باتیں نکل کر گزرتی ہیں۔ جیسا کہ ابھی عیسیٰ کی چھیڑ چھاڑ نے اسے آفاق کی باتیں یاد دلادی تھیں۔ سوزن کی عیسیٰ کے لیے محبت، عیسیٰ کی ماں کے سوزن جیسی اچھی لڑکی کے لیے جذبات، عیسیٰ کی شرط اور پھر سوزن کا انکار۔ اس نے محبت پر مذہب کو ترجیح دی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک منفرد اور عظیم لڑکی تھی اور اب عیسیٰ شاید تنبیہ کر رہا تھا کہ رقیبوں سے بات کرتے ہوئے محتاط رہنا یا پھر مذاق میں تنگ کر رہا تھا؟ مالا بھی نہیں مگر الجھ ضرور گئی۔

”سوزن میری رقیب کیسے ہو گئی؟“ مالا نے۔۔۔ حتی المقدور اپنے لہجے کو نارمل کیا تھا۔ وہ عیسیٰ پر کچھ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ اسے آفاق نے کچھ بتا رکھا ہے۔ دراصل یہ موضوع کبھی عیسیٰ نے چھیڑا ہی نہیں تھا ورنہ مالا تو کب سے بے چین تھی یہ جاننے کے لیے کہ آیا آفاق نے جھوٹ بولا تھا یا سچ؟

”آں..... تو گویا تم نہیں جانتیں؟“ عیسیٰ کچھ چونک گیا پھر کچھ دیر کے لیے سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔ شاید اپنی غلٹ پسندی پر خود کو ملامت کر رہا تھا کہ اسے مالا کے ساتھ ایسی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ مالا کچھ اس قسم کے احساسات کا شکار تھی۔

”میں کیسے جان سکتی ہوں، آپ نے کچھ بتایا ہے کیا؟“ وہ الٹا ناراض ہونے کا موڈ بنا رہی تھی کہ عیسیٰ نے اپنی بچھلی زندگی کے بارے میں اس کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ ماما کی باتیں ضرور کرتا تھا مگر یہ نہیں بتاتا تھا کہ ماما کی خواہش تھی اپنی بھانجی کو بہو بنانے کی۔ شاید یورپ میں ایسی رشتے دار یوں کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا مگر علی عیسیٰ کی ماما کا گھرانا اس لحاظ سے بہت مختلف تھا۔

”اگرچہ سوزن نے تمہیں کچھ نہیں بتایا ہوگا مگر میں مان نہیں سکتا کہ آفاق کے ہلکے پیٹ میں

کوئی بات ٹھہر سکے۔ اس نے تمہیں ایک دو گھنٹے کے اندر پوری ہسٹری بتا دی ہوگی۔ اٹ از ناٹ پاسیبل کہ وہ چپ رہے اور کچھ بولے نہیں۔ اسے بولتے رہنے کا خط ہے۔“ عیسیٰ کے اگلے سوال نے مالا کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ وہ تو ابھی عیسیٰ کی بتائی تفصیل کے حصار سے نہیں نکلی تھی کہ عیسیٰ نے جھٹ سے معصوم بن کر کہا۔ ”پر تم خاصی تھکی ہو یا دوسرے معنوں میں بردبار کہہ لو مجال ہے جو مجھ سے کچھ پوچھا ہو تم نے۔“ وہ اب مسکرا رہا تھا یا جتا رہا تھا۔ مالا گویا ہونق سی ہو گئی پھر اسے اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کا اچانک خیال آ گیا۔ اگر وہ اب بھی نہ بولتی تو شاید عیسیٰ سمجھتا کہ وہ کسی بات پر ناراض یا بدگمان ہے۔

”میں آپ سے پوچھتی تب جب مجھے آفاق کی کسی بات پر یقین آتا۔ مجھے کیا خبر آفاق جھوٹ بول رہا تھا یا سچ؟ ویسے بھی میں اجنبیوں سے۔۔۔ بے تکلف نہیں ہوتی اور نہ ان کی بے سرو پا باتوں کو حقیقت سمجھتی ہوں۔“ مالا کے تفصیلاً دو ٹوک پنے تلے جواب نے جہاں عیسیٰ کا دل جیت لیا تھا۔ وہیں اسے اپنی ہم سفر پر فخر محسوس ہوا تھا۔ وہ تو ایسے سیپ کے مانند تھی جس کے اندر نگینہ چھپا تھا۔ عیسیٰ کو مالا پر ٹوٹ کے پیار آیا تھا مگر یہ پیار جتانے کا وقت یا موقع نہیں تھا۔

”میڈیشن مالا! آئی لو پو۔“ اپنے حواسوں پر قابو پا کر عیسیٰ نے جس خواب آگئیں، شرابی لہجے میں اظہار محبت کیا تھا مالا گویا لڑکھرائی۔ وہ جو تھی یا بردبار والی بات سن کر اتنا سنجیدہ اور کرارا جواب دے رہی تھی عیسیٰ کے بے ساختہ انداز کو سن کر سرشار ہو گئی۔ وہ ایسا ہی تھا، جذباتی، منہ پھٹ اور دل میں کچھ بھی نہ رکھنے والا۔ نہ کینہ، نہ بغض، نہ حسد بس محبت دیتا اور محبت وصول کرتا تھا۔ جو کچھ محسوس کرنا فٹ سے کہہ دیتا جیسے ابھی مالا کی بات سننے بغیر اپنی

کے جا رہا تھا۔

”اور یار! آفاق جھوٹ نہیں بولتا، اس نے جو کہا ٹھیک ہی کہا۔“ اب کہ عیسیٰ کا لہجہ ذرا مدہم ہو گیا تھا۔ ”مگر ایک بری عادت ہے اس میں، راز سینے میں رکھنے والا نہیں ویسے بہت اچھا ہے۔ اتنا اچھا کہ میں نے تمہارے حوالے سے اس پر اعتماد کیا اور وہ اعتماد کو تمہیں پہنچانے والا نہیں۔“ وہ مدہم لہجے میں جانے آفاق کی تعریف کر رہا تھا یا اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا مالا کو آفاق کے حوالے سے وضاحت کچھ پرسکون کر گئی تھی ورنہ وہ تو اچھی خاصی آفاق سے بدگمان ہو چکی تھی حالانکہ اس نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کیا تھا جو مالا کو اس حد تک بدگمان کر دیتا مگر وہ عیسیٰ کی باتوں کو سمجھتے ہوئے آفاق کی گفتگو کو ذہن میں ڈہرا رہی تھی پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مالا نے آہستگی سے پوچھا۔

”تو کیا یہ سچ ہے کہ سوزن نے آپ سے شادی سے انکار کر دیا تھا؟“ مالا کے لہجے میں چھین نہیں تھی وہ بہت سادگی بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ ویسے بھی اسے سوزن سے کسی بھی قسم کی پُر خاش نہیں تھی۔ وہ جو بھی تھی جیسی بھی تھی مالا کو عزیز تھی۔ جانے یہ کیسا اٹوٹ سا رشتہ تھا جو خود بخود سوزن اور مالا کے درمیان بڑھ چکا تھا۔

”میں نے یہ کب کہا۔“ مالا نے فوراً وضاحت کی۔

”تو پھر؟“ وہ تلملایا۔

”پھر یہ کہ وہ نامراد رہ گئی۔“ مالا نے حسرت سے کہا تھا۔ عیسیٰ اس کے حسرت زدہ انداز پر اش اش کراٹھا۔

”تو تم اسے نامراد کہہ کر ایک بات کا دھیان رکھنا۔ یہاں قانوناً ایک بیوی ہی رکھ سکتے ہیں۔“ عیسیٰ نے جس تلملاہٹ سے جواب دیا تھا مالا گویا دھک سے رہ گئی تھی۔

”آپ کہاں تک سوچ بھی آئے؟“ وہ حیران در حیران تھی۔ ”میں نے تو صرف ایک بات کی ہے، آپ کے ارادوں کا بھلا کیا ہی کہنا۔“ مالا اب عیسیٰ کے بے ساختہ پن کو آڑے ہاتھوں لے رہی تھی اور وہ کون سا شرمندہ تھا۔ پوری ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تو میں ایک بزنس مین ہوں میڈیشن مالا! انتہا کو پہلے سوچتا ہوں۔“ عیسیٰ نے ہنسی دبائی تھی مگر مالا ہنس بھی نہ سکی۔ رہ رہ کر سوزن کا سوز و گداز سے بھر اچھرہ

”ہاں، سو فی صد سچ۔“ عیسیٰ نے خواہ خواہ دکھی ہونے کی کوشش میں منہ بنا لیا تھا۔ مالا نے کم از کم یہی محسوس کیا تھا کہ وہ غیر سنجیدہ سا ہے۔

”کوئی آپ کو بھی انکار کر سکتا ہے؟“ مالا نے حیرت سے پوچھا۔

”میں کہاں کا شہزادہ ہوں بھلا..... مجھے انکار کیوں نہیں ہو سکتا؟“ وہ الٹا مزے سے کہنے لگا۔

”وہ آپ سے محبت کرتی تھی۔“ اس نے بڑے گہرے لہجے میں عیسیٰ کو جانے کیا جتنا چاہا تھا مگر

97 ماہنامہ پاکیزہ منشی 2014ء



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم وائی، نارل کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے  
 ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں  
 ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

رکھا ہے مجھے تم نے، دیکھو، تمہاری آواز سن کر مجھے سب کچھ بھول گیا۔“ اب وہ تیز تیز بولتا، فون سرعت سے بند کر گیا تھا۔ تاہم فون بند کرنے سے پہلے اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرتا نہیں بھولا تھا۔ فون بند کرنے کے بعد بھی مالا، علی عیسیٰ کی سحر آمیز گفتگو کے حصار میں رہی تھی۔ اس کا دل کسی پہلو سے بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ ایسا سرور تھا عیسیٰ کی باتوں میں اور کچھ ایسی ہی محبت ہو گئی تھی مالا کو علی عیسیٰ کی منفرد ذات سے۔

وہ کتنی ہی دیر تک عیسیٰ کی محبت کے رس میں بھیکتی رہی تھی، سوزن کے فون نمبر والی چٹ کو تھیلی میں دبائے ہوئے۔ وہ عیسیٰ کی گفتگو کے حصار میں سے نکلتا نہیں چاہتی تھی مگر فون کے سفید بٹنوں میں گڑھے ہند سے اسے زیادہ دیر تک مسحور نہیں رہنے دے سکے۔ اس نے گہری سانس کھینچ کر نمبر ڈائل کرنا شروع کیا تھا کچھ ہی دیر میں فون کال ریسیو ہو گئی۔ فون تانتے نے اٹھایا تھا، مالا کی آواز سے بغیر وہ سی ایل آئی پر عیسیٰ کے گھر کا نمبر دیکھ کر سمجھ چکی تھیں کہ فون کرنے والا کون ہے۔ مالا نے انگلش میں تانتے سے کہا تھا کہ وہ سوزن کو بلا دیں مگر تانتے انگریزی نہیں سمجھتی تھیں سو مالا کچھ نظر میں بڑ گئی مگر ہوا کچھ یوں کہ تانتے نے آواز دے کر کسی اور کو بلایا تھا۔ شاید کوئی ان کے قریب ہی بیٹھا گفتگو کر رہا تھا پھر ریسیور کسی اور کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا اور جو آواز مالا کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی کم از کم اس وقت مالا اس آواز کو سننا نہیں چاہتی تھی۔ تانتے نے آواز لگا کر کہے بلایا تھا، مالا سمجھ نہیں سکی تھی۔

مون حسیب، مالا کی زندگی میں کیا کرنے والی تھی..... علی عیسیٰ اور مالا کے بیچ کیا ہونے جا رہا تھا۔ یہ سب کچھ ضرور معلوم ہو گا مگر اگلے ماہ

آنکھوں کے سامنے عکس بنا رہا تھا۔ نم ناک آنکھیں، ابھرے ابھرے سرخ گالوں پر چھائی اداسی۔ وہ کتنا کم مسکراتی تھی پھر کرخ کی ٹھنڈی اور رسمی تقریب میں سوزن کے پہنے والے آنسو، وہ آنسو بلاوجہ تو نہیں گر رہے تھے۔ اتنی بالی سی عمر میں اس کی مذہبی دلچسپی، بچکولے لیتا اس کا بھرا بھرا وجود، سادگی، وقار اور شرافت کی چمک لے اسے کا وجود ٹھکرائے جانے والا تو ہرگز نہیں تھا مگر اسے ٹھکرایا نہیں گیا تھا وہ تو اس نے خود ہی..... اور اب عیسیٰ کہہ رہا تھا۔

”مجھے سوزن پر اعتراض نہ ہوتا اگر سچ میں تم، تمہارا وجود، تمہاری محبت اور تمہاری چاہت کے جگنو نہ ہوتے۔“ عیسیٰ کے لہجے میں واضح سچائی تھی۔ وہ کتنے مضبوط اور مدلل لہجے میں کہہ رہا تھا۔ کتنی خوب صورت بات کر رہا تھا۔ کتنے دل سے کہہ رہا تھا مگر مالا پھر بھی جگہ جگہ انگ گئی تھی۔

”آپ کو سوزن پر اعتراض نہ ہوتا، اگر بیچ میں میری محبت نہ ہوتی..... تو پھر مذہب کہاں گیا؟“ مالا کے دل میں پھانس سی چھپی تھی۔ وہ عیسائی لڑکی عظمت کے کس مینار پر کھڑی تھی جس نے محبت پر مذہب کو قربان نہیں کیا تھا مگر یہ.....

”میں نے ماما سے کہا تھا وہ اسلام قبول کر لے جیسے انہوں نے کیا تھا مگر وہ راضی نہیں ہوئی پھر میری اس سے جذباتی وابستگی بھی نہیں تھی۔ دراصل شروع میں پاپا اور میں سمجھتے تھے کہ مون کو سوزن ہمارے خلاف بھڑکاتی ہے یہی سوزن کے کہنے پر ہی مون گھر چھوڑ گئی مگر ہم کچھ غلط ہی سوچتے تھے مون تو خود ہی..... بہت عجیب اور جانے کیوں ہے وہ ایسی۔“ عیسیٰ بے ربط سا بولتا کچھ چپ کر گیا تھا پھر اچانک اسے گزرتے وقت کا احساس ہوا تھا۔ وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہوا پھر عجلیت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

”باتوں میں الجھالتی ہو..... کچھ ایسا باندھ



شوہن کی لائبریری اینڈ فریمنگ پوائنٹ  
ماڈرن سٹیم اور جلی تھامس کی سہولت موجود ہے  
بے لیمبٹ سروسز اور ڈیولپمنٹ کی سہولت ہے  
دکان سرفیٹ صدہ ہاؤس پور



ناولٹ

ترک و فنا

نایاب جیلانی



پانچواں حصہ



”ارے مالا جی! تسی؟ کس لئی یاد کر لیا  
سانوں.....“ (مالا جی آپ! کیسے یاد کر لیا ہمیں؟) وہ  
ٹھیٹ پنجابی میں بڑے کھلکھلاتے لہجے میں بول رہا  
تھا جبکہ مالا اس کی آواز سن کر لہجوں میں پہچان گئی تھی۔

تانتے نے سچ سچ میں ”ایفین“ نام لیا تھا۔ یہ  
نام بھلا کیا تھا؟ اور کس شخصیت کا تھا؟ مالا کچھ نہیں  
جان پائی تھی۔ یہاں تک کہ وہ آواز اس کے کانوں  
سے غیر متوقع ٹکرائی۔



تھا..... اسے بس اپنی ہانکے جانے کی عادت تھی۔  
 ”وہ علی عیسیٰ سے کہنا، مجھے پھر سے اپنا پرسنل  
 سیکرٹری رکھ لے، اللہ کی قسم.....! اب کہ ذرا بھی گڑبڑ  
 نہیں کروں گا، فر فر لینکون بولوں گا، عیسیٰ کو شکایت کا  
 موقع نہیں ملے گا۔“ وہ عادتاً ایک ہی سانس میں بولتا  
 چلا گیا تھا..... تب مالانے بھٹا کر کہا۔

”میں عیسیٰ کے آفیشل افسیر ز میں انٹرفیئر نہیں  
 کرتی.....“ مالاجس طرح چبا، چبا کر بولی تھی، ہونا تو  
 یہ چاہیے تھا کہ وہ اس کی ناگواری کو سمجھ جاتا مگر بھلا وہ  
 اس کی ناگواری کو سمجھتا ہی کیوں.....؟ اسے کون سا  
 کسی کی بھی بات کبھی بری لگی تھی۔ کوئی اسے گالیاں  
 ہی کیوں نہ دے جاتا، وہ مسکرا کر گالیاں دینے والے  
 کو ٹھیکس ضرور بولتا تھا اگر کوئی اسے بے ضمیر یا بے  
 حس کہہ کر غیرت دلانے کی کوشش کرتا تو آفاق  
 صاحب آفاقی سی مسکراہٹ لبوں پر لا کر بڑے رساں  
 سے فرماتے۔

”میں کسی بد اخلاق کی وجہ سے اپنا اخلاق نہیں  
 گرا سکتا۔“ اپنی انہی خوبیوں کی بنا پر وہ حبیب  
 صاحب کا دلارا تھا مگر عیسیٰ کی آنکھ کا تارہ نہیں بن سکا  
 تھا۔ اس وقت بھی وہ مالاک کی ناگواری پر غور کیے بغیر  
 چپک رہا تھا۔

”میں نے تو تم سے اس لیے کہا تھا کہ عیسیٰ  
 تمہاری بات کبھی ٹال نہیں سکتا، خیر، مجھے سفارش کی  
 کوئی خاص ضرورت نہیں ہے، حبیب انکل ہیں  
 نا..... ویسے بھی مجھے اپنی صلاحیتوں پہ ناز ہے۔“  
 اس کی طرف سے نکاسا جواب ملنے پر اب وہ لمبی، لمبی  
 چھوڑ رہا تھا۔ مالانے جھنجھلا کر کھٹاک سے فون بند  
 کر دیا..... اس کا پہلے سے تپا دماغ کچھ اور تپ گیا تھا  
 جس کام کے لیے فون کیا تھا، وہ بھی نہ ہو سکا۔ نقلی  
 ٹکینوں والا بریسلیٹ ہنوز اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ مالاک  
 کو اتنا غصہ آیا کہ بریسلیٹ توڑ مروڑ کر ڈسٹ بن  
 میں جا پھینکا..... ایسے بے نام تحائف اور تعلقات کی

ہے، میں ابھی ابھی آیا ہوں ادھر..... پہلے نہیں رہتا  
 تھا، پھر مجھے اچھا نہ لگا کہ ڈھیر سارے دن کسی پر بوجھ  
 بن جاؤں..... خیر، تم سناؤ؟ فون سوزن کے لیے ہی  
 کیا ہوگا یہاں کوئی اور سوزن کے علاوہ اردو نہیں بولتا  
 اور تمہیں ڈیج آتی نہیں۔“ ایک ہی سانس میں اتنا  
 طویل جملہ بولنا، محض آفاق کا ہی کمال ہو سکتا تھا.....  
 اور وہ اسے کمالات میں انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔

”مجھے سوزن سے بات کرنی ہے۔“ مالانے  
 بروقت اپنا مدعا اس باتونی کی سماعتوں تک پہنچا دیا تھا  
 تبھی وہ کچھ سوچ کر بولا۔

”تم انتظار کرو، سوزن بس آتی ہوگی بلکہ  
 انتظار سے بہتر ہے مجھ سے بات کر لو۔“ آفاق نے  
 اپنے تئیں بڑا بہترین مشورہ دیا تھا مگر مالاکو ایسے  
 بھیا تک مشورے کی ضرورت نہیں تھی سو وہ فوراً ہی  
 خوفزدہ سی ہو گئی۔

”نہیں..... نہیں، میں پھر کال کر لوں گی، تم یاد  
 سے سوزن کو بتا دینا۔“ مالانے عجلت کے عالم  
 میں ہکلاتے ہوئے بے ساختہ کہا تھا۔ تب آفاق کو  
 اچانک کچھ ایسی بات یاد آئی تھی کہ وہ ایک دم بول اٹھا۔

”مالا خاتون! میرا ایک کام تو کر دینا.....“  
 آفاق نے جس تیز رفتاری سے اسے پکارا تھا، وہ فون  
 کان سے ہٹاتے ہٹاتے رک گئی۔

”کون سا کام.....؟“ مالاکھٹک گئی تھی۔  
 ”ایکچو نیلی! کام یہ ہے کہ تمہیں میری سفارش  
 کرنا ہوگی۔“ اب وہ بڑے لاڈ سے ٹھنک کر کہہ رہا  
 تھا۔ مالاکو اس کی دماغی حالت پر شبہ سا گزرا۔ تھا تو وہ  
 عیسیٰ کا ہم عمر مگر حرکتیں..... مالاکا دماغ بری طرح جھنجھنچا  
 اٹھا۔ ایک دم اسے آفاق پر خوب تپ چڑھی تھی۔

”کیسی سفارش.....؟“ اسے سخت قسم کا غصہ  
 آ گیا تھا..... حالانکہ وہ اتنا غصہ کرتی نہیں تھی، دوسری  
 طرف اس کے غصے کی ہرگز پروا نہیں کی گئی تھی بلکہ  
 آفاق نے تو اس کے غصے کی طرف دھیان بھی نہیں دیا

میں ہی سوئڈن سے اضافی ڈگری بھی لے رکھی ہے۔  
 مجھے اسکا لرشپ ملا تھا ناں عیسیٰ کو سب پتا ہے، وہ  
 میری قابلیت کی تعریف بھی کرتا ہے اور مجھے امید  
 ہے، اپنی فرم میں ہی مجھے بھی کھپالے گا۔ میں نے  
 ایک ماہ اس کے پرسنل سیکرٹری کی جاب بھی کی ہے پر  
 مجھے اس جاب کو چھوڑ کر یہاں آنا پڑا..... ڈیج سیکھنے  
 کے لیے۔ مجھے ڈیج نہیں آتی تھی ناں..... ورنہ جاب  
 کے کیا ٹھاٹ تھے، عیسیٰ کے ساتھ آنا جانا پتا ہے  
 تمہارے گھر کے گیسٹ روم میں رہتا تھا میں.....  
 انکل اور عیسیٰ بہت اچھے ہیں۔“ آفاق کی ہر بات،  
 ہر انداز میں بے ساختگی چھلکتی تھی۔ وہ بولتا تو اگلے  
 بندے کی ہرگز نہیں سنتا تھا تب وہ مالاکو بہت برا لگتا  
 تھا مگر جب اس کی ہر بات کی تان عیسیٰ کی تعریف پر  
 ٹوٹی تب وہ مالاکو بہت اچھا لگتا تھا۔ چاچو اور اب  
 آفاق بھی..... ہاں جو شخص عیسیٰ سے محبت کرے گا،  
 اس سے مالاکو بھی محبت کرے گی، یہ اس نے سوچا ہی  
 نہیں تھا بلکہ خود ایسے جذبات دل میں امد آئے تھے  
 جبکہ آفاق تو بیا تک دہل کہہ رہا تھا۔

”مجھے عیسیٰ سے بہت محبت ہے، اس جیسا  
 پورے مغربی جرمنی میں کوئی نہیں۔“ آفاق کے یہ  
 الفاظ مالاک کے لیے کسی انمول خزانے سے کم نہیں  
 تھے۔ اس کے ہونٹ آپوں آپ مسکرا اٹھے۔ عیسیٰ کی  
 تعریف اس کے اندر باہر پھول کھلا دیتی تھی۔ کچھ بل  
 کے لیے اسے بھول گیا تھا کہ اس نے فون پر آخر کس  
 سے بات کرنا تھی؟ وہ سوزن کا پوچھنا چاہتی تھی مگر  
 آفاق بولنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ اللہ، اللہ کر کے  
 پورے پندرہ منٹ بعد آفاق بولتے، بولتے رکا تب  
 مالانے عجلت میں اس سے سوزن کے بارے میں  
 پوچھ لیا تھا۔ مبادا وہ پھر سے کہیں اشارت ہی  
 ہو جائے..... اس کے خدشے اور وسوسے کے عین  
 مطابق وہ اشارت ہوتے، ہوتے رک گیا تھا۔

”سوزی بس آتی ہی ہوگی، باڑے تک گئی

”آفاق تم یعنی ایفٹق؟“ مالاک کے منہ سے  
 پھنسی، پھنسی آواز نکلی..... یہ بڑ بولا باتونی آج فون  
 پر بھی اس سے نکر گیا تھا۔ مالاکو یا اپنے ناخن چبا کر  
 رہ گئی تھی۔ آفاق کی آواز سننے کی اسے توقع ہرگز نہیں  
 تھی۔ آخر یہ کہاں سے ٹپک پڑا تھا؟

”جی ہاں..... میں ہی ایفٹق..... ادھر  
 سارے یواریا میں مجھے ایفٹق ہی کہا جاتا  
 ہے۔“ وہ بڑے خوشگوار انداز میں کہہ رہا تھا۔ گویا  
 مالاک سے اس کی خوب دوستی رہ چکی ہو۔ بے تکلفی  
 ایسی کہ جو توں سمیت آنکھوں میں گھس رہا تھا اور  
 یوں مخاطب تھا گویا اس سفر کے بعد بھی مالاک اس  
 سے رابطے میں رہ چکی تھی۔ یہ بے تکلفی مالاک سے  
 ہضم ہونے والی نہیں تھی۔

”اور سناؤ تم کیسی ہو.....؟ عیسیٰ صاحب تو  
 ٹھاٹ باٹ سے ہوں گے۔ کام پڑے تو میں یاد آتا  
 ہوں، کبھی بھول کر بھی تمہارے شوہر نے مجھ مسکین کو  
 یاد نہیں کیا۔“ آفاق کی چلتی زبان کو روکنا محال تھا  
 ..... ویسے بھی اسے اگلے بندے کی سنے بغیر بولنے  
 کی عادت تھی اور فی الحال اس کے اپنے شکوے ہی  
 بے شمار تھے، وہ مالاک کی ناگواری یا غصے کو بھلا کیسے  
 محسوس کرتا..... اس کی چلتی زبان رکنے کا نام ہی  
 نہیں لے رہی تھی۔

”خیر، مصروف بندہ ہے وہ، اب میں اسے کیا  
 کہوں..... محسن ہے میرا، ویسے عنقریب میں بھی من  
 ہائیم آنے والا ہوں۔“ وہ بہت پرجوش سے دوستانہ  
 لہجے میں بتا رہا تھا۔ گویا مالاکو تو بڑی بے قراری سے  
 اس کا انتظار تھا۔ کم از کم آفاق کے جوش و خروش سے  
 تو یہی نظر آ رہا تھا۔ مالاکو سخت الجھن ہونے لگی تھی،  
 ابھی وہ سوزن کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہی تھی  
 کہ آفاق پھر سے بول پڑا۔

”من ہائیم میں مجھے اچھی جاب مل سکتی ہے،  
 میں نے ایم بی اے کر رکھا ہے اور بزنس ایڈمنسٹریشن



”پردے میں رہنے والے، ذرا پردہ تو ہٹا چھپ کر تازے والے ذرا سامنے تو آ“ بنا گردن موڑے، وہ سامنے رکھی میز ہاتھوں سے بجاتے ہوئے گنگنارہا تھا۔ مالا سخت جھینپ گئی تھی۔ اب اوٹ میں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، وہ جھینپی، جھینپی سی سامنے آگئی تھی۔ عیسیٰ نے نگاہ جما کر اسے دیکھا تھا، وہ خاصی گھبرائی، گھبرائی نظر آرہی تھی۔ عیسیٰ نے آنکھیں میچ کر سرتایا اسے دیکھا تھا، اس کی نگاہیں مالا کے ہاتھوں پر جم گئی تھیں۔ اس کے ہاتھوں پر میدے کی باقیات لگی تھیں۔ وہ کچن میں کام کر رہی تھی اور عیسیٰ کی آواز سن کر شاید باہر آگئی تھی۔ عیسیٰ کے ہونٹ نیم وا ہوئے..... وہ دھیسے، دھیسے مسکرارہا تھا اور مالا اپنی خجالت چھپاتی اس پر بگڑ رہی تھی۔

”جانے کون سی دور بین سر کے پیچھے فٹ کر رکھی ہے۔“ مالا روٹھے، روٹھے انداز میں بولی تھی۔ اس کا پھولا منہ عیسیٰ کو ہنسنے پر مجبور کر گیا تھا۔

”آں..... ہاں، دور بین نہیں.....“ عیسیٰ نے فوراً وضاحت کی..... ”مالے ڈیر! یہ انتہائی حیرت رفقار حواس ظاہری ہیں..... شامہ، باصرہ، ذائقہ، لامسہ اور سامسہ..... کچھ لوگوں میں ان کی رفتار ایک ہزار فی سیکنڈ سے بھی بڑھ کے ہوتی ہے، وہ لمحے کے آخری حصے سے بھی پہلے سونگتے، دیکھتے، چھوتے یا سن لیتے ہیں..... میں ان لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہوں، مجھے تو تمہارے وجود کی یہ بھینپی، بھینپی خوشبو چونکا دیتی ہے۔ تم میری پسندیدہ خوشبو لگاتی ہو، مجھے تمہارے آنے سے پہلے اس اعلان کرتی خوشبو سے پتا چل جاتا ہے۔“ عیسیٰ نے تفصیلاً وضاحت کر دی تھی، گویا اسے کوئی جادو گر یا غیر معمولی ذہن نہ سمجھا جائے۔ مالا نے بھی گہری سانس کھینچ کر مسکرانا شروع کر دیا تھا..... وہ ایک سادہ لڑکا تھا، جھوٹ اور غلط بیانی اسے پسند نہیں تھی۔

گیا۔ وہ گویا اس کے لفظوں کی موسیقی اور لہروں کے ساتھ بہ رہی تھی۔ عیسیٰ کی آواز وائٹن کے سروں جیسی تھی۔ دلوں کو پکھلا دینے والی، انتہائی پُر لطف احساس جگاتی محبت کو ابھارتی، جذبات کو گرمائی اور دلوں کو بے چین کرتی۔

”دل سوچ کا پنجرہ ہے ایک بار ہی کھلتا ہے“ اب وہ بے خیالی میں یہی دو لائنیں گنگنارہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن تھا، اسے مالا کی موجودگی اور نگاہ کی پیش نے نہیں چونکا یا تھا۔ اسے سانسوں کی سرسراہٹ اور پیروں کی آہٹ نے بھی نہیں چونکا یا تھا، وہ آنکھیں بارش کے قطروں پر جمائے لقم کے خالق سے غائبانہ مخاطب تھا۔

”اے لکھنے والے، تم نے ٹھیک کہا۔ دل کی اتنی اچھی تشریح ہو ہی نہیں سکتی، ہاں دل سوچ کا پنجرہ ہے، ایک بار ہی کھلتا ہے، بار بار نہیں کھلتا اور جس کے لیے ایک دفعہ کھل جائے پھر اسے اپنے اندر محصور کر لیتا ہے۔ اپنی دیواروں میں قید کر لیتا ہے پھر اسے ”مقید دل“ کہتے ہیں۔“ عیسیٰ زیر لب بڑبڑایا تھا پھر گردن موڑے بغیر گویا مالا کی موجودگی محسوس کر کے بولا۔

”چوری چھپے کسی کو تازنا اچھی بات نہیں ہوتی۔“ اس کی نگاہیں اب بھی بارش کے شفاف قطروں پر جمی تھیں۔ مالا کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ہونٹوں سے بے ساختہ چیخ نکلنے والی تھی، جسے دونوں ہاتھ منہ پر جما کر اس نے بہ مشکل روکا تھا۔

”اللہ.....! یہ دونوں بہن بھائی تو کمال کے ہیں..... جادو گر ناں ہوں تو..... کیسے پتا چل گیا، میں چپکے، چپکے تاڑ رہی ہوں انہیں.....“ مالا کی سانسیں اس اچانک حملے پر اٹھل پھٹھل ہو گئی تھیں۔ وہ چونکہ اپنے دھیان میں کھڑی تھی اور اسے تینیں اس انداز سے چھپی تھی کہ عیسیٰ کی نظر میں نہ آسکے مگر یہ علی عیسیٰ بھی ناں.....

بچوں کی سی خوشی تھی، گویا وہ برستی بارش کو دیکھتا، خوب انجوائے کر رہا تھا۔ اس دوران وقتاً فوقتاً وہ کچن کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا مگر بارش دیکھنے میں اس کی دلچسپی کم نہیں ہو رہی تھی پھر وہ اٹھا تھا اور اندر سے ڈائری اور قلم اٹھا لایا۔ یقیناً کچھ لکھنے کا موڈ بن رہا تھا مگر وہ لکھنے کی کوشش کیے بغیر کوئی نظم دھیرے، دھیرے گنگناتے لگا تھا۔ ڈائری میں قلم رکھ کر اس نے ایک طرف اچھال دی تھی۔ مالا بہت غور سے اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہی تھی۔ اسے تو ویسے بھی علی عیسیٰ کو سوچنا اور پہروں چپکے، چپکے دیکھتے رہنا پسند تھا اور فی الوقت وہ بڑی توجہ اور فراغت سے عیسیٰ کو دیکھ سکتی تھی۔ اس کی ساری توجہ عیسیٰ کے ہلنے لیوں اور خوب صورت آنکھوں کی طرف تھی۔ وہ جانتی تھی، عیسیٰ کو بہت سارے شاعروں کا کلام زبانی یاد ہے۔ عیسیٰ کو شاعری سے دلچسپی وراثت میں ملی تھی، چاچو کو بھی لگ بھگ چھ سات سو اشعار تو زبانی یاد تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا چاچو نے اپنا شوق عیسیٰ میں منتقل کر دیا ہے۔ وہ خود بھی اکثر کچھ نہ کچھ گنگناتے رہتے تھے اور اس وقت عیسیٰ بھی کچھ گنگنارہا تھا۔ اس نے اوٹ سے جھانکا تو اسے عیسیٰ پہلے کی طرح انہماک سے بارش دیکھتا نظر آیا تھا اور اس کی آواز گویا مالا کے دل میں اترتی جا رہی تھی۔

”دل سوچ کا پنجرہ ہے ایک بار ہی کھلتا ہے دل پیار کا سودا ہے ایک بار ہی ملتا ہے“ آخری شعر گنگناتے ہوئے وہ خود بھی بڑی بے خودی کیفیت میں تھا۔

”دل درد کا ٹکڑا ہے بے چین سا رہتا ہے“ عیسیٰ کی آواز نے پورے ماحول پر سحر طاری کر رکھا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو گویا طلسم پھر سے ٹوٹ

جگہ کوڑے دان کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ وہ اس الجھن کو اپنے تئیں ڈسٹ بن کے حوالے کر چکی تھی مگر الجھنیں یوں اٹھا کر کوڑے دان میں پھینک دینے سے ختم ہو جاتیں تو آج ہر کوئی اپنی زندگی میں مطمئن اور شاد ہوتا۔

☆☆☆ اس کی زندگی میں آنے والی یہ صبح بھی عجیب تھی۔ اور ہوتا یوں تھا کہ جو صبح بھی عجیب ہوتی، عجیب طرح سے طلوع ہوتی، وہ مالا کے... پورے دن کو عجیب بنا دیتی تھی۔

تو پھر یہ صبح بھی عجیب طرح سے طلوع ہوئی، ہوا کچھ اس طرح کہ پہلے کیا حسین، چمکیلی سنہری دھوپ لگی، محض آدھے گھنٹے کے لیے، عیسیٰ نے گلاس ونڈو کے جالی دار ٹائیلوں کے پردے کو ہٹا کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے کرسیاں اٹھائے لان میں جا پہنچا۔ کچھ دیر بعد چاچو بھی عیسیٰ کے بلاوے پر بھاگے، بھاگے چلے گئے تھے مگر یوں ہوا کہ لحوں میں آسمان نے رنگ بدل لیا، سورج نے بدلیوں میں چہرہ چھپایا اور اوپر سے شفاف چمکیلی موتی برسے لگے۔

ٹپ ٹپ بارش برستی جا رہی تھی اور عیسیٰ ایک مرتبہ پھر کرسیاں اٹھائے برآمدے کی طرف بھاگا تھا۔ چاچو تو بارش کی ہولناکی ملاحظہ کر کے بد مزہ سے ہو کر اپنے بیڈ روم میں گھس گئے تھے جبکہ عیسیٰ وہیں برآمدے میں اسٹول پر براجمان برستی بارش کا نظارہ کرنے لگا تھا۔ اسے ایسی فرصت کبھی کبھی نصیب ہوتی تھی اور آج کا خوش قسمت ترین دن چھٹی کا تھا۔ سو عیسیٰ کا دل تھا وہ چھٹی کو خوب انجوائے کرے۔

مالا کچن میں ناشتا بنا رہی تھی اس کا رخ بھی برآمدے کی طرف تھا، وہ ایک نظر عیسیٰ کو دیکھ کر دوبارہ کچن میں آگئی تھی۔ مالا اسی سمت کھڑی تھی جہاں سے علی عیسیٰ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بڑے ہی انہماک سے بارش کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر



”اُوہ..... تو یہ بات تھی۔“ وہ ہاتھوں سے میدہ کھرچتی عیسیٰ کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ عیسیٰ نے عادتاً اسے نیچے بیٹھنے سے ٹوکا تھا مگر وہ عیسیٰ کی یہ بات نہیں مانتی تھی، اسے عیسیٰ کے سامنے فرش یا کارپٹ پر بیٹھنا بہت پسند تھا۔

”ویسے یہ پرفیوم مجھے چاچو نے لے کر دیا تھا۔“ مالا اپنے دو بچے کو سوتی مسکرائی تھی۔ اس نے چوڑی دار پاجامہ اور لمبی سی قمیص پہن رکھی تھی، عیسیٰ کو مالا کے ایسے تمام ڈریسز پسند تھے۔ وہ لمبی فرائگ کو بھی پسند کرتا تھا۔ مالا نے اپنی وارڈروب کو رنگ، رنگ کے کپڑوں سے بھر رکھا تھا۔ ان میں زیادہ ڈریسز وہ تھے جنہیں اس کی ماں نے پاکستان سے بھیجا تھا۔ آہ، پیاری ماں، اتنے فاصلوں کے باوجود بھی دوری کا احساس نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ ماں ہی تو تھی جس نے دل سے دل تک کے درمیان اپنی محبت سے ربط قائم کر رکھا تھا۔ وہ دور دیس میں موجود اپنوں کی یاد میں پور، پور بھیگنے لگی تھی مگر عیسیٰ نے اس کی یہ کوشش ناکام کر دی۔ وہ مالا کو اپنے علاوہ کچھ اور سوچنے نہیں دیتا تھا۔

”میں جانتا ہوں، پاپا میری پسند سے آگاہ ہیں۔“ عیسیٰ نے بے نیازی سے کہا تھا، برستی بوندوں سے اس کا دھیان ہٹ گیا تھا، اب وہ مالا کی طرف متوجہ تھا اور اسی کو دیکھنا چاہتا تھا۔

”اور میں.....؟“ مالا نے ٹھٹک کر کہا۔  
”تم ابھی وہاں تک نہیں پہنچی.....“ عیسیٰ شریر ہوا۔  
”کہاں تک.....؟“ وہ بھینسی بھینسی آواز میں چیخی۔

”جہاں سے محبت ختم ہوتی ہے اور عشق شروع ہوتا ہے۔“ وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مالا کو ڈھیر سارا غصہ آ گیا۔

”اچھا تو میں اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنچی.....؟“ مالا نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ عیسیٰ

نے بے ساختہ اسے ٹوک دیا تھا۔

”وہاں تک نہیں پہنچیں..... تاہم قریب، قریب ضرور ہو۔“ مالا کی ناراضی نے اسے کھل کر قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔ مالا کا منہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ خفگی مصنوعی تھی مگر عیسیٰ کی جان پر بن آئی۔ اس نے مسکراہٹ سمیٹ کر اٹھتی ہوئی مالا کو بے ساختہ روکا تھا مگر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”کیا تم نے سوزن کا شکر یہ ادا کر دیا؟“ کچھ دیر بعد عیسیٰ اس کے پاس موجود تھا۔ اس کے الفاظ اور لہجہ نارٹل تھا پھر بھی مالا کا دل بری طرح سے کانپ اٹھا۔ پھر وہ ہی پارسل، سلپ اور پھر بریسیلیٹ..... اس کا دھیان اپنے کمرے کے ایک کونے میں رکھی ڈسٹ بن تک گیا تھا، جس کے اندر وہ تڑا مڑا بریسیلیٹ رکھا تھا۔ اور نکلے، نکلے ہوئی سلپ، عیسیٰ کے الفاظ ایسے نہیں تھے جو مالا کو پریشان کر دیتے مگر وہ پھر بھی پریشان ہو چکی تھی۔

”میری اس سے بات نہیں ہو سکی۔“ وہ سچ، جھوٹ بولنے کے درمیان مطلق تھی۔ پھر اچانک مالا نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جھوٹ بولتی تب بھی بے چین رہتی..... اگر وہ کہہ دیتی، ہاں بات ہوئی ہے، میں نے اس کا شکر یہ بھی ادا کر دیا تو یہ کہنا مشکل نہیں تھا پھر اگر عیسیٰ سوزن سے خود پوچھ لیتا اور سوزن نے گفٹ ہی نہیں بھیجا ہوتا تب مالا کو منہ چھپانے کی کہیں جگہ نہیں ملتی، سو اس نے سچ بول کر خود کو کبھی مطمئن کر لیا تھا مگر کبھی، کبھی بلاوجہ ہی اطمینان رخصت ہو جاتا ہے، شاید عیسیٰ فی الوقت مطمئن ہو گیا تھا تبھی اس نے مزید کوئی سوال نہیں اٹھایا تھا۔ خاموشی سے ناشتا کرتا رہا، مالا چیکے سے کھسک گئی تھی پھر چاچو کو بلا لائی، وہ صبح، صبح ناشتا نہیں کرتے تھے، کبھی چائے پیتے، کبھی دودھ بھی جس کا ایک گلاس پی لیتے تھے، تاہم اکثر موڈ ہوتا تو ناشتے کی میز پر آجاتے..... چاچو کا میز تک آتا ہی ماحول کو خوشگوار

کر دیتا تھا اسی لیے مالا نضا کو کثیف محسوس کر کے چاچو کو بلا لاتی تھی..... اور چاچو کے آنے کی دیر تھی، عیسیٰ کا موڈ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ چاچو کو دیکھ کر وہ بے ساختہ چکا تھا۔

”آجائیں..... آج پرانے نہیں ہیں، قیمہ بھرے سلاکس اور انڈوں کا حلوا..... آپ کو اپنا لاہور یاد آ گیا ہے نا.....“ چاچو سربراہی کرسی سنبھال چکے تھے، یہ کرسی انہی کے لیے مخصوص تھی اور اب عیسیٰ کی چپکتی آواز کے موجب کو دیکھ رہے تھے، یعنی ناشتا آج اسے پسند آیا تھا اور وہ خوب رغبت سے کھا رہا تھا مگر تعریف اب بھی نہیں کی تھی۔ چاچو نے گہرا سا ہنکارا بھرا۔

”اتنا لذیذ حلوا کھا کر بھی تمہیں تعریف کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔“ ان کی پہلی گھر کی پر ہی عیسیٰ اشارت ہو گیا تھا۔ مالا کو لمحے بھر کے لیے وہ آفاق جیسا لگا تھا، تیز تیز بولتے ہوئے سانس لینے کے لیے بھی رک نہیں رہا تھا..... مگر وہ آفاق جیسا کیوں ہونے لگا..... اپنی فضول سوچ پر اسے جی بھر کے تاؤ آ گیا تھا۔ بڑے غلط نام پر آفاق کی طرف دھیان گیا تھا سو اسے غصہ کیوں نہیں آتا؟

”میں نے زندگی میں ایسا لذیذ حلوا نہیں کھایا بلکہ میں نے زندگی میں حلوا کبھی کھایا ہی نہیں..... پر اس لذیذ ڈش کو بنانے والے ایک سپرٹ ہاتھوں نے کمال کر دیا..... میں دوسری پلیٹ فل بھر کے معدے میں اتار چکا ہوں، ابھی سلاکس کھانے باقی ہیں، کاش کہ میں اتنی اتھارٹی رکھتا اور پورے من ہائیم کے فوڈ پوائنٹس بند کروا دیتا پھر میرے گھر کے سامنے ایک ہجوم کھڑا ہوتا اور میں فرم چلانے کے بجائے ہوٹل بنانے کا پلان کر لیتا..... ایسی بہترین کک ہم دونوں باپ، بیٹے کو کہیں نہ ملتی۔“ وہ مزے سے بولتا ہوا کبھی مالا کو اور کبھی چاچو کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے انڈوں کا تھوڑا اور حلوا اپنی پلیٹ میں ڈالا تھا۔ مالا

تو کہ وفا

کی گویا پوری محنت وصول ہو گئی تھی جبکہ چاچو، عیسیٰ کی جانے کس بات پر خفا ہونے کا موڈ بنا چکے تھے۔

”تم نے میری بیٹی کو بیکر اور خانسا ماں بنا دیا..... خود تم کہاں کے ڈیوک ہو۔“ چاچو نے لڑائی کا باقاعدہ آغاز کر دیا تھا، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ عیسیٰ خاموش رہ جاتا۔ مالا جب تک چاچو کے لیے ایلے چاول اور مسور کی... خوشبودار دال کا پاؤں بھر کے لائی تب تک جھڑپ نے ماحول کو خاصا گرم کر دیا تھا۔

”میں نے کب کہا، میں کہیں کا ڈیوک ہوں۔“ عیسیٰ بے ساختہ چلایا۔

”ڈیوک تمہارے جیسے ہوتے بھی نہیں۔“ چاچو نے شان بے نیازی سے کہا۔

”تو پھر آپ جیسے ہوتے ہوں گے؟“ وہ انہیں تاؤ دلا کر بولا تھا۔

”آف کورس.....؟“ چاچو نے مصنوعی کالر کھڑے کیے تھے۔ اب وہ دال چاول کھاتے ہوئے ہر، ہر اسپون کو بھرنے کے ساتھ مالا کی تعریف کیے جا رہے تھے۔ اور ان کا انداز مالا کا سیروں خون بڑھانے کے ساتھ ساتھ اسے جھینپنے پر بھی مجبور کر رہا تھا۔ کھانے کے دوران نوک جھوک جاری تھی جیسی عیسیٰ اٹھ کھڑا ہوا کہ اسے کہیں ضروری فون کرنا تھا وہ ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر فون تک آ گیا تھا۔ اسے اچانک ایک فون کال کا خیال آیا تھا۔ سیل کمرے میں رکھا تھا سو وہ لینڈ لائن تک آ گیا۔ ایک آفیشل کال کرنے کے بعد اس نے سوچا کافی دن سے گروسی کو کال نہیں کی۔ بس یہی سوچ کر وہ ڈائلڈ نمبر دیکھ رہا تھا آخری کال گروسی کے نمبر پر کی گئی تھی، کال کا دوران یہ پچیس سے تیس منٹ تھا۔ عیسیٰ قدرے حیران رہ گیا۔ اس کی پچھلے دو ہفتے سے گروسی یا تانتے سے بات نہیں ہو سکی تھی گھر سے آخری کال مالا نے کی تھی، عیسیٰ کو کال کرنے کے بعد..... یعنی سوزن کا نمبر عیسیٰ سے لے کر پھر اسے کال کی گئی تھی مگر بقول مالا



”آں..... ہاں..... اللہ نہ کرے، جو ہمیں کبھی رسوا کروں، پھر خود سے جدا کروں.....“ عیسیٰ نے مالا کو اپنے گارڈن سے ایک کٹی توڑ کر دی تھی۔ مالا روتے، روتے ہنس پڑی۔ عیسیٰ نے بارش میں دھوپ نکلتی دیکھی تھی پھر دھوپ میں بارش برستی دیکھی تھی۔ دونوں منظر اس کی نگاہ کو مبہوت کر گئے تھے۔ وہ گویا مسحور سا کھڑا تھا اور اس سحر کو مالا کی آواز نے توڑا تھا۔

”آپ کو کیا ہوا تھا.....؟ ایسے اٹھ کر کہاں چلے گئے تھے؟ بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔“ مالا کا شکوہ عیسیٰ کو کچھ وقت پہلے کی ذہنی کشمکش میں دھکیل گیا تھا۔ اسے کچھ توڑی دیر پہلے کی اذیت یاد آگئی..... وہ مالا سے کچھ پوچھنے اور نہ پوچھنے کے درمیان معلق ہو گیا تھا اگر اس نے انکار کر دیا تو.....؟ اگر جھوٹ بول دیا تو..... چاہے مصلحت ہی سہی۔ پھر میرے اندر وہ ٹوٹ جائے گا جو کبھی ٹوٹنا نہیں چاہیے۔“ وہ کسی تکلیف دہ ساعت کے اثر میں تھا..... وہ مالا کو بھلا کیا بتاتا.....؟ وہ مالا سے کیسے پوچھ لیتا؟ اگرچہ بات بڑی نہیں تھی۔ مالا خود سے شیئر کر دیتی یا ہلکا سا ذکر بھی کر دیتی تب اس کے اندر ایسی بے چینی نہ اترتی مگر اب کیفیات مختلف تھیں، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے۔

”آپ کچھ بول نہیں رہے، آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....“ مالا کی آنکھوں میں ٹھکر اتر آیا تھا۔ وہ کس قدر گھبرا رہی تھی، شاید عیسیٰ کو اس کی گھبراہٹ کا اندازہ نہیں تھا مگر یہ مالا کی خام خیالی تھی، عیسیٰ اس کی بے چینی کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔

”مجھے کچھ کام تھا اسی لیے اچانک چلا گیا۔“ عیسیٰ نے بات بنا کر کہا۔ اگرچہ بات بنانا مشکل تھا مگر وہ سچ ہی تو بول رہا تھا۔

”بتا کر تو جاتے ناں.....“ وہ خفگی سے بولی۔

”آئی ایم سوری.....“ عیسیٰ نے مسکینی صورت بنائی تھی تب مالا نے بڑے خفا، خفا لہجے میں کہا تھا۔

”مجھے انگریزی کے اس خبیث لفظ ”سوری“

شکی مزاج نہیں تھا مگر الجھنیں اکثر الجھا لیتی ہیں..... پھر جب وہ چار گھنٹے بعد گھر واپس آیا تو مالا بے قراری سے برآمدے میں کھڑی نظر آگئی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی نے عیسیٰ کو قدرے نادم کر دیا تھا۔ وہ مالا کو بتائے بغیر جو نکل گیا تھا پھر وہ پریشان کیوں نہ ہوتی.....؟ اس صورت میں بھی کہ سیل فون گھر میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ عیسیٰ کو ہلکی سی ندامت ہوئی۔ وہ اتنی پریشان تھی کہ عیسیٰ کو دیکھ کر خود پہ قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

”کہاں چلے گئے تھے بتاتے؟“ اس نے سسکیوں کے درمیان روتے ہوئے کہا تھا۔ عیسیٰ کے دل کو کچھ ہوا، اس کے اندر بے قراری بڑھ گئی تھی، اس نے بہ مشکل مالا کو چپ کر دیا تھا۔ حالانکہ ابھی وہ ڈھیر سا رونا چاہتی تھی عیسیٰ کے اجنبی رویے پر اسے بہت سی باتیں بھی سنانا چاہتی تھی مگر عیسیٰ کے نرم پھولوں سے لہجے اور الفاظ کو سن کر ساری ناراضی اور غصہ بھلا گئی تھی۔ محبت میں ایسی ہی طاقت ہوتی ہے، مالا اس کے لفظوں سے نرم پڑ گئی تھی تو پھر عیسیٰ بھی اس کے آنسوؤں سے پگھل گیا تھا۔

”میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کسی کو اتنا مت چاہو کہ اس کی جدائی برداشت نہ کر سکو..... مگر مجھے لگتا ہے، میں تمہاری چاہت میں بہت آگے بڑھ گیا ہوں، اتنا کہ پلٹنے کا سوال نہیں..... اگر تم مجھے کبھی دکھائی نہیں دو تو میرا کیا حال ہوگا؟“ عیسیٰ کے محبوبانہ الفاظ اور لہجے نے کچھ دیر پہلے والی کشافیت کے اثر کو زائل کر دیا تھا۔ وہ رونا بھول گئی تھی۔ اب وہ مسکرا رہی تھی مگر لفظ جدائی نے پھر اس کی ہنسی کا رس نچوڑ لیا تھا۔

”جدائی کی بات کیوں کرتے ہو؟ رسوائی کی بات کیوں کرتے ہو؟“ مالا کی آنکھیں پھر سے لبالب بھر گئیں۔

اس نے چھٹی والے روز تک روکے ہوئے تھے۔ ہارڈ ویئر اسٹور سے کچھ سامان لے کر اس نے گاڑی کی ڈگی میں رکھا تھا پھر غیر ارادی طور پر اسپورٹس کلب کی طرف آ گیا..... وہ جب بھی کچھ ڈپریشنڈ ہوتا تھا تو اسپورٹس کلب کی طرف آ جاتا تھا۔ یہاں خود کو مصروف رکھنے کے لیے بہت سے کھیل تھے جس میں پیرا کی کرنا بھی تھا۔ لہروں پر تیرنا، لہروں کو چیرنا، پانی میں گم ہونا، ڈوبنا، ابھرنا، گویا چند لمحوں کے لیے دنیا کی ہر سوچ سے تعلق ٹوٹ جاتا تھا وہ آدھا گھنٹا اسی شغل میں مصروف رہا تھا مگر پھر بھی فریش ہونے کے بجائے اس کی طبیعت اور بھی ادب گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ٹینس کلب کی طرف آ گیا..... مگر ٹینس کورٹ میں بھی اس کے لیے دلچسپی اور کشش نہیں تھی جلد ہی اس پر بیزاریت طاری ہو گئی تھی اور آخری پناہ گاہ کی طرف اسے آنا ہی پڑا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے، دنیا کے کسی کونے میں بھی تمہارے لیے ویسا سکون نہیں ہو سکتا جیسا تم اپنے گھر کے کسی بھی گوشے میں محسوس کر سکتے ہو، وہ اپنی الجھی سوچوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا مگر اسے یہ خبر نہیں تھی کہ الجھن گھر سے باہر بھی نہ ختم ہو سکتی ہے نہ حل ہو سکتی ہے، الجھنیں وہیں پہ ختم ہوتی ہیں جہاں سے ان کی شروعات ہوتی ہے، اب اسے اسی مقولے پر عمل کرنا تھا جو بات کسی سے براہ راست کر لی جائے، اس خاموشی اور گریز سے بہتر ہے جو ایک چپ کی وجہ سے دماغ کو تپاتی رہے۔ وہ باہر اسی لیے چلا گیا تھا کہ مزید اس چیز پہ سوچنا نہیں چاہتا تھا مگر جب الجھی سوچوں سے پیچھا نہ چھڑا سکا تو واپس پلٹ آیا۔ اس نے مالا سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ اپنی الجھن کو نظر انداز نہیں کر سکا تھا پھر بہتر یہی تھا کہ وہ مالا سے صاف بات کر لیتا کیا خبر، اسے بتانا یاد ہی نہیں رہا ہو..... یا پھر مالا کے نزدیک اس بات کی کوئی وقعت ہی نہیں ہو؟ وہ حقیقت میں

کے سوزن سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ تانتے اور گروسی انگریزی اور اردو کی شدہ بدھ نہیں رکھتی تھیں۔ گروسی اردو تھوڑی بہت سمجھ لیتی تھیں مگر بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا پھر اگر سوزن سے بھی بات نہیں ہو سکتی تھی تو مالا نے گروسی کے گھر پچیس، تیس منٹ تک کس سے بات کی تھی؟ وہ شکی مزاج نہیں تھا، نہ وہ مالا پر شک کر سکتا تھا مگر جس تو عین انسانی فطرت ہے، اس سے مبرا تو کوئی بھی نہیں..... تو بس اسی تجسس کے تحت اس نے گروسی سے پوچھ لیا تھا تب انہوں نے تانتے سے پوچھ کر بتایا تھا کہ گل مالا کی کال آئی تھی، وہ سوزن سے بات کرنا چاہتی تھی مگر سوزن اس وقت گھر پر نہیں تھی تب آفاق آیا ہوا تھا تو تانتے نے آفاق کو فون پکڑا دیا۔ پھر آفاق نے جانے کتنی دیر بات کی ہوگی۔ گروسی نے سادگی سے سب جواب دے دیے۔ عیسیٰ نے فون بند کرنے سے پہلے ادھر ادھر کی دو چار باتیں کیں پھر فون بھی رکھ دیا..... مگر اس کے ذہن میں کوئی بات چھین دینے لگی تھی۔

”سوزن سے بات نہیں ہو سکتی مگر آفاق سے اتفاقا ہو گئی..... لیکن مالا نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ یہ بات کیوں چھپائی؟ کیا یہ بات چھپانے والی تھی؟“ اس کا ذہن بہت گرم سوال اگل رہا تھا۔

☆☆☆

الجھن چھوٹی ہو یا بڑی..... ہوتی تو الجھن ہے..... اگر ذہن میں الجھن کی گرہ لگ جائے تو آسانی سے کھلتی بھی نہیں ہے..... وہ بلاوجہ مشکوک نہیں ہوتا تھا مگر جہاں گرہ لگ گئی تو پھر آسانی سے کھلتی بھی نہیں تھی۔ وہ اتنا الجھ رہا تھا کہ اسے پاپا کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی، وہ اسے بلارہے تھے مگر عیسیٰ نے گویا سنا ہی نہیں تھا۔ وہ benz کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا تھا۔ ایک دم گھر میں گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ اگرچہ وہ بلاوجہ گھر سے نہیں نکلا تھا، اسے چھوٹے موٹے ایک دو کام نمٹانے تھے جو



عیسیٰ ہنستے ہوئے مالا کو بتا رہا تھا کہ ڈیج سے نا بلد ہونے کی وجہ سے آفاق نے کہاں، کہاں اسے ستایا نہیں تھا۔ تنگ آکر اس نے پاپا سے شکایت کی، پاپا نے شاید مومن سے ذکر کیا تھا پھر اسے مومن کے انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن مل گیا۔ حالانکہ عیسیٰ چاہتا تھا ادھر بھیجے کے بجائے وہ یہاں کے کسی ادارے سے لینگویج کورس کر لے۔ آفاق جلدی سیکھ جانے والوں میں سے تھا اور اب یقیناً اس کا کورس کمپلیٹ ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا سہمی اسے جب کی پریشانی ہو رہی تھی۔ حالانکہ آفاق کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی جب تک عیسیٰ یا پاپا یہاں تھے وہ کسی بھی پاکستانی کو پریشان ہونے نہیں دیتے تھے۔

ان کی گفتگو کا اختتام خوشگوار موڈ پر ہوا تھا اور ہمیشہ کی طرح عیسیٰ نے مالا کو علم و حکمت اور دانائی سے گندھی آخری بات سمجھائی تھی۔ وہ ایسی باتیں عموماً کرتا رہتا تھا مگر گفتگو کے اختتام پر اس دانائی بھری بات کی مالا کو سمجھ نہ آئی تھی۔ عیسیٰ نے اٹھ کر بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا تھا۔

”ایک بات تمہیں سمجھاؤں گا مالا.....! تھوڑی، تھوڑی نادان لگتی ہو، شاید کم عمری کی وجہ سے یا پھر آگہی کے درمیں کشف نہیں ہوئے تم پر..... ویسے بھی ہم جو کچھ سیکھتے ہیں کتب حیات میں سیکھتے ہیں..... درسگاہیں، اسکول، یونیورسٹیز ہمیں کچھ نہیں سکھاتیں..... شاید کتاب حیات تمہیں بہت کچھ سکھا دے مگر اس سے پہلے ایک بات یاد رکھنا، اگر سچائی کو اس کی اصل ضرورت کے وقت پیش نہ کیا جائے تو پھر اس کے وجود کا اعتراف بیکار ہو جاتا ہے، امید ہے تم سمجھ گئی ہوگی.....“ وہ نرم الفاظ میں بولتا ہلکا پھلکا ہو کر اسے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ عیسیٰ نے مالا کو سرزنش کی تھی یا تہیہ.....؟ جو بھی تھا علی عیسیٰ کی بات کو مالا نے اپنی گرہ سے ضرور باندھ لیا تھا۔

اس سے اگلا دن مالا کے لیے خاصا مصروف

آہستی تھی سوانہوں نے پاس بیٹھے آفاق کو فون پکڑا دیا تھا پھر اس سے کافی بات ہوئی، مجھ سے سفارش کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میرے ذہن سے بھی نکل گیا۔ بے چارہ کافی اچھا ہے اور جاب لیس بھی۔“ آفاق کے ذکر نے مالا کو اس کی درخواست بھی یاد کروا دی تھی بھلے وقت میں عیسیٰ نے بھی آفاق کا ذکر چھیڑا تھا۔ وہ اس سے آفاق کی جاب کے متعلق کہہ سکتی تھی، اگرچہ مالا کو انسانوں کی پہچان تو نہیں تھی مگر آفاق اسے بہت مخلص، سادہ اور ہمدرد سا لگا تھا پھر عیسیٰ کی تو اتنی تعریف بھی کرتا تھا اور مالا کو ہر وہ بندہ پسند تھا جو عیسیٰ کی تعریف کرتا۔

”آں..... تو اس نے تم سے کہا، جاب کے لیے سفارش کرو؟“ عیسیٰ ایک دم حیران ہو گیا تھا، وہ کچھ دیر پہلے کی الجھن کی طرف ہوتی تھی اس کی ساری چونچالی لوٹ آئی تو اس کا اندازہ ٹھیک ہی نکلا تھا۔ مالا اسے آفاق کے بارے میں بتانا بھول گئی تھی۔ یہ اتنی اہم بات بھی نہیں تھی کہ جسے مالا یاد رکھتی..... عیسیٰ کو مالا اس لمحے بہت پیاری لگی تھی، انتہائی سادہ، معصوم اور تھوڑی، تھوڑی بھلکھو.....

”جی ہاں اس نے کہا..... آپ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گے سو میں جاب کے لیے آپ سے کہوں.....“ مالا نے بڑے مان بھرے لہجے میں کہا۔ عیسیٰ کو اس کا مان توڑنا اچھا نہیں لگا تھا سو کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا گیا۔

”بات تو میں تمہاری کبھی نہیں ٹال سکتا۔ مگر یہ آفاق بطور سیکرٹری میرا ناک میں دم کر دیتا ہے۔“ عیسیٰ نے اسے کچھ سابقہ واقعات بھی بتائے تھے جسے سن کر وہ ہنس، ہنس کر دہری ہوتی رہی۔

”وہ پرسنل سیکرٹری کے بجائے بیوی بننے کی کوشش کرتا ہے، تمہیں تو پتا نہیں ہوگا میں نے اپنی قابل ترین سیکرٹری ایملینس کو ہٹا کر اسے پاپا کے کہنے پر جاب دی تھی مگر اس نے مجھے ذلیل و خوار کر دیا.....“

تھیں۔ عیسیٰ کو اپنی تائی اور کزنز سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ کبھی زندگی میں موقع نہیں ملا تھا کہ وہ ان سے مل سکتا..... اب اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ جلد ہی مالا کو لے کر پاکستان جائے گا۔ وہ اپنے بہن، بھائیوں کے لیے بہت ادا اس تھی، اگرچہ منہ سے کہتی نہیں تھی پھر بھی عیسیٰ، مالا کی فیملی کو سمجھتا تھا اور عیسیٰ کو یہ بھی پتا تھا کہ وہ بندیا اور ذی شاہ کو بہت مس کرتی تھی۔ اسے بندیا سے بہت پیار تھا، ان دونوں بہنوں کی بہت دوستی تھی۔ عیسیٰ کو خبر تھی ذیشان تھوڑا سیلفش تھا یعنی اپنی ذات کے بارے میں سوچنے والا..... ذی شاہ کچھ بے پروا تھا جبکہ زرشام یعنی شامی بہت شرارتی تھا۔ وہ مالا کی زبانی گھر کے ہر فرد کی عادت، مزاج اور شخصیت کے بارے میں جان چکا تھا۔ وہ ان سب سے ملنے کا خواہشمند تھا، پاپا کی خواہش تھی کہ مومن کی شادی کر کے وہ بھی ان کے ساتھ پاکستان چلے جاتے مگر فی الحال یہ ممکن نہیں تھا۔ مومن شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہی تھی۔

فی الوقت وہ مالا سے اس کے گھر کی ہر چھوٹی بڑی بات ڈسکس کرنے کے بعد قدرے ریلیکس ہو گیا تھا پھر اسی ریلیکس موڈ میں اس نے بے حد سرسری سے لہجے میں مالا سے اصل بات پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ وہی بات جس نے عیسیٰ کو اندر سے کچھ مضطرب کر رکھا تھا۔ اس کا انداز اتنا سرسری سا تھا کہ مالا ہرگز بھی چونکی نہیں تھی جیسے معمول کی باتیں کرتے ہوئے اچانک کسی کا ذکر چھیڑ لیا جائے بالکل اسی طرح عیسیٰ نے آفاق کی بات چھیڑ لی تھی۔

”تم نے کبھی آفاق سے بات کی؟ یا تمہاری کبھی آفاق سے بات ہوئی؟“ عیسیٰ کا انداز اتنا عام اور نارٹل سا تھا کہ مالا ہرگز بھی ہنسی نہیں تھی بلکہ کچھ یاد آنے پر سرسری سے انداز میں بولی تھی۔

”ہاں تو..... جس روز سوزن کو کال کی تھی، فون تب تانتے نے اٹھایا تھا۔ انہیں میری بات سمجھ نہیں

سے بہت سخت نفرت ہے۔“ وہ دھپ، دھپ کرتی اندر چلی آئی تھی، عیسیٰ بھی اس کے پیچھے چلا آیا..... وہ سوچ رہا تھا کہ مالا سے خفا ہونا مشکل ہے، وہ اس لڑکی سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا تھا۔

”میں جرمن میں سوری کر لیتا ہوں۔“ عیسیٰ نے فرمانبرداری کے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے، تب مالا نے گویا ہاتھ باندھ لیے۔

”آپ مجھے اپنی گچ گچ سے تو محفوظ ہی رکھیں.....“ وہ تپ کر بولی تھی۔

”تو پھر کیا کروں.....؟“ عیسیٰ حقیقت میں سوچنے لگا تھا، مالا کی خفگی کتنی جان لیوا تھی اور اس کے آنسو دیکھنا مشکل ترین کام تھا۔ وہ خود سے عہد کر رہا تھا کہ اب کبھی مالا کو نہیں رولائے گا۔

”کچھ نہیں.....“ مالا بے نیازی سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔

”لخت میں اس کے کیا معنی ہیں؟“ وہ ہونق پن سے بولا تھا پھر مالا کو بے ساختہ ہنستے دیکھ کر جھینپ گیا۔

”تم بھی ناں.....“ اسے ہنسی آنے لگی تھی کیونکہ مالا بھی ہنس رہی تھی۔ اسی ہنسنے مسکرانے کے چکر میں عیسیٰ کو پھر وہی فون کال یاد آگئی تھی۔ لمحہ بھر پہلے کھلنے والی گرہ پھر سے بندھ گئی۔ اس نے مالا کو چائے بنانے کے لیے بھیج دیا تھا..... جب تک وہ واپس آئی، عیسیٰ لفظوں کو ترتیب دے چکا تھا..... وہ اس کے قریب بیٹھ گئی تھی پھر عیسیٰ نے مالا سے ہلکی پھلکی بے شمار باتیں کی تھیں۔ چھوٹی، چھوٹی، اس کے بچپن کی، گھر والوں کی، تائی، تائی، بندیا اور اس کے بھائیوں کی بے شمار باتوں کے دوران اسے پتا چلا تھا کہ ذیشان اپنی کزن یعنی میں انٹرنسٹڈ ہے، ان دونوں بہنوں کو عیسیٰ پسند نہیں تھی۔ عیسیٰ میں نخرہ اور غرور تھا۔ ان کی می یعنی عیسیٰ کی تائی بہت نرم مزاج اور حلیم الطبع خاتون تھیں۔ اپنے بچوں پر زور زبردستی کی قائل نہیں



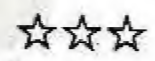
تھا، تاشیتے کے بعد وہ انسٹی ٹیوٹ پہنچ گئی تھی۔ آج کی کلاس بہت اہم تھی، اس کی اتالیق نے چھٹی سے منع کیا تھا۔ آج اسے یہ سیکھنا تھا کہ اگر اچانک اسے کیمسٹ یا ڈاکٹر کے پاس جانا پڑ جائے تو اسے کیا کہہ کر اپنا مسئلہ بتانا ہوگا۔ اہم نکات ہمیشہ کی طرح وہ اپنی ڈائری میں لکھ رہی تھی اگرچہ اس نے زیادہ امید نہیں رکھی تھی کہ وہ زبان سیکھ جائے گی مگر پھر بھی عیسیٰ کے لیے یہ گھونٹ تو بھرنا ہی تھا..... وہ برابر اسے ڈھارس بندھاتا تھا کہ مالا کو دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے..... کوئی بھی کام مشکل ضرور ہوتا ہے مگر ناممکن نہیں، بس اسی حوصلے کی بدولت وہ دل بڑا کر کے روزانہ کلاس اینڈ کرنے آ جاتی تھی۔

جرمن زبان سیکھنے کی اس کلاس میں اس کی سب سے اچھی پہلو ہائے ہو گئی تھی جیسی اس روز، ہیرا نام کی لڑکی..... کلاس فیلوز کے بارے میں اپنی رائے دے رہی تھی۔ ایک، ایک کر کے سب کی باری آتی گئی اور مالا کے بارے میں وہ کہنے لگی۔

”مالا علی عیسیٰ، این فاخ پوے“ (سادہ گڑیا) ہیرا کی دیکتی آنکھوں میں سچائی کے رنگ تھے۔ پوری کلاس نے گویا تائید میں پُر جوش تالیاں بجائی تھیں..... وہ سب لوگ مالا کے لیے ان الفاظ پہ متفق تھے اور بہت خوشی کا اظہار کر رہے تھے، مالا نے ان سب کے دلوں میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ خصوصاً ہیرا کے دل میں مالا کے لیے خوب جگہ نکل آئی تھی۔

وہ ہیرا کے الفاظ پر غور کر رہی تھی۔ اور یوں ہی اچانک ذہن میں کچھ کلک ہوا تھا۔ اسے بواریا کے چھوٹے سے قصبے میں اس ہاؤس فراؤ کے الفاظ یاد آئے تھے جو اس نے مالا کے لیے کہے تھے۔ ”این فاخ پوے اور پھر اس رات سوزن، مون سے کچھ کہہ رہی تھی۔ مالا کے ذہن میں پھر سے جھماکا ہوا تھا۔ سوزن کیا کہہ رہی تھی، کس کے بارے میں کہہ رہی تھی؟ مالا کو سب خبر ہو گئی..... سوزن کے وہ الفاظ مالا

کو بھولے نہیں تھے۔ بھول سکتے ہی نہیں تھے۔ ”این فاخ.....“ (سادہ) وہ مون سے کہہ رہی تھی، وہ مالا کے متعلق ہی بات کر رہی تھی..... وہ مون کو شاید سمجھا رہی تھی کہ مالا بہت سادہ ہے۔ وہ اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں..... مون اسے لفظوں سے tease (ستایا) نہ کرے..... یقیناً سوزن جانتی تھی کہ مون، ضرور مالا کو تیز کرے گی۔ تبھی اسے سمجھا رہی تھی کہ مالا ایسی نہیں..... وہ سادہ اور معصوم ہے، بے خطا ہے، اسے تنگ مت کرو..... مالا کے آنے سے پہلے شاید یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ اسکول کے گراؤنڈ میں چلتی ہوئی مسلسل سوزن کو سوچ رہی تھی۔ سوزن کی محبت کو سوچ رہی تھی، سوزن کے خلوص کو سوچ رہی تھی۔ وہ اپنی دوست نما بہن مون سے مالا کی خاطر الجھ رہی تھی۔ ایک اجنبی اور غیر لڑکی کی خاطر لڑائی کر رہی تھی۔ مون کو سمجھا رہی تھی بلکہ مون کو خفا اور ناراض کر رہی تھی۔ سوزن کتنی اچھی، کتنی نیک، کتنی عظیم تھی۔ اس پل مالا کے دل میں سوزن کے لیے محبت اور خلوص کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ سوزن اس کے سامنے ہوتی تو وہ اس کا منہ چوم لیتی..... سوزن کی محبت نے گویا مالا علی عیسیٰ کو بن داموں خرید لیا تھا۔



مالا نے عیسیٰ کو بتایا تھا کہ پہلے پہل اسے ہیرا اچھی نہیں لگی تھی، تھوڑی شوخ اور چھپھوری محسوس ہوتی تھی مگر اس سے تفصیلی بات کر کے اس کی سوچ بدل گئی۔ وہ خوش مزاج اور ہنسوز لڑکی تھی۔ مالا سے فٹ دوستی گانٹھ لی..... اب مالا کو اپنی سوچ پر ندامت تھی..... خواہ مخواہ وہ ہیرا کو چھپھوری سمجھتی رہی تھی۔ وہ اپنے لینگویج اسکول کے کلاس فیلوز کے بارے میں عیسیٰ سے باتیں کر رہی تھی۔

”ہر انسان کا ایک نہ ایک روپ آپ سے چھپا ہوا ضرور ہوتا ہے ورنہ آپ کسی کے خاص روپ سے

چھپتے نہیں..... اب تمہیں پتا چلا ہے کہ ہیرا چھپھوری نہیں بلکہ خوش مزاج اور ہنسوز ہے۔ پانی میں اترے بغیر اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، انسان کو سمجھے، پرکھے اور جانے بغیر اس کی شخصیت پہ فتویٰ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔“ وہ علی عیسیٰ تھا، کوئی بھی بات بنا مقصد کیے جانے کو گناہ سمجھتا تھا۔ وہ زندگی کو محتاط انداز میں برتنے والا بندہ تھا۔ اس نے مالا کو ایک مرتبہ بتایا تھا کہ اس نے آج تک کسی سے بداخلاقی نہیں کی، کسی کا برا نہیں چاہا، فحش کلامی نہیں کی..... کلاس فیلو سے ایک حد تک انسیت اور لگاؤ بھی رکھا..... مگر دوستی میں حدود و قیود کا خاص دھیان رکھا تھا۔ نہ اتنا بیٹھا ہوا کہ لوگوں نے اسے نکل لیا، نہ اتنا کڑوا ہوا کہ لوگوں نے اسے تھوک دیا..... اس نے باپ سے سیکھے علم، ہنر اور فن کو مٹھی میں قید کر کے زندگی کا سفر شروع کیا تھا..... اسے میانہ روی نے کبھی ڈرگانے نہیں دیا..... وہ اپنا فن مالا میں منتقل کرنے پر بضد نہیں تھا وہ تو بس اسے زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق سمجھانا چاہتا تھا۔

”مالا ہر مسکراہٹ کے پیچھے خلوص نہیں ہوتا اور نہ ہر خلوص بھری مسکراہٹ کے پیچھے منافقت ہوتی ہے۔ بات معمولی ہے اگر سمجھ لی جائے۔“ وہ اسے بتانا چاہتا تھا، بھروسے اکثر ٹوٹ جاتے ہیں، وہ بھی ہر کسی پر بھروسا نہیں کیا کرے، عیسیٰ اسے سمجھا دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی نکلون کو گھر، عیسیٰ اور چاچو تک محدود رکھے، اسے وسیع کرے گی تو توڑ.... دے گی اور عیسیٰ کو پورا یقین تھا کہ وہ عنقریب تین کی اس نکلون کو وسیع کرنے کی خواہش کرے گی، وہ مون کے متعلق بات کرے گی، مالا اسے اپنی زندگی میں شمولیت کی دعوت دے گی اور حیرت انگیز طور پر مالا نے گفتگو کا رخ ہیرا سے ہٹ کر مون کی طرف موڑ دیا تھا۔ وہ بہت سادگی بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”میں ہیرا کو بہت چھپھوری سمجھتی تھی مگر وہ ایسی

**ترک و وفا**

نہیں، اسی طرح مون کو بہت عجیب اور پراسرار سمجھتی ہوں، مجھے لگتا ہے، مون بھی ایسی نہیں.....“ یہ ایک عام سی سوچ تھی جسے اس نے عیسیٰ سے شہیر کر لیا تھا۔ عیسیٰ کھانا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے مالا کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ کھانا کھا چکا تھا..... اب مالا کی بات ختم ہونے کا انتظام کر رہا تھا۔

”دیواریں محض قلعوں کی نہیں ہوتیں مالا.....! دل کے اندر بھی ایک دیوار ہوتی ہے، وجود کے اوپر بھی ایک دیوار ہوتی ہے، انسان اپنی ذات کو پرت در پرت چھپائے رکھتا ہے۔ انسانی ذہن، سوچ اور شخصیت کو کھوجنا آسان نہیں، کوئی اس کھوج میں آگے تک نکل جاتا ہے اور سمجھو، یا تو وہ بھٹک جاتا ہے یا انسانیت کی اعلیٰ معراج پالیتا ہے۔ تمہیں میری کہاد میں حیران کرتی ہیں ناں.....؟ دراصل میں نے ڈسکو کلب میں وقت ضائع نہیں کیا، نہ شراب کے نشے میں اپنے حواس معطل کیے ہیں، اپنی تھوڑی سی عمر کا زیادہ تر وقت صحت مندانہ سرگرمیوں میں گزارا ہے۔ تبھی کچھ نہ کچھ وہ پاچکا ہوں جس کی خواہش تھی..... اور جہاں تک مون کی بات ہے تو اس کے بارے میں کیا کہوں؟ جب تک پتھروں سے واسطہ نہ پڑے، ان کی سختی، نوکیلے پن اور وزن کا اندازہ نہیں ہو سکتا اور پھر ہر کوئی الفاظ کو اپنی سمجھ کے مطابق ڈھالتا ہے۔“ عیسیٰ نے کتنی روانی اور سجاؤ سے مالا کو بہت کچھ باور کروانے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو بزنس کی کتابیں پڑھتا رہا تھا یہ حکمت، دانائی اور فلسفہ کہاں سے سیکھ گیا؟ مالا کو لگا، وہ اپنے سامنے ایسے نوجوان لڑکے کو دیکھ رہی ہے جو اپنی ذات میں ایک پوری یونیورسٹی ہے جبکہ وہ خود کو چھوٹا سا کتب خانہ بھی ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مون وہ نہیں جو نظر آتی ہے؟“ اس کے بے تکے سوال کو سن کر عیسیٰ نے بردباری کی انہما کر دی تھی۔ وہ جھنجھلائے بغیر ایک مرتبہ



پھر رک گیا۔ حالانکہ اسے دفتر سے دیر ہو رہی تھی، یہ بھی حقیقت تھی کہ دفتر اپنے باپ کا ہی تھا مگر وقت کی پابندی تو لازم تھی چاہے مالک ہو یا ملازم.....

”خاموشی بغیر تخت کی بادشاہی ہے۔“ عیسیٰ کی مسکراہٹ نہ جانے کہاں سے اٹھ آئی۔ مالا اس کی کوئی اور بات سمجھتی یا نہ سمجھتی مگر یہ بات ضرور سمجھ گئی تھی۔ اسی لیے فوراً منہ پھول کر گپا ہو گیا تھا حالانکہ عیسیٰ کے لہجے میں گنتی شرارت تھی مگر وہ سمجھ ہی نہیں پائی۔

”آپ کا مطلب ہے، میں بولوں ہی نہ.....“ اس نے بھٹا کر کہا تھا، عیسیٰ کی توقع کے عین مطابق وہ ناراض ہو گئی تھی۔

”میں نے بس اتنا کہا ہے کہ فضول بولنے سے بہتر خاموشی ہے۔“ عیسیٰ نے فوراً وضاحت کی تھی مگر یہ وضاحت کا رگر ثابت نہیں ہوئی۔ مالا کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا جبکہ وہ چاہتا تھا کہ مون کی شخصیت پر مزید بات نہ ہو، ٹائیک بدلنے کے لیے مالا کی ہلکی پھلکی خفگی اسے گوارا تھی مگر اب کہ..... مالا ذرا سیریس قسم کی ناراض ہو چکی تھی۔

”آئندہ آپ میری آواز نہیں سنیں گے۔“ وہ عجلت میں کرسی پیچھے کر کے اٹھ گئی تھی جبکہ عیسیٰ اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا وہ لمحے بھر کے وہ بھونچکا رہ گیا..... پھر اسے فوراً احساس ہوا تو مگر ذرا دیر ہو ہی گئی تھی۔ مالا نے کمرے میں جا کر دروازہ لاک کر لیا تھا۔ یعنی عائلی زندگی کا پہلا سنجیدہ ٹائپ کا جھگڑا.....

مگر جھگڑا تو ہوا نہیں تھا۔ بلاوجہ ناراضی ہو گئی تھی۔ عیسیٰ بے چارہ پریشان سا ہو گیا..... اس نے دیکھا تھا، مالا نے کھانا بھی نہیں کھایا..... اور اب ناراض ہو کر اندر بند ہو گئی تھی، عیسیٰ نے پاپا کو پریشان کرنے کے خیال سے کچھ نہیں بتایا تھا نہ انہیں جگا کر فکر مند کیا..... وہ خود ہی مالا کی منتیں کرتا رہا..... اسے دفتر جانا ہی بھول گیا تھا۔ اپنے بیڈروم کے باہر کھڑے ہو کر مالا کو آوازیں دے کر بولنے پر مجبور کرنے کا تجربہ بھی

خاصا انوکھا تھا۔ وہ ایک پریکٹیکل لڑکا تھا۔ شروع سے لے کر اب تک خاصا روکھا مزاج بھی تھا مگر مالا کے اس کی زندگی میں چلے آنے کے بعد بہت سی تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

اب وہ دروازے پر دستک دے رہا تھا اور دستک دینے والا بھی ایک حد تک دستک دیتا ہے اگر کواڑ بروقت نہ کھولے جائیں تو دستک دینے والے ہاتھ گر جاتے ہیں، قدم پلٹ جاتے ہیں، وہ اس فلسفے کی گہرائی سے ابھی تک واقف نہیں تھی۔ دوسری طرف وہ بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ باہر کھڑا اپنا سب سے ضروری کام کر رہا تھا..... بھلا مالا کو منانے کے علاوہ فی الحال کوئی اور اہم کام ہو سکتا تھا؟

”وقت ضائع کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وقت آپ کو بھی ضائع کر رہا ہے۔“ عیسیٰ نے اونچی آواز میں اسے سنانے کو کہا تھا۔ پورے سات منٹ گزر چکے تھے۔ وہ گھڑی پر نگاہیں جمائے کھڑا تھا۔ اندر سے ذرا سی بھی آہٹ نہیں آرہی تھی۔ عیسیٰ سخت بے چین تھا اور اندر تک اس کی بے چینی، بے قراری اور بے تابی کی آہٹیں پہنچ رہی تھیں مگر دروازہ پھر بھی کھل کر نہ دیا..... دس منٹ چپکے سے نکل گئے۔ مالا کی ناراضی شدید نوعیت اختیار کر رہی تھی۔ حالانکہ بات اتنی بڑی نہیں تھی۔ وہ اور بھی بے قرار ہوا..... نظریں گھڑی کے آر پار ہو رہی تھی۔

عیسیٰ زہرب آ نکھیں بند کیے بڑبڑاتا رہا..... تیرھواں، چودھواں اور پندرھواں منٹ گزرنے والا تھا۔ اچانک چڑچڑ کی آواز سے دروازہ کھل گیا تھا بلکہ کھلا نہیں، باہر کی صورت حال ملاحظہ کر کے پھر سے بند کر دیا گیا تھا۔ عیسیٰ پھر سے بھونچکا رہ گیا..... اس نے انتہائی دلسوز لہجے میں آہ بھر کر کہا تھا۔

”آپ کا پل پل بدلتا رویہ، آپ سے وابستہ لوگوں کو پل پل اذیت میں مبتلا کر رہا ہے۔“ اس کے بھیکے لہجے میں مقناطیس کی سی کشش تھی۔ کاش وہ پہلے

یہ حربہ استعمال کر لیتا، مالا نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔ عیسیٰ کے سامنے اس کا دکھی سا چہرہ آ گیا..... اس نے بے ساختہ مالا کی افسردگی دیکھ کر کہا۔

”ہٹ دھری سردیوں کی برف جیسی ہوتی ہے، زری بے فائدہ..... نہ اس کی ضرورت ہوتی ہے نہ قدر..... جس بات کی وضاحت کرنے کے لیے زبان ہو، اسے استعمال کر لینا چاہیے۔“ عیسیٰ کے نرم الفاظ پر وہ خفگی سے منہ پھلا کر جتانے والے انداز میں بولی۔

”اور اسی زبان کو اگر بند کرنے کا حکم دیا جائے تو.....؟“ مالا کے طنزیہ لہجے کو محسوس کر کے وہ مسکرا دیا تھا۔

”بات الفاظ کی نہیں، لہجے کی ہوتی ہے، تم نے الفاظ پر غور کیا..... لہجے پر نہیں..... اگر غور کر لیتیں تو غصہ نہ کھاتیں..... مگر غصہ تو تمہیں کھانا ہی تھا۔ بھوک جو لگ رہی ہے۔“ اس نے پہلے ہی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا..... تب مالا کو خیال گزرا..... عیسیٰ نے کہاوت غصہ دلانے والی بولی تھی مگر اس کی مسکراہٹ اچانک اٹھ آئی تھی۔ شرارتی سی مسکراہٹ تھوڑی چڑانے والی، تھوڑی زچ کرنے والی، اسے عیسیٰ کی بات ٹھیک لگی تھی اس نے الفاظ پر غور کیا تھا لہجے پر نہیں..... مگر تائید کر کے اسے اترانے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

”میں آپ کے فلسفے سے متاثر ہو کر دروازہ کھولنے پر مجبور نہیں ہوئی، بات فقط اتنی ہے کہ میں آپ کو ناراض نہیں کر سکتی اور نہ آپ کی خفگی سہہ سکتی ہوں۔“ مالا نے نرم آواز میں سچ اگل دیا تھا۔ عیسیٰ کے لیے مالا کے یہ الفاظ گویا امرت تھے۔ وہ سر تا پا سرشار ہو گیا۔

”کچھ چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہوتی ہیں۔ جیسے پھول کے ساتھ خوشبو جیسے چاند کے ساتھ ستارے..... جیسے دن کے ساتھ رات..... جیسے روشنی کے ساتھ اندھیرا..... اسی طرح روشنی اور منانے کا سنگم بھی بہت پرانا ہے۔ الفاظ جیسے بھی ہوں، مطلب ایک ہی لکھتا ہے، نہ تم میری خفگی سہہ

سکتی ہو اور نہ میں تمہیں خفا کر کے دنیا کے کسی کام کا ہو سکتا ہوں۔ میرے سارے کام اب تمہی سے شروع ہو کر تمہی پر ختم ہوتے ہیں۔ سواب ناراضی ختم، آرام سے بیٹھ کر کھانا کھا لو، بھوکے پیٹ تو بولا بھی نہیں جاتا، ناراضی تو دور کی بات ہے۔“ وہ اسے واہس میز تک لے آیا تھا، مالا خفگی بھلا کر اس بے پایاں محبت بھرے احساس رکھنے والے انداز پر مسکرا دی تھی۔ ایک نرم مسکراہٹ، دلوں کی رنجش دور کر سکتی ہے اور جانے لوگ لفظوں کے ذخیرے اور دلیلوں میں وقت ضائع کیوں کرتے ہیں؟ وہ اسی بات پر غور کر رہی تھی جبکہ عیسیٰ اسے اپنے زیر نگرانی کھانا کھلانے کے بعد آفس چلا گیا تھا پھر چاؤ اٹھے تو مالا نے عادتاً دن بھر کی روداد انہیں سنا دی تھی۔ وہ اتنا مزے کا سین نہیں دیکھ پائے تھے، یہی عیسیٰ کی منتیں کرنے والا، سو خاصے بد مزہ ہو رہے تھے، اس کے منہ سے من وعین پوری رومیٹک اسٹوری سن کر بھی خاصے افسردہ اور رنجیدہ تھے۔

”لایوسین کا تو اپنا ہی ایک الگ مزہ ہے۔“ انہیں شدید قلق تھا کہ مالا نے انہیں جگا یا نہیں..... اب وہ انہیں تسلی دے رہی تھی کہ پھر کبھی لایوسین دیکھ لیجیے گا۔ چاچو سوپ پی رہے تھے جبکہ مالا فون کی بیل سن کر اٹھ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ عیسیٰ کی ہی کال ہوگی مگر دوسری طرف سوزن تھی۔ مالا غیر متوقع طور پر اس کی آواز سن کر خوشی سے دیوانی ہو گئی تھی۔

”تم مجھے بھول گئی ہو سوزن.....“ اس نے بے ساختہ شکوہ کیا تھا۔ دوسری طرف سوزن متانت سے ہلکا سا مسکرائی تھی۔ مالا کا شکوہ سوزن کو بہت اپنائیت بھرا لگا تھا۔ وہ اس کی غلط فہمی فوری طور پر دور کرنا چاہتی تھی مگر اسی پل آفاق گھر میں داخل ہوا تھا۔ سوزن کچھ حیران ہوئی، وہ بیگ اٹھائے آیا تھا تو کیا وہ جانے والا تھا.....؟ رات کو گروسی بھی آفاق کی واپسی کے متعلق کوئی بات کر رہی تھیں مگر سوزن کا ان



### اصل وجہ

استاد: ”بھینس کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟“  
شاگرد: ”سر! یہ تو کوئی بے وقوف بھی بتا دے گا۔“

استاد: ”اسی لیے تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔“

### درد شریک

کراہیہ دار نے نصف شب کو مالک مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا، مالک مکان نیند سے بیدار ہو کر جلدی سے دروازے پر آیا تو کراہیہ دار بولا۔  
”میں اس صبح کراہیہ ادا نہیں کر سکوں گا۔“

”مگر یہ اطلاع دینے کا کون سا وقت ہے؟“ مالک مکان غصے سے بولا۔ ”تم یہ بات مجھے صبح بھی بتا سکتے تھے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر میں نے سوچا اس پریشانی میں، میں اکیلا کیوں جاگتا رہوں۔ تم بھی میرے درد شریک بھائی بنو۔“

از: نگینہ ضیا..... کیا ٹی وی

### زندگی

زندگی کی شام ہو رہی ہے پھر بھی سکون نہیں حاصل ہمیں چھائی سے من پر غم کی چادر قرار اب لہجی تو نہیں حاصل ہمیں زندگی اب کم ہی باقی ہے ہماری پھر بھی راحت کیوں نہیں حاصل ہمیں جاہت ہے کہ گزر جائیں اب تو ہم لیکن موت بھی اب نہیں حاصل ہمیں کیا کریں گے ایسی زندگی کا آنا سکون ہی جس میں نہیں حاصل ہمیں

از: اناخولہ بنت حوا، کراچی

آنکھوں میں سے ایک مقناطیسی لپک نکلتی دیکھی تھی، شاید لمحے کے آخری حصے سے بھی پہلے وہ لپک سوزن تک سفر کر گئی۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ بات ہوئی! یا پھر سوج سے سوج نگرانی تھی؟ جہاں انسانی عقل دم بخود رہ جائے وہیں سے معاملے کی شروعات ہوتی تھی۔ محض ایک لمحے کی دیر تھی۔ آفاق اب سوزن کی آواز سن رہا تھا جبکہ اس ایک لمحے میں نہ جانے کیا سے کیا ہو گیا تھا؟

”ہاں..... گفٹ میں نے بھیجا تھا مگر شکرے کی ضرورت نہیں۔“ سوزن کی ٹھہری سوئی سوئی آواز میں خوابیدگی کا عنصر نمایاں تھا۔ آفاق اسے پہلے سے فون پکڑے بولتے نہ سن چکا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ سوزن نیند سے اٹھ کر آئی ہے مگر اب تو اس کی حیرانی کا کوئی عالم ہی نہیں تھا۔ وہ اس لمحاتی اٹھل پھل کرتی کیفیت کو سمجھ نہیں پایا تھا مگر اس کے دل کی دھڑکن قابو میں نہیں آرہی تھی..... دماغ گویا مفلوج ہو گیا تھا۔ مون کے پلٹتے ہی غیر ارادی طور پر سوزن نے فون کریڈل پر بچھا اور آفاق کی طرف دیکھے بغیر کسی اور ہی عالم کو سوچتی راہداری کی طرف پلٹ گئی تھی جبکہ آفاق جو الوداعی سلام کرنے آیا تھا اپنے ایسے استقبال پر ششدر رہ گیا..... اس کی عقل گویا لمحے بھر کے لیے مفلوج ہو گئی تھی۔

☆☆☆

لائن اچانک ڈراپ ہو گئی تھی، مالانے سوچا کہ دوبارہ کال کرے مگر چاچو کی پکار نے ارادہ ڈانوں ڈول کر دیا تھا۔ اور وہ جو پہلی فرصت میں بیڈ روم کے ایک کونے میں رکھی کورپ کو کھٹکھٹانا چاہتی تھی وہی طور پر اتنا اہم کام بھول گئی..... دراصل چاچو کی پکار میں تکلیف کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی چاچو تک آئی تو وہ کرسی سے نیچے گرے گراہ رہے تھے۔ مالا کی تو گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ پہلی مرتبہ چاچو کو اس حالت میں کراہتے اور تکلیف

سے ریسیور پر ہاتھ رکھے بغیر بولی۔

”تم عیسیٰ کے گھر میں رہو گے؟“ سوزن نے شدید حیرت کا مظاہرہ کیا تھا کیونکہ آفاق کسی کے گھر پر ٹھہرنا..... پسند نہیں کرتا تھا۔ گروسی کے بہت دفعہ اصرار پر بھی وہ ریٹ پر کمرالے کر رہنے پر بضد رہا تھا اور ان کے گھر ٹھہرنے کو ترجیح نہیں دی تھی پھر اب بھلا کیسے مان گیا تھا؟ سوزن کیوں نہ حیران ہوتی.....؟

”ہاں..... جناب شرط یہی رکھی ہے، حالانکہ میں نے اتنا کہا، پہلے کی بات اور تھی..... اب تو مالا بھی ہے، اچھا نہیں لگتا مگر عیسیٰ نہیں مانا..... مجھے دھمکی دی کہ جاب نہیں دے گا..... مجبوراً اس کی بات ماننا پڑی..... ورنہ میں جاب کے لیے کہاں دھکے کھاتا.....؟ تم تو جانتی ہو ناں میرے گھر کے سارے حالات..... ماں کوچ کرانا ہے، دادی کے کڑے، بہنوں کی شادیاں وغیرہ..... وغیرہ..... وہ آفاق تھا، مختصر جواب نہیں دے سکتا تھا، سوزن تو اسے چھیڑ کر پچھتائی تھی جبکہ دوسری طرف مالانے بھی آفاق کی لن ترانیاں سن لی تھیں۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ اتفاقاً آج بھی آفاق یہاں موجود ہے۔ اس کی موجودگی میں پارسل کے بارے میں پوچھنا مناسب رہے گا؟ کچھ دیر کی کشمکش کے بعد بالآخر مالا نے سوزن سے پوچھ لیا..... بلکہ بہت مناسب طریقے سے شکر یہ ادا کرنا چاہا تھا۔

”تم نے مجھے گفٹ بھیجا تھا، اس کے لیے بہت شکر یہ.....“ اس نے بڑے محتاط الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ دوسری طرف سوزن کچھ حیران رہ گئی تھی۔ ابھی اس کے لبوں میں یہی الفاظ تھے کہ کون سا گفٹ.....؟“ جب اچانک لاؤنج کے دروازے میں کھڑی مون پر اس کی نظر پڑی تھی، عین اسی لمحے آفاق نے بھی لاؤنج کے دروازے کی طرف دیکھا تھا، پھر اس کی آنکھیں ایک عجیب سا منظر دیکھ کر گویا ابل کر باہر آ گئی تھیں۔ اس نے مون کی سحر طراز

کی طرف دھیان نہیں تھا..... اب آفاق کے بیک کو دیکھ کر اسے خیال آیا تھا کہ اس کا کورس کپلیٹ ہو چکا ہے، اس نے اشارے سے آفاق کو بیٹھنے کے لیے کہا تھا۔ جب وہ لاؤنج کے ایک کونے میں رکھے صوفے پر بیٹھ کر میگزین اٹھائے ورق گردانی کرنے لگا تب سوزن، مالا کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”میں تمہیں ہرگز بھی نہیں بھول سکتی۔“ سوزن کے محبت بھرے الفاظ نے آفاق کو کچھ چونکا دیا تھا..... وہ جو ذرا بے پروا سا بنا بیٹھا تھا، اب کچھ چونکتا ہو گیا۔

”یہ کس سے بات کر رہی ہے؟ وہ بھی اردو میں.....“ تجسس جیسا بھی ہو، انسان کی فطرت میں ضرور شامل ہوتا ہے، آفاق بھی سوچوں کے گھوڑے دوڑانے لگا تھا۔ یقیناً فون پر حسیب انکل نہیں تھے، ورنہ سوزن کا یہ انداز نہ ہوتا..... عیسیٰ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ سوزن سے اس طرح بات کرے..... وہ عیسیٰ کو اچھی طرح سے جانتا تھا پھر فون پر دوسری طرف کون تھا؟

”کیوں نہیں، میں چکر لگاؤں گی، تم شولے (اسکول) جا رہی ہو؟“ سوزن نے سابقہ مٹھاس بھرے لہجے میں کہا تھا۔ اب کہ آفاق کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا۔

”اوہ.... تو دوسری طرف مالا ہے۔“ غبارے میں سے نکلنے والی ہوا کی طرح آفاق کا تجسس ”پھر.....“ سے نکل گیا تھا، وہ ایک مرتبہ پھر میگ کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے بولا تھا، دوسرے معنوں میں اس نے سوزن کو یاد دلانا چاہا تھا کہ وہ بھی یہاں موجود ہے۔

”مالا سے کہہ دو، میری میزبانی کے لیے تیاری پکڑ لے..... میں کل وہاں پہنچ رہا ہوں..... عیسیٰ سے فون پر بات ہو گئی ہے۔“ آفاق نے کمال شاہانہ انداز میں بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا تب سوزن کچھ اچنبھے



سے تڑپتے دیکھا تھا..... انہیں سینے میں شدید درد تھا..... مالا بھاگتے ہوئے فون تک آئی پھر عیسیٰ کو فون کر کے چاچو کی خرابی طبیعت کا بتایا تھا۔ جب تک عیسیٰ آندھی طوفان کی طرح گھر آیا تب تک مالا روڑو کر بے حال ہو چکی تھی۔ وہ مالا کو تسلی دے کر چاچو کو ایسبولینس میں ڈال کر اسپتال چلا گیا تھا۔ جبکہ مالا تنہا، اکیلی گھنٹوں میں سردیے روٹی رہی۔ اس نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ چاچو کو پھر سے سینے میں اتنا بھیا تک درد اٹھے گا اور وہ اسپتال چلے جائیں گے۔ وہ جانے کتنے ہی گھنٹے بے آواز روتے ہوئے دعا میں کر رہی تھی۔ اسی دوران نماز کا وقت ہو گیا..... بکھری ہمتیں مجتمع کر کے وہ اللہ کے حضور نماز کے لیے کھڑی ہوئی تھی پھر آخری سجدے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنسو پھر سے بہتے چلے گئے تھے۔ جانے وہ کب تک روتی رہتی مگر فون کی چنگھاڑتی آواز نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا..... وہ لپک کر گرتی پڑتی فون تک گئی تھی۔ سینے میں دھڑکتا دل خوف سے... پھر پھڑپھڑا رہا تھا..... فون اٹھایا تو دوسری طرف سے غیر متوقع طور پر بندیا کی آواز سنائی دی تھی۔ آج پورے پندرہ دن بعد بندیا نے ہی بالآخر فون کیا تھا..... اور وہ خاصے جارحانہ تیور لیے ہوئے تھی۔ اس کی آواز سنے بغیر گویا ابل پڑی۔

”اللہ! تم جیسی بہن کسی کو نہ دے..... کبھی توفیق نہیں ہوتی فون کرنے کی..... جب بھی کیا، ہم نے ہی فون کیا..... تمہاری شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ تم عیسیٰ کو ہی پیاری ہو جاؤ۔“ بندیا نے اتنے دن کا جمع شدہ غصہ باہر نکال دیا تھا مگر ابھی اس کی تسلی کہاں ہوئی تھی۔

”ہمیں تو تم بھول ہی چکی ہو..... ایسے بھی جرمنی میں کون سے کام ہیں جو تمہیں فرصت ہی نہیں ملتی.....؟ کیا ایلے تھاپتی ہو، فصلوں کی کٹائی کرنے جاتی ہو، بھینسوں کو چارہ ڈالتی ہو؟ آخر مصروفیت کی

وجہ بھی تو معلوم ہو۔“ بندیا بھٹنا بھٹنا کر چیخ رہی تھی۔ پچھلے می شاید اسے تحمل سے بات کرنے کی تلقین کر رہی تھیں مگر وہ بندیا ہی کیا جو کسی کی سن لے..... اس کے اپنے ہی بے شمار شکوے تھے۔

”نہ شادی کی تصویریں بھیجیں..... نہ مووی، کم از کم میٹ ہی استعمال کر لیا کرو..... جرمنی جا کر بھی بڑھو ہی رہیں.....“ بندیا اب بری طرح سے لتاڑ رہی تھی۔ شاید وہ اب بھی جی بھر کے اس کی کلاس لیتی مگر مالا کی سوں، سوں نے بندیا کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

”تم رو رہی ہو مالا.....! تم ٹھیک تو ہونا.....؟“ سابقہ بکواس بھلائے بندیا لمحے بھر میں انتہائی پریشان ہو گئی تھی۔ ”ارے، کچھ تو بولو میں ہی بولتی جا رہی ہوں..... خیریت تو ہے ناں..... میرا دل سخت گھبرانے لگا ہے۔“ بندیا کی دُہائیوں نے بالآخر مالا کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے روتے ہوئے چاچو کی طبیعت کے متعلق بتا دیا تھا تب بندیا بھی سخت متوحش ہو گئی تھی۔

”عیسیٰ کہاں ہے؟“ بندیا نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

”چاچو کے ساتھ ہیں۔“ مالا کو بندیا کی آواز سن کر خاصی ڈھارس پینچی تھی۔ تبھی قدرے سنبھل کر بتانے لگی۔

”اور تم اکیلی ہو.....؟“ بندیا مزید ہراساں ہوئی۔ بہن کے اکیلے پن اور پریشانی نے اسے بھی سخت بے چین کر دیا تھا۔

”ہاں.....“ اس نے دھیمی آواز میں بتایا۔

”وہ نئی کدھر ہے؟“ بندیا نے پرسوج انداز میں پوچھا۔

”نئی چلی گئی..... میرا مطلب ہے چھٹی پر چلی گئی.....“ وہ بے ربط سی بولی تھی۔ فون اٹکچڑھا، کیا پتا..... عیسیٰ کال کر رہا ہو، اس کا سارا دھیان اسپتال

کی طرف تھا تبھی بے دھیانی میں بول رہی تھی۔

”اچھا، تم پریشان نہ ہو..... ہم لوگ یہاں چاچو کے لیے دعا کرتے ہیں۔ انہیں کچھ نہیں ہوگا.....“

بندیا نے بھرائی ہوئی آواز میں تسلی دی تھی۔ تب مالا نے سسک، سسک کر روتے ہوئے کہا تھا۔

”بندیا..... دعا کرنا، چاچو کو کچھ نہ ہو..... انہیں کچھ ہو گیا تو عیسیٰ سنبھل نہیں پائے گا، تمہیں نہیں پتا، یہ باپ بیٹا ایک دوسرے کو دیکھے بنا رہ نہیں سکتے۔“ مالا کے آنسو ایک تو اتر سے گر رہے تھے۔ وہ دوپٹے کے کونے سے آنسو صاف کرتی ہوئی کھڑکی کی طرف دیکھ کر جا رہی تھی۔ پاکستان میں جانے اس وقت کیا ٹائم تھا.....؟ مالا سے کچھ پوچھا نہیں گیا۔ یہاں جرمنی میں تو چوبیس گھنٹوں والا سٹیم چلتا تھا۔ دوپہر بارہ بجے کے بعد ایک دو استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ تیرہ اور چودہ کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اور اس وقت عیسیٰ کو گئے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے مگر فی الحال کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔

مالا کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ جانے کون سی خبر کان سننے والے تھے؟ دل کو دھڑکا سا لگا تھا پھر بندیا کے بعد می اور شامی نے بھی بات کی تھی۔ اس کا دل اپنے بھائیوں سے اداس ہونے لگا تھا..... خصوصاً شامی اسے بہت یاد آتا تھا..... نٹ کھٹ سا چلبلا..... بالکل آفاق جیسا باتونی لگتا تھا اور ذی تو گھر میں نہیں تھا، ابھی تک ہاسٹل میں قیام تھا اس کا..... اور ذیشان سے اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔ می سے اور بندیا سے بات کر کے دل کچھ پرسکون ہو گیا تھا۔ ماں بھی کیسی ہستی ہے، اتنے فاصلوں پر بھی دل گھبرانے سے جان گئی تھی کہ سمندر پار موجود بیٹی کو کسی پریشانی نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔

می اور بندیا کے بعد ڈیڈی نے بھی کال کی تھی۔ حسیب چاچو کے لیے وہ بہت پریشان اور بے چین تھے پھر انہوں نے عیسیٰ کا سیل نمبر لے کر اسے بھی کال کی تھی۔ مالا نے ڈیڈی سے بات کر کے فون

رکھا تب ڈور بیل بج اٹھی تھی۔ وہ قدرے متوحش رہ گئی تھی۔ گھر میں اس وقت کون آ سکتا تھا؟ وہ کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ مگر یہ خوف لمحاتی تھا، کچھ دیر بعد اسے ایک اور فون کال نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا..... اب کے آفاق کی کال آ گئی تھی۔ مالا تو فون سنتے سنتے خنپتی سی ہونے لگی تھی۔ عیسیٰ کا کچھ اتا پتا نہیں تھا..... جس کی کال کا اسے انتظار تھا سو چاکہ سیل فون پر کال کر لے مگر عیسیٰ نے اس کی کال پک ہی نہیں کی تھی۔ ابھی آفاق کی غیر متوقع آواز سن کر مالا ٹھٹک گئی تھی جبکہ وہ چھوٹے ہی منت کرنے لگا تھا۔

”اب تو دروازہ کھول دو، میں گھنٹیاں بجا، بجا کر تھک گیا..... یہ سامنے والے تمہارے نئے پڑوسی بھی اب تو آتے جاتے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔“ آفاق گویا رو دینے کو تھا۔ ادھر مالا سر تا پا حیران رہ گئی تھی۔ تو کیا، کل آنے والا وہ چھلاوا آج ہی پہنچ گیا تھا؟ مالا پریشان نہ ہوتی تو کیا کرتی؟ اسے دروازہ کھولنا چاہیے تھا یا نہیں.....؟ اس بارے میں عیسیٰ نے کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ وہ عجیب شکمش میں مبتلا ہو گئی تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آفاق کو کیا جواب دے، چاچو کی پریشانی الگ تھی اور اب یہ آفاق نئی مصیبت کی طرح نازل ہو گیا تھا۔

”تم..... آج ہی آگئے.....؟“ آفاق کے دوسری مرتبہ دہائی دینے پر مالا کے منہ سے بے ساختہ پھسلا تھا۔ اگرچہ اسے اپنی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا تھا مگر آفاق نے قطعاً برا نہیں مانا تھا۔

”جی ہاں..... سرکار بلائیں اور ہم نہ آئیں.....“ وہ لہک لہک کر گارہا تھا مگر آواز پہلے کی طرح رونے والی تھی۔ یقیناً وہ ان سوالات پر زچ ہو رہا تھا۔

”میں سمجھی نہیں.....“ اسے آفاق کی بکواس اس لمحے زہر لگ رہی تھی۔ وہ جلدی، جلدی بات کر کے فون بند کرنا چاہتی تھی تا کہ عیسیٰ اگر کال کرے تو اسے



مشکل نہ ہو۔

”مالا خاتون! آپ کی سمجھ بھی میری سمجھ کی طرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں بھی سامنے والی باتیں اور صاف دکھائی دینے والی چیزیں نہ دیکھ پاتا ہوں نہ سمجھ پاتا ہوں۔“ آفاق نے انتہائی برے وقت میں فلسفہ جھاڑا تھا۔ مالا کے پلے کچھ نہیں پڑا تھا سبھی بھٹنا کر بولی تھی۔

”گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں..... تم پھر کبھی آجانا۔“ اس نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا تھا۔

”میں جانتا ہوں گھر میں اس وقت کوئی نہیں..... اسی لیے تو آیا ہوں.....“ آفاق نے مالا کی بات کاٹ کر بے ساختہ کہا تھا پھر اسے اپنے لفظوں کے ہیر پھیر کا احساس ہوا تو ایک مرتبہ پھر بر جتہ بولا۔

”بلکہ اسی لیے تو بلوایا گیا ہوں۔“ اس نے قدرے وضاحت کی تھی مگر مالا پھر بھی نہ سمجھی بلکہ کچھ اور ہونق ہو گئی۔

”تم کیا کہنا چاہتے ہو، صاف، صاف بات کرو، پہلیاں بکھوانے کی ضرورت نہیں۔“ اس کی آواز میں سخت ناگواری تھی بھی آفاق جلدی سے بولا تھا مبادا مالا کو غصہ آجائے۔

”مجھے عیسیٰ نے فون کر کے بلایا ہے، تم دروازہ کھول کر مجھے اندر آنے دو، سامان رکھ کر پھر اسپتال چلا جاؤں گا۔ اگر دروازہ نہیں کھولو گی تو یہ حوض کے پار سڑک کی دوسری طرف مکان ہے ناں جس میں کوئی نئے لوگ شفٹ ہوئے ہیں آج..... ان کی ایک بیٹی آتے جاتے مجھے گھورتے ہوئے نکلتی ہے یا میرے سامان کو دیکھتی ہے یا مجھے..... شاید وہ سمجھ رہی ہے، تم نے مجھے گھر سے سامان سمیت باہر نکال دیا ہے اور اب میں دروازے پر بیٹھا منتیں کر رہا ہوں..... اب یہ نہ ہو، میری دہائیاں سن کر اس نازک حسینہ کو مجھ پر ترس آجائے اور وہ مجھے گھر لے

جانے کی آفر کر دے..... دیکھ لو، میں کسی کا دل نہیں توڑ سکتا..... پھر عیسیٰ خواہ مخواہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا اور عیسیٰ کی خنکی کا سارا ذمہ تمہیں بھگنا پڑے گا۔ تھنٹ کھول دو دروازہ۔“ آفاق نے ایک ہی سانس میں سامنے والے گھر پر نگاہ جما کر مالا کو اس باختہ کر دیا تھا اور مالا کے ذہن میں صرف عیسیٰ کی ناراضی کے ذمے والی بات گھوم رہی تھی۔ سو اس نے دروازہ کھول دیا تھا بھی آفاق سامان سمیت اندر آ گیا۔ اس کی روئی روئی صورت کو نظر انداز کرتا وہ اپنی لن ترانیوں میں مصروف تھا۔

”اللہ، اللہ! اتنی منتیں کروائیں، اتنی تفتیش کی..... میرا تو حلق خشک ہو گیا..... پر آپ تر دو دست کیجیے گا..... میں پانی نہیں پیوں گا۔“ آفاق کوئی بات سیدھے طریقے سے منہ بگاڑے بغیر نہیں نکالتا تھا۔ اب مالا جان گئی تھی کہ اس کی بات کا کیا مقصد ہے۔ ظاہر ہے، وہ پانی ہی پینا چاہتا تھا۔ مالا چپ چاپ کچن سے جوس نکال لائی۔

”بڑی مہربانی، آپ تو خاصی ذہین خاتون ہیں۔“ جوس کے دو تین گلاس حلق میں انڈیل کر اب وہ اسپتال جانے کے لیے نکل رہا تھا جاتے، جاتے اسے کچھ ہدایات دینے لگا۔

”درازہ نہیں کھولنا، پریشان نہیں ہونا اور رو نہ بھی نہیں۔“ اس کے چہرے پر نگاہ ڈالنے بغیر وہ تیز تیز بولتا باہر نکل گیا تھا۔ مالا حیران رہ گئی پھر اس کی ہدایات کو ڈھرائی دروازے تک آئی تھی۔ اس نے اپنے بھیکے چہرے پر غیر اردا ہاتھ پھیرا تھا۔ یہاں وہاں ہی ہی گئی تھی۔ اسے آفاق کا اپنائیت بھرا انداز یاد آیا۔ ”اور رونا بھی نہیں۔“ وہ گویا تہیہ کر کے گیا تھا۔ مالا کو روتے روتے ذرا سی ہنسی آئی۔

”یہ آفاق بھی کمال ہے۔“ اس نے دروازہ بند کر دیا تھا پھر سبچ اٹھا کر لاؤنج میں آ گئی۔ آفاق اپنا سامان ٹھکانے پر لگا کر گیا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا

کہ وہ اس گھر میں پوری بے تکلفی سے رہتا آیا ہے۔ اس نے مالا سے گیسٹ روم کا نہیں پوچھا تھا بلکہ خود ہی آرام سے اسی طرف چلا گیا۔ مالا، آفاق کو سوچتے ہوئے عیسیٰ کی باتیں ذہن میں دہرانے لگی تھی تو گویا عیسیٰ نے آفاق کو بلوایا تھا۔ ”کیا پتا چاچو کی طبیعت زیادہ خراب ہو۔“ اس کا دل پھیکا پڑ رہا تھا..... اسے چاچو کی ہنسی مسکراتی آواز سنائی دے رہی تھی۔ زندگی سے بھر پور، تازگی سے بھری..... کوئی اتنا تازہ دم شخص بھی اچانک بیمار پڑ سکتا ہے؟ مالا کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔ اسے چاچو جتنے مسکراتے، چلتے پھرتے دکھائی دینے لگے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ کہہ رہے تھے۔ ”لا یوسین دیکھنے کا تو اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے۔“ وہ کتنے افسردہ موڈ میں بیٹھے تھے گویا عیسیٰ اور مالا کی پہلی تازہ، تازہ کھٹی میٹھی جھڑپ دیکھنے سے محروم رہ گئے تھے۔ جھڑپ بھی ایسی جس میں عیسیٰ نے مالا کی ڈھیروں منتیں کیں اور پھر وہ... آفس جانا بھی بھول گیا۔ وقت کی شدید پابندی کرنے والا جب بہت دیر سے دفتر گیا ہوگا تو سب ورکرز کی معنی خیز نگاہوں سے خاصا جھنجھلایا ہوگا۔ چاچو تصور کی آنکھ سے گویا خوب لطف لے رہے تھے مگر لا یوسین دیکھنے کا تو مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ سو ان کا قلق جا ہی نہیں رہا تھا۔ مالا نے انہیں تسلی دی تھی۔ ”آپ پھر دیکھ لیجیے گا، دل چھوٹا کیوں کرتے ہیں۔“ اس نے جیسے بچوں کی طرح ان کو بہلایا تھا۔

”ارے..... پھر کس نے دیکھی ہے۔“ انہوں نے آہ بھر کر کہا۔

”آپ ایسے کیوں کہہ رہے ہیں۔ پھر سب نے ہی دیکھی ہے، ہم آج رات پھر سے لڑائی والا ماحول بنائیں گے۔“ وہ گویا ہنس رہی تھی۔ اس بات سے..... بے خبر کہ وقت کا خوشنما پانسہ کسی بھی لمحے پلٹ سکتا ہے اور دکھ ایسا دیکھ ہے جو ہنسی کو جاٹ جاتا ہے، کچھ دیر پہلے اس گھر میں ہنسی گونج رہی تھی مگر اب سناٹوں کا

تو ک وفا

راج تھا..... وقت اپنا پانسہ کبھی پلٹ بھی سکتا ہے۔ مالا کو پہلے گمان تھا، اب یقین بھی ہونے لگا تھا۔ اسے چاچو کی آواز گھر کے در و دیوار سے سنائی دے رہی تھی۔

”اس..... ہرگز نہیں، تم لڑنا ضرور، ہر جلد مان جانے کے لیے..... لڑائی زندگی کا حسن ہے مگر جب تک طویل نہ ہو۔“ انہوں نے بے ساختہ ٹوکا تھا، مالا کو لگا، وہ اس کے قریب ہی بیٹھے سر زلزل کر رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں بھل، بھل بننے لگی تھیں۔ اب بھلا کسے یاد تھی آفاق کی اپنائیت بھری تہیہ..... ”رونا بھی نہیں۔“

”میں عیسیٰ سے لڑوں گی اور وہ مجھے جلد منالیں گے۔“ اس نے شرارتی لہجے میں بڑے مان سے کہا تھا، یہ کیسی بے خبری اور نادانی بھری بات تھی، ہمارے ایسے اکثر بول جن پر تقدیر کا لکھا مسکراتا ہے..... انسان کچھ باتوں کو لبوں سے ایسے پھسلا دیتا ہے جیسے ہاتھ سے نکلے ریت کے ذرے..... جو بکھر تو سکتے ہیں مگر جمع نہیں ہو سکتے اور کہتے ہیں ناں..... وقت اور نصیب کسی لمحے بھی کسی کو زیر کر سکتا ہے اور برے وقت کی آہنیں کان پہلے سے ہی سننے لگتے ہیں۔

سے کی لہریں گزرتی جا رہی تھیں۔ فون کی گھنٹیاں ابھی تک خاموش تھیں۔ جانے اب کیا ہونے والا تھا؟ مالا کا دل خوف سے سکڑتا، پھیلتا جاتا تھا پھر ایک گھنٹے سے کچھ وقت پہلے فون کی تو نہیں دروازے کی گھنٹی البتہ ضرور بجنے لگی تھی۔ مالا اٹھ کر دروازے تک آئی۔ دروازے میں لگا عدسہ جس سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا سے باہر جھانکا تو اسے دروازے کے سامنے کوئی لہراتا آچل دکھائی دیا تھا۔ ”یہ کون ہے؟“ وہ کچھ گھبرا گئی تھی، اتنے عرصے سے اس دروازے پر مرنی کے علاوہ اور کوئی خاتون نظر نہیں آئی تھی۔ پھر اب یہ جانے کون تھی؟ مالا کشمکش میں مبتلا ہو گئی کہ دروازہ کھولے یا نہ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”سیر فری..... (کرایے کے لیے کمرانا تھا۔)“ اس نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جہاں ایک بورڈ پڑھو ”فاررینٹ“ لکھا تھا۔ یعنی انگریزی اور جرمن دونوں میں لکھا تھا۔ مالا گویا سمجھ کر مسکرا دی تھی پھر اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور انتہائی شکستہ ڈونج میں اسے سمجھایا تھا کہ وہ لڑکان کے گھر مہمان آیا ہے، اسے کرائے کے لیے کمر نہیں چاہیے تھا۔ مالا کی تفصیل سن کر وہ کچھ مایوس ہوئی تھی تاہم اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ پھر اس نے مالا سے مزید کچھ کہا جو اسے سمجھ نہ آیا۔

”آئی ڈونٹ انڈر اسٹینڈ۔“ اس کی شرمندگی محسوس کر کے وہ لڑکی جھٹ اردو میں بولی تھی تب مالا کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔

”شہیں اردو آتی ہے؟“ اس کے چہرے پر بے ساختہ خوشی اٹھ آئی تھی۔ ”اُف، اردو آتی تھی پھر بھی میرا امتحان لینے کھڑی ہو گئی..... یہ جرمن لوگ بھی ناں.....“ مالا نے دل ہی دل میں بے چارگی سے کہا تھا تب انی نے زور شور سے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں، میرے پاپا پاکستانی ہیں..... ان کی ڈچھ ہو چکی ہے میرا بھائی ان دنوں پاکستان گیا ہوا ہے۔ ہم لوگ اس گھر میں آج ہی شفٹ ہوئے ہیں۔“ انی نے بہت دوستانہ لہجے میں اسے بتایا تھا۔

وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ فی الحال یہاں اکیلی تھی۔ مالا اس بااخلاق لڑکی کو اندر لے آئی تھی۔ پھر انی، مالا کے ہاتھ سے بنی چائے پی کر ہی گئی۔ جاتے، جاتے وہ اسے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے گئی تھی۔ یوں اس کی سوزن، ہیرا کے بعد انی کے ساتھ بھی دوستی کی ابتدا ہو گئی تھی۔

سوزن اور انی اجنبیوں کے اس دہس میں مالا کو اپنے دل سے قریب لگی تھیں، دوستی کی وجہ ان کا پُر خلوص ہونا اور ہم زبان ہونا بھی تھا۔ وہ اس کی گفتگو کو اسی کی زبان میں سمجھ لیتی تھیں۔ دوستی کی ابتدا پہلے

کھولے..... اس دوران کال بیل کا جلتنگ بجاتا رہا تھا۔ وہ عدسے سے آنکھ چپکا کر باہر کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لینے لگی تھی۔ سامنے کوئی لڑکی کھڑی تھی، دروازے کی طرف پشت کیے۔ شاید پہلے یا دوسرے اسٹیپ پر، مالا کچھ اندازہ نہیں لگا سکی تھی مگر اس نے کچھ سوچتے ہوئے دروازہ کھول دیا تھا۔ سامنے ایک حسین اور نفیس چہرے والی نوخیز لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے نقوش بہت دل فریب تھے، مالا تو پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گئی، کالی آنکھیں، کالے بال، ملکوتی سا حسن، مسکراتے ہوئے نیم واہونٹ بے شک جرمنی کا حسن بے مثال تھا..... مگر یہ پری پیکر تو مشرقی لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ خاصا سرخ تھا اور ناک انتہائی گلابی..... تھوڑی زکام زدہ سی۔ مالا کے اتنے تفصیلی پوسٹ مارٹم پہ بڑے شائستہ انداز میں مسکرائی تھی۔

”ہیلو..... شام کا سلام.....“ انہں نے جرمن زبان میں سلام کر کے ہاتھ بھی آگے بڑھا دیا تھا، مالا نے جھجک کر اس کا ہاتھ تھاما اور پھر چھوڑ دینا چاہا تھا مگر مقابل کھڑی لڑکی نے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا..... وہ اس کا ہاتھ ابھی تک گرم جوشی سے دبائے کھڑی تھی۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“ وہی جوش بھرا انداز تھا ایک دم دوستانہ سا۔

”مالا علی عیسیٰ۔“ مالا کو بھی مسکراتا پڑا تھا، زبردستی کی مسکراہٹ بوجھل دل کے ساتھ مسکراتا بھی کتنا مشکل تھا۔ مالا کو اسی بل اور اک ہوا تھا پھر اس نے اپنا تعارف کروایا تھا، مالا چپ چاپ سنتی رہی۔ اس نے اپنا نام اپنی بتایا تھا۔ وہ لوگ بھی پاکستانی تھے، یہاں آج ہی شفٹ ہوئے تھے پھر اس نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا تھا وہ کچھ دیر پہلے یہاں کسی کو باہر بیٹھا دیکھ چکی تھی اور وہ اسی کے بارے میں پوچھنے آئی تھی کہ شاید باہر سامان سمیت بیٹھے لڑکے کو کرائے پر کمرا چاہیے تھا۔ اس نے بڑی شائستگی سے مالا کو مخاطب کر کے کہا تھا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کپریٹڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو پی ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

## WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ترک وفا

ہوئی تھیں، بھینگی، ننناک..... گویا واپسی کے سفر پر بھی روتا رہا تھا۔ ہاں، اپنے باپ کی تکلیف اسے اتنی ہی اذیت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اسے اپنے باپ سے عشق تھا۔ وہ انہیں ”درد“ میں بے قرار نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مالا کے دل کو کچھ ہونے لگا، وہ بھاگ کے عیسیٰ کو وہیں چھوڑ کر پانی لے آئی۔ عیسیٰ لاؤنج میں جوتے اتار کر صوفے پر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پانی دیا، عیسیٰ نے بنا کچھ کہے گلاس پکڑ لیا۔ مالا کارپٹ پر اس کے قریب ہی دو زانو بیٹھ گئی تھی۔

”چاچو کی طبیعت کیسی ہے عیسیٰ؟“ مالا کی آواز سن کر وہ بے خیالی میں سر اٹھائے ایک ننگ اسے دیکھنے لگا۔ مالا اس کی بوجھل لہورنگ آنکھوں کو دیکھ کر دہل گئی۔

”اللہ! اتنی سرخ آنکھیں۔“ اس کے دل پہ چوٹ سی لگی۔ عیسیٰ کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد دوبارہ سر جھکا گیا تھا۔

”پہلے سے کچھ بہتر ہیں۔“ اس کا انداز تسلی دینے والا تھا مگر مالا کی تشفی نہ ہوئی۔ جیسے عیسیٰ، مالا کے بجائے گویا خود کو تسلی دے رہا تھا۔

”تو پھر آئے کیوں نہیں؟“ وہ بے قرار ہوئی لیکن عیسیٰ کے سامنے روئی نہیں۔ وہ اسے پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم اپنی وجہ سے تو ہرگز نہیں۔

”ڈاکٹر نے انہیں ایڈمٹ کر لیا ہے۔ میں آنا نہیں چاہتا تھا مگر آفاق نے زبردستی بھیج دیا۔ آفاق اچھا لڑکا ہے۔ اپنوں سے بہت بہتر۔“ عیسیٰ کے لہجے میں ٹوٹے کانچ جھج رہے تھے۔ وہ اتنا پُر اذیت اور دکھی کیوں لگ رہا تھا۔ چاچو کے لیے؟ شاید کوئی اور وجہ بھی تھی۔

”آپ نے مون کو اطلاع نہیں دی؟“ معا سے خیال آیا تو عجلت میں بولی تھی۔ شاید علی عیسیٰ اسی سوال سے بچنا چاہتا تھا بھی بے چین سا صوفے پر سے اٹھ گیا۔

”وجہ“ پر ہوئی تھی پھر دھیرے دھیرے ”وجہ“ ختم ہو گئی اور ایک لازوال رشتہ باقی رہ گیا۔ ہیرا کا معاملہ کچھ الگ تھا، وہ اس کی ہم زبان نہیں تھی مگر اچھی کلاس فیلو ضرور تھی۔ وہ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ ڈونچ بولنے میں ہلکان ہوتی رہتی تھیں۔ بات چیت کی ابتدا پہلے ”وجہ“ سے ہوتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی بہترین ”اتالیق“ تھیں۔ اتالیق ہونا وجہ تھی، بعد میں وجہ ختم ہو گئی صرف رشتہ رہ گیا۔ ہمدردی، خلوص اور دوستی کا رشتہ۔

”اجنبی راہ اور اندھیرے انجان سفر میں کوئی جگنو نکرا جائے تو اسے مٹھی میں دبا لینا چاہیے۔ کیا پتا وہ بہ آسانی رستوں کی رہنمائی کر کے منزل تک پہنچا دے۔“ یہ علی عیسیٰ کی بتائی حکمت بھری باتیں تھیں جن کو مالا نے گہرے میں کس کر باندھ لیا تھا کہ دوستی اور چائے کی حدت اور تیزی ہی ان کی خوبی ہے نہ کہ حد درجہ مٹھاس..... تو گویا اس بات کا مفہوم یہ تھا۔ دوستی میں تلخ رویے اور کبھی کبھی لڑائی بھی سہنا پڑتی ہے۔ انسان کو گرم اور ٹھنڈی دونوں طرح کی چائے پینے کا عادی ہونا چاہیے۔

اس وقت تہا لاؤنج میں تکلیف دہ سوچوں کو جھٹک کر سوزن، ہیرا اورانی کو سوچنا بہت دلفریب لگ رہا تھا۔ پھر جانے کتنا وقت بیت گیا جبھی عیسیٰ کی benz کی آواز آئی۔ دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ مالا بھاگتی ہوئی دروازے میں لگے عدسے میں سے جھانکنے لگی۔ وہ موبائل پہ آج کل (میں شادی شدہ ہوں) کی ٹیون سیٹ کیے ہوئے تھا۔ دروازے کے قریب آ کر موبائل بچنے لگا تھا، مالا نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ سامنے عیسیٰ کا چہرہ تھا۔ انتہائی پشمرده، مرجھایا ہوا جبکہ سب سے زیادہ اس کی آنکھیں متاثر لگ رہی تھیں۔ انتہائی سرخ جیسے کنچن کا پھل ہو، رسیلا اور لہو برساتا ہوا۔ انتہائی سوچے پوسٹے جیسے وہ اسپتال میں اتنے گھٹے روتا رہا ہو۔ اس کی پلکیں جڑی



جون 2014 کے شمارے کی جھلک

# سمرگز نرسٹ

ماہنامہ

## چراغِ ادب

اردو ادب کے ایک ستون کی داستانِ حیات

## وہ کون تھے

کیا زمانہ قبل از تاریخ میں بھی  
ہوائی جہاز اڑا کرتے تھے

## اسٹیفن کنگ

اس مصنف نے پوری دنیا کو خوف میں  
بتلا کرنے کی کوشش کی تھی

## دمِ وفا

ہلر کے دور میں انسان کے ساتھ کیسا  
سلوک ہوتا تھا ایک چشم کشا تحریر

## موت و حیات

ایک شوہر کی سفاکی کا دلچسپ ماجرا انوکھی سچ بیانی

## الکاحی عمارت

فلمی الف لیلہ، سراب اور بہت ساری  
سچ بیانیوں کے سچے واقعات، مشہور قصے

وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

حسب جیسی خود غرض، عجیب، سنگ دل اور انتہائی  
عالم کوئی اور بیٹی آج تک نہیں دیکھی تھی۔

☆☆☆

ایک، دو، تین، چار..... پوروں پر کنتی کے  
جو تھے دن مالا کے پیارے چاچو ہشاش بشاش سے  
گھر واپس لوٹ آئے تھے۔ مالا ان کی صحت یابی کی  
خوشی میں دیوانی سی ہو گئی تھی۔ پاکستان اطلاع کردی  
گئی تو مئی نے چاچو کے لیے بہت سی خیرات کی۔  
ادھر مالا نے خود شکرانے کے نفل پڑھے۔ آیت  
کریمہ پڑھایا اور نیاز بھی خود پکائی۔ چاندی کے ورق  
سجا کر انتہائی لذیذ کھیر بنائی تھی مگر جب تک آیت  
کریمہ نہ پڑھا گیا اس نے کسی کو ایک چمچہ کھیر نہیں  
چکھائی تھی۔

یہ چھوٹی سی مقدس تقریب تھی جس میں ہیرا اور  
اس کے ڈاکٹر شوہر ابو بکر نے شرکت کی تھی۔ مالانے  
انی اور اس کی فیملی کو بھی انوائٹ کیا تھا..... سوزن کو  
بھی کال کی مگر اس نے معذرت کر لی تھی۔

سب نے بڑے دل کے ساتھ انتہائی خشوع و  
خضوع سے آیت کریمہ پڑھا تھا۔ مہمان تو سارے  
کانی دیر سے آئے تھے جبکہ مالانے آفاق کو صبح سے  
تسبیح دے کر بٹھایا ہوا تھا۔ ناشتے کے بعد کا بیٹھا ہوا وہ  
ابھی تک آیت کریمہ پڑھ رہا تھا۔ سچ میں اس نے  
بہت دفعہ بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر مالا کی دھمکی سے  
خونزدہ ہو جاتا تھا۔

سچ کے قریب تو آفاق کو چکر آنا شروع ہو گئے  
تھے حلق خشک ہو گیا اور بھوک سے معدہ چلانے لگا  
تب حسب چاچو اور عیسیٰ کو اس پر ترس آ گیا تھا۔

”زبردستی کی عبادت ایسے درخت جیسی ہے  
جس پر پتے تو آجائیں مگر پھل اور پھول کبھی نہ  
آئیں۔“ عیسیٰ کے الفاظ پر آفاق کو کرنٹ لگا تھا۔ وہ  
سخت برا مان گیا..... عیسیٰ کی گہری باتیں اکثر اسے  
اختلاجِ قلب میں مبتلا کر دیتی تھیں۔

کرتی.....؟ اس کی خاموشی نے مقابل کو چار  
شانے چت کر دیا تھا۔ وہ اپنا کوٹ، ٹائی اور  
ایک، ایک چیز صوفے کی طرف اچھالتا گیا۔  
صوفے کی ترتیب کچھ بدل گئی۔ کٹن آڑھے تر  
ہو کر گر گئے اب صوفے پر پہلے جیسا روپ نہیں  
وہ بے ترتیب اور الجھا، الجھا لگ رہا تھا۔ آنکھوں  
بھلا لگنے والا نہیں تھا۔ مالا کچھ الجھ گئی تھی اور عیسیٰ اسے  
اجھن سے ہی نکالنا چاہتا تھا۔

”اسی کو بے ترتیبی کہتے ہیں مالا! زندگی میں  
روتیوں میں، کبھی دل کو سکون نہیں دیتی، نہ نظر کو بھلی  
ہے، کچھ لوگ اپنی زندگی میں بے ترتیبی کو پسند کر  
ہیں اور پھر خواہش رکھتے ہیں کہ دوسرے بھی ان  
غلط عمل کی پیروی کریں..... جب ایسا نہیں کیا جائے  
ان کی انا اور میں کو دھچکا لگتا ہے۔ مون انہی لوگوں  
میں سے ہے۔ وہ پاپا کی تکلیف کا سن کر نہیں آئی۔ اس  
نے آنے سے انکار کر دیا..... وہ سمجھتی ہے، پاپا اُسے  
واپس بلانے کے لیے روز، روز ڈرا سے کرتے ہیں  
وہ کسی تھیر کی ادا کارہ نہیں جو معمولی سارول ملنے  
بھاگتی چلی آئے۔“ عیسیٰ کی آنکھوں میں شفاف پانیوں  
کا طوفان اُٹ آیا تھا مگر ضبط نے آگے بڑھ کر اسے  
ڈھارس پہنچائی تھی۔ وہ کچھ ہل خاموش کھڑا رہا۔

”مون، ہم سے اتنی دور چلی گی ہے کہ پلٹ  
آنے کی امید نہیں..... وہ بدگمان ہے اور فاصلے  
مٹانے کے بجائے اور بڑھا رہی ہے۔ تم نے  
کہیں پڑھا تو ہوگا، فاصلے بڑھ جائیں تو دلوں کے  
بندھن کمزور نہیں پڑتے، کبھی کبھی ٹوٹ جاتے ہیں۔  
انتظار مرتا نہیں، آنکھوں میں منجمد ہو جاتا ہے، ہاں  
بس آنکھیں مرجاتی ہیں..... اور مون میرے باپ کی  
آنکھوں کے اس انتظار کو منجمد کر دینا چاہتی ہے۔“  
عیسیٰ کے ضبط کا بندھن کا سچ کے مانند ٹوٹ گیا تھا پھر  
وہ عجلت میں پلٹا اور داش روم کی طرف بڑھ گیا جبکہ  
مالا کسی جیسے کی طرح ساکت ہو گئی تھی۔ اس نے مون

”آپ نے بتایا نہیں۔“ مالا اس کے پیچھے ہی  
آگئی۔ بیڈ روم کی طرف بڑھتے عیسیٰ کے قدم لٹخ بھر  
کے لیے رک گئے تھے۔ وہ اس کے پڑمرودہ روئے،  
روئے چہرے کو دیکھنے لگا تھا۔ نماز کے اسٹائل میں  
دو پٹا اوڑھے، ہاتھ میں تسبیح لیے وہ اپنے چچا کے لیے  
بہت ممکن، منتظر اور پریشان تھی۔

”اسے اطلاع دی تھی میں نے۔“ وہ نگاہیں  
موڑ کر اندر بڑھ گیا..... مالا پھر اس کے پیچھے بھاگی۔  
”تو مون کیا آگئی؟“ اس نے بے چینی  
دبائے بغیر پوچھا۔ عیسیٰ کچھ ہل کے لیے رک گیا تھا  
گویا سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

”نہیں.....“ عیسیٰ نے سپاٹ لہجے میں کہہ دیا۔  
”کیوں.....؟“ اس نے بے تاب سے کہا تھا  
تب عیسیٰ گہری سانس کھینچ کر پلٹا..... وہ اس کے  
چہرے پر لکھی بے چینی اور پاپا کے درد کی اذیت کو  
بخوبی پڑھ سکتا تھا۔ کچھ چہرے کھلی کتاب کے مانند  
ہوتے ہیں بغیر تردد کے پڑھتے چلے جاؤ۔ مالا کا چہرہ  
بھی ایسا ہی تھا اور اس کی بے چینی بھی معمولی نہ تھی، وہ  
مون کے بارے میں جاننے کے لیے اکثر بے تاب  
رہتی تھی۔ حالانکہ عیسیٰ کا دل چاہتا تھا وہ اسے شیخ سعدی  
کا ایک قول بار بار سنائے تاکہ وہ اس کے زرخیز دماغ  
میں بیٹھ جائے۔ وہ مالا کو بتانا چاہتا تھا کہ ظاہر پہ جانے  
والے خسارے میں رہتے ہیں، آگ دیکھنے میں سرخ  
نظر آتی ہے مگر جلا دے تو سیاہ راکھ کے علاوہ کچھ نہیں  
پختا مگر مالا ابھی ادراک کے لمحوں سے بہت دور تھی۔  
وہ وقت سے پہلے مالا کو اتنا سیانا نہیں کر سکتا تھا۔ اس  
ہل بھی مالا کے چہرے پر بکھرے سوز و گداز کو محسوس کر  
کے آہستگی سے بولا تھا۔

”زیادہ سوال کبھی کبھی عذاب لگتے ہیں  
مالا.....!“ وہ بیزار نہیں تھا، بس تھوڑا شکستہ دل تھا مگر  
مالا سمجھی نہیں تھی، بس چپ سی رہ گئی۔ عیسیٰ بولنے کے  
موڈ میں نہیں تھا پھر وہ اسے کیسے تنگ کرنے کی کوشش



چانس نظر آئے تو وہ فوراً فائلیں ٹیبل پر پھینک کر اٹھ گیا۔  
 ”مالا کو این کاؤف سین تروم (مرکز) تک تو نہیں جانا.....؟“ وہ بال سنوارتا چپکا تھا۔ کام سے جان جو چھوٹ گئی تھی۔ عیسیٰ نے نفی میں سر ہلادیا..... تب وہ مسکراتا ہوا مالا کے ہمراہ باہر آ گیا تھا..... اب جو قیامت ساموسم نظر آیا تو منہ بسور کر بولا۔

”دیکھ لو، تمہارے بور شوہر نے اس حسین موسم میں بھی فائلوں، لیپ ٹاپ اور کیلکولیٹر میں سرکھار کھا ہے۔ بھلا دفتر کو گھراٹھا کر لانے کی کیا ضرورت تھی، بندہ اس موسم میں تفریح کے لیے نکلتا ہے۔“ وہ کلکتا ہوا فرائے سے بول رہا تھا۔ مالا نے کندھے اچکا کر کہا۔

”اب تم کیوں جل، جل کر خاک ہو رہے ہو، تمہاری جان تو چھوٹ گئی۔“ مالا اپنے ہینڈ بیگ میں سے کچھ مارک جرمز کرنسی نکال کر الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ اسے پیسوں کا مسئلہ نہیں تھا۔ عیسیٰ نے اپنا خزانچی ساتھ بھیجا تھا۔ مالا کچھ مطمئن سی ہو کر چلتی رہی جبکہ آفاق اپنا لیڈر بیگ بغل میں دبائے مالا سے بھی تیز چل رہا تھا۔ ایک وارین ہاؤس سے کچھ چیزیں خرید کر اب وہ سبزی اور پھلوں کی مارکیٹس تک آگئے تھے۔ مالا یہاں پہلی مرتبہ آئی تھی۔ اس نے سبزی اور پھلوں کی شفاف شیشے کی چمکتی دکانوں کو دیکھا تو حیران رہ گئی..... من ہائیم کے افسانوی کردار یہاں بھی بستے تھے۔ وہ ہی شفاف رائل روڈ کے اطراف میں بنے چمکتے دیکتے بڑے، بڑے اسٹورز انتہائی خوب صورت اور صحت مند سیل گرلز..... ان کے ہونٹوں سے چمکی میٹھی مسکان گویا چینی کی گڑیا نئیں شیشوں میں بچی تھیں۔ صفائی کا اتنا اعلیٰ اہتمام تھا کہ پھل، سبزیاں صاف ستھری چمکتی دکتی نظر آرہی تھیں۔ مالا کی طرح آفاق بھی حیران در حیران تھا..... آنکھوں اور لہجے میں حسرت لیے وہ زربل بڑ بڑایا تھا۔

”کاش میرا پاکستان بھی ایسا ہو جاتا۔“ اس کی

تبی موٹی، موٹی تروتازہ دو عدد ڈبلیں بھی لے آیا۔ گھر کے بیرونی سرسبز احاطے کو آفاق کے فارغ اوقات کی محنت نے گل و گلزار بنا دیا تھا۔ انی اکثر ان کے گارڈن کو دیکھ کر جیلس ہوتی اور اکثر آفاق کو چڑانے کے لیے مالا سے کہتی۔

”اپنا مالی چند دن کے لیے ادھار دے دو۔“ انی کی شرارت محسوس کر کے آفاق جھٹ سے جواب دیتا۔ ”یہ مالی مستقل بھی آپ کی طرف قیام کر سکتا ہے اگر آپ چاہیں تو.....؟“ وہ آفاق ہی کیا جو ادھار رکھ لیتا..... اس کی انی کے ساتھ اکثر تکرار ہو جاتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب آفاق اپنے کوڑے کا ڈرم انی کے ڈرم میں الٹ آتا۔ تب ان دونوں کی خوب لڑائی ہوتی تھی..... اتنی کہ مالا کو سینز فائر کروانا پڑتا تھا یا پھر وہ آفاق کو گھسیٹ کر اندر لے جاتی۔

☆☆☆

اس دن بھی موسم خوب خوشگوار تھا۔ بہت دل فریب ہوا چل رہی تھی۔ آسمان صاف اور گہرا نیلا تھا..... یہاں کی مشہور مرغابیاں موسم کے حسن میں کم تھیں۔ نیلگوں نکلڑوں میں پرواز کرتے سنہری کئی ایک پرندے اپنے رقص سے دیکھنے والی آنکھ کو مسحور کر سکتے تھے بشرطیکہ کوئی انہیں دیکھنے کے لیے وقت نکال لیتا۔

آج بہت دن بعد مالا، آفاق کے ہمراہ باہر آئی تھی۔ اسے کچھ سبزیاں اور فروٹس خریدنے تھے۔ وہ انی کے ساتھ آنے کا ارادہ رکھتی تھی مگر انی کو اپنی بہن کے اسکول جانا پڑ گیا تھا۔ سو مالا دل موسس کر رہ گئی۔ اسے ہفتے بھر کی سبزیاں خریدنی تھیں اس کی اتری شکل دیکھ کر عیسیٰ نے آفاق سے کہا تھا۔

”تم مالا کے ساتھ چلے جاؤ.....“ وہ آفس ورک کرنے میں مصروف تھے دونوں..... عیسیٰ نے آفاق کو ڈھیر سارا کام بتا رکھا تھا۔ جسے مارے باندھے کرنے پر مجبور تھا..... اب جو جان چھوٹنے کے

نے یہاں رہنے کے بعد آنے سے بھی پہلے عیسیٰ سے تھا کہ وہ شکایت کا موقع آنے..... نہیں دے گا۔ دراصل گھر کے کاموں پر تو عیسیٰ کو کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا کبھی اس نے آفاق کو ٹوکا تھا بلکہ وہ دفتری امور پہل ٹھیک سے انجام نہیں دیتا تھا۔ اپنے پہلے قیام کے آفاق نے عیسیٰ کو ناکوں پنے چبوائے تھے سو اب آفیشل معاملات کو اچھی طرح سے سمجھ کر ہینڈل کرنا تھا۔ پہلے قیام کے دوران عیسیٰ کو سب سے بڑی شکایت آفاق سے شکایت تھی وہ کچھ یوں تھی کہ آفاق کبھی وقت پر تیار ہو کر دفتر نہیں پہنچتا تھا اور اب آفاق صاحب صبح سویرے، منہ اندھیرے اٹھ کر ٹیبل پر تائی شائی لگائے، بالوں کو جیل سے سنوارے عیسیٰ کے بیدروم کے سامنے کھڑے اعلان کیے جاتا۔

”عیسیٰ اٹھ جاؤ..... اتنے بیج کراتے منہ ہو چکے ہیں۔“ وہ منہ اندھیرے ہی الارم بجائے پھرتا تھا۔ ناشتا بھی بنا دیتا..... اخبار حفظ کر کے عیسیٰ کے تیار ہو کر آنے تک ایک، ایک خبر مرچ مسالے سمیت سنا ڈالتا..... اب عیسیٰ کا اخبار پڑھنے میں وقت ضائع نہیں ہوتا تھا اور یوں بہت کم بدت میں عیسیٰ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ”آفاق جی، کسی بڑے گریٹ ہو۔“ یہ الفاظ کم از کم آفاق کے لیے بہت اہمیت رکھتے تھے۔ اس کا جی چاہتا تو ان جملوں، تعریفی لفظوں کا تعویذ بنا کر گلے میں لٹکا لیتا..... مالا اس کی حرکتوں پر اکثر چوٹ کیے جاتی، خصوصاً اس وقت جب عیسیٰ اس کی تعریف کرتا اور آفاق اپنی تعریف پر پھول کے گپا ہوا جاتا۔

”صد شکر، کنجوس اعظم نے تعریف تو کی۔“ وہ شکر ادا کرتے ہوئے نہال ہو جاتا تھا۔ عیسیٰ کی تعریف آفاق کو دونوں سرور رکھتی تھی۔ اسی طرح گھر کے دیگر معاملات میں مالا اس سے بہت خوش تھی۔ مالا کے کہنے پر وہ نئے گیلے اٹھالایا تھا۔ حوض کے لیے

”تم میرا عمل ضائع کرنا چاہتے ہو؟“ آفاق روہنا ہوا گیا..... سفید جالی کی ٹوپی اتار کر میز پر رکھی، صبح کو آنکھوں سے چوم کر لگایا۔

”میں کون ہوتا ہوں نیکی، بدی، جزا سزا میں فیصلہ کرنے والا..... تم میری بات سمجھ کر پلٹ جاؤ تو یہ اور بات ہے۔“ عیسیٰ نے مسکراہٹ دہالی تھی۔ آفاق تھوڑا کھسیا گیا تھا۔

”تمہاری باتیں کم ہی کسی کی سمجھ میں آتی ہیں۔ اتنی مشکل باتیں جو کرتے ہو۔“ اب وہ عیسیٰ پر چڑھائی کر رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ٹوک جھوک تو اکثر چلتی ہی رہتی تھی۔ مالا کے لیے اب کچھ نیا نہیں تھا جبکہ مہمان بھی انجوائے کر رہے تھے۔

”بات مشکل نہیں ہوتی، نہ الفاظ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ بس لہجے کو سمجھ لینے سے ساری مشکل حل ہو جاتی ہے۔“ عیسیٰ نے مہمانوں کی توضیح کرتی مالا کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

مالا کو بھی آفاق نے..... تھوڑا تھوڑا بدل دیا تھا..... اب وہ بھی کھل کر ہنسنے لگی تھی۔ آفاق کے سنائے لطیفوں پر قہقہوں کی بوچھاڑ سے پاگل ہو جاتی..... آفاق کے پاس معلومات کا خزانہ تھا۔ وہ اسے فیشن سے لے کر کوکنگ تک چیدہ، چیدہ باتیں اور مشورے دیتا..... چاچو تو گویا آفاق کے چلے آنے سے تازہ دم ہو گئے تھے۔

آفاق گویا ہر فن مولا تھا، کبھی مشین لگا کر سارے کپڑے دھو دیتا، کبھی مالا سوئی ہوئی تو ناشتا بنا دیتا..... اب ننھی بس صفائی کے لیے آیا کرتی تھی۔ باقی کے کام مالا اور کبھی کبھی آفاق کر دیتا..... گھر کی بہت ساری ذمے داریاں آفاق نے اپنے کندھوں پر اٹھالی تھیں۔ چاچو کے ویٹکی چیک اپ سے لے کر گھر کا سودا سلف لانے تک ہر کام بخوبی کیے جاتا تھا۔ اس



آواز میں بھی حسرت در آئی تھی تب مالا نے بڑے ٹھنڈے سے لہجے میں کہا۔

”جب تمہارے جیسے جوان پردیس بھاگ آئیں گے تو پھر پاکستان بچوں اور بوڑھوں کے رحم و کرم پر کہاں تک آگے جاسکتا ہے؟“ اس کے لہجے میں واضح چبھن تھی۔ اس کا بس پلٹا تو وہ عیسیٰ کے ہمراہ واپس چلی جاتی تھی یہاں نہ آنے کے لیے..... اجنبی وطن تو اجنبی ہی رہتا ہے۔ چاہے سال گزاریں یہاں یا صدیاں.....

”کوئی شوق سے تو در در کی خاک نہیں چھانتا۔ وطن تو ہمارا ہے، پر کیا کریں حکمران ہمارے نہیں..... ڈگریوں کو گھن لگ رہا تھا، گھر میں پڑے، پڑے کتنے لوگوں کی آنکھوں میں خواب مرنے دیکھ چکا تھا۔ سو میں نے وقت ضائع نہیں کیا..... نہ ڈگریوں کو دیکھنے لگنے دی ہے۔ پتا نہیں، میرا فیصلہ غلط ہے یا صحیح.....؟ تاہم مطمئن ضرور ہوں..... رزق حلال کما تا ہوں جلد ہی ماں، باپ کو حج کرواؤں گا۔ دادی کو سونے کے کنگن لے کر دیتے ہیں..... بہنویوں کو سیٹلڈ کرنا ہے..... کیا ہوا جو اپنی ذات خسارے میں چلی گئی، خیر، خسارہ بھی کیوں.....؟ اپنوں کے لیے جینا ہی تو زندگی ہے، یہ میرا نہیں، تمہارے شوہر عیسیٰ کا قول ہے۔“ اب وہ ہمیشہ کی طرح مسکرا رہا تھا۔ بظاہر لاابالی سا یہ لڑکا اندر سے کتنا گہرا تھا۔ مالا کچھ کچھ حیران رہ گئی تھی۔ پھر آفاق نے زیادہ دیر اسے سوچنے بھی نہیں دیا تھا۔ وہ خریداری میں بری طرح مگن ہو گئے تھے۔

واپس آتے ہوئے بڑے، بڑے تھیلے پکڑے مالا نے نوٹ کیا تھا کہ آفاق نے ایک اور تھیلا بھی گھریلو سامان کا فل کروا رکھا تھا۔ مالا کے پوچھنے پر آفاق نے بے پروائی سے بتایا۔

”سامنے والی جنگلی ملی لسٹ پکڑا گئی تھی۔ اسے بہن کے اسکول جانا تھا۔ میں نے سوچا، اس کا

سامان بھی لے چلوں..... بے جاری کا بھائی ابھی تک واپس نہیں آیا۔“ آفاق سادگی سے بول رہا تھا جبکہ مالا آہم آہم کرتی رہ گئی تھی۔

”جنگلی ملی بے جاری.....“ مالا کو ڈھیروں ہنسی آگئی تھی۔ اسی طرح چھوٹی، چھوٹی باتوں کے دوران گھر قریب آ گیا تھا جبکہ مالا اسے مسلسل چھیڑتی رہی تھی۔ گھر کے سامنے رک کر آفاق نے کچھ تھیلے اسے پکڑائے اور انی کا تھیلا پکڑے اس کے گھر کی طرف دیکھ کر بولا۔

”روم فار رینٹ.....“ بورڈ پر ابھی تک لکھے الفاظ رورہے تھے۔ آفاق کو بے تحاشا ہنسی آگئی..... ”ان لوگوں کو ابھی تک کرائے دار نہیں ملا..... لگتا ہے، ان کے نصیب کا کرائے دار میں ہی ہوں..... پہلا اور آخری.....“ وہ انی کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ مالا کچھ ٹھنک گئی پھر سر جھٹک کر اندر چلی گئی تھی۔

سچ تو یہ تھا..... آفاق کے آنے سے اسے بہت سہولت ہو گئی تھی..... وہ اندر باہر کے سارے کام نمٹا دیتا تھا۔ آفس بھی باقاعدگی سے جاتا بڑی لگن اور محنت سے کام کر رہا تھا..... گھر والوں کو ڈھیروں رقم بھی بھیجتا..... اپنا خرچہ تو اس کا تھا نہیں، تھوڑا خرچہ رکھ کے باقی سب پاکستان بھجوا دیتا۔

آفاق کے آنے سے رونق بھی خوب لگ گئی تھی۔ سامنے والے گھر سے انی اور انی بھی آ جاتی تھیں پھر عیسیٰ اور آفاق کا کرکٹ میچ ہوتا..... کبھی بیڈ منٹن کھیلتے..... خوب ہنگامہ آرائی، ہلا گلا ہوتا، فن گامہ ٹائپ زندگی بن چکی تھی۔ چاچو کو شور اور تہمت بہت پسند تھے۔ وہ خود بھی گارڈن میں آ کر بیٹھ جاتے..... اکثر ویک اینڈ پر ہیرا اور ابو بکر بھی آ جاتے تو رونق دو بالا ہو جاتی تھی۔ کاش کہ زندگی یوں ہی گزر جاتی، ایک خواب کی طرح..... کسی پھول کی طرح، خوشبو کی طرح، چمکتے چاند کی طرح، بہار کی خوشبو و تازگی اور

مہر کار کی طرح۔ چاندنی رات کے ہاتھوں پہ سوار اتری ہے کوئی خوشبو میری دلہیز کے پار اتری ہے آہ..... خوشبو، جو لمحوں کا دھوکا ہوتی ہے، آتی ہے اور آ کر چلی جاتی ہے، ایک چھنا کے سے ٹوٹ جانے والے خواب کی طرح..... بس ایسی ہی کوئی کیفیت اس کا دل دھڑکا ئے رکھتی تھی۔ جیسے کچھ ہونے والا تھا۔ جیسے کچھ ہونے کے قریب تھا۔ دل کے دوسوے زبان تک آنے سے قاصر تھے۔

☆☆☆

بڑے جو جھل سے دن تھے۔ بڑی اداس سی شا میں تھیں۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا مگر پھر بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اپنی ابھی کیفیات میں مگن تھی سو ان دنوں الجھے، الجھے آفاق پر بھی غور نہیں کر سکی..... وہ بہت پریشان اور متشکر تھا۔ پہلے کی طرح نہ ٹھیک سے کھانا کھاتا نہ باتیں کرتا..... آفس سے آ کر باہر نکل جاتا تھا..... گویا وہ ماحول سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جانے اس کے ساتھ مسئلہ کیا تھا.....؟ اسے پریشانی کیا تھی؟ چاچو بھی اب تو چونکنے لگے تھے۔ آفاق پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ وہ ہنسی، وہ تہمتہ خواب نظر آتے تھے۔ عیسیٰ اسے کوئی میچ رکھنے کو کہتا تو وہ سہولت سے انکار کر دیتا تھا۔ عیسیٰ بھی اس کی بدلتی کیفیت پر حیران تھا۔ آفاق کے دم سے جو رونق لگی تھی اب اس کا خاتمہ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

پھر وہ دفتر سے آ کر رات گئے تک غائب ہو جاتا..... یہ بات عیسیٰ کو پسند نہیں تھی۔ اس نے آفاق کو ٹوکا تو وہ دوبارہ جلدی گھر آنے لگا تاہم مالا نے اکثر رات بھر اسے جاگتے دیکھا تھا۔ اس کے کمرے کی لائٹ جلتی رہتی تھی۔ صبح سرخ آنکھیں لیے دفتر چلا جاتا تھا، وہ بھی بغیر ناشتا کیے..... وہ کھانے پینے اور سونے سے غافل ہو رہا تھا۔ آخر اسے کیا ہوا تھا؟ مالا کو تو ہول اٹھنے لگے تھے۔ وہ کچھ

تک وفا

بتاتا بھی نہیں تھا۔ مالا تو پوچھ پوچھ کے تھک چکی تھی۔ پھر ایک دن وہ وقت سے پہلے گھر آ گیا تھا۔ عجیب تھا، تھکا، تھکا اور پڑ مردہ سا..... وہ بغیر کچھ کھائے سے معمول کی طرح اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ کیونکہ اب اسے عیسیٰ باہر جانے نہیں دیتا تھا۔ آج چونکہ مالا کا ضبط جواب دے گیا تھا سو وہ ساری احتیاط بھلا کر گیسٹ روم کی طرف آ گئی تھی۔ اس کے کمرے میں داخل ہو کر مالا کو کچھ عجیب سا لگا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ صوفے پر آڑا تر چھالینا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مالا نے اسے پہلی مرتبہ سگریٹ پیتے دیکھا تھا تبھی تقریباً دنگ رہ گئی تھی جبکہ آفاق اسے دیکھ کر اسپرنگ کی طرح اچھل پڑا تھا۔

”تم یہاں.....؟“ وہ بری طرح گڑ بڑا گیا۔ اسے امید نہیں تھی، مالا اس طرح چھاپا مار دے گی۔ اسی لیے کچھ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

”اتنے حیران کیوں ہو.....؟ اور یہ سگریٹ کیوں پھونک رہے ہو؟“ مالا کو گویا تپ ہی چڑھ گئی تھی۔ اس نے سگریٹ کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے کھینچ کر دور پھینک دیا تھا۔ آفاق گویا ششدر رہ گیا۔ ایسی جرات کی بھی اسے امید نہیں تھی۔



آئیڈیل ہو سکتا تھا۔ کسی کے بھی حواسوں پر بجلی گرا سکتا تھا اور اس نے دھبی آواز میں کچھ بولتے ہوئے مالا کے حواسوں پر بجلی گرا ہی دی تھی۔

”مجھے محبت ہو گئی ہے۔“ اس نے گویا اعتراف جرم کیا تھا۔ جھکے سر اور جھکی آنکھوں کے ساتھ..... مالا ایک دم دہل کر رہ گئی۔

”کس سے.....؟“ وہ بھینچی آواز میں بولی تھی۔ تبھی کمرے کے باہر ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ آفاق کا دھیان بھی دروازے کی چر..... اور آہٹ کی طرف چلا گیا تھا تاہم وہ سابقہ الجھے، الجھے لہجے میں بے ربط اور انک، انک کر بولنے لگا۔

”تم سے.....“ آفاق کے اگلے الفاظ لبوں میں ہی دبے رہ گئے تھے، دروازہ اب پوری طرح کھل چکا تھا۔ مالا اور آفاق کی آنکھیں اٹل پڑیں۔

”تم سے..... اس لیے شیر کر رہا ہوں کہ مجھے لگتا ہے، اس محبت کا اب میں اکیلے بوجھ اٹھا نہیں پاؤں گا۔“ آفاق نے انک، انک کر ہی سہی تاہم بات مکمل کر دی تھی۔ مالا کی غیر معمولی حد تک کھلی آنکھیں لمبے بھر میں نارمل ہو گئیں..... خوف کے مارے دھڑکتا دل تھم سا گیا تھا جبکہ آفاق کسی اور کی موجودگی محسوس کر کے اصل بات چھپا لیتا چاہتا تھا پھر صورت حال ایسی دیکھ کر کچ بتانے سے خود کو روک نہ پایا حالانکہ کوئی اور وقت ہوتا تو فی الحال وہ عیسیٰ کو کچھ نہ بتاتا۔

چونکہ علی عیسیٰ اچانک اس طرف آیا تھا، ابھی اس نے آفس سے آکر کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔ یقیناً وہ مالا کو ڈھونڈتا ہوا آفاق کے کمرے کی طرف آیا تھا۔ اس کی عادت تھی وہ آفس سے آنے کے بعد مالا، مالا بیکار کر جب تک اسے دیکھ نہ لیتا، اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ سو وہ اپنی تسلی کرنے مالا کو ڈھونڈتا ہوا ادھر آیا تھا۔ اسے امید تھی مالا آفاق سے انویسٹی گیشن کر رہی ہوگی۔ عین انسانی فطرت کے تحت آفاق کی

بدلی کیفیت اور مجنونانہ انداز نے مالا کو بھی ٹھنکار کھا تھا سو وہ آج معاملے کی تہ میں اترنے کی کھوج لیے آفاق کے کمرے تک آ گئی تھی۔ عیسیٰ کو امید نہیں تھی آفاق اسے دیکھ کر بھی سچ بول دے گا وہ آفاق کے بدلے تیار کب سے دیکھ رہا تھا۔ اسے کھٹکا تو تھا ہی کہ وال میں کچھ کالا ضرور ہے اور یہ کالا نظر بھی آ گیا تھا۔ اب عیسیٰ کے ہاتھ جیسے آفاق کی تیزوری آ گئی تھی۔

”اوہ..... تو یہ بات تھی۔“ عیسیٰ نے مصنوعی گہرے طنز سے کہا۔ ”میں تمہارے جو گیوں والے روپ کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ مینڈکی کو بھی بالآخر زکام ہو گیا ہے۔“ وہ مسکراہٹ دباتا آفاق پر صاف چوٹ کر رہا تھا..... دراصل آفاق بھی عیسیٰ کے اچانک چلے آنے پر بوکھلا گیا تھا، کچھ صورت حال بھی ایسی تھی کہ اگر ”وہ تم سے.....“ کے بعد ایک دفعہ پھر رک جاتا تو ڈھیروں غلط فہمیاں بھی جنم لے سکتی تھیں۔ عام حالات میں وہ فی الحال عیسیٰ کو اپنی محبت کے بارے میں ہرگز نہ بتاتا کیونکہ عیسیٰ نے اس کا ریکارڈ لگا دینا تھا مگر فی الوقت آفاق کوچ بتانا ہی بڑا تھا اور اس کا سچ سن کر عیسیٰ کے چہرے پر غیر محسوس قسم کا سکون بھی اتر آیا تھا۔ ابھی آفاق کو تمللانے کے لیے مزید چوٹ کر رہا تھا۔ آفاق چونکہ سنبھل چکا تھا اسی لیے بے ساختہ عیسیٰ کی بات نوک کر بولا۔

”یہ مینڈکی سے مراد کیا ہے تمہاری؟“ ماتھے پر بل ڈالے اس نے خفا، خفا سے لہجے میں پوچھا۔

”سمجھدار کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے جبکہ تمہارے جیسے احمق وضاحت مانگنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“ عیسیٰ نے چپک کر کہا۔

”میں تمہیں اسی لیے کچھ بتا نہیں رہا تھا۔ مالا کم از کم تمہاری طرح طنز نہیں کرتی..... تم اچانک جانے کہاں سے فک پڑے ہو۔“ آفاق نے روٹھے، روٹھے لہجے میں کہہ کر منہ بسورا تھا۔ اس کی غمناکی کو

محسوس کر کے کب سے ہونق کھڑی مالا کی طرف اشارہ کر کے عیسیٰ مزے سے بولا تھا۔

”مالا کو تو ایسے بتا رہے ہو گویا تمہاری لو اسٹوری میں یہ بڑا اہم کردار ادا کرے گی۔“ اس نے بھنائے ہوئے کھڑے آفاق کو پھر سے چھیڑا۔

”بہن ہے میری..... کیوں نہیں اہم کردار ادا کرے گی، ہر کوئی تمہارے جیسا نہیں ہوتا.....“

بدلی لہجہ اور طنز کرنے والا، خود تو میسج پر بھی میں شادی شدہ ہوں..... کی ٹیون سیٹ کر رکھی ہے اور دوسروں کو محبت بھی نہیں کرنے دیتے۔“ آفاق غصے میں الٹا سیدھا بولے جا رہا تھا۔ عیسیٰ کو ہنسی تو بہت آئی مگر چھپا گیا تھا۔

”میں نے کون سا کرفیو لگا رکھا ہے؟“ عیسیٰ نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔

”میر میری محبت کی رام کہانی تم سے برداشت نہیں ہو سکی فوراً ہٹل کے جن کی طرح حاضر ہو گئے۔ میں نے مالا سے بات کرنے کے لیے اتنی مشکل سے ہمت جمع کی تھی۔“ آفاق کو عیسیٰ کی

اپناک نثری پر غصہ تھا اور یہ غصہ اسے مالا پر بھی تھا جو عیسیٰ کو دیکھ کر ایسی ہونق ہوئی تھی کہ ابھی تک مجسمہ بنی کھڑی تھی۔ کم از کم آفاق سے یہ تو پوچھ لیتی کہ اسے

محبت کس سے ہوئی تھی؟“ شاید وہ آفاق کے ”تم سے“ کے بعد ایسی حیب ہوئی کہ دوبارہ وضاحت کرنے پر بھی بول نہیں سکتی تھی حالانکہ آفاق نے اس کا

سوال نظر انداز کر کے ہی یہ الفاظ بولے تھے کہ ”تم سے اس لیے شیر کر رہا ہوں، مجھے لگتا ہے اس محبت کا

میں اکیلے بوجھ اٹھا نہیں پاؤں گا۔“ وہ سوچ رہا تھا، مالا سے کچھ شیر کر کے اس کا من شانت اور بوجھ ہلکا

ہو جائے گا جبکہ عیسیٰ اس کے من کا بوجھ مزید بڑھانے پہنچ گیا تھا۔

”آہ..... ہمت.....! تو اب کہاں گئی تمہاری ہمت.....؟“ عیسیٰ نے بھولپن کی انہما کرتے ہوئے

کہا تھا۔ آفاق کا دل چاہا، پاس رکھا لائٹ اس کے منہ

## نرک وفا

پر دے مارے مگر اتنے سے لائٹ نے عیسیٰ کا بھلا کیا بگاڑ لیتا تھا۔

”مجھے نہیں پتا..... جاؤ تم یہاں سے۔“ آفاق بھنا کر رہ گیا..... تب عیسیٰ کو اس کی حالت پر رحم آ ہی گیا..... اس نے آفاق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بے ساختہ اسے پکڑا رکھا۔

”اچھا، مجھ سے شرم آتی ہے؟ میرے سامنے بتانا نہیں چاہتے؟ ٹھیک ہے، میں باہر چلا جاتا ہوں، تم مالا کو بتادو، اس امید کے ساتھ کہ مالا تمہارا راز لیک

آؤٹ نہیں کرے گی۔“ عیسیٰ نے اس کا کندھا دبا کر نرمی سے کہا تھا پھر مالا کو رک جانے کا اشارہ کیا.....

حالانکہ وہ عیسیٰ سے بھی پہلے باہر نکلتا چاہتی تھی اور اس وقت یہ پچھتا بھی رہی تھی جب اس نے آفاق سے

کچھ پوچھنے کا ارادہ کیا تھا۔

کچھ دیر پہلے آفاق کے جملے اور اس کے پہلے دو لفظوں نے اس کی جان نکال دی تھی پھر اچانک عیسیٰ کا کمرے میں آ جانا۔ مالا کو لگ رہا تھا وہ مجرم، نہ

ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی ہے پھر عیسیٰ اور آفاق کی نوک جھوک نے اس کے من کو ڈھارس پہنچائی تھی۔

کچھ دیر پہلے والی اعصاب شکن صورت حال کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر پھر بھی مالا کچھ کھٹک رہی تھی کہ ”کیا

پتا عیسیٰ کو دیکھ کر آفاق نے بات بدل دی ہو۔“ مگر جب آفاق نے اتنے مان بھرے لہجے میں کہا کہ ”مالا

میر میری بہن ہے۔“ تب اسے اپنی کچھ دیر پہلے والی سوچ پر شرمندگی ہوئی تھی۔ اس نے آفاق کی نیت پر

شک کیا تھا، چاہے لہجے بھر کے لیے ہی سہی تاہم اسے اپنی سوچ پر خفت ضرور تھی۔ اداسی و شرمندگی کے باعث وہ فی الفور منظر سے ہٹ جانا چاہتی تھی مگر عیسیٰ

کی بات نے اسے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”مالا تمہارا راز لیک آؤٹ نہیں کرے گی۔“

عیسیٰ کے لہجے میں کیسا مان اور اعتماد بول رہا تھا۔ مالا کو اس لہجے اپنے ہم سفر پر فخر محسوس ہوا۔ اسے لگا، وہ

91 ماہنامہ پاکیزہ جون 2014ء



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے ٹرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بریک لگ گئے تھے۔  
”ابھی بکواس کی کہاں ہے؟“ آفاق نے پھر سے دانت کھوسے تھے۔ مالا الجھ گئی۔  
”تم منہ تو اپنا بند کرو..... اور یہ سگریٹ کے بھکے..... آف.....“ مالا نے ناک چڑھا کر سفید ٹائیون کا جالی والا پردہ ہٹا کر سلائڈ کھول دیے تھے، کمرے میں تازہ ہوا کی آمد ہوئی تو کچھ تازگی کا احساس ہوا تھا۔

”یہ اسمونگ کی لت کیوں لگائی؟ اور کب سے لگائی؟“ اب وہ بڑے جارحانہ تیور لیے پوچھ رہی تھی تب آفاق نے ڈرتے، ڈرتے بتایا۔  
”جب سے محبت ہوئی۔“ اس کا انداز مسکینی لیے تھا۔ اتنا کہ مالا کو غصہ آتے آتے رہ گیا..... پھر اس نے آنکھیں سکیڑ کر آفاق کو دیکھا تھا جو ہاتھوں سے بال سنوارتا اب پہلے کی طرح افسردہ نہیں لگ رہا تھا۔  
”اور محبت کب سے ہوئی؟“ اس نے تکیے چوتھوں سے آفاق کو گھور کر پوچھا۔ یعنی اس کا شک بھی درست ہی نکلا تھا۔ جناب محبت کا روگ سینے سے لگائے پھر رہے تھے۔

”جب سے اسے دیکھا ہے یوں سمجھو..... پہلی نظر کی محبت.....“ آفاق گویا کھوسا گیا تھا۔ مالانے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔  
”اوہ..... تو میں پوچھ سکتی ہوں، وہ خاتون ہیں کون؟“ اسے فطری ساجش لاحق ہوا تھا۔ تبھی ذرا تیز لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”تم.....“ وہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا جبکہ مالانے اتنی زور کی چیخ ماری تھی کہ سیل فون کی طرف متوجہ ہوتا آفاق دہل کر رگ گیا۔

مالا علی عیسیٰ کی زندگی میں آفاق کیا گل کھلانے والا تھا اس کی خوشگوار ازدواجی زندگی کیونکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی یہ سب ضرور جاننے لیکن اگلے ماہ!

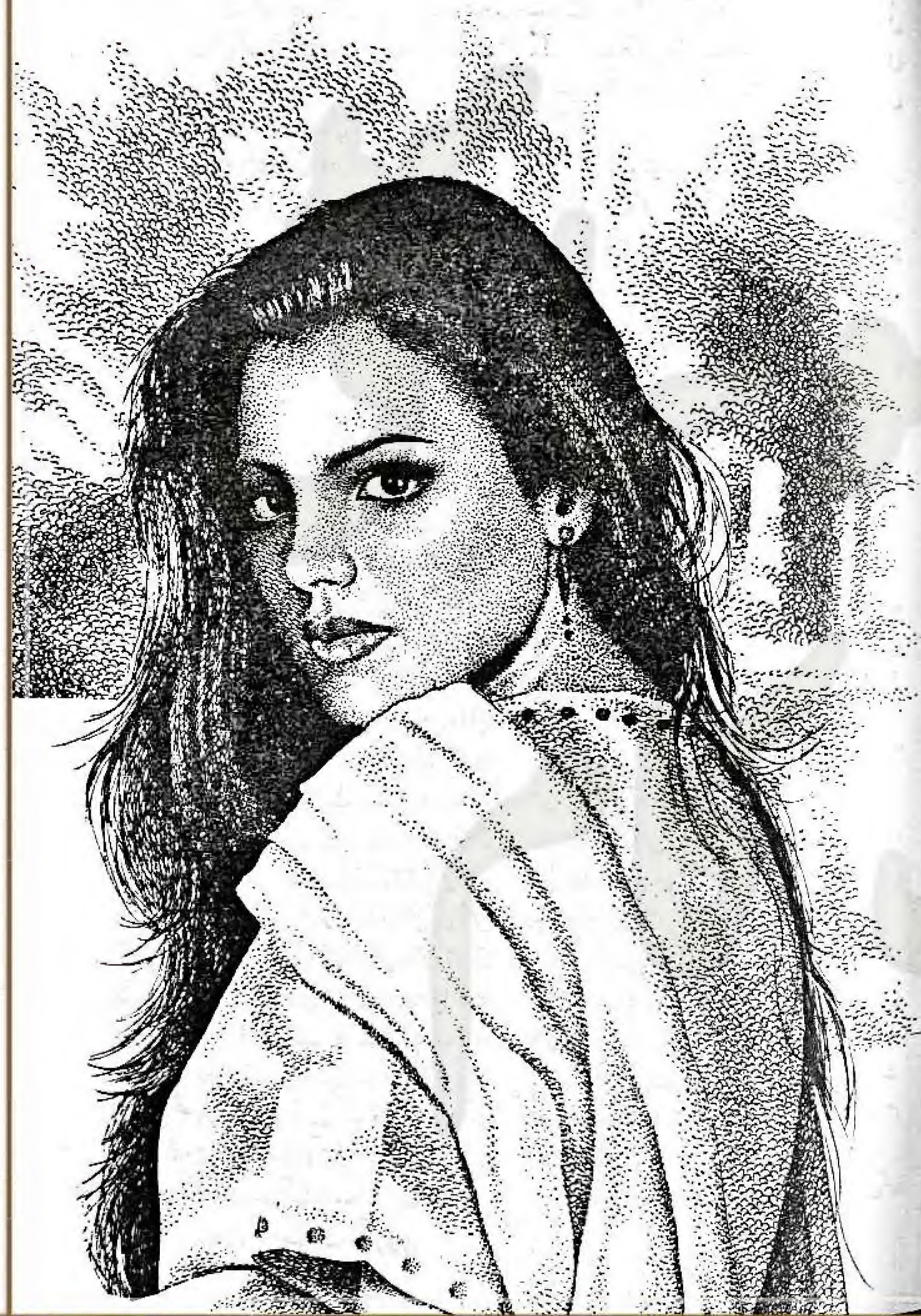
زمین سے دو انچ اونچی ہو گئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں دیوں کی بجگ بھر گئی تھی۔ اس کے چہرے پر الوہی خوشی چمکنے لگی۔ یہ کیسا اعتماد اور اعتبار کا رشتہ تھا؟ یہ کیسی محبت تھی؟ یہ کیسا خلوص تھا؟ مالا کو آج گویا دو جہاں کی خوشیاں بر آگئی تھیں۔ علی عیسیٰ اس پر اعتبار کرتا تھا..... اس سے محبت کرتا تھا، اس کی عزت کرتا تھا اور وہ بھی مالا سے بدگمان ہونے والا نہیں تھا۔ یہ احساس معمولی نہیں تھا، یہ احساس معمولی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

”تم مالا سے کچھ بھی شیئر کر سکتے ہوتا ہم اگر میری ضرورت پڑی تو ہاتھ نہ آؤں گا۔“ وہ جاتے جاتے بھی دمکانے سے باز نہیں آیا تھا تب آفاق نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

”مجھے تمہاری بڑی ضرورت ہے اور اگر مالا میرا راز“ تم تک پہنچا دے گی تو یہ میرے لیے عین سعادت ہوگی۔“ آفاق نے انکساری کی انتہا کرتے ہوئے کہا تھا پھر عیسیٰ کے باہر نکلتے ہی مالا کی طرف متوجہ ہو گیا..... وہ ابھی تک گرم صم سی کھڑی تھی، عیسیٰ کے مہکتے لفظوں کے اثر میں کھوئی، کھوئی، سی، آفاق نے گلا کھنکھار کے دعائے لہجے میں ہانک لگائی تھی۔  
”اللہ، تیرا شکر ہے بلائیں گئی۔“ اس کے انداز میں بھر پور شرارت تھی جبکہ بلا سے مراد اس کا اشارہ عیسیٰ کی طرف تھا۔ مالا کو اتنا برا لگا کہ حد نہیں وہ جو کچھ دیر پہلے جوگی بنا ہوا تھا اتنے دن سے آزرده، رنجیدہ، افسردہ، غمگین اور جانے کیا، کیا دکھائی دے رہا تھا، اب پھر سے پرانی جون میں لوٹنا نظر آ رہا تھا..... یہ عیسیٰ کی نرمی کا کمال تھا یا پھر کچھ دیر کے لیے وہ سابقہ کیفیت سے باہر نکل کر فریش ہونا چاہتا تھا۔ مالا سمجھ نہیں پائی تھی تاہم آفاق کا عیسیٰ کو بلا کہنے والا انداز اسے آگ لگا گیا تھا۔

”کیا بکواس ہے؟“ اسے ہنستا دیکھ کر مالا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ مالا کا غصہ دیکھ کر اس کی ہنسی کو





ناولٹ

ترک و فنا

نایاب جیلانی



چہنا حصہ



مون ان کے ساتھ اس گھر میں رہے اور دوسری خواہش یہ تھی کہ مون شادی کر لے..... اور ان کی بہت لاڈلی، تھوڑی، ضدی، کچھ سرکش اور انتہائی غیر معمولی ذہن بیٹی ان دو باتوں کو ماننے سے قطعاً

آج کل ان کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی اور شاید وہ پہلے کی طرح جلدی صحت یاب ہو جاتے اگر مون کی طرف سے انہیں دھڑکے نہ لگے ہوتے..... ان کی سب سے بڑی خواہش تو یہ تھی کہ



دور تھی..... وہ جب بھی مون کے سامنے اپنی یہ دو خواہشات رکھتے تھے، مون انہیں ایسے، ایسے دلائل دے کر بے بس کر دیتی تھی کہ وہ دوبارہ کچھ کہہ ہی نہیں پاتے تھے۔

علی عیسیٰ کی خوشحال اور پرسکون زندگی سے وہ جتنے مطمئن تھے، مون کی وجہ سے اتنے ہی اب سیٹ، پریشان حال اور پُر اذیت رہنے لگے تھے۔ وہ کیوں ایسی تھی؟ وہ کیوں ایسی ہو گئی تھی؟ یا پھر وہ شروع سے ہی ایسی تھی وہ باپ ہو کر بھی سمجھ نہیں پائے۔ ابھی کچھ دیر پہلے مون کی فون کال آئی تھی۔ اکلوتی بیٹی کی آواز سن کر ان کے دل میں دور تک ٹھنڈک اتر آئی تھی مگر اس کی باتوں نے اتنا ہی ان کے وجود کو پر زخ بنا دیا تھا۔ وہ ابھی تک بہت ڈولیدہ حال اور بکھری ہوئی سوچوں کے مہنور میں غرق ہو رہے تھے اور مون جیسے بڑے ہی عام لہجے میں ٹھوکروں سے کالج اڑا رہی تھی۔ ان کے یہ کہنے پر کہ ”تم میرا حال پوچھنے بھی نہیں آئی بیٹا۔“ اور اسی قسم کے دوسرے ٹھوکے سن کر مون نے سرسری لہجے میں کہا تھا۔

”آپ تو اکثر بیمار رہتے ہیں، اب ہر روز اپنا کام چھوڑ کر تو نہیں آسکتی۔“ اس کا لہجہ اتنا برا نہیں تھا جس قدر الفاظ زہریلے تھے۔ ان کے اندر کالج ٹوٹ کر بکھرنے لگے تھے۔ ایسا زور کا دھچکا لگا تھا کہ بہت دیر تک وہ کچھ بولنے کے قابل بھی نہیں ہو سکے تھے۔ یہ ان کی اکلوتی، لاڈلی بیٹی تھی جس کے پاس باپ کی طبیعت پوچھنے کا بھی وقت نہیں تھا حالانکہ وہ جانتے تھے مون ان سے بے انتہا محبت کرتی تھی..... پھر اچانک سچ میں کیا ہو گیا؟ وہ سوچتے تو مون کے اس رونے کے چہرے تھوڑا بہت اپنا جی تصور نہیں نظر آنے لگتا تھا مگر مون بھی آہستہ، آہستہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے گی یا احساس توہین کی زنجیروں سے نکل جائے گی، اپنی خام خیالی

پر وہ بس سوچتے ہی رہ گئے تھے نہ وہ احساس توہین کے ٹھنڈے سے نکل سکی تھی اور نہ ہی وہ کچھ بھول پائی تھی۔ اسے اول روز سے مالا کے وجود اور اس کی ذات سے نفرت تھی، یہ نفرت بڑھ تو سکتی تھی کم نہیں ہو سکتی تھی۔

ان کے سینے پر ایک بوجھ نما راز دفن تھا اور جب اس بوجھ کا وزن ڈگنا ہو جاتا ان کی برداشت سے بڑھ جاتا تب وہ اسپتال کے بستر پر پہنچ جاتے تھے۔ اب بھی سینے سے اشقی ٹیسوں کو دبائے وہ مسلسل مون کے بارے ہی میں سوچ رہے تھے۔

”تمہارے پاس اپنے بیمار باپ سے ملنے کا بھی وقت نہیں رہا بیٹا۔“ انہوں نے کیسے اپنے بکھرے حواسوں پر قابو پا کر یہ مشکل ٹھکوا کرنے کی کوشش میں آنسوؤں پر بند باندھا تھا۔

”نہیں.....“ مون نے کھنور پن کی انتہا کر دی تھی۔ ان کے دل کو پھر سے دھچکا لگا۔

”تم ایسی تو نہیں تھیں مون.....“ وہ رو دے تھے مگر مون ان احساسات کو سمجھنے سے بہت دور چلی گئی تھی۔ اس پر باپ کے بھرائے لہجے نے کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ وہ بہت سنگ دل ہو چکی تھی۔

”آپ میرے لیے شکر نہ ہوا کریں.....“ اس نے غصیلی آواز میں کہا۔

”تو پھر کون شکر ہوا کرے.....؟“ انہیں گہرا رنج ہوا۔ مون کی باتیں اکثر ان کے دل میں پیوست ہو جاتی تھیں۔

”پلیز پاپا! کوئی بات اور نہیں تو میں فون بند کرتی ہوں، کام ہے مجھے۔“ وہ سخت بیزار لہجے میں بولی تھی۔

”میری بات سنو.....“ انہوں نے بے ساختہ مون کو روکا تھا۔ وہ جو فون بند کرنے لگی تھی ایک دم رک گئی۔

”گھر کب آؤ گی؟“ اس کی خاموشی محسوس کر

کے حبیب احمد نے پھیکے لہجے میں پوچھا۔

”یہ سوال مت کیا کریں.....“ وہ رکھائی سے بولی۔

”کیوں.....؟“ انہیں پھر سے دھچکا لگا۔

”میں جواب نہیں دے سکوں گی۔“ مون بولتے، بولتے ذرا دیر کے لیے چپ کر گئی تھی تبھی انہوں نے دوبارہ بے چینی سے پوچھا۔

”کیوں.....؟“

”آپ کو برا لگے گا۔“ وہ ایک مرتبہ پھر ذرا سارک گئی۔

”اچھا..... تو تمہیں اس بات کا خیال ہے؟“ ان کی نم آنکھیں مسکرا دی تھیں تب مون کچھ جھنجھلا گئی۔

”ہے تو مگر.....“ وہ شاید فون بند کر دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کال طویل ہوتی دیکھ کر جھلاہٹ کا شکار تھی۔

”اگر خیال ہے تو اپنے پاپا کی خاطر گھر لوٹ آؤ بیٹا!“ ان کے لہجے میں آس بھیگ رہی تھی۔ وہ آرزو کی انتہا پر تھے اور مون کھنور پن کی انتہا پر.....

”یہ ممکن ہے، اگر آپ ”اسے“ یا مجھے، ہم دونوں میں سے ایک کو قریب رکھیں، آپ میری بات مان جائیں، میں آپ کی بات مان جاؤں گی۔“ اس نے وہی بات کی جس کا انہیں دھڑکا تھا تو اس کا مطلب ہے مون نے اپنے دل میں لگی گانٹھ کو ابھی تک نہیں کھولا تھا۔ وہ کتنے بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔

”تم کیوں نہیں سمجھتیں بیٹا! یہ ممکن نہیں۔“ وہ رو دینے کو تھے مگر دوسری طرف پروا کے تھی۔

”جب ممکن ہوا تب اپنی ڈیمانڈ میرے سامنے رکھیے گا۔“ مون زہر خند ہوئی..... تب وہ گویا اندر سے ایک مرتبہ پھر ٹوٹ گئے تھے۔

تراک وھا

”تمہارا اعتقاد کیوں اتنا کمزور ہوتا جا رہا ہے؟ کیوں نہیں، تمہیں سمجھ آتی، جو سمجھتیں ہمارے نصیب کی ہوں، دنیا کی کوئی طاقت انہیں ہم سے نہیں چھین سکتی۔ وہ ہمیں مل کے ہی رہتی ہیں اور جو ہمارے حصے کی نہ ہوں انہیں ساری دنیا مل کے بھی ہمارا نہیں کر سکتی۔“ وہ قطرہ، قطرہ پھیل گئے تھے، مون کی سرکشی، ضد اور جذباتیت انہیں اتنی ہی تکلیف دیتی تھی۔ اس کی ایک ضد نے انہیں برسوں کا بیمار بنا دیا تھا۔

”میرے سامنے عیسیٰ کی طرح اقوال زریں بولنا مت شروع ہو جایا کریں.....“ مون سچ کر رہ گئی..... اکثر باپ اور بھائی کی باتیں اسے لاجواب کر دیتی تھیں پھر جب اس کے پاس دلائل ختم ہو جاتے تھے تب وہ دوسرا حربہ استعمال کرتی تھی پھر کیا مجال تھی، اس کے باپ یا بھائی کی جو وہ اس کے سامنے کوئی اور دلیل اٹھالائے۔ مون اس وقت بھی چاہتی تو اپنے باپ کو لاجواب کر سکتی تھی مگر فی الحال دوسرا حربہ استعمال کرنے کا اس کے ذہن میں خیال نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن کو کبھی کبھی بہت ریٹیکس کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتی تھی، اب باپ کی نیندیں حرام کر کے وہ خود کو پرسکون کر رہی تھی، کیسی خود غرض بیٹی تھی وہ۔

”تمہارا باپ ہوں، تمہیں بھگتا نہیں دیکھ سکتا۔“ وہ بھرائی آواز میں بولے۔

”آپ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے، نہ کل کچھ کیا تھا اور نہ آج کچھ کریں گے۔ میں خود بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ آپ شاید جانتے نہیں، میں تو محض آپ کی محبت کو آزار ہی تھی اور آپ کی محبت کتنی کمزور نکلی..... بس علی عیسیٰ اور مالا تک محدود ہے آپ کی محبت..... اور دیکھ لیجیے گا، میں وہ سب کر کے دکھاؤں گی جو آپ دہم دگمان بھی نہیں کر سکتے۔“



ترک و تھا

نے گلا کھٹکھا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور مون گویا خیالات کی دنیا سے حیران، حیران باہر لگی تھی۔  
”تم جانتے تو ہو، مجھے اپنی ذات بہت عزیز ہے۔“ وہ فی الفور سنبھل کر گویا ہوئی تھی۔ اپنی کسی کمزوری کو واضح کرنا اسے گوارا نہیں تھا۔ عیسیٰ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔

”وہ کہتے ہیں ناں.....“ اس نے مسکراہٹ روک کر کچھ یاد کرنے کی کوشش میں خاموشی اختیار کی تھی پھر نرمی سے گویا جتانے لگا۔  
”گزرے لمحوں کو بھلانے میں کچھ وقت لگے گا

اپنی ذات سے باہر نکلنے میں کچھ وقت لگے گا“  
”آں..... ہاں.....“ عیسیٰ کے کلام کو سن کر مون نے برجستہ اسے ٹوکا تھا..... ”میں اپنی ذات کے بت کدے سے باہر نکلنے والی نہیں.....“ در پردہ وہ اسے لاجواب کرنا چاہ رہی تھی۔ مون ایسا گڑبھی سکتی تھی اگر اپنے اوپر والے پورشن (دماغ) کا کمال حاصل کرتی تو..... مگر آج وہ کسی اور ہی موڈ میں تھی۔ ذہنی طور پر خود کو تھکانا نہیں چاہتی تھی۔

”یاد رکھنا پیاری مون.....! بت ٹوٹ بھی جاتے ہیں..... اللہ تمہیں ایسی اذیت سے بچائے.....“ عیسیٰ نے بے ساختہ اسے ٹوکا تھا۔  
”تم مجھے اتنا کمزور نہ سمجھو.....“ وہی ضدی سا کچھ کچھ کر دفر انداز..... بھلا مون کا باپ اور بھائی پوری جان سے کانٹے کیوں نہ.....

”اتنی اونچائی پر مت جانا مون.....! کہ ہم تم تک اور تم ہم تک پہنچ ہی نہ پاؤ..... یاد رکھنا، جب اللہ کسی کو اونچی جگہ پر کھڑا کرتا ہے تو اسی پر بھروسا رکھنا چاہیے یا تو جب گرنے کے قریب وہ سہارا دے گا، ورنہ اڑنا تو سکھا ہی دے گا..... بات صرف اللہ پر بھروسے کی ہے، اپنے ایمان کو کمزور مت کرو..... اور اونچائی پر کھڑے ہو کر غرور بھی مت کرو، تمہیں اونچائی پر کھڑا کرنے والا بھی اللہ

وہی پڑا، دھیمی مگر سلتی آواز سنائی دے رہی تھی۔  
”ابھی تک صبر اور شکر کیے تو بیٹھی ہوں.....“  
ورنہ جانے کیا کچھ کر ڈالتی، آپ کا خیال ہی تو ارادوں کو توڑ ڈالتا ہے.....“ جانے کس رو میں اس نے پہلی مرتبہ کمزور لہجے میں کچھ کہا تھا۔ شاید باپ کی محبت اسے بھی کبھی کمزور کر دی جاتی تھی۔ عیسیٰ نے اک گہری سانس لی تھی اور دوسری طرف مون کی اتنی تیز حسیات تھیں کہ اس نے محض عیسیٰ کے سانس لینے والے اشکال سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ریسیور باپا کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

”تم بھی پہنچ گئے؟“ مون نے زیر لب بڑبڑا کر کہا تھا، وہ جانتی تھی عیسیٰ نے جتنی بات سن لی تھی، اس پر تبصرہ کیے بغیر رہنے والا نہیں تھا۔  
”باپا کا خیال تمہارے یعنی مون حبیب کے ارادوں کو توڑ دیتا ہے۔ اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہوگی؟ تم اپنے آپ سے نکل کر دوسروں کے لیے سوچنے لگی ہو، اتنی بڑی تبدیلی..... یقیناً میں حیران ہوں۔“

عموماً مون اپنے بھائی سے کم، کم ہم کلام ہوتی تھی، اسے عیسیٰ کی مقناطیسی باتوں سے خوف آتا تھا۔ جیسے اب آ رہا تھا، وہ عیسیٰ سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی یہ تو اچانک عیسیٰ اس کے فون کی خوشبو کا پیچھا کرتا آ گیا تھا حالانکہ مون جانتی بھی تھی، وہ آفس سے آنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارتا ہے، یہ عیسیٰ کا معمول تھا اور مون کی توقع کے برعکس عیسیٰ شادی کے بعد بھی اپنی روٹین بدل نہیں سکا تھا۔ وہ تو یہی سمجھتی تھی، عیسیٰ شادی کے بعد بہت بدل گیا ہے، حالانکہ دور سے دیکھنے والی چیز کے بارے میں غلط اندازے لگانا اس کے فن میں شامل نہیں تھا۔ وہ جانے کب تک خاموش رہتی مگر عیسیٰ کی دھیمی نرم آواز طلسم توڑ ڈالتی تھی۔  
”کیا تم لائن پر موجود ہو مون.....؟“ عیسیٰ

کے دل کو بھی پلٹ دیتا.....“ وہ ٹوٹے بکھرے لہجے میں بے آواز روتے ہوئے بولتے جا رہے تھے مگر دوسری طرف ساعتوں پر خمار کا پردہ چڑھا تھا۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں پر مان اور خمار کا پردہ..... وہ کیوں نہ پھر مون کی سرکشی سے خوفزدہ ہوتے.....؟  
”میں گمراہ یا سرکش نہیں، نہ رستہ بھولنے والی ہوں..... آپ کیوں نہیں سمجھتے..... اللہ خود مدد کے لیے زمین پر نہیں اترتا.....“ ویلے بنا دیتا ہے اور میری صلاحیتیں، میرے لیے وسیلہ ہیں۔“ مون نے جھنجھلا کر وضاحت کی تھی۔ عموماً وہ وضاحتیں کرتی نہیں تھی مگر باپا کے ”سرکشی“ والے طعنے اسے صفائی دینے پر مجبور کر دیتے تھے۔

”اپنی صلاحیتوں کا ناجائز استعمال نہ کرو، یہ بھی گناہ کبیرہ ہے، اپنے علم کو بھی ناجائز نہ بانٹو، یہ بھی گناہ کبیرہ ہے۔“ وہ بے ساختہ اسے ٹوک گئے تھے۔  
”اور ثواب کیا ہے؟ احساس تو بہن میں جکڑ کر عمر گزار دینا، ٹھکرائے جانے کی تکلیف سہنا.....؟ انتقام لینا، نہ بدلہ لینا.....؟“ مون غضبناک ہو گئی۔

”تمہیں کسی نے نہیں ٹھکرایا..... غلط بات مت کرو۔“ حبیب احمد نے گویا منت کی تھی۔  
”آپ دوسروں کے عیبوں پر پردہ مت ڈالیں، میں جانتی ہوں، جس نے جو بھی میرے ساتھ کیا تھا۔“ وہ انتہا کی بدگمان تھی۔

”کسی نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا، تم نصیب کے لکھے پر شاکر کیوں نہیں ہوتیں.....؟“  
حبیب احمد زیر لب بڑبڑا رہے تھے تب کسی نے چپکے سے دروازہ کھول کر قدم اندر رکھے تھے۔ پھر کوئی دے قدموں چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا..... وہ چونکے تو تب تھے جب کسی نے ریسیور ان کے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے کان سے لگا لیا تھا۔ انہیں سے

اس کے لہجے میں کیسی فرعونیت بھری تھی۔ حبیب احمد گویا وہیل، وہیل گئے۔  
”تجھے خوف نہیں آتا مون.....“ ان کو اگلے الفاظ ہی بھول گئے..... مون کے لب و لہجے میں پوشیدہ دھمکی نے ان کے حواس معطل کر دیے تھے۔ وہ گویا سر سے لے کر پھروں تک منجمد ہو گئے تھے۔ وہ کیا چاہتی تھی؟ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی؟ وہ انہیں ڈھکے چھپے لفظوں میں کیا بتا رہی تھی؟  
”نہیں.....“ اس نے ایک مرتبہ پھر ان کے حواس معطل کر دیے تھے۔

”تو تمہیں کسی بات کا خوف نہیں رہا..... پھر بھی تم سمجھ نہیں رہیں بیٹا! کہ تم راستہ بھول رہی ہو۔“ حبیب احمد کی آواز کسی عمر رسیدہ بزرگ کی طرح سیکڑا رہی تھی۔ مون اللہ کی طرف سے ان کے لیے آزمائش اور امتحان بن رہی تھی۔ ان کا جھٹکے کھاتا وجود بے بس ہو رہا تھا۔ یہ ان کی بیٹی کا ذہن اور سوچ اسے کس سمت لے جا رہے تھے؟ وہ کیوں نہ خوف زدہ ہوتے؟ مون نے ایک ننھے سے خواب کو بچانے کی خاطر جان کی بازی لگا رکھی تھی۔

”میں رستہ نہیں بھول رہی..... بس ایک خواب بچا رہی ہوں، پہلا اولین خواب..... جسے آپ نے اپنے ہی قدموں تلے چل دیا.....“ اس کی سانسیں ٹھنکار رہی تھیں حالانکہ لہجہ تو اب بھی اس کا بہت دھیمتا تھا۔ سرگوشیاں سا، مدہم سا..... مگر اس کے لفظ تلوار کی دھار تھے۔

”وہ خواب تمہارے نصیب کا نہیں تھا، تمہارے حصے کا نہیں تھا پھر تم نے اسے کیوں دیکھا.....؟ اس میں رنگ کیوں بھرے.....؟ تم نہیں جانتی تھیں کیا.....؟ خوابوں میں حقیقت کے رنگ صرف اللہ بھرتا ہے اگر خواب دیکھ لیا تھا تو پھر اس کی تعبیر کے لیے اللہ سے مدد مانگتی، دعا کرتی..... یقیناً وہ دلوں کو پلٹنے والا ہے، یقیناً وہ اس



کے بعد عیسیٰ نے سابقہ لہجے کو برقرار رکھ کر کہا تھا۔  
 ”ایسا نہیں ہوگا.....“ عیسیٰ بھی مطمئن تھا،  
 اس کا لہجہ بھی ٹھوس اور مستحکم تھا۔  
 ”سانپ کو آستین میں رکھ کر سمجھتے ہو کہ وہ  
 ڈسے گا بھی نہیں.....“ مون کے اگلے الفاظ نے  
 عیسیٰ کے مستحکم یقین کو متزلزل کر دیا تھا۔ وہ گویا لمحے  
 بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا..... اسے مون سے ایسی  
 دلیری اور زہریلی بات کی امید نہیں تھی۔

”سانپ سے تمہاری مراد کیا ہے؟“ بہت دیر  
 بعد عیسیٰ نے بڑے ہی ضبط کے ساتھ پوچھا تھا۔  
 حالانکہ وہ جانتا تھا مون بھی اچھی بات نہیں کرے  
 گی مگر پھر بھی جانے کس امید کے تحت پوچھ لیا تھا۔  
 ”مالا اور آفاق.....“ بالآخر مون نے اپنے  
 اندر کا زہر باہر اگل ہی دیا تھا۔ دوسری طرف اتنے  
 زور سے عیسیٰ چلا یا کہ مون کو اپنے کان پھنتے ہوئے  
 محسوس ہونے لگے تھے۔ وہ ایک دم دہل کر چپ  
 ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ اس کی چیخ پر دہل گیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کا  
 موبائل پکڑنے والا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔  
 اس نے کچھ تپ کر موبائل کو دیکھا تھا جونج، بج کر  
 خاموش ہو چکا تھا۔ اس نے اسکرین کو روشن کر کے  
 دیکھا، سامنے والی سفید جنگلی بلی کی کال تھی۔ اسے  
 قلق سا ہوا، مالا کی ڈرامائی چیخ کی وجہ سے موبائل  
 زمین بوس ہو چکا تھا اسے اٹھانے کے لیے وہ نیچے  
 جھکا تو مالا کے ہونق سے چہرے پر نظر پڑی تھی۔  
 آفاق کا منہ کچھ کھل سا گیا تھا۔ اس نے حیرت کے  
 جھکے سے سنبھل کر کہا۔

”تم کبھی ہونق ہو جاتی ہو اور کبھی چیخ پڑتی ہو،  
 آخر میری باتوں میں ایسا کیا راز ہے؟“ وہ...  
 بے چارگی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ موبائل کی اسکرین  
 خاموش تھی، اس کا آدھا دھیان کال کرنے والی

”تم جو کتابوں کو چھوڑ چکی ہو۔“ عیسیٰ کو قلق  
 سا ہوا تھا، مون نے جب تعلیم ادھوری چھوڑی تھی  
 جب عیسیٰ کو سب سے زیادہ تکلیف ہوئی تھی مگر ہمیشہ  
 کی طرح مون نے نہ پاپا کی بات مانی تھی اور نہ  
 عیسیٰ کے دلائل کو کوئی اہمیت دی تھی۔  
 ”مجھے اس پر کوئی پھتتا وا نہیں.....“ وہ بے  
 نیازی سے بولی۔

”سب سے بڑی غلطی ہی یہی ہے کہ اپنی  
 غلطیوں سے بے خبر رہا جائے۔“ عیسیٰ متاسف سا  
 رہ گیا۔

”تو تم اپنی غلطی سے آگاہ ہو؟“ وہ بھی تو  
 عیسیٰ کی بہن تھی پھر بھلا کیسے چوک جاتی، چبھتا ہوا  
 لہجہ عیسیٰ کو خوب چونکا بھی رہا تھا اور مون کی بات  
 کے ہر پہلو کی طرف اشارہ بھی کر رہا تھا۔

”پاکیزہ رشتوں کو غلطیوں سے عبارت  
 کر رہی ہو.....؟ اگر شادی کرنا ایک غلطی ہے تو پھر  
 میں واقعی گناہ گار ہوں۔“ عیسیٰ بھی بے نیازی سے  
 جتلا رہا تھا۔ تب مون نے بے ساختہ اسے ٹوک  
 دیا۔

”شادی کرنا غلطی نہیں..... اگر سوچ سمجھ کر  
 چھان بھنک کے کی جائے.....“ اس نے اندر کی جلن  
 باہر نکال ہی دی تھی۔ آج بہت عرصے بعد ان  
 دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہو رہی تھی۔ مون کو  
 بیٹے ہوئے کتنے ہی ماہ و سال یاد آگئے تھے جب وہ  
 دونوں بہن بھائی اتنے قریب نہ سہی پر اتنے دور بھی  
 نہیں تھے۔

”یعنی تم سمجھتی ہو، بابا کا اور میرا انتخاب غلط  
 ہے؟“ عیسیٰ نے بہ مشکل ناگواری دبا کر پوچھا تھا۔  
 ”ہاں..... اور وقت ثابت بھی کر دے گا۔“  
 وہ مطمئن تھی۔ گویا وقت کے اچانک پلٹا کھانے کا  
 اسے یقین تھا۔ عیسیٰ کو بے پناہ دکھ ہوا تھا مگر وہ کچھ  
 دیر کے لیے چپ سا کر گیا..... بہت دیر کی خاموشی

سے چلی گئی، مجھے تمہاری بیوی نہیں پسند.....“ عیسیٰ  
 کی بات کے جواب میں ایسا روکھا، سچ باہر آنے  
 والا تھا۔ عیسیٰ کو بھی خبر نہیں تھی۔ اب کہ عیسیٰ کچھ پل  
 کے لیے کم صبر رہ گیا..... حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مون  
 کو اس کی بیوی سے عجیب سی پُر خاش ہے۔ مون  
 اسے پسند نہیں کرتی..... مگر یوں منہ پھاڑ کر مون کا  
 سچ بولنا بھی عیسیٰ کو اچھا نہیں لگا تھا۔

”اب تمہاری پسند، نا پسند کی حدود سے بات  
 باہر نکل چکی ہے، مالا میری بیوی ہے، اس لحاظ سے  
 تمہارے لیے بھی قابل احترام ہے۔“ عیسیٰ نے  
 محل کے ساتھ اسے سمجھانا چاہا تھا۔ پاپا اس دوران  
 خاموشی کے ساتھ عیسیٰ کی گفتگو سن رہے تھے۔ انہوں  
 نے عیسیٰ کو ٹوکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”وہ میرے لیے قابل احترام نہیں.....“  
 مون بے ساختہ چپٹی۔  
 ”تو پھر.....؟“ عیسیٰ نے اچنبھے سے پوچھا۔  
 ”اس کا نام میرے سامنے مت لیا کرو۔“ وہ  
 زہر خند ہو رہی تھی۔

”نام نہ لینے سے کیا ہوگا.....؟ اس کی حیثیت  
 میں تبدیلی نہیں آئے گی..... وہ میری بیوی ہی  
 رہے گی۔“ عیسیٰ اب ذرا سخت لہجے میں بولا تھا۔  
 مون کی ناگواری اور غصہ اسے بھی غصہ دلا رہا تھا۔  
 ”وقت بہت کچھ ختم کر دیتا ہے۔“ کچھ دیر  
 بعد وہ اپنے ازلی اعتماد سے گویا ہوئی..... وہی  
 بُرتوش، پُراسرار قسم کا دھیما لہجہ..... عیسیٰ کا ذہن الجھ گیا  
 تھا۔

”وقت کم از کم رشتے ختم نہیں کر سکتا.....“  
 عیسیٰ نے اندرونی بے چینی چھپا کر کہا تھا تب وہ  
 ہولے سے دوسری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔  
 ”بہت کچھ بدل جاتا ہے عیسیٰ! تم جانے  
 کتابوں سے کب نکلو گے۔“ مون نے استہزائی  
 لب و لہجے میں کہا تھا، عیسیٰ کچھ چونک گیا۔

ہے اور اونچائی سے زمین بوس کرنے والا بھی وہی  
 خدا ہے۔ اس کے بھروسے کی ری کو چھوڑو گی تو نہ  
 دنیا رہے گی نہ آخرت.....“ عیسیٰ نے محل سے اپنی  
 بات کی وضاحت دلیل کے ساتھ کی تھی۔ مون کو  
 یہی لہجہ لاجواب کرتے تھے اور وہ لاجواب ہو کر  
 اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”میرا ایمان کمزور نہیں۔“ اس نے ٹھوس لہجے  
 میں کہا تھا، اب کہ لہجہ مضبوط تھا پر الفاظ ذرا کمزور  
 تھے۔ وہ جو باتوں کو پکڑنے کے فن سے آشنا تھا اس  
 وقت سابقہ کسی لمحے کو پکڑ کر سامنے لے آیا تھا۔

”بورا یا کے (کرخ) گر جا گھر میں کھڑے  
 ہو کر بھی یہی کہو، تو بات بنے..... جہاں تمہارا جانا  
 ضروری نہیں ہوتا، وہاں کیوں جاتی ہو؟“ عیسیٰ نے  
 کتنی پرانی بات کا حوالہ دیا تھا..... جب وہ مالا کو  
 ہمراہ لے کر گروسی کی طرف گیا تھا اور وہ مالا کو بورا یا  
 کا تاریخی گر جا گھر دکھا رہا تھا، تب اس نے مون کو  
 وہاں دیکھا تھا مگر جتنا بعد میں بھی نہیں تھا۔ آج  
 اتنے دنوں بعد اسے جتانے کا موقع بالآخر مل ہی گیا  
 تھا۔ وہ موقع کی مناسبت سے بات کرنے والوں  
 میں سے تھا۔ بعد میں کئی ملاقاتوں کے دوران بھی  
 اس نے مون کو گرجے جانے پر کبھی کبھی کہا نہیں تھا۔  
 آج موقع ملا تو اس نے گنوا یا بھی نہیں تھا۔ مون کچھ  
 پل کے لیے چپ سی کر گئی تھی۔

”میں تم سے ملنے وہاں گئی تھی، سوزن کے  
 لیے یا گرجے کی کشش میں نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے  
 کہہ رہی تھی۔ یقیناً وہ سچ بول رہی تھی۔ تب عیسیٰ  
 نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

”تم مجھ سے ملنے گئی تھیں پر ملی نہیں..... مجھے  
 دیکھ کر تم غائب ہو گئیں.....“ عیسیٰ کا انداز اب بھی  
 صاف جتانے والا تھا، مون کو بے حد برا لگا۔ وہ کچھ  
 دیر کی خاموشی کے بعد بولی۔



میں اٹکا ہوا تھا اور آدھا دھیان مالا کی طرف چکر لگا رہا تھا۔

”یہ جو تم قسطوں میں بات کرتے ہوناں..... ادھوری گفتگو چھوڑ کر ادھر ادھر توجہ دینا، آدمی بات کسی سے کرنا، آدمی بات درمیان میں چھوڑ دینا..... کسی دن اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبو گے“ مالا نے سنبھل کر اس کے چودہ طبق بھی روشن کر دیے تھے۔

”آں..... آں..... سمجھ گیا۔“ وہ چونک کر سیدھا ہوا تھا پھر اسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ خوب لمبا سا قہقہہ لگا کر وہ مالا کے غصیلے تاثرات کا جائزہ لینے لگا تھا پھر اس کا کام سے فارغ ہو کر ذرا سنجیدہ ہو گیا کیونکہ مالا بھی غصہ انتہائی سنجیدگی سے کر رہی تھی۔

”وہ اصل میں یہ اچانک موبائل بج کے ماحول ڈسٹرب کر گیا تھا ناں.....“ اس نے موبائل کو غصے سے اٹھا کر صوفے پر پٹا تھا پھر مالا کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم وہ بات بتاؤ جسے ادھورا چھوڑ کے موبائل کے گیت سننے لگے تھے۔“ وہ بیزار سی بولی تھی۔

ابھی اسے نیمل پر کھانا لگانا تھا۔ عیسیٰ کے پٹے نکالنے تھے جبکہ آفاق کی لن ترانیاں ختم نہیں ہو رہی تھیں۔

”تم سے..... ایک التماس کرنا تھی۔“ وہ ایک مرتبہ پھر تمہید باندھنے لگا تھا جب مالا نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے تھے۔

”جو کہنا ہے، کہہ بھی دو، تمہیں اللہ کا واسطہ۔“ مالا گویا عاجز ہو چکی تھی تب آفاق نے ذرا پُرسوج لہجے میں پچھلی بات کا حوالہ دے کر کہا۔

”پہلے مجھے تم یہ بتاؤ کہ محبت صرف ایک بندے تک محدود ہوتی ہے؟“ اس کا لہجہ اور انداز بہت پُرسوج قسم کے تھے، مالا الجھ سی گئی۔

پوچھا۔ ”اوکے، اس بات کو رہنے دو، سوال مشکل ہے، مجھے صرف یہ بتاؤ کہ محبت کی صرف ایک ہی قسم اور ایک ہی نظر ہوتی ہے۔ کیا محبت ماں، بہن، بیٹی یا کسی دوست کے خلوص سے نہیں ہو سکتی؟“ آفاق نے آسان لفظوں میں اپنی بات کو واضح کر دیا تھا،

مالا گویا سمجھ کر دھیرے سے مسکادی تھی، وہ جو یہ سوچ رہی تھی کہ آفاق جانے اب کون سی الجھنوں میں الجھتا رہے گا، اب اس کی بات کے معنی سمجھ کر ہلکی پھلکی ہو گئی۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے بھی وہ ایک مرتبہ پھر اس کے جو اسوں پر بجلی گرا تارک گیا تھا۔

آفاق کے ”تم سے“ جیسے دو لفظوں سے تو مالا کو اب خوف آنے لگا تھا۔ حالانکہ یہ خوف کچھ دیر پہلے بھی اس کے دل کو پنکھ لگا گیا تھا مگر اس کی وضاحت نے اسے پھول کی طرح ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ اس کی خاموشی پر آفاق نے جھنجھلا کر آواز لگائی تھی جیسی مالا چونک اٹھی۔

”ہاں، کیوں نہیں.....؟“ اس نے مسکرا کر آفاق کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ جیسی وہ مزید بڑے اعتماد سے بولا۔

”تو پھر جان لو کہ مجھے تم سے اور عیسیٰ سے بہت پیار ہے..... میری محبت تم لوگوں کے خلوص کے سامنے بالکل سچ ہے..... اور یہ محبت کسی بھی غرض سے پاک ہے جبکہ اپنی پڑوسن سے محبت اگرچہ بے غرض ہے مگر پھر بھی اس میں کچھ نہ کچھ غرض پوشیدہ ہے.....“ وہ اپنی جھونک میں بولتا جا رہا تھا

جب مالا ایک مرتبہ پھر بے ساختہ چیخ پڑی۔

”انی سے؟ تو کیا تم انی سے محبت کرتے ہو؟“ پچھلی ساری باتیں نظر انداز کر کے وہ انی کے نام پر انتہائی شاکڈ رہ گئی تھی۔

”ہاں تو اور کیا.....“ وہ آنکھیں مسل کر اثبات میں زور شور سے سر ہلاتا گیا..... ”مگر جو

محبت تم دونوں سے ہے، اس کی برابری انی بھی نہیں کر سکتی۔“ آفاق شاید بتانا چاہتا تھا کہ انی کی چار روزہ محبت ان دونوں کی محبت پر سبقت نہیں لے گی مگر مالا نے جھنجھلا کر اسے ٹوک دیا تھا۔

”ارے..... ہمیں بھاڑ میں جھونکو..... مجھے انی کے بارے میں بتاؤ..... یہ معرکہ کب سرانجام دیا؟ ہماری ناک کے نیچے پوری لو اسٹوری چلتی رہی اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہو سکی۔“ مالا سخت تجسس اور بے چین ہو چکی تھی۔ آفاق کی محبت سے لے کر مجنوں بننے تک پوری کہانی سننا چاہتی تھی۔

”انی کے بارے میں کیا بتاؤں؟ اسے تو خود اپنے بارے میں خبر نہیں.....“ اب وہ فلسفہ جھاڑنے لگا..... کے موڈ میں نظر آ رہا تھا تب مالا پھر سے جھنجھلا گئی تھی۔

”اُف..... اب لمبی، لمبی مت چھوڑنے بیٹھ جاؤ..... جلدی بولو محبت کی ابتدا کے بعد کہانی فلاپ کیسے ہو گئی؟“ اس نے بے قراری سے پوچھا تھا..... دراصل میز پر کھانا لگانے کی بھی جلدی تھی اور اتنی دیر تک تجسس پر قابو پانا بھی محال تھا۔ وہ اس کی پوری اسٹوری میں جہاں، جہاں عیسیٰ کی محبت اور مالا کا خلوص سامنے آتا گیا، وہ اسے فارورڈ کر داتی ہوئی محض انی اور آفاق کے سین تک پہنچ گئی تھی۔

”پہلے میری بات سن تو لو، آگے بھی بتاتا ہوں۔“ وہ معاً انتہا کا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مالا نے ایک گہری سانس کھینچی۔ وہ جانتی تھی پوری حکایت سنے بغیر جان نہیں چھوٹے گی..... اور آفاق مختصر بات کرنے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”اب جلدی بولو، سچ میں رکنا نہیں۔“ مالا جھلا گئی تھی۔

”دیکھو مالا! مجھے کچھ وضاحت کرنی ہے، یہ جو تم میری باتوں پر پریشان ہو جاتی ہو، تو اس کے

ترک و وفا

لے چھوٹی سی وضاحت دوں گا، مجھے عیسیٰ اور تمہارے خلوص سے بہت محبت ہے۔ میں یہاں اجنبیوں کے دل میں مارا، مارا پھر رہا تھا جب عیسیٰ میرے لیے وسیلہ بن گیا..... میں اس گھر کا نمک کھاتا ہوں اور میں نمک حرام نہیں ہوں..... عیسیٰ نے اگر مجھے یہاں رکھا ہوا ہے تو وہ مجھ پر اپنی ذات سے بڑھ کر اعتبار کرتا ہے۔ اسے مجھ سے کوئی خدشہ لاحق نہیں، وہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے اور میں عیسیٰ کا اعتبار توڑ دوں؟ یہ مجھے مر کے بھی گوارا نہیں ہوگا۔ باقی کہانی کچھ یوں ہے کہ انی مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور انی کی مٹی کو بھی میں بطور داماد پسند آ گیا ہوں مگر.....“ وہ نان اسٹاپ بولتے ہوئے عادیانہ رک گیا تھا تب مالا نے بے چینی سے کہا۔

”مگر کیا.....؟“ اس نے عجلت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”بھئی کہ میری دادی اور بہنوں نے محاذ کھڑا کر دیا ہے۔ انہیں غم ہے کہ میں کسی میم کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں حالانکہ وہ جانتی بھی ہیں کہ یہاں شادی کرنا میری مجبوری ہے۔ محبت ایک طرف، اگر میں یہاں شادی نہ کر سکا تو کبھی سٹیبلڈ نہیں ہو سکوں گا پھر ان لوگوں کے بڑے، بڑے خواب کیسے پورے ہوں گے؟ میرا فیوچر بھی نہیں بن سکے گا۔“ وہ اپنی پریشانی کی اصل وجہ مالا کو بتا کر اسے بھی متشکر کر چکا تھا۔

”تو پھر اب کیا ہوگا؟“ مالا سخت پریشان ہو گئی تھی۔ آفاق بھی فکر مند سا پیشانی ملتا بہت اپ سیٹ لگ رہا تھا۔

”ہونا کیا ہے؟ امی اور دادی کو منانا ہوگا مگر یہ کام عیسیٰ ہی کر سکتا ہے۔ امی اور باجیوں کو عیسیٰ پر بڑا اعتماد ہے۔“ آفاق نے سنجیدگی سے اگلے معاملات سے بھی آگاہ کیا..... تب مالا تھوڑا سا الجھ سی گئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



**تراک وفا**

ہیں۔ اسی طرح جرمنی اگر ایگری منٹ کے ٹھرو کسی دوسرے ملک سے افرادی قوت حاصل کرے تو یہ کام خاصا مہنگا ہوگا۔ یہ ملک اقوام متحدہ کے قانون کے مطابق سیاسی پناہ گزینوں اور مہاجرین کو مکمل تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اسے اپنی قانونی یا اخلاقی ذمے داری نہیں سمجھتا بلکہ اس میں بھی جرمنی کا اپنا فائدہ اور نفع نظر آتا ہے۔ کیونکہ سیاسی پناہ لے کر آئے افراد جرمنی کی تمام صنعتوں اور کاروباری اداروں میں کم لاگت پر انٹیک اور دیر تک کام کرتے ہیں بلکہ ان پناہ گزینوں کے خون تک نچوڑ لیتے ہیں۔ یہ انگریز قوم بغیر نفع و نقصان کا حساب لگائے تو سانس بھی نہیں لیتی۔ آفاق نے مزید یہ بھی بتایا تھا کہ یہاں پھیر میرج کرنا بھی آسان نہیں، یہ قوم بڑی ٹھنڈ ثابت ہوئی ہے۔ ویسے بھی اگر دوسری عالمی جنگ کے بعد مردوں کی تعداد جرمنی میں کم نہ ہو جاتی تو حکومت نے جرمن عورتوں کو غیر ملکیوں کے ساتھ شادی کی ہرگز بھی اجازت نہیں دینا تھی۔ اس قانون میں نرمی کے بعد جرمن خواتین کو غیر ملکیوں سے شادی کی اجازت مل گئی تھی مگر انہیں ہر لحاظ سے مردوں پر فوقیت دی گئی۔ وہ کئی مغربی ممالک میں عورتوں کی آزادی کے تحت جب دل چاہے شوہر سے طلاق لے سکتی تھیں۔ شوہر کی مکمل نگرانی کا حق انہیں حاصل تھا۔ تمام اخراجات ان کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ جتنی چاہے رقم شوہر کو دیں۔ وہ بے چارہ کما کما کر بے حال ہو جاتا اور یہ اپنی مرضی سے عیاشیاں کرنی پھرتیں، حتیٰ کہ شوہروں کو باہر اپنی مرضی سے دوستوں اور تعلق داروں سے ملنے کے لیے ایک مقرر وقت کی حد تک بیوی سے اجازت درکار ہوتی تھی۔

آفاق مالا کے چودہ طبق روشن کرتے ہوئے

نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ ان تمام آپشنز کو انی نے میرے سامنے رکھا تھا بلکہ اسی نے مجھے پروپوز کیا۔۔۔۔۔۔ تم تو کچھ جانتی ہی نہیں مالا۔۔۔۔۔۔ ایہاں پاکستانی فیملیز کو بیٹیوں کے مناسب رشتوں کے لیے کس قدر ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انی کا بھائی پاکستان اسی سلسلے کی غرض سے گیا ہے۔ اپنے باپ کے خاندان والوں میں بہنوں کے لیے مناسب برعلاش کرنے۔۔۔۔۔۔ جو پاکستانی گھرانے حسب انکل اور انی کی فیملی جیسے مہذب، شریف اور پرانی قدروں پہ جان دینے والے ہیں، ان کو اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی کے لیے یہاں اپنے جیسے ملتے ہی نہیں اور جو ملتے ہیں وہ اس قدر عیاش ہوتے ہیں کہ ان سے رشتہ جوڑنے سے بہتر خودکشی کر لینا ہے۔۔۔۔۔۔ آفاق نے بہت سنجیدگی کے ساتھ وضاحت کی تھی تب مالا گویا سمجھ کر سر ہلا گئی۔ وہ بغیر سوچے سمجھے سوچ کی انتہا پر پہنچنے کے فتویٰ جاری کر دیتی تھی جو بالکل غیر مناسب تھا۔ کسی بھی پہلو پہ غور کیے بغیر اگلے بندے پہ ایک کرنا قطعاً فضول حرکت ہے، عیسیٰ نے کئی مرتبہ مالا کو اس جلد بازی پر ٹوکا بھی تھا مگر مالا سے پھر بھی بھول چوک ہو جاتی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ نہ جانے کتنی دیر تک اپنی جلد بازی پہ پشیمان رہتی مگر آفاق نے اسے زیادہ دیر تک پشیمان نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ مالا کو مزید بتا رہا تھا کہ جرمنی میں مستقل رہائش کے باوجود بھی شہریت بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ کتنی کے تارکین وطن جو یقیناً بڑے خوش نصیب تھے انہیں جرمنی کی شہریت ملی تھی جن میں ایک حسب احمد بھی شامل تھے۔ ویسے بھی تمام مغربی ممالک اپنے مفاد کو لے کر آگے چلتے ہیں۔ اگر جرمنی، سیاسی پناہ کے لیے آنے والے مہاجرین کو اپنے ملک میں جگہ دیتا ہے تو اس میں بھی سراسر اپنا فائدہ اور نفع دیکھتا ہے جیسا کہ صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے مہاجرین بڑا اہم کردار ادا کرتے

کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو فوراً وضاحتی لہجے میں بولی۔

”میرا مطلب ہے اگر عیسیٰ ساتھ نہ دیں تو میں کیسے؟“ وہ گڑبڑا کر چپ سی کر گئی۔۔۔۔۔۔ تب اسنے کشیدہ ماحول میں بھی آفاق کو ہنسی آگئی تھی۔ وہ دیر تک اس کی گڑبڑاہٹ سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔

”آف اے مشرقی خاتون! نہیں آپ کی اطاعت گزاری اور وفا شعاری پر حرف آئے گا۔“ وہ مسکرا مسکرا کر ہلکان ہو رہا تھا۔ اپنے جوگیوں والے حلیے میں ہنستا ہوا وہ قطعاً جو کر لگ رہا تھا۔ مالا کو سخت برا لگا۔

”میں مشرقی خاتون ہوں، مجھے اس پر فخر ہے۔“ وہ ذرا اتر کر اور تھوڑا جتا کر بولی تھی۔ تب آفاق نے فوراً سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

”جانتا ہوں میں۔۔۔۔۔۔ اب کیا اعلان کر دوں۔۔۔۔۔۔ آفاق نے مسکرا کر اسے چھیڑا تھا جب وہ چڑ کر رہ گئی تھی۔

”اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

”وہ ہی۔۔۔۔۔۔ یعنی عیسیٰ سے بات کرو، وہ داوی کو منالے، باقی انی کی مٹی تو سمجھو تیار بیٹھی ہیں۔ انہیں میرے جیسا داماد تو کہیں مل ہی نہیں سکتا۔“ اب۔۔۔۔۔۔ اترانے کی باری آفاق کی تھی۔

”ایک بات بتاؤ آفاق کیا تم انی سے محبت کرتے ہو یا پھر محض بیٹھنٹی کے لیے شادی کرنا چاہتے ہو؟“ مالا نے کچھ جھجکتے ہوئے بالآخر اصل بات پوچھ ہی لی تھی جبکہ آفاق کا چہرہ کچھ تاریک سا ہو گیا تھا۔ گویا اپنی محبت پر غرض کی یہ ہلکی گرد بھی اسے پسند نہیں تھی۔ تاہم وہ مالا کو کچھ بھی پوچھنے سے روک نہیں سکتا تھا۔

”اسی بات نہیں مالا! مجھے انی سے محبت بیٹھنٹی کے لالچ میں نہیں ہوئی۔ بلکہ میں نے تو یہ سوچا بھی

”تم نے عیسیٰ سے بات نہیں کی۔“ وہ کچھ سوچ کر حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”اگر عیسیٰ سے بات کر لیتا تو تمہارے سامنے بین بجانے کی کیا ضرورت تھی۔“ آفاق جھلا کر بولا۔ مالا سخت برامان کر خٹکی سے تڑختی تھی۔

”تو پھر اب میں کیا کروں۔۔۔۔۔۔؟“ اس نے الجھ کر کہا تھا۔

”تم عیسیٰ سے بات کرو، وہ تمہاری بات کبھی رد نہیں کر سکتا۔“ آفاق لپٹی سا بول رہا تھا۔ مالا ذرا سا حیران ہوئی۔

”اور تمہاری بات رد کر دے گا؟“ اس نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا تھا۔ آفاق کی دماغی حالت پر اسے سو فیصد شک تھا۔ اب یقین بھی ہو چکا تھا۔ محبت نے اس کے حواس اچھے خاصے متاثر کر رکھے تھے۔

”ہاں کیونکہ وہ رشتوں کو ایک طریقے سے ساتھ لے کر چلنے والا بندہ ہے، جب میں اسے بتاؤں گا امی اور دادی نہیں مان رہیں تو وہ کہے گا میں ان کی بات مان لوں۔۔۔۔۔۔ جو میرے دل کو گوارا نہیں ہوگی۔۔۔۔۔۔“ وہ منہ بسورے پھر سے تان اسٹاپ شروع ہو چکا تھا۔ مالا ہونٹ سی ہو گئی۔

”عیسیٰ تمہاری محبت کو انجام تک لے جانے میں اگر تمہارا ساتھ نہیں دیں گے تو پھر میری طرف سے بھی جواب ہے۔“ مالا نے گویا آنکھیں ہی ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ اس کا صاف کھرا جواب سن کر آفاق کو دوچھکا لگا تھا۔

”ایں۔۔۔۔۔۔ تم کیسی بہن ہو؟“ اب وہ بہت خونخوار تیور لیے پوچھ رہا تھا۔ مالا کو فوراً اپنے لفظوں کا احساس ہو گیا۔ دراصل یہ لفظ ہی تو ہوتے ہیں جنہذا سے ہیر پھیر کی وجہ سے پورا مفہوم ہی الٹ دیتے ہیں۔ کسی کو سمجھ آ جاتے اور کوئی ان کی گہرائی میں اترے بغیر اپنی مرضی کا مفہوم نکال لیتا ہے۔ اب مالا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



مزید بتا رہا تھا کہ ویسے جرمیں عورتیں بلا کی وفادار اور وفا شعار ثابت ہوتی ہیں جن کی ایک بڑی مثال عیسیٰ کی ماما اور..... انی کی ماما نے قائم کی۔ عیسیٰ کی ماما جب تک زندہ رہیں، اپنے شوہر کی وفاداری اور انی کی ماما اپنے شوہر کے مرجانے کے بعد بھی اس کی وفادار تھیں..... انہوں نے اپنی باقی زندگی بچوں کی تعلیم و تربیت میں وقف کر دی تھی۔ یقیناً یہ دونوں عورتیں عظیم تھیں اور ان دو عورتوں کے شوہر بھی عظیم ثابت ہوئے تھے۔ جنہوں نے پاکستانی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے ان عورتوں سے شادی کر کے شہریت لینے کے بعد انہیں چھوڑا نہیں تھا۔ اب یہ تو طے تھا کہ شادی کر لینے کی صورت میں مستقل رہائش کی ٹینشن دور ہو جاتی مگر دیکھنا یہ تھا کہ بیوی کیسے ملتی؟ اس کا مزاج اور عادتیں کیسی ہوتیں.....؟ محض شادی کرنا ہی تو آفاق کے لیے مسئلہ نہیں تھا..... وہ کسی سے بھی شادی کر کے اچھے تعلقات بیوی سے رکھتا تو بینک سے کار خریدنے یا گھر بنوانے کے لیے قرض بھی مل سکتا تھا..... مگر بیوی کی بھلا کیا گارنٹی ہوتی؟ وہ آفاق کے ساتھ ساتھ جانے کس کس کی بیوی بن چکی ہوتی۔ حالانکہ وہ جانتا بھی تھا جرمیں عورت سے شادی کے ایک سال بعد رہائشی ویزا جاری ہو جائے گا پھر اس میں دو یا چار سال کی توسیع بھی کر دی جائے گی..... اگر وہ بیوی کا فرمانبردار، پیدا ہونے والے بچوں پر بھی بھرپور توجہ دے، گھر کا ماحول لڑائی جھگڑے سے پاک رکھے، کسی جرم میں بھی ملوث نہ رہے تو مدت گزرنے کے بعد پانچ سال کے لیے پاسپورٹ بھی جاری ہو جائے گا۔ جس کی وجہ سے وہ جرمیں میں مزید رک سکتا ہے اگر مزید پانچ سال گزر جائے تو جرمنی کا پاسپورٹ بھی مل جاتا، جس کی وجہ سے وہ کسی بھی ملک میں آزادانہ گھوم سکتا تھا مگر بات تو بیوی پر آ کر رک

جاتی تھی۔ ضروری تو نہیں تھا، اس کی بیوی عیسیٰ کی ماما اور انی کی ماما جیسی نیک، خدا ترس اور شریف ثابت ہوتی..... پھر اگر بچے ہو جاتے تو وہ عمر بھر کے لیے خوار ہو جاتا..... اس نے ہر پہلو پر غور کیا تھا، یہاں پیپر میرج کا مسئلہ نہیں تھا..... مگر وہ خود کو عمر بھر کے لیے اسیر کرنے اور پیدا ہونے والے بچوں کو ذلیل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

اسے شادی کرنا بھی تو حسیب احمد کی طرح..... ایک معزز، مہذب اور شریف لڑکی سے، وہ شادی کے نام پر کاروبار کر کے پھر بیوی، بچوں کو خوار کر کے اپنے ملک کے نام پر دھبا نہیں لگوانا چاہتا تھا پھر اگر قسمت اس پر مہربان ہو رہی تھی، محبت اس پر مہربان ہو رہی تھی تو وہ ناشکرا کیوں بنتا.....؟ اس نے پیچھے کسی سے عہد و پیمانہ تو کر نہیں رکھے تھے مگر اس کی امی اور بہنوں نے اتنا رونا دھونا مچا رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھیں۔ آفاق ویزے کی مدت پوری کر کے واپس آجائے۔ اس کی شادی پاکستان میں وہ خود کریں..... جبکہ آفاق جانتا تھا کہ ذمے داریوں کے اتنے پہاڑ وہ پاکستان میں جا کر کیسے سر کر پائے گا؟ وہ اپنی ماں، دادی اور بہنوں کو قائل نہیں کر سکا تھا۔ وہ کہتی تھیں، ہمیں پہلے روز سے یہی امید تھی کہ تم جرمن جا کر ”جن“ ضرور چڑھاؤ گے..... وہ پچھلے کئی دنوں سے ذہنی اذیت کا شکار تھا..... اگر انی کی ماما سے وعدہ نہ کر چکا ہوتا تو وہ اپنے دل کو سمجھا ہی لیتا مگر یہ دل کے سلسلے اپنے بس میں تھے کہاں؟ اتنے دنوں سے عیسیٰ چپ چاپ تماشا دیکھ رہا تھا مگر اتنی توفیق نہیں ہوئی، اس کا حال دل جان جاتا..... یقیناً وہ چاہتا تھا کہ آفاق خود اپنا مسئلہ شیزوفرے..... آفاق یہ کام بھی کر لیتا مگر وہ جانتا تھا عیسیٰ نے امی اور بہنوں کے حق میں ووٹ دینا تھا..... عیسیٰ کا خیال تھا بزرگوں کو ناراض کر کے دائمی خوشیاں نہیں سیتی جاسکتیں..... اس کا خیال

درست تھا..... مگر بزرگوں کو متاثر بھی تو جاسکتا تھا نا..... اب وہ مالا سے ہر بات ڈسکس کرنے کے بعد رُسکون ہو چکا تھا..... اسے امید تھی کہ مالا کی بات عیسیٰ رد نہیں کرے گا..... یوں اس کی تیا بھی پار لگ جائے گی..... ادھر مالا سوچ رہی تھی۔ انی کے لیے آفاق سے بہتر کوئی نہیں..... اور اگر آفاق، سوزن میں انٹرنلڈ ہوتا تو پھر بھی اسے بہت خوشی ہوتی..... مگر سوزن کے آفاق سے ستارے ملنے والے نہیں تھے۔ دونوں کے درمیان مذہب، نظریات اور رسم و رواج خلیج کے مانند کھڑے تھے۔ اب ہر مغربی لڑکی عیسیٰ کی ماما جیسی نہیں ہوتی، جو کامیابی کے آخری زینے پر کھڑی تھیں۔ جنہوں نے حسیب احمد کو جن کر زمانہ پالیا تھا..... مذہب، رشتے، محبت سب کچھ.....

☆☆☆

”جسٹ شٹ اپ مون.....!“ وہ پوری قوت سے چلا اٹھا تھا..... مون کو لگا، اس کی سماعتوں کے بعد دیگرے کئی پتھر آگرے تھے۔ ایسے نوکیلے اور سخت پتھر کہ وہ بے ساختہ کراہ اٹھی تھی مگر عیسیٰ کی دھاڑ نے اس کی سانسیں تک روک دی تھیں۔ وہ کسی پتھر میں ڈھلے مجسمے کی طرح ساکت ہو چکی تھی جبکہ عیسیٰ کی لہورنگ آنکھوں کو دیکھ کر حسیب احمد کے ہاتھ سے کتاب گر پڑی تھی۔ وہ بے ساختہ رانگ چیرے سے اٹھ کر عیسیٰ کی طرف آئے تھے۔ انہوں نے گھبراہٹ میں عیسیٰ کا کندھا ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا مگر عیسیٰ اپنے حواسوں میں لگا رہا تھا؟ وہ باپ کی بات سن کہاں رہا تھا؟ اس کے ذہن میں، کانوں میں اور آس پاس بڑا تسخیر اڑاتا شور اٹھ رہا تھا۔

”آفاق اور مالا.....“ کوئی اس کے کان میں بہت زور سے چلا یا تھا۔ عیسیٰ کو لگا، اس کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی۔ یہ اس کی سگی

تزلزلہ وفا

بہن تھی جو اس کے وجود کی دھجیاں اڑا رہی تھی۔ اس کے پر نچے اڑا رہی تھی۔ وہ زہر خند سا چلا اٹھا تھا۔

”تم اپنے حواسوں میں نہیں ہومون! تم پاگل ہو چکی ہو۔“ عیسیٰ نے دھیمے انداز میں پھنکارے لہجے میں کہا تھا۔ حسیب احمد نے پھر سے اس کا کندھا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ سمجھ گئے تھے، بہن، بھائی کے درمیان کسی بات پر تلخ کلامی ہو رہی ہے۔ یقیناً مون نے عادتاً کوئی ایسی بات ضرور کر دی تھی جو عیسیٰ کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ وہ بیٹے کو کول ڈاؤن رہنے کا اشارہ کر رہے تھے مگر عیسیٰ ان کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔

”میں اپنے حواسوں میں ہوں، مجنون یا دیوانی نہیں ہوں، بس یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنی آنکھیں کھول کر رکھو، آستین سے سانپ نکال کر پھینک دو، یہ لوگ تمہیں ڈس لیں گے۔“ مون کی سوئی ایک جگہ پھنس چکی تھی جبکہ اس کے آگ اگلنے الفاظ عیسیٰ کو غضبناک کر رہے تھے۔

”بکو اس بند کرو مون.....!“ وہ پھر سے چیخا تھا..... ”تم میری بہن نہ ہوتیں تو میں تمہارے ساتھ کس طرح پیش آتا..... تم گمان بھی نہیں کر سکتیں۔“ وہ اپنے ماتھے کو مسلتا کسی قدر شکستہ نظر آنے لگا تھا۔ ایک دم ٹڈھال اور غمزہ، مون اس کی اذیت کو سمجھ نہیں سکتی تھی اگر سمجھ جاتی تو ایسی بات ہی کیوں کرتی؟ مگر اسے دلوں کو ٹھوکروں سے اڑانا آتا تھا..... سو وہ اپنا کام دھیمی سے کر رہی تھی۔

”ایک غیر عورت کے لیے اپنی بہن سے اس لہجے میں بات کر رہے ہو۔“ مجھے بہت تکلیف ہوئی مگر یاد رکھنا، جس کے لیے مجھ سے تلخ کلامی کر رہے ہو، وہ کبھی تمہیں فیض نہیں دے گی۔ سخت دھوکا کھاؤ گے بڑے خسارے اٹھانے والے ہو تم۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نکل کر اچھے موڈ میں گیا تھا پھر اب مالانے اسے چاچو کے روم سے نکلتے دیکھا تھا۔ جانے اندر کیا بات ہوئی جو وہ ابھی تک اتنا اپ سیٹ تھا مگر مالا سے اپنی پریشانی کو چھپا رہا تھا۔ اس کو طرح، طرح کے اندیشے لاحق ہونے لگے۔

”کچھ نہیں پار! بس مون کی فون کال سن کر آ رہا ہوں.....“ عیسیٰ زیادہ دیر اسے پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”اور مون کی کال سن کر خیریت نہیں ہو سکتی۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا تھا۔ حالانکہ بات کر کے وہ سخت پچھتائی بھی تھی مگر عیسیٰ نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

”یہی سمجھ لو.....“ وہ ہمہ سابلو تھا پھر اچانک کچھ یاد آنے پر چونک گیا۔ ”آفاق کا مسئلہ حل ہوا؟“ اس نے ہنسنے لگا کر بال بنانے شروع کر دیے تھے۔ مالا گہری سانس کھینچ کر رہ گئی تھی۔ تو گویا وہ مون پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اندر سے کتنا گہرا تھا، مالا کو اب احساس ہو رہا تھا۔ وہ جس ٹاپک پہ نہیں بولنا چاہتا تھا، اس پہ بات بھی نہیں کرتا تھا بلکہ بہت صفائی کے ساتھ موضوع تبدیل کر دیتا۔

”میں اس کا مسئلہ تو حل نہیں کر رہی تھی، یہ کام تو آپ نے کرتا ہے۔“ مالا برا مان کر بولی تھی تب عیسیٰ پھر سے کچھ چونک گیا۔

”تو کام بتا دیا اس نے؟“ وہ بال بنا چکا تو ہاتھ دھونے پھر سے داش روم چلا گیا۔ جب واپس آیا تو مالا سنبھل کر کچھ الفاظ ترحیب دے کر بیٹھی تھی تاکہ عیسیٰ سے ابھی آفاق کے متعلق بات کر لے۔

”جی..... ہاں.....“ اس نے اگلے دس منٹ تک تمام تفصیل عیسیٰ کے گوش گزار کر دی تھی جسے سن کر وہ سر ہلا کے بولا۔

”یہ تو میں جانتا ہوں۔“ اس کا انداز پُرسوج

مون، عیسیٰ کے زہریلے لہجے کے دھچکے سے سنبھل کر سابقہ زہر خند آواز میں کہہ رہی تھی۔ اس کے لیے اپنے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں تھی جو کچھ وہ عیسیٰ کو کہہ چکی تھی گویا وہ سب اس کے لیے معمولی تھا۔

وہ مون کا فون پینج کر باہر نکلا تو مالا کچن سے نکلتی دکھائی دی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر نگاہ ڈال کر ٹھنک سی گئی پھر میز پر کوئی باؤل رکھ کر اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔ عیسیٰ جو فی الحال اتنے برے موڈ کے ساتھ مالا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر فوراً داش روم کی طرف بڑھ گیا تھا جبکہ مالا وہیں کمرے میں کھڑی ہو کر اس کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اتنا ٹائم لگا کر فریش ہونے کے بعد داش روم سے باہر نکلا تو مالا کو ابھی تک کمرے میں موجود دیکھ کر گہری سانس کھینچ کر رہ گیا جبکہ مالا بہت متشکر سی گھبرائے، گھبرائے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ عیسیٰ کی تصویر بنا ہوا تھا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں.....؟“ وہ کتنی بے چین اور مضطرب تھی۔ کبھی بغیر کوئی دوسری بات کیے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ کچھ دیر پہلے والے غصے، اضطراب اور پریشانی کا عیسیٰ کے چہرے پر شائبہ تک نہیں تھا..... مگر مالا پھر بھی مطمئن نہیں ہو سکی تھی۔

”ہاں، میں ٹھیک ہوں۔“ عیسیٰ نے ٹاول اسٹینڈ پہ پھیلا کر اپنے کپڑے ہینگ کرنے شروع کر دیے تھے۔ وہ عموماً اپنا کام کرتے ہوئے پھیلاوا نہیں ڈالتا تھا۔ یہ اس کی بہت پرانی عادت تھی مگر فی الحال تو وہ مالا کے مزید سوالوں سے بچنا چاہتا تھا مگر مالا پھر بھی.....

”مگر تب تو کچھ مضطرب لگ رہے تھے۔“ وہ فکر مندی سے گویا ہوئی..... رہ رہ کر عیسیٰ کی لہورنگ آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ آفاق کے کمرے سے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ترک وفا

”اس کے علاوہ کیا.....؟“ وہ سوچتے ہوئے عیسیٰ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہاں انوکھی سی جگہ گاہٹ تھی اور اس کی آنکھیں مالا کے خریدے گئے ڈھیروں کھلونوں پر جمی تھیں جنہیں مالا نے ترتیب سے کمرے میں جگہ جگہ سجا رکھا تھا تب عیسیٰ کی بات اور نظر کا مفہوم جان کر وہ ڈھیروں شرم سے بے حال ہو گئی تھی۔ انتہائی سرخ چہرہ لیے وہ پلوں کو جھکائے بیٹھی، بیٹھی مسکان کے ساتھ سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔ عیسیٰ کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ پھر اس نے آہ بھر کر کہا تھا۔

”جانتی ہو، حسن سے بڑھ کر حیا میں کشش ہوتی ہے۔“ اس کا لہجہ بوجھل اور آواز محسوس تھی۔ مالا کے دل کی گھنٹیاں ٹن ٹن بجنے لگی تھیں اس کا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔ یوں لگا، باہر تالاب میں سنہری پریاں اتر آئی ہیں یا پہلے کے جنگل میں مور پھر سے ناپنے لگے یا ستاروں کی بارات اس کے آنگن میں اتر آئی۔ اس کا دل کہکشاں کا گھر بن گیا تھا۔

علی عیسیٰ کے دل نے اس پل سجدہ شکر ادا کیا..... اللہ نے اسے ایک نیک اور با حیا عورت زمین پر بخش دی تھی۔ یہ اس کی خوش نصیبی کا بڑا اعلیٰ مقام تھا۔

”تم کو ایک بتاتا ہوں مالا.....“ اسے علی عیسیٰ کی رواں، مدہم آواز سنائی دی تھی۔ وہ ایک کرسٹل کی گڑیا کو ہاتھ میں لے کر اس کی چابی گھما رہا تھا۔ یہ گڑیا مالا خرید کر لائی تھی۔ ان تمام کھلونوں میں سب سے منفرد بھی یہی گڑیا تھی اور عیسیٰ کو بھی کرسٹل کی یہ گڑیا بہت پسند آئی تھی۔ اسے مالا نے سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا کیونکہ اس گڑیا کی آنکھوں میں بہت تیز لائٹس روشن ہوتی تھیں جو اندھیرے میں زیرو پاور جتنے بلب کا کام بخوبی دے رہی تھیں۔ عیسیٰ نے اسی گڑیا کو ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

”آپ جانتے بھی تھے پھر بھی کچھ نہیں کیا..... وہ بے چارہ اتنے دنوں سے مجھوں بنا پھرتا رہا..... اتنے دن سے ٹینشن لے رہا تھا۔ اور آپ جان بوجھ کر دیکھتے رہے.....“ مالا حلقی سے بولتی جا رہی تھی۔ تب عیسیٰ نے اسے رساں سے سمجھایا تھا۔

”مجھے کسی کے بھی ذاتی معاملات میں گھستا پسند نہیں۔ چاہے وہ آفاق ہی کیوں نہ ہو..... تاہم اس کے بارے میں پل، پل کی خبر گیری کرنا میرا فرض ہے..... اس سے میں کنارہ نہیں کر سکتا..... ہاں میں پاکستان کال کر کے اس کی امی کو سمجھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔“ عیسیٰ نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے حامی بھری تھی..... تب مالا کچھ پُر جوش سی ہو گئی۔

”آفاق اور انی کی شادی ہو جائے تو میری بھی تنہائی کا خاتمہ ہو جائے گا۔“ وہ دے دے بے جوش اور ڈھیروں سرخوشی کا اظہار کر رہی تھی تب ہی عیسیٰ نے اس کی خوشی محسوس کر کے بے ساختہ کہا تھا۔

”تم اپنی تنہائی بانٹنے کا کوئی اور حل سوچ لو۔“ اس کے لہجے میں واضح شرارت تھی۔ کچھ دیر پہلے والی مون کی ٹیو اس اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک تکلیف دہ یادوں اور باتوں کو نہیں سوچتا تھا۔ جیسی مطمئن اور محسوس رہتا تھا۔

”مثلاً.....؟“ مالا منہ بنا کر بولی۔ ”یہی کہیں گے ناں آپ.....! منی سے ڈچ میں گپ شب لگایا کرو.....“ اس کا انداز جلا کٹا سا تھا۔ عیسیٰ بے ساختہ ہنس پڑا۔

”نہیں، اس کے علاوہ کچھ.....؟“ اس کی آنکھوں میں کوٹ، کوٹ کر شرارت بھری تھی۔ مالا کچھ دیر کے لیے ہنوتی سی ہو گئی تھی۔ اسے عیسیٰ کی بات کے اندر اترا کبھی نہیں آتا تھا۔





**ماہِ صیام**

مبارک ہو مسلمانو کہ پھر ماہِ صیام آیا  
خدا کی رحمتوں اور برکتوں کا اژدہام آیا  
خدا کا شکر ہے فصل بہار جا نغز آئی  
خوش قسمت کہ پھر سے موسمِ صوم و قیام آیا  
زمانہ آگیا کہ لطفِ باری عام اب ہوگا  
نصیب اپنے کہ پھر سے زندگی میں یہ مقام آیا  
قیامت میں یہ روزہ ڈھال ہوگا روزہ داروں کی  
یہ سرمایہ بھی اپنا کیسے آڑے وقت کام آیا  
ہدایت کے صحیفے سب کے سب اس ماہ میں اترے  
اسی ماہِ مبارک میں کلاموں کا امام آیا  
پسند: فضلہ، تول، بہارہ کہو

**فضیلتِ قرآنِ مجید**

رمضان المبارک بہت ہی فضیلت و بزرگی والا  
مہینہ ہے اور اسی مناسبت سے اس مہینے میں ایک  
بہت ہی عظیم الشان امر کا ظہور ہوا ہے وہ یہ ہے۔  
شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن  
رمضان المبارک کا مہینہ ایسا ہے کہ اس مبارک  
مہینے میں قرآن شریف نازل ہوا اور چھٹی کتابوں اور  
صحیفوں کے نزول ہوئے سب کے سب اسی مہینے میں  
اترے اسی نسبت سے حضور ﷺ کا رمضان  
شریف میں تلاوتِ پاک پر زور دینا نسبتاً اور مہینوں کے  
زیادہ ثابت ہے۔ صحابہ کرام و خلفائے راشدین  
مدین اور بزرگانِ دین کا رمضان المبارک میں تلاوت کا  
خاص اہتمام..... یہ سب امور اس بات کے متقاضی  
ہیں کہ اس ماہِ مبارک میں قرآن پاک کی تلاوت کا  
معمول نسبتاً دوسرے معمولات ذکر و خصل کے اور زیادہ  
کرنا چاہیے اور جو بے چارے قرآن پاک کی تلاوت  
سے معذور ہیں وہ تراویح میں شریک ہو جائیں تو ان کو  
بھی یہ فضیلت میسر ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو  
اس کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مرسلہ: جمیں نیاز، ملتان

پورا آسمان سفید مرغابیوں سے چھایا تھا۔ فضا میں  
خاموشی کا راج تھا، کاریڈور سے کچھ آگے ہیرا  
کھلکھلاتی نظر آرہی تھی۔ اس نے گلے میں کیرا لٹکا  
رکھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کھٹا کھٹ سفید  
مرغابیوں کی تصویریں اتار رہی تھی۔ اس کے قریب  
ہی میکس وان کسی گہری سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ وہ  
عیسائی باپ کا بیٹا تھا اور ہندو عورت کے لپٹن سے  
پیدا ہوا تھا۔ وہ خود کو کتابی کہلوانا پسند کرتا تھا اور  
عیسائیت سے بے عشق میں مبتلا تھا۔ مالا نے اب  
تک میکس کی کوئی ایک بھی گرل فرینڈ پورے شولے  
میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا  
اور چرچ باقاعدگی سے جاتا تھا۔

مالا کو ہیرا کے بعد میکس بہت اچھا لگتا تھا۔  
شرمیلا سا، انتہائی کم گو اور مہذب.....

مالا گراؤنڈ میں سے گزرتے ہوئے پارک  
پلاٹس تک آئی تو میکس بھی اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔  
مالا کا ارادہ آج گھر جانے کا نہیں تھا بلکہ وہ کاؤف  
ہاؤس جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ سو اسی لیے ذرا  
جلدی کلاس سے نکل آئی تھی۔ وہ کوئی بس پکڑ کر  
مرکز تک جانا چاہتی تھی اور اس کا ارادہ بھانپ کر  
میکس نے فوراً آفر کر دی تھی۔

”میں بھی مرکز تک جا رہا ہوں، تم مجھے جو اتن  
کر سکتی ہو۔“ میکس کی پُر خلوص آفر کو مالا ٹھکرانے کا  
بھر پور ارادہ رکھتی تھی مگر انکار کے لیے کوئی موزوں  
الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میکس اس کا تذبذب  
محسوس کر کے نرمی سے بولا تھا۔

”تم میرے ساتھ بے جھجک جا سکتی ہو، میں  
انتہائی شریف آدمی ہوں۔“ اس نے اتنے بھولپن  
سے وضاحت کی تھی کہ مالا جو اتنی سنجیدہ صورت  
بنائے کھڑی تھی ایک دم ہنس پڑی۔

”ایسی بات نہیں.....“ مالا ذرا جھجک کر بولی  
تھی۔ دراصل اس نے عیسائی کو بیچ کر رکھا تھا کہ آفاق

کام بھی آجاتی ہیں۔“ عیسیٰ نے بات کرتے ہوئے  
کاغذات سے بھری کورپ میں ہاتھ مارا تھا۔ پھر  
کچھ ہی دیر بعد ایک سخت سی چیز عیسیٰ کے ہاتھ  
میں آگئی۔ یہ نقلی نگینوں والا بریلیٹ تھا جسے مالا  
نے توڑ مروڑ کر غصے میں پھینک دیا تھا۔ تب وہ جانتی  
نہیں تھی کہ سوزن نے یہ گفت اسے بھیجا تھا۔ مالا کو  
ایک دم ڈھیروں ندامت ہوئی..... وہ جو بریلیٹ  
کورپ میں سے نکالنا بھول گئی تھی اب انتہائی  
شرمسار کھڑی تھی۔ بھلا علی عیسیٰ کیا سوچتا ہوگا؟ مالا  
نے اس کی اتنی سویت کزن کا خلوص سے دیا تھا اتنی  
بے رحمی سے ڈسٹ بن کے حوالے کر دیا تھا۔ اس  
وقت بھی عیسیٰ کے تاثرات کم و بیش ایسے ہی تھے وہ مالا  
کو حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”تجھے کی ایسی ناقدری پہلے کبھی نہ دیکھی نہ  
سنی..... اگرچہ بریلیٹ اتنا مہنگا نہیں تھا مگر اتنا  
حقیر بھی نہیں تھا جو اس کی جگہ یہ کورپ ہوتی۔“ عیسیٰ  
کی آواز میں تاسف تھا۔ مالا گویا شرمندگی کے  
گڑھے میں گوڈے، گوڈے ڈوب گئی تھی۔

”سوزن اتنی امیر نہیں یار.....! تم نے جانے  
کیا سمجھا تھا۔ بہر حال، میں یہ بریلیٹ اسے  
واپس لوٹا دوں گا۔“ اس نے گویا آخری فیصلہ کر  
کے بریلیٹ اپنے لاکر میں محفوظ کر لیا تھا۔ مالا جو  
اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہتی تھی باہر سے آتی  
آفاق کی آواز سن کر دل مسوس کر رہ گئی۔ پھر اس  
نے سوچا۔ وہ عیسیٰ کو تسلی سے جواب دے گی اور وجہ  
بھی بتا دے گی مگر پھر آفاق کی لٹن ترانیوں اور بھوک  
کے شور کو سن کر ہمیشہ کی طرح بھول گئی اور یہ بھولنا  
کیا قیامت لائے گا..... اس بات سے مالا ہرگز  
واقف نہیں تھی۔

☆☆☆

آسمان پر سفید بادل دھجی دھجی بکھرے تھے۔  
سورج اپنی جگہ پر جمنا چک رہا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی۔

”تم نے سنا تو ہوگا، وہ شخص مر گیا، جو کسی کے  
دل میں نہیں رہا۔ آدمی کب مرتا ہے؟ جب دل سے  
اترتا ہے اور زندہ کب ہوتا ہے۔ جب دل میں  
اترتا ہے۔“ عیسیٰ کی مدہم آواز کے ساتھ ہی کرشل  
کی گڑیا میز کی سخت سطح سے ٹکرائی تھی۔ مالا کے دل کو  
کچھ ہو گیا۔ کیونکہ گڑیا کو پوری شدت کے ساتھ میز  
کی سطح سے ٹکرایا گیا تھا۔ اس کی نیلگوں انتہائی موٹی  
آنکھوں میں سے ایک کانٹا موٹا سا ڈیلا باہر نکل  
آیا تھا۔ گڑیا لحوں میں بدنما ہو گئی تھی۔ مالا کو ایک دم  
دھچکا سا لگا۔ ابھی وہ کچھ بولنا چاہتی ہی تھی جب عیسیٰ  
نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا تھا۔

”خوب صورتی دیکھنے والی آنکھ میں ہوتی  
ہے..... چیز اچھی ہو یا بری..... جسے خود اپنی پسند اور  
جاؤ سے خریدا ہو اس کے عیب پہ دل برا نہیں  
کرتے.....“ عیسیٰ نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے  
گڑیا کا موٹا سا نیلا ڈیلا پھر سے آنکھ کے گڑھے میں  
دفن کر دیا تھا۔

”اس عیب کی اصلاح کرتے ہیں..... دل برا  
کر کے اسے یوں کورپ (ڈسٹ بن) میں  
نہیں پھینکتے۔“ عیسیٰ نے کوڑے والی ٹوکری کا پتھر  
سے بٹن دبایا تو اس کا منہ کھل گیا۔ یہ ڈسٹ بن  
صرف عیسیٰ کے غیر ضروری کاغذات کے لیے  
کمرے میں رکھی گئی تھی۔ اکثر وہ غیر ضروری  
کاغذات مروڑ کر کورپ میں پھینک دیتا تھا مگر پھر  
کچھ دن بعد کبھی نہ کبھی ان کی ضرورت محسوس ہو ہی  
جاتی پھر انہیں ڈھونڈنے میں دشواری نہیں ہوتی  
تھی۔ نئی اس کورپ کو کم ہی ہاتھ لگاتی تھی۔ عیسیٰ  
نے اسے منع کر دیا تھا۔ فی الوقت بھی وہ ڈسٹ بن  
کھولے کچھ بول رہا تھا جب ایک دم کچھ چونک  
گیا۔

”اکثر غیر ضروری چیزیں جن کو ناکارہ سمجھ کر  
کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے، وہ ہمارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



میں اچھے دوست رہ چکے تھے اور ماضی قریب میں ہی سوزن کے جھگڑے کی وجہ سے وہ جماعت کی رکنیت سے بھی الگ ہو گیا تھا مگر پھر بھی اسے سوزن سے ایسے کٹھور پن کی قطعاً امید نہیں تھی۔ اسے بے دل سا مڑتا دیکھ کر چاچو زبردستی اندر لے آئے تھے پھر مالا کو چائے بنانے کے لیے بھیج کر وہ دونوں سٹنگ روم میں چلے گئے۔ مالا جب چائے کے ساتھ ڈھیروں لوازمات لے کر اندر آنے لگی تھی تب اسے چاچو اور میکس کی بہت سنجیدہ گفتگو نے مل بھر کے لیے روک دیا تھا۔ وہ دونوں بہت سنجیدگی سے کچھ ڈسکس کر رہے تھے۔ مالا نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ گفتگو سوزن کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ چاچو کی آواز میں عجیب سی شکستگی تھی۔ وہ بہت بکھرے، بکھرے لہجے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ مالا نے دروازے کی جھری میں سے جھانکا تو اس کے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ چاچو کا زرد آنسوؤں سے بھینکا چہرہ سامنے تھا جبکہ میکس انہیں نہ جانے کون، کون سی تسلیاں دے رہا تھا۔ وہ مقامی زبان میں بات کر رہے تھے..... اور مالا کی ڈونج اتنی امپرود تو ہو چکی تھی جو وہ پورا فقرہ نہ سہی کچھ کچھ الفاظ تو سمجھ جاتی..... اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش میں ہلکا سا دروازہ کھول دیا تھا۔ اسے میکس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ چاچو کو کچھ بتا رہا تھا۔

”اسے غیر ملکی اور ملکی کئی ایجنسیوں نے ہائیر کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔“ میکس کی بات نے چاچو کے چہرے پر سرسوں کے عرق کا برش پھیر دیا تھا۔ ان کے گال انڈے کی زردی جیسے پیلے پڑ گئے۔ بہت دیر تک وہ کچھ بول ہی نہیں پائے تھے۔

”پھر..... اس نے حامی بھری؟“ ان کے لہجے میں وسوسے ڈول رہے تھے۔ آنکھوں میں نظر اور اذیت دور سے بھی نظر آ سکتی تھی۔

میکس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”جی ہاں..... میں تو آپ کو دیکھتے ساتھ ہی پہچان گیا..... ایک دفعہ شام کو آپ کے گھر مومن اور سوزن کے ساتھ آ بھی چکا ہوں، شاید آپ کو یاد نہیں رہا۔ میں سوزن کی سنڈیکمیٹ کا باقاعدہ رکن ہوں۔“ اس کی شائستگی سے تفصیلاً وضاحت کوسن کر چاچو سر ہلانے لگے تھے۔ گویا انہیں میکس کا گزشتہ حوالہ دینا بہت کچھ یاد دلا گیا تھا۔

”تب مالا کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔“ میکس اب مسکرا کر مالا کی طرف اشارہ کر رہا تھا تب چاچو نے بڑے فخر کے ساتھ میکس کو بتایا تھا۔

”یہ میری بیٹی اور بہو ہے، میرے اکلوتے بیٹے کی بیوی.....“ چاچو کے تعارف نے مالا کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی جبکہ میکس ایک دم حیران رہ گیا تھا۔

”عیسیٰ کی بیوی.....؟“ میکس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ وہ کمال کی حیرت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ گویا اسے عیسیٰ کی شادی کا گمان ہی نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات بھی بہت عجیب تھے۔ چاچو اور مالا دونوں الجھ کر رہ گئے۔

”حیرت کی بات ہے۔“ میکس کی بڑ بڑاہٹ بہ آسانی ان دونوں کی سماعتوں تک اتر گئی تھی۔ ان دونوں نے بیک زبان کچھ کہنے کی کوشش کی تھی جبکہ میکس ان کی سنے بغیر اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔

”مجھے سوزن نے بھی نہیں بتایا، چلیں سوزن سے تو کافی عرصے سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ جبکہ مومن تو اکثر بیدی نوٹنگ میں ملتی رہتی ہے۔ نہ اس نے مجھے شادی پہ انوائٹ کیا..... اور نہ ہی بتانا گوارا کیا۔“ میکس انتہائی افسردہ اور دل برداشتہ نظر آ رہا تھا۔ گویا سوزن اور مومن کے عمل نے اس کے دل کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ اسے سوزن اور مومن دونوں سے ایسی بے مروتی کی امید نہیں تھی۔ وہ تینوں ماضی

کو اتنا انتظار کروانے پر کچھ سخت زدہ تھی۔

”جب تم لوگ میرے ساتھ آئی تھیں تو پھر میں اکیلا تم لوگوں کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا؟“ میکس نے مسکرا کر جواب دیا۔ مالا اور ہیرا اس کے ایثار کی قائل ہو گئی تھیں۔ بلاوجہ بے چارہ انتظار کی زحمت اٹھاتا رہا تھا۔ تاہم اس سفر کے دوران ان دونوں پر مشکف ہوا تھا کہ میکس بہت اچھا اور مہذب انسان ہے۔

وہ پہلے ہیرا کو اس کے فلیٹ پر اور مالا کو اس کے گھر تک ڈراپ کر کے گیا تھا پھر مالا کو اسے گیٹ پر لٹکانا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے میکس کو اندر آنے کی دعوت دی تھی۔ جسے اس نے شائستگی سے رد کرتے ہوئے ایک ریکیویسٹ کی تھی اور مالا اس کی ریکیویسٹ سن کر تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔

”آپ لوگ میری برتھ ڈے پارٹی پر ضرور آئیے گا۔“ میکس نے بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ دعوت دی تھی۔ آپ لوگوں سے مراد جانے کون، کون تھا؟ مالا نے ہونق پن کی انتہا کرتے ہوئے میکس سے پوچھ ہی لیا۔

”میں اور کون.....؟“ وہ ہونق بنی پوچھ رہی تھی۔ تبھی میکس نے وضاحت کی۔

”تم اور تمہاری فیملی.....“ اس نے مسکرا کر حسیب چاچو کو باہر نکلنے دیکھ کر اشارہ کیا تھا پھر ان سے ہیلو ہائے کرنے لگا۔ چاچو، مالا کے مہمان کو سوکھے منہ نہیں جانے دینا چاہتے تھے مگر میکس پھر کسی دن آنے کا وعدہ کر کے جانے لگا تھا جب چاچو نے اچانک اسے روک کر پوچھ لیا۔ وہ کچھ ابھی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

”مجھے لگ رہا ہے، ہم پہلے بھی مل چکے ہیں؟“ چاچو کے لہجے میں یقین بول رہا تھا۔ تب

کو بھیج دے۔ اسے کچھ شاپنگ کے لیے مرکز جانا ہے مگر عیسیٰ کا رپلائی نہیں آیا تھا جس کا مطلب تھا وہ بہت مصروف ہے۔ ویسے بھی ”این کاؤف سین ٹروم“ اتنا دور نہیں تھا۔ وہ بہ آسانی بس سے جا سکتی تھی مگر وہی اندرونی بزدلی، اکیلے جانے سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اگر وہ ہیرا سے کہتی تو اس نے فوراً تیار ہو جانا تھا۔ سو وہ اب میکس کی آفر ذہن میں رکھتے ہوئے ہیرا کو آواز دے رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر ہیرا گلے میں کیمرا لٹکائے بھاگتی دوڑتی آگئی۔

”اگر شاپنگ کا موڈ ہے تو میرے ساتھ چلو۔“ مالا نے دبی آواز میں ہیرا سے ریکیویسٹ کی تھی۔ اب اندھے کو بھلا کیا چاہیے تھا۔ وہ فوراً تیار ہو گئی تھی۔ میکس ان دونوں کو خوشی، خوشی اپنی ننھی سی کار میں بٹھا کر شاپنگ کے لیے لے آیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں ڈھیروں باتیں کر رہی تھیں جبکہ میکس خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا مسکراتا جا رہا تھا۔ پھر شاپنگ کے دوران وہ ان دونوں کو اکیلا چھوڑ کر اپنا کام کرتا رہا تھا۔ ہیرا نے اپنے لیے ڈھیروں کا کیمیکس خریدا تھا۔ مالا کو بھی ضروری چند ایک چیزیں خریدنا تھیں..... سو ڈیڑھ گھنٹے کی شاپنگ کے بعد جب وہ دونوں لدی پھندی باہر آئیں تو پارکنگ میں میکس کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

”تم ابھی تک یہیں ہو؟“ مالا نے حیرت کا برملا اظہار کیا تھا۔

”تو کیا مجھے چلے جانا چاہیے تھا؟“ میکس نے الٹا حیران ہو کر ان سے پوچھا تھا۔

”کیوں چلے جانا تھا.....؟ ہمارے پاس عیسیٰ کا کرایہ تک نہیں بچا۔ اچھا ہوا، تم گئے نہیں۔“ ہیرا نے خوش اخلاقی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کر کے شاپنگ بیگ دھڑا دھڑکار میں ٹھونس دیے تھے جبکہ مالا میکس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



مالا نے مزید... انہیں بتایا تھا۔  
”پڑھتا تو وہ اوپر والے کسی درجے میں ہے  
جبکہ زیادہ وقت ہماری کلاس میں پایا جاتا ہے۔  
اس نے سنجیدگی سے اپنی بات مکمل کی تھی۔ اسے چاچو  
کے سنجیدہ تاثرات کچھ کچھ گھبراہٹ میں جتلا کر رہے  
تھے۔ جانے کیا مسئلہ تھا؟ وہ اتنے سنجیدہ تو کبھی نہیں  
رہے تھے۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے چاچو۔“ وہ  
مشکل ہو گئی تھی اور بھاگ کر بی بی آپریشن اٹھا کر لانا  
چاہتی تھی۔ شاید چاچو کا بلڈ پریشر بڑھ رہا تھا، چاچو  
اس کا ارادہ بھانپ کر سرعت سے اس کا ہاتھ  
پکڑتے ہوئے بولے۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹا! تم میرے پاس رہو۔“  
ان کے چہرے پر اب بھی زردی چھا رہی تھی۔ بس  
مالا کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔  
”مگر مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے، کیا عیسیٰ کو  
بلاؤں؟“ مالا نے ان کا ٹھنڈا ہاتھ نرمی سے مسلتے  
ہوئے کہا تھا۔ تب وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیے  
تھے۔

”اسے پریشان نہ کرو..... مجھے کچھ نہیں  
ہوا۔“ اب وہ مالا کی خاطر خود پتہ قابو پا کر مسلسل مسکرا  
رہے تھے۔ وہ جانتی تھی، چاچو خود بر جبر کر رہے ہیں  
مگر ان کی بات ماننے بغیر گزارہ بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر  
بعد وہ ان کا دھیان بنانے کی غرض سے بولی۔

”آپ میکس کے بارے میں کچھ کہہ رہے  
تھے؟“ اس نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا تھا  
جہاں سے اس کی سوچوں کے باعث ٹوٹ گیا تھا.....  
تب چاچو پھر سے کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ مالا  
نے ان کا گھٹنا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“ وہ پھر سے  
مشکل ہو گئی تھی۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ میکس کو ڈوٹج سیکھنے کی

لیے اب بھی گھر آجایا کرنے۔ وہ لیکنوچ اسکول  
سے جلدی آ جاتی تھی۔ تاہم عیسیٰ مصروفیت کے  
باعث لنچ ٹائم میں اس کا فون نہیں اٹھاتا تھا اور صبح  
کے وقت مالا تاکید کرنا بھول جاتی تھی۔

نی الوقت بھی وہ میکس کی باتوں پر غور کرتی  
چاچو کو سوزن کے گفت کا نہیں بتا سکتی تھی جسے لاعلمی  
میں مالا نے کورپ میں پھینک دیا تھا اور جو اس کی  
بد قسمتی کے پھیر کی وجہ سے عیسیٰ کے ہاتھ لگ گیا تھا  
اور نہ صرف عیسیٰ نے اسے بھلو بھلو کر باتیں سنائی  
تھیں بلکہ گفت اٹھا کر اپنے پاس سوزن کو لوٹانے  
کے لیے سنبھال لیا تھا..... اب بھلا مالا وہاں کیا  
کرتی.....؟ وہ اس کی کوئی بات سننے والا نہیں تھا اور  
بعد میں مالا عادتاً وضاحت کرنا بھول گئی تھی۔  
حالانکہ اگر وہ وضاحت کر دیتی تو عیسیٰ سو فیصد  
مطمئن ہو سکتا تھا۔ ظاہری بات تھی اسے سوزن کے  
تختے کی اتنی بے حرمتی پسند نہیں آئی تھی۔ مالا ان  
زناکتوں کی طرف دھیان کر لیتی تو شاید اتنے  
خسارے میں کبھی نہیں رہتی۔

نی الحال بھی وہ میکس کے بارے میں سوچ  
رہی تھی۔ جب اچانک چاچو نے اسے اپنی طرف  
متوجہ کر لیا تھا۔

”میکس تمہارا اکلا س فیلو ہے؟“ وہ کسی گہری  
سوچ میں گم تھے، نہ جانے کیا سوچ رہے تھے اور  
کے سوچ رہے تھے۔ ان کا سوال سن کر مالا نے  
فوراً سر ہلا کر جواب دیا تھا۔

”اس کی لیکنوچ بہت امروہ ہو چکی ہے چاچو!  
وہ اوپر کے کسی درجے میں پڑھتا ہے۔“ اس نے  
اپنی معلومات کے مطابق بتایا تھا جبکہ چاچو قدرے  
پُر سوچ انداز میں ہنکارا بھر کے رہ گئے تھے پھر  
انہوں نے نفی میں ہولے سے سر ہلایا تھا۔ گویا مالا کی  
بات انہیں قائل نہیں کر سکتی تھی اور وہ ذرا بھی مطمئن  
نہیں ہو سکے تھے۔ چاچو کے تاثرات ملاحظہ کر کے

ان کے لہجے میں عجیب سا پچھتاوا تھا۔ وہ رنجیدگی  
کی انتہا پر کھڑے تھے۔ جانے انہیں کیا کچھ نہیں یاد  
آ رہا تھا۔

”بس کچھ لوگوں کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے،  
عموماً لوگوں کی کھوج میں رہتے ہیں۔“ وہ ہم سا بولا  
تھا پھر چاچو نے ماحول کی کثافت کم کرنے کے لیے  
یہ موضوع بدل دیا تھا۔

”سوزن کا اور تمہارا معاملہ کہاں تک پہنچا؟“  
ان کے لہجے میں تجسس نہیں، سادگی تھی گویا وہ میکس  
کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔

”وہ بات تو وہیں ختم ہو گئی تھی۔“ میکس کے  
الفاظ بھی گویا بھیگ سے گئے تھے۔ اس کے چہرے  
پر چھائی شکستگی بہت واضح پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ اتنا  
دلبرداشتہ اور رنجیدہ کیوں ہو گیا تھا؟ مالا سمجھ  
نہیں پا رہی تھی۔ مگر اب باہر کھڑے رہنے کا کوئی  
جواز نہیں تھا۔ میکس الوداعی کلمات بول کر اٹھنے ہی  
لگا تھا جب مالا ثرالی دھکیلتی اندر آ گئی۔ وہ اتنے  
لوازمات جانے کے ساتھ دیکھ کر بوکھلا سا گیا تھا۔

”فولین مالا.....! اس کی ضرورت کیا  
تھی؟ میں اس گھر میں مہمان تھوڑی ہوں۔“ میکس  
خواہ مخواہ شرمندہ ہوئے جا رہا تھا مگر چاچو اور مالا

کے اصرار پر اسے چائے پینا ہی پڑی تھی۔ پھر وہ  
کچھ دیر مزید وہاں بیٹھ کر واپس چلا گیا تھا اور میکس  
کے چلے جانے کے بعد مالا سہولت سے برتن سمیٹ  
کر ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔ تاہم بیٹھنے سے پہلے  
اس نے چاچو کو دو امر دریںے دی تھی۔ کم از کم چاچو کو

وقت پر دوا دینے والا کام وہ کبھی نہیں بھولتی  
تھی۔ باقی بہت سے معاملات میں اسے بھلکوں پن  
کی وجہ سے اسے کتنا نقصان اٹھانا پڑ سکتا تھا، اس  
بات سے مالا واقف نہیں تھی۔ تاہم وہ اپنی کمزوری  
پہ نی الحال قابو نہیں پاسکتی تھی۔ اکثر اسے صبح کے

وقت عیسیٰ کو یہ یاد دلانا بھول جاتا تھا کہ وہ لنچ کے

”نہیں.....“ میکس کے جواب نے گویا ان  
کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔  
”تو پھر.....؟“ وہ کچھ بے چینی سے پوچھنے  
لگے۔

”نی الحال تو اس نے انکار کر دیا ہے۔ اب  
آگے کا نہیں پتا.....“ میکس نے سنجیدگی سے بتایا۔  
”بیدی نوٹنگ ابھی تک جارہی ہے؟“ چاچو  
نے گہری طویل سانس کھینچ کر پوچھا۔ ان کے  
اعصاب ٹھکن سے چور ہو گئے تھے۔ عجیب شکستگی کا  
غبار ان کے آس پاس چھا رہا تھا۔

”وہاں جانے کی اسے ضرورت تو نہیں.....  
بیدی نوٹنگ والے تو خود اس کی صلاحیتوں کے تابع  
ہیں۔“ میکس بھی شاید مون کے متاثرین میں سے  
تھا مگر یہاں مون کی بات کہاں ہو رہی تھی؟ مالا نے  
حیرت سے سوچا تھا، یہ لوگ تو نہ جانے کسے ڈسکس  
کر رہے تھے اور مالا سمجھ رہی تھی وہ لوگ مون کے  
متعلق بات کر رہے ہیں، وہ سر جھٹک کر اندر جانا  
چاہتی تھی جب میکس کی پھر سے آواز سنائی دی تھی۔  
مالا کے بڑھتے قدم پھر سے رک گئے تھے۔

”پروفیسر بشر کیا اب بھی آتے ہیں؟“ وہ  
قدرے جھجک کر پوچھ رہا تھا۔ تب چاچو نے پھیکے  
سے لہجے میں بتایا تھا۔

”نہیں.....“ ان کا سر بھی بے اختیار نفی  
میں ہلتا چلا گیا تھا۔ میکس کچھ دیر کے لیے سوچوں  
میں گم ہو گیا۔ گویا کسی سابقہ منظر کو یاد کر رہا تھا۔ پھر  
سر جھٹک کر بولا۔

”جب سے عیسیٰ نے پروفیسر بشر کی بے عزتی  
کی تھی، وہ مون سے بھی کم کم ملنے لگے تھے۔ یوں  
سمجھ لیں، انہوں نے مون کے سر پر سے اپنا دست  
شفقت ہٹا لیا تھا۔“ میکس سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”سارے فساد کی جڑ یہ بشر ہی تو تھا۔ بس میں  
ہی سمجھ نہیں پایا۔“ چاچو افسردگی سے کہہ رہے تھے۔



کیا ضرورت ہے۔ وہ تو آٹھ دس ماہ بواریا میں مون کے انٹی ٹیوٹ میں پڑھاتا بھی رہا ہے۔ تو پھر اس اسکول میں پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟“ چاچو کے حیران سوال نے مالا کو بھی لمحہ بھر کے لیے مجھ کر دیا تھا۔

”تو کیا میکس جان بوجھ کر اپنا نام ویٹ کر رہا ہے یا پھر شوقیہ.....؟“ وہ بولتے، بولتے ایک، ایک کر رک گئی تھی۔

”شوقیہ تو نہیں، کیا پتا..... تمہارے اسکول میں جاب کا ارادہ رکھتا ہو۔“ چاچو نے گویا خود کو بودی سی دلیل دے کر قائل کرنا چاہا تھا مگر نہیں پائے تھے۔

”میکس بتا رہا تھا، اس کی مون کے ساتھ کسی بات پر تلخ کلامی ہو گئی تھی، وہ بواریا کا انٹی ٹیوٹ چھوڑ چکا ہے اور بیدی ٹونگ بھی نہیں جاتا..... جانے اس بات میں کتنی سچائی ہے۔“ چاچو گویا خود کلامی کر رہے تھے جبکہ مالا کی تو سانس تک رک گئی تھی۔ وہ پھٹی، پھٹی نگاہوں کے ساتھ چاچو کو ایک ننگ دیکھے جارہی تھی۔ اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی ضربیں لگ رہی تھیں۔

”مون اور میکس..... انٹی ٹیوٹ، لڑائی، ڈورج بولنا، اردو سمجھنا۔“ اسے لگ رہا تھا، مون اور میکس ایک ہی کہانی کے دو مختلف رخ ہیں، اس کے تصور کی اونچائی پر گروسی کے گھر کی وہ بھیانک رات ناپنے لگی تھی۔ دو حسین تر اور عجیب تر آنکھیں..... اس کی عجیب گفتگو، روح کھینچ لینے والی باتیں..... آنکھوں سے لپکتی نفرت کی آگ..... چہرے پر سنگ مرمر جیسی سختی..... کروفرانہ، مغرورانہ وہ غرور حسن تھا یا کچھ اور.....؟

وہاں نفرت کے شعلے تھے یا زخمی انا کا زہر پھونکا جا رہا تھا؟

”تم عنقریب علی عیسیٰ کی زندگی سے جانے

والی ہو۔“ تکبر سے بھرا لہجہ، آگ اگلنے لفظ..... اور پھر جیسی رنگ بدلتی آنکھیں جو کبھی ہری نظر آتیں، کبھی سرمئی، کبھی نیلی اور کبھی سیاہ.....

مالا کو کڑی سے کڑی ملانا نہیں آتا تھا..... اسے لفظ کی گہرائی میں اترنا نہیں آتا تھا۔ اسے لہجہ سمجھنا اور چہرے پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ اسے تو کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ وہ چھوٹے سے ملک کی شہری تھی، اک چھوٹے سے گھر میں محدود زندگی گزارنی آئی تھی۔ اس نے بھانت، بھانت کے اور رنگ، رنگ کے لوگ کہاں دیکھے تھے؟

مگر ایک بات اسے سمجھ ضرور..... آ رہی تھی۔ کوئی حال سا تھا جو اس کے آس پاس پھینکا جا رہا تھا۔ کوئی گھیرا سا تھا جو اس کے حلقوم اور گردن کے گرد تنگ کیا جا رہا تھا۔ اسے چاروں طرف سازشوں کے ٹھکنے جکڑنے والے تھے مگر بے خبری کا یہاں عالم ہی کوئی اور تھا۔

☆☆☆

اسے رات بھر ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ بار بار جانے کس خدشے کے تحت آنکھ کھل جاتی۔ اس شب علی عیسیٰ بھی گھر نہیں آیا تھا۔ آفاق اور عیسیٰ دونوں آؤٹ آف انٹیشن گئے تھے۔ بس مالا اور چاچو ہی گھر میں موجود تھے۔ ہاں، عیسیٰ نے نینی کو رک جانے کے لیے کہا تھا۔ نینی دوسرے کمرے میں سو رہی تھی جبکہ مالا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ پانچ دس منٹ کے لیے آنکھ لگتی اور پھر جانے کیسے اور کیونکر پلکیں خود بخود کھل جاتی تھیں۔ وہ اس آنکھ چھوٹی سے عاجز آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے کمرشل کی گڑیا کے دونوں ڈبلے آن کر دیے تھے۔ کمرے میں خاصی روشنی پھیل گئی تھی۔ یہ گڑیا، ٹیبل لیسپ کا کام بھی بخوبی دیتی تھی۔ اللہ نے انسان کو کیسے، کیسے دماغ دیے ہیں؟ کبھی آسمان پر اڑتے جہاز سے حیران کر ڈالتے تھے اور کبھی پانی

کی سطح پر تیرتے محل برابر جہاز، یاٹ، کشتیاں، کبھی ننھی ننھی مشینریاں اسے..... حیران کر دیتی تھیں۔ یہ انسانی ذہن ہی تو تھا جس نے آنکھوں کو دھج کر دینے والی چیزیں ایجاد کی تھیں۔ کروڑوں میل دور بیٹھ کر اپنوں کی آوازیں سن لینا..... ایک بن دبا کر کمر اٹھنا اور گرم کر لینا..... انسان کی زندگی مشین کے کتنے تابع ہے اور انسان خود بھی تو ایک مشین (دماغ) کے تابع ہے..... مالانے عقل کو حیران کر دینے والے ایسے ایسے نظارے اور چیزیں دیکھی تھیں کہ وہ دنوں ان کے سحر سے نکل نہیں پاتی تھی۔ کبھی کسی اتنی اونچی عمارت کو دیکھ کر وہ حیرت سے سوچتی تھی۔ ”اللہ یہ بھی تو انسان نے بنائی ہیں..... تیری بنائی مشین (دماغ) کے زور پر..... پھر بھی تیری ذات کو تسلیم نہیں کرتے؟ کیسے اندھے لوگ ہیں یہ.....“ یہاں جگہ جگہ حیرت کدے کھڑے تھے۔ خود مالا کے اپنے گھر میں بہت ساری ایسی چیزیں موجود تھیں جس کے استعمال کی اسے سمجھ نہیں آتی تھی۔ خصوصاً اسے تو کمرالاک ہو تو کھولنا بھی نہیں آتا تھا جیسی عیسیٰ نے جگہ جگہ کچھ پیغامات لکھ دیے تھے۔ جیسا کہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ اندر کی طرف بہت کھینچنے سے کھلتا تھا سو عیسیٰ نے وہاں ایک سفید سلب پر طریقہ لکھ دیا تھا۔ اسی طرح مالا کی رہنمائی کے لیے عیسیٰ نے بہت سی آسانیاں فراہم کر دی تھیں۔ وہ عیسیٰ کو سوچتی ہوئی بہت اداس ہونے لگی تھی۔ وہ کبھی رات بھر کے لیے کہیں نہیں گیا تھا، کم از کم کاروباری کام کے لیے تو کبھی نہیں گیا تھا مگر اب اسے اپنے کام کے لیے شہر سے باہر تو جانا ہی تھا۔ مالا کو عارضی جدائی کے لیے عادی ہونا ہی تھا۔

اور شاید اس کی یاد اور محبت کی کشش تھی جو عیسیٰ کی فون کال نے ماحول کے سنائے کو توڑ ڈالا تھا۔ ”آختونگ، آختونگ۔“ (توجہ کیجیے) عیسیٰ کا

تذکرہ

موبائل بج اٹھا تھا۔ وہ اپنا موبائل مالا کے پاس چھوڑ گیا تھا جبکہ دوسرا سیل ہمراہ لے گیا تھا۔ اس سیل فون کی ٹیون خود بخود بدلتی رہتی تھیں۔ مالانے لپک کر سیل فون اٹھا لیا تھا جیسی دوسری طرف گہری سانس کھینچ گئی۔

”مجھے پوری توقع تھی کہ تم جاگ رہی ہوگی۔“ عیسیٰ نے چھوٹے ہی چوٹ کرنے کی کوشش میں مالا کو خفا کر دیا تھا۔ وہ اس کی بات سن کر بگڑ گئی۔

”ایک تو اکیلا چھوڑ گئے ہیں، اوپر سے زبردستی سلانے کی کوشش میں بھی ہیں، نہیں آ رہی مجھے نیند۔“ مالا چڑچڑے پن سے بولی۔ وہی بغیر سوچے سمجھے بولنے کی پرانی عادت..... اب وہ عیسیٰ کی طرح تول، تول کر تو بول نہیں سکتی تھی۔ عیسیٰ کو بے ساختہ ہنستے سن کر وہ قدرے حیران ہوئی تھی پھر اپنی بات پر غور کیا تو جھینپ سی گئی۔

”میں کہاں سلا رہا ہوں، اتنی دور بیٹھے بس تصور ہی کیا جاسکتا ہے، عمل ہرگز نہیں۔“ عیسیٰ کا لہجہ شوخ سا تھا، ذرا بھی آواز میں نیند کا خمار یا بھاری پن نہیں تھا۔ مالا قدرے چوکی تھی پھر اس کی شوخ بات کا اثر زائل کرنے کی غرض سے بولی۔

”آپ کیوں نہیں سوئے.....؟“ وہ خفگی سے پوچھ رہی تھی۔ حالانکہ عیسیٰ کی غیر متوقع کال نے اس کے اندر سکون اتار دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے کا خوف جاتا رہا تھا۔ ورنہ، اسے تو نیلے ڈیلیوں والی نازک اندام گڑیا سے بھی خوف آ رہا تھا۔

”بس آپ کی یاد نے دل کو بے قرار کر رکھا ہے۔“ عیسیٰ نے خمار آلود آواز میں کہا تھا تب مالا اسے چھیڑنے کی غرض سے بولی۔

”کہیں نی تو نہیں رکھی؟“ اس کا لہجہ شوخ سا تھا۔ مسکراتا، کھلکھلاتا ہوا، عیسیٰ نے بڑی مزیداری آہ بھری تھی۔

91 ماہنامہ پاکیزہ جولائی 2014ء

90 ماہنامہ پاکیزہ جولائی 2014ء



مجھ سے ملیے

میرا نام صدف نورین ہے، میں



گو جرنوالہ کے ایک گاؤں میں سات اپریل 1988ء میں پیدا ہوئی۔ جب پانچ سال کی تھی تو میں اپنے والدین کے ساتھ لاہور شفٹ ہو گئی۔ میرے دو بھائی ہیں، میں ایک ہی بہن ہوں۔ پنجاب یونیورسٹی سے میں نے بی اے کیا ہے۔ میری پسندیدہ کتاب قرآن مجید ہے۔ میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں۔ قرآن وحدیث کے بے شمار کورسز بھی کیے ہیں، میں اپنے اس علم کو اپنے اسٹوڈنٹس تک منتقل کرنا چاہتی ہوں تاکہ وہ دینی تعلیم سے روشناس ہو سکیں جس سے بچوں کی اخلاقی تربیت بہتر ہو سکے گی۔ پاکیزہ سے میرا رشتہ بہت پرانا ہے..... جب تک پاکیزہ نہ پڑھ لوں چین نہیں ملتا۔ ہر ماہ بے قراری سے نئے پرچے کا انتظار رہتا ہے۔ مجھے آپ سے مل کر اچھا لگا، آپ کو کیسا لگا؟

اڑ گیا۔ اوپر سے مالا کی انتہائی بری حالت اور خوف سے نیلا بڑا چہرہ دیکھ کر ڈر پوک سی مٹی خود بھی تھر تھر کاپٹنے لگی تھی۔

”کک..... کون ہے.....؟“ مٹی نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”کوئی..... سایہ..... بولتا ہوا.....“ مالانے رک رک کر بتایا تھا۔ وہ مٹی کا بازو دبوچے کھڑی تھی۔ اگر باہر مٹی بھی نہیں تھی تو پھر وہ کرخت آواز کس کی تھی۔ انتہائی کھر در اور بھاری زمانہ لہجہ تھا۔ مٹی نے پوچھا تھا کہ وہ آواز کسی تھی؟ مالانے لڑکھٹاتے لہجے میں پوری بات بتادی پھر لاؤنج کے کھلے دروازے کا سن کر تو مٹی کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

”دروازہ کس نے کھولا.....؟“ سر نے خود لاک چیک کیے تھے؟“ مٹی ہکلاتے ہوئے حواس باختہ ہو گئی پھر مالا کو ساتھ لیے چاچو کے کمرے تک آئی۔ کاریڈور میں اب پوری روشنی بھیلی ہوئی تھی بلکہ سارا گھر جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ مٹی اور مالا ایک مرتبہ پھر سے بے ساختہ چیخ پڑیں۔

”لائٹس کس نے آن کی.....؟“ چاچو کو اپنے بیڈ پر گہری نیند میں سوتا دیکھ کر مالا چیخ پڑی تھی۔ یہ اس کی پیلاہٹ بھری خوفزدہ آواز تھی جسے سن کر چاچو بھی اٹھ گئے تھے اور چاچو کو اٹھا دیکھ کر مالا ایک ہی جست میں ان تک پہنچ کر اونچی آواز میں رونا شروع ہو گئی تھی۔ چاچو اس افتاد پر گھبرا اٹھے تھے مگر مالانے رونا اور چیخنا کم نہیں کیا تھا۔

”مالا.....! میری بیٹی ہوا کیا ہے؟“ چاچو کے بار بار پوچھنے پر سہمی کھڑی مٹی نے پوری بات انہیں بتادی تھی تب چاچو بے انتہا پریشانی کے عالم میں فوراً باہر نکل گئے تھے۔ مالا اور مٹی بھی ان کے پیچھے بھاگتے ہوئے آئی تھیں اور مالا کی ایک مرتبہ پھر گویا آنکھیں پھٹ پڑی تھیں۔ پورے لاؤنج میں ہوکا

ایک ہی جگہ چلتا نظر آ رہا تھا۔ پھر معا سے خیال آیا..... کہیں مٹی تو نہیں..... اور شاید وہ مٹی ہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر داخلی دروازے کو دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو گئیں۔ داخلی دروازہ کھلا تھا جبکہ چاچو نے سونے سے پہلے خود تمام لاک لگائے تھے۔ مالا کا سر چکر کھانے لگا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی اور وجود کسی مجسمے کے مانند ساکت اور سرد ہو رہا تھا پھر جانے کیسے اس نے دل کو ڈھارس پہنچانے کے لیے خود سے فرض کر لیا۔ ”شاید مٹی یا چاچو اندر سے بھلا کس نے دروازہ کھولا تھا۔“ بس یہی سوچ کر وہ ہمت مجتمع کرتی ہوئی کاریڈور کی طرف بڑھنے لگی تھی جب ایک عجیب سی کرخت اور بھیانک آواز سن کر سہم گئی۔

”زیخنت..... (خبردار) فورسینت (خبردار)“ آوازیں اتنا واضح محکم تھا کہ مالا کی گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ اس نے چیخنا چاہا تھا مگر چیخ نہیں پائی، بولنا چاہا تو بول نہیں پائی۔ گویا اس کرخت آواز نے اسے اپنی طرف بڑھنے سے روکا تھا۔ مالا کو گویا زماں و مکان بھول گئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے سیر پٹ دوڑ لگاتے اس..... پہلے ہی بیڈ روم میں گھس گئی تھی جو مٹی کا تھا یا چاچو کا..... جس طرح دروازہ دہاڑ سے کھول کر وہ چیختے ہوئے اندر آئی تھی۔ بیڈ پر بڑا مٹی کا وجود سہم کر ہڑبڑا ہوا تھا پھر مٹی گویا خود بھی چیختی ہوئی بیڈ سے اچھل پڑی تھی۔ مالا کو اپنے کمرے میں حواس باختہ کھڑا دیکھ کر وہ بھی انتہائی خوفزدہ ہو گئی۔

”تم یہاں.....؟“ مٹی نے نیند سے بھاری آواز میں کہا تھا تب مالانے ہکلاتے ہوئے باہر کی طرف اشارہ کر کے مٹی کو بتایا۔

”باہر..... کوئی ہے.....“ وہ بھاگتے ہوئے مٹی سے چٹ گئی تھی جبکہ مٹی کا رنگ بھی خوف سے

”ہزار جام لطف، ہزار مہ خانے نگاہ یار کی لذت، شراب کیا جانے وہ بڑے برجستہ لب و لہجے میں بولا تھا۔ یوں کہ مالا بے ساختہ ہنس پڑی تھی پھر عیسیٰ نے پورا ایک گھنٹا اس سے بات کی تھی۔ مالا کا تو اب بھی دل نہیں بھر رہا تھا تاہم عیسیٰ نے اسے پچکارنے ہونے رات گہری ہونے کا احساس دلایا تھا اور یہ کہ اسے وقت پر سونا چاہیے تھا تا کہ صبح فریش اٹھ سکے، عیسیٰ نے فون بند کیا تو مالانے خود میں ایک نئی تازگی بھرتی محسوس کی تھی۔ یہ صرف عیسیٰ کی فون کال کا کمال تھا۔ وہ چپل پہن کر باہر نکل آئی۔ ارادہ تھا پانی پی کر آرام سے سونے کے لیے لیٹے گی۔ سو پانی پی کر وہ اپنی ترنگ میں باہر نکل رہی تھی جب کاریڈور کے آخری سرے پر اسے کسی کا سایہ نظر آیا تھا۔ یہ سایہ انسانی وجود کا تھا..... مالا کا کچھ دیر والا شکفتہ سا مطمئن دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ خوف کے مارے اس کا وجود دھیرے، دھیرے کاہنے لگا تھا۔ لاؤنج اور کاریڈور میں اندھیرا تھا، نیم ملگجا سا..... اور مالا کو یہ سایہ چلتا پھرتا نظر آ رہا تھا۔ وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ چیخ بھی نہیں پار ہی تھی اور نہ اس میں ہمت تھی کہ جو آگے بڑھ کر چکن کی لائٹ آن کر لیتی۔ اس نے آنکھیں مسل، مسل کر سامنے دیکھنے کی کوشش میں تھوڑا آگے بڑھنا چاہا تھا مگر اس کے پیروں کو زمین نے جکڑ لیے تھے۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید باہر ہوا تیز چل رہی ہو اور کاریڈور کے دائیں طرف سنگ روم کا کوئی پردہ مل رہا ہو مگر یہ خیال پختہ نہیں تھا۔ سایہ کسی انسانی وجود کا تھا۔ مالا نے مڑنا چاہا تو محسوس ہوا کہ ٹانگوں میں ذرا بھی ہمت نہیں..... وہ نہ آگے بڑھ سکتی تھی اور نہ پیچھے ہٹ پار ہی تھی۔ خوف نے اسے زرد کر رکھا تھا اور وہ انسانی سایہ کہیں غائب ہونے والا بھی نہیں تھا۔



## ترک و ہوا

کرنا چاہتی تھی، تبھی براہ راست نینی سے پوچھ رہی تھی ورنہ چاچو تو رات کو جو کچھ بھی ہوا تھا اسے مالا کا وہم سمجھ رہے تھے۔ حالانکہ وہ سب مالا کا وہم ہرگز نہیں تھا۔ نینی اس کا سوال سن کر پھر گھبرا گئی تھی۔ تبھی اس نے بے ساختہ نینی میں سر ہلایا تھا۔

”پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا.....“ نینی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے، مالا کو ذرا بھی یقین نہیں آیا تھا بلکہ نینی کے جھوٹ نے اس کا ایقان بڑھا دیا تھا۔ وہ پورے دثوق سے کہہ سکتی تھی اس گھر میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

”جھوٹ مت بولو، نینی! مجھے سچ بتاؤ، یقین کرو، میں چاچو کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ مالا نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ اس کا تذبذب جان چکی تھی۔ یقیناً اسے چاچو کی ڈانٹ نے خوف زدہ کر رکھا تھا اگر چاچو جان جاتے کہ نینی نے مالا کو کچھ اور بھی بتایا ہے تو پھر اس کی چھٹی کروادی جاتی۔ نینی بہت غریب گھرانے سے تھی۔ اس کا باپ سیاسی پناہ لے کر جرمنی آیا تھا۔ نینی کا کنبہ بھی بہت زیادہ تھا..... یہ ساری بہنیں کلینرین تھیں اور گھر کا خرچہ یہی کھینچ تھیں۔ مالا کی یقین دہانی نے نینی کو کچھ ڈھارس پہنچائی تھی۔ اب وہ مالا کو کچھ بھی بتا دینے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔ اس نے جھکے سر کے ساتھ بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔ حالانکہ وہ اب بھی خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا لہجہ اور آواز بھی کانپ رہی تھی۔

”اس گھر میں عجیب، عجیب واقعات ہوتے ہیں۔ یہ گھر شادی شدہ جوڑوں کے لیے بڑا ہی منحوس ہے۔ یہ صرف میں نہیں کہتی بلکہ یہاں کی ہاؤس فراؤ (عیسیٰ کی ماما) بھی کہتی تھیں۔“ نینی نے خوف زدہ لہجے میں دھیرے، دھیرے بتانا شروع کیا تھا جبکہ مالا جو خود کو بڑا بہادر بنا کر نینی سے

چھپائے کسی سے فون پر بات کرنے میں مصروف تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ اس نے دور سے ہی کسی کے آنے کی آہٹوں کو محسوس کر لیا تھا تبھی فون کو آف کر کے گردن موڑے مالا کو دیکھنے لگی تھی۔ مالا کو اس کے تاثرات کچھ عجیب لگے تھے۔ گویا اسے مالا کی بد اخلاقت سخت گراں گزری تھی۔ اور اس کا موڈ بھی کچھ بڑ گیا تھا۔ تاہم وہ منہ سے تاگ (ہیلو) تک بھی نہیں بولی تھی جو اس کے معمول کا ایک حصہ تھا۔ مالا کو وہ کچھ کھوٹی، کھوٹی اور کسی الجھن میں ڈوبی نظر آئی تھی پھر کچھ ہی لمحوں میں اس نے گویا حواسوں میں آکر مالا کو ہیلو کہا تھا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

”تم بھی سویرے اٹھنے کی عادی ہو۔“ نینی نے بہ مشکل مسکرانے کی کوشش میں باچھیں یہاں سے وہاں تک پھیلانی تھیں۔ مالا کو اس کا زبردستی مسکرانا بھی برا لگا تھا۔ بالکل عجیب سا۔

”ہاں..... اور شاید تم بھی۔“ مالا کو جواب میں کچھ تو بولنا ہی تھا سو مالا کا سوال سن کر نینی نے بے ساختہ اثبات میں سر ہلایا۔

”کسی سے بات کر رہی تھیں؟“ اسے خاموش دیکھ کر مالا نے گفتگو مزید آگے بڑھائی تھی۔ تب وہ کچھ گھبرا کر ہاں کہنے کے بعد ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔ مالا نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ یقیناً نینی اپنے کسی بوائے فرینڈ سے گپ شپ کر رہی تھی سو مالا کی انٹری نے اسے کچھ بد مزہ سا کر دیا تھا۔ اب مالا، کے سوال پر وہ بجائے جواب دینے کے پیروں سے گھاس مسلنے لگ گئی تھی۔ سو مالا نے اس تمہید پر لعنت بھیج کر سیدھے سیدھے رات کا قصہ چھیڑ دیا تھا جسے سن کر وہ خوف سے پہلی پڑ گئی۔ رات کو بھی نینی کا رد عمل یہی رہا تھا۔ وہ مالا سے بھی زیادہ خوفزدہ تھی اور یقیناً ڈر پوک بھی بہت تھی۔

”نینی! کیا پہلے بھی رات کو اس قسم کے واقعات پیش آچکے ہیں؟“ مالا اپنے دوسرے کو ختم

نے اپنی عقل کے مطابق رائے دی تھی۔ چاچو کو سبے انتہا غصہ آ گیا۔ انہوں نے جھڑک کر نینی کو باہر جانے کے لیے کہا تھا۔

”یہ قوم.....“ چاچو نے بہ مشکل خود کو غصہ کرنے سے باز رکھا تھا۔ ”اس چیز کو نہیں ماننے..... جس کو ماننا چاہیے..... وجود لاریب سے غافل ہیں اور بھوت پریت پر اندھے اعتقاد.....“ نینی کے اٹھ کر چلے جانے کے بعد بھی چاچو غصہ کرتے رہے تھے۔ پھر ہوا یوں کہ نینی ایک مرتبہ پھر ڈرتے، ڈرتے واپس آ گئی۔

”سر.....! مجھے باہر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“ اس نے اتنی بے چارگی سے کہا کہ چاچو اور مالا دونوں کو ترس آ گیا۔ یوں نینی اور مالا نے رات چاچو کے کمرے میں جیسے تیسے گزار دی تھی اور صبح ہوتے ہی نینی نے گویا دوڑ لگا دی۔ یہ یواریا میں گزرنے والی راتوں سے بھی خوفناک اور بھیانک رات تھی۔ مالا کو پوری رات نیند نہیں آئی تھی اور صبح بھاری سر کے ساتھ نماز ادا کرنا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ چاچو تو مالا سے بھی پہلے اٹھ کر نماز ادا کر چکے تھے..... اور اب اپنی تسبیحات پڑھنے کے بعد معمول کے مطابق دوبارہ سو چکے تھے۔ تاہم مالا اٹھ کر باہر چلی آئی تھی۔ رات کا منظر ایک پل کے لیے بھی مالا کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ کارڈور کے آخری کونے کو دیکھتے ہوئے اس نے بے ساختہ جھرجھری لی تھی۔ رات کی بھیانک ساعتیں ایک مرتبہ پھر لگا ہوں کی چلیوں میں جم گئی تھیں۔ وہ بہ مشکل خوف سے چھپا چھڑا کر باہر آئی تو نینی کو تالاب کے کنارے پر بیٹھا دیکھ کر کچھ متحیر رہ گئی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر وہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی تالاب کی طرف آئی۔ اسے لگا نینی سر جھکائے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہے مگر یہ مالا کی خام خیالی تھی۔ قریب آنے پر پتا چلا تھا نینی گھٹنوں میں منہ

عالم تھا۔ مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا..... کارڈور میں اب کوئی بھی بولتا ہوا سا یہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ لاؤنج کے لاک جب چاچو نے چیک کیے تو مالا گویا دنگ رہ گئی تھی۔ دونوں آٹو بینک لاک بند تھے۔ چاچو کچھ متحیر سے پلٹے۔

”مالا.....! میری جان، یہاں تو کچھ بھی نہیں۔“ انہوں نے پھر سے اسے ساتھ لگا کر چوما تھا۔ نسلی دلا سادینے کی کوشش کی تھی۔ وہ اسے سمجھا رہے تھے کہ شاید اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے مگر مالا قطعاً ماننے کو تیار نہیں تھی۔

”میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے چاچو.....! یہاں ابھی کچھ دیر پہلے کوئی تھا۔“ وہ بری طرح سسک رہی تھی اور نینی بھی سر ہلا کر گویا تائید کر رہی تھی۔

”لائٹس آن تھیں۔“ نینی نے یقین دلانے والے انداز میں کہا تھا..... مگر چاچو نے اسے ڈانٹ دیا۔

”تم نے بے پروائی سے آن کر دی ہوں گی..... اب اسے مزید خوف زدہ مت کرو۔“ چاچو کے غصے کو محسوس کر کے نینی چپ کر گئی تھی جبکہ مالا قطعاً اسے کوئی بھیانک خواب نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کچھ دیر پہلے گھر میں کوئی آیا تھا؟ کون آیا تھا؟ اور پلک جھپکنے کی دیر میں کیسے چلا گیا؟ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔

”تمہارا وہم ہے بیٹا.....“ چاچو نے پیار سے اسے سمجھایا۔ ”صدیوں سے یہاں اس گھر میں رہ رہا ہوں..... ایسا کبھی نہیں ہوا۔“ وہ اسے برابر سلی دے رہے تھے پھر مالا کو دوبارہ اپنے کمرے میں لے آئے۔ نینی بھی ان کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

”کیا پتا، بھوت پریت میں سے کوئی ہو، اپنی دنیا سے بھٹک کر ہماری دنیا میں آ گیا ہو.....“ نینی



گیا۔ وہ آتے جاتے مالا کو تنگ کرتا۔  
 ”پھر دوبارہ سے سہیلیوں نے ملاقات نہیں کی؟“ اس کی شرارت مالا کو غصہ دلا دیتی تھی۔ غالباً سہیلیوں سے مراد وہی نسوانی آوازیں تھیں جس نے مالا کو کاریڈور کی طرف آنے سے روکا تھا۔ مگر سچ تو یہ تھا جسے سب مالا کا وہم کہہ رہے تھے وہ کوئی وہم نہیں تھا بلکہ جاگتی آنکھوں دیکھنے والا بھیا تک خواب تھا۔ مالا نے اس روز کے بعد کئی مرتبہ کمرے کے باہر آئیں سنی تھیں۔

اس رات کے بعد لائٹس آن ہونے والا واقعہ تو نظر کے سامنے نہیں آیا تھا مگر ایک ایسی انہونی ہوئی جسے کسی کا ذہن قبول کرنے والا نہیں تھا۔ صحیح معنوں میں چاچو اور عیسیٰ کو بھی اس واقعہ نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ جو مالا کی باتوں کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے ایک دم انتہائی متشکر ہو گئے تھے بلکہ ان کی راتوں کا سکون اور نیند اڑنے لگی تھی۔

ہوا کچھ یوں کہ مالا کو اس رات بھی اتفاقاً اکیلے رہنا پڑا تھا، اس شب نئی، مالا کے کمرے میں ہی سو رہی تھی کچھ دیر پہلے عیسیٰ نے کال کر کے ”سب خیریت ہے؟ کوئی مسئلہ تو نہیں۔“ اس قسم کی بہت سی باتیں پوچھی تھیں۔ تب تک کوئی مسئلہ نہیں پیش آیا تھا۔ مسئلہ تو فون بند کرنے کے بعد پیش آیا۔ کچھ دیر وہ ریسیور پکڑے بیٹھی رہی پھر جیسے کسی غیر مرنی قوت نے اسے بستر سے اٹھا دیا۔ وہ غیر ارادی طور پر کمرے میں ٹپلنے لگی تھی۔ جب عیسیٰ گھر میں ہوتا تب اسے کسی بھی قسم کا خوف لاحق نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی ایسے عجیب و غریب واقعات پیش آتے تھے۔ اسے لگتا تھا، عیسیٰ کے منظر سے ہٹتے ہی اس کی زندگی بے ترتیبی کا شکار ہونے لگتی تھی۔ جیسا کہ اس وقت اتنا عجیب واقعہ پیش آیا تھا، مالا کمرے میں ٹپل رہی تھی۔ جب اس نے اپنے روم کی واحد

ذہن پر ایک دم بوجھ آ پڑا تھا۔ چاروں طرف سائیں، سائیں کی آوازیں ابھر رہی تھیں اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ گویا کوئی نادیدہ چہرے اور آنکھیں اسے گھور رہی ہیں۔ اس نے بے ساختہ نین کی ہاتھ تھام لیا تھا، اسے رات کو کاریڈور سے آنے والی آواز پھر سے سنائی دے رہی تھی۔ ”زیخت“ (خبردار) مالا کے کانوں میں نوکیلے کانچ چبھ رہے تھے۔ جیسے اس وقت بھی وہ نادیدہ مخلوق انہیں خبردار کر رہی تھی کہ ہم یہیں آس پاس ہیں۔ اسی گھر میں رہتے ہیں۔ یہ ہمارا ٹھکانا ہے۔ یہاں کوئی عورت مستقل نہیں رہ سکتی۔ ہم اسے یہاں رہنے نہیں دیں گے۔ کم از کم مالا کو اپنے آس پاس یہی جھنجھٹا ہٹ سنائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

رات کا واقعہ اتنا معمولی نہیں تھا جسے اتنی آسانی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا مگر چاچو نے ایسے ہی کیا تھا۔ گویا ان کے نزدیک رات کا واقعہ مالا کے وہم یا خواب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ حالانکہ نئی کے چلے جانے کے بعد بھی وہ چاچو سے کرید کرید کر سوال کرتی رہی تھی اور ہر دفعہ بات کو گھما پھرا کر اس گھر میں رہنے والی کسی نادیدہ مخلوق تک لے آتی تھی مگر چاچو کمال ذہانت سے اس کی بات کو بدل دیتے تھے یا تو وہ مالا کے خوف و ہراس کی وجہ سے کچھ چھپا رہے تھے یا پھر چاچو اس قسم کے واقعات اور انہونیوں کے عادی ہو چکے تھے جو بھی تھا، مالا کو وہ ہرگز بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے تھے..... بلکہ ابھی تک اس کے رات والے وہم کو انجوائے کر رہے تھے جبکہ مالا اندر ہی اندر سخت جھنجھلاہٹ کا شکار تھی۔

ایک طرح سے یہ بات مذاق میں ٹال دی گئی تھی۔ اتنا سنجیدہ موضوع مذاق کا نشانہ بن گیا تھا پھر عیسیٰ کو گویا اسے چھیڑنے کے لیے ایک اور موقع مل

آواز میں بتا رہی تھی۔ مالا ایک دم پھر سے دہل گئی۔ ”رات سے پہلے مجھے بھی ایسا نفل نہیں ہوا۔“ مالا زرب بڑ بڑا رہی تھی تب نئی نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا تھا۔

”پہلے تم کو اس لیے تنگ نہیں کیا گیا کہ یہاں رہنے والے لوگ مہانوں کو کچھ نہیں کہتے..... اب ان کو سمجھ آ گئی ہے کہ تم مستقل یہاں رہو گی سو وہ اپنا آپ دکھانے لگے ہیں۔“ نئی بہت سنجیدگی کے ساتھ مالا کے حواسوں کو معطل کر رہی تھی۔ وہ خود بھی بہت پریشان تھی، رات کے واقعے نے اسے بھی سخت خوف زدہ کر رکھا تھا۔ اس کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید وہ اس نوکری کو لات مار کے چلی جاتی مگر مسئلہ یہ تھا کہ کسی اسٹور یا پمپ پر جا کر کرنا بہت تکلیف دہ، پراذیت کام تھا۔ اڑتالیس گھنٹے کی سخت ڈیوٹی تھی اور نئی اتنا مشکل کام نہیں کر سکتی تھی جبکہ اس پاکستانی فیملی کے ساتھ کام کرتے ہوئے اسے گئی سال گزر چکے تھے۔ مناسب تنخواہ، کھانا فری اور کام بھی مشکل نہیں تھا۔ خصوصاً یہ لوگ ہر تہوار پر اضافی تنخواہ، بونس وغیرہ بھی دیتے تھے، عید، شب برات پہ نئے کپڑے بھی لے دیتے، اکثر بچا ہوا سارا کھانا وہ گھر لے جاتی تھی پھر اتنے اچھے لوگ تھے کہ ڈانٹ ڈپٹ، روک، ٹوک بھی نہیں کرتے تھے پھر ذرا سے خوف اور غیر معمولی واقعات سے ڈر کر وہ کیسے اتنی اچھی نوکری چھوڑ سکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ مالا کو اپنی مجبوری کے متعلق بتا رہی تھی۔

”کبھی کبھی تو دن کو بھی برآمدے میں کسی کے چلنے کی آواز آتی ہے، مجھے اتنا ڈر لگتا ہے کہ حد نہیں..... مگر سر کو بھی نہیں بتا سکتی۔ وہ میری بات کا یقین نہیں کرتے۔“ نئی نے خوفزدہ لہجے میں بتایا۔ گویا یہ صورت حال اس کے لیے بہت پریشان کن تھی۔ مالا کی خوف کے مارے ٹھکی بندھ گئی تھی۔

سوال کر رہی تھی پہلی بات پر ہی اندر سے ڈھے گئی۔ ایک عجیب سا خوف تھا جس نے مالا کو اپنے ٹھکانے میں جکڑ لیا تھا مگر وہ نئی کو خاموش نہیں کروا سکتی تھی۔ وہ نئی کو سننا چاہتی تھی۔

”میں نے اپنا لڑکپن یہیں گزارا ہے۔ ہاؤس فراؤ (مالکن) بہت اچھی تھی مگر آئے دن ان کے ساتھ کچھ نہ کچھ عجیب ہوتا تھا۔ کبھی ان کے کپڑے جل جاتے، کبھی نئے کپڑے خود بخود ڈھیلے سے نیچے گر کر ٹوٹے لگتے اور پھر صحت مند تو وہ بھی رہی ہی نہیں تھیں۔ ہر وقت بیمار رہتیں، کبھی سر میں درد، کبھی شدید قسم کا بخار، کبھی کھڑے، کھڑے چکر آنے لگتے تھے اکثر وہ راتوں کو خواب میں ڈر جاتی تھیں اور کبھی کبھار مالکن کو گھر میں چلتے پھرتے لوگوں کی آہٹیں سنائی دیتی تھیں۔“ نئی انگلیاں مروڑتے ہوئے ادھر ادھر چور نظروں سے دیکھتی کسی نادیدہ مخلوق کو دیکھ رہی تھی۔ ایسی مخلوق جو نئی کے منہ سے اپنا ذکر سن کر اسے نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔ وہ انتہائی خوف زدہ نظر آ رہی تھی اور مالا اس کی آخری بات سن کر لمحے بھر کے لیے دہل سی گئی۔

”لوگوں کی آہٹیں.....؟“ مالا کے ہونٹ کپکپا گئے تھے۔ چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی۔ اس کے کان کسی نادیدہ مخلوق کی آہٹوں کو سننے لگے تھے جیسے عجیب سی شائیں، شائیں جیسے کوئی گھاس پر چل رہا ہو، مالا نے بے ساختہ نئی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”کیا تمہیں بھی کسی کی آہٹ سنائی دی ہے؟“ اس کا وجود سوکھے پتے کے مانند کانپ رہا تھا۔ نئی اس کا سوال سن کر چپ سی کر گئی تھی پھر مالا کے دوبارہ دہرانے پر بیچینی، بیچینی آواز میں بولی۔ ”ہاں.....“ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ شدید گھبراہٹ کا شکار تھی۔ ”مجھے اکثر لاؤنج میں اور نیچے بیسٹ میں کوئی سرگوشیاں کرتا اور بولتا ہوا سنائی دیتا ہے۔“ نئی ہونٹ کاٹتے ہوئے کپکپاتی



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہریم کوالٹی، ہرمل کوالٹی، کپیریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کروڑوں لوگوں کی آوازوں میں سے بھی پلک جھپکنے کی دیر سے پہلے پہچان سکتی تھی۔ مالانے کان دیوار کے ساتھ چپکا دیے تھے۔

”ٹارگٹ تو اچھو کرنا ہی ہے.....“ یہ مرد کی آواز تھی، سنجیدہ..... برد بار اور مستحکم سی، لہجے میں یقین بول رہا تھا۔ ارادے کی پختگی نظر آ رہی تھی..... کچھ دیر بعد نسوانی آواز بھی سنائی دی۔

”ٹارگٹ مشکل ضرور ہے، پر ناممکن نہیں..... میں چاہتی تو لہجوں میں کھیل کو ایک ہی چال کے ساتھ ختم کر سکتی تھی مگر ایسی گیم کا مزہ ہی کیا جس میں مقابل کو بے خبری میں مار ڈالا جائے..... بے خبری میں ہرا دیا جائے۔ مزہ تو تب ہے کہ مات کرنے سے پہلے تڑپا تڑپا کر بار کا مزہ لوٹا جائے۔“ نسوانی آواز میں حقارت تھی، نفرت تھی، غرور تھا، زہر تھا، جانے اس کی آواز میں نفرت کے کیسے، کیسے غلیظ رنگ تھے۔ مالاکا پورا وجود سن ہو گیا تھا۔ جیسے برف کے تودوں نے اسے سن کر دیا ہو جیسے اس کا وجود برف کے گڑھے میں گر کر جم گیا ہو..... جیسے وہ برف کی کوئی دیوار بن گئی ہو، ان آوازوں کی پہچان نے مالاکا کو برف کا سردخانہ بنا ڈالا تھا۔

وہ مرجانی پھر زندہ ہوتی تب بھی ان دو لوگوں کی آوازوں کو پہچان سکتی تھی۔ وہ عالم جنون میں بھی ان دو لوگوں کی آواز کو پہچان سکتی تھی۔ وہ دو لوگ کوئی اور نہیں بلکہ آفاق اور سوزن تھے۔

مرد اور عورت کی جھنجھناہٹ اب ختم ہو چکی تھی۔ جیسے کہانی ایک دفعہ تو ختم ہو چکی ہو مگر اصل کہانی ختم کہاں ہوئی تھی؟

مالا کی خوشگوار زندگی کس کی سازشوں کا شکار ہوئی.....؟ کیا وہ ان آوازوں کو درست پہچانی تھی یا پھر.....؟ یہ سب ضرور جاننے مگر اگلے ماہ

گلاس وٹو پر پڑے آدھے سفید تالیوں کے جالی دار اور آدھے پھولدار سلک کے پردے پر کسی عکس کو سرسراتے دیکھا تھا۔ جیسے کوئی کھڑکی کے باہر کھڑا تھا..... رات کے انتہائی پہر یہ خیال کیا کم ڈراؤنا تھا کہ کمرے کی کھڑکی سے باہر کوئی وجود سانس لیتا ہو اور آپ کو دکھائی نہ دیتا ہو؟ مالاکا معمول کے مطابق دھڑکتا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ ایک غیر ارادی حرکت کے طور پر وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں کھڑکی کے دوسری طرف گویا اوٹ میں ہو گئی تھی۔ یہ سمجھے بغیر کہ جو گھر کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے، جو بند لاک کو کھول سکتا ہے، وہ کمرے میں بھی تو آ سکتا ہے، وہ کمرے میں بھی تو بلا جھجک داخل ہو سکتا تھا اور وہ جہاں بھی چھپتی، اس نادیہ مخلوق نے اسے دیکھ ہی لیتا تھا مگر عین فطرت انسانی اس نے گویا خود کو کھڑکی میں سے تاڑتے وجود کی آنکھوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ حالانکہ وہ سانس روکے دیوار سے چپکی کھڑکی تھی۔ نیچے میٹرس پہ نئی بے خبر سو رہی تھی مگر اس کے ہونٹ ایک دوسرے کے ساتھ چپکنے سے بھی گریزاں تھے سو وہ نئی کو جگانے سے بھی قاصر تھی۔

مالاکا کو لگ رہا تھا گویا یہیں کھڑے، کھڑے صدیاں بیت گئی تھیں۔ اس سے مزید سانس روکنی بھی محال ہو گئی۔ وہ دیوار سے سر چپکائے لمبی، لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ جب اسے باہر باتوں کی جھنجھناہٹ سنائی دی تھی۔ کسی مرد اور عورت کی آوازیں تھیں، مالاکا کو جیسے زمین اس کے پیروں تلے سے کھسک جائے گی..... جیسے ساتوں آسمان اس کے سر پر آن گریں گے جیسے وہ کبھی اپنے وجود کی عمارت کے ساتھ کھڑی نہ ہو پائے گی۔ اس کے کانوں نے آوازیں ہی کچھ اس قسم کی سنی تھیں۔ آسمان جیسے گر پڑا تھا اور زمین جیسے ریت کے مانند سرکے لگی تھی۔ وہ ان آوازوں کو لاکھوں، ہزاروں،



ناولٹ

پُرک وِفا

نایاب جیلانی



ساتواں حصہ



آفاق کا گھناؤنا چہرہ عیسیٰ کو دکھائے گی؟ کیا عیسیٰ کو یہ  
انکشاف ہلا کر نہ رکھ دے گا؟ وہ کس قدر اذیت محسوس  
کرے گا، اسے کتنا دکھ ہوگا؟ مگر ملا اسے آفاق کا  
کریم روپ ہر صورت دکھانا چاہتی تھی، چاہے کچھ بھی

”بیاری مالا! گنتا ہے، رات کو سہیلیوں کے  
ساتھ لمبی ملاقات ہوئی ہے۔“ وہ جو مسلسل ان آوازوں  
کے پارے میں سوچتے ہوئے سخت اذیت میں مبتلا تھی،  
عیسیٰ کی شوخ آواز سن کر بالکل ڈھے گئی تھی۔ کیا وہ کبھی



ہو جاتا، چاہے عیسیٰ یقین کرنا یا نہ کرنا..... مگر وہ آفاق اور سوزن کے ہاتھوں خود کو زبردستی بے وقوف نہیں بننے دے سکتی تھی۔ اسے آفاق کے دھوکے نے اتنی ٹھیس نہیں پہنچائی تھی جس قدر سوزن کی غلیظ سوچ نے دکھ اور اذیت میں مبتلا کیا تھا۔ بظاہر کسی ہمدرد، پُر غلوں اور نیک نیت نظر آتی تھی مگر وہ پردہ سوزن کیا تھی؟ مالا کچھ تو جان بچائی تھی اور کچھ جاننے کے قریب تھی۔ ایک بات تو طے تھی، مالا اب سوزن اور آفاق کے جھانسنے میں آنے والی نہیں تھی۔

”وہیے یار! یہ خوب صورت روٹیں اور پریاں مالا کو نظر آتی ہیں، ہمیں کیوں نہیں.....“ آفاق کی شوخ کھٹکنائی آواز مالا کو پُر اذیت سوچوں کے حضور سے کھینچ لائی تھی، وہ گم صدمہ آفاق کو دیکھنے لگی تھی۔ کیا کوئی اتنا ڈرامے باز ہو سکتا ہے؟

”سوچنے کی بات ہے، پریاں ہمیں نظر کیوں نہیں آتیں؟ ہماری غیر موجودگی ہی میں کیوں آتی ہیں۔“ عیسیٰ بھولپن کا مظاہرہ کرنا آفاق سے پوچھ رہا تھا۔ اس بات سے بے نیاز کہ سامنے بیٹھ لگا کتنا مکار اور ہوشیار ہے اور کس طرح آستین میں بیٹھ کر ڈنکے کے ارادے ہاندھے ہوئے ہے، مالا کو ایک مرتبہ پھر سوزن اور آفاق کی باتیں زہر آلود کرنے لگی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا یہیں پل دو پل میں آفاق کے چہرے پر سے نقاب کھینچ دے۔ وہ کسی غیر میری نکتے پر نظر جما کر ان الفاظ کو ترتیب دے رہی تھی جو اسے کچھ دیر بعد عیسیٰ کے گوش گزار کرنے تھے۔ مالا کو اتنی سوچ بچار میں گم دیکھ کر عیسیٰ نے کھٹکھار کر شرارتا کہا۔

”مالا ڈیر! پھر تو نہیں کوئی سہیلی دکھائی دے رہی؟“ عیسیٰ پلیٹ میں چمچ بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ ”کیا پھر کوئی پری نظر آئی؟ حسین و جمیل اور نازک اندام سی؟“ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ جگ کر رہا تھا جبکہ مالا بہت اذیت میں تھی۔ وہ اسے اپنی

تکلیف فوراً بتا دیتی اگر آفاق سامنے نہ بیٹھا ہوتا..... وہ محض آفاق کے منظر سے ہٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جوں ہی اٹھ کر وہاں سے جاتا، مالا عیسیٰ کو اس کی حقیقت فوراً کھول کر بتا دیتی۔ چاہے نتائج کچھ بھی نکلتے..... اسے پکا یقین تھا، اس گھر پر کسی آسیب کا سایہ نہیں..... یہ آفاق اور سوزن کی کوئی ملی بھگت تھی۔ یقیناً سوزن، عیسیٰ سے کوئی پرانا بدلہ لے رہی تھی..... اور مالا کو خوفزدہ کر کے اسے ٹیز کر رہی تھی مگر آفاق کیوں اس گھناؤنے کھیل میں شامل تھا؟ اپنے محسن اور دوست کے ساتھ کھلا دھوکا کر رہا تھا۔

”مالا! کیا ہو گیا ہے تمہیں یار؟“ اسے پھر کسی سوچ میں گم اور کچھ گراہ کر عیسیٰ کچھ متشکر ہو گیا تھا۔ مالا گویا ایک دم ہڑبڑا گئی تھی۔

”تم اس معاملے میں اتنی سیریس کیوں ہو رہی ہو؟“ ایسا کچھ بھی نہیں، وہم ہے بس تمہارا۔“ اس نے سپاہی عیسیٰ مالا کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا تب مالا کچھ سا بچے میں چلی تھی۔

”میرا وہم نہیں، حقیقت ہے یہ سب.....“ وہ آفاق کو چھپتی نظر سے دیکھ رہی تھی، عیسیٰ کبھے بغیر نرمی سے بولا تھا۔

”ایک ہی بات کو بار بار سوچو گی تو یہ حقیقت ہی لگے گا۔ آہیں، آوازیں، دیکھو، مالا! ایک وہم کو سر پر سوار کرنے سے یوں ہی محسوس ہوتا ہے گویا سب کچھ حقیقت میں ہو رہا ہے، کبھی تم نے خیال کیا، اکیلے بیٹھنے سے ہمارے کان خاموشی کے سناٹوں کو محسوس کرتے ہیں، جیسے رنگ ہرنگ کی آوازیں آنے لگتی ہیں، اسی طرح آنکھوں کو تختی سے بند کر لینے کے بعد اندھیرے میں آہستہ آہستہ عکس ابھرتے ہیں، ہماری تصوراتی دنیا کے کئی طرح کے اور نئی قسم کے منظر ابھرتے ہیں۔ یہ ہمارا خیال ہوتا ہے۔ حقیقت سے قطعاً دور.....“ عیسیٰ بہت نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ گویا پہلے والی مذاق کی کیفیت



نزلہ چھا

”مجھے پر یاں کچھ نہیں کہتیں..... بڑا پیار آتا ہے انہیں مجھ پر۔“ عیسیٰ اتر آیا۔

”ہونہ، دھیان سے یار.....! کہیں پیار، پیار کے کھیل میں تمہیں لے نہاڑیں.....“ آفاق نے منہ بنا کر کہا تھا..... ادھر مالا دل گئی۔

”اللہ نہ کرے.....“ اس نے چپتے ہوئے لہجے میں غصے سے کہا۔ اس کا زور عمل خاصا جارحانہ تھا۔ عیسیٰ اور آفاق دونوں چونک گئے تھے۔ آفاق تھوڑا سخت زدہ رہ گیا تھا جبکہ عیسیٰ کو بات سنبھالنے مشکل ہو گئی تھی۔

”آفاق مذاق کر رہا ہے مالا!“ عیسیٰ نے نرمی سے کہا۔

”مذاق بھی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔“ وہ روکھے لہجے میں بولتی اٹھ گئی تھی جبکہ وہ دونوں کچھ ہنسنے لگے۔

”کیا اس کے حراج اور دماغ پر بھی تو اثر نہیں ہو گیا.....؟ عیسیٰ انتہائی شکر سا مالا کو چکن کی طرف جاتا رہا۔ زبرد سوچ رہا تھا۔ جبکہ آفاق کچھ سخت زدہ سا عیسیٰ کا کندھا تھپتھا کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

”کیا بات ہے مالا.....؟“ عیسیٰ جو اپنے کمرے میں آ کر کسی کام میں مصروف تھا اب مالا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کی چٹنی اہتری سمجھ سکتا تھا۔ ان دنوں وہ نہ جانے کن وہموں میں پڑ گئی تھی۔

”مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔“ بہت دیر کی کوشش کے بعد مالا نے بالآخر بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اسے آفاق کے کمرے میں کھول کر بتانے کا ارادہ کر چکی تھی۔

”کیا.....؟“ عیسیٰ بھی کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ مالا کے تاثرات ہی کچھ ایسے تھے اور جو کچھ مالا نے بتایا اسے سن کر تو عیسیٰ کا پورا وجود دل گیا تھا۔ اس نے بے چینی کے ساتھ مالا کی طرف دیکھا تھا آیا وہ

ختم ہو چکی تھی۔ اسی طرح آفاق بھی تائیدی انداز میں سر ہلاتا گویا عیسیٰ سے متفق تھا اور مالا کو وہ سراسر ڈراما کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

”ویسے عیسیٰ! مالا کچھ زیادہ وہمی ہو رہی ہے، یہ سب ٹھیک نہیں، اسی طرح تو انسانی نفسیات بھی متاثر ہوتی ہے۔“ وہ جالاک بڑی ہمدردی کے ساتھ عیسیٰ سے مخاطب تھا جبکہ عیسیٰ سنجیدگی کے ساتھ اثبات میں سر ہلا رہا تھا..... اور مالا کا دل چاہ رہا تھا کہ آفاق کا کریہ منہ فوج لے۔ اس نے ایسا متناقض زندگی میں پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔

”یہی تو اسے سمجھا رہا ہوں، جو یہ فیصل کر رہی ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا، کیا آفاق! تم نے کبھی محسوس کیا ہے؟“ عیسیٰ نے آفاق کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا، اس نے بے ساختہ نگہ میں سر ہلایا۔

”نہیں تو..... مجھے کبھی پر یاں نظر نہیں آئیں..... حالانکہ مجھے پر یاں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔“ آفاق نے بے جا رہ ساتھ ہنسیا تھا جیسے اس کی سب سے بڑی زندگی کی خواہش ابھی تک ادھوری تھی۔ مالا کو اس کی مکاری پر اب بھی غصہ آ گیا تھا مگر فی الحال وہ کچھ بھی بولنے سے قاصر تھی۔

”کاش پر یاں مالا کے بجائے مجھے نظر آتیں.....“ آفاق نے پھر منہ نوی حسرت کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب عیسیٰ نے اس کے کندھے پر دھب لگائی۔

”مت اتنی آچیں بھرو..... یہ نہ ہو کہ آج رات تمہاری باری ہو۔“ عیسیٰ نے اسے دھمکایا اور وہ دھمک بھی گیا۔

”نہیں یار! مت ڈراؤ..... میرا دل پہلے ہی کمزور ہے، پر یوں کی تاب نہیں لاسکے گا۔“ وہ سنسنا کر بول رہا تھا۔

”اتنی مت تھی بس۔“ عیسیٰ نے اس کا مذاق اڑایا۔

”تم بھی زیادہ بہادر نہ بنو، کیا پتا آج تمہارے امتحان کی باری ہو۔“ آفاق نے اسے چڑایا۔



خواسوں میں ہے یا پھر سچ سچ میں خطی ہو چکی ہے۔  
 ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟“ عیسیٰ کا پورا وجود  
 جھنجھٹا اٹھا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اس کھڑکی کے باہر  
 کوئی سایہ تھا جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا  
 تھا پھر میں نے آفاق اور سوزن کی آواز سنی تھی۔ میں  
 نیند میں نہیں تھی، نہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی  
 میں نے خود ان دونوں کی باتیں سنی تھیں۔“ مالا نے  
 ہونٹ کپکتے ہوئے ایک، ایک بات بتا دی تھی مگر  
 سامنے تو بے یقینی کا عالم ہی کوئی اور تھا۔ عیسیٰ پہلے تو  
 شاکہ زدہ گیا پھر اس کے چہرے پر ناقابل فہم تاثرات  
 ابھرے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے مالا کو دیکھے جا رہا  
 تھا۔ اتنی حیرت اور بے یقینی کے ساتھ گویا اسے پورا  
 یقین تھا کہ مالا جھوٹ بول رہی ہے یا پھر غلط بیانی  
 سے کام لے رہی ہے۔

”یہ کیا بکواس ہے مالا؟“ عیسیٰ کی آنکھوں میں  
 ناگواری کا تاثر تھا۔ اسے ایک دم مالا کی بات سن کر  
 غصہ آ گیا۔

”پلیز آپ میری بات کا یقین کریں۔“ مالا  
 ایک دم گھبرا اٹھی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا  
 کہ عیسیٰ اتنی شدت کے ساتھ بے یقینی کا اظہار کرے  
 گا۔ وہ حیرت زدہ ہو جاتا تو اور بات ہی مگر وہ تو ایک  
 دم غصے میں آ گیا تھا جیسے اسے مالا کی غلط بیانی پر غصہ  
 آیا تھا اور مالا کو ٹھنڈے سینے آنے لگے تھے۔ عیسیٰ کی  
 ناگواری بھلا وہ برداشت کر سکتی تھی؟

”کس بات کا یقین کروں؟ تمہیں نہ جانے کیا  
 ہو گیا ہے؟ اتنی بہکی، بہکی باتیں کرنے لگی ہو، بس لیٹا  
 ہوں.... کسی سائیکاٹرسٹ سے ٹائم.....“ عیسیٰ نے  
 جیسے پریشانی اور تفکر کے عالم میں سر تھام لیا تھا جبکہ  
 مالا حق دق سی بیٹھی رہ گئی۔

”تو آپ کو لگتا ہے، میں جھوٹ بول رہی  
 ہوں؟“ مالا کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئی

تھیں۔ عیسیٰ سے یہ دردناک منظر بھی دیکھا نہیں گیا  
 تھا مگر اس نے دل پر پتھر رکھ کر کشور لہجے میں کہا۔

”پھر ”سچ“ کہاں سے بول رہی ہو.....؟“ وہ  
 دکھائی سے بولا۔

”میں جھوٹی ہوں۔“ اسے انتہا کا صدمہ ہوا۔  
 ”مجھے نہیں پتا.....“ عیسیٰ نے سختی سے کہتے  
 ہوئے اپنا سر تھام لیا تھا۔ ”جب تم ایک ایسی بات  
 کرو گی جس کا سر ہو گا نہ پیر..... اور جس بات پر میں  
 قیامت تک یقین نہیں کر سکتا اسے سچ کیسے  
 کہوں.....“ عیسیٰ نے انتہائی تکلیف سے کہنا پڑ رہا ہے تم  
 نے پھر سے کوئی خواب دیکھا ہے۔“ وہ اتنا متشکر اور  
 پریشان ہو گیا تھا کہ اسے سامنے جھم جھم آنسو بہاتی  
 مالا کی موجودگی بھی سامنے بھرنے کے لیے بھول گئی تھی۔

”میں نے اپنی آنکھوں سے سایہ دیکھا اور ان  
 دونوں کی باتیں خود سنی تھیں۔“ وہ بھڑائے لہجے میں  
 بولتی بہت اذیت میں تھی۔ عیسیٰ اتنی بے دردی سے  
 اس کی بات رو کر دے گا، یہ تو اس کے گمان میں بھی  
 نہیں تھا۔ وہ اتنی تکلیف محسوس کر رہی تھی جس کی انتہا  
 کوئی نہیں تھی۔

”میں کیسے یقین کروں..... تم..... تم پاگل تو  
 نہیں ہو گئیں؟“ عیسیٰ تیز لہجے میں غصے سے بولا۔

”سوزن اور آفاق ہی تھے، میں ان کی آواز  
 لاکھوں میں بھی پہچان سکتی ہوں۔“ مالا اب کمزور ہو  
 کر عیسیٰ کو خود سے بدگمان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب  
 اسے ہر صورت عیسیٰ کو یقین دلانا تھا، چاہے کچھ بھی  
 ہو جاتا۔ عیسیٰ اسے جھوٹا سمجھنے لگتا یہ تو وہ کبھی گوارا نہیں  
 کر سکتی تھی۔

”سوزن اور آفاق کیسے ہو سکتے تھے؟“ عیسیٰ  
 گویا زچ ہوا اٹھا۔ ”سوزن سنڈکیٹ کے ہمراہ شہر  
 سے باہر سے اور آفاق.....“ عیسیٰ بولتے ہوئے ایک  
 دم لب بلیچ کر غصہ ضبط کرنے لگا تھا پھر کچھ دیر کی



نہ لے چکا

ملاقاتوں کا ریلیشن نہیں رہا تھا پھر عیسیٰ کے گھر میں ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جبکہ مالا جو بات کر رہی تھی اسے عیسیٰ بھلا کیسے مان لیتا.....؟

☆☆☆

اس کی اتنی اہتر کنڈیشن دیکھ کر علی عیسیٰ نے ماہر نفسیات سے رجوع کرنا شروع کرنا شروع کیا۔ وہ ہر ڈاکٹر سے یہی کہتا..... "میری بیوی وہم اور خوف کا شکار ہے۔" اس کے لیے مالا کی صحت ہر دنیاوی کام سے اہم ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ دفتر میں کم اور ڈاکٹرز کے کلینک میں زیادہ خوار ہونے لگا تھا۔ کبھی پایا کو اسپتال لے کر بھاگتا، کبھی مالا کو..... اس کی زندگی کا مقصد گویا یہی رہ گیا تھا۔ مالا، عیسیٰ کی حالت دیکھ، دیکھ کر کڑھتی تھی پھر خود ہی اس نے ایک پیاز جتنا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہی کہ وہ عیسیٰ کو اپنے خوف کے متعلق کچھ نہیں بتائے گی۔ اس فیصلے نے مالا کو مطمئن کر دیا تھا اور اب وہ اندر ہی اندر چھپتی رہتی مگر عیسیٰ کو کچھ نہ بتاتی۔ اس کی بہتر حالت کو دیکھ کر آفاق سمیت چاچو اور عیسیٰ نے بھی سکھ کی سانس لی تھی۔ پھر کچھ دن بہت اچھے گزرے۔ عیسیٰ نے مالا کو دوبارہ شولے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب وہ پھر سے شولے چلی جاتی۔ کلاسز اینڈ کرتی..... اس کا کورس بھی مکمل ہونے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ پھر ایک دن اس نے میکس کو پکڑ لیا..... وہ اور ہیرا کفنے سے لوٹ کر آئیں تو میکس پر ان دونوں کی نظر پڑ گئی تھی پھر مالانے میکس کے وہ لٹے لیے کہ وہ تو بے چارہ حق دق رہ گیا تھا۔

"تم بواریا کے انسٹی ٹیوٹ میں ڈیج پڑھاتے تھے اور اب یہاں ڈیج سیکھتے ہو، یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی ہے" مالا کے طنز نے میکس کو بوکھلا دیا تھا تاہم وہ گھبرایا نہیں تھا۔ مالا جو سمجھ رہی تھی وہ میکس کو لاجواب کر دے گی، اس کا جواب سن کر چپ سی ہو گئی۔

"میں یہاں ڈیج پڑھنے نہیں آتا، یہ تم سے کس نے کہہ دیا، ضروری تو نہیں، میں یہاں ڈیج ہی

خاموشی کے بعد بولا۔

"اور آفاق میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں اسٹین (ٹی) میں تھے۔ ایک پل کے لیے وہ میری نظر سے دور نہیں ہوا اور نہ وہ چھلاوا ہے جو رات کے چند گھنٹے مجھے چمکا دے کر دوبارہ میرے ہی گھر میں آ کر سوزن سے ملاقات کرے..... پھر اسے سوزن سے ملاقات کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سوزی کسی غیر مسلم سے ہی شادی کرے گی، کسی مسلمان سے کبھی نہیں..... پھر وہ ایسی لڑکی نہیں جو بوائے فرینڈز کے ساتھ وقت گزاری کرے..... اور سب سے بڑی بات ان دونوں کو "ملاقات" کرنا ہوتی تو کم از کم میرا گھر استعمال نہیں کرتے..... پھر بتاؤ، جب آفاق سارا وقت میرے ساتھ رہا..... ہم پوری رات ٹرین میں سفر کرتے رہے ہیں، نہ اسے نیند آتی ہے سفر میں نہ مجھے..... تو پھر آفاق کوئی جنات کی قوم سے ہے جو لمحوں میں اڑتا ہوا ہر جگہ پہنچ جائے۔" عیسیٰ کا تلخ لہجہ اور کھری، کھری باتوں نے مالا کی پوری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس پہلو پہ مالانے سوچا ہی کہاں تھا.....؟ بلکہ ان دونوں کی آواز میں سن کر وہ ایسی حواس باختہ ہوئی تھی کہ فقط ایک ہی پہلو پر سوچ رہی تھی۔

"عیسیٰ! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔" وہ بھل بھل رونے لگی تھی۔ عیسیٰ سر اٹھا کر جیسے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا پھر کرنٹ کھا کر سیدھا ہوا۔ دوسرے ہی پل وہ کار پٹ پہ جھکا مالا کو چپ کر دیا ہوا تھا۔

"کیا پاگل پن ہے مالا.....! میں نے یہ سب کہا تم سے.....؟" وہ اس کے آنسو پونچھتا خود بھی جیسے الجھ رہا تھا۔ گویا یقین اور بے یقینی کے درمیان متعلق تھا۔ مالا کے چہرے کو دیکھتا تو وہاں سچائی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور اگر دوسری طرف غور کرنا تو دماغ چکرانے لگتا تھا، آفاق اور سوزن دو الگ دنیاؤں کے لوگ تھے۔ ان کے درمیان کبھی



بہنی تو وہاں عیسیٰ اور چاروں دونوں کو دیکھ کر ایک دم رک سی گئی۔ لاؤنج کے ایک صوفے پر سر جھکائے آفاق بھی بیٹھا تھا جبکہ عیسیٰ بہت غصے کے عالم میں زہر لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ مالا کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔

”پروفیسر کیوں آیا تھا یہاں.....؟ آپ نے اسے دھکے دے کر کیوں نہیں نکالا.....؟“ عیسیٰ کی زہر میں بھی آواز سن کر مالا ٹھک گئی تھی۔

”تو کیا وہ آدی پروفیسر بشر تھا.....؟“ مالا گویا سر تاپا حیران رہ گئی تھی۔ پروفیسر بشر کو دیکھنے کی سعادت سے محروم رہنے کا بھی اسے قفس تھا۔ وہ ذرا آگے بڑھ کر پردے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ اس نے کان اندر کی آواز پر نکادے تھے۔ چاچو بھی آواز میں گویا سنائی نہیں کر رہے تھے۔

”برائی روٹی کا لحاظ تھا..... پھر گھر سے کیسے نکال دیتا.....؟ میری احوال پر سی کے لیے آیا تھا۔“ چاچو کی آواز بہت ہلکی تھی جیسے انہیں بھی پروفیسر کا آنا پسند نہیں آیا تھا مگر وہ مہمان کا لحاظ کر کے خاموش ہو گئے تھے۔

”شیطان کی اولاد ہے..... ایک دم خبیث انسان..... پھر کسی سازش کے تحت آیا ہوگا..... آئندہ مجھے پتا چلا کہ وہ میرے گھر آیا ہے تو یہ اس کے حق میں بالکل اچھا نہیں ہوگا.....“ عیسیٰ نے گویا وارننگ دی تھی پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ چاچو بے چارے سنجیدہ سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ بس لاؤنج میں آفاق رہ گیا تھا۔ جس نے مالا کی موجودگی محسوس کر لی تھی پھر اسے باہر کی طرف جانا دیکھ کر خود بھی چیخے آ گیا تھا۔ مالا تالاب کی طرف جا رہی تھی۔ پھر تالاب کے اونچے کنگرے پر بیٹھ کر سر جھکائے کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ آفاق بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا تھا پھر جس طرح مالا قدموں کی آہٹ پر حواس باختہ ہو

پڑھوں..... مجھے کچھ اور نہ نہیں سیکھنے کا بھی چسکا ہے۔ میں آج کل، عربی اور افریقی لینگویج کورس کر رہا ہوں.....“ میکس نے اطمینان سے کہا تھا۔ مالا اپنا سامنے لے کر رہ گئی تھی اور میکس یوں دانت نکال رہا تھا جیسے مالا کو لاجواب کر کے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

”اور تم مون کو کب سے جانتے ہو.....؟“ مالا نے پھر سے ذرا چپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کافی عرصہ پہلے سے.....“ میکس نے.... پر وائی سے بتایا تھا پھر جیسے کچھ یاد آنے پر بولا۔

”تم نے میری برتھ ڈے پارٹی پر ضرور آنا ہے..... اور ہیرا کو تو کہنے کی ضرورت نہیں۔“ اب وہ ہمیشہ کی طرح سادگی سے بتا رہا تھا بلکہ یاد دل رہا تھا کہ مالا کہیں بھول نہ جائے..... ہیرا نے پرجوش انداز میں حامی بھر لی تھی جبکہ مالا کچھ الجھتی ہوئی پلٹ آئی۔

جب وہ گھر آئی تو تین نے بتایا کہ چاچو کے کچھ مہمان آئے ہیں، مالا نے یہی سمجھا تھا کہ مہمان دو چار تو ضرور ہوں گے مگر ڈرائنگ روم میں جھانکنے کے بعد اسے پتا چلا کہ مہمان صرف ایک ہی ہے اور وہ بھی عیسیٰ کا انتہائی ناپسندیدہ..... مالا کو مہمان کی خصوصیات کے بارے میں علم نہیں تھا۔ وہ کون تھا.....؟ اور اتنے عرصے میں پہلے کیوں نہیں آیا؟ مالا کو ان باتوں کی طرف دھیان دینے کی بھلا ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے معمول کے مطابق ڈرائنگ روم میں چائے کے لوازمات بیچے اور پھر خود نماز ظہر ادا کرنے لگی تھی۔ آخری سلام پھیرنے کے بعد اس نے کوئی ناگواری آوازیں ابھرتی سنی تھیں جیسے کوئی غصے میں تیز تیز بول رہا تھا۔ مالا نے جاننا نہ لپٹ کر فیلف پر رکھی پھر سلیپر پہن کر جلدی سے باہر آئی۔



توک وفا

”کچھ نہیں، بہت کچھ.....“ مالا دو ٹوک لب لہجے میں بولی تھی تب آفاق شوخ سا ہو گیا۔  
 ”پر یاں نظر آئیں تو بات بھی بنے.....“ وہ مسکراتے ہوئے من ہائیم کے ہادلوں کو دیکھنے لگا..... گہرے ہوتے ہادلوں..... جیسے برسنے کو..... بے تاب ہوں..... مرغابیوں کے خول محو رقص تھے، سفید دودھ جیسی کونجیں گاری تھیں۔

”پر یاں بھی دکھائی دے جائیں گی۔ تمہیں فکر کس بات کی ہے؟“ مالا نے تکی سے پوچھا۔ آفاق کے انجان پن پر اسے سخت تاؤ آرہا تھا۔ جبکہ وہ اس کا سزاوار تھا۔

”میں انی سے غلط ہوں، محبت کرتا ہوں اور غمخیز بی بی ہماری شادی کروا رہا ہے، تم روحوں اور بی بیوں کے چکر سے نکلو تو کچھ نظر بھی آئے۔ تمہیں اپنی بی بی بہن بتایا تھا اور یہی پانچ سگی بہنوں سے زیادہ پروٹوکول دیا..... پر تم تو سوئگی بہنوں سے بھی بڑھ کر بے مروت تلی ہو۔“ آفاق بے ساختہ شکوہ کراٹھا۔ دراصل مالا کے بدلتے رخ روٹنے نے بی بی کے ساتھ، ساتھ آفاق کو بھی خاصا اپ سیٹ کر رکھا تھا۔ کہاں تو وہ اتنی دلچسپی لیا..... کرتی تھی۔ اس کی شادی اور محبت کی اسٹوری میں اور کہاں اتنی بیزار ہو چکی تھی کہ بات بھی کرتی تو سات پھراٹھا کر..... یہ صورت حال آفاق کے لیے بھی بہت پریشان کن تھی۔

”تمہاری بات طے ہوگئی.....؟“ مالا گویا چیخ پڑی۔ یعنی اس کی بے خبری میں انی کی ذات پر کیسا ظلم ہونے والا تھا۔ مالا کی تو گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ تو کسی بھی صورت آفاق جیسے منافق کے ساتھ انی کو برباد ہونا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”نہیں..... ہونے کے قریب پہنچ گئی تھی مگر تمہاری وجہ سے سب پروگرام چوہٹ ہو گیا۔“ آفاق کا منہ اتر گیا تھا۔ تاہم وہ اسی بات پر خوش تھا

کر چوکی تھی۔ آفاق سے یہ منظر بھلائے نہیں بھولا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آئی تھی..... یعنی اس کے چہرے پر جو پہلا تاثر ابھرا تھا وہ خوف کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ وہ سہم گئی تھی۔ یعنی آپٹیں اسے سہا دیتی تھیں۔ وہ ذہنی طور پر شکستہ ہو رہی تھی۔ اس بات سے کوئی واقف نہیں تھا، وہ اپنے خول میں سمٹ رہی تھی اس بات سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ فی الوقت مالا، آفاق کو دیکھ کر کچھ سنبھلی تھی۔ یہ قدموں کی چاپ کسی غیر مرئی مخلوق کی نہیں تھی، ابھی اس کے چہرے پر سکون اتر آیا تھا مگر یہ سکون لمبائی تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ غصے کے ساتھ آفاق سے مخاطب تھی۔

”کیوں آئے ہو.....؟ کوئی کام تھا تو نیلی سے کہتے.....؟“ مالا کے چہرے پر غصے کی شکنیں تھیں۔ آفاق کچھ اپنا سامنے لے کر رہ گیا تھا۔ وہ وجہ جاننے سے قاصر تھا کہ مالا کی اسے دیکھ کر طبیعت کیوں بگڑ جاتی ہے اور مالا کو کھلی کئی راتوں کی اذیت بھلائے نہیں بھولتی تھی پھر اس کی مکاری اور سوزن کے ساتھ اس گھر میں ملاقات نے تو مالا کے حواس معطل کر دیے تھے پھر سونے پر سہانگ بی بی اس کی بات سرے سے ماننا ہی نہیں تھا۔

”مالا! تمہیں کوئی الجھن ہے تو بتاتی کیوں نہیں.....؟ کیا حقیقت میں تمہیں کچھ سناکی یا دکھائی دیتا ہے؟“ وہ شکر سا پوچھ رہا تھا۔ تب مالا نے سر جھٹک کر کہا۔

”ہاں..... نظر تو بہت کچھ آتا ہے۔“ اس کا انداز بلا کا معنی خیز تھا۔

”کیا.....؟“ وہ سمجھے بغیر بولا۔

”بہت جلد جان جاؤ گے.....“ مالا نے جیتے ہوئے لہجے میں کہا تھا تب آفاق ایک مرتبہ پھر سمجھے بغیر کہہ رہا تھا۔

”کیا مجھے بھی کچھ نظر آئے گا.....؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔



کہ مالا اس کے ساتھ بات تو کر رہی ہے۔ ورنہ اتنے دن سے آفاق کو دیکھ کر راستہ بدل جاتی تھی۔ سیدھے منہ بات نہیں کر رہی تھی۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔  
”میری وجہ سے؟“ مالا چونکی۔

”تو اور کیا.....؟“ آفاق نے پھر سے براسا منہ بتایا۔

”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”لو جی..... کیوں کا بھلا کیا سوال.....؟ عیسیٰ کو ڈاکٹرز کے ہاں چکر لگانے سے فرصت ملے تب ناں.....“ آفاق پھولے منہ سے گویا ہوا۔ وہ سر جھکائے گھاس بوجھ رہا تھا جبکہ چہرے پر مصنوعی خنکی تھی۔

”تمہارے گھر والے مان گئے.....؟“ مالا متحیر رہ گئی۔ تو گویا اس کی بے خبری میں اتنا بڑا نقصان ہونے والا تھا۔ صد شکر کہ اس کی بیماری میں معاملہ التوا میں پڑ گیا تھا۔

”عیسیٰ نے بات کی تھی، مانتے کیوں نہیں.....“ وہ اترا یا۔ ”اب تم روجوں کو بھاڑ میں جھونک کر چلنی

سے ٹھیک ہو جاؤ..... پھر چھوٹی سی نکاح کی تقریب رکھیں گے۔“ آفاق لمحوں میں نرجوش ہو چکا تھا۔ مالا کی کیفیات سمجھے بغیر اپنا اگلا پروگرام اسے بتا رہا تھا جبکہ مالا کچھ دیر کے لیے تو کم صبر ہو کر رہ گئی تھی۔ تو گویا اپنی کوڑ بے سے وہ ہرگز بچا نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنی کو بھلا بھاتی بھی کیسے؟ اس کی می تو گویا سب تیاریاں مکمل کر چکی تھیں..... عیسیٰ اور آفاق کے جاتے ہی وہ اپنی کے گھر آگئی۔ ہمیشہ کی طرح اپنی کی می اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ وہ ایک بااخلاق، مہمان نواز خاتون تھیں اور مالا کو تو خصوصی اہمیت دیتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہنسی مسکراتی اپنی بھی آگئی تھی۔ اس کے انتہائی نفیس نقوش میں سرخیاں اتر آئی تھیں۔ چمکیلی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے لب تار ہے تھے

کہ وہ اپنی شادی کے قریب آنے پر بہت خوش تھی۔ مالا سے اس کی خوشی میں بد مزگی گوارا نہ ہو سکی تھی مگر وہ اتنی بیماری لڑی کہ بے خبری کے عالم میں برباد ہونا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بہت دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد مالا کو بالآخر بولنے کے لیے کچھ الفاظ مل ہی گئے تھے پھر اس نے جھپکتے ہوئے گنگو کا آغاز کر لیا تھا۔

”تمہیں آفاق سے بہت محبت ہے انی.....؟“

مالا نے ذرا تھک کر پوچھا تھا۔ حالانکہ یہ سوال پوچھنے کی ضرورت تو ہرگز نہیں تھی۔ انی کی خوشی اس کے اندر کا حال بتا رہی تھی پھر اس کی ہر بات آفاق سے شروع ہو کر آفاق پر ختم ہوتی تھی۔ مالا کا سوال سن کر وہ اس وقت بھی چونکی نہیں تھی بلکہ بہت جوش کے عالم میں بتانے لگی۔

”ہاں..... بہت محبت کرتی ہوں، آفاق ہے بھی تو بہت اچھا.....“ اس نے چمکتی آنکھوں سے بتایا۔ وہ اتنی خوش اور نرجوش تھی کہ مالا کا ارادہ ڈالنے میں ڈول سا ہو گیا۔

”کسی کے اچھا ہونے کی کب کوئی دلیل ہوتی ہے؟“ مالا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

”یار کسی کی اچھائی کو دیکھنے کے لیے دلیل نہیں ڈھونڈتے بلکہ اس کی شخصیت کی اچھائیاں دیکھتے ہیں اور آفاق بہت اچھا ہے۔“ انی نے گویا اسے سمجھانے کے ساتھ، ساتھ آفاق کی تعریف کرنا بھی ضروری سمجھا تھا۔

”اور اچھائی کو ناپنے والا کوئی پیمانہ ہوتا ہے؟“ مالا نے الجھ کر بھی پوچھا تھا۔ انی اس کی بات پر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

”میڈیشن مالا.....! اچھائی کو ناپنے والا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ بس دیکھنے والی آنکھ ہوتی ہے جو اچھائی اور برائی کو کھوج لیتی ہے۔“ انی نے کچھ دیر بعد بہت نرمی سے گویا اسے سمجھایا تھا جبکہ مالا کچھ اور الجھ گئی تھی۔



**نرگہ وفا**

نے کچھ سنجیدگی بھرے لہجے میں جتایا تھا۔ ”تم وہ بات کرو جو کہنا چاہتی ہو۔“ وہ سنجیدہ تھی جبکہ مالانے بھی چپ رہنا مناسب نہیں سمجھا۔

”بیاری انی اتم مجھے بہت عزیز ہو..... میں چاہتی ہوں تمہارا بھائی واپس آجائے، آفاق کے حوالے سے کچھ اور چھان بین کر لو، عمر بھر کے فیصلے اتنی جلدت میں نہیں کرنے چاہئیں۔“ مالانے اسے رساں سے سمجھایا تھا تب انی گویا اس کے خدشات سمجھ گئی تھی۔

”مجھے تمہارا فکر بہت اچھا لگا..... میرے دل میں تمہاری محبت اور بھی بڑھ گئی ہے۔“ انی نے سچے دل سے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”مگر یاہ! میرے بھائی کے آنے میں بہت وقت ہے، پھر بھائی اور مگی دونوں کا مشترکہ فیصلہ ہے۔ آفاق نے بھائی سے بات کر لی ہے۔ اسے بھی آگے بہت اچھا لگا ہے کیونکہ عیسیٰ کی گارنٹی بھی موجود ہے۔“ وہ مسکرا کر گویا اسے تسلی دے رہی تھی۔

”انی..... کیا خبر، وہ پیشینگی کا لالچ بھی رکھتا ہو۔“ مالانے کچھ اور دوسو سوں کا اظہار کیا تھا جس پر انی کچھ اور بھی مسکرائی تھی بلکہ تہقیر لگا کر ہنس پڑی تھی۔ اس کے قہقہے نے مالاکو کچھ اور ہونق کر دیا تھا۔ وہ اس کے قہقہے کو سمجھ نہ پائی تھی۔

”اگر ایسی بات ہے تو کچھ غلط نہیں..... اسے پیشینگی مل جائے گی مگر اتنی آسانی سے نہیں۔“ انی ابھی تک ہنس رہی تھی پھر اسے مزید بتانے لگی۔

”یار! میری نانی بھی میرے پاپا کو پیشینگی ملنے پر خدشات کا شکار تھیں۔ وہ پاپا کے پھپر ز نہیں بننے دے رہی تھیں۔ انہیں خدشہ تھا پھر ز بننے کے بعد پاپا مگی کو اور ہمیں چھوڑ جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ پاپا ہمیشہ ہمارے رہے، نانی کے خدشے بے بنیاد تھے۔ سو آفاق بھی مجھے کبھی دھوکا نہیں دے گا۔“ وہ اتنی مطمئن تھی کہ مالاکو اس کے اطمینان پر رشک آیا تھا۔

”ضروری تو نہیں ہر اچھا دکھائی دینے والا بندہ قلعے ہو۔۔۔ کیا خبر، وہ ڈرانا کرنا ہو یا اچھائی کے لباس کو پہن کر بیکس بدل کے کسی کو اپنے سازشی حال میں پھنسانا چاہتا ہو۔“ مالاکی گہری کاٹ داری بات نے انی کو کچھ چولکا دیا تھا۔ تاہم وہ کندھے جھٹک کر بے پروائی سے بولی تھی۔

”دلوں کے بھید تو بس اللہ ہی جانتا ہے۔“ وہ شاید مزید بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر مالاکا دل ابھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ بات کو کسی نہ کسی طریقے پر پھرا کر آفاق تک لانا چاہتی تھی مگر ہمت یوں نہیں ہو رہی تھی کہ اسے انی کی خوشی کو ختم کر دینے کی تکلیف بھی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ انی کا دل ٹوٹے یا وہ پریشان ہو۔

”ویسے بھی کسی اچھائی جاننے کے لیے دل کا مطمئن ہونا بھی ضروری ہے جیسا کہ میں نے خود آفاق کو پر دپوز کیا تھا اور یہ اس کی اچھائی تھی جو آج تک اس نے کسی کو بتایا نہیں..... جی! کہ مگی کو بھی نہیں..... تمہاری نیلی سے تو وہ سب کچھ شیئر کر لیتا ہے پھر یہ بھی تو دیکھو، وہ کتنا پر غلوں میں ہے، اس کی موجودگی میں کوئی مسئلہ جنم لے اور وہ اسے حل نہ کرے یہ ممکن نہیں..... میرا بھائی یہاں نہیں اور سمجھو، اس نے بہت سے ہمارے بوجھ بھار کئے ہیں۔“ انی نے نہایت عقیدت کے ساتھ آفاق کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔ ویسے بھی مالاکو لگ رہا تھا کہ انی کی آنکھوں پر آفاق کی محبت اور اچھائیوں کی پٹی بندھ چکی ہے۔ وہ اس کی بات کبھی نہیں سمجھے گی۔

”ضروری تو نہیں ہر بلند نظر آنے والا بندہ حقیقت میں بھی بلند ہو..... ہر چٹکتی چیز سونا بھی تو نہیں ہوتی۔“ مالادبے لفظوں میں بالآخر کہہ ہی گئی تھی۔

”شاید تم بھی ٹھیک کہتی ہو، پر آفاق نے کوئی دکھاوا نہیں کیا۔“ انی سنجیدگی سے بولی تھی۔ شاید وہ مالاکی بات کے اندر کی گہرائی میں اتر گئی تھی پھر اس



اس نے دل ہی دل میں اس کا اعتماد قائم رہنے اور خوشیاں برقرار رہنے کی دعا کی تھی۔

”اللہ کرے، آفاق بہت اچھا رہے تمہارے ساتھ۔“ مالا نے سچے دل سے دعا دی اور جانے کی اجازت چاہی۔

وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو عیسیٰ مسکراتا ہوا اسے سامنے سے آتا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ میں ٹرے پکڑ رکھی تھی۔ شاید وہ کچن سے نکل کر باہر آ رہا تھا۔ ٹرے میں کیک، چائے اور ٹفلس تھے۔ مالا نے فوراً آگے بڑھ کر ٹرے پکڑ لی تھی۔

”گھر میں کوئی آیا ہے؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔ وہ عیسیٰ کے پیچھے سنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ عیسیٰ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”سوزی آئی ہے۔“ عیسیٰ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ وہ اور سوزن جانے کس موضوع پر بات کر رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ تاہم مالا نے نوٹ کیا تھا، سوزی کچھ الجھی، الجھی سی پیشی ہے، مالا کو دیکھ کر اگرچہ اس نے جوش اور محبت کا مظاہرہ کیا تھا مگر وہ کچھ الجھی، الجھی بھی لگ رہی تھی جبکہ مالا کے تو اندر باہر آگ کے پھانپھانے لگے تھے۔ جیسے اس رات کا ایک، ایک تین دو پارہ اس کی نگاہ میں جم گیا تھا۔ سوزی اور آفاق کی آوازیں کھینوں کی طرح بجھنا رہی تھیں۔ مالا کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔

”دھوکے باز، منافق لڑکی۔“ اس نے زہر لب بڑا کر کہا۔ وہ دونوں پھر سے باتوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ جبکہ مالا اس پر لعنت بھیج کر جانے کے بجائے وہیں صوفے پر تنگ گئی تھی۔ اب وہ بڑے غور سے سوزن کے سرخ ابھرے گالوں کو دیکھ رہی تھی۔

چکنا سا کھن کی ٹکیہ جیسا چہرہ۔۔۔ سر کو سینور سے اب بھی ڈھکا ہوا تھا، پیچھے کی طرف جیسے رومال کو گرہ لگا رکھی تھی۔ اس کی سوتی روک کی فرل فرل کو چھوتی

تھی۔ مالا بنا دیکھے بھی جانتی تھی اس نے گھریلو آرام وہ چیل نہیں ہوگی۔ وہ قدرے مضطرب تھی اور عیسیٰ سے گفتگو کے دوران کبھی، کبھی مالا پر بھی نگاہ ڈال لیتی تھی۔ جانے وہ دونوں کس ناپک پر بات کر رہے تھے۔ مالا چونکی تو تب جب عیسیٰ نے ایک ایسا موضوع چھیڑا جس کی مالا کو توقع تھی اور نہ سوزن کو۔۔۔ وہ دونوں کچھ متحیر سی عیسیٰ کو سن رہی تھیں۔

”میری سالگرہ والی شام تمہد تم نے مجھے دینا تھا یا مالا کو۔۔۔۔۔؟ کتنی کجوس ہو تم۔۔۔۔۔ اگر ایک سینٹ یا شرٹ مجھے بھیج دیتیں تو میری بیوی کے سامنے کچھ عزت بن جاتی۔ کہا سوجتی ہوگی مالا! ان لوگوں میں کزنز فرینڈ شپ تو ہے ہی نہیں۔“ عیسیٰ نے جس قدر سادگی بھرے لہجے میں شکوہ کیا تھا سوزی کے جواب نے عیسیٰ اور مالا کو ای قدر سن کر کے رکھ دیا۔

”تھخ۔۔۔۔۔؟ کون سا تھخ۔۔۔۔۔؟ میں تو آج تک شرمندہ ہوں۔ مالا کو کوئی تھخ نہیں دے سکی۔“ سوزن نے سر جھکا کر جیسے اعتراف جرم کیا تھا۔ مالا کی سانس تک حلق میں اٹک گئی۔۔۔۔۔ یہ سوزی کیا کہہ رہی تھی۔ سوزی۔۔۔۔۔ کتنی جھوٹی تھی۔ کتنی منافق تھی؟ اس نے خود ٹون پر مالا کو بتایا تھا کہ اس نے اسے تھخ بھیجا ہے پھر اب عیسیٰ کے سامنے کیوں مکر رہی تھی؟ سوزی یہ سب کیا کر رہی تھی؟ مالا کے ساتھ کون سا کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنا بڑا جھوٹ وہ بھی ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر۔۔۔۔۔ اتنی شدید غلط بیانی؟ تھخ بھیج کر مکر جانا کوئی معمولی بات تھی۔ مالا کو لگا وہ دھڑام، دھڑام تباہ و برباد ہو جائے گی۔ وہ فنا ہو جائے گی۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں سوزن کو دیکھا تھا۔ وہ اب بھی انکاری تھی اور عیسیٰ جیسے سنبھل کر پوچھ رہا تھا۔

”پھر مالا کو تھخ کس نے بھیجا؟“ عیسیٰ کے ماتھے پر شکنیں تھیں اور لہجہ اتنا سخت اور کھردرا تھا کہ مالا کا اندر تک ہل گیا۔



## تراک وفا

تھا؟ سے یقین تھا مالا جھوٹ نہیں بول رہی..... اور اسے یہ بھی یقین تھا سوزی غلط بیانی نہیں کرتی۔ پھر مالا کے منہ پر کیوں مکتی؟ پھر جانے اصل "سچ" کیا تھا؟ عیسیٰ کا سر تو چکرانے لگا۔

ادھر مالا نفرت آئینہ نظا سے سوزی کو گھور رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس کے سرخ چکنے ابھرے کمال نوج دے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ سوزی کی آنکھوں کو بھی پھوڑ دے..... بلکہ کوئی ایسا بھالا اس کے اندر اتارے کہ سوزی کو اس بھیا تک جھوٹ بولنے کی مزال جائے۔ اس نے عیسیٰ کی آنکھوں میں بے یقینی اتاری دیکھی تھی وہ بھلا چپ رہ سکتی تھی۔

"کتنی مکار لڑکی ہو تم..... ایک دم شاطر اور چال بازی..... عیسیٰ کی نظر سے مجھے گرانے کے لیے کتنی کھانڈلی حرکت کیا ہے تم نے..... آئی سیٹ ہو....."

دل چاہتا ہے تمہارے منہ پر تیزاب پھینک دوں..... تم نے خود نوں پر مجھے بتایا، میں نے تمہارا شکر یہ ادا کیا تھا تب تم نے انکار کیوں نہ کیا.....؟ تم نے آج انکار کر دیا۔ تم آج عیسیٰ کے سامنے مگر گئی ہو تاکہ عیسیٰ کا اعتبار مجھ پر قائم نہ رہ سکے، عیسیٰ مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ عیسیٰ سمجھے کہ میں ایک جھوٹی لڑکی ہوں..... یہ مجھ پر کبھی اعتبار نہ کرے اور میں عیسیٰ کے دل اور نگاہ سے اتر جاؤں۔" مالا بند بانی انداز میں چیخنے لگی تھی۔ اس کے آنسو بھل، بھل کر رہے تھے اور وہ اپنے بالوں کو نوچتی حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

"میں ایسا کیوں چاہوں گی، تمہیں غلط نہیں ہوئی ہے۔" سوزن اور عیسیٰ دونوں گھبرا گئے تھے۔ عیسیٰ، مالا کے لیے پانی لینے کچن کی طرف بھاگا تھا جبکہ مالا مسلسل چیخنے جا رہی تھی۔

"تم ایسا ہی چاہو گی..... میرے خلاف سازشیں کرتی ہو، تم انتہائی خبیث ہو، یہ میں ہی تھی جو تمہیں جان نہیں سکی۔ تمہارا کر یہ روپ دیکھ نہیں پائی۔" مالا ہانپتے ہوئے زہر خند ہو رہی تھی جبکہ سوزن

"یہ تو تم مالا سے پوچھو، پر یقین مانو..... میں نے مالا کو کچھ بھی نہیں بھیجا۔" وہ سادگی بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی جبکہ مالا کو وہ کوئی چالاک لومڑی نظر آرہی تھی۔ اس کا دل چاہا، وہ اٹھ کر سوزن کا منہ نوج لے۔ مگر اس کی صحت جیسے نچڑ کر رہ گئی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عیسیٰ کو دیکھا تھا۔ وہ مالا کو ہی دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کے کچھ بولنے کا منتظر تھا۔

"بولو مالا.....! تم نے تو کہا تھا سوزی سے فون پر بات ہوگئی تھو سوزن نے ہی بھیجا تھا۔ پھر یہ کیوں غلط بات کر رہی ہے۔" عیسیٰ کے لہجے میں نرمی تھی۔ وہ بڑے مان بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ جیسے ابھی مالا تردید کر دے گی۔ جیسے ابھی مالا سوزن کو جھوٹا ثابت کر دے گی مگر مالا کچھ بھی نہیں کر سکی..... اسے لگا، وہ گہری آنکھیں جو اس کی ناک میں لگی رہتی تھیں باسے لہجے عیسیٰ کی نظر سے گرا رہی تھیں۔ وہ گرتی جا رہی تھی..... گرتی جا رہی تھی۔ وہ کھائی میں گرتی جا رہی تھی۔

"بولتی کیوں نہیں ہو مالا!" عیسیٰ اٹھ کر اس کے برابر آ بیٹھا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی مذاق میں کہی بات اتنی سنجیدہ صورت اختیار کر جائے گی۔ وہ تو سوزن کو گھبر رہا تھا کہ کبھی اسے عیسیٰ کو برتھ ڈے وش کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا۔ وہ بے نام تھو جو اس وقت بھی اس کے ذہن کو الجھا گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر سوالیہ نشان بن کر چلیوں کے سامنے ناچنے لگا تھا۔ مالانے بتایا تھا وہ بے نام تھو سوزن کی طرف سے آیا ہے۔ اس کی سوزن سے فون پر بات ہوگئی تھی۔ سوزی نے شکر یہ بھی وصول کر لیا اور اب وہ عیسیٰ کے مقابل بیٹھ کر صاف، صاف کر رہی تھی۔ عیسیٰ کو نصرت آتا تو وہ اور کیا کرتا..... وہ اٹھا کر برہ سلیٹ لے آیا تھا۔ جو توڑ مروڑ دیا گیا تھا۔ بھلا مالانے سوزن کا تھو کو روپ میں کیوں پھینکا؟ اس نے تب نہیں سوچا تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا۔ آخر یہ تھو آیا کہاں سے



کاسرخ چہرہ آگ کے مانند مچنے لگا تھا۔ مالا کے الفاظ نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

”مالا..... تم پاگل ہو چکی ہو۔“ سوزن نے سنجی سے کہا۔ ”بہت جذباتی ہو..... ایک دم احمق اور بدھو.....“ عیسیٰ کو آتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی مگر اس کے چہرے کی تپش ختم نہیں ہوئی۔

”ہاں، تم تو چاہتی ہو، میں پاگل ہو جاؤں، پہلے مجھے تحفے بھیجتی ہو..... پھر مگر جالی ہوتا کہ میرے شوہر کو بدگمان کر سکو۔“ مالا چنگھاڑی تھی۔ وہ مزاجاً ایسی نہیں تھی۔ اسے حالات نے مجبوظ الحواس کر دیا تھا۔ عیسیٰ نے آگے بڑھ کر اسے زبردستی پانی پلایا تھا پھر سوزن کی طرف مڑ کر مٹی سے بولا۔

”پلیز سوزن! تم یہاں سے چل جاؤ۔۔۔۔۔ تمہاری وجہ سے مالا کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔“ عیسیٰ کے انتہائی توہین آمیز الفاظ نے سوزن کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر سے نکل جانے کو کہہ رہا تھا۔ دوسرے معنوں میں وارننگ دے رہا تھا کہ اس کی وجہ سے مالا کی طبیعت بگڑی ہے اور سوزن دوبارہ یہاں نہ آئے۔ اس ذلت بھرے احساس نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا مگر وہ پھر بھی ہانسنے کو تیار نہیں تھی کہ اس نے مالا کو تھخہ بھیجا ہے۔ وہ جانتے، جانتے بھی اپنی صفائی میں کچھ بول گئی تھی جسے عیسیٰ نے سنا ہی نہیں۔ وہ تو مالا کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اسے پچکار رہا تھا۔ نرمی اور پیار سے سمجھا رہا تھا۔

”میں تم سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتا۔ تمہارا جو مقام میرے دل میں ہے اسے کوئی بھی بدگمانی ختم نہیں کر سکتی اور نہ مٹا سکتی ہے۔ سوزن مگرٹی ہے تو سو دفعہ مگر جائے۔ مجھے یقین ہے مالا جھوٹ نہیں بولتی۔“ عیسیٰ کے نرم پھوار جیسے الفاظ جاتی ہوئی سوزن کی سماعتوں میں بھی اتر گئے تھے۔ اس کے دل میں نیزے کی الی جا چھبی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ عیسیٰ کے الفاظ سوزن کے منہ پر طمانچہ

تھے۔ کبھی وہ کہتا تھا کہ سوزن جھوٹ نہیں بولتی، آج وہ کہہ رہا تھا کہ مالا جھوٹ نہیں بولتی۔ وقت انسان کو کیسے دورا ہے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ حالانکہ عیسیٰ اپنے ایمان اور یقین سے کہہ سکتا تھا مالا اور سوزن دونوں جھوٹ نہیں بولتیں..... اگر وہ ایسا کہہ دیتا تو کیا حرج تھا؟ مگر وہ ایسا نہیں بولا تو گویا اس کا یقین مالا پہ بھاری تھا۔ سوزن کا پلڑا ہلکا ہو گیا..... مالا اس کی بیوی تھی جبکہ سوزن صرف ایک کزن..... رشتوں میں فرق بہت تھا، اعتبار اور اعتماد کی نوعیت بھی کچھ اور تھی۔ اس نے قرقر پر گھرے بر۔ سیلیٹ کو دیکھا..... پھر جھک کر اسے اٹھالیا۔ اس پر سیلیٹ کی وجہ سے کتنے دنوں کا نقصان ہوا تھا۔ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہاں، سوزن کا اعتبار مالا سے اٹھ گیا تھا اور مالا کا اعتبار سوزن سے اٹھ گیا تھا۔ ایک قرآن کی قسم کھا رہی تھی..... ایک مقدس انجیل کی قسم کھا رہی تھی۔ ان دونوں سے بھی زیادہ عیسیٰ مشکل میں گرفتار تھا۔ بھلا وہ ان دونوں میں سے کس کا یقین کرتا.....؟ وہ دونوں ہی اپنی، اپنی جگہ درست تھیں شاید..... جانے لفظ کیا تھا؟ جانے غلط کیوں تھا؟ اور کیسے ہو رہا تھا؟ عیسیٰ نے مالا کے لبوں سے پانی کا گلاس ہٹایا تو اس کی سماعتوں میں سوزن کی آواز اترتی۔ وہ سینے پر صلیب کا نشان بناتی بھرائی آنکھوں سے پلٹ کر ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے یہ منظر... بے انتہا لذیت ناک تھا۔

”مقدس انجیل کی قسم! یہ لڑکی خسارہ اٹھانے والی ہے، اسے انسانوں کی پہچان ہی نہیں۔“ سوزن کی درد ناک آواز لاؤنج میں گونجتی رہ گئی تھی جبکہ وہ اپنی روک کو پیروں میں دھرتی اٹنے سیدھے قدم اٹھاتی کبھی اس گھر میں دوبارہ نہ آنے کے لیے چلی گئی تھی جبکہ لاؤنج اور سنگ روم کے سناٹوں کو محسوس کرتے یہ دو لوگ ایک دوسرے کو بے ساختہ پکاراٹھے تھے۔

☆☆☆



**نہ کہ وفا**

اور اعتبار ہی تو تھا جو وہ پھر سے بولنے کے قابل ہو چکی تھی۔ ورنہ جو کچھ سوزن نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ نہ بھلا یا جانے والا تھا اور نہ نظر انداز کیے جانے والا تھا۔ وہ جو سمجھ رہی تھی سوزن کے انکار اور مکر جانے کے بعد عیسیٰ اس سے بدگمان ہو جائے گا ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے گفت والے قصے پر مٹی ڈال دی اور مالا کو سختی سے تاکید کی کہ آئندہ اس گھٹیا شخصے کا ذکر نہیں ہوگا۔ مالا کے دل میں عیسیٰ کی محبت پہلے سے چوگنی ہو گئی تھی کبھی کبھی اسے خود پرناز ہونے لگتا تھا۔ وہ تو بہت حقیر سی لڑکی تھی اللہ نے اسے اتنا نواز دیا تھا جس کی نہ کوئی حد تھی اور نہ کوئی شمار تھا۔ سوزن تو یہی سوچتی ہو گی وہ عیسیٰ کو مالا سے بدگمان کر دے گی۔ آخر اس کی بات کا مطلب تو یہی تھا۔ عیسیٰ، مالا سے متنفر ہو جائے گا مگر پانسہ جیسے الٹ ہی گیا تھا۔ عیسیٰ نے مالا سے بدگمان ہونا تھا نہ ہوا۔ حالانکہ اس کے بعد کئی مرتبہ بے نام پارسل موصول ہوئے۔ چونکہ عیسیٰ کی غیر موجودگی میں آتے تھے سو مالا انہیں بنا دیکھے کوڑے والے ڈرم میں مالٹ آتی تھی پھر بہت سارے دن دے قدموں گزر گئے۔ عیسیٰ اسے اور چاچو کو شہر سے باہر گھمانے لے گیا تھا۔ اتفاق کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا مگر اس نے معذرت کر لی تھی۔

زندگی جیسے پھر سے معمول پر آ گئی۔ یوں لگا، وہ دو آنکھوں والا آسیب اس کا بیچا چھوڑ گیا ہے۔ شاید اس نے مالا کی ذات سے کچھونا کر لیا تھا۔ مالا کے لیے یہ احساس ہی فرحت بخش اور اطمینان دلانے والا تھا۔ مگر یوں تھا کہ مالا بے چاری کے سکون و چین اور اطمینان کے دن تھوڑے ہی تھے۔ پھر ایسا روح ہلا دینے والا واقعہ ہوا جس نے پہلی مرتبہ عیسیٰ اور چاچو کو چونکا ڈالا تھا۔ وہ دن بڑا است روی سے طلوع ہوا تھا۔ عیسیٰ اور آفاق دونوں دفتر چلے گئے تھے اور آج کے دن چاچو لازمی چاچی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور پھول چڑھانے جاتے تھے۔ یہ ان کے معمول میں

”مالا.....!“ اس نے مالا کا گال بے ساختہ تھپتھپایا۔

”عیسیٰ.....!“ مالا نے گھبرا کر عیسیٰ کا اپنے گال پر رکھا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر کے لیے گم سم رہ گئے تھے۔ جیسے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ چند لمحوں میں بھلا ہوا کیا تھا؟ عیسیٰ کو لگا جیسے یہ کوئی ڈرامے کا سین تھا جو فٹ منظر بدلا گیا۔ دوپہل میں کیا سے کیا ہو گیا؟ سوزن کے چلے جانے کے بعد عیسیٰ کو احساس ہوا تھا کہ اس نے سوزن کو گھر سے نکال کر اچھا نہیں کیا..... غصے، جذباتیت اور جلد بازی میں اس نے سوزن کی بہت توہین کر دی تھی۔ عیسیٰ نے گروسی کی محبت کا خیال رکھا اور نہ تانتے کے پیار کو نظر میں رکھا۔۔۔ پھر وہ اس کے گھر مہمان آئی تھی۔ مہمانوں کو یوں بے عزت کر کے گھر سے نکالنا عیسیٰ کے گھرانے کی روایت تو نہیں تھی۔ اسے سوزن کے ساتھ انتہائی معیوب سلوک کرنے پر اور اسے گھر سے نکال دینے کی وجہ سے خود پر غصہ آ رہا تھا۔ غصہ حرام ہوتا ہے۔ اسے ان لمحات میں غصے کے نقصانات کا ادراک ہوا تھا۔ مگر وہ بھی کیا کرتا؟ جویشن ہی ایسی تھی۔ مالا کی الیت نے عیسیٰ کی سندھ بدھ بھلا دی تھی۔ بھی وہ سوزن پر الٹ پڑا تھا۔ اسے سوزن کے ساتھ اتنا تلخ رویہ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ عیسیٰ نے سوچا تھا، معمولی۔ گفت کا تو معاملہ تھا۔ بات رفع دفع ہو جاتی تو بہتر تھا۔ اسے بات بڑھانی نہیں چاہیے تھی۔ مگر بات پھر بھی بڑھ چکی تھی۔ ادھر مالا ابھی تک اس کیفیت سے باہر نہیں آ رہی تھی۔ اسے سوزن پر شدید غصہ تھا۔ وہ اب بھی سسکاریاں بھرتی گھسی، مٹی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”یہ کون سی جادوگری ہے علی عیسیٰ! یہاں اتنی انہونیاں کیوں ہوتی ہیں؟ میری سادہ سی زندگی میں اتنی الجھنیں کہاں سے آ گئی ہیں۔“ وہ آنسو پونچھتی کراہ رہی تھی۔ یہ علی عیسیٰ کی ذات کا مان، تحفظ، محبت



کمرے پر نگاہ ڈالی تھی۔ اسے مالا کے قریب وہ جوان عورت کھڑی نظر نہیں آئی تھی۔ مالا کے پیروں تلے سے زمین دھیرے دھیرے سرکنے لگی تھی۔ پھر اس نے نئی کو کچھ بولتے سنا تھا۔ وہ مالا کے حواس معطل کر رہی تھی۔

”کہاں ہے.....؟ کون ہے.....؟ مادام! آپ تو بہک گئیں۔ یہاں تو کوئی لہجہ نہیں۔“ نئی نے ہکلاتے ہکلاتے بہ مشکل اپنی بات مکمل کی تھی۔ اس کا پورا وجود تھر تھرا رہا تھا اور وہ چہرہ خوف کے مارے اٹھنے کی زردی جیسا ہو چکا تھا۔

”تمہیں یہ عورت نظر نہیں آئی.....؟“ مالا نے اپنے قریب کھڑی عورت کی طرف اشارہ کیا تھا تب نئی چیخ مار کر مالا کے قریب آگئی۔

”مجھے کوئی عورت نظر نہیں آ رہی..... یہاں ہم دو ہیں۔“ نئی نے اس کا ہا زود بوج کر پتلی آواز میں کہا۔ ”ہم دو ٹیکس ٹین ہیں۔“ مالا کی ٹھکی بندھ گئی۔

خوف نے اسے لرزا لرزا کر بے حال کر دیا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ جیسے مرنے کے قریب پہنچ چکی تھی۔

”تم ادھر دیکھو.....“ مالا نے نئی کا چہرہ اس عورت کی طرف موڑا تھا۔ وہ عورت جو سپاٹ چہرہ لیے ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا انداز اتنا عجیب تھا۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی کچھ کہہ بھی نہیں رہی تھی اور نہ وہ غائب ہو رہی تھی۔ جبکہ مالا کے علاوہ وہ کسی اور کو نظر بھی نہیں آ رہی تھی۔ سب سے تکلیف وہ مقام بھی یہی تھا۔

”یہاں کچھ بھی نہیں۔“ نئی مستثنائی۔

”تم اندھی ہو.....“ مالا چلنی۔

”میں جھوٹ نہیں بول رہی.....“ نئی کی آواز کپکپا رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ کمرے سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر کیسے مالا کو اکیلا چھوڑ دیتی۔

”تو میں جھوٹ بولتی ہوں۔“ مالا نے تڑپ کر کہا۔ ”الٹی یہ کیسی سزا ہے۔“ وہ بھل بھل رونے لگی

شامل تھا۔ ہر پندرہ دن بعد وہ دل کے اطمینان کی خاطر چاہتی سے مٹنے جاتے۔ اس دن نئی اور مالا گھر میں اکیلی تھیں۔ مالا نے بڑا مزیدار لٹچ تیار کر رکھا تھا مگر لٹچ سے کچھ دیر پہلے عیسیٰ نے کہا وہ کسی ضروری میٹنگ کی وجہ سے نہیں آسکے گا۔ تب مالا پست۔ وقت کے مطابق نماز ادا کرنے میں چلی گئی تھی۔ وہ سلام پھیر رہی تھی جب اس نے مڑ کر دیکھا..... ہاں اس نے مڑ کر غیر ادرانا دیکھ لیا تھا اور یوں لمحوں میں اسے لگا جیسے اس کے وجود سے دھیرے دھیرے نہیں ایک ہی جھٹکے ساتھ جان نکل گئی ہے۔ اس کے پیچھے ایک عورت کھڑی تھی۔ سر سے لے کر پیروں تک سفید لباس پہنے ہوئے..... اس کا چہرہ انتہائی سفید اور جھکے غازے سے لٹھڑا ہوا تھا۔ اس عورت کی آنکھیں جھکی تھیں..... وہ خوب صورت عورت تھی مگر اس کی اصل رنگت سفید غازے میں گم ہو چکی تھی۔

ایک تنہا کمرے میں اکیلا وجود کسی اور کا گمان نہ کرتے ہوئے اپنے دھیان میں گمن ہو اور اسے اچانک کوئی وجود نظر آ جائے..... پھر کسی کا جاننے کہا حالت ہوتی ہوگی تاہم مالا تو جیسے مرنے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اسے لگا، آنکھیں تو حلقہ پھاڑ کر باہر اہل پڑیں گی اور یہ ٹانگیں تو کبھی چلنے کے قابل نہیں ہو سکیں گی۔ اس نے اتنا بھیانک منظر زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ معادروانہ دھیرے سے کھلا تھا اور مالا کی جیسے جان میں جان آگئی۔ اندر داخل ہونے والی نئی بھی جو کسی اور کے وجود سے قطعاً بے نیاز مالا سے مخاطب تھی۔ ”برتن میز پر لگا دیے ہیں۔“ نئی نے بغیر چونکے یا ٹھٹکے آرام سے کہا تھا۔ کیا اسے مالا کے قریب کھڑی وہ عورت نظر نہیں آئی تھی؟ مالا کا ٹھہرنا دل پھر سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔

”نئی اکمرے میں کوئی اور بھی ہے۔“ مالا نے کمزور آواز میں زیر لب بڑا بڑا کر پوچھا تھا۔ تب نئی کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ اس نے ڈیلے پھاڑ، پھاڑ کر پورے



دنگ و ہوا

آنکھیں پھاڑے اسے پکار رہی تھی۔ مگر جنگلی پھولوں کی ہاڑک جانیے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اندھیرا لہا جھنڈا، اونچے اونچے درخت نما پودے جن پر قسم قسم کے پھول لگے ہوئے تھے۔ نئی بھی تب تک مالا کے پیچھے گرتی پڑتی آگئی تھی۔ اب اسے ہاڑک گھورتے دیکھ کر زبردستی اندر لے آئی۔

”سایوں کا پہچان نہیں کرتے۔“ مالا نے نئی کو کہتے سنا تھا۔ پھر جیسے اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا اتر آیا۔ وہ چکرا کر فرش پر گر رہی تھی۔ جب اسے نئی نے سہارا دے کر تھام لیا تھا تاہم اس کا ذہن ایک دم تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

وہ پادے آٹھ گھنٹے بے ہوش رہی تھی۔ اس بے ہوشی نے اگر اسے شدید اور بھیا تک خوف کی سوچا تھا تو اس بے ہوشی کے ساتھ کچھ حقائق بھی نہیں۔۔۔۔۔ جب وہ بے ہوش ہوئی تب چاچو بھی گھر لوٹ آئے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ ایسبیلنس منگوائی اور مالا کو اس میں ڈال کر اسپتال لے گئے تھے۔ تب تک عیسیٰ بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ پھر فوراً طبی امداد ملنے کے باعث اسے ہوش تو آ گیا تھا تاہم ڈاکٹر نے بتایا وہ کسی شدید قسم کے خوف اور ڈر کے زیر اثر ہے۔ اسی بے ہوشی میں ڈاکٹر نے بتایا کہ مالا ماں بھی بننے والی ہے۔ جہاں یہ خوش خبری چاچو اور عیسیٰ کے لیے انتہائی برسر تھی وہیں مالا کی حالت نے انہیں تشویش کا شکار کر دیا تھا۔ نئی نے من و عن پورا واقعہ کہہ سنایا تھا۔ مالا نے ہوش میں آ کر وہی باتیں دہرا دی تھیں۔ مالا نے روتے روتے بتایا۔

”وہ عورت چاہتی ہے، میں اس گھر میں نہ رہوں۔۔۔۔۔ وہ مجھے نظر آتی ہے نئی کو نہیں۔ آخر میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“ مالا کی ذہنی حالت قابل تشویش تھی۔ اس کی کنڈیشن ایسی نہیں تھی کہ۔۔۔ وہ کوئی صدمہ برداشت کر سکے۔ چاچو اور عیسیٰ سخت پریشان

تھی۔ مگر سامنے کھڑی چاندی کے مجسے میں ڈھلی عورت ٹس سے ٹس نہیں ہوتی تھی۔ نہ چونکی، نہ ٹھکی۔ اسی طرح بت کی طرح کھڑی رہی تھی۔

”تم۔۔۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔۔۔؟“ مالا نے بڑی ہمت کے ساتھ اس عورت کو مخاطب کیا تھا جو صرف اسے نظر آ رہی تھی نئی کو ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ مالا بھلا کیا کرتی۔۔۔۔۔؟ خوف، صدمہ، دکھ اور جانے کون، کون سا احساس جو اس معطل کر رہا تھا۔

”بوتی کیوں نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کیوں تنگ کرتی ہو؟ میرا گناہ کیا ہے؟“ مالا تڑپ تڑپ کر بولی تھی پھر جیسے پتھر کے بت میں جان پڑ گئی تھی۔ اس چاندی کے مجسے نے کہا۔

”یہ ہماری جگہ ہے۔۔۔۔۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔“ آواز کی گونج مالا کے کانوں میں اتر گئی تھی۔ مگر نئی گونگوں، بہروں کی طرح بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ مالا نے نئی کو جھنجھوڑ دیا تھا۔

”کیا تمہیں کوئی آواز سنائی دی؟“ مالا نے بڑی آس سے پوچھا تھا مگر نئی نے نئی میں سر ہلا دیا۔ ”مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔۔۔۔۔ نئی خوف کے مارے لرزتی آواز میں بولی تھی۔ پھر جیسے مالا نے تھک کر نئی کو بتایا تھا۔

”یہ عورت مجھ سے کہہ رہی ہے میں اس گھر سے چلی جاؤں۔“ مالا پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی اور نئی کے ڈیلے پھر سے باہر آ کرے تھے۔ شاید مجسے نئی عورت کو مالا کا بولنا اور رونا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ کسی ردیوٹ کی طرح چلتی ہوئی کرے سے باہر نکل گئی تھی۔ جبکہ مالا کو ایک دم ہوش سا آ گیا تھا۔ وہ بھی لپک کر باہر کی طرف بھاگی تھی۔ حالانکہ نئی اسے روکنا چاہتی تھی مگر مالا سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ وہ عورت تالاب تک جاتی دکھائی دی پھر وہ جنگلی پھولوں کی لوٹ میں گم ہو گئی تھی۔ مالا







**تراک وضا**

پرورش پائی۔ پھر ایک روز باغ میں ٹہلتے ہوئے بدیع الجہاں نے اسے دیکھا اور سیف الملوک نے بدیع الجہاں کو دیکھا عشق نے کیسی آگ لگائی تھی کہ اڑتی ہوئی جن زاوی آدم کے عشق میں اسیر ہو گئی۔

مالا کو میاں صاحب کے وہ شعر یاد آ رہے تھے جب شہزادہ، بدیع الجہاں سے ملنے گیا تھا پھر کیسے انتہائی انداز میں درخواست پیش کی تھی کہ اس کی محبت اور عشق کی روداد سن لے۔ شہزادے نے پری کو اس کی ماں کے دودھ کی قسم دی تاکہ پری اس کی بات سن لے۔ شہزادے نے پری سے کہا۔ میاں محمد صاحب نے پنجابی بلہان میں اس پوری داستان کو نظم بند کیا ہے۔

(ترجمہ) میری بات پوری سن لو اور سنا دل کے کانوں سے، میرے پاس اب صبر نہیں رہا، میری روداد عشق اب سن لو۔ پھر پری نے شہزادے کی آواز سنی سے متاثر ہو کر بڑے ناز بھرے انداز میں جواب دیا تھا۔

(ترجمہ) بدیع جہاں پری نے کہا..... اے شہزادے! تو نے مجھے ماں کے دودھ کی بہت بھاری قسم دی ہے۔ میں تمہاری بات ایک بار تو ضرور سنوں گی۔ پھر شہزادے کی پوری بات سن کر پری نے اسی سے کہا تھا۔ (ترجمہ) تیرا، میرا ملنا تو بہت مشکل ہے، یہ کس نے کہہ دیا تم سے کہ ہم دونوں کبھی مل سکیں گے؟

پھر پری بدیع الجہاں نے سیف الملوک کو جیسے سمجھاتے ہوئے مزید کہا تھا۔ سیف الملوک کے عشق کی داستان کے جواب میں پری دلائل اور جواز دیتی ہے اور بڑے تقاضا اور ناز بھرے انداز میں کہتی ہے۔

(ترجمہ) ہم تو ناری ہیں اور خود کو آدم زاد سے اونچا سمجھتے ہیں۔ تم ناری کی محبت چھوڑ دو، پریوں کی محبت تمہیں کیا دے گی۔

مالا نے بھی بدیع الجہاں کا قصہ ایک کہانی سمجھ کر نہیں پڑھا تھا۔ اس نے ہمیشہ بڑی محبت، چاہت اور عقیدت کے ساتھ اسے پڑھا تھا۔

وہ اب بھی پری کے ساحرانہ کلام میں جیسے

کیا ہوگا۔ اس کی تو سانس بند ہونے لگتی۔ اگر وہ کبھی علی بھیلی سے دوری کا تصور کرتی۔

اور صبح کے اس نورانی وقت تالاب کے کنارے پر بیٹھ کر کیا ضروری تھا کہ وہ پری بدیع الجہاں یا سیف الملوک کو یاد کرتی؟ وہ سر جھٹک کر اپنی سوچوں کو ایک ننھے منے نرم و نازک سے وجود کی طرف مبذول کروانا چاہتی تھی۔ وہ بچہ جو اس کے سارے خدشات ختم کرنے، اس کا دل بہلانے دنیا میں آنے والا تھا۔ ایک خوشگوار ممتا کا احساس بخشنے والا تھا۔

وہ شاید خوابوں اور خیالوں میں بہت دور تک چلی جاتی جو اگر اسے "لوں..... ہوں....." کی آواز نہ چونکاتی..... کوئی پھر مالا کے آس پاس تھا..... کوئی پھر مالا کے قریب تھا۔ اس نے دائیں دیکھا۔ پھر پیچھے دیکھا..... وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ قریب پڑی تھی کلیوں کو بے پردائی سے پانی میں اچھال رہی تھی۔

پانی کی شفاف سطح پر ہلکے پھونکے بننے رہے تھے۔ بالائی زندگی بھی انہی پھونکوں کے ماتھے تھی۔ کبھی الجھ جاتی تھی کبھی سلجھ جاتی تھی۔ بس ایک محبت کا احساس تھا جس نے اسے زندہ کر رکھا تھا۔ ورنہ وہ اتنی پریشانیوں میں ابھی تک کیسے حواس قائم رکھے ہوئے تھی؟

یونہی تالاب کے شفاف پانیوں کو دیکھتے ہوئے اچانک اس کے ذہن میں میاں محمد صاحب کے شعر اترنے لگے تھے۔ کسی اور نے محبت کی ایسی شاندار تشریح کی ہوگی.....؟ محبت کو جیسے انہوں نے بدیع الجہاں اور سیف الملوک کے قصے میں گوندھ دیا تھا۔ کس طرح سیف الملوک باغ میں ٹہل رہا تھا۔ ایسا ہی کوئی حسین پھولوں سے لدا گارڈن ہوگا۔ مالا آس پاس نگاہ دوڑا رہی تھی۔ اسے لگا، وہ تصوراتی دنیا میں کھو گئی ہے۔

میاں محمد صاحب کی مٹھاس بھری کہانی میں پورے پورے ڈوب گئی ہے۔ انہوں نے کتنی محبت سے سیف الملوک کی سوانح عمری لکھی تھی۔ جب وہ پیدا ہوا، بے شمار منتوں مرادوں کے بعد۔ پھر پلا بڑھا..... ناز و نعم میں



کے نیچے دی مٹی سے ہی چشمے پھوٹتے ہیں۔ بس مالا ہی سمجھ نہیں پاتی تھی۔ اسے لگا، بدلیج جمال نے اسے ایک راہ دکھائی ہے۔ بدلیج جمال جیسے روشنی کا پینار بنی کھڑی تھی۔ اسے دستہ ہتھاری تھی۔ اسے سمجھا رہی تھی۔

”نیچاں دی آشنائی ہوں نبض سے تیار پھل پایا؟“ لفظ ملفظ میں جسے مالا کے لیے کوئی رہبر کھڑا پکار رہا تھا۔ بات مشکل نہیں تھی بس مالا سمجھ نہیں پاتی۔

اس نے آفاق اور سوزن پر اعتبار کر کے دھوکا کھایا تھا۔ اس نے ان دونوں پر خلوص لٹا کر غلط کیا تھا۔ مالا نے بے قدروں پر خلوص پھجا اور کیا اور انہیں اعتبار کے قائل سمجھا۔ وہ کیوں نہیں سمجھ سکی کہ مون کی کزن، عیسیٰ کی نام نہاد منگیتر سوزن، مالا کے لیے کیوں مخلص ہوئی؟ وہ یہ بھی کیوں نہیں سمجھ سکی، مون کے انسی ٹیوٹ سے لٹکوتیج کورس کر کے آنے والا آفاق مون کی ہی حریف یعنی مالا سے مخلص ہوگا؟ تو گویا مالانے تسلیم کر لیا تھا۔ وہ ایک جیٹک سازش کا شکار ہو رہی تھی۔ اور اسے نفسیاتی حربوں سے میز اور نارچہ کیا جا رہا تھا۔ اور سب سے بڑی بات اس سازشی منصوبے میں آفاق اور سوزن کا بھی پورا پورا ہاتھ تھا۔

وہ ابھی آفاق اور سوزن کی منافقت کے بارے میں کچھ اور بھی ٹھوس نکتے نکالتی جب ”اوں ہوں“ کی آواز نے مالا کو پھر سے چونکا دیا تھا۔ جیسے ”اوں ہوں“ میں کوئی تنبیہ تھی۔ مالا کو کسی بات سے منع کیا جا رہا تھا بھلا کس سے؟ اس نے تالاب کے کنکرے پر رکھے گیلے میں سے کئی کنکرے نکالے ہی تھے بلکہ اس سے بھی پہلے پودے کی شاخوں پر لگی ساری گلیوں کو توڑ کر تالاب میں پھینک دیا تھا اس نے پھولوں سے لدے پودے کو قریب، قریب گھنچا کر دیا تھا۔ اب کہ مالا کو کچھ افسوس سا ہوا تھا۔ بھلا ایسی بھی کیا۔۔۔

خبری؟ وہ خود کو لعن طعن کرنے لگی تھی۔ جب ”اوں ہوں“ کی آواز پھر سے سنائی دی۔ اب کہ مالانے بائیں جانب دیکھا تھا۔ پھولوں کا اونچا جھنڈا ایک

کھوئی ہوئی تھی۔ اسے لگا، وہ سمندر پار کسی اجنبی ملک کی سرزمین پر نہیں بلکہ اپنے ڈیڈی کی لاہریری میں بیٹھی سفر العشق یعنی قصہ سیف الملوک و بدلیج الجمال پڑھ رہی تھی۔ اسے پری کی ناز بھری آواز لاکھوں میل کی دوری کے باوجود سنائی دے رہی تھی۔ جیسے وہ سیف الملوک کو سمجھا رہی تھی۔ اور ابن آدم کو بے وفا کہہ رہی تھی۔

بے وفائی کم تہ ڈا، پریاں لوک وفائی بے قدر اں دی الفت مندی، نیچاں دی آشنائی ترجمہ (پری بتاتی ہے کہ بے وفائی تمہارا کام اور انسانوں کا وصف ہے، جبکہ پریاں فطرتاً و فادار ہوتی ہیں۔ وہ جس سے محبت کرتی ہیں عمر بھر اس کی وفادار رہتی ہیں اور پری کہتی ہے کہ بے قدروں یعنی انسانوں کی الفت بری ہے اور بیچ لوگوں کی آشنائی اور دل ربائی بھی بری ہے۔

نیچاں دی آشنائی کولوں فیض کے نہیں پایا گرتے انگور چڑھایا، ہر گھنچا زخمایا

ترجمہ (بیچ لوگوں کی محبت سے کس نے فیض اور شمر پایا ہے؟ کیکر کے کانٹوں پہ انگور چڑھانے سے ہر دانے کو زخم ہی تو آتا ہے مالا کو لگا تھا جیسے بدلیج جمال نے یہ الفاظ اسے ہی سمجھانے کو کہے تھے۔ جیسے ایک پردہ سا اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا تھا۔ اس کے کانوں میں میاں صاحب کا یہ شعر پھر سے امرت شکانے لگا۔

”گرتے انگور چڑھایا، ہر گھنچا زخمایا۔“ مالا کو لگا۔ پیاز کی پرتیں کھلنے لگی ہیں۔ ایک، ایک پردہ ہٹنے لگا تھا۔ خلوص اور محبت کو بے قدروں پر مت لٹاؤ، کیکر پہ انگور مت چڑھاؤ اور مالانے بھلا کیا، کیا تھا؟ اور کیا کچھ کرتی آئی تھی؟ بے قدروں پر اعتبار کرتی رہی اور خلوص لٹاتی رہی۔ جیسے شہر زمین پر خلوص و الفت کے بیج بکھرتی رہی۔ بھلا شہر زمینیں فصلیں اگاتی ہیں؟ محبت پتھروں کے سینوں میں سے چشمے نہیں نکالتی پتھروں



**توک وفاق**

بت میں جان پڑ گئی تھی۔ مالا کو گویا بہت ہی لطف آیا۔  
 ”ہاں، ہاں..... تم چاندی کا بت ہو۔۔۔۔۔  
 ہمارے ہاں تمہارے جیسے بت کو خرید کر حزار پر  
 چڑھاوا دیتے ہیں۔۔۔۔۔ آں..... ہاں، میں یہ کیا بول  
 گئی۔ تم تو بدلیج اجمال ہو۔۔۔۔۔“ مالا نے کہا بلکہ مندی  
 سے اسے ایک مرتبہ پھر ہونق کر دیا تھا۔ بھلا پر یاں  
 ہونق بھی ہو جاتی ہیں؟ مالا کو پہلی مرتبہ تجربہ ہوا تھا سو  
 کچھ حیرانی بھی تھی۔ مگر سامنے کھڑی عورت اس کے  
 سارے طبق روشن کرنے کے موڈ میں تھی۔

”میں علی عیسیٰ کے نکاح میں ہوں۔۔۔۔۔ جس  
 شب جہارا محمد علی عیسیٰ سے نکاح ہوا تھا اسی شب میں  
 بھی خود بخود اس کے نکاح میں آ گئی تھی۔ اس گھر میں  
 میرا قیام ہے، انسان تو بے وفا ہوتے ہیں جبکہ ہم  
 نہیں۔۔۔۔۔ مگر کبھی نہیں پھوڑتے۔“ وہ اپنے تئیں مالا  
 کے خواہوں پر ہم پھوڑ چکی تھی۔ کچھ لمبے کے لیے مالا  
 بھی چکرا کر رہ گئی تھی۔ اسے سننے میں بہت وقت لگا  
 تھا۔ یہ انکشاف لمحے بھر کے لیے ہلا کر رکھ گیا تھا  
 اسے۔۔۔۔۔ مگر وہ پھر بھی سبھل ہی گئی تھی۔ اس نے  
 سامنے کھڑی پری ہیکر کو دیکھا تھا۔ انسانی ڈھانچے  
 میں ڈھلا وجود۔۔۔۔۔ چہرے پر ناقابل فہم تاثرات اور  
 الفاظ ایسے تھے گویا مالا کی ہستی مل کر رہ گئی تھی۔

”اوہ..... تو یہ بات ہے، تم عیسیٰ کے نکاح  
 میں ہو۔۔۔۔۔ اور مجھے پریشان کرنی ہو، پھر میری وجہ سے  
 عیسیٰ پریشان ہوتا ہے تم کیسی محبت کرنی ہو علی عیسیٰ  
 سے؟ اس گھر میں رہنے والوں کو زک پہنچانی ہو، شہرہ،  
 میں تمہیں پوچھتی ہوں۔“ مالا نے پورے جوش اور  
 غصے کے عالم میں جارحانہ تیور کے ساتھ منھی میں دہائی  
 کلی سامنے کھڑی عورت کو ماری تھی۔ یہ حملہ بہت  
 اچانک تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا، مالا پتھر بھی مارتی تو وہ  
 عورت ٹس سے مس نہ ہوتی بلکہ بندوق کی گولی بھی  
 اس پر اثر نہ کرتی مگر وہ تو معمولی سی کلی کا زور بھی سہ  
 نہیں سکتی تھی حالانکہ کلی اس تک پہنچ بھی نہیں پاتی تھی۔

جنگلاتی حسین عورت سے لٹک رہا تھا۔ وہی جوان  
 عورت جو مالا کو کمرے میں لٹی تھی۔ چمکتا ہوا سفید  
 چہرہ۔۔۔۔۔ سانچے میں ڈھلا بدن۔۔۔۔۔ نہ نقوش مشرئی  
 تھے نہ مغربی۔۔۔۔۔ کمال کا نفیس نقوش سے ترشا چہرہ تھا۔  
 مالا کو پہلی مرتبہ ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس  
 نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں خوف کہیں نہیں تھا۔ مالا  
 کچھ متحیر رہ گئی تھی۔ مگر فی الحال حیران ہونے کا بھی  
 اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ اپنے قدموں پر اٹھ  
 کھڑی ہوئی۔ مہولی میں گری ساری چپاں تالاب  
 میں گر پڑی تھیں۔ مالا نے جھک کر ایک کلی کو منھی  
 میں ڈال لیا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔  
 ”پری بدلیج اجمال۔“ مالا نے زہر لب بڑا  
 کر کہا تھا۔ ”مجھے تم سے ملاقات کا بہت شوق تھا۔  
 میں ایک عرصے سے تمہارے گھر میں گرفتار تھی۔ مجھے  
 یقین تھا، تم میرے تصور سے بھی بڑھ کر حسین  
 ہوگی۔“ مالا نے دو قدم غیر محسوس طریقے سے آگے  
 بڑھائے تھے۔ سامنے کھڑی چاندی میں ڈھلی عورت  
 شاگرد رہ گئی۔ اس کے تاثرات بہت حیران کن تھے۔  
 مالا خود بھی متحیر رہ گئی۔ ”تو کیا پر یاں بھی حیران ہوتی  
 ہیں؟“ وہ گویا خود سے پوچھ رہی تھی۔ جبکہ دوسری  
 طرف حیرت کا انداز اور شمار ہی کوئی نہیں تھا۔

مالا سبھی نہیں تھی، ڈری نہیں تھی..... اس کے دل  
 میں کہیں خوف کا نشان تک باقی نہیں تھا۔ خوف اس  
 کے دل سے بے وفائی کر گیا تھا مگر مالا اس بے وفائی  
 پر بہت خوش اور مطمئن تھی۔

”آج تم خاموش کیوں ہو؟ لولتی کیوں  
 نہیں؟ مجھے تمہارے بولنے کا شدت سے انتظار  
 ہے۔“ مالا جیسے اس کی خاموشی سے بھی لطف اندوز  
 ہو رہی تھی۔ آج مالا کی ترنگ ہی کچھ اور تھی۔ اس کے  
 سامنے بدلیج اجمال جو کھڑی تھی۔ اس کا تصور آتی ہیکر،  
 سیف املوک کی محبوبہ.....  
 ”تم جانتی ہو، میں کون ہوں؟“ چاندی کے



اتر و گی، جب تک خوف کو ہاتھ سے محسوس نہیں کرو گی، وہ کبھی تم سے دور نہیں جائے گا۔" یہ عیسیٰ کے قول تھے پھر بھلا مالا ان پر ایمان کیسے نہ لاتی۔ اس نے خوف کو مجسم شکل میں دیکھ کر اسے چھوٹا چاہا تھا اور خوف، مالا کے خوف سے بھاگ گیا تھا۔ مالا کا دل چاہ رہا تھا جو آسمانوں پر مرغابیاں اتر رہی ہیں اور جو کو بھیں قطاروں میں تیر رہی ہیں کم از کم آج تو وہ ان کے ہمراہ رقص کر لے، آج مالا کی فتح کا۔ بسرت دن تھا۔ آج مالا کی ان دیکھے اور آنکھوں دیکھے خوف سے آزادی کا دن تھا۔

☆ ☆ ☆

انگلے بہت سارے دن جیسے امن اور شانتی کی پھوار لے کر آئے تھے۔ زندگی کی بگڑتی ترتیب میں سنو اور کھٹار آ گیا تھا۔ بگڑتی چیزیں جیسے اپنے اصل مقام تک آ رہی تھیں۔ مگر مالا اتنا ضرور جانتی تھی کہ یہ سکون بھی عارضی ہے۔ ابھی اس کی آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی کچھ اور امتحان باقی تھے۔

اس دن شام سے کچھ پہلے ہیرا کی کال آ گئی تھی۔ وہ اسے میکس کی برتھ ڈے پارٹی کا تقاریبی تھی بلکہ یاد دہانی کروا رہی تھی۔

"سات بجے تک پہنچ جانا۔۔۔ میں بھی سات بجے تک آؤں گی۔" ہیرا عموماً ہر قسم کے ٹکٹھن انجوائے کرتی تھی۔ سو اس وقت بھی بہت ایکسائٹڈ تھی۔ مالا کا پہلے تو ارادہ ڈالوں ڈول ہو گیا تھا۔ پھر ہیرا کے اصرار پر اس نے حامی بھری تھی۔ پھر جب عیسیٰ سے مالا نے پوچھا تو اس نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔ مگر ساتھ تاکید بھی کی تھی۔

"اگر آفاق فارغ ہے تو اسے ساتھ لے جاؤ۔" جانے اس کے شوہر کو خبیث آفاق پر کیسا اندھا اعتماد تھا؟ مالا کو آفاق زہر لگتا تھا۔ دل تو چاہتا تھا اسے اٹھ کر باہر پھینک دے مگر عیسیٰ کی وجہ سے مجبور تھی۔

مالا نے آفاق سے مارے بانہ مٹے ہی پوچھا تھا

ہوا میں معلق رہ کر بالآخر زمین ہوس ہو گئی تھی۔ جبکہ سامنے کھڑی چاندی کی عورت نے بے ساختہ چیخ ماری تھی۔ پھر وہ اٹنے قدموں بھاگ گئی۔ مالا کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جوتا اٹھا کر چاندی میں ڈھلی اس عورت کا پیچھا کرے مگر وہ گلاب کے سینڈ میں غائب ہو گئی تھی۔ اور مالا... ایک گہری سانس کھینچتی تالاب کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ اس کے سر پر سے خوف کا بھیا تک بھوت اتر گیا تھا۔ قوم جن کی ایک عورت علی عیسیٰ سے نکاح کا اعتراف کر کے بھاگ گئی تھی۔ مالا نے اسے بھاگا ڈالا تھا۔ ماری پہ خاکی جیسے سبقت لے گیا۔ اس نے ڈر کو ڈر کے ساتھ کاٹ ڈالا تھا۔ اس پہ مالا کو بدلتا الجھال پر ٹوٹ کے پیارا آ گیا تھا۔

جیسے کوئی تھیل سیف السلوک پر سر جھکائے ٹھنڈی مٹیسی چاندی میں گنگنا رہا تھا۔ "بھلا بریاں کس کے ہاتھ آتی ہیں؟ پر یوں کو تو چھوٹا بھی ممکن نہیں۔" پھر یہ کیسی پر پی تھی جو گلی کا وارہ بہت پانی اور انسانی لہس کی قربت سے بھاگ گئی۔ مالا تو ابھی اس کے قریب آ رہی تھی۔ وہ اسے گلی مار کر چھوٹا چاہتی تھی اور شاید وہ عورت اس کا ارادہ بھانپ چکی تھی۔ بھاگ نکلی۔ اگر مالا اسے چھو لیتی تو پھر مٹوٹ جاتا۔ شاید آج فیصلے کا... آگیا اور اوراک کا دن نہیں تھا۔ مالا پھر کسی ایسی ہی ملاقات کا انتظار کرنے لگی تھی۔

علی عیسیٰ نے دو دن پہلے ہی مالا کو ہی تو سمجھایا تھا۔ "یہ ڈر اور خوف کچھ نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن کے دسو سے ہیں سارے، کچھ بھی خود پر سوار کر لو، چاہے خوشی، چاہے غم یا خوف۔۔۔ جو سوچو گے اس کے ذریعہ اثر ہو گے، دیکھو، کنویں میں جھانکے بغیر اس کی گہرائی کا پتا نہیں چلتا۔ آگ کو چھوئے بغیر اس کی تپش کا احساس ہو جاتا ہے مگر نزدیک جاؤ کچھ چیزیں سمجھانی پڑتی ہیں اور کچھ بغیر سمجھائے اوراک تک پہنچ جاتی ہیں۔ تم خوف کو آگ کی تپش مت سمجھو بلکہ کنویں کی طرح سمجھو۔۔۔ جب تک خوف کی گہرائی میں نہیں



ترک و وفا

”اس فلم کا ڈائریکٹر اہلق یعنی کہ میں ہوں۔۔۔۔۔ علی عیسیٰ کی آستین میں آرام فرمانے والا ڈیش، ڈیش اور ڈیش۔۔۔۔۔“ آفاق نے تہتہ لگایا تھا کچھ لمحوں کے بعد سوزن کی آواز آئی۔ وہی مکارانہ آواز۔۔۔۔۔ مالا کو جیسے الیکٹریک شاخس لگ رہے تھے۔

”اور میں فلم کی کاسٹ کا اہم حصہ ہوں۔۔۔۔۔“ اس فلم کا نام ہے ترک و وفا۔۔۔۔۔ یہ فلم مالا اور علی عیسیٰ کی کہانی پر مبنی ہے۔ اس کا اسکرپٹ مومن حسیب نے لکھا ہے اور اسے پروڈیوس بھی مومن حسیب نے کیا ہے۔ جبکہ ہم محض کہانی کے اہم ترین کریکٹرز ہیں۔۔۔۔۔ اور ایکٹنگ میں کمال کا فن رکھتے ہیں۔“ وہ چالاک لومڑی تہتہ لگا کر ہنس رہی تھی جبکہ مالا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔

اندھیرا کیا ہوتا ہے؟ مالا نے اس لمحے جانا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے غبار چھا گیا تھا، سیاہ دھجی دھجی بکھرا گہرا ہوتا غبار۔۔۔۔۔ بکتوں کی شکل میں ابھرتا اور پھر گہرا ہوتا، پھیل پھیل جاتا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا تو دیوار بالشت بھر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ دماغ چکی کے پاٹ کی طرح بھاری تھا اور گول، گول گھوم رہا تھا۔ وہ زمین پر گرنے کے قریب تھی یا پھر وہ زمین پر گر گئی تھی یا خلا میں تعلق تھی۔ وہ کہاں تھی؟ شاید کہیں بھی نہیں، زمین پر نہ آسمان پر خلا میں، نہ ہوا میں۔

”نیچاں دی آشنائی لوگوں فیض کسے نہ پایا“ کوئی سیف الملوک جھیل پر سر جھکائے بھیگی آواز میں گارہا تھا۔ مالا کو لگا، اس کا دل پھٹ جائے گا، اس کی سانسیں، اس کی آنکھیں، اس کا دل، سوچیں کسی گڑھے میں گر رہی تھیں۔ وہ خود بھی تو کسی گڑھے میں گر رہی تھی۔ جہاں اندھیرا تھا، جہاں سانس لینا بھی مشکل تھا۔

وہ دیوار کے ساتھ چپکی گہری، گہری سانس لے رہی تھی، مالا نے اس ہل جانا تھا بھی، کبھی سانس لینا بھی کتنا دشوار ہوتا ہے۔

کہ وہ مصروف تو نہیں اور آفاق نے بتایا، اس کا گلا خراب ہے، ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہے۔ مالا نے تشکر بھری سانس خارج کی تھی۔ وہ آفاق کے ساتھ کہیں بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ ادھر آفاق کے نکلنے ہی اس نے بھی تیاری کر لی تھی پھر چاچو کو بتا کر بس کے ذریعے میکس کے فلیٹ تک آگئی۔ رستے میں اس نے فلاور شاپ سے بو کے خریدا تھا اور ایک کے ساتھ چاکلیٹ کا ایک لارج سائز پیک بھی لیا۔ جب وہ میکس کے فلیٹ کی بلڈنگ تک پہنچی تو میکس اسے نیچے ہی مل گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر مالا کا خیر مقدم کیا۔ اور پھر مالا کو بتایا، وہ فلیٹ نمبر نسلوں پر پہنچ جائے۔ دروازہ کھلا ہی ہوگا۔ میکس جلدی میں تھا اور تڑپتی بیکری میں گھس گیا تھا۔ مالا اسے پکارتی ہی رہ گئی۔ پھر جب وہ لفٹ کے ذریعے مطلوبہ بنیفیٹ پر پہنچی تو توقع کے عین مطابق دروازہ کھلا ہی ملا تھا۔ اس نے دروازے سے اندر پاؤں رکھا تو کئی طرف کی وقفے، وقفے کے ساتھ آوازیں سنائی دی تھیں۔ پہلی آواز سوزن کی تھی، دوسری مومن کی، تیسری آواز آفاق کی تھی۔ مالا کے سر پر دھڑام، دھڑام سات آسمان آگرے تھے۔ تو آفاق ڈاکٹر کے لینک جانے کے بجائے مومن کے بلاوے پر ابھرا گیا تھا۔ آفاق نے مالا سے جھوٹ بولا تھا؟ اتنا بڑا ایک اور دھوکا۔۔۔۔۔؟ مالا کا سر گول، گول گھومنے لگا۔ تو گویا آفاق جانتا ہی نہیں تھا۔ مالا کو بھی میکس کی طرف آنا ہے۔ اگر جان جاتا تو یہاں نہ آتا۔

مالا کو اندر سے نکھیلوں کی۔ جھنڈنا ہٹ نما آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا وجود گویا دھول میں ہو رہا تھا۔

”ٹارگٹ کامیابی کے آخری مراحل میں ہے۔۔۔۔۔ بس ایک ہی جھٹکے میں کہانی کا اینڈ ہو جائے گا۔۔۔۔۔“ اس فلم کی پروڈیوسر مومن حسیب ہے۔“ اندر سے مومن کی چمکتی آواز سنائی دی تھی پھر کچھ دیر بعد دوسری آواز آئی۔



تالاب کے کنارے پھر کوئی ..... پری  
 بیہواڑے بیٹھی تھی۔ وہ جو روشنی کا مینار تھی اور مالا  
 کو صاف راہ دکھا رہی تھی، اسے سمجھا رہی تھی کہ بیچ  
 لوگ محلوں میں بھی رہیں تب بھی نیچے ہی ہوتے ہیں۔  
 اور بیچوں کی یاری، ولداری سے اعتبار ہی ٹوٹتے ہیں،  
 بے یقینی، دکھ اور صدمات ملتے ہیں، اسے لگا، بدلیج  
 الجھال پھر اس کے قریب آگئی ہے۔ وہ جمیل سیف  
 الملوک کے ٹھنڈے پانیوں میں اتر کر اسے بتا رہی تھی  
 کہ دکھ اور اچانک صدمے سے سنبھلتے کیسے ہیں؟ وہ  
 اسے مضبوط رہنے اور حوصلہ پکڑنے کی ہمت دلا رہی  
 تھی۔ وہ بدلیج الجھال ہی تو تھی جو ایک مرتبہ پھر روشنی کا  
 مینار بنی کھڑی تھی۔ اسے بتا رہی تھی کہ انسان کا بھروسا  
 تب ٹوٹتا ہے جب اللہ پر اس کا بھروسا ہلکا ہوتا  
 ہے۔ زہد اور متقی بن مشقت کے نہیں بن  
 جاتے۔ درگاہوں اور صحراؤں میں رہنا پڑتا ہے۔ کسی  
 نے مالا کے کانوں میں امرت قطرہ، قطرہ دیا  
 تھا۔ اس کی نیم وا آنکھیں ایک جھلکے سے کھل گئی تھیں۔  
 نکتوں کی شکل میں دجی، دجی بکھرا غبار دھیرے  
 دھیرے چھٹ رہا تھا جیسے اندھیرا کم پڑ رہا تھا۔ جیسے  
 غبار کے چھبے کوئی ننھا سا جگنو شمار رہا تھا۔ دور بہت دور  
 لاکھوں میل کی دوری پہ جمیل سیف الملوک کے سج  
 کناروں پہ شیریں نغمے نغماؤں میں بکھرتے سنائی  
 دے رہے تھے۔ کوئی بہت سوزو گداز سے اللہ کی  
 "حمد" پڑھنے میں دنیا بھلائے گمن تھا۔ وہ بھلا کون  
 تھا؟ سیف الملوک یا بدلیج الجھال؟ اللہ کی بادشاہی  
 ہمیشہ کی ہے، اسی کا راج ہے، اسی کی حکومت ہے، اسی  
 کے ملک ہیں اور اسی یعنی اللہ کے در پہ بھی سلامی  
 دیتے ہیں۔ بھی جھکتے ہیں، آدم، جن اور فرشتے ہر دم،  
 ہر جان اللہ کی بندگی میں مصروف اور اسی کے سامنے  
 سر نہمو ہیں۔ سیاہ دجی جیسا اندھیرا کچھ اور چھٹ گیا  
 تھا۔ غبار پہلے سے ہلکا تھا۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں  
 کھول سکتی تھی، اسے اندھیرے میں کچھ، کچھ روشنی نظر

آ رہی تھی، یہ روشنی جگنو کی تھی یا پھر.....؟  
 وہ ہی ہے جو غرور اور تکبر کرنے والوں کے  
 غرور کو توڑ ڈالتا ہے۔ غریب، بے کس، مسکین اور  
 مظلوم کا ساتھی مددگار ہے، کوہ قاف تک روزی  
 پہنچانے والا چرند پرند تک رزق دینے والا وہی اللہ تو  
 ہے۔ پردے جیسے ایک، ایک کر کے کھسک رہے  
 تھے۔ اس نے دیوار پر ہاتھ رکھا تو اس کا چکرا نا دماغ  
 ٹھہر گیا۔ اسے گزرے ہوئے کچھ ہل یا آئے تھے،  
 اسے کوئی بات یاد آئی تھی۔

"تم عنقریب میرے بھائی کی زندگی سے  
 جانے والی ہو، بہت جلد علی عیسیٰ تمہیں طلاق دے  
 دے گا۔ غرور، تکبر سے بھری یہ آواز کس کی تھی؟ مالا  
 عالم بالا میں کتنی کڑی اس آواز کو پہچان سکتی تھی۔ اس  
 کا دل ایک مرتبہ پھر لہلہا ہوا گیا تھا۔ اس کی  
 آنکھوں میں زخم بھر گئے تھے مگر پھر جیسے کوئی سکون کا  
 ہسم مالا کے وجود پر پڑھ کر پھونکنے لگا تھا۔ جیسے کسی  
 نے مالا کو اپنے محفوظ حصار میں مقید کر لیا تھا۔ اس کے  
 اندر پابہر ٹھنڈک اترنے لگی تھی۔

اس نے یقین کو اپنے اندر مضبوط کیا تو اللہ نے  
 اس کے قدم زمین پر مضبوطی سے جما دیے تھے۔ وہ خلا  
 سے باحفاظت زمین پر اتر آئی تھی۔ اس کے قدم زمین  
 پر جم گئے تھے اور وہ بیچ لوگوں کی اوقات پہچان چکی تھی۔  
 "ہارگٹ مشکل ضرور ہے پر ناممکن نہیں.....  
 میں جاہتی تو لمحوں کو ایک ہی جھلکے کے ساتھ ختم کر سکتی  
 تھی۔ مگر ایسی گیم کا مزہ ہی کیا..... جس میں مقابل کو  
 اس کی بے خبری میں مات دی جائے۔" کچھ عرصے  
 بلکہ کچھ دن پہلے تو اس نے اپنے کمرے کی واحد گلاس  
 ونڈو کے دوسری طرف ایک عورت کے زہریلے  
 الفاظ سنے تھے۔ وہ عورت مومن اور علی عیسیٰ کی فرسٹ  
 کزن سوزن تھی۔ مالا نے سوزن کی اصلیت پہچان  
 لی تھی اور مالا نے آفاق کی حیثیت بھی سمجھ لی  
 تھی، اب کوئی راز، "راز" نہیں رہا تھا جیسے حقیقت







ہی لمحے جیسے اس کے قدم زمین نے پھر سے جکڑ لیے تھے۔ ڈرائنگ روم کا منظر واضح تھا۔ وہاں مون کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ نہ سوزن اور نہ ہی آفاق۔۔۔ پورا کمرابھان، بھان کر رہا تھا۔ باقوت اور ہیرے سے سجا کر اون سر پر سہائے سرخ گھنے سلکی پالوں کی اونچی سی پوتی بنائے بلاشبہ وہ مون ہی تھی۔ سرخ سٹک کی چروں تک چھوٹی روک پہنے، ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ بڑے نخرے اور طعرات کے ساتھ صوفے پر بیٹھی سامنے کسی ڈیکوریشن میں کود کھ رہی تھی۔ مالا کی موجودگی محسوس کر کے اسے الیکٹریک شاک لگا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ صوفے سے اٹھ گئی تھی۔

”تم نے اسے بھی انوائٹ کر رکھا ہے؟“  
 مون نے غیظ کے عالم میں میکس سے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر ناقابلِ فہم تاثرات چھائے تھے۔ گویا اسے مالا کی موجودگی نے بہت شاکڈ کیا تھا۔ وہ کم از کم۔۔۔ مالا کی یہاں توقع نہیں کر رہی تھی۔ اگر چاس کے انداز سے یہی ظاہر تھا تاہم مالا کو لگ رہا تھا وہ ڈرانا کر رہی ہے۔ اسے پہلے سے خبر تھی کہ مالا بھی یہاں آئے گی۔ جبکہ میکس، مون کے الفاظ پر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر نفرت سی چھا گئی تھی۔

”مالا سے میری ابھی جان بچان ہے۔ یہ ہیرا کی دوست ہے اور تمہاری بھالی،۔۔۔ اگر اسے انوائٹ کیا ہے تو تمہیں کیوں برا لگا؟“ میکس اپنی شرمندگی مٹا رہا تھا۔ اور مالا کے سامنے مون کی اتنی سچ بات کا اثر زائل کر رہا تھا۔ جبکہ مالا تو ششدر لگی بڈرائنگ روم میں صرف مون کھڑی تھی تو پھر سوزن اور آفاق کہاں تھے؟ اس نے پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر پورا کمر اچھان مارا۔ اسے سوزن اور آفاق کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ جانے وہ اچانک کہاں چلے گئے تھے؟ مالا کو دیکھ کر کہاں چھپ گئے تھے؟ اس کی موجودگی محسوس کر کے کسی جگہ اور کہاں غائب ہوئے تھے؟ مالا کی آنکھیں صوفے کے پار، پردوں کے پیچھے دروازے کے دائیں

بانیں دیکھ دیکھ کر جھکنے لگی تھیں جبکہ مون اس کی کیفیات سے بے نیاز مائیٹ بولتی بھرتی اسی غرور کے ساتھ واپس گھر چلی گئی تھی۔ جبکہ میکس جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ مالا چونک کر میکس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”آفاق اور سوزن کہاں ہیں؟“ اس نے کمرے میں میکس کے علاوہ کسی اور کو نہ پا کر متفکر لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ مون کے چلے جانے پر قطعاً غور نہیں کر سکی تھی۔ وہ تو صرف آفاق اور سوزن کی آوازوں میں الجھی تھی۔

”وہ دونوں تو نہیں آئے۔ سوزن نے معذرت کر لی تھی جبکہ آفاق۔۔۔۔۔“ میکس بولتے، بولتے ایک دم رگ گیا تھا۔ جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا تھا۔ جیسے اچانک اسے کچھ خیال آیا تھا۔ پھر وہ سر جھٹک کر کچھ بولنا چاہتا تھا جب کارڈور سے ہیرا اور ابو بکر کے بولنے کی آواز سنائی دی تھی تب وہ مسکراتا ہوا اہٹل دیکھ کرنے باہر نکل گیا۔۔۔۔۔ جبکہ جاتے جاتے اس نے مالا کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔

”سوزن اور آفاق کہاں چلے گئے؟ ابھی تو ہیں تھے اور میرے خلاف بول رہے تھے۔“ مالا کی خود دکھائی میکس کو ضرور ٹھنکا دیتی جو اگر ہیرا کی چکار اس کا دھیان نہ ہلا دیتی۔ کچھ دیر میں میکس کے گئے گئے مہمان جمع ہو گئے تھے۔ پھر محفل زعفران زار بن گئی تھی۔ میکس نے تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا تھا، وہ بچوں کی طرح خوش نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے سب سے پہلے مالا کا شکر یہ ادا کیا، سب سے گفت و صول کرتے ہوئے وہ خوش ہونے کے ساتھ، ساتھ کچھ افسردہ بھی تھا۔ ابو بکر کے پوچھنے پر اس نے افسردگی سے کہا۔

”کیا تھا جو سوزن بھی میرا دل رکھنے کو آجاتی مگر اسے دل رکھنا آتا ہی کہاں ہے؟“ میکس کا لہجہ نرم سا تھا۔ اداس اور غمزوہ سا عجیب سا آنچ دیتا ہوا۔۔۔۔۔ جبکہ مالا تو اس کے الفاظ پر گویا دم بخود رہ گئی تھی۔

”سوزن بھی آجاتی؟ سوزن آئی تو تھی۔۔۔۔۔ یہ



**تراک وفا**

”کیا ہوا ہے تمہیں.....؟“ نورت اور غصے کو دبا کر بالکل پہلے کی طرح نارمل انداز میں بولتا کس قدر مشکل ترین امر تھا۔ مگر مالانے یہ مرحلہ بالآخر طے کر ہی لیا۔ وہ آفاق سے کلام کرنے پر خود کو تیار کر چکی تھی۔

”گلے میں بہت درد ہے، دوا بھی لے کر آیا ہوں مگر کچھ افاقہ نہیں۔“ آفاق نے تکلیف دہ کراہتی آواز میں کہا تھا۔ یقیناً وہ ہمدردی ٹوٹنے کے چکر میں تھا اور مالانے اتنی رحم دلی کا مظاہرہ کرنے سے کتراری تھی۔

”تو صبر کرو، آرام آ ہی جائے گا۔“ اس نے سنجی چھپا کر کہا۔

”کب سے صبر ہی تو کر رہا ہوں۔“ وہ پھر سے کرا۔  
 ”تو اب میں کیا کروں.....؟“ مالانے منہ بنا لیا تھا۔ دل تو جا رہا تھا کہ اسے خوب کھری، کھری سنا کر ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے نکال دے مگر اسے صبر کی طلب کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا تھا۔ یہ اس نے خود سے وعدہ کر رکھا تھا اور وہ عہد توڑنے والی بننا نہیں چاہتی تھی۔

”ایک کپ قہوہ بنا دو، مجھے لگتا ہے، قہوے سے افاقہ پاؤں گا۔“ آفاق نے مسکین صورت بنا کر فوراً فرمائش جڑی تھی۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا وہ کھٹ سے اسے جواب دے دیتی مگر اس ازلی مروت کا کیا کرتی؟ پھر وہ اپنی بد مزاجی سے آفاق کو چوکنا کرتا بھی نہیں چاہتی تھی، اس کا بدلہ روٹیہ دیکھ کر یقیناً وہ وجہ کھوج کر محتاط ہو سکتا تھا اور مالانے اسے محتاط نہیں کرنا چاہتی تھی، وہ ایسی ہی کسی سازشی پلاننگ میں آفاق اور سوزن کو رکنے ہاتھوں پکڑنا چاہتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب عیسیٰ بھی قریب ہوتا۔ اور اسے پوری امید تھی اللہ اسے بہت جلد ایسا ہی کوئی موقع فراہم کرنے والا تھا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی آفاق، مالانے کے لیے کتنے بے ہودہ الفاظ بول رہا تھا، وہ اس کا دشمن تھا اور آستین میں بیٹھ کر عیسیٰ پر وار کرنے والا

میکس کیا بے وقوف ہے؟ یا مجھے اتنی سمجھتا ہے؟“ وہ انتہائی سنجی اور بدگمانی سے سوچ رہی تھی۔ اس نے سوزن اور آفاق کے ساتھ میکس کو بھی اسی کیلنگری میں کھڑا کر دیا تھا۔ دھوکے بازوں اور فریبوں کی کیلنگری میں۔

☆☆☆

وہ ایک بھر پور شام گزار کر جب گھر واپس آئی تو آفاق کو لاؤنج میں کراہتے ہوئے پایا تھا۔ وہ صونے پر گلا پکڑے لیٹا تھا۔ اور ہائے دائے کیے جا رہا تھا۔ مالانے اسے دیکھ کر متحیر رہ گئی تھی۔ کیا آفاق چھلاوا تھا؟ بل میں ادھر اور بل میں ادھر..... مالانے پر تین حرف بھیج کر آگے بڑھ رہی تھی جب آفاق نے کراہتے ہوئے اسے پکارا تھا۔

”کیسی بہن ہو، تڑپتے بھائی کو نظر انداز کیے آگے بڑھ رہی ہو؟ رکتی کیوں نہیں؟ بندہ کسی کا احوال ہی پوچھ لیتا ہے۔“ وہ کہنی کے بل سر اونچا کیے بڑی دگی نظر سے مالانے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتے بڑھتے ایک دم رک گئی تھی۔ اسے آفاق کی ڈھٹائی پہ غش سا آ گیا تھا۔ کوئی اتنا ڈھیٹ بھی ہوتا ہے؟ کوئی اتنا بے شرم بھی ہوتا ہے؟ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ اگلے قدموں پیچھے ہٹے اور آفاق کے منہ پر تین چار طمانچے دے مارے۔ اس کا دل چاہا، وہ آفاق کا منہ توڑ کر اس کا کرپہ روپ، اندر کی سیاہی اور منافقت کا سارا کچا چٹھا کھول دے۔ مگر اس کے منہ پہ آیا سارا تلخ کلام ایک ضبط اور صبر کے تیز ریلے میں بہہ گیا تھا۔ اس نے انتظار کی طابوں کو تکی سے پکڑ لیا۔ وہ تدبیر کرنے والے کی سب سے بہترین تدبیر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے انتظار کرنا تھا۔ حقیقت کے کھلنے کا، سچائی کے ظاہر ہونے کا اور سوزن، سوزن، آفاق کی غلیظ پلاننگ کے کھلنے کا تو پھر وہ اتنا سارا انتظار کیوں نہ کر لیتی۔ جب تک علی عیسیٰ سب کچھ خود بخود نہ جان لیتا..... سو وہ اپنے اندر اٹھتی غصے کی لہروں کو دہاتے ہوئے واپس پلٹ آئی تھی۔



تھا، اس کے باوجود یہ مالا کے حوصلے، ہر اور ہمت کی انتہائی جوہ آفاق کے لیے قبوہ بنالائی تھی ورنہ اسے آفاق کے الفاظ بھولے تو نہیں تھے۔

”اس فلم کا ڈائریکٹر آفاق یعنی اہلق یعنی کہ میں ہوں..... علی بیسی کی آستین میں آرام فرمانے والا ڈیش، ڈیش اور ڈیش۔۔۔“ قبوہ بتائی مالا نے سختی سے آنکھیں میچ لی تھیں۔ کچھ دیر میں وہ قبوہ اہل گیا۔ اس نے تک میں قبوہ اظہر ل کر باہر کی طرف دیکھا۔ آفاق گھاڑ ہاتے ہوئے ابھی تک کراہ رہا تھا۔ جانے وہ تکلیف میں تھا یا محض اداکاری کر رہا تھا۔ کچھ گھنٹے پہلے کی اپنی بکواس کو کسی ڈرامائی سین کی طرح اسکرپٹ سے غائب کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کی کراہیں مالا کو کچھ دیر پہلے کی تکلیف اور زہریلے الفاظ بھولنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھیں جب ایک مرتبہ انسان نظر سے گر جاتا ہے تو کبھی دوبارہ اٹھ نہیں پاتا۔ سوزن اور آفاق، مالا کی نظر سے گر چکے تھے۔ اب وہ دوبارہ اپنا مقام زندگی کی آخری سانس تک بھی بھول نہیں کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں نال زمین پر گرا انسان اٹھ سکتا ہے، البتہ آنکھ سے گرا کبھی نہیں اٹھ سکتا۔ اسے انسانوں کی پہچان اس سے پہلے نہیں تھی۔ انسانوں کی پہچان اسے اب ہوئی تھی۔ آگہی کا عذاب بہت اذیت ناک ہوتا ہے اور مالا آگہی کے اس عذاب سے گزر رہی تھی۔

اس نے تک اٹھا کر رڑے میں رکھا۔ پھر کچھ سوچ کر رڑے دیں سلیب پر چھوڑ کر خود باہر آگئی تھی۔ اس نے تک کو کنڈے سے پکڑ رکھا تھا اور پھر آفاق کو تک پکڑاتے ہوئے اس نے دانستہ کنڈا نہیں چھوڑا، مجبوراً آفاق کو تک نیچے سے پکڑنا پڑا تھا۔ گرم قبوے کی وجہ سے تک بہت گرم تھا۔ آفاق کا ہاتھ بری طرح جل گیا۔

”ہائے، وائے، اولیٰ..... امی جی۔“ آفاق اچھل کر سیدھا ہوا تھا، تب تک مالا نے تک احتیاط سے دور ہٹا کر سینٹرل ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ ”جلن ہوئی ہو یا

زیادہ مگر ہوتی ضرور ہے۔“ اس نے مز کر صونے پر رکھے کشن سیدھے کیے تھے پھر ایک میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔ جانے یہ میگ کون لایا تھا؟ مالا تو ایک دو صفحات سے زیادہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ آج سے پہلے اس گھر میں مالا نے ایسا کوئی بھی میگزین نہیں دیکھا تھا۔ ایک نقش اور بے ہودہ۔۔۔ اسے میگزین پکڑے دیکھ کر آفاق اپنے ہاتھ کی جلن بھلا کر میگ پر جھپٹ پڑا تھا۔ پھر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز، تیز قدموں سے چٹا ہوا باہر نکل گیا۔ مالا بھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گلاس وٹڑہ کی طرف بھاگی تھی۔ وہی ٹائیٹون کے جالی دار پردے کو ہٹا کر مالا نے باہر جھانکا تو آفاق کو میگ بھاڑ کر ڈرام میں پھینکتے ہوئے دیکھ کر کچھ حیرت ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد آفاق ہاتھ بھاڑتا اندر آ گیا۔

”یہ میگزین کون لایا تھا؟ عیسیٰ دیکھ لیتا تو قیامت آجاتی۔“ آفاق تیز تیز بولتا گلے میں سے گھر گزر کر نکلتی آواز کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ تب مالا کی بھو میں ایک دم تن گئی تھیں۔

”تمہاری اس بات کا مطلب کیا ہے؟ ذرا وضاحت کرو گے؟ یہ میگزین کون لایا تھا؟“ مالا نے جیسے اس کے لہجے اور الفاظ کی نقل اتاری تھی۔

”مجھے کیا پتا.....؟“ آفاق نے کندھے اچکائے تھے پھر تک اٹھا کر قبوہ سڑکنے لگا۔ اس کی.... بے نیازی نے مالا کا اشتعال کچھ اور بڑھا دیا تھا۔

”تو پھر کیا یہ بے ہودہ میگ میں لائی ہوں؟“ اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے تھے۔ انتہائی بے ہودہ تصویروں والا وہ رسالہ جس پر مالا نے دوسری نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی اور اسے اپنے گھر کے نیوز پیپر ایک میں دیکھ کر اسے غصہ تو آتا ہی تھا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا.....؟“ آفاق اس کے غصے سے ایک دم سہم گیا تھا۔ (ایکٹرن ہو تو) وہ خون رنگ آنکھوں سے مسلسل اسے گھور رہی تھی۔

”تو پھر.....؟“ وہ اسے بخشنے والی نہیں تھی۔



آفاق کچھ ہونق ہو گیا۔

”تم کیا سمجھ رہی ہو، یہ میگزین میں لایا ہوں؟“ آفاق نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا تھا۔ قبوہ پینے سے گلے کو تقویت ملی تو وہ بھی فارم میں آ گیا۔

”پھر کون لایا ہے؟ عیسیٰ؟ میں یا چاچو۔۔۔؟“

مالا کے تیور غصیناک تھے۔ آفاق پھر سے ہم گیا۔

ڈرامے باز صاف ایکٹنگ کرتا نظر آ رہا تھا۔

”آئی سوئیر مالا۔۔۔! مجھے اتنے بے ہودہ رسالے خریدنے کا کوئی شوق نہیں۔“ آفاق اب...

بڑی عاجزی سے کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد یہ بے مقصد بحث عیسیٰ کی آمد کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ عیسیٰ کے آتے ہی مالا کو میکس کی پارٹی میں مومن، سوزن اور آفاق کی بکواس پھر سے یاد آ گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً آفاق کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دے مگر بعض قوی خواہشات جتنی بھی قوی ہوں ان کو پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ بھی بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک انتظار کی زنجیر میں بندھ گئی تھی۔ وہ قبل از وقت کچھ بھی بول کر عیسیٰ کو بدگمان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنا اعتبار ہلکا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی عیسیٰ خود سوزن، مومن اور آفاق کی اہمیت کھوج نکالے، ان کی مکاری، عیاری اور سازش کو سمجھ لے اور ایسا ناممکن تو ہرگز نہیں تھا۔

عیسیٰ کے آتے ہی مالا کی معروضیات بڑھ جاتی تھیں، اسے سونے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ ان دنوں عیسیٰ رات کو بھی گھر میں رہتا تھا سو وہ بے نام سا خوف اور عجیب سی آہنیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ کبھی، کبھی مالا کو لگتا تھا یہ اس کے اپنے ہی ذہن کے دوسرے ہیں، سو وہ سر جھٹک کر نظر انداز کر دیتی تھی ویسے بھی بڑے دنوں سے وہ سفید لہاؤں سے لپٹی عورت دکھائی نہیں دی تھی۔ مالا کی ماری ہوئی گئی نے جیسے گولی کا کام کیا تھا۔ وہ دوبارہ دکھائی ہی نہیں دی۔ حالانکہ مالا کو اس سے دوبارہ ملاقات کا خاصا اشتیاق تھا۔

چونکہ بہت دنوں سے کوئی عجیب واقعہ رونما نہیں ہوا تھا سو چاچو سمیت کبھی دلی اطمینان محسوس کر رہے تھے۔ حالانکہ جانتے بھی تھے کہ یہ اطمینان بس عارضی ہے۔ تاہم کچھ دن تک سکون سے تو رہا جاسکتا تھا۔ اس دوران آفاق نہ جانے کہاں سے ایک بزرگ خاتون کو دریافت کر لایا تھا۔ جنہوں نے پورے گھر کے کونے، کونے پرز عمران اور گلاب کے عرق میں بھیجے تھوید والے پانی سے چھڑکاؤ کیا تھا پھر بلند آواز میں قرآنی آیات کی تلاوت پورے تین دن تک کرتی رہی تھیں۔ جرمنی میں اسکی گلیڈ بزرگ عورت کو دیکھنا بہت تعجب انگیز تھا۔ پھر مالا کو پتا چلا کہ یہ بزرگ عورت ڈاکٹر ابو بکر کی والدہ ہیں جو ایران سے آئی تھیں اور ان کے پاس روحانی علم تھا۔ پیرا کی سانس سے مل کر مالا کے بہت سے دوسرے خود بخود ختم ہو گئے تھے۔ ہالہ صاحبہ نے بتایا تھا ان کے گھر پر کوئی بھی آسیب نہیں ہے۔ مالا اپنے دل سے ہر وہم نکال دے۔ انہوں نے مالا کو کثرت سے ذکر الہی کے متعلق ہدایات دی تھیں اور جاتے، جاتے انہوں نے انکشاف کیا تھا کہ مالا کسی کی بد نظر کے حصار میں ہے اور ستاروں کی نحوست کا اس پر اثر ہے۔ ہالہ صاحبہ ایک ہفتے کے لیے جرمنی آئی تھیں۔ انہیں جلد واپس چلے جانا تھا۔ اور مالا چاہتی تھی کہ جانے سے پہلے وہ ان کی دعوت کرے۔ اس ضمن میں اس کا بروگرام بھی طے ہو چکا تھا جو جلد ہی ترتیب پایا اس روز کھانے کے دوران بھی مالا اپنی ڈسکس کرنا چاہتی تھی مگر آفاق اور عیسیٰ نے ایک الگ موضوع چھیڑ رکھا تھا۔ وہ نوٹ تو کب سے کر رہی تھی کہ آفاق، عیسیٰ کے کانوں میں گھسا ہوا ہے مگر اپنی سوچوں میں گم ہونے کی بیماری کے باعث وہ ان کی گفتگو سننے سے محروم رہ گئی تھی۔ اب جبکہ وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو چکی تھی تو وہ دونوں ہی منہ بند کیے کھانا کھانے میں لگن ہو چکے تھے۔ عیسیٰ کے چہرے پر...



ہوں۔“ وہ آنکھوں میں شرارت بھرے اسے چھیڑ رہا تھا۔ عیسیٰ کی توقع کے عین مطابق وہ فوراً ابرامان گیا۔  
”میں کیوں نظر لگاؤں گا۔ بھلا بہنوں کے شوہروں کو نظر لگائی جاتی ہے؟“ اس پل جو بھولپن آفاق نے اپنے چہرے پر پینٹ کر رکھا تھا مالا کو ایک دم مڈ ماسک لگا۔ اس کا دل چاہا، آفاق مکار لومڑے کا منہ ہی نوج لے۔ مگر وہ یہ سب صرف سوچ سکتی تھی۔ عمل کرنا آسان نہیں تھا۔

”اب مسک مت لگانا..... میں اپنی .... بنے غم (جیم) کے ہاتھ کا لذیذ کھانا کھا کر نفل ہو چکا ہوں۔“ عیسیٰ نے مسکرا کر جتایا۔

”تو پھر شکی سے کچھ آگے بھی بڑھو۔“ آفاق بری طرح چڑ گیا۔

”ہوں..... تو یہ بات ہے۔“ وہ گویا سمجھ کر مسکرایا تھا۔ آفاق نے فوراً پاجامیں کھلا لیں۔

”تھی ہاں..... یہی بات تو تھی۔“ آفاق ضرورت سے زیادہ ہی ایکساٹنڈ ہو گیا۔

”بھلا کون سی.....؟“ عیسیٰ نے اگلے ہی لمحے اس کی پوری ایکساٹنڈ کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم۔“ آفاق کو غصہ آ گیا۔ ادھر مالا برتن اٹھاتی ٹھنک کر دک گئی تھی۔

”بھاڑ میں جاؤ تم.....“ وہ زبردستی بڑ بڑاتی پھر جیسے پھٹ پڑی۔ ”اور تم بھی۔“ مالا کا ردِ عمل اچانک سامنے آیا تھا۔ وہ دونوں بری طرح سے چوکے تھے۔

مالا ان کے تاثرات دیکھنے رکی نہیں تھی بلکہ فوراً ہی کچن میں چلی گئی۔ آفاق اس کی بات پر کچھ دیر تک کے لیے بھونچکا رہ گیا تھا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

مالا کی زندگی کس نہج پر جا رہی تھی وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر نہیں کیا جلی عیسیٰ بھی مالا کے ساتھ کھیل کھیل رہا تھا؟ یہ سب جانبی اگلے ماہ کے شمارے میں

بے نیازی تھی جبکہ آفاق کا منہ پھولا ہوا تھا۔ جانے ان کے درمیان کیا بات ہوئی تھی؟ مالا کو فطری ساجس ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد آفاق نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ وہ زیادہ دیر جب نہیں رہ سکتا تھا۔

”تمہیں میرا کچھ احساس ہی نہیں.....“ وہ دکھی سا نظر آ رہا تھا۔ لہجے میں ہزاروں شکوے تھے۔ مالا کو اس کی لدا کاری پر سخت ناؤ آنے لگا تھا۔ خصوصاً جب وہ عیسیٰ کی شکل بنا کر اپنی کوئی بھی بات عیسیٰ سے منوالیتا تھا۔ اور عیسیٰ ایسا نرم ہول تھا کہ اس فوراً کچھ جاتا۔

”تمہارا احساس نہ ہوتا تو تم میرے سامنے بھی بیٹھے نہ ہوتے۔“ عیسیٰ نے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا تھا جو کچھ دیر پہلے مالا نے بھر کے رکھا تھا۔ وہ معمول کے مطابق عیسیٰ کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ رکھتی جا رہی تھی۔ حالانکہ پہلے یہی معمول عیسیٰ کا تھا مگر اب مالا نے اس کی گدی سنبھال لی تھی۔ آفاق سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا تھا، فوراً منہ بسور کر بولا۔

”تم چاہتے ہی نہیں، میرا بھی کوئی خیال رکھے مالا کی طرح.....“ آفاق کے دکھ کا پس منظر دیکھتے ہوئے

مالا کے منہ میں کڑوے بادام آگئے تھے۔ یقیناً وہ اپنی سے شادی کی بات کر رہا تھا۔ ایک منافع، فخر ہی اور دیگر شخص محسوس ہی اتنی کو اپنے جان میں بھانسنے والا تھا۔ کیا

خبر، آفاق کی اس میں بھی پلاننگ شامل ہو..... وہ بیچرز بنا کر اتنی کو چھوڑ دے یا کوئی اور بڑا ڈانٹ سے جائے۔

بھلا منافع اور جھوٹے لوگوں پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ مالا کے اندر باہر بے چینی بھر گئی تھی۔ وہ اپنی شخص سہیل کو کیسے اس فراڈیے سے بچا پاتی؟

”میں کیوں نہیں چاہوں گا.....؟“ عیسیٰ نے کھانا ختم کر کے ٹیکن سے ہاتھ پونچھے تھے۔ اب وہ فراغت کے ساتھ آفاق کو جواب کر سکتا تھا۔ ”میں تو چاہتا ہوں، کل کے بجائے آج تمہارا نکاح پڑھا دوں..... کم از کم تمہاری بد نظر کا فوکس تو بدلے گا۔ ضرورت تم میری اور مالا کی محبت کو نظر لگانے والے

”میں کیوں نہیں چاہوں گا.....؟“ عیسیٰ نے کھانا ختم کر کے ٹیکن سے ہاتھ پونچھے تھے۔ اب وہ فراغت کے ساتھ آفاق کو جواب کر سکتا تھا۔ ”میں تو چاہتا ہوں، کل کے بجائے آج تمہارا نکاح پڑھا دوں..... کم از کم تمہاری بد نظر کا فوکس تو بدلے گا۔ ضرورت تم میری اور مالا کی محبت کو نظر لگانے والے

”میں کیوں نہیں چاہوں گا.....؟“ عیسیٰ نے کھانا ختم کر کے ٹیکن سے ہاتھ پونچھے تھے۔ اب وہ فراغت کے ساتھ آفاق کو جواب کر سکتا تھا۔ ”میں تو چاہتا ہوں، کل کے بجائے آج تمہارا نکاح پڑھا دوں..... کم از کم تمہاری بد نظر کا فوکس تو بدلے گا۔ ضرورت تم میری اور مالا کی محبت کو نظر لگانے والے

”میں کیوں نہیں چاہوں گا.....؟“ عیسیٰ نے کھانا ختم کر کے ٹیکن سے ہاتھ پونچھے تھے۔ اب وہ فراغت کے ساتھ آفاق کو جواب کر سکتا تھا۔ ”میں تو چاہتا ہوں، کل کے بجائے آج تمہارا نکاح پڑھا دوں..... کم از کم تمہاری بد نظر کا فوکس تو بدلے گا۔ ضرورت تم میری اور مالا کی محبت کو نظر لگانے والے

”میں کیوں نہیں چاہوں گا.....؟“ عیسیٰ نے کھانا ختم کر کے ٹیکن سے ہاتھ پونچھے تھے۔ اب وہ فراغت کے ساتھ آفاق کو جواب کر سکتا تھا۔ ”میں تو چاہتا ہوں، کل کے بجائے آج تمہارا نکاح پڑھا دوں..... کم از کم تمہاری بد نظر کا فوکس تو بدلے گا۔ ضرورت تم میری اور مالا کی محبت کو نظر لگانے والے

”میں کیوں نہیں چاہوں گا.....؟“ عیسیٰ نے کھانا ختم کر کے ٹیکن سے ہاتھ پونچھے تھے۔ اب وہ فراغت کے ساتھ آفاق کو جواب کر سکتا تھا۔ ”میں تو چاہتا ہوں، کل کے بجائے آج تمہارا نکاح پڑھا دوں..... کم از کم تمہاری بد نظر کا فوکس تو بدلے گا۔ ضرورت تم میری اور مالا کی محبت کو نظر لگانے والے

”میں کیوں نہیں چاہوں گا.....؟“ عیسیٰ نے کھانا ختم کر کے ٹیکن سے ہاتھ پونچھے تھے۔ اب وہ فراغت کے ساتھ آفاق کو جواب کر سکتا تھا۔ ”میں تو چاہتا ہوں، کل کے بجائے آج تمہارا نکاح پڑھا دوں..... کم از کم تمہاری بد نظر کا فوکس تو بدلے گا۔ ضرورت تم میری اور مالا کی محبت کو نظر لگانے والے



ناولٹ

ترک و فنا

نایاب جیلانی



آٹھواں حصہ



بیک کر لیا تھا، گہرے، ارد بیرے اور پھیر زخ کی سلاد بنائی پھر ہن خون (چوزے کے گوشت) کو سینوں پر بھوننا..... کوئلے دہکا کر سینوں پر بوٹی چڑھا کر پکانے کا الگ ہی مزہ تھا تاہم یہاں وہ کوئلے لانے کا تردد کیسے

ہالہ صاحبہ کی دعوت کے لیے اس نے بڑا اہتمام کر رکھا تھا..... ڈیزہ گھٹنا لگا کر تو اس نے محض صرف کھانے پینے کی اشیاء کے متعلق لسٹ بنائی تھی، سو سے سے لے کر پفان کو خن تک البتہ پڑا اس نے خود ہی



گھڑی پر جی تھی، مالا نے بھی گھڑی کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

”بس ایک گھنٹے تک.....“ اب وہ جیم بھر کے ایک کے گھڑوں پر ٹھنڈا کسٹر ڈال رہی تھی۔ پھر اس نے کئی ہوئی چیری اور کیلے بھی کسٹر پر پھیلا دیے۔ جلی کے گھڑے بھی سج گئے تھے۔ یہ کچن میں آخری آٹم اس کے ہاتھوں تیار ہوا تھا۔ اب وہ ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے ہی باہر نکل آئی تھی۔ چاچو کمرے میں جانے کے بجائے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ یقیناً مہمانوں کے استقبال اور انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے..... ویسے بھی ہالہ صاحبہ کا ان لوگوں کے دلوں میں بڑا احترام بھرا گیا تھا۔ خصوصاً اس وقت جب انہوں نے مالا کے دل سے آسیب کا وہم نکال دیا تھا۔ اب چاچو اسے آسیب کے حوالے سے چھیڑتے نہیں تھے، وہ تو اسی بات پر ہالہ صاحبہ کے شکر گزار تھے جنہوں نے مالا کے ذہن سے دوسرے نکال دیے تھے۔ اب بھی ہالہ صاحبہ کے متعلق باتیں کرتے انہوں نے اچانک انی کی فیملی کے متعلق بھی پوچھ لیا تھا۔

”کیا سامنے والوں کو کھانے پر نہیں بلا یا؟“ چاچو نے کچھ چونک کر مالا سے پوچھا تھا جو جانے کس مراتبے میں مصروف تھی۔ ایک دم ہڑ بڑا کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”بلا یا ہے چاچو.....! عیسیٰ نے خود انہیں انوائٹ کیا ہے۔“ مالا کچھ کھنچے، کھنچے انداز میں بولی تھی۔ چاچو نے اپنے دھیان میں مالا کا رویہ نوٹ نہیں کیا تھا ورنہ وہ ضرور ٹھکتے..... انی کی فیملی سے مالا کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ وہ انہیں بخوشی کھانے پہ بلاتی مگر آج کے بلاوے کا کچھ خاص مقصد تھا۔ یعنی آج عیسیٰ، انی کی مہمی سے آفاق اور انی کے نکاح کی بات کرنے والا تھا اور مالا کی کچھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ عیسیٰ کو کیسے روکے..... انی کو آفاق کی اصلیت کیسے بتائے؟ اور وہ اس بہت اچھی فیملی کو آفاق کے ”شر“ سے کیسے محفوظ کرے، کبھی اس کا دل چاہتا وہ انی کو صاف،

انہیں اچانک خیال آیا تھا۔  
”یہ نئی کدھر ہے؟“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ذرا حیران ہوئے۔

”وہ چھٹی ہے۔“ مالا نے بے پروائی سے بتایا تھا۔ وہ سادہ اسٹینج ایک شیشے کے چمکیلے پاؤں میں سجا کر ایک کے اوپر جیم کی موٹی بیجا رہی تھی پھر اس نے ایک کے سینڈ وچ بنا لیے، درمیان میں خوب ڈھیر سارا جیم بھر رکھا تھا۔ ان سلائمز کو کرسٹل کے ڈش نما پاؤں میں سلیتے سے اس نے پھیلا دیا تھا۔ اب وہ فرنج سے دودھ نکال رہی تھی جس میں اس نے بالائی پہلے سے کس کر رکھی تھی۔ کام کرتے ہوئے بھی اس کا دھیان چاچو کی طرف تھا۔

”یہ نئی بہت چھٹیاں کرنے لگی ہے۔ اسے خبر بھی ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں مگر یہ سیلفش لوگ! بس اپنی دفعہ مزاد رونے سنا دے گی مگر دوسروں کی پروا نہیں۔“ انہیں مالا کی بہت فکر تھی سو اسی لیے نینی کو ڈانٹ رہے تھے حالانکہ نینی کو اس گھر میں خاصی کھلی چھوٹ دی گئی تھی۔

”میں ٹھیک تو ہوں چاچو.....“ مالا جھپٹی جھپٹی سی بولی تھی۔ آج کل اس کی خرابی طبیعت بھی عیسیٰ اور چاچو کے لیے سخت قسم کا ایڈیو بنا ہوا تھا۔ ان دونوں باپ، بیٹے کو مالا کے آرام، صحت اور ڈائٹ کے متعلق ہدایات دینے کا خط سوار تھا اور دونوں ہی مالا کے لیے حد درجہ کانسٹنس تھے۔ چاچو کو تو مالا کا کچن میں ان دنوں جانا سرے سے گوارا ہی نہیں تھا۔ یہ تو مالا جان بوجھ کر ضد کر لیا کرتی تھی۔ ویسے بھی وہ آرام کر کر کے اور فارغ رہ رہ کر آکتا چکی تھی۔ ان دنوں عیسیٰ نے اس کا شولے جانا بھی بند کر رکھا تھا سو وہ کبھی ابکیاں کرتی اور کچھ دیر آرام کر کے پھر کچن میں گھس جاتی۔ دراصل کچن کی مصروفیت کے علاوہ کوئی اور مصروفیت بھی تو نہیں تھی۔

”ہاں..... ٹھیک تو ہو ماشاء اللہ سے۔“ انہوں نے مالا کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر بولے۔ ”کب تک آئیں گے مہمان؟“ ان کی نگاہ

سے بولے تھے۔ مالا انہیں کیے بعد دیکرے تیسری بوٹی پہ ہاتھ صاف کرتے دیکھ کر فوراً چینی تھی۔

”بس کریں چاچو! کیوں اپنے بیٹے سے مجھے پوچھنا ہے۔“ وہ کچھ خوف زدہ بھی تھی کیونکہ املی کی کھٹی چٹنی کے اثرات جلد ہی ان کی خرابی طبیعت کی صورت میں ظاہر ہو سکتے تھے پھر عیسیٰ کا غصہ سہنا لگ تھا..... وہ اس بات پر ذرا بھی کپرو ماڑ نہیں کرتا تھا۔ اپنے باپ کی صحت اور ان کی زندگی عیسیٰ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھی۔ وہ اپنے باپ پر جان دیتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ ماما کی دائمی جدائی پر وہ جلد مستجمل گیا تھا مگر باپ سے کچھ ایسا لاقافی عشق تھا کہ اسے لگتا، پاپا کو کچھ ہو گیا تو وہ زندہ نہیں رہ پائے گا..... کچھ ایسی ہی محبت میں وہ جلتا تھا۔ جب سے وہ اسپتال رہ کر آئے تھے تب سے تو عیسیٰ کچھ زیادہ ہی بے یقینی کا شکار تھا۔ گھر میں ہوتا تو رات کو لازمی دو تین مرتبہ پاپا کے کمرے میں جھانک کر آتا۔ اکثر وہ عیسیٰ کی چوری پکڑ لیتے۔ وہ آتا بھی تو دبے پاؤں تھا۔ پاپا کو سوتا دیکھ کر پُرسکون ہو جاتا اور جاگتا دیکھ کر جھینپ جاتا۔

”نہیں مرنے والا میں..... ابھی تمہارے بچوں کے بچوں کو بھی کھلانا ہے۔ کیوں دھڑکا لگا رہتا ہے تمہیں۔“ اگر ان کی آنکھ کھل جاتی تب عیسیٰ کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس کی خوب کلاس لیتے مگر اس ڈانٹ ڈپٹ میں بھی محبت کا الگ قسم اور رنگ کا ڈانٹہ گھلا ہوتا تھا۔ وہ عیسیٰ ہی کیا جو ان کی ڈانٹ پر کان دھر لیتا..... اس نے اپنی روئین ترک نہیں کی تھی۔ وہی صبح ان کو اپنی نگرانی میں کچھ نہ کچھ کھلانا، لچ ٹائم میں مالا کو ہدایات اور ڈنر کے وقت پھر سے کڑی نگرانی ہوتی تھی۔ اکثر چاچو چڑنے لگتے۔

”میرے کھانے پینے کے دشمن! کھالینے دو مجھے، اپنے حصے کا رزق ختم کرتا ہوں۔“ وہ بد پرہیزی میں پی ایچ ڈی کیے ہوئے تھے۔ انہیں بھلا کون روک سکتا تھا۔ جس طرح مالا اب بھی انہیں روک نہیں پاتی تھی اور وہ مزے سے کوک کا گلاس بھی چڑھا گئے تھے پھر جیسے

کرتی.....؟ نرم، نرم بوٹیوں کو سینوں میں کھبا کر ایک ٹرک تندور میں پکایا تھا۔ پھر جب ایک، ایک کر کے تمام سببیں بڑے میں سجا لیں تو پورا کچن اشتہا انگیز خوشبو سے مہک گیا تھا..... املی اور آلو بخارے کی چٹنی بوٹیوں پر پکھل رہی تھی..... کھٹی میٹھی اور ٹمکن سے ڈانٹتے اور خوشبو میں تھڑی بوٹیوں نے چاچو کو کمرے سے کھینچ کر باہر نکال دیا تھا..... وہ خوشبو کا پیچھا کرتے دے قدموں کچن میں چلے آئے..... مالا نے سببیں بڑے میں سجا کر رکھی تھیں۔ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی اور اب وہ پڑا ایک کرنے کی تیاریوں میں مگن تھی۔

چاچو نے ایک سٹخ اڑائی اور پھر اگلے قدموں واپس ہو لیے۔ عموماً عیسیٰ ان کا ڈائٹ چارٹ بناتا تھا جس میں ایسی کسی بد پرہیزی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی..... مگر وہ کبھی کبھار ایسی انجوائے منٹ ضرور کر لیتے تھے۔ اب ہوا یوں کہ چاچو چپکے سے کھسک لیے تھے جبکہ مالا کو ہلکی سی آہٹ سنانی دی تھی۔ قدموں کی ہلکی سی چاپ جیسے کوئی کچن میں دبے قدموں داخل ہوا تھا۔ بڑا کے لیے ٹائمر سیٹ کرتے مالا کے ہاتھ ہولے سے کپکپا گئے تھے۔ اس کا دل یک لخت بہت زور سے دھڑکا تھا مگر اس نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ خوف کچھ اس طرح سے حواسوں پر چھایا تھا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ ”اوف“ کی بھیانک آواز نے مالا کو گردن موڑ کر پہلے دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر چاچو کو سچ چھپاتے اور ہونٹ سہلاتے دیکھ کر مالا گویا سمجھ گئی تھی۔ وہ گرما گرم بوٹی منہ میں رکھنے کی غلطی میں ”پکڑنے“ جا چکے تھے۔ صورت حال مستحکم خیر تھی۔ مالا کو بے طرح ہنسی آگئی۔

”دیکھ لیا چوری کرنے کا انجام.....“ وہ صانی سے ہاتھ پونچھتی چاچو تک آئی تھی جو ذرا بھی شرمندہ نظر نہیں آرہے تھے۔ تاہم اسے ہنستا دیکھ کر قدرے برا مان گئے۔

”تم ہنس لو، ہمارے حال پر.....“ وہ پھونک مار کر خالص دیسی طریقے سے بولی کھاتے ہوئے مزے



صاف آفاق اور سوزن کی ملی بھگت کا بتا دے..... مگر وہ بتائے بھی کیا.....؟ اگر کسی نے ثبوت مانگ لیا تو..... یہاں آکر اس کے تمام ارادے ڈانواں ڈول ہو جاتے تھے۔ اسے نہیں لگتا تھا کہ وہ کبھی عیسیٰ اور انی کو آفاق کے کروت بتا سکے گی۔ یہ کہ رات کی تاریکی میں وہ مالا کے گھر میں، مالا کو ہی آسیب کا دھوکا دے کر سوزن اور مون کے ساتھ گہری پلاننگ کے بعد سے ”خوفزدہ“ کر رہا ہے۔ بات عقل میں سامنے والی تو تھی اگر کوئی سمجھ لیتا تو تب ناں..... انی تو عیسیٰ کی طرح ہی آفاق کی اچھائیوں اور محبت میں اندھی ہو چکی تھی۔ اسے تو آفاق کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح عیسیٰ بھی آفاق پر اندھا اعتماد کرتا تھا..... اگر جو میکس کے گھر میں ہونے والی سوزن، مون اور آفاق کی گفتگو عیسیٰ کو سنوادی جاتی تو تب..... ہاں تب عیسیٰ یقین کر سکتا تھا..... پھر اسے کسی اور ثبوت کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوتی..... اور شاید بہت سے لوگ آفاق کے شر سے محفوظ رہ جاتے۔ تو کیا اسے کوئی ریکارڈ پلیئر اپنے ساتھ رکھنا چاہیے تھا؟ ہاں، وہ ایک ریکارڈ پلیئر ضرور خریدے گی۔ پہلی فرصت میں، آج نہیں کل ہر صورت..... وہ جیسے ایک نتیجے پہ پہنچ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ چاچو اس کی سوچوں سے بے نیاز مشہور اٹھلیٹ کارل لیوس کے کارنامے نی وی پہ ملاحظہ کر رہے تھے پھر انہوں نے گردن موڑ کر مالا کو دیکھا اور بولے۔

”میں عیسیٰ سے کہوں گا، اب آفاق اور انی کے بارے میں بھی کچھ سوچ لے۔ انی کے یہاں آنے سے تمہاری تنہائی بٹ جائے گی۔ میں بڑھا تو بیماری کے جھکے کی وجہ سے اب بولنے اور گپ شپ لگانے سے بھی رٹا رٹا ہو گیا ہوں۔“ وہ مالا کو گم مسم بیٹھا دیکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ مالا کچھ سوچ کر سیدھی ہو گئی تھی پھر اس نے حیرانی سے چاچو کو مخاطب کیا تھا۔

”تو کیا شادی کے بعد بھی آفاق ادھر رہے گا؟“ اس کے لہجے میں واضح چہمن اور ناگواری تھی۔ یوں کہ لاؤنج کے دروازے سے اندر آتا آفاق لہجے بھر کے

لیے ٹھنک کر رک گیا تھا۔

”میری اور عیسیٰ کی خواہش تو یہی ہے۔ تاہم آفاق شاید نہ مانے۔“ چاچو نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا تھا۔ گویا اس موضوع پر وہ آفاق سے طویل بحث کر چکے تھے مگر آفاق شاید مان نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود مالا نے حیرت اور ناگواری کا برملا اظہار کرتے ہوئے آفاق کے سر پر طنز کی ضربیں ماری تھیں۔ وہ آفاق کو اندر آتے اور دروازے میں رکتے دیکھ چکی تھی۔ اب وہ اتنا سنہری موقع بھلا کیسے گنوا دیتی۔ آفاق کو غیرت دلانے کا یہی تو بہترین وقت تھا۔

”آفاق کیوں نہیں مانے گا، یہ جگہ ہر لحاظ سے بہتر ہے اس کے لیے، نہ کرائے کا جھنجٹ اور نہ کھانے کا بل..... سب کچھ ریڈی میڈ اور فری میں مل جاتا ہے۔“ مالا نے کن انکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ اسے آفاق کے جوتے نظر آ رہے تھے۔ وہ زمین پر پیر جمائے کھڑا تھا۔ شاید نعت زدہ تھا یا غصے میں۔ بے حال، مالا اس کے چہرے کی طرف دیکھ نہیں سکتی تھی۔ حالانکہ وہ آفاق کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی۔

”وہ تو بڑا خود دار لڑکا ہے بیٹا.....! بس عیسیٰ کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہے۔“ چاچو نے برابر آفاق کی حمایت جاری رکھی تھی۔ ادھر مالا، آفاق کی تلملاہٹ کا جزہ لینا چاہتی تھی۔ وہ اسے چھپ کر ذلیل اور خوفزدہ کرتا تھا، مالا اسے سامنے کھڑا کر کے طنز کے تیر پھینک رہی تھی۔ اب اتنا تو وہ جانتی ہی تھی کہ آفاق اب یہاں زیادہ دیر ٹھہرنے والا نہیں۔ زیادہ نہ سہی تھوڑی بہت تو اس میں غیرت ضرور ہوگی۔ اب مالا کے اتنے کھلم کھلا اشارے کو بھی نہ سمجھتا تو پھر آفاق کی مکاری پر بھی لعنت ہی تھی مگر وہ بے غیرت اتنی مراعات چھوڑ کر جاتا بھی کیوں..... یہاں سے چلا جاتا تو مالا کو آنوں بہانوں سے خوف زدہ کیسے کرتا؟ آفاق کو تو ہر پہلو پہ سوچنا تھا جبکہ مالا سمجھ رہی تھی کہ اس کی طنز یہ گفتگو سن کر وہ پوریا بستر سینے فوراً نو دو گیارہ ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ وہ چاچو کے محبت بھرے جملوں کو سیلوٹ کرتا فوراً اندر چلا

تو کہ وفا

تھیں۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر ابو بکر، ہیرا اور ہالہ صاحبہ بھی آگئیں پھر میکس، ایجنس اور ایوا بھی پہنچ گئے تھے۔ عیسیٰ نے اپنے ایک دو قرعے جانیے والوں کو بھی بلا رکھا تھا۔ کیونکہ اس تقریب میں باقاعدہ آفاق اور انی کے نکاح کی ڈیٹ بھی رکھی جانی تھی۔ ہالہ صاحبہ کے اعزاز میں دی گئی یہ دعوت بہت مبارک ثابت ہوئی تھی۔ کم از کم --- آفاق کے لیے تو بہت ہی مبارک تھی۔ اس کے من کی مراد برآئی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح انی کے پیر بھی زمین پر ٹک نہیں رہے تھے۔ مالا ان دونوں پر سوائے افسوس کرنے کے کچھ اور نہیں کر سکتی تھی۔ آفاق کو تو خوش ہونا ہی تھا۔ اس کی زندگی سنور رہی تھی۔ اس کا فوج بننے والا تھا۔ کچھ سال اور گزرتے تو نیشنلسٹی بھی مل جاتی پھر انی کا کیا حشر ہوتا؟ یہ مالا تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتی تھی۔ اتنی حسین اور تعلیم یافتہ لڑکی کو آفاق کے ہاتھوں خوار ہوتے دیکھنے کا حوصلہ کم از کم مالا میں نہیں تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ صرف ایک مرتبہ تو وہ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے انی کی آنکھیں ضرور کھولے گی۔ آگے جو بھی ہو، وہ اس کے نصیب ہوں گے یا احقانہ فیصلے..... کم از کم وہ گلٹی فیمل تو نہیں کر سکے گی ناں..... اسے یہ دیکھ کر اور پچھتاوا تو نہ ہوگا کہ اس نے انی جیسی لڑکی کو دھوکے میں رکھا اور آفاق کی گھٹاؤنی شکل دکھا نہیں پائی۔

اس تقریب کے اختتام پر بزرگ مہمان گھروں کو روزانہ ہو گئے تھے جن میں ہالہ صاحبہ بھی شامل تھیں۔ البتہ مالا کے کچھ کلاس فیوز اور انی، ایچی ابھی تک یہیں تھیں۔ پھر یوں ہوا کہ ڈاکٹر ابو بکر اور ہیرا نے برج کھیلنے کا شوشا چھوڑ دیا تھا۔ یہاں پر تقریباً سبھی برج کے شائقین تھے جن میں عیسیٰ صاحب بھی سرفہرست تھے۔ اسی دوران ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کم از کم مالا کے لیے ایک واقعہ ہی تھا۔ کنٹریکٹ برج سے پہلے مون صاحبہ تشریف لے آئیں۔ توقع کے برخلاف، بالکل اچانک، بیمار باپ کا احوال پوچھنے تو انہیں سکی تھی۔ اب جانے کس مقصد کے تحت آئی تھی۔ سوزن،

آیا تھا۔ پہلے کی طرح ہشاش بشاش اور ہنستا مسکراتا..... وہ کمال کا ایکٹر تھا۔ اتنی بکواس سن کر بھی بے غیرتوں اور ڈھیٹوں کی طرح مسکرا رہا تھا۔ اپنے جلد آنے کی اس نے وجہ یہ بتائی تھی کہ عیسیٰ نے اسے گھر بھیجا تھا تا کہ وہ مالا کی کچھ مدد کروا دے۔ مارکیٹ سے کچھ لانا ہے تو وہ بھی لا کر دے۔ چاچو تو آفاق کو دیکھ کر ویسے بھی کھل اٹھے تھے۔ اب بھی اسے کچن کے کاموں میں دلچسپی لینا دیکھ کر فوراً بولے۔

”مالا نے سب کچھ بتا لیا ہے۔ تم چینیج کر کے آ جاؤ، شطرنج کی ایک بازی ہو جائے۔“ چاچو کا جوش دیدنی تھا۔ مالا پیر بیٹھے ہوئے اندر چلی گئی تھی جبکہ آفاق نے مسکراتے ہوئے حکم کی تعمیل کی تھی۔ ایسا ڈھیٹ اور بے غیرت انسان مالا نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ میکس کی پارٹی کے بعد سے مالا نے آفاق سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ وہ اس کا ناشتا بھی نہیں بتاتی تھی اور جب بھی موقع ملتا طنز کے تیر پھینک دیتی۔ اس کا اکھڑا اکھڑا دیکھنا ابھی تک کسی اور کی نظر میں نہیں آیا تھا۔ ورنہ عیسیٰ نہ سہی چاچو تو لازمی وجہ دریافت کرتے۔ وہ آفاق کے ساتھ ان دنوں کسی آ کوڑھ زدہ مریض جیسا سلوک کر رہی تھی۔ اس کے نزدیک آفاق اس رویتے سے بھی زیادہ کا حق دار تھا۔ جو کچھ وہ اپنے کانوں سے سن کر آئی تھی اس پر کوئی اور بے شک یقین نہ کرتا تاہم وہ خود تو آفاق کی ذہنی غلاظت سے واقف ہو چکی تھی پھر کیسے پہلے کی طرح آفاق کے ساتھ مخلص رہتی اور آفاق اتنا ڈھیٹ اور خبیث تھا کہ مالا کے مزاج اور تیور دیکھ کر بھی سوال نہیں کرتا تھا۔ اسے کروت جانتا جو تھا کہ اگر مالا سے وجہ پوچھی تو اپنی ہی گردن شکنجے میں آ پھنسے گی۔

وہ زیادہ دیر آفاق کی کمینگی نہ غور و فکر نہیں کر سکتی تھی۔ جلد اسے باہر آنا پڑا تھا۔ عیسیٰ گھر آچکا تھا اور اب مہمان بھی آرہے تھے۔ انی کی پوری فیملی آچکی تھی، اس کا بھائی ابھی تک پاکستان میں تھا اور فی الحال واپسی نہیں ہوئی تھی۔ ایچی، انی اور ان کی می تشریف لے آئی



آفاق کے بعد اسے اب مون سے بھی نفرت سی ہونے لگی تھی۔ یہی تو تھی جس کی پلاننگ کے اہم کردار آفاق اور سوزن تھے۔ اصل فساد کی جڑ تو مون تھی۔ آفاق اور سوزن تو محض پتلیاں تھیں جن کی ڈوریں مون حبیب نے اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں اور زمین پر تکبر کی ایک واضح مثال بنی بیٹھی تھی۔

وہی لمبا سا گھیر دار بوارین فراک پہنے جس کی فرل کارپٹ کو چھوتی تھی۔ بلاؤز کا گلاسفید موتیوں سے کڑھا تھا۔ گلے میں ننھے سے موتی کا میٹلس جو دودھ جیسی گردن سے چپک گیا تھا۔ اس کے بال آج بھی انتہائی ریشمی اور چمکدار سرخی مائل کر کو چھوتے تھے۔ اوپنٹی سی پونی میں جگمگاتے ہیرے جیسے موتی سجے تھے اور اس کے سر کا کراؤن جو اسے کسی ریاست کی شہزادی ظاہر کرتا تھا۔ موٹا سا ہیرا جس کے آس پاس یا قوت کے دانے بکھرے تھے۔ اس کے ہیرے کی چمک نے محفل میں موجود کتنے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ جان محفل تھی۔ مالانے آج تک کسی انسانی وجود سے محفل کے رنگ کو بدلنے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی موجودگی نے جیسے اتنے ہنگامے اور شور بھرے ماحول کو بجلی کے مٹن دبانے جتنی مدت میں ساکت کر دیا تھا۔ کھلاڑیوں کے ہاتھ میں تاش کے پتے بھینچ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو مون کو جانتے تھے اور جو نہیں جانتے تھے وہ اس کے سحر میں بری طرح گرفتار ہو گئے تھے۔ اتنا سناٹا لمحے بھر میں چھا گیا تھا کہ اگر سوئی بھی گرتی تو آواز آجاتی..... پھر اس جادوگری کی ساحرہ نے سب کو مخاطب کر کے ماحول پر چھایا طلسم توڑ ڈالا تھا۔ تعارفی مراحل کے بعد وہ برج کی طرف متوجہ ہوئی۔ لمحے بھر میں پارٹنر منتخب ہوئے اور وہ عیسیٰ کی پارٹنر بن گئی۔ اس دفعہ باقی سب کپلو تھے سوائے مالا اور عیسیٰ کے۔ عیسیٰ تو کھیل کی طرف متوجہ تھا جبکہ مالا سانس روکے مون کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہی چمکنا سفید بے داغ چہرہ..... جھگی پلکوں والی لمبی آنکھیں اور عجیب تر آنکھیں..... کیا کبھی حسین چہرے بھی خوف زدہ کرتے ہیں؟ ایسا کبھی نہیں

ہوا..... ایسا ہوتا ہی نہیں..... مگر مالا کے ساتھ ضرور ہو جاتا تھا۔ جب وہ مون کو دیکھتی تھی اس کے دل پر وحشت سوار ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آتی۔ اسے مون کی حسین صورت سے خوف آنے لگتا تھا۔ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ وہ کبھی سمجھ نہیں سکی تھی سو وہ اب بھی سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس نے ہیرا کا چہرہ دیکھا۔ شوخ و شنگ سا ایرانی حسن کا مجسمہ، اس نے انی اور ایچی کو دیکھا، جیسے جرمنی کا حسن ان کے چہروں پر بکھر گیا تھا۔ اس نے ایوا اور اینجلس کو دیکھا..... وہاں کوئی بھی بد صورت نہیں تھا۔ سب خوش شکل، خوش لباس لوگ تھے پھر مون میں ایسا کیا تھا جو اسے خوف زدہ کر دیتا تھا جو اسے وحشت زدہ کر دیتا تھا۔

اس نے مون کو پھر دیکھا، پھر دیکھا، پھر دیکھا..... کئی بار دیکھا، ہزار بار دیکھا۔ وہ پلکیں جھپک، جھپک کر اسے دیکھ رہی تھی۔ نرم رخساروں پر جیسے جیسے..... مکھن، سفید گلابی مائل..... ملائم مکھن پھل رہا تھا..... جیسے پلکوں کی جھال مکھن جیسے رخساروں سے چپک گئی تھی۔ وہ نگاہ اٹھا کر کسی کو نہیں دیکھتی تھی۔ یہ اس کی انفرادیت تھی؟ یا انداز تھا؟ وہ کبھی سمجھ نہیں سکی۔ مون کسی کو دیکھ کر بات نہیں کرتی تھی، یہ ایک بات تو جیسے طے تھی۔ اب بھی وہ اپنے بھائی کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی اور عیسیٰ کا بھلا کیا حال تھا؟ مالا شاید لفظوں میں بیان نہ کر پاتی۔ وہ مون کو اتنے نارمل طریقے سے اس کی کسی محفل میں شریک دیکھ کر اتنا خوش تھا کہ اس خوشی کی نہ کوئی حد تھی اور نہ کوئی شمار تھا۔ اسے مون کا گھر آنا اور ان کی محفل میں شریک ہونا خوشی سے دیوانہ کر رہا تھا اور نہ صرف مون محفل میں شریک ہوئی تھی بلکہ گیم میں بھی شامل ہو گئی پھر عیسیٰ نے ان سب کو جیسے بڑے تقاضے سے بتایا تھا۔

”میری بہن شطرنج کی بگ ماسٹر ہے۔ اگر یہ کسی عالمی مقابلے میں حصہ لیتی تو دنیا کی سب سے کم عمر عالمی شطرنج چیمپیئن بن سکتی تھی۔ اس نے دس سال کی عمر میں شطرنج کھیلا سیکھا اور یہاں کے بگ ماسٹر مائیکل

کیے کو شکست دی تھی۔ یہ عالمی سطح پر اپنی نخریلی اور ضدی عادت کے باعث جاہی نہیں سکی۔ ورنہ ورلڈ ریکارڈ بک میں آج اس کا نام بھی شامل ہوتا اور یہ کارپوف کار ریکارڈ بھی توڑ ڈالتی۔“ عیسیٰ نے مون کے شانے پر ہاتھ رکھ کر جس محبت اور عقیدت کے ساتھ حاضرین کو اپنی بہن کی ذہانت کے بارے میں بتایا تھا، وہ سب کے لیے حیران کن تھا۔ مون حبیب کتنی ذہین تھی، کتنی قابلیت رکھتی تھی؟ اور وہ کیا تھی۔ شاید مون کا حقیقی بھائی اس کے ساتھ ملنے بڑھنے والا بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ نہ درتہ انکشافات اور ذہانت کا مرقع تھی۔ اللہ نے اسے دو بڑے خطرناک قسم کے ہتھیاروں سے لیس کر رکھا تھا، ایک حسن اور دوسری ذہانت، اپنے حسن سے وہ خود آگاہ تھی یا نہیں؟ تاہم ذہانت میں اس کی نگر کا شاید کوئی نہیں تھا۔ اور اس کے آس پاس رہنے والے لوگ بھی اس کی اصل قابلیت سے اتنے واقف نہیں تھے۔ وہ ایسے سیپ کے مانند تھی جسے آج تک کسی نے دریافت نہیں کیا تھا۔ نہ اس کا کوئی رہنما تھا، نہ اسے کوئی رہنما ملا اور نہ کسی کی راہنمائی پائی۔

ورنہ جس طرح 1814ء میں لوچاؤ کے رہنے والے کارل وٹے نے جرمنی کی گیسن یونیورسٹی سے ریاضی میں ڈاکٹریٹ کی سند بارہ سال کی عمر میں حاصل کی تھی اسی طرح مون حبیب دس سال کی عمر میں اسکاٹ لینڈیارد کے فرین آفسرز کو چاروں شانے چت کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

مگر ہوا کیا تھا؟ اسے کوئی راہنما نہ مل سکا۔ وہ ذہنی طور پر اتنی قابل تھی کہ یو ایس اے کی ریاست الاباما کے مقام موبائل سے تعلق رکھنے والے مائیکل کیے کی طرح دس سال چار ماہ کی عمر میں گریجویشن کر لیتی اور آج اس کا نام بھی سنہری حروف میں لکھا جاتا مگر بہت سارے معاملات میں خوش نصیب ہونے کے ساتھ، ساتھ وہ انتہا کی بد قسمت بھی تھی۔ اسے پھر کوئی صحیح رہنما نہ مل سکا۔

اور ادھر اس کا بھائی کتنے تقاضے سے اس کا ذکر

کر رہا تھا جیسے وہ عالمی ریکارڈ توڑے بیٹھی تھی۔ جیسے وہ کوئی غلاباز اور ہوا بازی، آہ..... وہ تو بس مون حبیب تھی۔ اس کے نام سے پہلے کچھ بھی نہ لگا۔ اور ابھی اس وقت نہ درتہ چھپی ذہانت کے ایک ہی وار میں اس نے برج کے انتہائی کامیاب کھلاڑی ڈاکٹر ابو بکر کو ہرا کر رکھ دیا تھا۔ ابو بکر برج کا شیدائی تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ کوئی اسے ہرا نہیں سکتا۔ پہلی مرتبہ وہ پارٹنر کی نا اہلی کی وجہ سے ہارا تھا، دوسری مرتبہ وہ اکیلا کھیلا مگر پھر بھی ہار گیا۔ وہ مون حبیب سے سو پوائنٹس سے ہارتا گیا تھا۔ وہ سب لوگ دم بخود تھے۔ ابو بکر کو ہرانا آسان نہیں تھا۔ اسی لیے عیسیٰ بھی حیران تھا اور ہیرا تو جیسے سشدر رہ گئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی قابلیت سے واقف تھی اور اسے ایک عورت سے ہارتا دیکھ کر بخند رہ گئی تھی۔

”یہ ٹھیک نہیں، مون نے بے ایمانی کی ہے..... ابو بکر برج میں کم از کم کبھی نہیں ہار سکتا۔“ ہیرا شا کڈ تھی، بے یقین تھی جبکہ ابو بکر بھی کچھ متحیر تھا۔ وہ نناوے پوائنٹس سے ہارتا تھا۔ وہ جیت رہا تھا مگر پھر بھی ہار گیا۔ وہ ایک قابل ترین ڈاکٹر تھا، ایک ذہین ترین ماہر نفسیات تھا۔ اسے لگا جیسے مون اس کے ہاتھ میں موجود پتوں کو کھوج رہی تھی پھر جیسے اس نے اپنے حق میں جاتا پتا پھینکا جاتا تو بلا ارادہ ہی اس نے دوسرا پتا پھینک دیا۔ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر یہ سب غیر ارادی طور پر ہوا۔ وہ پتا پھینک کر حیران رہ گیا۔ مون آخری پتا پھینک کر آخری بچا ہوا پوائنٹ بھی لے گئی۔ یعنی برج کی بازی وہ آرام سے جیت گئی۔ دیکھنے میں یہ ایک کھیل ہی تھا۔ سب اسے کھیل سمجھ کر انجوائے کر رہے تھے۔ عیسیٰ اور مون کو مبارک باد دے رہے تھے مگر ڈاکٹر ابو بکر کا رویہ کچھ مختلف تھا۔ اسے گیم ہارنے کا دکھ نہیں تھا۔ یقیناً یہ ایک گیم تھا مگر اسے کچھ الگ ساٹیل ہوا تھا۔ کچھ ایسا جو حیران کن تھا۔ کچھ عجیب تھا، کچھ غیر معمولی تھا، وہ پُرسوج نظروں سے مون کو دیکھتا رہا، وہ اس کا چہرہ



کھوجتا رہا پھر جیسے مون کے سپاٹ تاثرات نے اسے  
جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا مگر وہ اپنے ذہن میں آئے  
خیالات کو جھٹک نہیں پارہا تھا۔  
دوسرا مقابلہ کونز کا تھا جس میں اس کی بیوی سمیت  
مون بھی پیش، پیش تھی۔ دس دس سوالات کا یہ مقابلہ  
تھا۔ دو، دو لوگوں کے گروپس بن گئے تھے۔ سب سے  
پہلے میکس اور ایوانے سوال کیے، جن کے جواب انی اور  
آفاق نے دیئے تھے۔ ان کے دوسوالوں کے جوابات  
دینے کے علاوہ باقی سب غلط تھے۔ یعنی انی اور آفاق دو  
پوائنٹ لے کر گیم سے باہر ہو گئے۔ اب تالیاں بجا بجا  
کر دوسروں کو کنفیوژ کر رہے تھے پھر انجیلس اور ایوی  
نے ابو بکر اور ہیرا سے سوال کیے۔ ان کے جواب ٹھیک  
اور ایک غلط نکلا۔۔۔۔۔ اب ابو بکر اور ہیرا نے مون اور عیسیٰ  
سے سوال کرنا تھا۔ مالا اس دفعہ بھی گیم سے باہر محض  
خاموش تماشائی تھی اور ایک تک صرف مون کو دیکھے  
جا رہی تھی جیسے کوئی پتھر کی صورت ہو۔

گیم کے رول اور قواعد کے مطابق ابو بکر نے  
سوال لکھ کر نیچے جواب بھی لکھ کر اپنی پارٹنر ہیرا کو پرچہ  
پکڑا دیا تھا تاکہ پارٹنر کنفیوژ نہ ہو۔ سوال لکھنے کے  
دوران باقی سب لوگوں نے خوب ہاہا کاری مچائی تھی۔  
تالیاں، سیٹیاں اور شور بڑھتا رہا۔ جب سوالوں کی  
باری آئی تب ماحول پہ خود بخود دستانا چھا گیا تھا۔ مالا بھی  
ابو بکر اور ہیرا کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ ہیرا بہت  
پرجوش تھی۔ اسے امید تھی، اس کے ڈاکٹر شوہر نے جو  
سوال لکھے تھے ان کے جوابات کم از کم عیسیٰ اور مون  
نہیں دے سکتے۔ یہ سائنسی سوال تھے، حیران کن اور  
ذرا مختلف۔۔۔۔۔ ڈاکٹر بندے سے بھلا اور امید بھی کیا کی  
جا سکتی تھی، ہیرا کی مسکراہٹوں کا کوئی شمار نہیں تھا۔ وہ  
لوگ عیسیٰ اور مون کو ہرانے والے تھے۔ باقی لوگ گیم  
سے پہلے ہی باہر ہو چکے تھے۔ ہیرا کو پورا یقین تھا برج  
نہ سہی، کونز مقابلے میں انہیں کوئی ہرا نہیں سکتا۔ ہر  
بندے نے اپنی فیلڈ کے حساب سے سوال پوچھنے تھے۔  
چاہے کوئی ڈاکٹر تھا، ٹیچر تھا یا بزنس من۔

راوہر مالا عجیب کیفیات کا شکار تھی اسے لگا جیسے  
برج کی گیم جیت کر مون نے اس پر ثابت کر دیا تھا کہ  
وہ کبھی ہار نہیں سکتی۔ بساط شطرنج کی ہو یا بازی تاش کی  
۔ اسے صرف جیتنا ہے۔ مالا کا دل سوکھے بچے کی طرح  
کانپ رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ گیم کی طرف متوجہ  
تھی۔ اس کا شوہر مون کا پارٹنر تھا۔ اس کی دعائیں عیسیٰ  
کے ساتھ تھیں مگر وہ پھر بھی چاہتی تھی مون اس دفعہ  
ضرور ہار جائے۔ مالا کو لگتا تھا، وہ گیمز جیت کر اس پر  
بہت کچھ ثابت کرنا چاہتی ہے۔ وہ اسی لیے گیمز میں  
حصہ لے رہی تھی۔ وہ مالا کو مزید ہراساں کر رہی تھی۔  
وہ اسے جتا رہی تھی کہ علی عیسیٰ کی زندگی سے مالا کو نکالنا  
اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور وہ جلد اس کی زندگی  
کا پانسہ بھی اٹھنے والی تھی۔

گیم شروع ہوئی تو انی، آفاق، میکس اور ایوا  
وغیرہ نے چیخ، چیخ کر ہیرا، ابو بکر اور مون، عیسیٰ کا  
حوصلہ بڑھایا تھا۔ گیم یوں تھی کہ کچھ سوال عیسیٰ سے کیے  
جاتے تھے اور کچھ سوال مون سے۔۔۔۔۔ مگر مون نے کہا  
تھا، وہ سب سوالوں کے خود جواب دے گی۔ اس کے  
اعتماد نے ابو بکر سمیت سب کو ایک مرتبہ پھر حیران کر دیا  
تھا۔ ابو بکر نے مون سے کہا۔

”ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔ عیسیٰ تمہاری مدد کر سکتا  
ہے۔“ وہ اسے ”جتا“ رہا تھا کہ سوال مشکل ہیں۔ وہ اپنی  
ذہانت پر اتنا مت اترائے مگر مون نے تاک چڑھا کر  
انکار کر دیا تھا۔ تب عیسیٰ، مالا کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود  
اٹھ کر بچن میں ان سب کے لیے چائے بنانے چلا گیا  
تھا۔ آفاق بھی اس کی مدد کے خیال سے اٹھ گیا۔ باقی  
لوگ بہت تھستے تھے اور ڈاکٹر ابو بکر کو گیم شروع کرنے پر  
فوس کر رہے تھے۔ تب مالا نے بھی جیسے ”جتا“ کر کہا  
تھا۔ وہ مون کو عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ابو بکر بھائی! آپ سوال کریں۔۔۔۔۔“ اس کی  
نیک تمنا میں ہیرا اور ابو بکر کے لیے تھیں۔ اللہ، اللہ  
کر کے پہلا سوال آیا۔ وہ سب انتہائی پرجوش ہو گئے  
تھے۔ سوال ابو بکر کر رہا تھا۔ اور مون متوجہ ہیرا کی طرف

تھی۔ اس کے ہر کام میں نرالا پن تو ضرور ہوتا تھا۔  
ابو بکر نے بڑی پرجوش نظروں سے اسے دیکھتے  
ہوئے پوچھا۔  
”دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ سے کام کرنے  
والے انسان، دماغ کا کون سا حصہ استعمال کرتے  
ہیں؟“ ابو بکر کی طرف سے یہ پہلا سوال تھا۔ انتہائی  
مشکل اور پیچیدہ۔ ہر ایک کے لیے یہ آسانی تھی کہ وہ  
اپنی فیلڈ کے حساب سے سوال کر سکتا تھا۔ جبکہ جواب  
دینے والے کے لیے سخت مشکل ہوتا تھا جواب دینا۔  
اب ایک ٹیچر یا انجینئر سے بزنس کے متعلق سوال کیا  
جاتا تو وہ بھلا کیا جواب دیتا۔ جبکہ اس وقت ایک ماہر  
ڈاکٹر ایسی لڑکی سے سائنسی نوعیت کے پیچیدہ سوال  
کر رہا تھا جس نے دنیاوی تعلیم کے حساب سے صرف  
کتنی کی دس جماعتیں پاس کر رکھی تھیں۔ مقابلہ سخت بھی  
تھا، مشکل ترین بھی تھا۔ اسی لیے سبھی تقریباً ہمہ تن گوش  
تھے اور سانس روکے جواب کے منتظر تھے جبکہ مون کے  
پاس نو سیکنڈ کا وقت تھا۔ ان نو سیکنڈ میں وہ پلک جھپکائے  
بغیر ہیرا کو دیکھ رہی تھی ایک تک، پتا نگاہ ہٹائے۔۔۔۔۔  
جیسے جیسے اپنی غیر معمولی ذہن آنکھوں سے ہیرا کا  
ذہن کھنگال رہی تھی۔ جیسے اس کی سوچ کو پڑھ رہی تھی  
اور جیسے ہیرا کے ہاتھ میں موجود پرچے پہ لکھے جوابات  
کو ہیرا کے ذہن میں سے نوچ کھسوٹ کر اپنے ذہن  
تک لانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ محفل میں موجود کوئی  
بھی فرد مون اور ہیرا کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ایوا، ایوی کو  
اپنی انگوٹھی دکھا رہی تھی۔ انی، انجیلس کی طرف متوجہ  
تھی۔ آفاق اور عیسیٰ بچن میں تھے۔ میکس بھی انگوٹھی  
کے ڈیزائن پر تبصرہ کر رہا تھا۔ بس لمحے بھر کی چوک میں  
وہ سب جھٹاتے اور ہوا یوں کہ مون کی گہری بولتی نگاہ  
ہیرا کے چہرے سے ہٹ گئی۔ اب وہ بڑے مطمئن  
انداز میں جواب دے رہی تھی۔

”انسانی دماغ کے دو حصے ہیں۔ دائیں اور  
بائیں سمت والا۔ دائیں ہاتھ سے کام کرنے والے،  
بائیں سمت والا دماغ اور بائیں ہاتھ سے کام کرنے

والے دائیں سمت والا دماغ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ  
قدرتی عمل کے تحت ہوتا ہے۔“ جواب کسی بھی دلیل  
اور سوچ و بچار کے بغیر مکمل تھا۔ حاضرین نے فی الفور  
اپنی، اپنی مصروفیات ترک کر کے زور شور سے تالیاں  
بجائی تھیں۔ جبکہ ہیرا کے علاوہ ڈاکٹر ابو بکر اور مالا دم  
بخود تھے۔ جتنا ابو بکر حیران تھا اسی قدر مالا بھی حیرت  
سے منجمد ہو گئی تھی۔ گویا مون ہارنے والی نہیں تھی۔ وہ  
ایک ذہین ڈاکٹر کا مقابلہ بھی کر سکتی تھی۔ مگر نہیں۔۔۔۔۔ مالا  
کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی تو نو سوال اور بھی باقی  
تھے۔ وہ بڑی امید بھری نظر سے ڈاکٹر ابو بکر کو دیکھ رہی  
تھی جیسے اب تو وہ مون کو لگا جواب کرنے ہی والا تھا۔

”انسانی آنکھ کتنی دور تک دیکھنے کی صلاحیت  
رکھتی ہے؟“ ابو بکر نے کچھ دیر بعد ایک اور سوال پوچھا  
تھا۔ اس دفعہ بھی مون نے ابو بکر کو دیکھے بنا ہیرا پہ نگاہ  
جمائے رکھی۔ یہ جواب دو سیکنڈ میں اسے مل گیا تھا۔  
مون کو اس دفعہ زیادہ تر ڈون نہیں کرنا پڑا۔

”انسانی آنکھ پچاس میل دور چلنے والی موسم بتی کا  
شعلہ دیکھ سکتی ہے۔“ مون کا اعتماد اب کی دفعہ بھی قابل  
دید تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ مطمئن ہو چکی تھی۔ گویا وہ اب  
تو ہرگز بھی ہارنے والی نہیں تھی۔ اس مرتبہ ابو بکر کے  
ہونٹ سچ گئے تھے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ ہو گیا  
تھا۔ اس کے چہرے پر نا قابل فہم تاثرات تھے جبکہ ہیرا  
جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔ وہ قطعاً ان لوگوں کی طرف متوجہ  
نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو کسی کی طرف بھی متوجہ نہیں تھی۔ اگر  
مالا غور نہ کرتی تو باقی سب کی طرح اسے بھی پتا نہ چلتا کہ  
ہیرا تو مون کی دودھیا گردن سے چپکی چین اور ہیرے  
مون کی طرف متوجہ تھی۔ مالا شاید بے اختیار ہی ہیرا  
کو پکار رہی تھی مگر ڈاکٹر ابو بکر نے اسے اپنی طرف متوجہ  
کر لیا تھا۔ وہ مون سے ایک اور سوال کر رہا تھا۔

”آنکھ ایک دن میں کتنی بار جھپکتی ہے؟“ ابو بکر کا  
لہجہ پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا تھا۔ مون کے لیے یہ سوال بھی  
مشکل نہیں تھا۔  
”انسانی آنکھ دن میں بیس ہزار بار جھپکتی ہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



لوہوں سے لگا لیا تھا۔

”تقریباً پندرہ سال سے میں پروفیشنل کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ چینی تمہاری عمر ہے اس سے ذرا کچھ کم تجربہ تو بہر حال میرے پاس ہے ہی..... تم نے کہا کہ تم ہیرے اور گریفائیٹ میں وضاحت نہیں کرو گی۔ مگر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہیرے اور گریفائیٹ میں کیا فرق ہے؟ تو سنو! ہیرا خالص حالت میں بے رنگ اور شفاف ہوتا ہے۔ بالکل تمہارے کراؤن جیسا قیمتی اور چمکدار۔ جب اس کی تراش خراش کی جاتی ہے تو یہ انتہائی چمکدار، لشکارے مارنا نظر آتا ہے۔ یہ قدرتی حالت میں پائی جانے والی سخت ترین شے ہے۔ اس کی کثافت 3.3 گرام فی مکعب سم ہوتی ہے۔ یہ برقی رو کے لیے ناقص موصل ہے یعنی اس میں سے بجلی نہیں گزر سکتی۔ اگر اسے برقی بھٹی میں زیادہ دیر تک رکھا جائے تو یہ گریفائیٹ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ساخت کے لحاظ سے ہیرے میں پائے جانے والے ایٹم ہر طرف سے جڑے ہوتے ہیں۔ انہیں آسانی سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس وجہ سے یہ زیادہ سخت ہوتا ہے۔ یہ سخت ہونے کی وجہ سے شیشہ کاٹنے اور دوسرے آلات میں استعمال ہوتا ہے۔ ہیرے کے جڑاؤ سے قیمتی زیورات تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ ڈائمنڈ کی خصوصیات ہیں۔ جو تمہارے کراؤن میں سجا ہے۔ اور تم ان خصوصیات سے یقینی طور پر ناواقف نہیں اور ہو گی..... اب سنو کہ گریفائیٹ کیا ہے؟ اور میں نے تم سے یہ سوال کیوں پوچھا؟ اس کی وضاحت بھی کرتا ہوں۔ گریفائیٹ سیاہی مائل بھورے رنگ کا نرم ٹھوس ہوتا ہے۔ یہ ملائم، نرم اور چمکتا ہوتا ہے۔ یہ بجلی اور حرارت کا اچھا موصل ہے۔ اس کی کثافت 2.2 سے 2.5 تک ہوتی ہے۔ برقی بھٹی میں زیادہ دیر تک گرم کرنے سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ گریفائیٹ بطور مارکر نشان لگانے کے کام آتا ہے۔ چمکتا ہونے کی وجہ سے مشینوں میں بطور گریس استعمال ہوتا ہے۔ دراصل یہی فرق ہے گریفائیٹ اور ڈائمنڈ میں۔ اور

اردگرد اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یہاں سب لوگ اپنی، اپنی مصروفیات میں مگن تھے۔ کوئی بھی ہیرا کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ پھر ابو بکر نے اسے اٹھا دیا۔

”جاؤ، منہ پہ دو جھپکے مار آؤ۔“ ہیرا کو واٹش روم کی طرف بھیج کر ابو بکر پھر سے مون کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر اب پہلے جیسی بے چینی نہیں تھی۔ جھنجھلاہٹ نہیں تھی۔ پہلے جیسی حیرانی نہیں تھی۔ اب اس کے چہرے پر بحس تھا، کھوج تھا۔ گویا وہ کوئی سراغ پانا چاہتا تھا۔ کچھ کھوجنا چاہتا تھا۔ وہ مون کے چہرے پر سے کیا کھوجنا چاہتا تھا؟ تھوڑی دیر بعد اس نے مون سے ایک عجیب سوال کیا تھا، سوال عجیب نہیں تھا۔ تھوڑی گہرائی لیے ہوئے تھا۔ ابو بکر کے بولنے پر وہ سب لوگ اپنی، اپنی مصروفیات ترک کر کے ایک مرتبہ پھر ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”کیا تم مجھے ہیرا (ڈائمنڈ) اور گریفائیٹ کے خواص، فوائد اور استعمال بتا سکتی ہو؟“ ابو بکر نے بڑی سنجیدہ نگاہوں سے مون کی طرف دیکھا تھا۔ ایک دم مون کے چہرے کا رنگ بدلا۔ مالا گویا حیران رہ گئی تھی۔ کیا مون کا سپاٹ چہرہ بھی رنگ بدل سکتا تھا؟

”میں جواب دے چکی ہوں۔“ وہ پتھر لیے لہجے میں بولی۔ اسے ابو بکر کا سوال سخت برا لگا تھا جیسے اسے اب مزید سوال کی امید نہیں تھی۔

”مجھے کچھ وضاحت چاہیے۔“ اب کہ منظور ہونے کی باری کسی اور کی تھی اور ان میں ابو بکر اور مالا بھی شامل تھے۔ مالا کا روم روم جیسے ساعت بن گیا۔

”میں وضاحت دینے کی پابند نہیں۔“ وہ رکھائی سے کہہ رہی تھی۔ گویا صاف جواب دے رہی تھی۔ ابو بکر کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔ پھر کچھ دیر بعد وہ گلا کھنکھار کے سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”اگر چہ تم جیت گئی ہو، اگر چہ تم نے ٹھیک جوابات دیے۔ اس کے باوجود میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ چلو تم وضاحت نہیں کرنا چاہتی تو میں وضاحت کر دیتا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر پانی کا گلاس اٹھا کر

وہ پراعتماد طریقے سے بول رہی تھی جیسے یہ سوال اس کے نزدیک ننھے منے چوونے کی طرح تھے۔ جنہیں وہ بیروں تلے مسل رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ ذرا محفوظ قسم کی مسکراہٹ در آئی۔ جیسے وہ ابو بکر کو زچ کر کے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”انسانی آنکھ کتنے رنگوں اور سایوں میں تمیز کر سکتی ہے؟“ ابو بکر نے ایک اور سوال کیا۔

”آنکھ ایک کروڑ مختلف رنگوں اور سایوں کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔“ مون کے لیے جواب مشکل نہیں تھا۔ پھر سوال پر سوال ہوتے چلے گئے۔ ایک کے بعد ایک سوال۔

”آنکھ آواز کو محسوس کر سکتی ہے یا نہیں؟“ وہ پہلے سے زیادہ بے چین اور سنجیدہ تھا۔

”آنکھ آواز کو اتعاش سے محسوس کر سکتی ہے۔“ مون پہلے سے بڑھ کر مطمئن تھی۔

”ورزش کرتے، کھیلتے یا دوڑتے ہوئے انسانی دماغ تک پیغام کتنے میل فی گھنٹا کی رفتار سے پہنچتا ہے؟“ وہ اور بھی بے چین ہوا۔

”ورزش کرتے، کھیلتے یا دوڑتے وقت دماغ تک پیغام 180 میل فی گھنٹا کی رفتار سے پہنچتا ہے۔“ مون مسکرائی۔ حالانکہ وہ مسکراتی نہیں تھی۔ جواب اس کی نوک زبان پہ مچل رہے تھے۔ وہ سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں جواب دے رہی تھی۔

”کیا کسی انسان کے فکر پرش کسی دوسرے انسان کی انگلیوں کے نشانات سے ملتے ہیں؟“ ابو بکر نے پہلو بدلا تھا۔

”کسی بھی انسان کے فکر پرش کسی دوسرے انسان سے نہیں ملتے۔“ مون محفوظ ہوئی۔ جیت قریب تھی، ہار دور ہو رہی تھی۔ ابو بکر پریشان تھا اور مالا دم بخود تھی۔

”کان آواز کو کیسے محسوس کرتے ہیں؟“ ابو بکر نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

”کان ہوا کی دباہریشن (ارتعاش) سے آواز کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



میرا سوال تم سے یہ ہے کہ تم خود کو ہیرا یعنی ڈائمنڈ سمجھتی ہو یا گریفائیٹ؟“ ابو بکر کی طویل تقریر نے ان سب کو جیسے پتھر بنا دیا تھا۔ وہ حیران تھے کھیل، کھیل میں بات کہاں سے کہاں نکل گئی تھی..... ابو بکر ابھی تک مون کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع آیا تھا جب وہ کسی سوال پہ لاجواب ہوئی تھی ورنہ وہ تو لاجواب کرتی آئی تھی۔ اس نے لاجواب ہونا کہاں سیکھا تھا؟ وہ دم بخود نہ ہوتی تو کیا کرتی؟

سب کی نظریں مون کے چہرے پہ جمی تھیں اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا جواب دے؟ ابو بکر کچھ دیر اس کا چہرہ کھوجنے کے بعد خود ہی بولا۔

”ڈائمنڈ اور گریفائیٹ دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔ دونوں بے فائدہ نہیں۔ ایک زیورات میں جتنا ہے اور اپنا حسن اور قیمت بڑھا دیتا ہے اور ایک مشین چلانے میں کام آتا ہے۔ مگر پھر بھی ہیرا، گریفائیٹ سے افضل ہے۔ تو تم بتاؤ؟ کیا تم خود کو ”ہیرا“ سمجھتی ہو یا گریفائیٹ؟“ ابو بکر اتنی آسانی سے بخشنے والا نہیں تھا۔ اس کا سوال مون کے آس پاس ہی گھوم رہا تھا۔ شاید اس نے مون کے اندر کچھ غیر معمولی چیز پائی تھی۔ شاید ابو بکر نے اپنی ”کھوج“ مکمل کر لی تھی اور اب وہ نفسیاتی حربوں سے مون کا اندر کھنگال رہا تھا۔ وہ گویا جیسے لمبے بھر کے لیے گم صدمہ رہ گئی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ اور یہ ابو بکر کیا پوچھنا چاہتا تھا؟

”سوال مشکل تو نہیں۔ پھر بھی اتنی دیر؟“ ابو بکر معنی خیزی سے مسکرایا۔ کچھ دیر تک ماحول پہ سناٹا چھایا رہا۔ پھر جیسے طلسم خود ہی ٹوٹ گیا۔ ابو بکر نے جواب کو بھی مکمل کر دیا تھا۔ وہ اپنے تجربات کی رو سے مون حسیب کے چھکے چھڑا رہا تھا، وہ جو آج تک لوگوں کو ایک اسم سے ساکت کرتی آئی تھی لمبے بھر کے لیے خود منجمد ہو گئی تھی۔

”تم ڈائمنڈ ہو مون حسیب! اور تم اس بات سے واقف نہیں۔ تمہارے زر گراتے جو ہر شناس نہیں تھے اور نہ ہی تم اتنی عقل مند تھیں جو غلط اور ٹھیک کی پہچان

کر سکتیں۔ تمہیں اللہ نے خالص اور قدرتی حالت میں ہیرے کی شکل دی۔ تمہیں تراشنے والے ہاتھ ناکارہ اور نا اہل تھے۔ ان کے پاس ہیرے کو تراشنے کا علم، ہنر اور فن نہیں تھا۔ وہ بے چارے تو بے خبری میں مارے گئے اور تم نے یوں کیا کہ خود کو زیادہ دیر تک برقی بجٹی میں رکھا، یہاں تک کہ ہیرا پھل کر گریفائیٹ یعنی چمچائی گریس بن گیا۔ جو اپنا اصل اور حقیقی مقام کھو گیا۔ اب گریس اور ڈائمنڈ کا کیا مقابلہ؟ ہیرے کا مقام تو گریس سے بہت اوپر ہے۔ مگر پھر بھی دیکھو اللہ نے تمہیں گریفائیٹ بنا کر بھی بے فائدہ نہیں کیا۔ تم اب بھی فائدہ مند ہو۔ یہ باتیں ہیں ذرا حکمت اور دانائی کی۔ کبھی اکیلے میں غور و فکر کرنا کہ تم کو نز مقابلہ ہو یا زندگی کا مقابلہ..... شطرنج کی بازی ہو یا تاش کی، مہلا کس طرح سے دوسروں کو پچھاڑتی ہو؟ ایک غیر فطری عمل سے جسے عام طور پر بے ایمانی کہا جاتا ہے۔ ایسی جیت سے تو ہزار بار مات اچھی ہے.....“ ابو بکر نے جیسے اپنا صبح بیان ختم کر دیا تھا۔ اس نے سر محفل مون حسیب کو کیا، کیا بتایا تھا؟ اس کی باتوں کا مفہوم کیا تھا؟ اور اس نے مون کو برکھنے اور کھوجنے میں کہاں تک اندازوں کی درنگی پائی تھی۔ پوری محفل کو سانسپ سوگتہ گیا تھا۔ پھر جیسے چائے کی پیالیوں کا شور اٹھا۔ عیسیٰ اور آفاق دونوں لاؤنج کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اتنے ہی ساکت اور گم صدمہ۔ جیسے مون کو اندر تک کھنگال کر اس کی ذات کے متعلق ایسی جامع تشریح پہ ابو بکر کو خراج حسیب پیش کرنا چاہتے تھے۔ ابو بکر وہ واحد بندہ تھا جس نے مون حسیب کے مقابل پٹہ کر اس کے چھکے چھڑا دیے تھے اور مون اتنی بے بس تھی کہ کچھ بول ہی نہیں سکتی تھی۔ یہاں محفل میں بیٹھے ہر ایک فرد کی کیفیات مختلف تھیں۔ جو جرات ابو بکر نے کی تھی ایسی جرات کا مظاہرہ نہ میکس کر سکتا تھا اور نہ ہی آفاق، حتیٰ کہ آج تک علی عیسیٰ کو بھی مون نے اپنی ذات میں مداخلت کرنے نہیں دی تھی۔ وہ ایک ترقی یافتہ ملک کی آزاد شہری تھی۔ بھلا اس کے باپ اور بھائی کی جرات تھی جو وہ اس کی ذات پہ بات کرتے، اسے

سمجھاتے یا اس کی غلطیوں پہ نیک یا کراس لگاتے۔ یہ تو ڈاکٹر ابو بکر تھا۔ جس نے محفل کے ہر فرد کو حیرت سے منجمد کر دیا تھا۔ محض دو لفظوں میں پوری مون کی شخصیت کا نچوڑ نکال دیا تھا۔

”تم نے برقی بجٹی میں خود کو اتنی دیر تک رکھا۔ یہاں تک کہ تم ہیرے سے گریفائیٹ میں بدل گئیں۔ تم اپنے اصل مقام سے نیچے آ گئیں۔“ یہ ڈاکٹر ابو بکر کے الفاظ تھے۔ آخر اس نے مون حسیب میں کھوجا ہی کیا تھا؟ محفل میں موجود ہر آنکھ کا سوال بڑا ہی بے چین قسم کا تھا۔ اور وہ سب ایک دوسرے کو حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پھر جیسے محفل کا اختتام ہو گیا۔ سب لوگ چائے سے لطف اندوز ہو کر اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ حتیٰ کہ مون بھی ابو بکر سے ملنے والے جھکوں پر خفا ہو کر نہیں اٹھی تھی۔ وہ اپنی کمزوری غصہ ظاہر کر کے سب کو دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ سو چائے پی کر پاپا سے ملنے کے بعد واپس چلی گئی تھی۔ آج عیسیٰ نے اسے روکا نہیں تھا۔ حسیب احمد بس اسی میں خوش تھے کہ مون آ تو گئی تھی۔ محفل کے اختتام پر برتن آفاق اور عیسیٰ نے سینے تھے اور وہ دونوں زیر لب نینی کو کوسنے دے رہے تھے۔

”اب یہ چنگبری بھینس آئے تو اسے فارغ کر دینا۔ ایک تو اتنی خوفناک ہے اور دوسرے اتنی چھٹیاں کرتی ہے۔ کان سے پکڑ کر نکال دینا۔“ آفاق جل بھن کر کہہ رہا تھا۔ عیسیٰ خود بھی نینی سے عاجز لگتا تھا۔ اور اس کی ”خوفناکی“ پر وہ دونوں بھرے کے جا رہے تھے۔

”یہ نینی خاصی خوفناک اور گراسرار لگتی ہے۔“ عیسیٰ بھی پراسوج انداز میں بولا تھا۔ آفاق نے زور شور سے سر ہلایا۔

”تو اور کیا..... میں تو کہتا ہوں، اسے فارغ کر دو۔ زیادہ ”ہراس“ اس گھر میں نینی کا پھیلا یا لگتا ہے۔“ وہ سمجھداری سے کہہ رہا تھا۔ آفاق سر ہلا کر زہ گیا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”یار! وہ ہم کا کچھ نہ کچھ حقیقت سے تعلق ضرور ہوتا ہے۔ حقیقت کچھ نہ کچھ ہو تو ”وہم“ بھی ہوتا ہے۔“ وہ برتن دھوتا بہت سنجیدہ تھا۔ عیسیٰ کے کافی بچھٹتے ہاتھ رک سے گئے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر آفاق کو دیکھا۔

”تمہاری بات کا مفہوم یہ ہے کہ مالا کو جو کچھ دکھائی دیتا ہے یا محسوس ہوتا ہے، وہ ٹھیک ہے؟“ عیسیٰ اجنبی سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے تاثرات سنجیدہ تھے اور آنکھوں میں ناگواری تھی۔

”زیادہ نہ سہی مگر کچھ تو ضرور ہے۔ دیکھو بالکل بھی مالا کو غلط کہنا مناسب نہیں۔“ برتن دھل چکے تھے۔ اب وہ انہیں خشک کر رہا تھا۔ عیسیٰ کے چہرے پہ بھی ناگواری دوڑی تھی۔ ادھر بچن میں آتی مالا ٹھنک کر رک گئی تھی۔

”مالا کو غلط کون کہہ رہا ہے؟ ایسی بات ہوتی تو ہالہ صاحبہ کو کیوں بلا یا جاتا۔“ وہ جیسے برامان گیا تھا۔

”تم نے کبھی غور نہیں کیا۔ اچانک ہی مالا کو عجیب و غریب چیزیں نظر کیوں آنے لگی ہیں۔“ آفاق نے اس کے برامانے پر دھیان دیے بغیر ایک اور نکتہ اٹھالیا۔ مالا کچھ قہم سی گئی۔ یہ آفاق کی باتوں کا آخر مقصد کیا تھا؟

”پہلے ایسا نہیں تھا یعنی تمہاری شادی کے شروع دنوں میں۔“ اسے چپ کھڑا دیکھ کر آفاق نے مزید کھڑا لگایا پھر ریک میں خشک برتن سجا کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”یہ سلسلہ کچھ دن پہلے شروع ہوا ہے آخر وجہ تو دریافت کرنا چاہیے تھی۔“ وہ بے اتہا سنجیدہ تھا عیسیٰ بھی کچھ چونک گیا۔

”تو وجہ کس سے دریافت کروں؟“ عیسیٰ نے چپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”خود سے۔“ آفاق کا جواب حیرت میں مبتلا کر دینے والا تھا وہ اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ عیسیٰ خشکی سے بولا۔

”سو فیصد فیصد ٹھیک ہے۔“ وہ مطمئن تھا۔

”تو پھر؟“ اس نے ناگواری سے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ وہ ایک دم پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ دل برصدمات کی کٹھنیں جم گئی تھیں۔ اذیت کی کائی اٹنے لگی تھی دکھ کا سیل بہ رہا تھا۔ وہ ذرا بھی محل کا مظاہرہ نہ کر سکی اور جذباتیت میں پھوٹ، پھوٹ کر روتی رہی۔ عیسیٰ کے لیے اس کا رونا، تڑپنا دیکھ کر چپ رہنا محال تھا۔ وہ بھی۔ گھبرا اٹھا۔ جانے مالا کو اتنی سی دیر میں کیا ہوا تھا وہ کیوں رورہی تھی جب اسے کوئی تکلیف بھی نہیں تھی اور کسی نے کچھ کہا بھی نہیں تھا پھر یہ کھلتے آنسو.....!

”مالا! بتاتی کیوں نہیں؟“ عیسیٰ عاجز آ کر بول اٹھا۔ اس کے آنسو اور سسکتا، تڑپنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ مالا جیسے رُو رو کر تھک گئی تھی پھر خود ہی سسکاریاں بھرتی چپ کر گئی۔

”بولو مالا..... ہوا کیا ہے؟“ وہ نرمی اور تحمل سے پوچھ رہا تھا جب مالا نے اپنے بھرے دل کی ساری حکایت بتا دی تھی۔

”وہ آفاق کا بچہ آپ کو میرے متعلق بدگمان کر رہا تھا۔“ اس نے بالآخر وجہ اٹھائی ہی دی تھی جسے سن کر عیسیٰ نے اپنا سر پیٹ ڈالا۔

”نہیں تو..... تم نے کیسے سمجھ لیا، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ عیسیٰ جیسے ساری بات سمجھ کر اب وضاحت کر رہا تھا۔ تقیبا وہ ان دونوں کی کچھ باتیں سن کر بدگمان ہو رہی تھی۔ وہ غلط گمان میں پڑ رہی تھی۔ آفاق پریشک کر رہی تھی حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ دنیا میں کوئی بھی شخص کم از کم علی عیسیٰ کو اس سچے موتی جیسی لڑکی سے بدگمان نہیں کر سکتا تھا بھلا یہ بات وہ مالا کو کیسے بتاتا، کس طرح سے سمجھاتا، وہ مالا سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتا۔

”میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے وہ کہتا ہے یہاں کوئی آسیب نہیں اور جو کوئی بھی ہے آپ کی موجودگی میں ظاہر کیوں نہیں ہوتا۔“ وہ انتہا کی گرد اپنے دل پر جمائے بیٹھی تھی۔ اس نے آفاق کی باتوں کا الٹ مفہوم نکالا تھا حالانکہ آفاق تو درست مشورے دے رہا تھا۔ وہ تو انہیں مشکلات سے نکال کر ٹھیک

تک آیا تھا۔ اس نے فوراً محسوس کر لیا تھا کہ وہ رورہی تھی، وہ کیوں رورہی تھی؟ شاید وہ بہت تھک گئی تھی یا اس کی طبیعت خراب تھی یا پھر وہ ان دنوں ویسے ہی زدورنج رہتی تھی۔ عیسیٰ کچھ بے قراری سے دوڑا تو اس کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گیا تھا پھر اس نے مالا کا بیٹھا چہرہ ٹولا۔ اس کے رخسار غم تھے عیسیٰ کا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ رورہی تھی مگر عیسیٰ کو دیکھ کر جلالت میں آنسو پونچھنے لگی تھی لیکن عیسیٰ کی نظر سے اس کے آنسو پوشیدہ نہیں رہ سکے تھے۔ وہ اتنا ہی بے قرار ہو گیا تھا جس قدر بے چینی سے وہ سسکاریاں بھرتی تھی۔

”کیوں رورہی مالا؟ کیا گھر والے یاد آرہے ہیں؟“ اس نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔ مالا کچھ مل کے لیے چپ رہ گئی تھی پھر بے ساختگی میں سر ہلانے لگی۔

”تو پھر..... کیا بیمار ہو..... کہیں درد ہے؟“ وہ اور بھی فکر مند ہو گیا مالا نے سر کو ایک مرتبہ پھر دائیں بائیں لپی میں ہلایا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ مالا بیچینی آواز میں بولی۔

”کچھ تو ہے۔“ وہ ذرا بھی مطمئن نہیں ہوا جانے کیوں اسے پاپا اور مالا کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا جیسے کچھ ہو جائے گا..... جیسے کچھ ہو جائے گا۔

”نہیں..... میں ٹھیک ہوں۔“ مالا نے سر جھکا لیا وہ اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی جیسے بہت مضطرب تھی پھر عیسیٰ کیوں نہ متشکر ہوتا۔

”پھر مجھے کیوں نہیں ٹھیک لگ رہیں؟“ وہ نرمی سے جتا کر بولا تھا۔

”ہاں نہیں۔“ مالا جھنجھلائی۔

”کسے پتا ہے؟“ عیسیٰ بھی اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ تب مالا جیسے تھک گئی۔ اسے لگا وہ کبھی عیسیٰ سے کچھ بھی نہیں چھپا سکتی۔ وہ اپنے دل میں کچھ نہیں رکھ سکتی۔ وہ عیسیٰ سے شیئر کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دل پر بوجھ لادے وہ پہلے ہی جھکنے لگی تھی۔ اب اور ضبط اور جبر کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ جیسے اس کی برداشت اور

”تو اس کا کوئی ٹھوس حل؟“ وہ بے انتہا سنجیدہ ہو چکا تھا۔

”ہے ناں۔“ آفاق جیسے پُر جوش ہو گیا۔ ”ہمیں اس نادیدہ دشمن کو کھوجنا ہے اور یہ بڑا آسان کام ہے۔“ اب وہ عیسیٰ کے کان پر جھک آیا تھا۔

”کیسے؟“ عیسیٰ بھی تجسس ہو گیا۔

”میں آج ہی کچھ حساس آئے، کیمرے اور سسٹم خریدتا ہوں جن کو گھر کے مختلف کونوں میں نصب کریں گے پھر دیکھنا نہ کوئی آسیب رہے گا اور نہ کوئی وہم یا وسوسہ۔ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی۔“ آفاق نے بہت ٹھوس لہجے میں بڑا مضبوط حل پیش کیا تھا یوں کہ علی عیسیٰ نے آفاق کو اپنے سینے میں سمجھ لیا۔

”تو گریٹ ہے یا ذرا خرم میں نے اس نادیدہ آسیب کو ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔“ وہ اپنی نا اہلی پر خود کولامت کر رہا تھا تب آفاق نے برجستہ چپک کر کہا۔

”اس لیے کہ تم مجھ سے زیادہ خوب رو تو ہو سکتے ہو مگر چالاک نہیں۔“ آفاق نے قہقہہ لگایا اور عیسیٰ نے اس کا بھرپور ساتھ دیا پھر پلاننگ کے پہلے اسٹیم کے لیے بجٹ کے حساب سے اسے رقم دے کر وہ لائٹس آف کرتا اپنے کمرے میں پہنچ گیا تھا اور اسے کمرے میں داخل ہو کر اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ مالا نہ

صرف جاگ رہی تھی بلکہ بیڈ پر پھر لٹکائے بیٹھی تھی حالانکہ عیسیٰ اسے سونے کی تلقین کر کے چکن میں گیا تھا۔ آج کی دعوت نے بلاشبہ مالا کو تھکا دیا تھا سو وہ نہیں چاہتا تھا کہ کھانا سمیٹنے اور برتن دھوتے ہوئے وہ اور زیادہ تھک جائے۔ اس کی طبیعت ان دنوں بہت بوجھل تھی اور اکثر وہ کسی وجہ کے بغیر بھی رونے لگتی تھی۔

عیسیٰ سمجھتا تھا، وہ اپنی ماں، باپ اور بہن بھائیوں کو بہت مس کرتی ہے اور اس نے مالا سے وعدہ کر رکھا تھا وہ ڈیوری کے فوراً بعد اسے پاکستان لے جائے گا۔

اسے خود بھی اپنے کزنز سے ملنے کا بہت شوق تھا اور صرف تصویروں کی حد تک اس نے انہیں دیکھ رکھا تھا۔ اس وقت وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہوا بیڈ

”پھر یہ کہ تم اپنے تئیں یعنی خود سے کوشش کیوں نہیں کرتے، یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ تمہاری موجودگی میں ناگوار واقعات پیش نہیں آتے۔ تمہاری غیر موجودگی میں ہی کیوں؟“ آفاق نے بڑی گہری بات کی تھی یوں کہ عیسیٰ جیسے حیران رہ گیا مگر وہ اسے جھٹلا نہیں پایا تھا۔ ادھر مالا حق دق رہ گئی تھی۔ اسے آفاق سے ایسی لگائی بھائی کی امید نہیں تھی مگر اسے آفاق سے ہر قسم کی امید رکھنی چاہیے تھی۔

”یہ تو سوچنے کی بات ہے۔“ عیسیٰ نے ہنکارا سا بھرا تھا۔ مالا جیسے پتھر ہو گئی تھی تو آفاق، عیسیٰ کو بدگمان کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

”تو پھر سوچو کہ اصل معاملہ کیا ہے؟“ آفاق نے ہمدردی سے عیسیٰ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”اور یاد رکھنا یہ معمولی واقعات نہیں۔“ وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔

مالا کے اندر تشکر کی لہر ابھری تھی۔ غصے سے اس کی بھویں تن گئیں اور مارے اہانت کے وہ تورا نے لگی تھی پھر وہ اٹنے قدموں واپس پلٹ گئی۔ اگر مزید کھڑی رہتی تو آفاق کے گریبان تک پہنچ جاتی۔ جس کا ابھی مناسب وقت نہیں تھا۔ مالا کے آنے اور پھر جانے سے بے نیاز آفاق، عیسیٰ کو سمجھا رہا تھا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے، یہ نادیدہ دشمن صرف مالا کا ہے۔ تمہارا نہیں کیونکہ یہ صرف مالا کو تیز کرتا ہے اور تمہاری غیر موجودگی میں آتا ہے۔“ آفاق نے بہت اہم نکتہ اٹھایا اب کہ عیسیٰ بھی حیران رہ گیا۔

آفاق ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں آفاق کی ذہانت کو سراہا۔ یہ ایسا پہلو تھا کہ اس نے اس پر سوچا ہی نہیں تھا بلکہ اسے سوچنے کا وقت ہی نہیں مل سکا تھا۔ پاپا کی بیماری، مالا کا ڈپریشن اور برنس کے بکھیڑوں میں الجھ کر وہ وقتی طور پر کسی بھی طرف دھیان نہیں دے پایا تھا اور اسی بات پر مطمئن ہو چکا تھا کہ مالا

کے ڈپریشن یا خود ساختہ وہم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب جو آفاق نے اس کا دھیان دوسری سمت مبذول کروایا تو وہ اسی پہلو پر غور کرنے لگا تھا۔

66 ماہنامہ پاکیزہ ستمبر 2014ء

67 ماہنامہ پاکیزہ ستمبر 2014ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



رہنمائی کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس بات کی طرف آفاق نے اس کا دھیان لگایا تھا وہ ایک دم ٹھیک اور پرفیکٹ تھی۔ وہ گھر میں حساس آلے فٹ کر ڈاکرا نے دشمن تک رسائی پاسکتا تھا جو مالا کا دشمن تھا، وہ پہلے عیسیٰ کا اپنا دشمن تھا اور ایک بات تو سلی تھی اس گھر پر کسی کا آسیب یا سایہ نہیں تھا۔ یہ کوئی آستین میں چھپا دشمن تھا جس تک پہنچنا اب مشکل نہیں تھا۔

وہ مالا کی بدگمانی فی الوقت دور کرتے ہوئے وضاحت دے رہا تھا۔ اس نے آفاق کا مشورہ بھی مالا سے شیئر کیا۔ تب وہ کیمروں کا سن کر حیران رہ گئی۔ اسے امید نہیں تھی کہ آفاق ایسا بھی کوئی مشورہ دے سکتا ہے۔ کیا اسے اپنے پکڑے جانے کا خوف نہیں یا وہ خود کو ضرورت سے زیادہ شاطر سمجھتا ہے آخر وہ اتنا اعتماد ہو کر کیسے گھر میں گھرے فٹ کرنے کی بات کر سکتا تھا؟ کیا اس بات کے پیچھے بھی کوئی پلاننگ تھی؟ کوئی انہونا سا منصوبہ؟ کوئی جامع پلاننگ کے ساتھ انوکھی چال؟ مالا اب آفاق پر بھروسا کرنے والی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس کی کئی چال میں آسکتی تھی۔ اب وہ محض تیل کی دھار دیکھ رہی تھی یا پھر وقت کی چال بھلا پانسہ کب تک اٹنے والا تھا؟

☆☆☆

کمرے میں نائٹ بلب روشن تھا ملگجاسا اندھیرا جواتا بھی ملگجائیں تھا۔ نائٹ بلب کے ساتھ ٹیبل لیپ کی روشنی بھی غبار کے مانند چھلی ہوئی تھی۔ گھڑی کی ٹنگ تک خاموش ماحول میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی یہ رات کا دوسرا پہر تھا۔ ہیرا نے اپنی ہیروں جیسی دکتی آنکھوں کے ساتھ گردن موڑ کر کاؤچ کی طرف دیکھا تھا۔ ڈاکٹر ابوبکر نفسیات کی کوئی بہت موٹی کتاب کھولے صفحوں پر نظر جمائے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ ہیرا کچھ متحیر رہ گئی تھی وہ جب سے مالا کے گھر سے آئی تھی اس نے ابوبکر کو گم سم سا پایا تھا۔ وہ اتنا چپ، چپ کبھی نہیں رہا تھا مگر پچھلے کچھ گھنٹوں سے اس کی کیفیات بڑی عجیب و غریب قسم کی تھیں۔ ہیرا کے لیے یہ صورت حال خاصی

تشویش ناک تھی۔ وہ کہنی کے بل ڈرا سا اٹھ کر اونچی ہوئی پھر اس نے کتاب کے ٹائٹل پر انگلی بجا کر جیسے ابوبکر کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق ابوبکر نے گردن موڑ کر ہیرا کو دیکھا۔ وہ اسے جاگتا دیکھ کر کچھ متحیر رہ گیا تھا۔

”تم ابھی تک سوئی نہیں؟“ وہ متشکر سا بولا انداز اب بھی کچھ کھویا، کھویا سا تھا ایک دم مضطرب سا۔

”میں سو کر اٹھ بھی گئی اور تم لگتا ہے ایک دفعہ بھی نہیں سوئے۔“ ہیرا بھی فکر مند ہو گئی۔ وہ اپنے شوہر کے لیے خاصی حساس تھی۔

”آں..... ہاں، بس نیند نہیں آئی۔“ ابوبکر کچھ چونک گیا۔

”نیند کیوں نہیں آئی، خیر تو ہے؟“ ہیرا بے چین ہو کر اٹھ گئی۔ ابوبکر جاگ رہا تھا پھر وہ کیسے سو جاتی۔ ابوبکر بے چین تھا ہیرا کیسے چین پالیتی۔

”ہا نہیں تم کیوں اٹھ گئیں شاید روشنی کی وجہ سے۔“ ٹھہر و میں لائٹ آف کرتا ہوں۔“ وہ لیپ کا بٹن دبانے لگا تھا جب ہیرا نے غلت میں اسے روک دیا۔

”اندھیرا مت کرو، روشنی ٹھیک ہے۔“ وہ مکھی پیچھے نکائے اس رخ سے بیٹھ گئی جس سے وہ ابوبکر کا چہرہ دھیان سے دیکھ سکے۔ ہیرا کی دکتی آنکھوں میں چھپا نظر اور کچھ کھوج اسے حیران کر رہا تھا اور کچھ کچھ جھنجھلاہٹ میں بھی مبتلا کر رہا تھا۔ بھی وہ نگاہ چرا کر کتاب کے صفحے اٹنے لگا مگر ہیرا کی تکرار اس کا دھیان کتاب میں نکلنے نہیں دے رہی تھی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ ابوبکر نے الجھ کر پوچھا۔ تب ہیرا گہری سانس پھینکتی الجھتی سنبلتی متشکر سی بول اٹھی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟ جب سے آئے ہو ایک دم چپ، اور خاموش ہو؟“ ہیرا بے چین ہو گئی تھی تب ابوبکر کو کچھ احساس ہوا۔ وہ اپنی وجہ سے اپنی بہت لاڈلی سی نٹ کھٹ بیوی کو پریشان کر رہا تھا اور یہ ٹھیک نہیں تھا۔

خاموشی کے بعد اس نے وہی بات چھیڑ دی جو اسے کب سے مضطرب اور بے چین کر رہی تھی۔ ہیرا جانتی تھی جب وہ کسی بات پر سخت سوچ و بچار میں مبتلا ہوتا تھا تب وہ اسی طرح گم سم اور خاموش ہو جاتا۔ اب چونکہ وہ ہمیشہ کی طرح اس سے کچھ شیئر کرنے والا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گئی تھی۔

”کیا.....؟“ اس کی دکتی آنکھوں میں تجسس بھر گیا۔

”وہ جو عیسیٰ کی بہن اور مالا کی نند ہے..... وہ کس قدر مختلف سی ہے۔“ ابوبکر نے جو کچھ اتنی بچار کے بعد کہا تھا وہ ہیرا کا بے ساختہ موڈ آف کر گیا۔ اب یہاں مون نامہ شروع ہونے والا تھا۔ وہ کچھ بد مزہ سی ہو گئی۔ عیسیٰ کی بہن اور مالا کی نندا سے پسند جو نہیں آتی تھی۔

”وہ مختلف ہے نا؟“ ابوبکر اسے خاموش پا کر جیسے تائید چاہ رہا تھا تب ہیرا کو سر ہلانا ہی پڑا۔

”مختلف نہیں، حسین ہے۔“ ہیرا نے دل پر پتھر رکھ کر کہہ ہی دیا۔ تصور میں مون کا شہزادوں جیسا سراپا گھوم گیا۔ اللہ بھی کچھ لوگوں کو بے بہا نواز دیتا ہے۔ ہیرا کو غائبانہ سا بے ضرر قسم کا حسد ہوا۔

”شاید حسین ہے مگر بہت عجیب بھی ہے۔ کیا تمہیں وہ عجیب نہیں لگی؟“ ابوبکر نے کچھ سوچتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔ تب ہیرا جیسے پرجوش ہو گئی تھی۔

”ہاں..... مجھے بھی بہت عجیب لگی خصوصاً اس کی آنکھیں..... ان آنکھوں کی چمک عجیب سی بجلی جیسی لپک..... یوں لگتا تھا بیٹھے بیٹھے پننا تاز کر دے گی۔“ ہیرا نے جذباتی انداز میں فر فر تقریری جھاڑ دی۔ تب ابوبکر نے گہری سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے پھر اس نے ہیرا پر جیسے آسمان گرا دیا۔

”اور تمہیں بتا بھی نہیں چلا، اس نے بیٹھے بیٹھے تمہیں پننا تاز کر دیا۔“ ابوبکر نے جس سنجیدگی سے بات کی تھی وہاں مذاق کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا۔ ہیرا ہکا بکا رہ گئی۔

”تم مذاق کر رہے ہو؟“ وہ بے ربط سی کہہ گئی۔

”نہیں، حقیقت کہہ رہا ہوں۔“ ابوبکر اب بھی سنجیدہ تھا۔ اس نے نفسیات کی موٹی سی کتاب کو بند کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اب وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے نیم دراز ہو گیا۔

”لگ..... کیا..... یہ ٹھیک ہے؟“ ہیرا تو گھبرا اٹھی تھی اس کے نزدیک ابوبکر اس سے مذاق کر رہا تھا مگر ایسا ہرگز نہیں تھا۔

”ہاں، میں نے یہی محسوس کیا۔ وہ بہت عجیب لڑکی ہے۔ میں نے ہر رنگ کے لوگ دیکھے ہیں طرح، طرح کے مریضوں سے واسطہ پڑا ہے مگر وہ بہت عجیب لگی۔“ ابوبکر اپنی کیفیات شیئر کر رہا تھا۔ اس نے کیا محسوس کیا، کس طرح محسوس کیا؟ اور مون میں اس نے کیا کیا، کیا بہت انوکھا اور عجیب دیکھا؟ وہ عام لڑکیوں سے ہٹ کر بہت مختلف تھی۔ حسن اس کی اضافی خوبی تھی اور معلومات کے لحاظ سے جیسے اس کے پاس کوئی خزانہ دفن تھا۔ وہ واجبی سی تعلیم یافتہ تھی اور یوں لگتا تھا جیسے زمانے کا علم حفظ کیے بیٹھی ہے پھر بہت دیر تک وہ دونوں مون حسیب کو ڈسکس کرتے رہے۔

ہیرا نے اسے بتایا کہ وہ چار منٹ کے لیے اونگھ گئی تھی جیسے سو گئی تھی مگر یوں لگ رہا تھا وہ فل حواسوں میں ہے۔ سوئی جاگی سی کیفیت تھی۔ اس کے تمام دماغی افعال کام کر رہے تھے۔ نیند کے باعث اس کا بیرونی دنیا سے عام نیند کی طرح رابطہ منقطع نہیں تھا۔ آخر وہ چار منٹ تک اتنی بے نیاز کیوں ہو گئی تھی جس کی وجہ سے کوئز مقابلے کے آخری سوال وہ سن نہیں پائی تھی۔

ابوبکر بہت خاموشی سے ہیرا کی باتیں سن رہا تھا جیسے... کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ بہت قابل ترین ماہر نفسیات تھا۔ اسے انسانی نفسیات کی گتھیاں سلجھانے میں بہت لطف آتا تھا۔

”وہ لڑکی صرف عجیب نہیں، بہت خطرناک ذہن کی مالک ہے۔“ ہیرا اس کی بات پر دم بخود رہ گئی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



یہ رات کا تیسرا پہر تھا باہر گھور اندھیرا اور اندر بھی گھورتار کی تھی۔ جرمی میں چوبیس گھنٹوں والا سسٹم رائج تھا۔ سو یہاں کے وقت اور ٹائم کے مطابق پندرہ بج کر کچھ ہی منٹ ہوئے تھے۔

رات کے سیاہ پردوں میں بہت سے بھید چھپے تھے۔ رات جو شر بھی تھی اور جس میں خیر بھی چھپا تھا۔ جو خوف بھی تھی اور امن بھی تھی اس میں راحت بھی تھی، بے چینی بھی تھی۔

رات کا تیسرا پہر پھسل رہا تھا۔ کہیں دور کسی جنگل کے کنارے مرغابیاں سر نہبوڑے اونگھ رہی تھیں۔ تالاب کے پار کہیں آسانی پر یاں اتری تھیں۔ کوئی میاں محمد صاحب کی رباعی گارہا تھا۔ گہری مدہوش اور پُرسکون نیند میں کم، باہر کی دنیا سے تمام کنکشن ختم ہونے کے باوجود جانے کس احساس کے تحت اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ جیسے بڑبڑا کر اٹھ گیا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے مٹ گئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں دیکھ رہا تھا پھر جانے کس احساس کے تحت حلق پر ہاتھ پھیرتا سلیر پہنے باہر نکل آیا۔

اسے شاید پانی پینا تھا، وہ بچن کی طرف جانا چاہتا تھا مگر جگر جگر کرتے لاؤنج کو دیکھ کر ٹھنک گیا۔ پورے لاؤنج کی لائٹس آن تھیں۔ سیکھے چل رہے تھے شدید سردی کے باوجود اسے سی تک آن تھے۔ اس کی سانس جیسے اٹک اٹک کر چلنے لگی۔

”گھر میں کوئی ہے..... گھر میں کوئی ہے۔“ وہ زربلب بڑبڑا رہا تھا مگر اس کے ہونٹ کسی گوند کے ساتھ ایک دوسرے سے چپک گئے تھے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر زمین اس کے قدم پکڑے بیٹھی تھی۔ وہ نہ آگے بڑھ پارہا تھا نہ پیچھے ہٹنے کی کوشش کر سکتا تھا بس ایک احساس جس نے اس کے پورے وجود پر پنجہ جمار کھا تھا اور وہ احساس تھا صرف خوف کا۔ مالا ایسے بھیا تک خوف سے کئی مرتبہ گزری تھی تاہم آفاق کی باری آج آئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے پورے لاؤنج میں دیکھ رہا تھا کہیں بھی بے ترتیبی نہیں تھی پھر اس کا دل داخلی

دروازے کو دیکھ کر دھک سے رہ گیا تھا، دروازہ کھلا تھا۔ ”تو کیا کوئی ابھی تک اندر موجود تھا؟“ اس کے دل میں پکڑ دھکڑ ہونے لگی تھی پھر کسی فیبی طاقت کے بل بوتے پر اس نے گھر کا کونا، کونا چھان مارا تھا۔ اسے کوئی بھی انسانی وجود نظر نہیں آیا پھر وہ حواس باختہ سا باہر آیا۔ اسے پھولوں کے اونچے جھنڈ کے پاس کسی وجود کا گمان ہوا، وہاں کوئی موجود تھا مگر بلیک جینکے کی دیر میں جھنڈ جیسے خالی ہو گیا اب وہاں کوئی سایہ نہیں تھا۔ آفاق کا دل چاہا وہ سائے کا پیچھا کرے مگر عجیب سے خوف نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ وہ پسینہ، پسینہ وجود لیے واپس مڑ آیا تھا۔ اس کے حواس ٹھکانے پر نہیں تھے۔ ہر قدم پر اسے چکر آ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا بڑھ رہا تھا حالانکہ لاؤنج کے چھوٹے بڑے فانوس جل رہے تھے۔ مالا کتنی سچی تھی، آفاق کو جیسے یقین آ گیا۔ گھر میں کوئی بھیدی آتا تھا۔ رات کی تاریکی میں..... مگر سوچنے کی بات یہ تھی وہ بھیدی رات کی تاریکی میں ہی کیوں آتا تھا؟ محض ہراس پھیلانے کے لیے۔

وہ اپنے گول، گول گھومتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے عیسیٰ کے کمرے تک آیا۔ اب وہ دونوں ہاتھوں سے دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد حواس باختہ سے عیسیٰ نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے آفاق کو کھڑا دیکھ کر وہ بڑبڑا گیا تھا۔

”آفاق تم! خیر تو ہے؟“ عیسیٰ آنکھیں مسلتا ہوا جیسے حیرانی اور بوکھلاہٹ میں پوچھ رہا تھا حالانکہ اسے سمجھ جانا چاہیے تھا کہ جس حواس باختگی سے آفاق دروازہ پیٹ رہا تھا، خیریت بھلا کہاں ممکن تھی۔

”خیر کہاں ہے..... ذرا باہر آؤ۔“ وہ اس کا بازو دبوچے لاؤنج میں گھسیٹ لایا۔ عیسیٰ حیران پریشان اس کے ساتھ گھسٹتا چلا آیا تھا۔ لاؤنج کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ پورا لاؤنج روشنیوں میں نہایا تھا ہر چھوٹا بڑا فانوس جگر جگر کر رہا تھا۔ سیکھے فل اسپڈ میں چل رہے تھے حتیٰ کہ اسے سی تک آن تھے اور پھر عیسیٰ کی

نگاہ دیوار پر نصب بیٹرنگ گئی۔ ”یہ بیٹرنگ نے آن کیا؟“ وہ دوسرے ہی پل اسے سی، سیکھے، گلوب بیٹر بند کرتا حواس باختہ ہو رہا تھا۔ ”شباباش عیسیٰ صاحب، مجھ سے پوچھ رہے ہو بیٹرنگ نے آن کیا؟ یہ گلوب، سیکھے اور اسے سی دکھائی نہیں دیے؟“ آفاق اتنے بڑے جھٹکے سے سنجھل کر گویا ہوا تب عیسیٰ نے گردن موڑ کر دیکھا داخلی دروازہ بھی کھلا تھا۔ وہ پھر سے شاکڈ ہوا۔

”یہ کس نے کھولا ہے؟“ دوسرے ہی پل وہ دروازے کا لاک چیک کرتا متحیر تھا۔ رات کو سونے سے پہلے تمام دروازے، کھڑکیاں اس نے خود چیک کر کے لاک کیے تھے۔ چابیاں ابھی تک اس کے نیکے کے نیچے پڑی تھیں پھر یہ دروازے کا لاک بنا چابی کے کیسے کھلا تھا؟ اس کا دماغ چکر کر رہ گیا۔ آج بہت دن بعد پھر وہی واقعہ رونما ہوا تھا فرق صرف اتنا تھا اس دفعہ مالا کے بجائے آفاق کو جھٹکے لگے تھے۔ وہ اسے کسی انسانی سائے کے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ دونوں لاؤنج میں کارپٹ پر سر تھامے بیٹھے تھے۔ دونوں کے پاس کہنے کو جیسے کچھ نہیں بچا تھا۔ دونوں متحیر تھے کچھ، کچھ خوف زدہ بھی تھے۔ خوف محض اس لیے تھا کہ اگر ان کی موجودگی کی بھی پروا کیے بغیر کوئی گھر میں دیدہ دلیری سے گھس آیا تھا تو غیر موجودگی میں کیا کرتا؟ اگر پاپا، مالا کو کوئی نقصان پہنچا دیتا؟ اب تو اسے ہر قسم کی اس نا دیدہ دشمن سے امید ہو چلی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا چاہتا تو سامنے سے وار کرتا چاہتا تو پشت میں چمرا گھونپ دیتا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ بہت دیر بعد عیسیٰ نے ٹوٹے لہجے میں پوچھا۔ جہاں انسانی سوچ کی انتہا ہو جاتی تھی وہیں اس کے گھر میں اچانک رونما ہونے والے واقعات کی شروعات ہوتی تھی۔ وہ اتنا پریشان تھا کہ بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔

”مجھے تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ آفاق تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ابھی سونے سے پہلے ہی تو وہ کمرے اور حواس سسٹم خریدنے کی بات کر رہا تھا۔

**خواب**

اسے کہنا  
تمہاری یاد کے جگنو  
اب میری  
آنکھوں میں دکنے لگے ہیں  
درد کے سارے موسم  
قلب و جاں میں  
اترنے لگے ہیں  
میرے اشکوں کی تپش سے  
میرے سارے خواب  
جلنے لگے ہیں

شاعرہ: فنیو آصف خان، ملتان

اب یہ کمرے کتنے ناگزیر ہو گئے تھے۔ عیسیٰ اور آفاق دونوں ان کی اہمیت سمجھتے تھے۔

”آفاق! تم کیا کہتے ہو؟ میں یہ گھر چھوڑ نہ دوں؟“ بہت دیر کی بے چینی نما خاموشی اور سوچ بچار کے بعد عیسیٰ نے نہایت بے چارگی سے آفاق کو مخاطب کیا تب آفاق بھی ٹھنک گیا۔

”تم کیوں گھر چھوڑو گے؟ یار یہ تو بزدلی ہے۔“ آفاق نے سنجھل کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کیا کروں؟ میرا چین، سکون کم گیا ہے۔“ وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال سے کیسے نٹے۔ جانے وقت علی عیسیٰ کے ساتھ کون سا کھیل کھیلنے والا تھا۔ وہ پہلے بھی مالا کے خوف کو معمولی خیال کر کے نظر انداز نہیں کرتا تھا مگر اب تو جیسے کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے بالوں کو نوچتا بے انتہا متحیر تھا۔ آفاق اسے پریشان دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔

”عیسیٰ تم پریشان نہ ہو۔ میں صبح ہی کچھ کرتا ہوں۔ دیکھنا جلد ہم اس ڈبھی اذیت سے چھٹکارا پالیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



”عیسیٰ! یہ ہمیں الگ کر دیں گے، مجھے آپ سے دور کر دیں گے۔“ وہ چیخ رہی تھی، رور رہی تھی۔ وہ ٹھٹھاٹھی، بے حال تھی اور عیسیٰ کے بدن میں دوڑتا لہو جم جم جا رہا تھا وہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

”مالا..... ہوش کرو، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ کوئی تمہیں مجھ سے دور نہیں کر سکتا۔“ عیسیٰ نے بہ مشکل اسے سنبھالا دے رکھا تھا۔ وہ اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔

”آپ..... آپ اسے نکالتے کیوں نہیں۔ آپ اسے ابھی گھر سے نکال دیں۔ یہ مجھے نظر نہ آئے۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟“ وہ عیسیٰ کی منتیں کر رہی تھی۔ عیسیٰ جیسے اس کے آنسوؤں سے پھل رہا تھا، بے بس ہو رہا تھا اور وہ آفاق کے سامنے شرمندہ بھی تھا۔ اسے شرمندہ دیکھ کر آفاق نے سنبھل کر اسے اشارہ کیا۔

”تم فکر نہ کرو بس مالا کو دیکھو۔ میں برامانے والا نہیں۔“ آفاق نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ وہ مالا کو اندر لے جائے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور عیسیٰ کم از کم آفاق کی فکر نہ کرے۔ وہ مالا کے الفاظ کو نظر انداز کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ آفاق کی طرف سے حوصلہ افزا اشارے نے عیسیٰ کی جھکی آنکھوں کو کچھ اٹھا دیا تھا۔ وہ مالا کو لے کر بہ مشکل اندر گیا۔ وہ اب بھی چیخ رہی تھی اور عیسیٰ کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ ان دونوں کے اندر جاتے ہی آفاق بے دم ہو کر صوفے پر ڈھے گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا اور سخت مضطرب کیفیت میں اپنے بال نوج رہا تھا۔ اس کے دل پر کون سی قیامت گزر رہی تھی، یہ مالا نہیں جانتی تھی، علی عیسیٰ بھی نہیں جانتا تھا۔

وہ بس مالا کی نفرت اور حقارت کی انتہا کو سوچ رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کہاں تک نیچے جا کر سوچتی تھی۔ وہ اس کے بارے میں کیسے خیالات رکھتی تھی؟ آفاق میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو اسی لمحے سامان اٹھا کر اس گھر پر لعنت بھیجتا، ٹھوکروں سے ہر چیز اڑاتا چلا جاتا

کچھ بھی ڈھکا چھپا رہنے والا نہیں تھا۔ مالا، علی عیسیٰ کی آستین میں آرام فرمانے والے ساتھ کے سر کو کچلنے والی تھی۔ وہ اس کے گریبان کو پکڑنے والی تھی۔

”کیا بکواس ہے مالا؟“ علی عیسیٰ گھبرا گیا۔ ”یہ تم کیا کہ رہی ہو؟“ وہ گردن موڑے آفاق کو دیکھ رہا تھا جو کسی پتھر کے بت میں ڈھلا نظر آ رہا تھا۔ اس کی رنگت انتہائی زرد ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ نیلے ہو کر تھر تھرا رہے تھے اور اس کا پورا جسم بھی کانپ رہا تھا۔ وہ ایک مرد ہو کر بری طرح تھر تھرا رہا تھا شاید جو کچھ مالا کہنے والی تھی وہ سب کم از کم عیسیٰ کے سامنے سننے کا آفاق میں حوصلہ نہیں تھا۔

”جو کہہ رہی ہوں آپ بھی سن لیں۔ ہمارے گھر پر کسی آسیب کا سایہ نہیں، نہ ہمارا کوئی دشمن موجود ہے۔ یہ سب کیا دھراسوزن اور آفاق کا ہے اور ان کی پشت کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے یہ آپ کو آفاق خود بتائے گا۔ یہی آپ کا سب سے بڑا دشمن..... آپ کو اذیت پہنچانے والا، آپ کی آستین میں آرام فرمانے والا، عیسیٰ اسے گھر سے نکال دیجیے۔ یہ ہمیں ڈس لے گا۔ ہماری خوشیوں کو نگل جائے گا۔ یہ کسی چامچ سازش کو لے کر آیا ہے۔ یہ ہمارے درمیان جدائی ڈالنے آیا ہے۔“ وہ عیسیٰ کی شرٹ نوچے چیخ، چیخ کر رور رہی تھی۔ وہ حال سے بے حال تھی۔ وہ بے انتہا ٹھٹھاٹھی، وہ ذہنی اذیت کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی شاید وہ اپنے حواسوں میں بھی نہیں تھی شاید اس کے صبر، ضبط اور برداشت کی آخری حد ختم ہو چکی تھی۔

”یہ سوزن کے کہنے پر مجھے نارچ کر رہا ہے۔ وہی سوزن جو آپ سے محبت کرتی ہے اور آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے صرف اپنے مذہب پر قائم رہ کر اور آپ کو اپنے مذہب کی طرف راغب کر کے۔ یہ ایک بڑی سازش کے تحت ہو رہا ہے، یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔ یہ ہمیں تباہ کر دیں گے، یہ ہمیں جدا کر دیں گے۔“ وہ عیسیٰ کا گریبان جھنجھوڑ رہی تھی اور عیسیٰ اتنا دم بخود تھا کہ اسے روک بھی نہیں پار رہا تھا۔ اسے چپ بھی نہیں کروا پار رہا تھا۔

نہیں تھے۔

”اللہ رحم کرے، کچھ نہیں ہوتا۔“ آفاق کا انداز بھر پور تسلی دینے والا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا جب کسی احساس کے تحت اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لاؤنج کے دروازے پر مالا کھڑی تھی۔ بکھرے بال لیے اور اس کی آنکھیں کچن کے رنگ جیسی سرخ تھیں۔ جیسے ابھی آنکھوں سے لہو پھوٹنے والا تھا اور تاثرات کیسے تھے؟ آفاق لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر تھا۔ وہ کسی پھرے طوفان کے مانند لگ رہی تھی جیسے ایک ہی جھٹکے میں تنکا، تنکا سب کچھ بکھیرنے والی تھی۔ اس کے چہرے پر غیظ بھر رہا تھا اور لبوں سے جیسے جھاگ نکلنے والا تھا۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی وہاں آئی۔ نہ جانے وہ کب سے ان کی باتیں سن رہی تھی اب جو اس کا ضبط جواب دے گیا تو پھٹ پڑی۔

”اللہ تو رحیم ہے، رحم کرتا ہے مگر اس کے بندے، بندوں پر رحم اور ترس نہیں کرتے۔ جب موقع ملتا ہے ڈس لیتے ہیں۔ نہ دوست کی پشت دیکھتے ہیں نہ دشمن کا سینہ۔ آستین میں چھپ کر ڈستے ہیں اور پھر بھی ہمدردی کا امرت ٹپکانے کا ڈراما کرتے ہیں۔ آفرین ہے ایسے آستین کے ڈیش..... ڈیش..... سانپوں پر۔“ وہ کسی خونخوار بھری شیرنی کی طرح، غیظ و غضب سے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے جبکہ عیسیٰ اور آفاق دم بخود رہ گئے تھے۔ ان دونوں میں سب سے پہلے عیسیٰ ہی سنبھل کر آگے بڑھا تھا۔

”مالا! تمہیں کیا ہوا ہے؟“ عیسیٰ نے گھبرا کر مالا کے دونوں شانے تھامے۔ وہ غصے اور نفرت سے تھر تھرا کانپ رہی تھی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

”مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بس آپ کے اس غلیظ سوچ رکھنے والے دوست کی اصلیت کھل گئی ہے۔“ آج جیسے پوم حساب آچکا تھا۔ آج آفاق کے کروت کھلنے کا وقت آچکا تھا۔ یہ رات سارے بھید، سارے بھرم توڑنے والی تھی۔ سارے راز کھولنے والی تھی۔ اب

گے۔“ آفاق نے دوستی کا حق ادا کرتے اسے تسلی دی۔ وہ خود بھی بہت متفکر تھا اسے لگ رہا تھا مالا کے اکڑے روپے کے پیچھے بھی یہی ذہنی اذیت پوشیدہ ہے۔ وہ آفاق سے بہت اکھڑی، اکھڑی رہنے لگی تھی۔ بات، بات پر طنز کرتی۔ آفاق کو لگتا تھا وہ میٹھی ڈسٹرب ہے جی اس کے ساتھ بھی اکھڑی رہتی ہے۔ ہر وقت چہرے پر ناراضی، غصہ اور ماتھے پر سلونٹیں تو عام طور پر نظر آنے لگی تھیں۔ شاید اسی جھنجھلاہٹ اور ذہنی اذیت کے باعث..... آخر یہ جھٹکے کوئی معمولی تو نہ تھے۔ وہ جو مالا کے کئی دفعہ بولے گئے طنز یہ جملوں پر ڈسٹرب ہو جاتا تھا اسے آج ہر طرح کے روپے کے لیے حق بجانب سمجھ رہا تھا۔ اس قسم کی صورت حال میں تو نارمل انسان پاگل ہونے لگتا ہے اور وہ نہ جانے کس حد تک ڈسٹرب تھی۔ اسے اس وقت مالا سے بہت ہمدردی ہو رہی تھی۔

”پتا نہیں، کیا ہونے والا ہے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے جیسے کچھ ہو کر رہے گا۔“ عیسیٰ نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام رکھا تھا۔ وہ اس وقت بہت بکھرا بکھرا نظر آ رہا تھا۔

”کچھ نہیں ہوگا تم تسلی رکھو۔“ آفاق نے اس کے شانے دبائے۔

”نہیں آفاق، یہ وسوسے یا واہے نہیں، تم دیکھ لینا کوئی منخوس گھڑی تاک لگائے بیٹھی ہے۔ مجھے آنے والے وقت کی منخوس آ نہیں سنائی دے رہی ہیں۔“ وہ لفظوں سے بھلنے والا نہیں تھا جو کچھ آج وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اسے بھلا کیسے جھٹلا دیتا؟ اب تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

”کیا پولیس کی مدد لوں؟“ کچھ دیر بعد اس نے آفاق سے مشورہ لینا چاہا تھا تب آفاق نے نفی میں سر ہلایا۔

”میرا خیال ہے ابھی مناسب نہیں ہے..... کچھ انتظار کر لیتے ہیں..... ایک دو دن تک۔“ آفاق سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”اور ایک دو دن میں کچھ اور نہ ہو جائے کوئی ناقابل تلافی نقصان؟“ عیسیٰ کے خدشات بے بنیاد



مگر اسے جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کرنا تھا۔ اسے مجلت نہیں دکھانی تھی بلکہ مشن امپا سیل کو کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا۔ وہ ناممکن نظر آنے والی ادھوری چیزوں کو بے ترتیب چیزوں کو کس طرح سے ممکن بنا سکتا تھا اسے بگڑی ترتیب کو درست کرنا تھا اور یہ درستی بھلا کون سا طوفان اٹھانے والی تھی یہ بات آفاق نہیں جانتا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے والی مراثیت اور انتہائی اعصاب شکن پھوشن کو بھلا کر آئندہ کی صورت حال پر غور کر رہا تھا۔ اگلا منصوبہ؟ اگلا لائحہ عمل؟ اگلی پلاننگ یا اگلی کوئی کہانی.....؟

مالا اسے گالیاں دے کر گئی تھی، طعنے مار کے گئی تھی، نفرت اور حقارت کا مظاہرہ کر کے گئی تھی۔ اسے گھرتیک سے نکالنے کی عیسیٰ کے سامنے التجا کر کے گئی تھی۔ وہ غیرت مند ہوتا تو عیسیٰ کے سامنے ہر چیز کو ٹھوکر سے اڑا کر چلا جاتا مگر بس ایک احساس تھا، جس نے اسے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے روک رکھا تھا، بس ایک جذبہ صرف ایک احساس۔

☆☆☆

صبح تک مالا جیسے نارمل ہو گئی تھی حالانکہ رات کو جس طرح وہ کسی دورے کا شکار لگ رہی تھی کسی کو بھی اس کے سنبھلنے کی امید نہیں تھی مگر صبح ہوتے ہی اس کا ذہن پرسکون ہو گیا۔ وہ ایک ان دیکھے بوجھ سے آزاد ہو چکی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ جس ذہنی کرب سے گزر رہی تھی یوں لگ رہا تھا سب کچھ کہہ سن کر اس کا دماغ اور دل کپاس کے مانند ہلکے ہو گئے تھے۔ وہ عیسیٰ کو سب بتا کر جیسے آزاد ہو گئی تھی۔ اب اس کے من پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اسے قوی امید اور بڑا مستحکم یقین تھا کہ علی عیسیٰ اب اپنے دشمنوں کی نشاندہی ہو چکنے کے بعد اب ان سے خود ہی نپٹ لے گا۔ مالا کے نزدیک کہانی مکمل کر سامنے آ گئی تھی۔ آخر سوزن اور آفاق کی ملی بھگت کو مالا نے کھوج لیا تھا۔ سوزن جو اپنے رد کیے جانے کے توہین نما احساس میں جکڑی تھی۔ بظاہر مالا کے لیے بے انتہا مخلص تھی اور در پردہ آفاق کے ساتھ مل کر اسے نارچہ کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ علی عیسیٰ، مالا کو نفسیاتی مریضہ

سمجھ کر کسی اسپتال میں پھینک آتا۔ سوزن اپنے تئیں رستے صاف کر رہی تھی۔ آفاق کو جانے کتنے پیسوں کا لالچ دے رکھا تھا مگر ایک بات تو مالا سمجھ چکی تھی۔ آفاق صرف سوزن کے لیے کام کرتا تھا اور سوزن کچھ تو اپنے لیے اور کچھ مون کے حصے کا حصہ بھی مالا پر آرام سے نکال رہی تھی۔ اسے بے وقوف بنا کر اس پر غصہ اور خوف طاری کر کے وہ لوگ بس علی عیسیٰ کی نگاہ میں اسے گرانا چاہتے تھے اور مالا ان کے انتہائی غلیظ مقاصد کو سمجھ چکی تھی اور آج وہ مطمئن اس لیے تھی کہ علی عیسیٰ کی آنکھیں بھی اس نے کھول دی تھیں۔

شاید آج مالا کے سکون اور اطمینان کا دن تھا۔ اگرچہ علی عیسیٰ نے اسے کی تمام باتوں اور بدگمانیوں کے جواب میں کوئی سوال نہیں پوچھے تھے مگر وہ کسی بھی وقت مالا سے کچھ بھی پوچھ سکتا تھا۔ وہ اس سے کوئی ثبوت مانگ لیتا یا دلیل چاہتا تو مالا بھلا کیا جواب دیتی؟ اس کے پاس فی الحال کوئی ثبوت نہیں تھا اور ثبوت اکٹھا کرنے کے لیے اسے سوزن اور آفاق کی باتیں ریکارڈ کرنا تھیں۔ مالا کا یقین مستحکم تھا کہ ایک مرتبہ پھر سوزن اور آفاق نفسیاتی طور پر اسے نارچہ کرنے کے لیے عیسیٰ کی غیر موجودگی میں آئیں گے تب اس کے پاس ایک ٹیپ ریکارڈ رکھنا ہونا بہت ضروری تھا۔

وہ آج عیسیٰ اور آفاق کے جاتے ہی قریمی مارکیٹ اکیلی چلی آئی تھی۔ اسے ایک بہت چھوٹا سا فلیش ڈرائیو بتا رہا تھا ریکارڈ چاہیے تھا جسے وہ اپنے بالوں کے پیچھے پن اپ کر سکتی۔

آج وہ اکیلی علی عیسیٰ کے من ہائیم کی چمکتی شفاف سڑکوں پر گھوم رہی تھی۔ یہ من ہائیم تھا جو مالا کے من میں بہتا تھا۔ یہاں انسان نہیں طلسمانی، رومانوی کردار بسا کرتے تھے۔ کالی، چمکیلی سڑکوں پر چلتے پھرتے نظر آیا کرتے تھے۔ اس شہر کی فضا میں محبت رچی ہوئی تھی اور وفا گندھی ہوئی تھی۔

سر می سڑکوں پر خوش پوشاک، خوب صورت، صحت مند لوگ چلتے تھے اور شیشوں کی دکانوں میں چینی

کی گڑیا جیسی سیلز گرلز راہ چلوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں۔

اس شہر کے پس منظر میں بلند پہاڑوں کی سر می چوٹیاں تھیں اور انہی پہاڑوں پر کہیں کہیں سفید خوب صورت مکان، جانے ان پتھروں پر یہ مکان کھڑے کیسے تھے!

اس سر زمین پر قدم رکھتے ہی مالا کی یہی سوچ تھی، اس سر زمین سے مالا کے قدم اکھڑنے کے وقت بھی یہی سوچ تھی۔ وہ کچھ خواب کی سی کیفیت میں چلتی شیشے کے ریکس دیکھنے لگی۔ جن پر جدید قسم کے ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو، موبائل اور مختلف قسم کا الیکٹرونکس کا سامان پڑا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے کرسٹل نمافش کی شیب میں پڑے ریکارڈر کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اسے جلد ہی گورہ مقصود لگ گیا تھا۔ اس نے کرسٹل نمافش ریکارڈر اٹھا کر سیلز گرل کے سامنے رکھا۔

”یہ کتنے کا ہے؟“ مالا نے عجلت میں اسے مخاطب کیا۔ وہ ہل گم چپاتی اپنی پونی ٹیل ہلا کر اس کی طرح ہنسی مسکراتی نہیں تھی۔ وہ ایک سنجیدہ ٹائپ کی سیلز گرل تھی۔ بہت خوب صورت، صحت مند اور اجلی اجلی سی۔ مالا عموماً اس کے پاس خریداری کے لیے آتی تھی۔ اس نے ایک ریک کے طرف ڈھیروں میگزین بھی رکھے ہوئے تھے۔ اکثر خریداری کے دوران مرد حضرات ان میگزین کی تب تک ورق گردانی کرتے تھے جب تک ان کی خواتین شاپنگ سے فارغ نہیں ہو جاتیں۔ جب وہ جانے لگتے تب یہ سیلز گرل ان کو لجاجت سے مخاطب کرتی۔

”کیا میگ پیک کر دوں؟ یا میگزین چاہیے؟“ اکثریت اس کی لجاجت کو دیکھتے ہوئے میگزین خریدنے کو ترجیح دیتے تاہم کچھ مالا جیسے لوگ بھی تھے جو بن دیکھے انکار کر دیتے تھے۔ تاہم یہ لڑکی ہر کسی کو جاتے ہوئے میگزین خریدنے پر ضرور اکساتی تھی۔ جانے یہ میگزین کیسے تھے؟ فی الوقت مالا کو ریکارڈر خریدنے کی جلدی تھی۔ وہ ادھر ادھر تاکہ جھانک کر کے وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے

سیلز گرل کو بتایا۔

”میں یہ لوں گی۔“ اس کی ڈورج اتنی امپرووو ہو گئی تھی جو وہ اب انگریزی کا ٹوٹا پھوٹا سہارا لیے بغیر اور آئی ول ٹیک اسٹ بولے بنا کسی بھی دکان سے کچھ بھی خرید سکتی تھی۔ سیلز گرل نے اس کا مطالبہ سن کر ریکارڈر پیک کر دیا تھا۔ قیمت اوپر ہی چسپاں تھی مالا نے رقم پکڑا کر دانگے شون (آپ کا شکر یہ) بولا اور پھر پلٹ کر جانے لگی تب اسی لڑکی نے عجلت میں اسے مخاطب کیا۔

”تم میگزین لو گی؟“ وہ مالا سے مخاطب تھی جب دو تین اور کسٹمر پہنچ گئے۔ وہ اسے چھوڑ کر انہیں فارغ کرنے لگی تھی۔ مالا نے اپنی سی نگاہ میگزین کے سروق پر ڈالی اور دوسری نگاہ ڈالنے کا گناہ کیے بغیر استغفر اللہ بولتی جھپاک سے باہر نکلنے لگی تھی معاً اپنے پیچھے ایک مانوس سی آواز اس کے کانوں سے گھرائی۔ وہ کون تھا؟ جو جدید قسم کے کیمروں کا پوچھ رہا تھا اور اس کی مانوس سی آواز میں ”بیٹے سیگن زی میر۔“ (برائے مہربانی مجھے دکھائیے) سن کر وہ پلٹ ضرور جاتی جو لوگوں کا ایک جھوم اس طرف اٹھتا۔ اتنے رش کا اسے گمان نہیں تھا۔ ایک دم بھانت بھانت کے لوگ آگئے تھے۔ مختلف آوازیں مگر مطالبہ اور خواہش صرف ایک تھی۔

”نیا میگ آیا ہے؟“ وہ لوگ میگزین کے ڈھیر پر کھینوں کی طرح بجنھنار ہے تھے۔ سیلز گرل کی مسکراہٹ دیکھنے کے لائق تھی۔ پہلے والی ناگواری اور سنجیدگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وہ خوش اخلاقی سے انتہائی عریاں تصویروں والا میگ ایک، ایک گا بک پکڑا رہی تھی۔

مالا استغفار، استغفار کا ورد کرتی کانوں کو ہاتھ لگاتی رائل روڈ پر چل رہی تھی مگر اس کے کان ابھی تک اسی مانوس آواز کی بازگشت کو سن رہے تھے بلاشبہ وہ آفاق کی آواز تھی یا تو اس نے مالا کو دیکھا نہیں تھا یا پھر دیکھ کر جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ آخر شرم اور شرمندگی کے باعث کیسے سامنا کرتا؟ وہ بھی اس



صورت میں جب مالا اس کی چالوں اور منصوبوں کو جان چکی تھی نہ انتہا کر بہ روپ اور بد نما شکل نلے کر مالا کا سامنا کیسے کر پاتا؟ یوں کہ عیسیٰ بھی اسے اب گھاس ڈالنے والا نہیں تھا۔ مالا کو قوی امید تھی کہ آج نہ سہی تو اگلی سویر تک عیسیٰ، آفاق کو گھر اور چاب سے نکال دے گا۔ دراصل عیسیٰ بڑا با اصول بندہ تھا۔ دشمنوں کے ساتھ بھی ضابطے میں رہ کر کارروائی کرتا اور مالا کو پوری امید تھی کہ عیسیٰ، آفاق کے بارے میں سب کچھ جان کر بھی اس پر اندھا بھروسا ہرگز نہیں کرے گا۔ وہ اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر کرے گا۔ مالا کو اب صرف رات کا یا اگلی سویر تک کا انتظار تھا۔ وہ جانتی ہی عیسیٰ اس سے زیادہ آفاق کو گھر میں رکھ کر مالا کو ذہنی اذیت اور ڈپریشن کا شکار کبھی نہیں کرے گا۔ اسے مالا دنیا میں اپنے باپ اور بہن کے بعد ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھی۔

وہ اپنی اسٹریٹ پر آئی تو اچانک انی کے مکان پر نظر پڑی۔ وہاں سفید تائیلون کے جالی دار پردوں والی کھڑکیوں کے بیرونی طرف پھولوں سے لدی ٹوکریوں کے ایک جانب بورڈ پر ابھی تک سیر فری یعنی روم فار رینٹ لکھا تھا۔ کرایے کے لیے ابھی تک کرا خالی تھا اور انی کو کرایے دار آج تک نہیں ملا تھا۔ خیرانی کی یہ خواہش جلد پوری ہونے والی تھی۔ آج شام تک یا اگلی صبح تک علی عیسیٰ، آفاق کو گھر سے نکال کر چاب سے فارغ کرنے والا تھا۔ ایسے فریبی، مکار، ذلیل اور آستین کے سانپ جیسے ہم وطنوں کا علاج بھی یہی تھا۔ انہیں عزت اور رزق رسا آنے والا نہیں تھا۔ دوسروں کے گھروں میں آگ لگا کر بھلا کیسے چین پاسکتے تھے؟ اب اسے خوار ہونا تھا۔ اپنی جلد بازی، کمیٹی فطرت اور لالچ کے باعث وہ مالا کے دل سے تو آتر ہی تھا عیسیٰ کی نگاہ اور دل سے بھی نکل گیا تھا۔ اب کیسے ماں کو حج کروائے گا، کس طرح داوی کو کڑے بنا کر دے گا اور کیسے بہنویوں کو سیٹ کرے گا، بہنیں بیاہے گا؟ دوسروں کی زندگیاں اجیرن کر کے سکھ پانا کوئی آسان

نہیں ہوتا، کاش کہ کم فہم آفاق جان جاتا۔ لالچ آ کر عیسیٰ کے دل سے نہ اترتا۔ اس کے گھر سے تو آج بچہ سالوں میں اس ملک جرمی کا باعزت بن جاتا مگر عزت اور حلال رزق کسی کسی کے نصیب ہوتا ہے، ہر کسی کے نہیں۔

جانے کون سی ایسی طاقت تھی جو اس سے اپنے گھر کے بجائے انی کے گھر لے آئی تھی۔ وہ انی کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ آفاق کے ایک، ایک کر توت، چال، منصوبے، مکاری کے بارے میں بتانے کا پختہ ارادہ کر کے تھی پھر اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر انی کو سب بتا دیا۔ سوزن کی عیسیٰ سے محبت، سوزن کی چال، آفاق اور سوزن کی دوستی، ان کا منصوبہ اور مالا کو بے درجے خوف زدہ کرنے تک۔ وہ ایک، ایک کہانی کھول، کھول کر بتا رہی تھی۔ وہ آفاق کی بد فطرت کے ایک، ایک بھیانک پہلو کو اجاگر کر رہی تھی۔ اسے انی جیسی مصمم لڑکی کو آنے والے فریب اور دھوکے سے بچانا تھا۔ صاف نیت اور خلوص لے کر آئی تھی۔ وہ انی کی ہمدرد دوست اور اچھی پڑوسن کا حق ادا کرنے آئی تھی مگر انی نے بھلا کیا سمجھا؟

وہ اسے حاسد اور بد فطرت سمجھنے لگی۔ یہ کہ مالا اس کی خوشیوں سے جلنے لگی تھی۔ آج شام ان کا نکاح تھا اور مالا رنگ میں بھنگ ڈالنے آگئی تھی۔ وہ تو نکاح کی خبر ہی شاکڈ تھی لیکن انی کی بدگمانی، غصہ اور رونے دھونے کو دیکھ کر اور بھی ڈھے گئی۔ وہ انی کو بچانا چاہتی تھی مگر انی خود ہی گڑھے میں گرنے کو تیار بیٹھی تھی۔ انی نے اس کی پوری بات سن کر شاکڈ سی کیفیت میں کہا تھا۔

”مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تم میری خوشی میں رکاوٹ بن جاؤ گی۔ تمہیں کیا خبر یورپین کنٹریز میں پاکستانی لڑکیوں کو اچھے رشتے ملنا کتنا مشکل اور کٹھن ہوتا ہے۔ میری ماں کی نیندیں حرام ہیں اور میرا بھائی پاکستان میں رشتے داروں کے گھروں میں ہمارے لیے اچھے برتلاشنے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔ مجھے

تمہاری سوچ پر بہت افسوس ہے، کیا اتنے عرصے بعد تمہیں اچانک آفاق اپنا دشمن نظر آنے لگا ہے؟ آخر پہلے بھی تو وہی آفاق تھا جس کے تمہارے شوہر اور تم دشمن بن گیا کرتے تھے۔ اب آفاق میں کیسے کیڑے نظر آئے؟ اور تم یقیناً کسی غلط گمان میں ہو، آفاق ایسا نہیں ہے۔“ انی نے دکھ کی انتہا پر پہنچ کر مالا کے سارے طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ مالا کو برا بھلا کہہ رہی تھی، غصہ کر رہی تھی اور ناراض ہو رہی تھی۔ اس کی می اور ای می نے بھی جیسے فساد کھڑا کر دیا تھا۔ عین نکاح والے دن مالا کا آفاق کے بارے میں برائی نامہ سن کر انہیں یہی کچھ تو کرنا چاہیے تھا۔

ادھر مالا اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ وہ ان لوگوں کو جنہم میں جاؤ کہہ کر واپس پلٹ آئی۔ اسے انی کی بدگمانی کا بہت دکھ تھا۔ دوستی کا لحاظ کیے بغیر اس نے مالا کو کیسے منہ پھاڑ کر حاسد کہہ دیا تھا۔ اسے رنج نہ ہوتا تو پھر وہ شادیاں بجاتی کیا؟ وہ بہت کھری ٹوٹی حالت میں جرمی جیسے ملک میں موجود اپنی دوسری سہیلی سے بھی تانا توڑ آئی تھی۔ سوزن سے تو رشتہ ختم ہوا ہی تھا، آج انی بھی ہمیشہ کے لیے پرانی ہو گئی تھی۔ مالا کا دل ٹوٹ سا گیا۔ انی نے جس طرح کاروتیہ اس کے ساتھ رکھا تھا وہ مالا کے لیے کسی دھچکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق ایک لفظ بھی پر نہیں سننا چاہتی تھی اسے مالا ایک نمبر کی منافق، جھوٹی، گھٹی اور مکار نظر آئی تھی۔ انی کی نظر میں اس کا ایج بگڑ گیا تھا۔ مالا روٹی چلاتی یا دگھی کیوں نہ ہوتی۔

وہ بھیکے چہرے کے ساتھ تالاب کے قریب سے گزر رہی تھی جب اس نے کچھ فاصلے پر پھولوں کے اونچے جھنڈے کے ایک طرف سرسراہٹ سی محسوس کی تھی۔ وہ شاید اپنے دکھوں اور رونے دھونے میں مشغول کبھی نہ متوجہ ہوتی جب تک وہ ”اومیرے مالک“ جیسی آواز نہ سن لیتی۔ کوئی جھنڈے کے دوسری طرف دو زانو بیٹھا نوکیلی گھاس میں ہاتھ مارتا شاکڈ تھا۔

مالا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اسے آفاق کی

تک وہا

جیکٹ نظر آگئی تھی اور اس کا مخصوص لیڈر بیگ جس کو اس نے کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ اللہ جانے وہ مارکیٹ سے سیدھا گھر آ رہا تھا یا پھر گھر سے اب دوبارہ کہیں جا رہا تھا۔ مالا کچھ ٹھنک کر آفاق کو دیکھنے لگی۔ اس نے گھاس میں سے کچھ تلاش کر کے اسے اپنے ہاتھ میں ٹٹولا پھر ”اومیرے مالک“ بول کر اس چیز کو جھلت میں اپنے لیڈر بیگ میں رکھنے لگا۔ اس کا چہرہ انتہائی سرخ تھا۔ آنکھوں میں حیرت اور عجیب سا تعجب تھا جیسے اسے امید نہیں تھی کہ وہ نوکیلی گھاس میں سے کوئی اس قسم کی چیز بھی دریافت کر سکتا تھا۔ جس کی نہ تو اسے کوئی توقع تھی اور نہ کوئی امید۔ وہ اتنا ہی شاکڈ، حیران، متحیر اور دم بخود تھا پھر جیسے وہ اس جھکے سے سنبھل کر اپنی جگہ سے اٹھا تھا تب اس کی مالا پر نگاہ پڑ گئی تھی۔ یہ اتفاقاً مالا سے دوسرا ٹکراؤ تھا۔ مارکیٹ کے بعد وہ اب دوبارہ اسے دیکھ رہا تھا حالانکہ فی الحال وہ اسے مخاطب کرنا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا۔

”گھر کے اہم مقامات پر کیمزے فٹ کر دیے ہیں۔ دیکھ لینا جلد حقیقت سامنے آجائے گی، سچ کو کھلتے دیر نہیں لگے گی۔“ وہ مالا کو ہرگز بھی نہ بلاتا مگر پھر بھی خود کو روک نہیں پایا تھا۔ رات کے ایک، ایک منظر کو ایک، ایک اذیت کی لہر دبانے کے بعد نظر انداز کرنا بہت مشکل تھا مگر آفاق نے یہ مشکل اور کٹھن مرحلہ بالآخر طے کر ہی لیا تھا۔

”سچ تو کھل گیا۔“ مالا انتہائی تنفر سے بولی تھی۔ جی چاہ رہا تھا آفاق کا مکاری بھرا چہرہ ناخنوں سے کھسٹ ڈالے مگر اس خواہش پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ ”یہ سچ آدھا ہے..... پورا کھلنے سے پہلے تھی فیصلہ نہیں چاہیے ورنہ پچھتاوے گھیر لیتے ہیں۔“ وہ عجیب سے کاٹ دار لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مالا کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آ گیا تھا۔

”ہونہہ..... پورا سچ..... اب کسے دھوکا دینا چاہتے ہو؟ عیسیٰ نے تمہارا کر بہ روپ تو دیکھ لیا ہے۔“



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارٹ کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

وہ زہر خند ہوئی۔  
 ”عیسیٰ نے ابھی میرا ہی روپ دیکھا ہے وہ بھی تمہاری نظر سے۔ اسے اب اپنی نظر سے بھی کچھ دیکھنے دو۔ تم نے اپنی بیٹی ہی اس کی آنکھوں پر باندھ رکھی ہے۔“ آفاق بھی مٹی سے بولا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ آفاق کی بات کو مذاق سمجھ کر انجوائے کرتی مگر اب تو اس کا دماغ آگ کی طرح تپنے لگا تھا۔  
 ”عیسیٰ نے تمہارے کروتوت دیکھ لیے ہیں۔ اب تم بس فیصلے تک کا انتظار کرو۔“ مالا اسے دھمکا رہی تھی۔ آفاق کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔  
 ”فیصلے سے زیادہ میں اسے کچھ ایسا ضرور دکھاؤں گا جو وہ کبھی دیکھنا نہیں چاہے گا۔ تم بھی انتظار کرو۔“ اس نے گویا بدلہ اتارا تھا۔  
 ”تمہیں غرور کس بات پر ہے؟ اپنے شاطر ذہن پر یا اعلیٰ منصب پر..... جو تمہارے ہی منہ پر آ پڑا ہے۔“ وہ آگ بگولہ ہو گئی۔  
 ”ایک طرف کی کہانی، فلم کا آدھا پارٹ، ناول کا پہلا حصہ، ڈرامے کی ابتدائی قسطیں..... بھلا اصل کہانی اور انجام تک پہنچنے سے پہلے تم فرد جرم کیسے عائد کر سکتی ہو؟ کم از کم میں عیسیٰ کو تمہارے جیسا جلد باز یا جذباتی نہیں سمجھتا۔“ آفاق نے کچھ جھنجھلا کر کہا تھا۔  
 ”تو پھر آج شام یا کل صبح تک انتظار کر لینا۔ عیسیٰ تمہیں خود گھر سے باہر نکال دیں گے۔ آستین کے دشمن۔“ وہ غیظ کے مارے لرز گئی تھی۔  
 ”عیسیٰ مجھے کیوں نکالے گا؟ میں اس کے دھکے دینے سے پہلے ہی تمہارا گھر چھوڑ دوں گا مگر عیسیٰ کو کچھ دکھانے کے بعد۔ مجھے ابھی اپنے نکاح کے وقت کوئی بدمزگی نہیں پھیلائی..... نکاح کے بعد بتادوں گا کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔“ آفاق غضب ناک تیور لیے لے لے لے ڈگ بھرتا اپنے لیڈر بیگ کو سینے سے چمٹائے باہر کی طرف چلا گیا تھا جبکہ مالا سر جھٹکتی اندر آ گئی۔  
 ☆☆☆

”یہ بے ہودہ رسائل کون لایا ہے؟“ مالا نے غضب ناک تیور لیے مٹی سے پوچھا تھا۔ اس کی توجیح کے عین مطابق مٹی نے لائسنس کا اظہار کیا تھا۔ آج سے پہلے بھی اگاڈا کا ایسے بے ہودہ رسائل گھر میں دکھائی دیے تھے مگر مالا تب غور نہ کر پائی تھی کہ انہیں کون لاتا ہے۔  
 ”مجھے نہیں پتا، آفاق سر کو پتا ہوگا۔ وہی تو ابھی مارکیٹ سے آئے ہیں۔“ مٹی کے سادگی بھرے جواب نے مالا کو آگ لگا دی تھی۔ آخر یہ آفاق کرنا کیا چاہتا تھا؟ اس قسم کے میگزین اس کے کمرے میں رکھنے کا مقصد کیا تھا؟ صرف اور صرف عیسیٰ کو بدگمان کرنا؟ مالا آنسو بہاتی ”اور اللہ تمہیں سمجھے آفاق“ کہتی تمام میگزین اٹھا کر کوڑے کے ڈرم میں ڈال رہی تھی۔ جب علی عیسیٰ بھی اچانک گھر آ گیا۔ اب مالا کی حالت اس کی نگاہ سے چھپی نہیں رہ سکی تھی پھر جو اس نے میگزین دیکھ لیے تو اس کا پارہ بھی پنا سوچے سمجھے چڑھ گیا تھا۔  
 ”یہ بے ہودہ رسائل کون لایا ہے؟“ اس کی آنکھیں غصے کے مارے سرخ ہو گئی تھیں۔ اتنا تو وہ جانتا ہی تھا کہ مالا اس قسم کی نازیبا اور گھٹیا حرکات نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM







ہوئی تھی تب مالا نے ڈیڑی، می اور بھائیوں کا حال احوال پوچھ کر فون بند کر دیا تھا۔ جانے کیوں اس کا دل بھر بھر آنے لگا۔ سب بے طرح یاد آنے لگے۔

سوچوں کے تانوں بانوں نے اسے الجھا رکھا تھا تب چاچو کی کراہ اسے حال کی دنیا میں کھینچ لائی تھی۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی چاچو تک پہنچی تھی ان کی طبیعت خراب لگ رہی تھی۔ وہی سینے کا پرانا درد تھا مالا نے چاچو کو دوا دی ان کا سینہ اور بازو مسلوا تو ایک دم انہیں افاقہ محسوس ہونے لگا تھا۔ مالا چاہتی تھی کہ عیسیٰ کو اطلاع کر دے مگر چاچو نے منع کر دیا۔ وہ اب بہتر محسوس کر رہے تھے مگر وہ ٹھیک نہیں تھے۔ مالا جانتی تھی پر چاچو اسے اٹھنے نہیں دے رہے تھے۔ ان کا دل چاہ رہا تھا مالا ان کے قریب رہے اور ان سے باتیں کرے۔ وہ گھبراہٹ محسوس کر رہے تھے۔ ان کی رنگت کتنی پھکی تھی اور ماتھے پر بار بار ابھرتی بوندیں..... مالا کا دل خدشات میں لپٹ رہا تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا تھا جیسے قریب، قریب کوئی خاص آنکھیں سنائی دے رہی تھی۔ چاچو بھی آواز میں بتا رہے تھے۔

”مون کی کال آئی تھی۔“ ان کا لہجہ بھرا بھرا تھا۔ مالا نے گہری سانس لی۔ مون کی کال جب بھی آتی وہ اسی طرح بیمار ہو جاتے تھے۔ انہیں ٹھنڈے پینے آنے لگتے، رنگت پھکی پڑ جاتی، سینے میں درد اٹھنے لگتا۔ جانے یہ مون کیسے بنی تھی؟ کیسی اولاد تھی جو ٹھنڈک بننے کے بجائے کوئی عذاب یا سزا کی طرح نازل تھی۔

”کیا کہتی ہے؟“ مالا نے حتی المقدور سرسری لہجے میں پوچھا تھا حالانکہ مون کے ذکر سے اس کا دل دھک، دھک کرنے لگا تھا اور اندر کہیں دور گہرائی میں خوف کی لہریں ابھرنے لگتیں۔

”بس ایسے ہی۔“ انہوں نے یہ مشکل مسکرانے کی کوشش کی تھی مگر وہ مسکرا نہیں پائے تھے۔ مالا بغور انہیں دیکھنے لگی۔ وہ اپنی عمر سے ذرا بھی بڑے نہیں لگتے تھے بلکہ چار پانچ سال چھوٹے ہی لگتے۔ اونچے، لمبے، مضبوط اور بے انتہا خوب صورت۔ شاید چاچو، چاچو

کے حسن میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ چاچو کا سحر بھلا جوانی میں کیسا ہوگا؟ اس نے لمحے بھر کے لیے آنکھیں بند کیں تو علی عیسیٰ کا سراپا آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

ہاں عیسیٰ چاچو کی جوانی ہی تو تھا۔ انہی جیسا خوب صورت اور حلیم الطبع۔ نہ جانے چاچو کی مزاجا کیسی تھیں؟ وہ تو عمر بھر پاکستان نہیں گئی تھیں نہ چاچو اور بچوں کو جانے دیا اور ان کے مرجانے کے بعد دونوں بھائیوں نے ایک تیسرا مضبوط رشتہ اپنے درمیان قائم کر لیا تھا مالا اور عیسیٰ کی صورت میں۔

وہ چاچو کو بغور دیکھتی رہی تھی وہ اب بھی بہت گریں فل اور جوان لگتے تھے مگر مون کی وجہ سے مالا کو لگتا تھا وہ اندر ہی اندر کھوکھلے ہو رہے تھے پھر جیسے انہوں نے مالا کی سوچ کو زبان دے دی تھی۔

”میرا جرنی میں ہمیشہ رہنے کا فیصلہ بہت غلط تھا بیٹا۔ ہم پاکستانی لوگ ایک عمر اجنبی دلس میں گزار کر جب اولاد کے ہاتھوں پامال ہونے لگتے ہیں تب، تب پھر اپنی قدریں، اپنی تہذیب اور اپنا وطن یاد آتا ہے۔ مجھے جلد یہاں سے لوٹ جانا چاہیے تھا مگر میں واپس پلٹ نہ سکا۔ مریم واپس نہیں جانا چاہتی تھی، اپنی ماں کو چھوڑنا اس کے لیے مشکل تھا اور میں ایسا خود غرض کے اپنی ماں کو چھوڑ آیا۔ کبھی لگتا ہے یہ ماں کے آنسوؤں کی سزا ہے۔ یہ مون میرے لیے ایک سزا ہی تو ہے۔“ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔ وہ بے آواز رو رہے تھے۔ اپنی غلطیاں اب اتنا وقت بیت جانے کے بعد پہاڑ جتنی لگ رہی تھیں۔ مالا سے ان کا کرب دیکھا نہیں گیا تھا۔

”اس میں آپ کا کیا قصور چاچو، یہ تو رزق باندھ لیتا ہے۔“ اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لیے تھے۔ وہ ان کے بال سہلا رہی تھی۔ یہ بھی تو ایک بیٹی ہی تھی۔ سات سمندر پار سے اپنے اپنوں کو چھوڑ کر آئی صرف ان کے علی عیسیٰ کے لیے۔ اپنے ماں، باپ کے لیے بھی ٹھنڈک، چچا کے لیے بھی ٹھنڈک اور شوہر کے دل کا چین و قرار۔ کبھی کبھی ان کا

بھی دل چاہتا تھا، وہ اپنی مون کی شادی کریں۔ اسے شوہر کے ہمراہ ہنستا، بستا دیکھیں۔ اس کے بچوں کو گود میں اٹھائیں۔ ان کی قلقاریاں سنیں مگر مون ان کی کوئی خواہش پوری کرنے والی نہیں تھی۔ بس ایک دل کو ٹھیس لگی تو سارے رشتوں کی مٹھاس بھول گئی۔

”دل، بہلاوے کی باتیں ہیں ساری، سچ تو یہ تھا میں واپس جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ جرنی کا حسن بھی بچال کا کالا جادو ہے جو ایک دفعہ طاری ہوا تو پھر عمر بھر کے لیے نہ ٹوٹا۔“ ان کی آواز بھیگ گئی۔ وہ رندھے لہجے میں رونے لگے تھے۔ مالا کے سامنے آج تک وہ اتنے کمزور نہیں پڑے تھے۔ جانے آج کیا ہوا تھا؟ وہ اتنے زور دینے کیوں ہونے لگے؟ وہ اتنے بکھر کیوں رہے تھے پھر وہ بہت دیر تک مالا سے باتیں کرتے رہے پھر جیسے انہیں نیند آنے لگی۔ وہ اونگھ رہے تھے جب مالا احتیاط سے اٹھ کر ان کا وجود کھیل سے ڈھانپ کر باہر نکل آئی۔

آج معمول سے بڑھ کر سناٹا تھا۔ نئی جانے کہاں چلی گئی تھی۔ مالا نے سفید تائیوں کے جالی دار پردے کو ہٹا کر باہر جھانکا۔ سامنے والے گھر میں چہل پہل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آج روشنیوں کا شمار کوئی نہیں تھا۔ انی کی می پوری بچت بھلائے سارے گلوب آن کر رہی تھیں۔ مالا کو ڈھونڈنے کی تھاب سنائی دی تھی۔ انی کی کزنز اور دوست آتی جاتی، بھاگتی دوڑتی، ہنستی مسکراتی نظر آ رہی تھیں۔ مالا کی آنکھ میں کچھ جھپٹے لگا۔ اس نے روشنیوں میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ آج روم فار رینٹ کی تختی بھی اکٹڑ چکی تھی۔ انہیں مستقل کرایے دار مل چکا تھا۔ مالا کا دل بھر سا آیا۔ انی کی... اعتباری نے سینے میں پھانس گاڑ دی تھی۔ وہ اس کا بھلے سے اعتبار نہ کرتی پر اتنی رکھائی تو نہ دکھائی، اتنی تو بہن تو نہ کرتی۔ مالا نے نم آنکھوں سے آخری دفعہ انی کے گھر پر نگاہ ڈال کر پردے برابر کر دیے تھے۔ اب عمر بھر کے لیے اس نے سامنے والے گھر کو نہیں دیکھنا تھا۔

وہ واپس پلٹ کر کمرے میں آئی تو کچھ ہی دیر

بعد علی عیسیٰ بھی چلا آیا۔ وہ دفتر سے سیدھا گھر آ رہا تھا۔ گلے میں ٹائی لنگ رہی تھی۔ وہ تھکا تھکا سا پڑ مردہ لگ رہا تھا۔ مالا نے چاچو کی خرابی طبیعت کا بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی پہلے اسے کچھ کھانے پینے کو دے گی پھر چاچو کا بتائے گی ویسے بھی اب وہ پہلے سے بہتر تھے اور اونگھ رہے تھے مگر اس کے باوجود عیسیٰ چاچو کے کمرے میں جھانک کر انہیں سوتا دیکھنے کے بعد مطمئن سا واپس آیا تھا تب تک مالا گرا گرم چائے اور اسٹیکس لے آئی تھی۔ چائے پیتے ہوئے جیسے وہ فریش سا ہو گیا تھا تب مالا نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

”آفاق اور انی کا آج نکاح ہے؟ وہ بھی اتنا اچانک؟“ مالا نے اپنی حیرت کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ ابھی کچھ گھنٹے پہلے ہی تو اسے آفاق کے نکاح کا پتا چلا تھا اور وہ اسی لیے حیران بھی تھی۔

”ماں، انی کی می کو بہت جلدی ہے۔ ایک لحاظ سے بہتر ہے۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ آفاق کا نکاح جلدی ہو جائے اور وہ یہاں سے چلا جائے۔“ گرما گرم چائے کے گھونٹ حلق میں اٹھیلنے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ عیسیٰ کے تاثرات سپاٹ قسم کے تھے۔ مالا کو یوں لگا کہ وہ آفاق کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہتا تاہم نکاح میں شرکت کا وہ ارادہ ضرور رکھتا تھا۔ با اصول بندہ جو تھا ہر کام ضابطے اور قاعدے سے کرتا تھا۔ مالا نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

”میں انی کے گھر نہیں جاؤں گی۔“ مالا نے لگے ہاتھوں طبیعت کا بہانہ بنا کر انی کی اور اپنی تلخ گفتگو کو چھپا لیا تھا۔ عیسیٰ نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ تاہم وہ سر ہلا کر تائید ضرور کر رہا تھا پھر موضوع گفتگو خود بخود بدل گیا۔ عیسیٰ بہت سنجیدہ اور کچھ سوچتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ مالا سے گزرے ہوئے چیدہ، چیدہ انہوں نے واقعات پوچھنے لگا۔ پچھلے دنوں مالا کو کیا کچھ نظر آیا، گھر میں لائٹس آن کرنے سے لے کر وہ اجنبی غائبانہ سی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



آواز تک۔ ایک، ایک بات وہ پوری جزیات کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ سوال کر رہا تھا اور نکتے بھی اٹھا رہا تھا پھر جب مالا نے نماز پڑھنے کے دوران اس عورت کا ذکر کیا اور تالاب پر اسے کلی مارنے کا واقعہ دوبارہ سنایا تب علی عیسیٰ بری طرح سے چونک گیا تھا۔ نہ صرف وہ چونکا بلکہ پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر بڑی بے ساختہ قسم کی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

”آں..... ہاں، ذرا پھر سے بتاؤ۔ تالاب پر بدیع الجہاں پری آئی اور اس نے کیا کہا؟“ علی عیسیٰ کی دلچسپی کا کوئی انت نہیں تھا۔ اس نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا تھا اور اب مسکراہٹ چھپائے بغیر پوچھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے والے سنجیدہ اور سپاٹ قسم کے تاثرات اب کہیں نہیں تھے۔ وہ اتنا زبردستی نظر آ رہا تھا کہ حد نہیں۔

”نہیں..... نہیں تو، بدیع الجہاں نہیں تھی وہ..... بدیع الجہاں وہ ہو بھی کیسے سکتی تھی؟“ مالا فوراً برامان گئی تھی جیسے اس کے پسندیدہ کردار بدیع الجہاں کو اس جھوٹی، فریبی اور ماسک زدہ چہرے والی عورت سے ملا کر عیسیٰ نے کوئی جرم کر ڈالا تھا۔ تب عیسیٰ نے فوراً معذرت کی۔

”تو اچھا..... وہ سیف الملوک کی بدیع الجہاں نہیں تھی؟“ وہ ہونٹوں کی تراش میں مسکراہٹ چھپا کر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ مالا کی زبانی سفر العشق یعنی قصہ سیف الملوک و بدیع الجہاں اس نے کئی ہزار مرتبہ سن رکھا تھا۔ وہ لاقانی قسم کی محبت میں مبتلا تھی یعنی سیف الملوک اور بدیع الجہاں کی محبت کو بڑی عقیدت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اب بھی عیسیٰ کی شرارت محسوس کر کے اس نے فوراً تریخ کر جواب دیا تھا۔

”وہ سیف الملوک کی بدیع الجہاں نہیں بلکہ آپ کی منکوحہ تھی۔“ اس نے چڑچڑے پن سے نئی بھرے لہجے میں کہا تب عیسیٰ کا ہنس، ہنس کر برا حال ہو گیا، وہ اتنی بے فکری سے ہنستا ہوا مالا کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ بڑی فدا ہونے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا عیسیٰ یوں ہی بے فکری سے ہنستا رہے مگر بعض دعائیں اور بعض خواہشات کبھی پوری

نہیں ہوتیں۔ اس کی یہ دعا بھی ادھوری رہ گئی۔

”ہیں..... میری منکوحہ؟“ وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ گیا۔ مالا اس کی اداکاری پر چڑھ گئی تھی۔

”وہ کہہ رہی تھی جب میرا نکاح آپ کے ساتھ ہوا تب آٹو ٹینک وہ بھی آپ کے نکاح میں آگئی۔ تو جن کی عورتوں کا شاید ایسے ہی نکاح ہوتا ہے۔“ وہ مزہ پھلا کرتا نے لگی تب عیسیٰ کی پھر سے ہنسی چھوٹ گئی۔

”یہ تو کمال ہو گیا، نکاح نہ ہوا آٹو ٹینک لاک ہو گیا۔ ویسے میری نادیدہ بیگم ہیں کہاں؟ مجھے نظر کیوں نہیں آتی؟“ عیسیٰ بے قرار سا ہو گیا تھا مالا بھٹائی تھی۔

”وہ مجھ سے ملاقات جو کرتی ہے۔ آپ سے شاید ڈرتی ہوگی۔“ وہ جیسے جتا کر کہہ رہی تھی۔ تب عیسیٰ نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

”مجھ سے کہاں، تمہی سے ڈرتی ہوگی۔ تم نے کلی چھینکی اور وہ ڈرا ایسا بھاگی کہ دوبارہ پلٹی ہی نہیں۔“ عیسیٰ دلچسپی سے ہنس رہا تھا اور مالا اس کی مزید اکیٹنگ سے بغیر اور نظر ڈالنے بنا ہی باہر چلی گئی۔ جانتی تھی کہ اب عیسیٰ اسے جان بوجھ کر تنگ کرتا رہے گا حالانکہ وہ بھی مالا کی طرح جان چکا تھا کہ پری وغیرہ کا قصہ جھوٹ ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس کی بیک پر کسی اور کا ہاتھ تھا اور عیسیٰ نے اسی ہاتھ پر نیچہ گاڑنا تھا۔ اسے امید تھی وہ جلد اپنے اور مالا کے نادیدہ دشمن تک پہنچ جائے گا۔ اگر چہ پہنچ تو وہ چکا ہی تھا اب بس تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے تک کا انتظار تھا۔

محض تین چار گھنٹوں تک بہت کچھ کھل کے سامنے آنے والا تھا۔ تب وہ آفاق کا بھلا کیا حشر کرتا؟ وہ دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن تھا۔ دوستی میں جان بھی دار دیتا اور دشمنی میں ہاتھ ڈال کر جان باہر نکال لیتا تھا۔ آفاق جانے کس بھول میں تھا کہ وہ عیسیٰ کو چکما دے کر نکل بھاگے گا۔ اگر تو آفاق کے بارے میں مالا کی کہی باتیں درست نکلتیں تب وہ اسے جرمنی میں سے کتے کی موت دے کر باہر نکالتا۔ اسے آفاق پر بڑا مان تھا۔ اپنے باپ کی خواہش پر اس

نے آفاق کا بڑا ساتھ دیا تھا۔ وہ ہر انجینی پاکستانی کی مدد کرتا تھا۔ یہ اس کے باپ کی خواہش ہی نہیں حکم بھی تھا۔ اس نے آفاق پر کوئی الگ سے احسان نہیں کیے تھے۔ وہ پہلے بھی بہت سے لوگوں کو جرمنی میں سٹیل کر چکا تھا۔ ان کی مدد کرتا، پیپرز بنواتا، مکان خرید دیتا۔ پاپا کے نزدیک یہ چھوٹی موٹی نیکیاں تھیں جو اس کا نامہ اعمال سنوار سکتی تھیں۔ پاپا کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس کے باپ نے بھی بہت سے لوگوں پر احسان کیے تھے انہی میں ایک پروفیسر بشر بھی تھا مگر وہ بھی ایک خبیث اور خود غرض انسان نکلا تھا جیسا کہ آفاق ثابت ہو رہا تھا۔

سوزن کے ساتھ مل کر اس کی زندگی میں تنخیاں گھول رہا تھا۔ سوزن نے اسے کون سا لالچ دیا ہوگا؟ شادی کا نہیں پیسے کا لالچ یا پھر ویزا بڑھانے کا لالچ کچھ تو سبز باغ آفاق کو بھی دکھائے گئے تھے تبھی اس نے دوست کے سینے میں خنجر گھونپ ڈالا تھا۔ اب عیسیٰ کو کچھ گھنٹوں کے بعد آفاق سے ملاقات کا انتظار تھا۔ اس نے کہا تھا، نکاح کے بعد وہ عیسیٰ کو کچھ دکھانے والا ہے؟ وہ کیا دکھانے والا تھا، یہ تو عیسیٰ نہیں جانتا تھا تاہم اس کی چھٹی حس کسی غلط اور انہونی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اسے سوزن سے ایسی توقع نہیں تھی۔ وہ اس کی چھٹی باتیں بھلا کر دوبارہ تعلقات بحال کر چکا تھا مگر سوزن نے کیا، کیا؟ انجینی ناموں سے مالا کے لیے تحائف بھیجتی رہی۔ اسے ذہنی طور پر شکستہ کرتی رہی، خوف زدہ کرتی رہی۔ میٹھی نارچ کرنا اسی کو کہتے تھے۔ وہ نفسیاتی حربوں سے مالا سے اس کو بدگمان کرنا چاہتی تھی مگر عیسیٰ بھلا مالا سے بدگمان ہو سکتا تھا؟ سوزن کی اصلیت کھل چکی تھی اور اب آفاق کے چہرے سے نقاب ہٹنے والا تھا۔ اگر تو آفاق اس منصوبے میں سوزن کے ساتھ برابر کا شریک نہ ہوتا تب اس کی زندگی کا یہ آخری دن ہو سکتا تھا۔ اپنی شادی والی شام مرنے والا وہ جرمنی میں پہلا دولہا ہوگا۔ دھوکے باز، منافق، احسان فراموش لوگوں کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا۔

علی عیسیٰ سلک کے پردے کو ہٹا کر اس کے دوسرے حصے یعنی سفید نایلون کے جالی دار پردے پر ہاتھ پھیرتا گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ شاید اگلا لاکھ عمل تیار کر رہا تھا۔ آفاق سے ملاقات کے بعد اگر کوئی ثبوت اس کے ہاتھ آ گیا تو اسے کیا کرنا ہوگا؟ اب وہ مزکر اپنے لائسنس شدہ ریوالور میں گولیاں بھر رہا تھا۔ ریوالور لوڈ ڈھوکڑا بھاری ہو گیا تھا۔ اس نے ریوالور کو احتیاط سے شرٹ کے پیچھے سے پنٹ میں اڑس لیا۔ اب وہ آفاق کے بیچ پر سامنے والے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اسے آفاق کے نکاح میں شرکت بھی تو کرنا تھی۔

☆☆☆

وقت کی تھیلی میں کس کے لیے کیا رکھا تھا؟ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا مگر حقیقت میں کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ کیا ہونے والا تھا؟ دل میں دوسرے تھے، کسی پل قرار نہیں تھا۔ عجیب بے چینی تھی جو بڑھتی جا رہی تھی۔

اس کے دل کو پتھکے لگے تھے، وہ بے چین سی گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر کاٹ رہی تھی۔ عیسیٰ ابھی تک نہیں لوٹا تھا اور یہ انتظار بڑا اذیت ناک تھا اسے ایک کہاوت یاد آ رہی تھی۔ چلتے چلتے اس کے پیر تھکنے لگے تھے۔ سانس پھول رہی تھی۔

time is too slow for those who wait  
(انتظار کرنے والوں کے لیے وقت بہت سست رفتار ہوتا ہے)

اس نے گھڑی کو دیکھا، وقت بہت سست روی سے گزر رہا تھا پھر جیسے باہر کھٹکے کی آواز آئی تھی۔ مالا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک دم گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ ہتھیلیوں میں نمی اتر آئی۔

too swift for those who fear  
(جو ڈرتے ہیں ان کے لیے بہت تیز رفتار)

وہ ڈرنے لگی تو سویاں بھی بھاگنے لگی۔ بیس، پچیس،

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



تہا

چھپے تیار کر کے چودہ فروری کے روز تجھے کے طور پر دیے جاتے تھے۔ ان چچوں کو عموماً دلوں، چاہیوں اور چابی کے سوراخوں سے سجایا جاتا تھا جن کا مجموعی مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ تم نے میرے دل کا تالا کھول دیا جبکہ آج چودہ فروری کی شام مالانے اپنے دل کے تالے کو مضبوطی سے بند کر لیا تھا۔ یہاں اب کسی سوزن، انی، مون، آفاق یا کسی اور منافق کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ اس نے عمر بھر کے لیے ان لوگوں سے تعلق توڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ سب مالا کو علی عیسیٰ کی زندگی سے نکالنا چاہتے تھے۔ یہ سب لوگ کتنے سفاک، بے رحم، کٹھور اور سنگ دل تھے۔ زندگی کو زندگی سے دور کرنا چاہتے تھے۔

پھر جانے کتنا وقت بیت گیا باہر شور کی آواز سنائی دی تھی۔ انی کا نکاح ہو گیا، مہمان چلے گئے تھے پھر یہ شور کیسا تھا؟ مالانے کان لگائے تو اسے یہ شور اپنے ہی گھر کے ڈرائنگ روم میں سنائی دیا تھا۔ وہ لمحے کے ہزاروں حصے میں گرئی پڑتی بھاگتی ڈرائنگ روم کے دروازے تک آئی۔ اندر کا خطر دیکھ کر اس کا کلیجیا کانپ رہا تھا۔

”آستین کے سانپ، ذلیل، کتے، نمک حرام..... تو میرے ہی سینے پر خنجر چلا رہا ہے۔ میرے ہی گھر میں بندھے کتے بھی پر بھونکتا ہے۔“ وہ علی عیسیٰ تھا مگر مالا کو وہ عیسیٰ نہیں لگا۔ اس پر حیوانیت سوار تھی۔ وہ آفاق کو لاتوں، گھونسوں اور جوتوں سے مار رہا تھا۔ اس نے بل بھر میں آفاق کو لہو لہان کر دیا تھا پھر مالا نے گردن گھما کر دیکھا وہاں قریب ہی چاچو کھڑے تھے اور مالا کو پہلی نظر میں یوں لگا جیسے ان کے جسم میں سے دھیرے، دھیرے جان نکل رہی ہے۔ وہ کسی پتھر لے بت کے مانند ساکت تھے۔ نہ وہ روک رہے تھے نہ وہ عیسیٰ کو منع کر رہے تھے، نہ وہ بول رہے تھے اور عیسیٰ کو خبر ہی نہیں تھی اس کے پاپا تو دھیرے، دھیرے مر رہے تھے۔

ادھر آفاق چلا رہا تھا۔ آگ اگل رہا تھا، چیخ رہا

مالا علی عیسیٰ کا رڈ لیس تھا مے بالکل ڈھے گئی۔ اس کا پورا وجود پسینے سے شرابور تھا۔ آخر مون حسیب اسے کس مقام پر روکنا چاہتی تھی جہاں مالا کے قدم اکھڑ جاتے یا جم جاتے وہ اسے کس کشمکش میں مبتلا کر چکی تھی؟ وہ اسے کس عذاب کے حوالے کر چکی تھی۔

مالانے سوچا وہ اٹھ کر چاچو کے کمرے کا دروازہ بجائے اور انہیں ان کی بیٹی کے ایک، ایک کارنامے اور منصوبے کا بتائے۔ چاہے وہ یقین کریں یا نہ کریں۔ مالانے سر کے پیچھے غیر ارادی طور پر ہاتھ مارا۔ قش کی شبیب کا ریکارڈر ساتھ نہیں تھا جانے وہ اسے کہاں رکھ آئی تھی۔ نہانے سے پہلے ڈریسنگ پر یا پھر بیچے کے نیچے۔

وہ تذبذب کے عالم میں سر جھکتی چاچو کے کمرے کو دیکھنے لگی۔ اسے تذبذب کی حقیقت کا اور اک بھی آج ہوا تھا۔ تذبذب کیا تھا؟ اس کی تعریف کیا تھی؟ اس کی وضاحت یا تشریح کیا تھی؟ تذبذب ایسے مقام کو کہتے ہیں جہاں آگے جانے کی ہمت نہ ہو اور واپس جانا ممکن نہ ہو..... تو مالا علی عیسیٰ اسی تذبذب کا شکار تھی۔ بے دم اور ساکت تھی نہ آگے بڑھ پارہی تھی اور نہ پیچھے ہٹنے کا حوصلہ تھا۔ وہ آج مون کے اندر کا زہر اور غلاظت بھی کھولنے کا مستحکم عہد باندھنے والی تھی مگر اس کے لیے تھوڑی ہمت بھی درکار تھی۔

اس نے کارڈ لیس رکھ کر چھوٹا سا سرخ ہندسوں والا کلینڈر اٹھا لیا تھا۔ چودہ فروری کے ہندسے پر انگلی پھیر کر اس نے گردن موڑ کر باہر کی طرف دیکھا۔ انی کا گھر نظر نہیں آ رہا تھا۔ آج انی کا نکاح تھا، انی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آج ویلنٹائن ڈے تھا، فلمی سے ایکٹر نما آفاق نے شادی کے لیے فلمی سارو مانوی دن منتخب کیا تھا۔ اب وہ اپنی نئی زندگی میں اداکاری کر کے کتنا کامیاب ہو سکتا تھا یہ صرف وقت بتانے والا تھا۔

کلینڈر کے نیچے سفید موٹے حروف میں کچھ اور بھی لکھا تھا۔ جانے کیا؟ مالا سے پڑھا نہیں گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ویلز میں لکڑی کے ”محبوبی“

رک گئی تھی۔ اس کا دل جیسے رک رک کر چلنے لگا اور چل چل کر تھمنے لگا۔ بن مانگے اللہ کیا، کیا عطا کرتا ہے۔ مالا کو آج پتا چلا تھا۔ اللہ نے اسے علی عیسیٰ کی صورت میں کون سا ہیرا دیا تھا اس کی دنیا مکمل کر دی۔ مالا کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے، شکر گزاری کے آنسو۔ اسے اتنا نیک، ایمان دار اور باکردار شریک حیات ملا تھا۔ یہ اس کی کوئی نیکی کا بدل تھا یا اس کے برکھوں کی کسی نیکی اور احسان کے بدلے اس پر نعمت پوری کی گئی تھی۔ مالا نہیں جانتی تھی وہ تو صرف اللہ کا شکر ادا کرتا جانتی تھی اور ہر گھڑی، ہر ساعت بس شکر ادا کرتی تھی۔

کتنی ساعتیں چپکے سے ہمسلم گئیں معافوں کی گھنٹی نے طلسم توڑ ڈالا تھا۔ وہ پیر گھنٹی چونک کر فون تک آئی۔ نمبر انجانا تھا اس نے کارڈ لیس اٹھا کر کان سے لگایا۔ اس کے کچھ بھی کہے یا بولے بغیر ایک تکبیر بھری آواز سماعتوں میں سیسہ اتارنے لگی تھی۔

”بہت جلد واپس ملنے والی ہو، کبھی سوچنا تو سہی جہاں سے چلی تھیں وہیں رگوں گی۔ اپنے پچھلوں کو جا کر میرا ایک پیغام دینا۔ مون حسیب انتقام اور بدلہ پورا کرنے میں کمال کی مہارت رکھتی ہے۔ جو نفرت کرے، اس سے نفرت کرو۔ جو محبت کرے، اس سے محبت کرو۔ جو دھوکا دے، اسے دھوکا دو۔ جو آگ لگائے، اسے آگ لگا دو۔ جو دل کو ڈھائے، اس کے وجود کی پوری عمارت کو ڈھا دو۔ اپنا تو عمر بھر کے لیے ایک ہی اصول اور ایک ہی قانون رہا ہے جس میں ترمیم تو ہو سکتی ہے اسے بدلا نہیں جاسکتا۔“ پھنکارتی ہوئی آواز آتا بند ہو گئی تھی۔ اس نے محض مالا کو اتنا ہی سمجھانا تھا۔ آگے وہ خود سمجھ دار ہوتی تو سمجھ جاتی مگر وہ سمجھ دار ہی تو نہیں تھی۔

”بھلا مون نے پچھلوں کی بات کیوں کی تھی؟ کون سے پچھلے؟ آخر مون کا میرے پچھلوں کے ساتھ تعلق ہی کیا تھا؟ اور وہ کہہ رہی تھی جو آپ کو دھتکارے اسے دھتکار کر سزا دو۔“ وہ مالا کو کیا بتا رہی تھی۔ اس کی باتوں کا مفہوم کیا تھا وہ محض اسے خوف زدہ کر رہی تھی یا اس کی آگ برسانی باتوں اور لفظوں میں کوئی معنی بھی چھپے تھے۔

تیس منٹ جیسے ہمسلم، ہمسلم گئے، وقت بھاگنے لگا تھا۔

too long for those who grieve

(جو غمزدہ ہوتے ہیں، ان کے لیے بہت طویل) ہاں، اس کے اندر غم تھا عیسیٰ سے چھڑ جانے کا خوف تھا، جدائی کا وسوسہ تھا۔ یہ لاشعوری غم تھے مالانہ بھی سوچتی تب بھی یہ خوف ذہن میں پنچہ جمانے لگتے۔

too short for those who rejoice

(جو خوشی مناتے ہیں، ان کے لیے مختصر) اس نے زمانے بھر کی خوشیاں علی عیسیٰ کی ہمراہی میں پالی تھیں۔ وقت اسی لیے مختصر ہو رہا تھا۔ مالا یہ تنگ پڑ رہا تھا۔ کاش کہ وہ وقت بدلنے کی طاقت رکھتی مگر یہ ممکن ہی کہاں تھا۔

but for those who love time is eternity.

(لیکن جو محبت کرتے ہیں ان کے لیے وقت ابد تک پھیل جاتا ہے)

اور وقت مالا علی عیسیٰ کے لیے ابد تک پھیلنے والا تھا۔ اس نے محبت کی تھی، اسے محبت ہوئی تھی۔ بالکل ایسی ہی محبت جو سیف الملوک نے بدیع الجہال سے کی تھی اور تاریخ نے اس محبت کو سنہری حروف کے ساتھ کتابوں میں محفوظ کر دیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا تھا۔ یہ محبت جسموں سے نہیں روح کے تعلق سے ہوئی تھی۔ وہاں روحوں کا ملاپ ہوا تھا۔ یہ روح کی روح سے محبت تھی جو آج تک میاں محمود صاحب کی تصنیف میں زندہ تھی۔

راہ عشق پل صراط سے کم نہیں جس طرح پل صراط پر چلنا محال ہے اسی طرح عشق کی منزل تک پہنچنا بھی آسان نہیں جس طرح بہشت کی آس، امید کو زندہ رکھتی ہے۔ اسی طرح وچھوڑے اور جدائی میں بھی ملن کی آس زندگی کو آگے کھینچنے میں مدد کرتی ہے۔

وہ چلتے چلتے علی عیسیٰ کی تصویر کے پاس آ کر



تھا۔ جانے آفاق نے عیسیٰ کو کیا دکھایا تھا جو عیسیٰ کے سر پر خون سوار ہو چکا تھا۔ وہاں آفاق کا لیدر بیگ بھی کھلا پڑا تھا اور اس بیگ میں کچھ چمک رہا تھا۔ جانے کیا؟ مالا سے دیکھا نہ گیا۔

”تو مالا کی آنکھ سے دیکھا ہے، کبھی اپنی آنکھ سے دیکھ، تیرا مجرم تیری اپنی آستین میں ہے۔“ آفاق نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے سر سے خون کے فوارے ابل رہے تھے۔ وہ جرمنی کا پہلا پردیسی دولہا تھا جو اپنی شادی کی شام موت کے دہانے پر کھڑا تڑپ رہا تھا۔ شاید آفاق کا یہی انجام ہونا تھا۔ لاپٹی اور ذلیل لوگ دنیا میں اسی طرح خوار ہوتے ہیں۔ وہ بھی خوار ہو رہا تھا۔ اس کا انجام یہی تو ہونا تھا پھر مالا کیوں خوش نہیں تھی؟ اس کے دل میں تو بس خوف نے کنڈلی مار رکھی تھی اور یہی خوف اسے چیخنے پر مجبور کر رہا تھا۔

”بس کریں..... بس کریں..... یہ مر جائے گا۔“

مالا تڑپ کر رہی تھی۔ اس سے عیسیٰ کی درندگی دیکھی نہ گئی۔ وہ اتنا صابر، حلیم اور مہذب عیسیٰ بالکل وحشی درندہ لگ رہا تھا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ وہ مالا کے حواس معطل کر رہا تھا۔

”تو اس کی جا کر گردن دبوچ..... وہ ہی تو ہے تیری آستین میں.....“ آفاق سے آگے بولا نہیں گیا تھا۔ عیسیٰ نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔ اس کا سر فرش پر دھڑ دھڑ کھراتا رہا پھر اس نے اپنی شرٹ کے پیچھے پینٹ میں اڑسار یو لور نکال لیا۔

”پھر لیا تو نے اپنی گندی زبان سے اس کا نام..... اب تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ عیسیٰ نے کف لگتے ریو لور کا ٹریگر دبا دیا اور ٹریگر دبانے سے پہلے اس نے ایک بھیا تک آواز سنی۔ یہ آواز چاچو کے منہ سے نکلی تھی۔ وہ فرش پر گرے تڑپ رہے تھے پھر جب عیسیٰ پستول پھینک کر اپنے باپ کی طرف آیا تب تک مٹی کے بت سے روح بے سکون کب کی پرواز کر گئی تھی۔

علی عیسیٰ کے پایا مر گئے اور وہ جیسے دیوانہ ہو گیا۔ ان کے مرے ہوئے جسم کو اٹھا کر اسپتالوں میں بھاگتا

رہا مگر کسی ڈاکٹر کے پاس اس کے پایا کی جان واپس لانے کا اسم نہیں تھا۔ تھک ہار کر انہیں سپرد خاک کر دیا یہ تو کرنا ہی تھا۔ وہ باپ کے قدموں میں سر رکھ کر بچوں کی طرح روتا علی عیسیٰ حواس چھوڑ رہا تھا۔ اس کا پہلا عشق اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اس کا پسندیدہ کھلونا اس سے دور ہو گیا، چھن گیا تھا وہ راتوں کو اٹھ، اٹھ کر رونے لگتا۔ اس کے دل کا چین سکون کھو گیا تھا، علی عیسیٰ جیسے کھو گیا۔ وہ شاید سنبھل ہی جاتے۔ زندگی آہستہ آہستہ ہی سہی اپنے معمول پر آ جاتی مگر پھر وہ ہو گیا جس کا تصور بھی قیامت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہاں، قیامت مالا اور علی عیسیٰ پر بیک وقت ٹوٹ پڑی تھی۔

مالا کی کشتی ایسی تند موجوں کے بھور میں جا پھنسی تھی جس نے دکھیل کر اسے جرمنی کی سر زمین سے پاکستان لا چکا تھا مگر اس دوران ہوا کیا تھا چاچو کے مرجانے کے بعد وہ ایک رات جیسے مالا کی زندگی کا رس نچوڑ گئی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے علی عیسیٰ کی زندگی سے نکل گئی مگر اس رات آخر ہوا کیا تھا؟

☆☆☆

زندگی میں کبھی کبھار بہت عجیب واقعات پیش آتے ہیں۔ اتنے عجیب کہ عقل ان کے جواز ڈھونڈنے کے دوران بالکل دنگ رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھار بہت عجیب طرح سے انہوں نے واقعے، حادثے یا سامنے پیش آتے ہیں اور عقل انسانی کو حیران کر دینے والی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ذی شاہ کے ساتھ بھی کچھ یوں ہی ہوا تھا۔ وہ سوچتا تو حیران رہ جاتا آخر اس کے ذہن میں جرمنی جانے کا انہوتا خیال کیسے آیا تھا؟ حالانکہ دیکھا جائے تو جرمنی ان کے لیے ہندوستان کا کالا پانی یا خطرناک جیل کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ جی ہاں، یہ وہی جرمنی تھا جس کی طرف کوئی ایک مرتبہ رخ کر لیتا تو یا پھر وہ کبھی نہ لوٹتا ان کے اکلوتے چچا کی طرح یا اگر لوٹ تو آتا مگر ذی شاہ کی بہن جیسے حالات سے گزر کر۔ اپنا دل، دماغ اور سوچیں تک پرانی کر کے اپنے حواس اور شعور تک کو لٹا

کر پھر اسے جرمنی جانے کا کیا فائدہ تھا؟ مگر ذی شاہ ہر قسم کے فائدے اور نقصان کو ایک طرف رکھ کے صرف اپنی بہن کے مجرم کو تلاش کرنے آیا تھا۔ جس نے اس کی معصوم بہن کو طلاق دے کر گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ وہ دھکے کھاتی اور جانے کہاں کہاں رتی واپس اپنے وطن لوٹ پائی تھی اور اس کے صدمات سے چور وجود کو دیکھ کر ذی شاہ کے ڈیڑی ہارٹ ایک سے جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس کی بہن مالا نے قبل از وقت ڈیڑی جھٹکوں کی بدولت اپنا بچہ بھی کھو دیا تھا اور خود وہ جیتی جاگتی لاش ہی تو بن گئی تھی۔ تو کیا ذی شاہ کا فرض نہیں بننا تھا وہ پلٹ کر اپنی بہن کے مجرموں اور قاتلوں سے حساب لیتا۔

اس کے دل میں جرمنی جانے کا پہلا خیال کب آیا تھا؟ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں تھی کچھ مہینے پہلے وہ معمول کے مطابق جاگنگ کے لیے گھر سے نکلا تھا، وہ قرمبی پارک میں ورزش کے لیے ہر روز آیا کرتا تھا۔ آج بھی معمول کے مطابق جاگنگ ٹریک پر دوڑتا کبھی کبھار رک کر ایکسرسائز کرنے لگتا۔

تب دوڑتے اور ورزش کرتے اچانک اس کے دماغ میں کلک سے کچھ روشن ہوا۔ جیسے کوئی خیال آیا تھا۔ جیسے اس کے ذہن نے کوئی پیغام وصول کیا تھا۔ وہ سر جھٹک کر اپنے کام کو جاری رکھتا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ اس کا ذہن ایک نکتے پر جم گیا۔ آگے بڑھ سکا نہ پیچھے ہٹ سکا۔ وہ ایک ہی پیغام کو بار بار وصول کر رہا تھا۔ انسانی ذہن جو ایک موڈیم کی طرح ہوتا ہے بنیادی طور پر ان پٹ آؤٹ پٹ ڈیوائس جیسا۔ جو فون لائن کو کمپیوٹر سے جوڑتا ہے۔ اس کے ذریعے ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر تک ڈیٹا حاصل کرنے اور پہنچانے کا کام لیا جاتا ہے جیسے ایک ذہن کو دوسرے ذہن کے ساتھ جوڑ لیا جائے۔ انسانی ذہن بھی کمپیوٹر کے موڈیم کی طرح ہوتا جو برقی ڈاک (ای میل) پیغامات کو 180 میل فی گھنٹا کی رفتار سے لاکھوں میل کی دوری کے باوجود ایک ذہن سے دوسرے ذہن

تک پہنچا دیتا ہے مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ کوئی دماغ اتنی افلاطونی طاقت کیسے رکھتا ہے؟ یقیناً کروڑوں انسانوں کی اس دنیا میں بلاشبہ بے شمار لوگ ایسے تھے جنہیں اللہ نے عقل کو دنگ کر دینے والی نعمتوں سے نوازا تھا۔ کسی کو اتنا علم دیا کہ اس نے جہاز بنا کر اڑا بھی لیا، کسی کو اتنا فہم دیا کہ اس نے اپنے جسم سے بجلی پیدا کر لی، کسی کو اتنی عقل دی کہ وہ سیاروں پر پہنچ گیا۔ کسی کو اتنی ہمت دی کہ اس نے کوہسار فتح کر لیے۔ کسی کے جسم میں ایسی طاقت بھردی کہ وہ زہریلے اور زہریلے ترین سانپ کے کانے اور سیکنڈوں میں موت کے گھاٹ اتار دینے والے سانپ کے زہر کا انجکشن لگا کر بھی زندہ رہا۔ کسی کو سائنس دان بنا دیا، کسی کو خلا باز بنا دیا، کسی کو زہریلے جانوروں کا شکار کرنا سکھا دیا، کسی کو حسن کی دولت سے مالا مال کر دیا اور کسی کو انتہائی طاقتور دماغ عنایت کر دیا۔ یہ سب کرمہ سازی اسی اللہ کی تھی جو جہانوں کا رب ہے۔ جسے چاہتا ہے نواز دیتا ہے اور اس کا شکر ادا کرنے والے بندے بہت کم ہیں لیکن وہ پھر بھی نوازتا ہے۔ اب لینے والے پر منحصر ہے کہ وہ رب کی دی گئی نعمتوں کا مثبت استعمال کتنا کرتا ہے؟ انسانی دماغ سے کیسے کام لیتا ہے کس طرح سے اپنی بے بہا طاقت کا استعمال کرتا ہے۔

انسانی ذہن جو کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک یا موڈیم کے مانند ہے۔ برقی ڈاک کی طرح پیغامات کو لمحوں میں وصول کرتا ہے۔ کمپیوٹر سافٹ ویئر پروگرام جس کے ذریعے ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر تک پیغام کو ارسال اور وصول کیا جائے۔ ٹیکنیکی اور مروری طور پر ای میل کہلاتا ہے۔ ای میل کا تصور تو اب جا کر 1960ء کی دہائی میں منظر عام پر آیا تھا مگر انسانی دماغ اس سے بھی پہلے ای میل کی طرح لاکھوں میل کی دوری سے پیغام ارسال اور وصول کر لیتا تھا۔ بالکل اسی طرح ذی شاہ نے ورزش کرتے ایک پیغام وصول کیا جیسے اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔

”جرمنی مجھے بلارہا ہے۔“ یہ اس کے ذہن میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



آنے والا پہلا خیال تھا۔ وہ اپنے سر کو جھٹک کر اس خیال سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔ جرمنی اسے بلا رہا تھا؟ جرمنی اسے کیوں بلا رہا تھا؟ مگر واپس جاتے ہوئے اس کا ذہن اس سوال کا جواب تلاش کرتا رہا اور گھر آنے کے بعد فوراً اسے قریب سر جھکائے بیٹھی اپنی چھوٹی بہن کو دیکھ کر جیسے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

”تو جرمنی مجھے اسی لیے بلا رہا ہے تاکہ میں اپنی معصوم بہن کے مجرم کا گریبان پکڑ سکوں۔“ یہ آخری خیال تھا جو روزمرہ معمول، روٹین اور کاروباری میٹنگز سے ہٹ کر تھا۔ پھر وہ دفتر چلا گیا اور دفتر جانے کے کچھ دیر بعد پھر اس کے ذہن کا کنکشن مالا کی موجودہ... رنگ ویران زندگی کی طرف جڑ گیا تھا۔ جیسے پھر سے اس کے ذہن نے کوئی پیغام وصول کیا۔

”جرمنی تمہیں بلا رہا ہے۔“ اس کا دل بے چین ہو گیا پھر اس کا کسی بھی میٹنگ میں دل نہیں لگا تھا۔ وہ فیصلے کی اکھاڑ پچھاڑ میں لگ گیا۔ بہت دن کی سوچ بچار کے بعد آخر فیصلہ ہو گیا۔ اس نے جرمنی جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مالا کی بے رنگ زندگی، گھریلو... حالات کو دیکھتے ہوئے اسے یہی مناسب لگا تھا اگرچہ ذیشان ٹھیک کہتا تھا۔ مالا کے مجرم تک پہنچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ مالا کو طلاق دے چکا تھا مگر ذیشان کا یہ حق بننا تھا کہ وہ طلاق کی وجہ تو معلوم کرے۔ محض صبر شکر کر کے بیٹھ جانا بھی عقلمندی نہیں تھی مگر ذیشان نے ایسے ہی تو کیا تھا۔ وہ اپنے فرائض سے نظر چرا کر نئی نویلی بیوی کی ناز برداریوں میں لگ گیا تھا۔ نہ بہن کی اذیت اور صدمات کی اسے کوئی پروا تھی نہ بیوہ ماں کی خاموشی اسے نظر آتی تھی۔ اب جو بھی کرتا تھا ذیشان کو خود ہی کرنا تھا اور اس کے لیے سب سے پہلے جرمنی کا ویزا ضروری تھا۔ چچا کے علاوہ کوئی اور رشتے دار جرمنی میں نہیں تھا اور چاچو لے چارے وفات پا گئے تھے۔ اسے اسپانسر ویزا نہیں مل سکتا تھا۔ اگر اس کا اکلوتا پیارا دوست افرایم کوشش بھی کرتا تب بھی یہ ممکن نہیں تھا۔ افرایم کے وسائل اتنے نہیں تھے جو وہ اسپانسر ویزا کی شرائط پوری کر سکتا۔

جرمنی میں مقیم رشتے داروں یا دوستوں سے ملنے کے لیے جانے والے کو بہت سی چیزوں پر توجہ کرنا ہوتی تھی۔ ایک تو جرمنی میں مقیم اس کا میزبان قانونی حیثیت سے وہاں کاروبار یا ملازمت کر رہا ہو اور وہ کسی بینک یا مالیاتی ادارے کا مقروض بھی نہ ہو۔ اس کی مالی حیثیت بھی بہتر ہوتی اگرچہ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے وہ افرایم کو کبھی نہ تنگ کرتا اور نہ اس پر بوجھ ڈالتا پھر بھی بہت ساری باتوں کو نظر میں رکھنا تھا۔

جرمنی کی کمپنی کے ساتھ کاروباری خط کتابت اور کاروباری سرگرمیوں کا ثبوت، ذاتی اخراجات کے لیے تیس ہزار امریکی ڈالر نقدی کی صورت میں جب منظر عام پر آئے اور قضائی ٹکٹوں کی کنفرمنشن کا بڑے بھائی ذیشان کو بتا چلا تو اس نے ایک طوفان بدتمیزی اٹھادیا۔

”تم اتنا خرچہ کر کے جرمنی جا رہے ہو، شیئرز کی رقم الگ ادا کرو گے؟ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔“

ذیشان کو جیسے آگ لگ چکی تھی۔ نہ اس نے ماں کا خیال کیا نہ بہنوں کا۔ ذیشان کے ساتھ منہ ماری کرتے ہوئے بس ہاتھ پائی کی کسر رہ گئی تھی۔ گھر کا ماحول بگڑ گیا۔ حالات خراب ہو گئے۔ ایک تو آنیہ سے رشتے پر انکار، دوسرے ذیشان نے مشترکہ اکاؤنٹ سے ذاتی اخراجات کے لیے بھاری رقم نکلوائی تھی۔ بھلا ذیشان کا پارہ کیوں نہ چڑھتا۔ اسے تو آگ لگنا ہی تھی کیونکہ شعلوں کو ہوا دینے کے لیے عینی جو موجود تھی۔ اس نے بیانگ دہل اعلان کر دیا۔ وہ اوپر والے پورشن میں الگ ہو جائے گی۔ اپنا چکن بھی الگ کر لے گی۔ ایسی دھمکیاں ان کے لیے نئی نہیں تھیں مگر پھر بھی می... بے چاری سہم گئی تھیں۔ یہ تینوں بھائی ان کی زندگی میں ہی الگ ہو جاتے یہ می کو گوارا نہیں تھا۔ وہ ذیشان کی ایک مرتبہ پھر نہیں کرنے لگی تھیں۔

”بیٹا تم ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔“ انہوں نے رات کو ذیشان کے گھر آتے ہی بڑی لجاجت سے کہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں معمولی باتوں پر لڑائی جھگڑا بڑھنے لگے۔ وہ ابھی اتنی جرمنی کی کمیسی کے ایک

تو تفصیلات اور ویزا افسر کے ساتھ فون پر سرکھپا کر آ رہا تھا جانی الحال کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر مقابل تو ماں تھی اسے جواب دینا ہی پڑا۔

”کیا سوچ لوں می، میں جرمنی جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“ اس نے نرم مگر مضبوط لہجے میں کہا تھا جب می کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئیں۔

”میں جرمنی جانے کی بات نہیں کر رہی ہوں۔“ وہ سر جھکائے کچھ بل کے لیے خاموش ہو گئی تھیں جیسے اگلے الفاظ ترتیب دینا چاہتی تھیں۔

”تو پھر؟“ ذیشان سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھتا ٹھنک گیا تھا۔ ”او..... اچھا۔“ وہ جیسے سمجھ کر لب بھینچ گیا تب می نے بہت بے قراری اور لجاجت سے کہا تھا۔

”اس میں حرج کیا ہے۔ گھر کی بات گھر میں رہ جائے گی۔“ وہ ایک ماں تھیں گھر میں پھوٹ پڑتی نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ اپنے بیٹوں کو جوڑے رکھنا چاہتی تھیں اگر ذیشان شاہ مان جاتا تو سارے مسئلے ہی حل ہو جاتے۔

”پلیز می، میں نے کبھی آنیہ کے لیے ایسا ویسا کچھ نہیں سوچا۔“ ذیشان جھنجھلا گیا تھا۔ اگر ماں کی طرف سے زیادہ دباؤ بڑھ جاتا تب اسے یقیناً ماننا پڑتا اور وہ اس سے پہلے کوئی بندھ باندھنا چاہتا تھا۔

”تو اب سوچ لو، وہ عینی سے مختلف ہے۔“ انہوں نے جیسے اسے بہلانا چاہا تھا۔ اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

”مما وہ عینی کی بہن ہے، اس سے مختلف ہرگز نہیں ہوگی۔“ ذیشان کا ایک ہی جواب تھا۔ ماں جیسے بے بس ہو گئی۔

”ذیشان کی خواہش ہے بیٹا ورنہ وہ الگ ہو جائے گا۔“ انہوں نے متشکر لہجے میں کہا۔ ذیشان کی دھمکی نے انہیں بہت اپ سیٹ کر رکھا تھا۔ ذیشان کو ذیشان پر بے طرح غصہ آ گیا۔

”وہ اپنی شادی بھی اپنی مرضی سے کرتا ہے اور ہماری شادیاں بھی اپنی مرضی سے کرے گا؟ اسے یہ اختیار کس نے دیا؟ وہ ڈیڈی کی جگہ اگر بڑے بھائیوں

والا کردار ادا کرتا تو شاید آج میں اسے کبھی انکار نہیں کرتا۔ خامی آنیہ میں نہیں، یہی سمجھیں میں اس کے قابل نہیں۔ میں کسی کورنگٹ نہیں کر رہا بس اپنی بہنوں سے پہلے گھر بسانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ کی خاطر یہ زہر پیتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔ اگر مالا اور بندیا کی شادی ہو جانے تک ماموں لوگ انتظار کر سکتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میری طرف سے جواب ہے۔“ اس نے نکل سے بات کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا می پھر سے بے بس ہو گئیں۔

”اتنا انتظار تو وہ نہیں کر سکتے۔“ می نے ٹھکر بھرے لہجے میں کہا۔

”تو نہ کریں۔“ وہ رکھائی سے بولا۔

”تم منگنی تو کر لو۔“ می جیسے کچھ سوچ کر بولیں۔

”شادی کے وقت منگنی بھی کر لوں گا۔“ اس کا جواب نہ ہی میں تھا۔

”اور شادی کب کرو گے؟“ وہ جیسے پوروں پر حساب کتاب کرنے لگی تھیں۔

”مالا اور بندیا کو بیاہ کر۔“ ذیشان نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کا فیصلہ اٹل تھا، ارادہ پختہ تھا۔ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا تھا۔ می جیسے تھم سی گئیں۔

”بندیا کی تو ٹھیک ہے پر مالا کی شادی؟“ انہوں نے جیسے کوئی انہونی بات سن لی تھی کبھی کبھ حیران رہ گئیں۔

”کیا مطلب..... مالا کی شادی نہیں ہو سکتی؟“ وہ بھوس اچکا کر پوچھ رہا تھا۔ اسے ماں سے ایسی حیرانی کی توقع نہیں تھی۔

”اس کی شادی تو ہو چکی ہے؟ پھر مطلقہ سے کون کرے گا؟“ وہ بھگی آواز میں بول رہی تھیں۔ ان کے کرب کا کوئی شمار نہیں تھا۔ وہ تو بیٹے کے منہ سے مالا کا دوبارہ گھر بسنے کا کوئی پلان یا بات سن کر ہی تھیر رہ گئی تھیں۔ یہ تو ان کے دل کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

مالا کا دوبارہ گھر بس جانا تو وہ بھی چین سے مر سکتیں۔

”کوئی تو کر لے گا، ہم نے کون سا اس کے متعلق کچھ سوچا ہے۔“ اگر سوچ لیتے تو آج وہ ماضی کی یاد میں



حال سے اتنی غافل نہ ہوتی۔“ ذی شاہ کا لہجہ بلا کا تلخ تھا، مہی کی آنکھیں بہنے لگیں۔

”تمہارا باپ ہوتا تو آج تک بہت کچھ ہو چکا ہوتا۔ بڑا بیٹا نا اہل ثابت ہوا تو تم چھوٹوں کو کیا کہوں؟“ انہوں نے آنکھیں پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”یہی تو آپ کی غلطی تھی۔ نہ آپ نے ذیشان کو احساس دلایا اور نہ مجھے کچھ بتایا۔ مہی کچھ ہم جیسے کم فہم بیٹے بھی ہوتے ہیں جو بہنوں کی خاموش آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کو خود سے نہیں دیکھ پاتے۔ ہم جیسوں کو احساس دلانا پڑتا ہے۔“ ذی شاہ کا لہجہ ٹوٹ سا گیا۔ مالا کا کرب آمیز چہرہ آنکھوں کی پتلیوں میں عکس بنانے لگا تھا۔ اس نے ضبط کی شدت سے ہونٹ کاٹ لیے تھے۔

”میرا بیٹا تو اللہ تم کو اس نیکی کا اجر دے۔ تمہاری راہ کی ہر رکاوٹ دور کرے۔ تمہارے لیے آسانیاں ہوں۔“ مہی نے دل سے دعا دیتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ بس اس کی کامیابی کے لیے اس دعا جتنا زادراہ ہی کافی تھا۔ وہ جیسے ماں کے ٹھنڈے بوسے کو محسوس کر کے مطمئن ہو گیا تھا پھر اسے ذیشان کی طرف سے ہر دم کی بھی امرت کے مانند لگی تھی حالانکہ اس نے بزنس بھی الگ کرنے کی بات کر کے اپنے گھنٹیا پن پر مہر لگا دی تھی وہ گھر بھی چھوڑنا چاہتا تھا۔ اپنے تئیں وہ ذی شاہ کو فنا نشلی ڈاؤن کرنا چاہتا تھا۔

”میں گھر میں سے بھی حصہ لوں گا اور بزنس بھی الگ کروں گا۔ شامی تو ابھی پڑھ رہا ہے تم اپنے حصے کا کام کسی اور کے حوالے کر جاؤ۔ اپنا کوئی بھی نائب چھوڑ جاؤ میں ہرگز بھی تمہارے آفس کا انتظام نہیں سنبھالوں گا۔“ ذیشان آخری حربے کے طور پر یہی کہہ سکتا تھا جو کچھ وہ بول چکا تھا۔ اس کے علاوہ اب اس کے پاس کوئی اور دھمکی نہیں بچی تھی۔ تب ذی شاہ نے بڑے تحمل کے ساتھ اس کے تمام طبق روشن کر دیے تھے۔

”گھر میں تم ضرور حصہ لو مگر پانچ حصے نکال کر چھٹا حصہ تمہارا بنتا ہے۔ اس کے علاوہ کاروبار میں بھی

ہم سب برابر کے حصے دار ہیں۔ بہنوں کے حصے اور ماں کا حق نکال کر ہم تینوں کا جو کچھ بنے گا اسے برابر تقسیم کر لینا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس اتنا سوچ لینا ہماری فرم کی ساکھ تباہ ہو جائے گی۔“ ذی شاہ کا اطمینان قابل دید تھا۔ وہ اپنی بات دہرایا نہیں کرتا تھا۔ سو آرام سے اٹھ کر چلا گیا پیچھے ذیشان اور مہنی تمللاتے رہ گئے تھے۔ اس رات ذیشان نے مہی سے خاصی بدتمیزی کی تھی۔ انہیں بہت پریشان کیا تھا اور ساتھ ڈیڑی کے فیصلے کو غلط قرار دیا تھا۔

”ڈیڑی نے مالا کے لیے غلط انتخاب کیا تھا۔ انہیں کیا ضرورت تھی بیٹی کو پکڑ کر جرمنی لے جانے کی۔ پھر چاچو کے بیٹے سے نکاح کر دیا۔ مڑ کر خبر بھی نہ لے سکے۔ اس کی ایک بھی تصویر نہیں ہمارے پاس۔“ ذیشان بہت دفعہ پہلے کی دہرائی جانے والی باتوں کو دوبارہ جتا کر اپنی کھون نکال رہا تھا۔ یعنی برابر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

”تو اور کیا سو فیصد غلط فیصلہ، پکڑ کر لڑکی کو داغ لگا دیا۔ پچھا خیر سے مر گئے اب بندہ کس کا گریبان پکڑے؟ نہ کوئی آگے نہ پیچھے خود محترم مفروضہ ہو گئے جانے خبیث آدمی زندہ بھی ہے یا مر گیا۔“ یعنی کی زبان کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ اس کے سفاک لفظوں کی شدت کو محسوس کر کے کونے میں بیٹی مالا تڑپ اٹھی تھی۔

”اللہ نہ کرے۔“ اس نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔ بندیا نے اس کی حرکت ملاحظہ کر کے گھور کر دیکھا تھا۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کی تھی کہ مالا اس قسم کی دعاؤں کے حقوق کھوپکی ہے اور وہ اس بد بخت کے لیے اللہ سے رحم طلب نہ کرے۔

”مہی مجھے نہیں لگتا ذی شاہ کے گا اور جانے یہ واپس کب آئے۔ مجھے تو اس کی بہت فکر ہے۔“ ذیشان نے مہی کو خاموش دیکھ کر پینتیر ابدل لیا تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا ہر بحث فضول اور لا حاصل ہے تاہم اس کے دل میں گرہ ضرور پڑ گئی تھی۔

”ذی شاہ کی نہیں، آنیہ کی فکر ہے۔“ بندیا بھی

کہاں چپ رہ سکتی تھی۔ اس کے الفاظ نے یعنی کو آگ لگا دی تھی۔ وہ اتنی غضب ناک ہوئی کہ حد نہیں، گورے بے داغ گال خون چھلکانے لگے، چیکھی ناک سکر گئی، ماتھے پر پل پڑ گئے۔

”آنیہ کو رشتوں کی کوئی کمی نہیں۔ تم لوگ نہ جانے کس زعم میں مبتلا ہو۔“ وہ حلق پھاڑ کر چلائی تھی تب مالا اور مہی دونوں سہم گئی تھیں جبکہ بندیا دو بدو مقابلے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اسے کون سا لحاظ تھا کسی کا۔ جب یہ لوگ ڈھیٹ اور بے شرم تھے تو وہ بھی ڈھیٹ اور بڈر ہو گئی تھی۔

”ہم لوگ کسی زعم میں نہیں، بس لوگ ہی میرے بھائیوں کے پیچھے پڑے ہیں۔ اللہ ہی انہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے۔“ بندیا بھی منہ پھاڑ کر بولی تھی۔ اسے کون سا کسی کی پروا ہوتی تھی۔ اب محاذ دونوں طرف گرم ہو چکا تھا۔ ذیشان کو ہی سیز فائر کروانا پڑا۔ بیوی بر تو زور نہیں چلتا تھا بہن پر سارا نزلہ گرا ڈالا۔

انگلی صبح معمول کے مطابق دونوں بھائی آفس چلے گئے تھے پھر ایک ہفتہ پُرا سن نکل گیا۔ یعنی کی انا خاصی برہم تھی۔ ناک کٹ رہی تھی سو وہ اپنی بات سے بٹنے والی نہیں تھی۔ اس نے گھر چھوڑنے پر بالآخر ذیشان کو راضی کر ہی لیا تھا حالانکہ کم از کم وہ گھر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یعنی کو در پردہ سمجھاتا بھی رہا تھا مگر اس پر ایک ہی دھن سوار تھی۔ اوپر والے پورشن کے بجائے الگ گھر کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ بالآخر جیت یعنی کی ہوئی۔ ذیشان کو ماننا ہی پڑا۔ اس کے بغیر اور کوئی راستہ جو نہیں تھا۔

☆☆☆

ذیشان کے گھر چھوڑنے نے مہی کو بیمار کر دیا تھا وہ اسپتال کیا گئیں مردہ ہوئی مالا کے اندر زندگی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ مہی کی بیماری نے اسے اتنا حساس کر دیا تھا کہ وہ دن رات مہی کی پٹی سے لگی رہتی تھی۔ اسے ڈیڑی کے بعد مہی کی جدائی کے دھڑکے نے متوحش کر دیا تھا۔ وہ دن رات ان کی خدمت کرتی طویل تر سجدے، لمبی دعاؤں میں اپنی مہی کی صحت اور

### تم میں سے ہو

آج لکھوں کیا سارے لفظ ہیں خفا مجھ سے  
دل پہ اک بوجھ اب بھی باقی ہے  
نیند سے عاری آنکھیں  
اک سنے کی تلاش میں ہاری ہیں  
اس کے ہونٹوں سے کچھ سننے کی حسرت  
اب بھی دل میں باقی ہے  
زندگی جینے کو اک بات ہی کافی ہے  
وہ اک بار جو بس یہ کہہ دے ایشل  
تم میرے ہو

شاعرہ: ایشل شادیاں آرائیں، گولار چچی

زندگی مانتی۔ یہ بندیا اور مالا کی دعائیں ہی تھیں جو مہی اس جھٹکے سے سنبھل کر گھر آ گئیں۔ ذی شاہ اور شامی نے گویا سکھ کی سانس لی۔ پھر انہی دنوں ذی شاہ کا ویزا لگ گیا تھا۔ سیٹ بھی کنفرم ہو گئی تھی۔ روانگی سے کچھ دیر پہلے متذبذب سی مالا اس کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ ہی نہ سکی حالانکہ ذی شاہ نے بہت دفعہ اس سے علی عیسیٰ کے گھر کا ایڈریس مانگا تھا مگر مالا کو ایڈریس کی کچھ سمجھ نہیں تھی۔ ٹوٹی پھوٹی سی لوکیشن اس نے سمجھا دی تھی۔ جو ذی شاہ کو اتنی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ مالا کو ڈھیروں تسلیاں دینا چاہتا تھا مگر وہ بولا تو صرف اتنا۔

”میں تیری ساری کھوئی ہوئی خوشیاں واپس لاؤں گا مالا۔ یہ تیرے بھائی کا تجھ سے وعدہ ہے۔“ ذی شاہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ گھٹی، گھٹی آواز میں رونے لگی تھی جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی کون سی خوشیاں، کبھی خوشیاں؟

”وہ خوشیاں جو تجھ سے چھین گئیں۔“ ذی شاہ



نے بھرائی آواز میں کہا تو مالا کا جھکنا سننا اٹھ سکا۔  
 ”تیرے ایک، ایک دکھ کا حساب لوں گا۔“ وہ  
 گویا خود کو یقین دلا رہا تھا۔ خود سے عہد باندھ رہا تھا۔

☆☆☆

اور آج کی رات ذی شاہ کے دل پر بہت بھاری  
 تھی۔ وہ علی عیسیٰ کے من ہائیم میں تھا۔ یہ علی عیسیٰ کا  
 شہر تھا جس کی خوشبو میں محبت کی باس اب بھی رہتی تھی۔  
 یہاں کی فضا میں مالا کے آنسوؤں کی مہک پھیلی تھی۔  
 یہاں سے اس کی بہن کو دھکا کر نکال دیا گیا تھا۔ اس  
 کے سارے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ سارے ٹانگے ادھڑ  
 گئے تھے۔ مالا کی بربادی اسے زلزلہ ہی تھی اور آج وہ  
 اپنے سارے خاندان سے چھپ کر دوست کے گھر میں  
 تنہا کمرے اور خاموش ماحول کو پا کر پھوٹ پھوٹ کر رو  
 رہا تھا۔ یہ آنسو وہ آخری مرتبہ بہا رہا تھا۔ اب رونے  
 کی باری علی عیسیٰ کی تھی۔ مالا تو بہت خوار ہو چکی۔ اب  
 ذلیل ہونے کی باری علی عیسیٰ کی تھی۔

وہ اپنا اگلا لمحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ عیسیٰ تک پہنچنے  
 کا، اس کے گریبان کو پکڑنے کا اور سب سے بڑی بات  
 اسے جو کچھ بھی کرنا تھا۔ افرایم اور اس کی فیملی کو ملوث  
 کیے بغیر کرنا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے ان مخلص لوگوں کو کسی  
 بھی مصیبت میں نہیں پھنسا دیکھ سکتا تھا اور اس کے لیے  
 ضروری تھا کہ وہ افرایم کو اپنے جرمی آنے کا مقصد  
 ہرگز نہ بتاتا۔ افرایم کو صرف یہی پتا تھا کہ وہ جرمی  
 برائے کی غرض سے آیا ہے وہ کسی علی عیسیٰ کو نہیں جانتا اور  
 نہ کسی کی تلاش میں آیا تھا۔ یہ افرایم کے تحفظ کا اہم جز  
 اور بے حد ضروری تھا۔ بس انہی سوچوں میں گم وہ سفید  
 بے داغ بے سلوٹ بستر پر ایسا گرا کہ صبح کا اجالا پھلنے پر  
 ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اتنی بے خبری کی نیند تو کبھی نہیں  
 سوچا تھا بھی حیران سا آنکھیں مستلا اٹھ گیا۔ معاً اس کی نگاہ  
 داخلی دروازے تک گئی تھی۔ جہاں چکنے سے کارڈ پر ابھی  
 تک ”ویلکو مین ان من ہائیم“ لکھا تھا۔ ذی شاہ کے  
 ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آگئی تھی۔ تو گویا اسے من ہائیم میں  
 خوش آمدید کیا گیا تھا۔ ویلکم کا یہ انداز اسے پسند آیا تھا۔

وہ کمرے کی آخری کمر میں موجود باد لے سیر تک گیا  
 تھا۔ رات کو موتر نے (افرایم کی ماں) نے غسل خانے کی  
 نشاندہی کر دی تھی۔ وہ اپنے صاف ستھرے کپڑے نکال کر  
 نہانے کی غرض سے آیا تھا اور چمکتے دیکتے ہاتھ روم کو دیکھ کر  
 لمحے بھر کے لیے متحیر رہ گیا۔ یہ غسل خانہ تھا اتنا شفاف،  
 معطر اور چمکیلا جیسے کوئی شیشے کا گھاسا گھاسا۔ اجلا چمکدار  
 نہانے کا ٹب اور انیمیل، شیشوں کی جگمگاہٹ کے ساتھ  
 کالج کا خوب صورت فرش آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ اتنے  
 اجلے، خوشبودار ہاتھ کو دیکھ کر ذی شاہ کو اپنا آپ اور بھی گندا  
 سندا اور میلا، میلا سا لگ رہا تھا۔

وہ نہا کر باہر آیا تب تک افرایم بھی کمرے میں آچکا  
 تھا۔ اسے فریش، فریش اور تروتازہ دیکھ کر مسکراتے  
 ہوئے بولا۔

”سلام صبح! تم اٹھ گئے، میں تیسری دفعہ دیکھنے آیا  
 ہوں تمہیں۔“ مٹی نے پریڈ کروا رکھی ہے۔ رات کو ڈزریکے  
 بغیر جو سو گئے تھے۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولنے کا عادی  
 تو نہیں تھا مگر فی الحال اس کی اسپینڈ دیکھنے سے تعلق رکھتی  
 تھی۔ وہ اسے بال بنانے کی مہلت دے کر جلدی نیچے  
 آنے کا کہتا خود باہر نکل گیا تھا تب ذی شاہ نے اپنے سمسو  
 ٹائٹ کیس سے پرفیوم کی بوتل نکال کر خوشبو میں خود کو بھگوایا  
 اور پھر سامان سمیٹ کر کمرے کی گلاس ونڈو میں آکھڑا  
 ہوا۔ دراصل وہ باہر کا موسم دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے  
 ٹائیلوں کی جالی والا مین سا پردہ انگلیوں کی چنگلی میں پکڑ کر  
 پیچھے ہٹایا اور دوسرے سلک کے کے پھولدار رنگی پردے  
 کو سمیٹ دیا۔ اب وہ سلائیڈ ہٹا کر باہر جرمی کے کمرے  
 تروتازہ حسن کو دیکھ رہا تھا ایک دم سحر زدہ اور دم بخود، اس  
 نے دل میں عہد کر رکھا تھا وہ جرمی کے سحر میں نہیں پھنسے گا  
 مگر اس کا یہ عہد جرمی کی اس اجلی، حسین، جھلی سوری میں  
 بھر بھری ریت کی دیوار ثابت ہو گیا۔ وہ جرمی کے سحر میں  
 گرفتار ہو گیا تھا۔

وہ یہ نہیں کہہ سکا تھا کہ دی ویدرا زگدوہ کچھ بھی نہیں  
 کہہ سکا تھا۔ اس کے ہونٹ منجمد تھے اور نگاہیں ساکت۔  
 دور ہوتے کوہستان آپس، آسمان میں تیرتی مرغابیاں

رقص کرتی سنہری پریاں، ڈار سے چھڑی اس کونج کے آس  
 پاس مجر قصاں تھیں۔ ہاں سارے جرمی کا حسن سمٹ کر  
 ایک نکتے کی شکل میں دائرہ بنا گیا تھا۔  
 اسے یقین آ گیا تھا پورے جرمی میں ایسا جھلی آسٹم  
 اسے ڈھونڈنے سے بھی دکھائی نہ دیتا۔ تلاش کرنے سے  
 بھی نہ ملتا۔

وہ ایک سفید راج ہنس کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔  
 پھولوں سے لدی ٹوکری آج بھی اس کے قریب رکھی تھی۔  
 ذی شاہ کو اس کے ہونٹ ملتے نظر آ رہے تھے۔ وہ راج  
 ہنس جیسی سفید لڑکی راج ہنس کے ساتھ بائیں کر رہی تھی۔  
 یقیناً وہ راج ہنس سے ہی ہم کلام تھی مگر اس کے بہتے رواں  
 آنسو جیسے کسی ٹوٹی کا ہینڈل لوز ہونے کی وجہ سے مسلسل  
 پانی ٹپک رہا ہو۔ وہ آنکھیں نہیں یا کوئی چھوٹی سی ندی، گہرا  
 سا سمندر یا پہاڑ سے پھوٹنے والا چشمہ؟ جو خشک ہونا تو  
 جانتا ہی نہیں تھا۔

ذی شاہ نے بس اپنی بہن مالا کو روتے ہوئے دیکھا  
 تھا مگر اس انداز میں مالا بھی کبھی نہیں روئی تھی عموماً جب وہ  
 روتی تھی تب کوئی نہ کوئی اسے فوراً چپ کر دیتا۔ شروع،  
 شروع میں اسے دورے پڑتے تھے تب وہ چپٹی چلائی تھی  
 مگر اس انداز میں مالا کے آنسو بہتے اس نے بھی نہیں  
 دیکھے تھے۔

ذی شاہ کو کچھ الجھن کے ساتھ عجیب سی بے چینی  
 ہونے لگی تھی تو گویا یہ طے تھا کہ کسی بھی عورت کے آنسو  
 اس سے دیکھے نہیں جاتے تھے۔ وہ ماں کے آنسو ہوتے یا  
 بہن کے یا پھر کسی اجنبی جھلی آسٹم کے۔ وہ ہرگز بھی عورت  
 کی برستی آنکھیں دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ مالا کے  
 آنسو تھے جو اسے کھینچ کر جرمی لے آئے تھے ورنہ اس کے  
 تو خواب و خیال میں بھی جرمی آنے کا کوئی پلان نہیں تھا  
 اور اب راج ہنس سے باتیں کرتی اس اجنبی لڑکی کے آنسو  
 اسے بے قرار کر رہے تھے اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ  
 دوسری منزل سے نیچے چھلانگ لگا دیتا اور وہ اپنے ارادے  
 کو عملی جامہ بھی ضرور پہنا دیتا اگر وہ لڑکی راج ہنس کو  
 بازوؤں میں دبوچے اٹھ کر اندر کہیں گم نہ ہو جاتی۔

پل بھر کے لیے ذی شاہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسے  
 جیسے امید ہی نہیں تھی وہ جھلی آسٹم اس کی نگاہ سے اوچھل  
 ہو جائے گی۔ اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ دل  
 کیوں ایک دم بچھ گیا تھا اور من ہائیم کا حسن جیسے ماند پڑ گیا  
 تھا۔ اب نہ کوہستان آپس کی حسین چوٹیاں نگاہ کھینچ رہی  
 تھیں نہ بادلوں سے ڈھلکے آسمان پر تیرتی کونجیں متوجہ  
 کر رہی تھیں۔ وہ دل کھینچ لینے والی ڈار سے چھڑی کونج جو  
 کہیں نہیں تھی ذی شاہ کو لگا وہ سارے آس پاس کے منظر کا  
 حسن سمیٹ ساٹ کر اندر کھس گئی تھی۔ اب باہر نہ تو پھولوں  
 کے مکٹ اسے اپنے طرف بلا رہے تھے نہ دور جاگنگ  
 ٹریک کے آس پاس کھری ہریالی اسے پکار رہی تھی۔ ہر  
 منظر اپنا سحر کھو چکا تھا، ہر خوب صورتی اپنی ترنگ بھول گئی  
 تھی۔ کہیں بھی کچھ نہیں تھا حالانکہ سب کچھ وہیں تھا۔ یہ تو  
 ذی شاہ کے اپنے احساسات تھے جو سارے عہد بھلائے  
 اسے چاروں شانے چت کر رہے تھے گویا اسے جتا رہے  
 تھے تم تو پہلی نگاہ میں ہی دل پر ایسا کر گئے۔ ادھر ذی شاہ  
 ونڈو کی سلائیڈ کھینچ کر سر جھٹک رہا تھا جیسے خود کو کسی ان  
 دیکھے سحر سے آزاد کر رہا تھا مگر یہ ممکن تھا؟ کیا یہ ممکن تھا؟

یہ دل اور نظر کے سلسلے تھے۔ ذات پات، رنگ، نسل،  
 قومیت سے بے نیاز تو پھر ذی شاہ خود کو کیسے جھوٹے  
 بہلاوے دے پاتا؟ وہ خود کو کیسے بے نیاز کر لیتا؟ وہ خود کو  
 کیسے جھٹلا پاتا۔ دل تو اسی ڈار سے چھڑی کونج کی طرف کھینچ رہا  
 تھا۔ کھینچا جا رہا تھا۔ یہیں کہیں دل میں بیٹھا بیٹھا درد جگانی  
 اک تھی سی خواہش انگڑائیاں لے کر جاگ رہی تھی۔  
 ”کاش کے وہ ایک مرتبہ پھر نظر آجائے۔“

وہ اندازے سے چلتا ہوا بالکل ٹھیک جگہ یعنی طعام  
 کے کمرے میں بغیر اس گھر کی غلام گردشوں میں کھوئے کھینچ  
 چکا تھا۔ بلیک سوٹ میں انتہائی تروتازہ، صاف ستھرا اور بلا  
 کافریش..... موتر کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر ستائش اتر  
 آئی تھی جبکہ افرایم کی نٹ کھٹ سی چھوٹی بہن نے گلا  
 کھنکھار کر جانے ڈونج میں کیا کہا تھا۔ اسے تو بس ”فریوچ  
 لیٹک“ کی آواز آئی تھی۔ اب اس کا مطلب کیا تھا؟ یہ ذی  
 شاہ ہرگز نہیں سمجھ پایا تھا۔ اگرچہ ڈونج کی اسے شدہ بدھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



تو تھی ہی بہر حال اسے یہ جرمن زبان خاصی مشکل لگا کرتی تھی۔ اس سے بہتر تو ذی شاہ کی پنجابی تھی جس میں اپنائیت اور مٹھاس محسوس کی جاسکتی تھی جبکہ ڈوئچ تو زبان کو تھکا ڈالنے والی نہایت روکھی اور اکھڑ قسم کی بولی تھی۔ سو ڈوئچ بول چال کے کتابچوں کو اس نے بنا پڑھے ہی سپرد ہوا کر دیا تھا کیونکہ وہ ڈوئچ نہیں بول سکتا تھا۔

”فریوچ لیگ۔“ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھا تو افرامیم کی بہن ایمل اس کے کان میں جیسے گھس گئی تھی۔ وہ تیرہ سالہ انتہائی خوب صورت بچی تھی اور بڑی پُرشوق نظروں سے ذی شاہ کو دیکھ رہی تھی۔ ذی شاہ اس کی بات پھر بھی سمجھ نہیں سکا تھا تب اس نے اشارے سے ایک سینری کا بتایا۔ ذی شاہ کو گردن گھمانا پڑی تھی پھر وہ سینری کو دیکھنے لگا تھا یہ پھولوں سے لدی کوئی راہ گزر تھی جس کے آس پاس اونچے پھولوں کے درخت تھے جو ہر طرح کے رنگ برنگے پھولوں سے لدے تھے۔ آغاز بہار کا تاثر دیتی یہ پینٹنگ بہت خوب صورت تھی پھر ایمل کے اشارے نے اسے کچھ کچھ سمجھا دیا تھا۔ وہ اسے شاید بتا رہی تھی کہ تم بہار کی طرح تروتازہ ہو۔ دوسرے معنوں میں ایمل نے اس کی تعریف کی تھی وہ اپنی تعریف پر کچھ جھینپ سا گیا۔ کچھ دیر بعد ماں سے نظر بچا کر ایمل پھر اس کے کان میں گھس گئی تھی۔

”رائسٹ۔“ اس نے مسکرا کر ایک گلدان کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ایک حرنی معنی خیر لفظ ذی شاہ کے سر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر ہونق ہو گیا تھا پھر اس نے گلدان پر غور کیا۔ سچا سنورا گلدان توجہ کے قابل تھا خصوصاً اس میں ٹھلٹے سفید تازہ گلاب اس نے نگاہ موڑ کر ایمل کو دیکھا۔ وہ اپنی ٹوٹی انگریزی میں اسے بتا رہی تھی ”تم بلا کے اٹریکٹو ہو۔“ ایمل کے تعریفی کلمات نے ذی شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ رائسٹ یعنی پُرشکشی یعنی کہ اٹریکٹو۔ وہ بے ساختہ ہنستا چلا گیا۔ اسے ایمل بہت دلچسپ لگی تھی۔ اس کی ایک لفظی باتیں بھی بہت دلچسپ تھیں۔ اب وہ جھک کر رازداری سے کچھ اور پوچھنا چاہتی مگر اس سے پہلے اس نے موٹر کے بکن میں چلے جانے کی سلی کر لی تھی۔

”یونگے سلے؟“ وہ بہت بے چینی، تجسس اور عجلت میں پوچھ رہی تھی۔ اسے خوف تھا کہ می ناشتے کی ٹرے اٹھا کر واپس نہ آجائیں حالانکہ ابھی ان کا بکن سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ وہ افرامیم کے دوست کی مدد کے لیے چیز کیک بنا رہی تھیں اور کیک بیک ہونے میں ابھی کچھ ٹائم باقی تھا۔

”یونگے سلے؟“ ایمل نے اسے چپ دکھ کر بے چینی کے عالم میں بازو ہلایا تھا پھر جیسے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر انگریزی اور ڈوئچ کے کچھ کے ساتھ بولی۔

”آر یو یونگے سلے؟“ ایمل نے انگریزی اور اطالوی کا کچھ جو بنایا تھا وہ ذی شاہ کے بلے پھر بھی نہیں پڑا تھا۔ اس نے لفظوں پر غور کیا تو اندازہ ہوا محترمہ کوئی سوال پوچھ رہی تھیں۔ اب یونگے سلے کا مطلب کیا تھا؟ ذی شاہ کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے۔ سو وہ بے بس سا ہو گیا تھا تب ایمل بھاگ کر کانس پر بچی ایک گڑیا کو اٹھالائی۔ وہ صرف ایک گڑیا نہیں تھی اس کا دو لہا دوست (کچھ بھی کہا جاسکتا ہے) ساتھ تھا۔ ایمل اب دوبارہ اپنا سوال دُہرا رہی تھی۔ ذی شاہ نے پھر سے لفظوں پر غور کیا۔

”آر یو یونگے سلے؟“ اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ کیا تم میڈ ہو یا گونگے ہو یا جرمن سے واقف ہو؟ یونگے سلے کا مفہوم کیا ہو سکتا تھا؟ شاید ان میں سے کوئی بھی نہیں وہ گڑیا اور گڈے کی طرف اشارہ کر رہی تھی پھر اس نے گڑیا کے ہاتھ کو پکڑ کر سامنے کیا تھا۔ باری کی انگلی میں انگلی تھی۔ اس نے کرسچن برائینڈل ڈریس پہن رکھا تھا۔ سفید لباس میں وہ اپنے دو لہا کے ساتھ کھڑی تھی۔ تو کیا ایمل اس سے یہ تو نہیں پوچھ رہی تھی۔

”آر یو یونگے سلے؟“ (کیا تم شادی شدہ ہو؟ یا پھر کیا تم کنوارے ہو؟) ذی شاہ کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا۔ ابھی وہ اپنے اندازے کی درستگی پر ٹھیک سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا جب ایمل نے سوچ سوچ کر اپنے ذہن کے کسی کونے سے یونگے سلے کا انگریزی ترجمہ ”آر یو پیچلر؟“ کے طور پر بالآخر نکال ہی لیا تھا۔

”آں..... ہاں..... نہ..... نہ.....“ ذی شاہ کا منہ

حیرت سے کھل گیا۔ وہ اس کے نہ کہنے پر بے ساختہ خوش ہو گئی تھی تو گویا وہ اردو سمجھ لیتی تھی مگر بول نہیں سکتی تھی اور اب بڑے جوش کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

”ریخ-ٹیک (ٹھیک، ٹھیک)“ اس کی خوشی کا کوئی شمار نہ تھا۔ اگلے چندرہ منٹ میں ذی شاہ کو ایمل کے خوش ہونے کی اصل وجہ سمجھ آ گئی تھی۔ ایمل کو میرڈ لوگ پسند نہیں تھے۔ پیچلر پسند تھے۔ اس کی بہن شادی شدہ ہو کر اسے چھوڑ چکی تھی۔ اب اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی سو ایمل کو بہن کی جدائی کا بہت دکھ تھا۔ اسے شادی بہت بری لگتی، جو بہنوں کو پرایا کر دیتی تھی اور بھائیوں کی مصروفیت بڑھا دیتی۔ بھائی بیویوں کے ہو جاتے اور بہنیں شوہر کی بھلا سب سے چھوٹے بہن بھائی کے حصے میں کیا آتا ہے۔ ڈانٹ، غصہ، می کی جھڑکیاں، تہائی، اکیلا پن سو ایمل کا شادی شدہ لوگوں پر غصہ کرنا بنتا تھا۔

اگلے چندرہ منٹ میں ایمل اس کی بچی سہیلی بن چکی تھی۔ می کے آنے تک ایمل نے ذی شاہ کی کلائی پر فرینڈ شپ بینڈ باندھ دیا تھا۔ اب وہ اس کی بہت اچھی دوست بن چکی تھی جس کی بات سمجھنے میں ذی شاہ کا اتنا ڈھیر سارا ٹائم دیٹ ہو جاتا تھا۔ آٹنی کے آنے تک اس نے ٹیبل پر برتن بھی نہیں رکھے تھے جس کی وجہ سے ان کا بارہ بڑ گیا تھا۔

”داس ازت آبر۔“ انہوں نے گھوڑ گھور کر ایمل کو دیکھا تھا اور ایمل گویا سر پر پیر رکھ کر بھاگی تھی۔ ماں کی ڈانٹ بس اسی کو سمجھ آ سکتی تھی جبکہ وہ محض مسکراتا ہی رہا تھا اگر جو ڈانٹ کے مفہوم جان جاتا تو ایمل کو ڈانٹ پڑنے پر کچھ افسردہ ہو کر نئی نئی دوستی کا حق ادا کر دیتا مگر وہ ”داس ازت آبر“ جو انگریزی کے that's a shame سے ملتے جلتے الفاظ کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ سو انجان پن سے میں بس مسکرایا تھا۔ اگلے تین چار گھنٹوں میں اس پر واضح ہو چکا تھا اس گھر میں ایمل کو سب سے خوب ڈانٹ پڑتی تھی۔ افرامیم سے لے کر می تک کیونکہ اس کی بچکانہ حرکتیں ناقابل برداشت تھیں۔

☆☆☆

وہ جس مقصد کے تحت جرمنی آیا تھا اسے بھولا ہرگز

نہیں تھا مگر ہر چیز کے کچھ ضابطے ہوتے ہیں، کچھ قاعدے اور اصول ہوتے ہیں سو اسے ایک قاعدے، ضابطے کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔ اسٹیپ بائے اسٹیپ قدم بڑھانے تھے۔ وہ عجلت اور جلد بازی میں علی صلی کو چوکنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سو ایک جامع لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔

اسے آئے یہاں اڑتیس گھنٹے تو ہو چکے تھے اور ان اڑتیس گھنٹوں میں بلا مبالغہ اس نے اپنے کمرے کی گلاس ونڈو سے کوئی ایک سو تانوںے مرتبہ ڈار سے چھڑی کونج کو دیکھا تھا۔ وہ اٹھارہ دفعہ تو دروازے کی بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھی نظر آئی تھی۔ اکتالیس دفعہ درمیانی سڑک پر چکر کاٹی دکھائی دی۔ کوئی تیس مرتبہ اس نے اپنا سر کھجایا تھا۔ کچھ دیر زوہ لے بالوں والا سر۔ چندرہ دفعہ اپنا جوتا اٹھا کر دیکھا شاید جوتے کے اسٹریپ تنگ کر رہے تھے۔ اس کی سوتی روک سڑک پر گھسٹی بیروں میں رتی جا رہی تھی مگر اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ ناک پونچھنے کے لیے ٹشو یا رومال کا تکلف کیے بغیر آرام سے آستین کو استعمال کر لیتی اور جب پینسویں مرتبہ اس نے ناک آستین سے صاف کی تو ذی شاہ کا جی اوب گیا تھا۔

”ہاؤ ڈسٹنگ، چھی چھی۔“ وہ زرب لب بڑبڑایا تھا مگر زگ ہیں پھر بھی موڑ نہ سکا۔ اسے بہتی ناک والے بچے بھی برے لگتے تھے یہ تو پھر اتنی بڑی لڑکی تھی جو ناک پونچھتے ہوئے بچوں کو بھی مات کر رہی تھی۔ یہ پورا دن ذی شاہ کا اسی مصروفیت میں گزرا تھا۔ ایمل اسکول چلی گئی تھی۔ آٹنی کے اپنے بہت سے کام تھے سو وہ کچھ دیر کے لیے شامی سے چیٹ کرتا رہا۔ بندیا سے بات کی اور اب سب سے حسین ترین مصروفیت میں کھو چکا تھا۔

”اور اب یہ اس کا یالیسواں پھیرا ہوا۔“ وہ خبیلی آہٹم کوڑکا ہوں میں سوئے پھر سے بڑبڑایا تھا۔ اس نے پوری سڑک کو جیسے اپنے بیروں تلے روندنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ اپنے پیر ہی تھا کار ہی تھی۔ بیروں کی طرف دھیان جاتے ہی ذی شاہ قدرے ٹھنک گیا تھا۔

”ایں..... یہ کیا اتنا خون..... مگر کہاں سے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں:-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایپوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

میرا مطلب ہے یہ خون..... میں تمہیں کب سے دیکھ رہا ہوں اس کھڑکی سے۔ وہ روانی سے بولتا ہوا سامنے گھر کی اوپر والی کھڑکی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسے لگا شاید وہ لڑکی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گی۔ یہ بات ماننے والی بھی نہیں تھی بھلا آج کے دور میں کون اتنا فارغ تھا جو کھڑکیوں سے لنگ کرتا نکا جھانگی کرے پھر جرنی جیسے تیز رفتار ملک میں۔ ذی شاہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اس لڑکی کو اپنے محسوسات کیسے بتائے؟ اپنے جذبات، اپنی خواہش، دل کی بدلتی کیفیت، یہ بیٹھا، بیٹھا ابھرتا درد آخر وہ لڑکی اس کی کس، کس بات پر یقین کرے گی؟ وہ پہلی بات میں ہی اسے یا گل قرار دے دے گی پھر یا تو وہ دو چار گالیوں سے نوازے گی یا ایک عدد جھانپڑ سید کر دے گی۔ اس کی بکواس کا انجام یہی ہوتا چاہیے تھا مگر یہ بکواس کہاں تھی؟ یہ تو اس کے دل میں ابھرنے والے خالص جذبے تھے۔

پہلی نظر کی محبت جو اسے پاکستان میں تو کسی سے نہیں ہو سکی تھی۔ آئیے تو چاہ کر بھی نہیں ہو پائی تھی اور ادھر بے چاہے دل بادشاہ فراڈ کھیل گیا تھا۔ وہ بے چارہ کرتا بھی کیا؟ بس فی الوقت تو اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ دل سے تسلیم کر لے کہ جرنی آنے کے بعد ان اڑتیس گھنٹوں کے دوران کوئی ایک سونائے مرتبہ وہ اسے احمقوں کی طرح دیکھ چکا ہے۔ کبھی چلتے، کبھی روتے، کبھی روتے، کبھی خود سے بائیں کرتے۔

”تم مجھے پچھلے اڑتیس گھنٹوں میں ایک سونائے مرتبہ دیکھ چکے ہو۔ ٹائیڈوں کا جالی دار مہین پر وہ ہٹا کر گردن باہر لٹکائے، میں جانتی ہوں، آگے بتاؤ۔“ گردن کو آپس کی چوٹیوں کی طرف موڑے اس نے دھڑ دھڑ ذی شاہ کے سر پر حیرتوں کا بینڈ بجا ڈالا تھا وہ لمحے بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا۔

اس رات اور کیا ہوا تھا، مون حسیب کا اگلا شکار کون بننے جا رہا تھا؟ یہ سب جاننے کے لیے اگلے ماہ تک کا انتظار کیجیے

آیا؟“ اس نے گردن پوری کھڑکی سے باہر نکال لی تھی۔ اب وہ بہت غور سے سامنے چلتی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ واک کر رہی تھی؟ واک اس طرح کرتے ہیں؟ پانگوں کی طرح سڑک کے چکر کاٹنا۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اس کی جوتی کہاں تھی؟ شاید اس نے اتار دی تھی اور اب ایزھیوں سے نکلتا خون۔ جانے اسے کوئی نوکیلا پتھر لگا تھا یا کوئی کاج مگر بھل بھل نکلتا انسانی خون دیکھنا اس کے لیے محال تھا۔ سڑک پر جگہ، جگہ خون کے دھبے بھر رہے تھے۔ کیا اسے ذرا بھی درد نہیں ہو رہا تھا اسے ذرا بھی تکلیف نہیں تھی وہ اتنی بے حس کیوں تھی، کیا اسے ایزھیوں سے نکلتا خون دکھائی یا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

ذی شاہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا پھر جیسے ایک دم وہ کوئی فیصلہ کرتا پلٹ گیا۔ اس نے اپنے سمسوناٹ کیس سے ننھا سافر سٹ ایڈ باکس نکالا پھر دھڑا دھڑا ایڑھیاں اترتا نیچے چلا آیا۔ آئی اسے پاس کہیں نہیں تھیں وہ قدرے مطمئن ہو کر باہر چلا آیا۔ وہ سامنے ہی آٹھ دس فرلانگ کے فاصلے پر اوچی سی سڑک کے کنارے پڑے پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ ذی شاہ تقریباً بھاگتا ہوا اس تک پہنچا تھا۔

”اے..... اے ہیلو۔“ وہ پھولی سانسوں سمیت خبطی آئیٹم کے قریب پہنچ گیا تھا پھر جیسے دوزانو دھڑام سے زمین پر گرا۔ اتنی تیز رفتاری سے بھاگتے ہوئے بے چارہ لگانا مشکل تھا مگر وہ کامیاب ہو ہی گیا تھا لیکن یہ کیا؟ وہ خبطی آئیٹم کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ہرگز بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ ہلکی ہو گئی تھی۔

”اے..... مانی نیم از ذی شاہ، ہاؤ ڈو یو ڈو؟ واٹ از یور نیم؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ لیے تھے مگر جواب نداد۔ وہ گم سم بیٹھی لڑکی اس پر ایک سادہ نگاہ ڈال کر اپنے رستے پیروں کو دیکھنے لگی تھی۔ ذی شاہ کو لگا وہ انگریزی نہیں سمجھتی۔ غلطی ہے وہ اپنی زبان میں ہی بات سمجھ سکتی ہوگی۔ وہ تھوڑا مایوس ہو گیا تھا۔ اب کیا کرے؟ کیسے مخاطب کرے؟ بات کس طرح سے ہو؟ وہ اردو، انگریزی سمجھنے والی نہیں تھی۔

”میں تمہارے زخم کو دیکھ کر آیا ہوں.....“

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

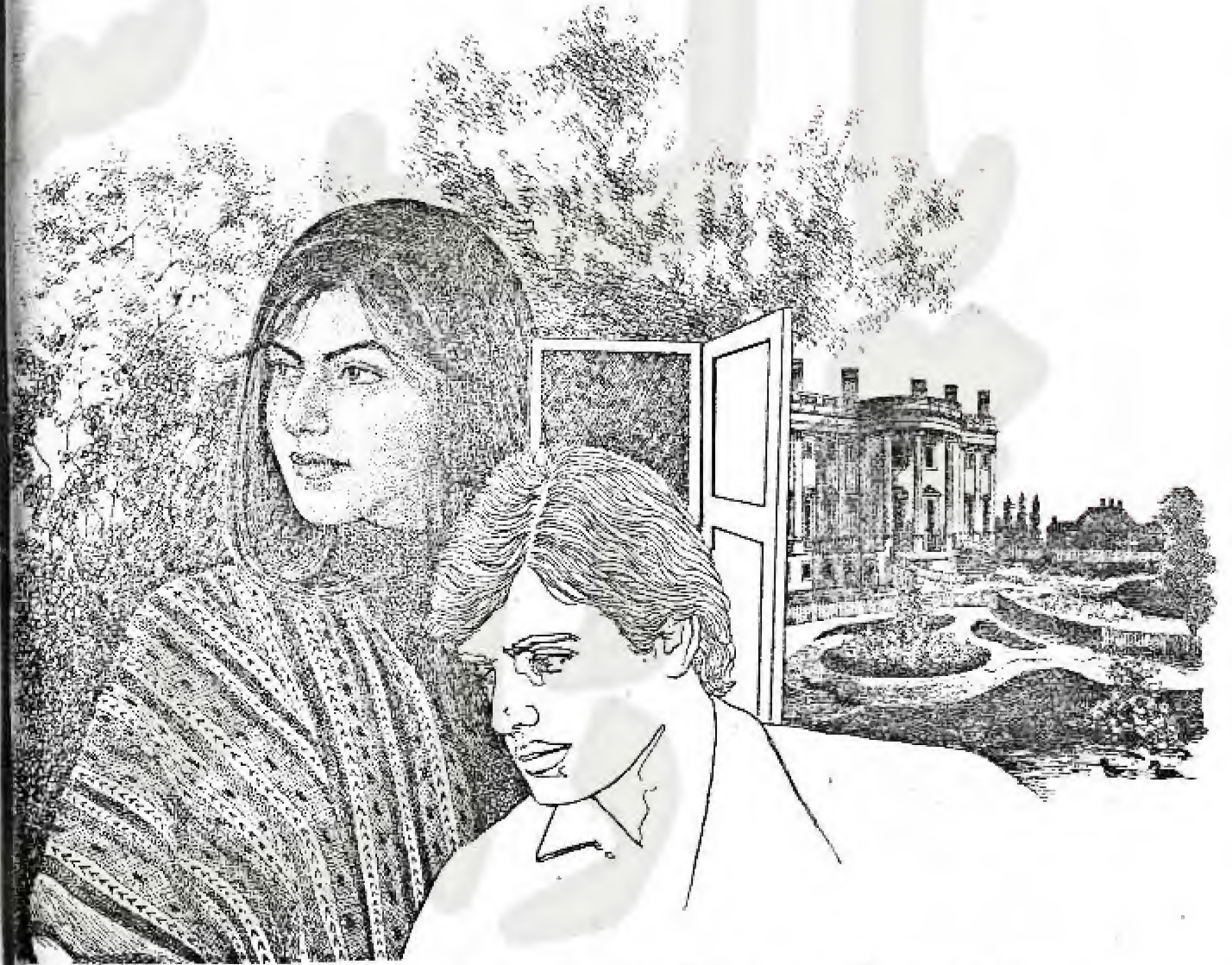


ناولٹ

ترک و فنا

نایاب جیلانی

نواں حصہ



فائدہ اٹھا کر اسے دیکھ لیتی۔ جبکہ اپنے کسی بھی عمل سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ ذی شاہ کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ پہلے کی طرح ہی بے نیاز اور بے حس بنی بیٹھی تھی۔ اس کے پیروں سے اب بھی خون رس رہا تھا مگر مجال تھی جو اس کے لبوں سے ہلکی سی کراہ بھی نکل آتی۔ بڑا کمال کا ضبط پایا تھا اس نے..... ذی شاہ کی زندگی میں آنے والا وہ پہلا خطی آنسو تھا جو اسے پل پل حیران کر رہا تھا۔ اس

وہ حیران کیوں نہ ہوتا اس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی وہ بھی بہت رواں اردو میں..... اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ خطی آنسو کی ایک، ایک حرکت کو بہت اونچائی اور بلندی سے نوٹ کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک اونچی جگہ پر کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا جبکہ وہ لڑکی بہت نیچے تھی۔ اور ذی شاہ لمحے بھر کے لیے اسے دیکھتے وقت چونکا نہیں تھا جو وہ لڑکی موقع سے



لڑکی کی بے نیازی، ضبط، صبر و تحمل کمال کا تھا۔ ورنہ اس نے تو صرف سوئی چھینے پر لڑکیوں کو چلاتے دیکھا تھا۔ ابھی آج صبح ہی تو ایمل کو آئی سے محض چھری کا ہلکا سا کٹ لگنے پر ڈانٹ پڑی تھی کیونکہ کٹ بہت معمولی تھا مگر وہ شورا تانا چارہ ہی تھی گویا سارے زمانے کا درد اس کی ننھی سی انگلی میں سمٹ آیا ہو..... چلو، ایمل تو بچی تھی، اس نے بندیا اور عینی کو ذرا، ذرا سی تکلیف پہ دھاڑیں مارتے دیکھا تھا۔ وہ تین، تین دن تک بستر نہیں چھوڑتی تھیں اور یہاں وہ ایک جرمن لڑکی کے صبر، برداشت اور حوصلے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تین انچ لمبے اور نو کیلے کانچ کو ایزھی میں کھائے مطمئن سی بیٹھی تھی۔

”اللہ اکبر..... اتنا حوصلہ.....“ ذی شاہ ساری سوچوں کو جھٹک کر اس کے پیر پہ جھک آیا تھا۔ وہ ایزھی پکڑ کر زخم کا جائزہ لینا چاہتا تھا جب اس لڑکی نے اسے حلاوت سے روک دیا۔

”اسے مت چھیڑو..... اسے میری ایزھی میں کھبا رہنے دو۔“ وہی نرم اور شیریں انداز..... وہ ذی شاہ کو دیکھے بنا نرمی سے منع کر رہی تھی۔ اسے پھر سے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ رواں اردو اور شیریں لہجہ..... وہ لمحے بھر کے لیے چپ سا کر گیا تھا پھر اس سے ایزھی سے بہتا خون دیکھا نہ گیا۔ نیچے شفاف جگہ پر خون کی ننھی سی ندی رواں ہو گئی تھی۔ اتنا خون بہنے کے باوجود وہ ذرا سی کمزوری محسوس نہیں کر رہی تھی۔ وہ حقیقتاً کوئی خبلی آسٹم ہی تھی۔ افرایم نے بالکل ٹھیک کہا تھا اور پورے مغربی جرمنی میں ذی شاہ کو ایسا خبلی آسٹم نظر نہیں آ سکتا تھا۔

اس نے اس کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود بھی فرسٹ ایڈ باکس کھول لیا تھا۔ وہ ڈینول کے ذریعے زخم صاف کر کے کانچ کو نکالنا چاہتا تھا جب اس لڑکی نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔

”میں نے کہا نا..... اسے مت نکالو، یہ جب تک میری ایزھی میں کھبا مجھے تکلیف دیتا رہے گا، میرا اللہ پر یقین بڑھتا جائے گا۔ تم اسے یہیں رہنے دو..... مت نکالو..... مجھے اس درد کی لذت کا احساس بہت

سکون دیتا ہے۔ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی تو ہے جو اتنا درد دیتا ہے کہ بے بس کر کے رکھ دیتا ہے اور ایسی تدبیر کرتا ہے جو حواس چھین لیتی ہے۔“ وہ بن دیکھے اسے اپنے شیریں کلام سے متحیر کر رہی تھی۔ مغربی حسن، مغربی شکل، مشرقی باتیں اور بیچ میں اللہ کا ذکر..... وہ پھر سے بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ خبلی آسٹم تو جیسے اسے بھی خبلی کرنے کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔

”تم پاکستانی ہو؟“ ذی شاہ نے حیران ہونا ترک کر کے زبردستی اس کے پیر پر اپنا ہتھ جمالیا تھا پھر اس کے منع کرنے اور روکنے کے باوجود کچھ دیر پہلے کی تقریر بھلا کر اس نے بڑے آرام سے کانچ نکال لیا تھا اور شیشہ نکالتے ہی جیسے گوشت کے کئی ٹوٹھڑے باہر آ پڑے تھے۔ خون کا جیسا فوارہ چھوٹ پڑا تھا۔ وہ بغیر گھبرائے بڑی سہولت کے ساتھ خون روکنے کی کوشش کرتا رہا..... مگر یہ کوشش قطعاً ناکام تھی..... ذی شاہ کو اندازہ ہو گیا تھا خون روکنے والا ہرگز نہیں..... زخم بہت گہرا تھا۔

”آئی ایڈ وائس یو ٹو گونو ہاسپٹل.....“ ذی شاہ نے متشکر لہجے میں کہا پھر جیسے کچھ سوچ کر اٹھ گیا۔ افرایم کی گاڑی نہیں تھی اور یقیناً اس خبلی آسٹم کے پاس بھی گاڑی کی سہولت نہیں تھی۔ وہ اندازے سے چلتا ہوا مین روڈ تک گیا۔ تب اسے اپنے پیچھے ہی ایک آواز سنائی دی تھی۔ ذی شاہ اسے پتھر پر بیٹھا رہنے کی التجا کر کے آیا تھا جبکہ وہ اس کے پیچھے ہی دے قدموں چلتی آگئی تھی۔ وہ جس طرح پیر زمین پر جما کر چل رہی تھی، اس کے بجائے ذی شاہ کو تکلیف ہونے لگی تھی۔ اس کا ہر زمین پر پڑتا قدم ذی شاہ کو اپنے دل پر پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کل سے اپنی کیفیات پر حیران تھا۔ وہ آج بھی اپنی کیفیات پر حیران ہو رہا تھا۔

”نیکسی یہاں سے نہیں ملے گی۔ بس اسٹاپ تک چلتے ہیں۔“ وہ یقیناً بڑی ہمت والی بہادر لڑکی تھی۔ ذرا سی کراہ بھی منہ سے نکالے بغیر ذی شاہ کا سہارا لینے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی بلکہ اس کے سہارا دینے پر انکار کر کے آرام سے چلتی بس اسٹاپ تک پہنچ گئی تھی۔ دیکھا

جاتا تو ذی شاہ کو ساتھ جانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ خود چل کر بس اسٹاپ تک آ سکتی تھی تو کیا ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتی تھی؟ اور ویسے بھی ذی شاہ کو تو نہ رستوں کا علم تھا نہ کلینک کی کچھ خبر تھی۔ وہ تو اس کجخت دل کے مجبور کرنے پر بنا سوچے سمجھے منہ اٹھا کر چلا آیا تھا۔ اور عجیب بات یہ تھی، ساتھ آنے والی محترمہ نے رسی طور پر بھی اسے ساتھ چلنے سے منع نہیں کیا تھا، سو وہ بھی ڈھیوں کی طرح رکنے کے بجائے ساتھ ہی چل پڑا۔

وہ ننگے پیر بھی اور بینڈیج کے باعث خون رکا تو نہیں تھا تاہم پہلے کی طرح ٹپک نہیں رہا تھا پھر بھی اتنے صبر اور حوصلے کے ساتھ بنا تکلیف کا داویلا کیے وہ چل پڑی تھی۔ پھر کچھ ہی دیر میں بذریعہ بس وہ لوگ ڈاکٹر کے کلینک پہنچ گئے جہاں اسے معائنے کے بعد چھوٹا سا آپریشن کر کے ٹانگے وغیرہ لگائے گئے تھے۔ اس دوران ذی شاہ بھی ساتھ، ساتھ رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کے پہاڑ جتنے حوصلے، صبر اور ہمت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اتنی صابر خاتون ذی شاہ نے اپنی پوری زندگی میں کوئی نہیں دیکھی تھی۔ کم از کم ذرا سی تکلیف کے آثار تو نظر آنے چاہیے تھے۔ یوں تو وہ صابر اور باہمت کے ساتھ، ساتھ کچھ کچھ بے حس بھی لگ رہی تھی۔ جو ہر قسم کے احساسات سے بے خبر تھی۔ جسے تکلیف یا درد تک محسوس نہیں ہوتا تھا۔

میڈیکل ٹریینٹ کے بعد اب وہ لوگ کیسٹ کے پاس کھڑے تھے۔ وہ اب بھی ذی شاہ کا سہارا لیے بغیر ڈاکٹر کے لکھے گئے نسخے کو دیکھ رہی تھی۔ دوائیاں لے کر اس نے ادائیگی کرنا چاہی تو ذی شاہ نے اسے روک دیا تھا۔ یقیناً وہ بے خیالی میں ادھر ادھر دیکھتی اپنا پاؤچ تلاش کر رہی تھی۔ اس کے پاس پاؤچ تھا ہی نہیں۔ بس کا کرایہ بھی ذی شاہ نے اسے پکڑا یا تھا۔ کیسٹ سے ہی اس نے نشوونیدے جو آستین سے ناک پونچتی اس خبلی آسٹم کو بھی دیے اور وہ اب چلتے چلتے ایک چھوٹی سپر مارکیٹ کے قریب رک کر اس کا جائزہ لے کر اندر کی طرف بڑھا۔ وہ بھی ساتھ، ساتھ

ترک وہا

تھی۔ وہ لیڈریز جوتوں کی ایک چھوٹی سی دکان میں داخل ہوا اور خوش مزاج سیلز گرل سے اس کے لیے جوتا دکھانے کو کہا۔ وہ تو اس طرح نخوت سے جوتا لے رہی تھی جیسے ذی شاہ بڑی بنتوں کے بعد اسے لے کر آیا تھا۔ خیر..... آیا تو وہ ادھر اپنی مرضی سے تھا..... مگر مجال تھی جو وہ لڑکی ذرا سا مسکرا دیتی۔ بندہ اس اخلاقی عمل کو دیکھ کر ذرا سی حوصلہ افزائی ہی کر دیتا ہے۔ ذی شاہ کے اتنے مروت بھرے فدویانہ رویے پہ محترمہ نظر ڈالے بنا جوتے پہنے اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ جبکہ شاپ کی مالکن کچھ الجھی اور سوچتی نظر سے اسے دیکھ رہی تھی جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو مگر..... پھر پورا رستہ خاموشی میں کٹا..... گھر کے قریب آ کر ذی شاہ نے اتنے سوالوں میں پہلا اہم ترین سوال اٹھایا تھا۔ یعنی اس نے خبلی آسٹم سے اس کا نام پوچھنے کی جسارت کر لی تھی۔ یہی جسارت زینا (سیلز گرل) بھی کرنا چاہتی تھی مگر اس کا ارادہ بھانپ کر وہ شاپ سے بھاگ نکلی۔

”آں..... میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟“ وہ بغیر کوئی رسی کلمات بولے براؤن کلر کے جوتوں میں پیر پھنسائے اپنے ویس ہاؤس کی طرف بڑھ رہی تھی جب ذی شاہ کی آواز سن کر بھڑک کر روک گئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر جھٹک کر جواب دیا تھا۔

”منکٹھے.....“ وہ خبلی آسٹم لمحہ بھر کی دیر میں اپنے ویس ہاؤس کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جاتے سے وہ اپنا خوب صورت نام ذی شاہ کی سماعتوں میں امرت کی طرح اتار گئی تھی۔ وہ جیسے سحر زدہ رہ گیا تھا۔

”اتنا حسین مگر عجیب نام.....“ وہ زیر لب... بڑبڑاتا ہوا بیٹھی سی مسکان ہونٹوں پر سجائے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس کے دل کی خوشی اور سکون کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ منکٹھے سے آج نہ صرف ملاقات ہو گئی تھی بلکہ بہت طویل بات بھی ہوئی تھی۔ جرمنی آنے کے صرف اکتالیس گھنٹوں بعد منکٹھے سے پہلی باضابطہ ملاقات..... وہ جو پہلی نظر میں دل کی آخری تہوں میں اتر گئی تھی۔ جو ذی شاہ کے دل کا ہر ساز اپنی بے نیازی



میں گھیر کر بجا گئی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں اپنی ساؤگی کے باعث ہمیشہ کے لیے رنج بس گئی تھی۔ اور ایک بات تو جیسے طے تھی وہ اس کے دل کی سرزمین سے پیر اکھاڑنے والی نہیں تھی۔ وہ عجیب نام کی عجیب لڑکی.....

☆☆☆

”تمہارا نام کتنا عجیب ہے.....“ کرشل کے شفاف باؤل میں سرخ، ریلی اسٹرا پر بڑے بھرے وہ اسٹول نما سنگی پتھر پر نزاکت سے بیٹھی تھی۔ پنک اسکرٹ کے اوپر وائٹ بلوزے پہن رکھا تھا، بالوں کی ڈھیلی سی پونی کے ساتھ وہ بہت بے پروا نظر آ رہی تھی۔ اس کی اٹھان بہت اچھی تھی، ہاتھ پاؤں بڑے، بڑے تھے تاہم نسوانی نزاکت ضرور دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ اخروٹی تھا، آنکھیں نیلی اور جسم بہت دبلا پتلا تھا، اس کے باوجود وہ تیرہ سال کی عمر میں سترہ سالہ دو شیرہ نظر آتی تھی۔

ذی شاہ کو ایمیل کی کمپنی پسند تھی اور ایمیل بھی اسکول سے آکر اس کے پہلو سے چپک جاتی تھی۔ دن کا بیشتر وقت وہ ماں سے ڈانٹ کھاتی تھی بھی بقول ایمیل اسے کھایا پیا نہیں لگتا تھا۔ وہ باتوں کی شیدائی تھی اور چاہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ اسے ہی سنا جائے۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور اچھی خاصی پنجابی میں وہ خوب ہنسنے لے کر اسے باتیں سناتی تھی۔ اپنی بہن کی نو میرج کا قصہ اس نے کوئی اٹھارہ مرتبہ تو اسے سنا رکھا تھا۔ فی الوقت ویس ہاؤس کی مالکن پر تبصرہ کرتے ہوئے اچانک ایمیل کو اس کا نام بہت عجیب لگا تھا۔ اور دل کی بات رکھنے والی تو وہ تھی نہیں۔ تبھی تبھی سی تاک سیکر بولی تھی۔

”عجیب نام ہے تمہارا..... پہلے کبھی نہیں سنا.....“ ایمیل نے موٹی سی اسٹرا بیری منہ میں رکھ کر دانت زور سے دبائے تو اسٹرا بیری کا اضافی رس اس کے ہونٹوں کی تراش اور کونوں سے باہر نکل آیا تھا جسے وہ اپنے ہونٹوں کو چوس چوس کر زبان پھیرتے ہوئے اندر کر رہی تھی۔

”اس..... عجیب کیوں ہوا.....؟“ ذی شاہ برامان گیا..... اس کی نظریں پھولوں سے لدی ٹوکریوں پر جمی تھیں۔ ایک جیسی ٹوکریاں ایک جیسے گھروں کے کونوں میں موجود چھوٹے سے سوئمنگ پول..... کھڑکیوں کے اندر لٹکے ایک ہی طرز کے سفید جالی دار نائیلون کے پردے..... اتنی مماثلت کا مقصد کیا تھا؟ یا پھر ایک ہی طرز کی کچھ چیزیں یہاں کے کچھ کا کوئی حصہ تھیں، ہر گھر کے اندر پردے ایک جیسے تھے، پھولوں کی ٹوکریاں بھی ایک جیسی..... گارڈن میں موجود پول بھی ایک ہی طرز کے..... حتیٰ کہ کھڑکیوں کا طول عرض بھی ایک سا تھا۔ یہ جرمن قوم کے مزاج کا انوکھا پہلو تھا۔ بہت ساری چیزوں میں انتہا کی یکسانیت..... ہر اجنبی کو اسی طرح حیران کر دیتی ہوگی۔

وہ اتنی ساری عجیب..... چیزوں پر حیران ہونا ترک کر کے اپنی چھوٹی فرینڈ کی عجیب بات میں الجھ گیا تھا جسے ذی شاہ نام جانے کیوں عجیب لگا تھا۔

”میرا نام تو بہت اچھا ہے.....“ ذی شاہ نے مصنوعی تفاخر سے جتا کر کہا تھا۔ تب ایمیل تیسری اسٹرا بیری کو اپنے دانتوں تلے دبا کر پہلے والے ہی اسٹائل میں کناروں سے چھلکتا رس چوستی دیکھتی رہی۔

”وہ کیسے؟“ اس کی نیلی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ ”وہ ایسے کہ میرے نام ذی شاہ کا معنی بہت خوب صورت ہے، شان اور مرتبے والا.....“ وہ اپنے تفاخر کی وجہ بتا رہا تھا۔ تب ایمیل نے اثبات میں سر ہلا کر جیسے تائید کی تھی۔

”اور تم لوگوں کے نام تو جیسے ہرگز بھی عجیب نہیں.....“ افرابیم، افریشم اور ایمیل..... اور یہ سامنے والی..... ”ذی شاہ کچھ بولتے، بولتے ایک دم رک سا گیا۔ حالانکہ وہ جتنا چاہتا تھا کہ یہ سامنے والی عجیب نام کی منکھے خاتون..... بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا؟“

”اچھا..... اچھا، نام سب ہی اچھے ہوتے ہیں۔“ ایمیل نے فوراً سپر فائر کرنے کی کوشش میں اسٹرا بیری ہاتھ سے رکھ دی تھی کیونکہ ان دونوں کی لڑائی اب متوقع

تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اسے کوئی اور بات بتا رہی تھی۔ معاذی شاہ کو اچانک خیال آیا تو بولا۔

”میرے ساتھ شریب وارن تک چلو گی؟“ اس نے اپنے امپورٹڈ والٹ کو نکال کر کرسی چپک کی تھی پھر مطمئن ہو کر ایمیل کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس سے بھی پہلے قدرے پُر جوش ہو گئی تھی..... ہانٹ لوگ اس کی فوٹو دکان تھی۔ اسے بھی کافی زیادہ اسٹیشنری کا سامان خریدنا تھا..... سو فوراً باؤل کو اٹھا کر اندر رکھ آئی..... واپسی پر اس کے ہاتھ میں وائٹ بلوزے جیسا ایک پاؤچ بھی تھا۔

”تمہیں ہانٹ لوگ سے کیا خریدنا ہے؟“ ایمیل بے گم چہانے تجسس بھرے لہجے میں بولی تھی۔ وہ دونوں فٹ پاتھ پر واک کے انداز میں چل رہے تھے۔ اسٹیشنری یہاں سے دس منٹ کے واکنگ ڈسٹنس پر تھی۔ ذی شاہ کو ابھی یہ علاقہ گھومنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ورنہ وہ اکیلا ہی چلا آتا..... ایسے ہی ارد گرد دیکھتے اس کے دل میں خواہش اچانک اٹھائی لے کر بیدار ہوئی تھی کہ ویس ہاؤس کی مالکن، وہ خطی آسٹم منکھے بیس کہیں دکھائی دے جائے..... جانے اس کے پیر کا زخم کیسا تھا.....؟ وہ اسے کل سے دکھائی نہیں دی تھی۔ اسے چلنے پھرنے میں یقیناً دشواری کا سامنا تھا۔

”مجھے خط لکھنے کے لیے پیڈ، لٹافے اور قلم چاہیے۔“ وہ بنیدگی سے جواب دیتا ابھی تک منکھے کو سوچ رہا تھا..... اور ایمیل بار بار اس کا ارتکاز توڑ رہی تھی..... اسے بولنے کی بیماری تھی اور وہ چپ نہیں رہ سکتی تھی۔

”وہ تو گھر میں بھی موجود تھے۔ تم مجھے بتاتے تو سہی۔“ ایمیل نے بڑے پن سے کہا تھا، تب ذی شاہ بے پروائی سے بولا۔

”انس اوکے یار.....! اسی بہانے تھوڑی آؤٹنگ ہو جائے گی۔“ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا پھر کسی سوچ کے زیر اثر چلا گیا تھا۔ روتی ہوئی منکھے کبھی آنکھوں کی پتلیوں کے سامنے مگس بنانے لگتی تھی۔ کبھی روڈ کے وسط میں چلتی نظر آتی، کبھی راج ہنس سے

ترک و وفا

باتیں کرتی دکھائی دینے لگتی..... پھر اس کے الفاظ، وہ چلتے، چلتے ٹھنک گیا۔ اس نے کیسے ذی شاہ کو اتنی اونچائی پر ہونے کے باوجود دیکھا تھا۔ اس کی ایک، ایک حرکت نوٹ کی..... حتیٰ کہ گھنٹوں کا بھی حساب رکھا..... جبکہ بظاہر وہ بے نیاز نظر آتی تھی۔ کیا کمال کی زیرک نظری پائی تھی اس نے..... کیا غضب کا مشاہدہ تھا۔ وہ ابھی تک متحیر تھا، بھلا اتنے بے نیاز روپ کے ساتھ وہ آس پاس کے ماحول سے اتنی باخبر کیسے تھی؟ جانے وہ کب تک سوچوں میں محو رہتا؟ چونکا تو وہ تب جب ایمیل نے خطگی سے اس کا بازو دبوچ کر روکنے کی کوشش کی تھی۔ ورنہ وہ تو اپنے ہی دھیان میں مگن بہت آگے تک چلا گیا تھا بھی پھولی سانسوں والی ایمیل نے بھاگ کر اس کا بازو دبوچ لیا۔

”اللہ..... کہاں، بھاگے جا رہے ہو.....؟ ہانٹ لوگ تو پیچھے رہ گئی۔“ وہ اسے واپس موڑتے ہوئے خاصا شرمندہ کر رہی تھی۔ ذی شاہ چونک کر جیسے حقیقتاً شرمندہ ہو گیا۔ پھر اپنی شرمندگی مٹانے کی خاطر اس نے ایمیل کو خاصی شاپنگ کروائی تھی پھر اس نے شاپ کیپر سے پوسٹ آفس کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ ایک کاغذ پر جلدی، جلدی کچھ تحریر کر رہا تھا۔

”ازدی پوسٹ آفس ٹوڈے؟“ شاپ کیپر سے انگریزی میں پوچھتا وہ خود ہی ہونق ہو گیا کیونکہ شاپ کیپر صاحب نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اخبار اٹھا کر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایمیل اس عزت افزائی پر قتل، قتل ہونے لگی تھی۔ ذی شاہ بری طرح ہنستا گیا۔ اس نے قلم چلانا ترک کر کے ایمیل کو گھورا تھا۔

”اسے انگریزی کی سمجھ نہیں آئی۔“ ایمیل نے شکستہ انگلش اور شستہ پنجابی میں اسے سمجھایا تھا۔ تب ذی شاہ پھر سے اسٹیشنر کو گھور کر رہ گیا تھا۔ اب کہ ایمیل شاپ کیپر کو مخاطب کر رہی تھی۔

”ازت داس پوسٹا مت مورگن اوفن.....؟“ ایمیل نے آج کے بجائے کل ڈاک خانے کے کھلے ہونے کی تصدیق کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ڈاک خانہ



آج اس وقت تک بند ہو گیا ہر گھر شاپ کیپرنے بتایا پوسٹ آفس آج بھی کھلا ہے۔ وہ دونوں دانگے شون (شکریہ) بولتے باہر نکل آئے تھے۔ اب انہوں نے قریبی پوسٹ آفس سے لفافوں اور ایروگراموں پر لگانے کے لیے خاص قسم کے ٹکٹ خریدے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک لفافے میں چینی سلپ پر لکھی کوئی تحریر ڈال کر ”ویرا زوی پوسٹ بکس.....؟“ پوچھتا ایک کونے کی طرف چلا گیا تھا۔ خط پوسٹ کر کے اب وہ دونوں واپسی کے سفر پر گامزن تھے۔

”تم نے خط کے بھیجا.....؟“ ایمل نے اپنی بے چین فطرت کے باعث فوراً سوال اٹھایا تھا۔ وہ کب سے بے چینی چھپائے اس کی کلیدھائیاں دیکھ رہی تھی۔ اب صبر نہ ہو سکا تو فوراً پوچھنے لگی۔

”پاکستان اپنے گھر.....“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

ادھر ایمل حیران رہ گئی تھی۔

”تمہارے گھر میں ٹیلی فون نہیں.....؟“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر ذی شاہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”فون ہے.....“ ذی شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور انٹرنیٹ.....؟“ ایک اور حیرانی بھرا سوال۔

”انٹرنیٹ بھی ہے.....“ وہ اس کی بے چینی کو سمجھ رہا تھا بھی خط اٹھاتے ہوئے بولا۔

”تو پھر خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم فون پر بات کر لیتے یا اسکا پ پر.....“ ایمل نے منہ پھلا کر ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ اس تیز رفتار انٹرنیٹ دور میں ایک ماڈرن لڑکے کا خط لکھنا اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی اس کی سمجھ خاصی کمزور تھی۔

”تم نہیں سمجھو گی.....“ ذی شاہ نے اس کے سر پر چپٹ لگائی تھی۔ وہ پھر سے منہ پھلا گئی۔ اسے بات بہ بات روٹھنے کی بھی بیماری تھی۔ اسے بات بہ بات لگا تھا پھر ایک آکس کریم کارز کو دیکھ کر جھٹ سے بولا۔

”کون کھاؤ گی.....؟“ وہ اسے لالچ دے رہا تھا مگر ایمل نے فوراً انکار کر دیا۔ وہ کچھ موڈی سی تھی اور جب موڈ میں آ کر کسی بات پر انکار کرتے ہوئے

اب بھی اس نے منہ بنا کر انکار کر دیا تھا۔

”رہن دیوہ وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اپنی اسٹریٹ سے ہوتی ہوئی گھر کے اندر کھس گئی تھی جبکہ ذی شاہ کے قدموں کی رفتار خود بخود بند ہو گئی۔

وہ رک سا گیا، گویا تھم گیا ہو۔

”کیا اسے منکھے کی خیریت معلوم کرنے جانا چاہیے.....؟“ دل اور دماغ کی دلیلوں اور جوازوں کے درمیان وہ متذبذب کھڑا تھا۔ آگے بڑھے یا پیچھے پلٹ جائے؟ آگے جانا مناسب تھا یا واپسی میں عافیت تھی؟ وہ الجھتا رہا، سوچتا رہا، بہت دیر کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کے بعد وہ واپس پلٹ کر گھر کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جذبات پہ سوچ حاوی ہو گئی تھی۔

وہ کس طرح بتا کسی جان پہچان کے منکھے کا دروازہ کھٹکنا سکتا تھا؟ محض کل کی مختصر رفاقت کے بل بوتے پر اتنی بے تکلفی یورپ میں اسے بھاری نقصان سے دو چار بھی کر سکتی تھی؟ کیا خبر منکھے اسے دیکھ کر پہچاننے سے انکار کر دیتی؟ یا پھر برا بھلا کہنے لگتی زیادہ ہی میٹر گھومتا تو پولیس کو بلوائیتی..... جب وہ منکھے کی طرف سے ملنے والے جھٹکے سے کیسے سنہلے گا.....؟ وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ منکھے کو اپنے دل میں بہت اعلیٰ مقام دے چکا تھا۔ شاید وہ اس سے ایک طرفہ محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ اور بات تھی اس محبت کا اعتراف کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ مگر دل کی بدلتی کیفیت اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ یہاں محبتیں کرنے تو نہیں آیا تھا، نہ دل پرایا کرنے آیا تھا پھر اس کے ساتھ آخر کیا ہو رہا تھا؟

وہ عجیب کشمکش میں مبتلا بالوں میں انگلیاں پھیرتا لاؤنج میں آیا تو سامنے ہی ایمل صوفیے پر چڑھی اپنی باربی کو سینے سے چٹائے دکھائی دی تھی۔ اس کا موڈ پہلے سے بہت بہتر لگ رہا تھا بھی ذرا چمک کر بولی تھی۔

”وہاں کیوں رک گئے تھے..... ویس ہاؤس کے سامنے؟“ اس نے بڑے عجیب لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ ذرا ٹھنک گیا۔

اسے امید نہیں تھی، ایمل اندر کی جھری میں سے اسے باہر کھڑا دیکھ رہی تھی اور نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ بہت غور بھی کر چکی تھی۔ تبھی بڑے حیران کن تاثرات سجائے بیٹھی تھی۔

”نہیں تو.....“ ذی شاہ نے ہڑ بڑا کر جھوٹ بولا۔

”رہن دیوہ..... جھوٹ نہ بولو، میں نے خود دیکھا ہے۔“ وہ پھر سے چمک کر بولی تھی۔

”کہاں سے؟“ ذی شاہ نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

”اس ونڈو سے“ ایمل نے سفید ٹائی لون کے جالی دار مہین پر دے کی طرف اشارہ کیا تھا جو اس وقت ہک میں اڑسا ہوا تھا جس کی وجہ سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ذی شاہ بھوس اچکا کر رہ گیا۔

”میں تو ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا۔“ اس سے بات نہیں بن پائی تھی، اتنی سی بالشت بھر کی بچی نے اسے گھاڑا لاکھا۔

”رہن دیوہ (رہنے دو) ایسے ہی تو بلا وجہ کچھ سوچا نہیں جاتا۔“ وہ اس کے بہلاوے میں نہیں آئی تھی۔ خاصی افلاطونی بچی تھی۔ عمر کے لحاظ سے کم تاہم قد میں اتنی بانس جتنی لمبی.....

”مگر میں تو بلا وجہ ہی کھڑا سوچ رہا تھا۔“ ذی شاہ کھسیا گیا۔

”ویس ہاؤس کو دیکھ کر.....؟“ وہ پھر سے چمکی.....

”کسی اور چیز کو دیکھ کر سوچ لیتے، سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر ویس ہاؤس کے داخلی دروازے پر نگاہ جما کر سوچنے سے کیا اچھی، اچھی باتیں ذہن میں آتی ہیں؟ اگر یہ کوئی میجک ہے تو اسے میں بھی آزما لوں گی۔“

ایمل کی بچی نے اس کی درگت بنا ڈالی تھی۔ بہت تیز اور حاضر دماغ لگتی تھی۔ ذی شاہ سردھن کر رہ گیا۔

”یہ واقعی میجک ہے..... تم بھی آزما لینا.....“ وہ شرارتی انداز میں بولا تھا تب اس کے اگلے الفاظ اس

ترک و وفا

کی ساری شرارت کو ہوا کر گئے تھے۔

”میں کوئی پاگل ہوں جو ویس ہاؤس کو دیکھ کر سوچوں گی۔ پھر تو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔“ ایمل ساری طراری بھلائے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ عجیب سا ہراس اس کی آنکھوں میں ابھرنے لگا تھا۔

”کیوں بھلا.....؟“ وہ حیران ہوا تھا..... تب ایمل جیسے گڑ بڑا گئی تھی۔ گویا زیادہ بولنے کے نقصان سے دوچار ہو گئی۔ ذی شاہ کو یوں لگا تھا جیسے وہ کچھ بتاتے، بتاتے چھپا گئی تھی۔

”ایسے ہی.....“ اس نے ذی شاہ کے انداز میں ہی جواب لوٹا دیا تھا۔ بالکل اسی کے اسٹائل میں کندھے اچکا کر..... پھر بار بار پھینک کر بچن کی طرف بھاگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بلینڈر چلنے کی آواز آئی۔ شاید وہ شیک بنا رہی تھی۔ چند منٹ تک بلینڈر چلتا رہا تھا پھر آواز آنا بند ہو گئی۔ وہ سوچتی نظروں سے اوپن بچن میں کام کرتی ایمل کو دیکھتا رہا۔ وہ جیسے اس کے متوقع سوالات سے بچنے کی غرض سے بھاگ گئی تھی۔ شیک کا تو بہانہ تھا..... کچھ دیر مزید بچن میں رکنے کے بعد وہ ٹھنڈا ٹھار شیک کا گچ کے تیلے اور انتہائی لمبے اسٹرا جتنے گلاسوں میں بھر کے لے آئی تھی۔ یہ اسٹرا جتنے لمبے اور پائپ جتنے موٹے بلوریں گلاس اپنی ساخت کے لحاظ سے خاصے پیرکشش لگتے تھے۔ ایمل نے ایک گلاس اسے پکڑا دیا تھا، دوسرا گلاس خود پکڑ کر کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

”تمہیں بھوک تو نہیں لگی.....؟“ ایمل نے بڑے، بڑے گھونٹ بھرتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر انکار کیا تھا..... تب وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ آج ایمل کی موٹر کہیں گئی ہوئی تھیں۔ لنج کی ڈتے داری ایمل پر تھی شاید بھی وہ متفکر سی پوچھ رہی تھی۔

”نہیں..... یہ گینٹرنگ (شیک) ہی کافی ہے.....“ ذی شاہ نے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے معصوم ایمل کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

”اگر بھوک لگی تو بتا دینا، میں کھانا گرم

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



کردوں گی۔ می سب بنا کر گئی ہیں۔“ اس نے بہت بے نیازی سے جواب دیا تھا۔ تب وہ چونک سا گیا۔  
”آئی کہاں گئی ہیں؟“ وہ متشکر سا بولا۔

”افریشم کی طرف..... اس کی طبیعت خراب تھی۔“ ایمل نے بیزاری سے بتایا۔ اسے افریشم سے بہت شکوے تھے، ایک تو وہ شادی کر کے اسے چھوڑ گئی تھی اور دوسرے می کو بھی آئے دن بلاوا بھیج دیتی تھی۔ اب اگر ذی شاہ نہ ہوتا تو اس نے قیامت اٹھالینی تھی کیونکہ وہ اکیلے کبھی گھر میں نہیں رہتی تھی۔

”کیا ہوا افریشم کو.....؟“ ذی شاہ نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔ یہ وہی افریشم تھی جس نے ایک خوب صورت کارڈ پہ اسے من ہائیم میں ویلکم بولا تھا۔ وہ کارڈ ابھی تک گیسٹ روم کے دروازے پر چسپاں تھا۔

”ہاں نہیں.....“ ایمل کی بیزاری عروج پر تھی۔ اس نے گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھا تھا پھر ایمل کی طرف متوجہ ہوا۔

”تم کچھ بتا رہی تھیں۔“ وہ سلسلے کلام دوبارہ سے جوڑنا چاہتا تھا جہاں سے ایمل توڑ کر کچن میں چلی گئی تھی۔

”کیا.....؟“ اب وہ فی وی لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز میں بے پروائی محسوس کر کے ذی شاہ نے بتایا تھا۔  
”ولیس ہاؤس کے بارے میں.....“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا تب ایمل ٹھنک گئی۔

”یہ ولیس ہاؤس تمہارے حواسوں پر سوار کیوں ہو چکا ہے؟“ ایمل چمک کر بولی تھی۔ اس کے الفاظ نے ذی شاہ کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ کس قدر تیز لڑکی تھی، اگر اپنے منہ سے اپنی عمر نہ بتاتی تو وہ اسے اٹھارہ، انیس کی تو لازمی سمجھ لیتا۔ اب بھی اپنی عمر سے زیادہ بڑی باتیں کرتی تھی۔ ذی شاہ ”آف“ کراٹھا۔

”ایسی بات نہیں۔“ وہ گڑ بڑا گیا تھا۔  
”تو پھر کیسی بات ہے؟“ ایمل صاحبہ اس پر جیسے تھانیدارنی لگ گئی تھیں۔ وہ پھر سے ہڑ بڑایا۔

”میں ایسے ہی انفو کے لیے پوچھ رہا ہوں۔“ اسے بہ مشکل بات کا ٹکڑا وضاحت کے لیے مل ہی گیا تھا

وہ کچھ شانت ہو گیا۔

”اچھا.....“ ایمل کو کچھ مایوسی ہوئی۔ یعنی صرف انفارمیشن کی ضرورت تھی مقابل کو..... اندر سے معاملہ گڑ بڑ نہیں تھا۔ وہ تو اپنے بہنوئی اور بہن جیسی رومیٹک تازہ ترین لو اسٹوری کا چکر سمجھ رہی تھی..... مگر یہاں ایسا کچھ نہیں تھا، وہ سخت بدمزہ ہوئی تھی۔

”بتاؤ ناں.....؟“ ذی شاہ نے بے چینی سے کہا..... وہ منکشفے کے بارے میں کچھ تفصیل جانا چاہتا تھا، اس کی فیملی اور گھر بار کے متعلق..... اس کی تعلیم، خوبیاں، قابلیت..... آخر یہ لوگ کچھ نہ کچھ تو منکشفے کے بارے میں جانتے ہوں گے؟ آنا جانا نہ سہی، وہ کچھ تو منکشفے کے اوقات کار، مزاج، گفتار اور رہن بہن کے متعلق جانتے ہوں گے، آخر وہ ان کے سامنے تو رہتی تھی۔

اگرچہ یہ خیال ناقص ہی تھا۔ بھلا یورپ میں کون، کسی کی خبر گیری کرتا ہے مگر اسے قوی امید تھی ایمل جیسی متجسس طبیعت لڑکی ضرور دوسروں کی ٹوہ میں رہتی ہوگی..... اور اس کی توقع کے عین مطابق وہ ذرا اُپر جوش، ذرا خوف زدہ اور تھوڑی سی گھبرا کر اسے رازدارانہ لہجے میں بتانے لگی تھی۔

”تم ولیس ہاؤس کی زیادہ بات مت کیا کرو، میری می اور بھائی کو پسند نہیں۔“ وہ صوفے کی گدازیت میں انگلیاں کھبائے آنکھیں میچے ذرا سہے، سہے لہجے میں بولی تھی یوں کہ ذی شاہ قدرے متحیر رہ گیا تھا۔

”مگر کیوں.....؟“ وہ بھی ایمل کے سے انداز میں سرگوشیاں بولا تھا..... تب ایمل نے چیخی، چیخی آواز میں گھبرا کر بتایا۔

”ولیس ہاؤس میں مرڈر ہو گیا تھا۔ تب سے میری می اور بھائی کو ولیس ہاؤس کا ذکر برا لگتا ہے۔“

ایمل نے بالآخر اس کے سر پر دھکا کر ہی دیا تھا..... وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ تب اجا تک کوئی لاؤنج کے دروازے سے اندر داخل ہوا تھا پھر کسی نے چیتے کی سی تیزی سے ایمل کی طرف جا کر اس کے منہ پر زور دار ٹھپڑ دے مارا تھا۔ ماحول میں زناٹے دار

تھپڑ کی گونج لہرا گئی تھی۔ جیسے پورا عالم لمحے بھر کے لیے شائیں، شائیں کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

”چنانچہ.....“ ایمل کے منہ پر بڑے زور کا تھپڑ پڑا تھا۔ وہ اتنی بری طرح سے چیخی تھی کہ ذی شاہ بھی گھبرا اٹھا تھا۔ تھپڑ مارنے والی کوئی اور نہیں ایمل کی می تھیں جو خونخوار نظروں سے تھڑ تھڑ کا پتی، ایمل کو گھور رہی تھیں۔ آخر ہوا کیا تھا؟ انہیں اتنا غصہ کیوں آیا؟ ایمل نے اسے بتا کر کون سا گناہ کر دیا تھا؟ وہ جیسے ہکا بکا رہ گیا تھا۔

”زبان نہیں رکھتی اس کی.....“ آئی آگ بگولا ہو رہی تھیں..... ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ ایمل کی پتی سی انتہائی گوری گردن دبوچ ڈالتیں یا اسے مار مار کر لہو لہان کر دیتیں..... صورت حال کچھ ایسی تھی کہ ذی شاہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کیسا رویہ دکھائے..... وہ خاموش رہے یا ایمل کی حمایت میں کچھ بولے۔

”وہاٹ ہپنڈ.....؟“ اس نے حیرت و بے یقینی سے کانچی لرزتی ایمل کو دیکھتے ہوئے آئی سے پوچھا تھا۔ وہ ابھی تک ایمل کو گھورنے میں مصروف تھیں کبھی اس کی طرف توجہ نہیں کر سکی تھیں۔ اور ایمل ہاتھوں میں چہرہ چھپائے (اومعانی چاہتی ہوں) جیسے الفاظ بول کر شاید آئی کو رام کرنا چاہتی تھی..... مگر آئی کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

”مجھے افسوس ہے.....“ ایمل نے سر جھکا کر کہا تھا جیسے وہ ذی شاہ کو ولیس ہاؤس میں مرڈر ہو جانے کا بتا کر سخت پشیمان تھی۔ یقیناً آئی کا خوف اسے ہراساں کر رہا تھا۔ وہ ان کے غصے پر زیادہ گھبرا رہی تھی۔ آئی کا اتنا شدید رد عمل اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ جبکہ وہ ایمل کی پشیمانی پر سخت طنزیہ انداز میں بات کر رہی تھیں گویا ان کے نزدیک ایمل کا شرمندہ ہونا محض ادکاری تھی۔

”واقعی ہے؟“ انہوں نے غضبناک تیوروں سے اسے دیکھا تھا، گویا پس پردہ کہہ رہی تھیں کیا واقعی تمہیں افسوس ہے۔ صورت حال بہت کشیدہ تھی، ماحول کشیف تھا، فضا اداس تھی، ذی شاہ کا دل بھی بہت بوجھل ہونے

تذکرہ وفا

لگا تھا۔ ایمل کے آنسو سے تکلیف دے رہے تھے، وہی عورت کے آنسو نہ دیکھ سکنے کی بیماری..... پھر ایمل تو اس کی چھوٹی سی فرینڈ تھی اور محض اس کے اصرار پر جو کچھ بتا چکی تھی اب اس کا خمیازہ بھگت رہی تھی..... وہ ہائی اسکول میں جانے والی تھی مگر آئی اسے بچوں کی طرح پیٹ ڈالتی تھیں، یہ عمل درست نہیں تھا، خیر پیرش کو غصہ آ بھی سکتا تھا مگر یوں..... ایک جرمن ماں کا یورپین کنٹری میں اولاد پر ہاتھ اٹھانا۔ پھر اولاد کا چپ چاپ تھپڑ سہہ جانا، پولیس کی دھمکی کے بغیر یہ ایک قابل ستائش عمل تھا، یقیناً ایمل کی جرمن می نے ان بہن بھائی کی تربیت بہت بہترین کی تھی..... اور ان کا گھرانہ عام یورپین فیملیز سے ہٹ کر بہت مختلف تھا۔

آئی نے ایمل کو اندر بھیج دیا تھا، اب وہ خود کو کچھ نارل کرتی ذی شاہ کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے کھڑا دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

”ڈیو لائک ٹو ڈرنک سم تھنگ.....؟“ وہ بھی ایمل کی طرح تھوڑی بہت انگریزی بول لیتی تھیں۔ یقیناً انہیں اب خیال آیا کہ وہ ان کا مہمان ہے، سو وہ آداب میزبانی کے ساتھ زپر لب بڑ بڑانی کچن کی طرف جانے لگی تھیں جب ذی شاہ نے انہیں روک دیا تھا۔

”شکریہ آئی..... میں ایمل کے بنائے ٹیک سے لطف اندوز ہو چکا ہوں۔“ اس نے شائستگی کا مظاہرہ کیا تھا، بہر حال ایمل کی تکلیف ایک طرف، آئی کے احترام میں وہ کوئی کمی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کی دوست افرایم کی والدہ تھیں اور ذی شاہ بھی انہیں اپنی ماں جیسا درجہ دیتا تھا۔

”آں..... کیا ایمل نے بنایا؟“ آئی کچن میں جھانکتی حیران ہوئی تھیں پھر اُن کے چہرے پر نرمی سی اتر آئی۔

”ایمل تھوڑی سکھڑ سے آہستہ، آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ کچھ دیر پہلے کی بدمزگی کو بھلائے انہوں نے بڑے پیار سے ذی شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تم چاہو تو فی وی دیکھ لو۔ یا آرام کر لو..... تب



تک میں گرما گرم پز ایک کر کے لے آتی ہوں، ایل مل بھی بہت پسند ہے۔“ وہ اب بڑی حلیم ماں دکھائی دے رہی تھیں جسے بس اپنی خفائی کی ناراضی کو ختم کرنا تھا۔ اس کی پسندیدہ ڈشز بنا کر، ممتا کا یہ مٹھاس بھرا پہلو ذی شاہ کو ستائش میں مبتلا کر گیا تھا۔ وہ لی وی دیکھنے کا آرام کرنے کے بجائے آنٹی کے پاس چکن میں ہی کھڑا دنیا جہاں کی باتیں کرنے لگا پھر باتوں کے دوران ہی آنٹی نے خود بخود ویس ہاؤس کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ حالانکہ ذی شاہ نے بہت چاہ کر بھی کسی دلچسپی یا تجسس کے تحت ایل کو مارے جانے والے تھپڑ کا پس منظر نہیں پوچھا تھا۔

آنٹی نے خود ہی بتا دیا تھا اور دوسرے معنوں میں جیسے یہ وضاحت کرنے کی کوشش میں ذی شاہ یہ جتایا تھا کہ آئندہ اس گھر میں دوبارہ ویس ہاؤس کا ذکر نہیں ہوگا۔

”وہ سامنے والے گھر میں مرڈر ہوا تھا..... بہت عرصے یہاں پولیس آتی رہی، ہماری بھی شامت آئی رہی، ہر دفعہ کوئی نہ کوئی آفیسر ہماری طرف بھی انوسٹی گیشن کے لیے آجاتا تھا۔ وہ گھر ہمارے لیے صرف ڈپریشن بن گیا۔ پھر پولیس نے گھر سیل کر دیا..... کچھ مہینوں بعد شاید اصل وارثوں نے معاملہ رفع دفع کیا..... گھر پر کرائے دار آنے لگے، ہاؤس فار رینٹ کی سختی لگ گئی تھی مگر کوئی بھی کرائے دار یہاں نکا نہیں آئے اور پھر چلے گئے۔ ایک سال تک یہی سلسلہ چلتا رہا پھر یہ گھر بند ہو گیا۔“ وہ پز ایلانے کی ابتدائی تیاری کرتے ہوئے خاصی مصروف نظر آ رہی تھیں۔ تب پہلی مرتبہ ذی شاہ نے کچھ چونک کر ان سے سوال کیا تھا۔

”اور اب سامنے والے گھر میں کون رہتا ہے؟“

اس کے لہجے میں واضح بے چینی اور تجسس تھا، وہ اندر کی بے قراری چھپانے میں قطعاً ناکام ثابت ہو رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتا..... شاید کوئی نیا کرائے دار یا مالک مکان میں سے کوئی ہوگا۔“ ان کا لہجہ سپاٹ سا تھا، گویا وہ جانتی بھی تھیں تب بھی سامنے والے میں دلچسپی لینا نہیں چاہتی تھیں اور نہ مزید اس گھر پر بحث کرنے کی خواہش رکھتی تھیں۔ انہوں نے ذی شاہ سے

ذکر بھی اسی لیے کر دیا تھا کہ وہ تجسس نہ رکھے۔

”ہمارے گھر میں ویس ہاؤس کا ذکر نہیں ہوتا.....“

افراہیم نے سختی سے منع کر رکھا ہے، دراصل ہم لوگوں نے اس مرڈر کی وجہ سے بہت پریشانی اٹھائی ہے، بہت تفتیش بگھلتی ہے، ایک عرصہ ذنی اذیت کا شکار رہے تھے..... اب اللہ کا شکر ہے ہر طرف سکون ہو گیا۔“ انہوں نے کام کے دوران ہی پائین اپیل کا ٹا، اس کے ٹکڑے کیے۔ پھر آڑو اور اسٹریمری کے پیس کر کے باؤل اور فوک ذی شاہ کو تھما دیا تھا۔ ان کے خیال میں شاید اسے بھوک لگ رہی ہوگی۔ مگر ذی شاہ کو ہرگز بھی بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کچھ متحیر سا نہیں سن رہا تھا۔

”اور اب جو ویس ہاؤس میں کرائے دار رہتے ہیں، آپ کی ان سے جان پہچان نہیں؟“ اس کا سوال اجتماعانہ قسم کا تھا، یہاں کوئی قریب ہی تڑپ، تڑپ کر مر جاتا تب بھی کسی کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ پڑوس میں کون رہتا ہے؟ کتنے لوگ ہیں؟ کوئی ہے بھی یا نہیں؟ سال گزر جاتے مگر کسی کو پتا نہیں چلتا..... اور وہ اتنا مشرقی ٹائپ کا ایک مغربی ملک میں کھڑا ہو کر ایک مغربی خاتون سے سوال کر رہا تھا۔ یہ اس کا پاکستان تو تھا نہیں..... جہاں ایک محلے میں کوئی چھینک بھی مارتا تب آواز اور ٹوہ میں اگلی چھ گلیوں کے لوگ دیواروں سے چپک کر کھڑے ہو جاتے..... بھلا اتنی مصروف سی افراہیم کی می کو کیا خبر سامنے یاد آئیں، ہائیں کون لوگ رہتے ہیں..... اور ان کا تعلق کہاں، کہاں سے ہے؟ ایسی کھوج پاکستانی گھرانوں میں ہوتی ہے، بھلا یہاں اس کھوج کا تصور کیا جاسکتا تھا؟

”شاید کوئی لڑکی ہے دیوانی سی..... مجھے کچھ معلوم نہیں..... اور تم بھی احتیاط برتنا.....“ جانے کس رو میں انہوں نے اسے بھی محتاط رہنے کا کہہ دیا تھا۔ بھلا اسے ویس ہاؤس کے خنبلی آئٹم سے کیا خدشہ ہو سکتا تھا؟ کیا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا؟ وہ سر جھٹک کر باؤل اٹھائے باہر نکل آیا..... کچھ دیر لی وی کے سامنے بیٹھ کر وہ بور ہونے کی وجہ سے میز ہیاں چڑھتا اپنے کمرے میں

آ گیا تھا..... وہی خوب صورت دودھیا دیواروں والا کمرہ جیسے اس کا منظر کھڑا تھا..... بے داغ، سفید بستر، جالی کے پردے، پھولوں سے لدی نوکریاں اور میز پر رکھا اس کا سوسائٹ کیس جس کے اوپر خنبلی سی سلپ بڑی تھی، وہ جلالت میں چلتا ہوا کیس کے قریب آیا تھا جس کے اوپر کاغذ کا چکنا پیس پڑا تھا۔

”می کو تو عادت ہے، ان کو ایسے ہی سامنے والی پر غصہ آ جاتا ہے، میں ذرا بھی ناراض نہیں..... تم کیوں چھپ کر کمرے میں بیٹھ گئے..... باہر آ جاؤ ناں..... گیم کھیلتے ہیں۔“ تحریر پڑھتے ہوئے ذی شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اسے ایل کی معصومیت پر پیار سا آ گیا..... شاید وہ سمجھ رہی تھی، ذی شاہ گھٹی فیل کر رہا ہے اور یہ بات ٹھیک بھی تھی، وہ شرمسار تھا نہ سامنے والی کے بارے میں تجسس ہوتا نہ ایل کو پھپھڑتا..... خیر، سامنے والی میں کوئی تو ایسی بات تھی جو یہاں کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ یقیناً اس میں کچھ بری عادتیں ہوں گی، اس کے بوائے فرینڈز ہوں گے، سگریٹ یا شراب پیتی ہوگی؟ یا کچھ بھی جو اس معاشرے کے ناسور جیسے بد فعل میں شامل تھے، جنہیں افراہیم کی تہذیب یافتہ نیک طبیعت می ناپسند کرتی تھیں..... اس کے علاوہ ذی شاہ کا ذہن کچھ اور آگے جا نہیں سکا تھا۔ وہ بس یہیں تک سوچ کر رہ گیا..... اور اگر یہ سب خوبیاں منکشفے میں بدرجہ اتم موجود ہوں تب وہ کیا کرے گا؟ اس سوچ نے ذی شاہ کے اندر ملامت برپا کر دیا تھا۔ دل کو جیسے کسی نے کانٹوں پر گھسیٹ دیا تھا، وہ شدت ضبط سے سرخ پڑنے لگا۔ ماتھے پر پسینہ اترنے لگا تھا اور دل کی حالت بہت شکستہ تھی تب جیسے اس نے ٹوٹ، ٹوٹ کر جڑتے ہوئے خود سے سوال کیا تھا۔

”میں اتنا آگے تک چلا گیا ہوں..... بھلا کیسے؟ کس طرح؟“ اس سوال نے ذی شاہ کو دم بخود کر دیا تھا۔ وہ جیسے خود سے نگاہ ملانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

کیا وہ اتنا سفر کر کے یہاں آنے اور علی عیسیٰ کو ذمہ دہن کر سزا دینے والا عظیم ترین مقصد بھول گیا تھا؟

تراک وفا

یقیناً ایسا نہیں تھا۔ وہ یہ مقصد کیسے بھول سکتا تھا؟ ہاں، بس زندگی کی رگ زگر پر چلنے، چلتے اسے اپنا گوہر مقصود بھی جیسے مل گیا تھا اور اب منکشفے کے علاوہ کوئی نگاہ میں بچ جاتی یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ دل تھا، کوئی دعا باز کرائے کا گھر اور کرائے دار تو تھا نہیں..... نہ مین بدل سکتا تھا نہ مکان.....

وہ تو اس پاگل، باگل لڑکی کو یہ تک نہیں کہہ سکا تھا، تم آئی، تم نے دیکھا اور مجھ ذی شاہ کو فتح کر لیا..... کیسی ذرا عالم ہو..... تم..... بغیر کوشش اور جتن کے فتح کر لیتی ہو..... مگر کیا اس خنبلی، خنبلی لڑکی نے کوشش نہیں کی تھی؟

سفید جالی دار مہین پردے کو دیکھتے ہوئے وہ چلتا، چلتا گلاس ونڈو میں آکھڑا ہوا تھا..... سلائیڈ ہٹائے بغیر اس نے ویس ہاؤس کی عمارت کو دیکھا تھا۔ منکشفے سامنے کہیں نہیں تھی اور اس کے بغیر جیسے ہر حسین منظر ادھورا تھا۔ کوئی بھی چیز قابل توجہ نہیں تھی۔ کچھ بھی نظر کو بھانے والا نہیں تھا..... کسی منظر میں اداس کوچنگ کے حسن جیسا سحر نہیں تھا۔ رستے خون آلود پیر والی اجنبی سی لڑکی ذی شاہ کے دل پر کیسا وار کر گئی تھی؟ یہ کون سا میٹھا درد جگا گئی تھی۔ وہ بے بس سا بستر پڑھے گیا تھا۔

جانے پھر کتنا وقت گزر گیا تھا، کمرے میں آہٹ ہوئی تو وہ چونکا تھا۔ افراہیم کی می اسے بلانے کے لیے، نیچے آنے کا کہہ کر واپس چلی گئی تھیں۔ لہجہ یقیناً تیار تھا مگر اسے اتنی بھوک نہیں تھی پھر بھی اخلاقی نیچے چلا آیا، کھانے کی میز پر ایل سے سامنا ہو ہی گیا تھا۔ وہ بڑی خوش باش سی بیٹھی تھی، کمرے میں گرما گرم پز کی مہک پھیلی ہوئی تھی اور وہ محترمہ دانت نکال، نکال کر پز کے بڑے، بڑے ٹکڑے ایل کی چٹنی میں بھگو، بھگو کر کھا رہی تھی، کچھ دیر پہلے والا غصہ ناراضی اور خنبلی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ بچوں کی ناراضی، خنبلی اور غصے کی مدت بس اتنی سی ہوتی ہے؟ ذرا سے لاڈ، پیار اور پچکار سے پہلے کی طرح سب بھلا کر ہشاش بشاش ہو جاتے ہیں، بچے جو من کے سچے ہوتے ہیں..... نیت کے صاف، من کے







تو کہ وفا

نیکر کے شفاف پانیوں پر جانے کس، کس کی کہانی بہہ رہی تھی۔ اور وہ کون، جی دار آدم زاد تھا جو نیکر کی گہرائیوں میں نڈر ہو کر اتر جاتا اور علی عیسیٰ کی مالا کے دور عروج کا صفحہ، صفحہ گیلے پانیوں سے نکال لاتا؟ آخر کون ایسا جی دار تھا جو نیکر کے پانیوں میں بے جھجک چھلانگ مارتا؟ آخر کون تھا جو مالا علی عیسیٰ کی زندگی کے وہ چھ حسین ترین اور... بدترین مہینے نیکر کی گہرائیوں سے نکال لاتا؟

سفید نائیلون کا جالی دار پردہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ذی شاہ کے دل پر جیسے اداسیوں کی اوس کرنے لگی تھی۔

”کیا وہ کبھی علی عیسیٰ تک پہنچ پائے گا؟“ کئی طرح کے سوالیہ نشان تھے۔ اور ہر طرح کی سوچیں تھیں..... اس کا ذہن ریشم کی گانٹھ بن گیا تھا۔ اتنے الجھاوے تھے اور سلجھتا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ جس چیز کو سوچتا، وہ اتنی ہی کٹھن، مشکل اور ناممکن لگتی تھی۔ بے خیالی میں پرفیوم اسپرے کر کے وہ نیچے چلا آیا تھا، آٹنی سامنے کہیں نہیں تھیں۔ ان کا بیڈ روم بند تھا۔ ذی شاہ کو بچکن میں سے ایمل کے زور، زور سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔

”ہائی اسکول میں چھٹیاں ہیں..... اب میں کیا کروں؟“ مٹی تو آئے دن لاڈلی بیٹی کے گھر بھاگ جاتی ہیں، مجھے اتنا بوری ہونا پڑتا ہے، ایک اتنا اچھا فرینڈ ملا تھا۔ جسے تم دفتر اپنے ساتھ لے جاؤ گے، میں پیچھے کیا کروں گی؟“ ایمل بچوں کی طرح ٹھنکتی بہت غصے میں نظر آرہی تھی۔ موضوع گفتگو ذی شاہ کی ذات تھی، وہ گلا گھٹکھارتا اندر آ گیا۔ اسے دیکھ کر ایمل کا منہ اور بھی اتر گیا تھا۔

”بن ٹھن کر آ چکے ہو..... اب صبح کے گئے منہ اٹھا کر رات کو آ جانا افرایم کی طرح۔“ وہ بھنا، بھنا کر ٹوسٹر سے سلاک نکال رہی تھی۔ افرایم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جسے وہ کمال مہارت سے چھپا گیا تھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں افرایم سے معاملہ پوچھا تھا جس کی وضاحت وہ محترمہ خود ہی کر رہی تھی۔

”ذی یہاں پہ فارغ رہنے نہیں آیا۔ نہ تمہاری بوریت دور کرنے آیا ہے، اس کا یہاں کام ہے، وہ

مزید یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا مگر افرایم اور اس کی مٹی نے اسے ہرگز بھی ریٹنٹ پہ جانے نہیں دینا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دن بعد پھر سے یہ ذکر چھیڑ کر آٹنی کو منائے گا۔ افرایم کے ماننے کی توقع اسے نہیں تھی۔ یہی سوچ کر وہ تھوڑا مطمئن ہو گیا تھا پھر افرایم نے جاتے ہوئے اسے یاد دہانی کروائی تھی۔

”7:30 پر تیار رہنا..... ہم ایک ساتھ دفتر کے لیے نکلیں گے۔“ وہ اسے ”گوتے ناخت“ (شام سے رات تک کا سلام) بول کر باہر نکل گیا تھا جبکہ ذی شاہ گہری سانس کھینچتا بستر پر ڈھے گیا۔ اس کا ذہن اب ہیرنچ کے ارد گرد چکر کھار رہا تھا۔

اگلی صبح جگمگاتے واش روم میں نہا کرتا زہ دم ہونے کے بعد اس نے پرفیوم کی بوتل اٹھائی اور غیر ارادی طور پر چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتا کھڑکی کے پاس آ گیا تھا۔ سفید جالی دار نائیلون کے مہین پر دے گی ڈوری کھینچ کر اس نے باہر نیکری صبح کی نوخیز سپیدی کو دیکھا تھا۔ نورج کا عالم ہی کچھ اور تھا..... برندوں کی خوش الحانی، آپس کی سحر طرازی، پھولوں کی گنگناہٹ، تیلیوں کا رقص اور راج ہنسون کی تقاریاں..... جیسے پورا عالم نٹائے الہی میں مشغول تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے دم بخود ہو گیا۔ دور کو ہستان آپس کا ملگجا سا دھندلا پہاڑی سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ جیسے نوکیلی پہاڑیوں پر سفید گھاس پھل رہی تھی اور دور کہیں دریائے نیکر سو گوار تاثرات کے ساتھ بہ رہا تھا۔ نیکر کے شفاف پانیوں میں ابھرتی، ڈوبتی، غم کھاتی، پچھاڑتی اور دھاڑتی مارتی یہ کہانی کس کی تھی؟

من ہانیم کے علی عیسیٰ کی یا پھولوں، کلیوں اور خوشبوؤں سے معطر، بیگی، مدہوش مالاک کی؟

پاکستان سے آنے والے مغرور چہرے، اکھڑ تاثرات اور کھلی پُرخور آنکھوں والے ذی شاہ کی یا پھر سڑکوں پہ دیوانہ وار بہتے پیروں کے ساتھ مدہوش انداز میں چلتی اس اداس کوچ کی؟ جو کسی انجان لمحے میں اپنی ڈار سے پچھڑ کر اب بھٹک رہی تھی۔

”سو فیصد..... یہ رہا ہیرنچ کا ایڈریس..... بڑی اچھی سا کھ رکھنے والی کمپنی ہے، مجھے خوشی ہے کہ اس کمپنی کی طرف سے تمہیں شراکت داری کا دعوتی خط ملا..... اس کے علاوہ یہاں کے نائب مالکان میں میرا بہنوئی بھی شامل ہے۔ وہ کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہے۔ تمہیں قطعاً پر اہم نہ ہوگی..... میں خود تمہیں ہیرنچ چھوڑ کر آؤں گا۔“ افرایم نے مسکراتے ہوئے تمام پروگرام خود ہی ترتیب دے لیا تھا تب ذی شاہ قدرے چونک گیا۔ وہ افرایم کو اپنے معاملات میں گھسا کر کسی مصیبت کا شکار کرنا نہیں چاہتا تھا..... پھر افرایم جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں صرف بزنس کرنے نہیں آیا۔ بلکہ کوئی پرانے حساب چکانے آیا ہے سو وہ کبھی نہیں چاہتا تھا افرایم اس کے پلان کو جان جائے۔ اس نے خود ہی افرایم کو منع کر دیا۔

”شکریہ دوست.....! ہیرنچ تک پہنچنا اب مشکل نہیں رہا۔ تم نے میری بہت ہیلپ کی، میرے لیے یہی کافی ہے۔“ اس نے خلوص دل کے ساتھ افرایم کا شکر یہ ادا کیا تھا جس پر وہ فوراً برامان گیا۔

”اب میرا موڈ خراب مت کرو۔“ افرایم نے خفگی سے کہا تھا تب وہ معذرت کرتا اسے پھر سے ناراض کر گیا۔ حالانکہ اس نے بات کا آغاز تو ڈرتے، ڈرتے ہی کیا تھا۔

”یار.....! اب میرے لیے کوئی کرائے کا کرا فلیٹ یا کوئی ہوٹل بھی بتا دو، میں اتنے دن بلکہ مہینوں کے لیے تمہارا مہمان بن کر ان ایزی فیل کروں گا۔“ اس نے بڑی لجاجت سے التجا کی تھی مگر اس کی توقع کے عین مطابق وہ برامان گیا تھا۔

”اب بکواس کی تو اس کھڑکی سے اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔“ افرایم کے تیور بگڑ گئے تھے۔ وہ اپنا سامنے لے کر رہ گیا۔

”یار..... پھر بھی۔“ ذی شاہ منمنایا۔

”رہن دے، کٹ کھائے گا میرے سے۔“ افرایم کی دھمکی پر وہ چپ سا کر گیا۔ حالانکہ وہ اب

گھر بھیجتے ہیں، انگ، انگ دکھ رہا ہوتا ہے۔“ افرایم اپنی جاب سے نالاں دوست سے بھی کچھ پشیمان تھا۔ وہ اسے وقت نہیں دے پارہا تھا۔ نہ کہیں تفریح کے لیے جا پایا تھا۔ بھی اسے بہت شرمندگی تھی۔ ذی شاہ سمجھتا تھا اسی لیے نارمل انداز میں سنجیدگی سے بولا۔

”آئی نو یار..... تم کیوں گلٹی فیل کرتے ہو.....“

میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں۔“ وہ بولے سے مسکرایا بھی تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے افرایم کو کچھ مطمئن کر دیا تھا۔ اور وہ نیکسٹ ویک اینڈ تک اپنی ساری مصروفیات کو ایک طرف رکھ کر ذی شاہ کو گھمانے کا کوئی پروگرام ترتیب دینا چاہتا تھا۔

”ہم سونٹاگ (سنڈے) کو ہائیڈل برگ جائیں گے، وہاں کا تاریخی قلعہ اور جرمنی کی قدیم ترین یونیورسٹی دیکھیں گے، جرمنی اتنا سبز ہے جیسے تمہارا سوات اور کاغان..... پورے جرمنی کا سحر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، تم جرمنی کے حسن میں ایسے پھنسو گے کہ کبھی نکل نہ پاؤ گے۔ چاہے عمریں گزریں یا صدیاں.....“ افرایم گھونٹ، گھونٹ کافی چڑھاتا اپنے جرمنی کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔ تب ذی شاہ لمحے بھر کے لیے اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔

”آہ..... پھنس تو میں گیا..... کہاں گئے میرے بودے دعوے..... میں یہاں کے سحر میں جتلا ہونے تو نہیں آیا..... اور اب پور، پور، گوڈے، گوڈے ڈوب چکا ہوں..... اگر افرایم کو پتا چلے کہ وہ خطی آنٹم میرے حواسوں پر سوار ہو چکا ہے تب یہ میرا ریکارڈ لگا دے گا۔“ ذی شاہ نے عجیب بے چارگی کے عالم میں سوچا تھا۔ جیسے اپنی بے بسی پر خود سے بھی خفا ہونے لگا تھا۔ ادھر افرایم جرمنی کی شان میں کلمات بول کر اب فائل کھولے اس کے حواس ٹھکانے پر لے آیا تھا۔ اس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی جو ذی شاہ سارا نشہ سارا عشق بھلائے اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

”تو کیا ہو گیا میرا کام.....؟“ ذی شاہ نے بے تابانی سے پوچھا تھا تب افرایم نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔



کاروبار کرنے آیا ہے۔“ افرایم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ بہت زچ لگ رہا تھا۔ ائیل یقیناً بہت دیر سے بحث کر رہی تھی۔

”میں کچھ نہیں جانتی، تم سارے لوگ ہی بڑے مصروف ہو، ایک میرا ہی وجود فارغ ہے۔“ اس نے جل بھن کر بالآخر ناشتے کی ٹیبل سجادی تھی۔ افرایم نے اسٹول کی طرف اشارہ کر کے ذی شاہ سے کہا۔

”اس کی تو عادت ہے، تم بیٹھ کے ناشتا کرو۔“

”آنٹی کہاں ہیں؟“ ذی شاہ نے آنٹی کو نہ پا کر پوچھا کیونکہ وہ ان دو تین دنوں میں اچھی طرح جان گیا تھا۔ آنٹی کو افرایم کے گھر جانا دیکھ کر ائیل اسی طرح... جبار خانہ تیور لیے سب پہ غصہ اتارتی تھی، ایک تو اسے کام کرنا پڑتا تھا، دوسرے اکیلے رہنا پڑتا۔ پھر آنٹی اسے افرایم کے گھر بھی نہیں لے کر جاتی تھیں۔ اس بات پہ اسے زیادہ غصہ آتا تھا۔

”افرایم کی طرف گئی ہیں، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں پار..... ائیل بچی ہے، جھجھی نہیں۔“ افرایم نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

”اور اس کا شوہر؟“ اس نے ایسے ہی بات برائے بات پوچھا تھا۔ کوئی خاص قسم کی ٹوہ یا جھس نہیں تھا۔

”بتایا تو ہے..... وہ ایک بہت بڑی کمپنی کا ایم ڈی ہے..... وہی ہیرنچ کمپنی کا..... تمہاری ملاقات ہوگی اس سے، بہت ناکس بندہ ہے..... میں نے اپنا ریفرنس نہیں دیا تم نے سختی سے منع جو کر رکھا ہے۔ ورنہ وہ خود یہاں آ کر تم سے مل لیتا۔“ افرایم اپنے بہنوئی کا بہت محبت سے ذکر کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں اپنے بہنوئی کے لیے واضح احترام تھا۔ اس کے دل میں جیسے ٹیس سی اٹھی تھی۔ اسی من ہائیم میں ذی شاہ کا بہنوئی بھی موجود تھا۔ اس کی بہن کا مجرم..... اس کی بہن کی خوشیوں کا قاتل..... وہ علی عیسیٰ کے بارے میں سوچتا تو اس کا خون کھول اٹھتا تھا۔ جیسے اب بھی گرما گرم خون رگوں میں جوش کھانے لگا تھا۔

جانے کیسے اس نے خود پر کنٹرول رکھا تھا پھر افرایم کے اٹھتے ہی وہ خود بھی اسٹول چھوڑ گیا تھا۔ اس کی بھوک، پیاس مٹ سی گئی تھی۔ وہ بچن سے باہر نکلا تو ائیل کی آواز سنائی دی تھی۔ ائیل جیسے خود کلامی کر رہی تھی۔

”بھائی صاحب تو بیگم کی پٹی سے لگے بیٹھے ہیں، اللہ کرے، میری بہن جلدی سے ٹھیک ہو جائے۔ میری بہن اتنی حسین ہے، اتنی..... اتنی..... اور اتنی۔“ وہ بازوؤں کو پھیلا کر فرط محبت سے بولی تھی۔ ذی شاہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ وہ ائیل کے دھوپ چھاؤں جیسے روٹے کا اب عادی ہو چکا تھا۔ پل میں روٹی، پل میں ہنستی، کبھی ہنسی، کبھی بگڑتی، وہ خوب موڈی لڑکی تھی۔ اپنے مزاج کے تابع رہتی..... بالکل بندیا کی طرح۔

☆☆☆

افرایم کی lexus شفاف چوڑی اور انتہائی شاندار سڑک پر بھاگ رہی تھی۔ یہ ایک معروف ترین شاہراہ تھی۔ ارد گرد اسٹور، بڑی، بڑی عمارتیں جن میں بینک، پلازے، سرکاری دفاتر وغیرہ شامل تھے۔ انہی میں ایک ہیرنچ فرم بھی انتہائی شاندار، بلند اور عظیم..... افرایم نے اسے ہیرنچ کا اردو ترجمہ کر کے بتایا تھا جس کے معنی تھے عظیم الشان..... وہ حقیقتاً glorious یعنی عظیم الشان تھی۔ ڈوئچ لینڈ (جرمنی) میں ایسی عمارتوں کا کال نہیں تھا..... مگر اس نے حیرانی یوں محسوس کی تھی کہ دراصل وہ ہیرنچ کا انتخاب اس وجہ سے کر سکا تھا کیونکہ اس فرم کا اور ایک مسلم تھا۔ دوسرے اوزر کے نام میں علی عیسیٰ کا نام بھی شامل تھا۔ یہ سب معلومات اس نے پاکستان میں ہی لے لی تھیں اگرچہ علی عیسیٰ کے نام سے من ہائیم کے کئی کاروباری اداروں کے اوزر کی فہرست سامنے آگئی تھی۔ مگر جانے اس کا دل ہیرنچ یہ کیوں آ کر رک سا گیا تھا۔ اب اسے کتنے فیصد کامیابی ہو سکتی تھی؟ یا پھر وہ اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچا بھی تھا یا نہیں، یہ صرف وقت بتا سکتا تھا۔

اس کی خواہش کے مطابق افرایم اسے بلڈنگ کے داخلی دروازے تک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ویسے بھی وہ

اپنے دفتر سے لیٹ ہو رہا تھا۔ اسے نیک تمناؤں سے رخصت کرتا وہ چلا گیا تب ذی شاہ دھڑکتے دل کے ساتھ گلاس ڈور کھولتا اندر آ گیا..... ایک وسیع و عریض چمکتے، دسکتے ہال میں، جس کے ایک طرف ریسپشن تھا..... گراؤنڈ فلور پہ بے شمار دفاتر تھے، جس میں سوئڈ بوٹڈ لوگ انتہائی مصروف نظر آ رہے تھے۔ اپنے اپنے کام میں مگن زیادہ لوگ مغربی تھے۔ اسے ارکان کمپنی کے دفتر جانا تھا۔ بورڈ آفس کا پوچھ کر وہ بذریعہ لفٹ دوسری اور پھر تیسری منزل پر آ گیا تھا۔ تھرڈ فلور پر برٹش آسٹریٹ، آسٹریٹین ورکرز کے کیمپن تھے۔ اسے فور تھ فلور پہ جانا پڑا..... ابھی آگے اور نہ جانے کتنے جہان باقی تھے۔

وہ کچھ، کچھ ستائشی نظروں سے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ پاکستان میں ڈیڑی کی فرم کے دفاتر بھی ایچھے تھے اور بلڈنگ بھی کمال کی تھی مگر اس کا ہیرنچ سے مقابلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس فرم کو ائیل کی زبان میں ڈائمنٹ (اڑیکٹو) کہہ سکتا تھا۔ بنا شور، آہٹ اور آوازیں نکالے بیاتے، نیجر، آفیسرز اپنے، اپنے کام میں مصروف تھے۔ کوئی بھی ایک دوسرے کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ یہ تھا ترقی یافتہ ملک کا ایک کاروباری ادارہ..... مالکان کی غیر موجودگی میں بھی تندہی سے کام جاری تھا۔ کہیں بھی کیمرے فٹ نہیں تھے۔ روک ٹوک، جھڑکیاں، بد نظمی یا ہنگامہ نہیں تھا۔

ریسپشن سے معلومات لے کر وہ ایم ڈی کے آئیبل (آفس) تک پہنچ ہی گیا تھا۔ یہ تھا مینجنگ ڈائریکٹر کا دفتر..... افرایم کے بہنوئی کا آفس..... اسے کچھ دیر کے لیے ویننگ روم میں بیٹھنا پڑا تھا۔ ایم ڈی فی الحال اپنے دفتر میں نہیں تھا، اسے ہنگامی طور پر باہر جانا پڑ گیا تھا۔ یورپ میں ہر کام وقت پر قاعدے اور اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ دس منٹ جلدی پہنچ گیا تھا، سو اسے دس منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔ ایم ڈی اپنے مقررہ وقت پر آفس پہنچ گیا۔

ذی شاہ کو اندر جانے کے لیے کہا گیا تھا۔ جب وہ انتہائی شاندار اور مہر آسائش خوابناک آفس میں پہنچا

ترک۔ وفا

تب اس کا استقبال تین لوگوں نے کیا تھا۔ ان میں سے افرایم کا بہنوئی کون تھا؟ شاید مرکزی کرسی پر بیٹھا ہوا انتہائی وجیہہ سا بندہ افرایم کا بہنوئی تھا۔ باقی دو لوگ انگریز تھے جو یقیناً افرایم کے بہنوئی نہیں ہو سکتے تھے۔ ذی شاہ بس اسی جوان کو دیکھ رہا تھا۔ جس نے اپنی سحر طراز آنکھوں پر گلاسز لگا رکھے تھے۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت جوان تھا۔ خوش پوشاک مگر بلا کا سنجیدہ..... اتنی خطرناک سنجیدگی کی ذی شاہ کو امید نہیں تھی۔ اس نے ذرا بھی نرمی، حلاوت یا جوش کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ کسی رو بوٹ کی طرح اس سے بات کرتا رہا۔ یہ ایک غیر رسمی میننگ تھی۔ باقاعدہ معاہدے کے تحت وکیلوں کی موجودگی میں حلفیہ بیان دیے گئے تھے۔ ایگری منٹ سائن ہوا۔ اس نے شیرز کی رقم کمپنی کے ذاتی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروادی تھی۔ ایم ڈی خاصا محتاط تھا یقیناً مرکزی کرسی پر بیٹھ کر اتنا ہی محتاط ہونا پڑتا تھا۔ وہ خود بھی ایک بزنس مین تھا اور کاروباری پیچیدگیوں کو سمجھتا تھا۔

اسے آکھنچ بیورو اور آکھنچ ریٹ کے متعلق ابتدائی انفارمیشن دے دی گئی تھی۔ ایم ڈی اپنے روز کی وضاحت کر رہا تھا۔ اسے فیبرک کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا۔ فیکٹری کس ایریا میں تھی، اسے یہ بھی بتایا گیا، وہ سائٹ پہ جاسکتا تھا۔ اس کے لیے مسٹر دان کی خدمات لینا تھی۔ کاروباری ماحول میں بات چیت مکمل ہو رہی تھی۔ ڈوئچ ایم ڈی بڑی رواں انگریزی میں اپنا نقطہ نظر واضح کر رہا تھا۔

اسے ایر لاؤپ نیس (licence) اور انشورنس کے لیے کیا کرنا تھا؟ اگلے دو منٹ میں بتا دیا گیا تھا۔ اپنے ”پاس“ کی ایک کاپی ذی شاہ نے ڈاکومنٹس کے ساتھ جمع کروادی تھی۔ اب نیکسٹ اسٹیپ اس کی پرفارمنس پر ڈیپنڈ کرنا تھا۔ اسے باقاعدگی کے ساتھ تین ہفتے تک آفس جوائن کرنے کی آفر کردی گئی تھی۔ تین ہفتے کی مدت وہی بکواس قسم کی ڈوئچ سیکھنے کی شرط تھی۔ یہاں زیادہ در کر ڈوئچ تھے۔ انگریزی قطعاً نہیں جانتے



تھے۔ سو ذی شاہ کے لیے ڈورچ سیکھنا ناگزیر تھا۔

میٹنگ کے اختتام پر مرکزی سیٹ پر بیٹھا جوان اٹھ کر رسمی انداز میں کسی مشین کی طرح نیک خواہشات کا اظہار کر کے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد مسٹروان نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا اور لچ کی آفر کر دی تھی۔ یقیناً یہ مہمان نوازی کی ایک کوشش تھی۔ مسٹروان ایک ہنس کھ، ہینڈسم جوان تھا۔ یہ کمپنی کا تیسرا ایم ڈی تھا۔ یعنی عہدوں کے لحاظ سے بالترتیب تیسرے نمبر پر تھا۔ وان بہت باتونی تھا۔ لچ کے دوران اسے بہت سی معلومات ملی تھیں۔ اس نے بتایا تھا، کمپنی کا پہلا ایم ڈی یہ تھا جس سے ابھی ذی شاہ کی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بھی دفتر نہیں آتا تھا، آج نہ جانے کیسے بہت مجبور کرنے پر آ گیا تھا۔ یہ اس فرم کا مالک بھی تھا مگر دفتری امور سے خود کو الگ رکھتا تھا۔ دوسرا ایم ڈی چھٹی پر تھا اور تیسرا ذی شاہ کے سامنے بیٹھا کھلنڈر اسٹا جوان تھا۔ تب اس نے حیران اور کچھ، کچھ متاثر ہو کر سوچا۔ ”بہت حیران کن، افرایم کا بہنوئی، بہت شاندار پرسنالٹی کا مالک ہے۔“ وہ بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ معا سے افرایم کے بہنوئی کا نام پوچھنے کا خیال آیا تھا۔ تب مسٹروان نے ہی بے پروائی سے ایم ڈی کا نام بتایا..... وہ ذی شاہ کے ڈاکومنٹس کو ترتیب دے رہا تھا۔ کچھ چونک کر سیدھا ہوا۔

”محمد علی عیسیٰ کریم (عیسائی) نہیں ہے۔ موسیٰ (مسلم) ہے۔“

☆☆☆

”محمد علی عیسیٰ؟ تو کیا یہ افرایم کا بہنوئی ہے؟“ وہ اتنا حیران ہوا کہ گھر واپس آ کر بھی اس کی حیرانی کم نہیں ہوئی تھی۔ جانے کیوں وہ اندر سے بہت مایوس ہوا تھا، جو کچھ وہ سوچ کر گیا تھا ایسا کچھ ہوا نہیں..... جیسے اندر سے وہ لمحے بھر کے لیے بچھ گیا تھا۔ آنکھوں کی چلیوں میں بس ایک ہی عکس ٹھہر گیا تھا۔ پورے ماحول پر چھایا فرم کا مالک، افرایم کا بہنوئی علی عیسیٰ۔

اسے افریشم پر در پردہ بہت رشک آیا تھا۔ اس

جہان میں کیسے، کیسے بلند بخت اور خوش نصیب لوگ تھے۔ اس کا دل بھر آیا۔ مالا کی بے رنگ، ویران اور اداس زندگی نے اس کی آنکھوں میں زخم بھر دیے تھے پھر جو طلاق کا بد نما داغ لگا تھا وہ علی عیسیٰ کے گریبان تک پہنچ کر اور اسے سزا دینے کے باوجود بھی دخل نہیں سکتا تھا۔

وہ مالا کے لیے جتنا بھی سوچتا، اسی قدر زخمی ہوتا..... ہیرنچ سے آ کر وہ ایسا بدل ہوا تھا کہ اگلی صبح تک باہر نہ آیا۔ تقریباً آدھی دوپہر کھسک گئی تب وہ نیچے آیا تھا یوں کہ پورا گھر..... بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ خاموشی جیسے محور قصاں تھی۔ آنٹی اور ایمل کہیں نہیں تھیں۔ وہ حیران ہوتا، ادھر ادھر جھانکنے لگا تھا۔ معا اس کی نظر ڈانٹنگ میز کی چکنی سطح پر پڑی تھی۔ اس نے گردن اچکا کر دیکھا، وہاں ایک چٹ پر لکھا تھا۔

”جب اٹھ جاؤ تو اوون کھولنے کی زحمت بھی کر لینا۔ تمہارا ناشتا وہیں رکھا ہے، میں اور می تو شاپنگ کے لیے نکلے ہیں۔“ ایمل صاحبہ کی تحریر پڑھ کر وہ مسکرا دیا تھا۔ پھر جو اس کی اس ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اوون کھولا تو سامنے ہی ایک ڈش میں چکن اینڈ گرین پیپر آلیٹ ڈھکا نظر آ گیا۔ وہ ٹوسٹر میں سلاٹس ڈالے بغیر ایک کانٹا اٹھا کر باہر آ گیا۔ آلیٹ اور جوس سے لطف اندوز ہوتا وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا جب افرایم کی اسے کال آئی تھی۔ بینک میں اس کا کوئی کام تھا، وہ وقت پر پہنچ نہیں سکتا تھا بھی ذی شاہ سے کہا تھا کہ وہ مقامی بینک سے اس کا مطلوبہ سامان لے آئے۔ شاید کچھ بے منٹ کا معاملہ تھا۔ ایڈریس سمجھ کر وہ بال ہاتھوں سے سنوارتا ہوا آ گیا تھا۔ یہ بینک زیادہ دور نہیں تھا۔ مگر پھر بھی اسے بس پکڑنا پڑی تھی۔ افرایم کا کام جاتے ہی ہو گیا تھا۔ قریب، قریب بارہ منٹ لگے تھے اور اب وہ واپس گھر آ رہا تھا۔ بس اسٹاپ یہ پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد مطلوبہ بس آ تو گئی تھی مگر مسافروں سے کچھ کچھ بھری تھی یعنی کوئی سیٹ نہیں تھی۔ مزید پندرہ منٹ انتظار میں نہ صرف ضائع ہوئے بلکہ

اسے غصہ بھی دلا گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک خوب صورت بلکہ حسین ترین دو شیزہ بھی اسٹاپ پر آ گئی۔ کیا کمال کی اللہ نے صورت بنائی تھی۔ اتنے نفیس اور حسین ترشے ہوئے نقوش تھے۔ چہرے پر بلا کی ملاحظت اور نزاکت تھی۔ بڑی، بڑی گہری آنکھیں..... ذی شاہ نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔ اگرچہ وہ کوئی حسن پرست بندہ نہیں تھا مگر خوب صورتی کے بری لگتی ہے؟ ذرا غور کرنے پر پتا چلا کہ محترمہ تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ چہرے پر انتظار کی کوفت رقم تھی۔ پھر ذی شاہ کی نظریں محسوس کر کے وہ کچھ سمٹ سی گئی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ بس آئی ہی نہیں۔ وہ لڑکی تنگ آ کر فٹ پاتھ پر چل پڑی۔ اب وہ لڑکی ہو کر نازک حالت کے باوجود پیدل چلنے کو ترجیح دے رہی تھی تب ذی شاہ کو بھی تھوڑی غیرت آ گئی۔ ویسے بھی گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ تو ایویں ہی بس کا سہارا لینے کھڑا ہو گیا تھا۔ اب اس لڑکی کے پیچھے چلنا قطعاً غیر مناسب حرکت تھی۔ محترمہ مشکوک ہو کر پولیس کو بھی بلوا سکتی تھیں۔ ویسے بھی اس کے بلوزے اور اسکرٹ کا ہم رنگ شوئڈر بیگ بھی موجود تھا جس میں ایک عدد موبائل تو یقینی طور پر پایا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی وہ کسی غیر اخلاقی حرکت کے باعث اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ دراصل اس کا رستہ ہی یہی تھا۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی کو پیچھے چھوڑے آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کی رفتار تیز تھی جبکہ لڑکی بہت سست روی سے چل رہی تھی۔

اگلے دس منٹ میں وہ گھر کے اندر تھا اور افرایم کو کال کرتے بتا رہا تھا۔

”تمہارا مال لے آیا ہوں۔“ اس نے پیکٹ احتیاط سے دراز میں ڈال دیا تھا پھر افرایم کا شکریہ سنے بغیر فون کھٹاک سے بند کر دیا۔ اب وہ فریج سے جوس کا کینا نکال لایا تھا۔ گھونٹ، گھونٹ جوس پیتے ہوئے جوں ہی اس کی نگاہ لاؤنج کے دروازے تک گئی گویا واپس پلٹنا ہی بھول گئی تھی۔ وہ ہکا بکا بوتل کو منہ سے لگائے کھڑا رہ گیا۔ اس لڑکی کے تاثرات بھی کم و بیش اسی

**تذکرہ وفا**

قسم کے تھے۔ ایک دم حیران، شاکڈ اور بے یقین۔ بس اسٹاپ پر کھڑا لڑکا اس کے گھر میں موجود تھا؟ کیوں؟ کیسے اور کس طرح.....؟ پھر جیسے اس کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا۔ اسے اچانک یاد آیا..... ”اچھا..... تو یہ وہ ہے؟ افرایم کا دوست.....“ ایک دم اس کے کئیے تاثرات بدل گئے تھے۔ اب وہ تھوڑی مطمئن سی صورت پر ڈھل گئی تھی۔ مسلسل چلنے کی وجہ سے اس کے پیر سوچ گئے تھے اور سانس پھول رہی تھی۔ وہ پانی پینا چاہتی تھی اسے پیاس لگی تھی مگر کچن تک جانے کی اب ہمت نہیں تھی۔ ذی شاہ اس کے تاثرات دیکھ کر کچھ، کچھ سمجھ رہا تھا۔ پھر جس طرح اس نے ذی شاہ کے ہاتھ میں موجود کین کو دیکھ کر حسرت محسوس کی تھی وہ فوراً سمجھ کر فریج میں سے جوس نکال لایا تھا۔ کوکونٹ جوس دیکھ کر لڑکی نے فوراً میز پر رکھ دیا۔

”مجھے لیموں یا سنگترے کا جوس دو۔“ وہ اپنے پیر دباتی یقیناً بہت تھک گئی تھی، ذی شاہ کو افسوس سا ہوا۔ اسے کیا ضرورت تھی چل کر آنے کی، بس کے آنے تک کا انتظار کر لیتی۔ وہ سنگترے کا جوس لے کر آداب میز بانی بجا لایا تھا۔ لڑکی نے جوس پی کر شکریہ ادا کیا..... پھر جیسے ہی اس کے حواس ٹھکانے آئے، وہ تفتیش کے موڈ میں نظر آ گئی تھی۔ ذی شاہ نے سوچا تھا اب یہی تفتیش بھگتنا پڑے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑے حل اور نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

”تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ دل لگ گیا؟“ اسی قسم کے بے ضرر سوال وہ پوچھ رہی تھی۔ جبکہ دل لگنے والا سوال تو اس کے دل میں بے ساختہ ٹھا کر کے گڑ گیا تھا۔ ظالم نے دل پر ہی ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منکشے کا چہرہ آ گیا۔ وہ آتے جاتے بھی آج کل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جانے وہ کہاں تھی؟ اس کا دل سکڑنے سنسنے لگا تھا۔ خیر، فی الوقت منکشے کا خیال جھٹک کر وہ سامنے موجود حسینہ کی طرف متوجہ تھا جو یقیناً افرایم کی بہن اور علی عیسیٰ کی بیوی تھی۔

”جی ہاں.....“ دل تو اچھی طرح لگ گیا۔ بلکہ



لگا ہی اب ہے، کم بخت کو پاکستان میں لگنا ہی نہ آیا..... اور لگا بھی کہاں۔ وہ اثبات میں جواب دیتا باقی کی بات سوچ رہا تھا پھر سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں افریشم ہوں، افرایشم کی بہن۔“ وہ اپنا تعارف کروا رہی تھی، نہ بھی کروانی تب وہ جان ہی چکا تھا۔

”میں جانتا ہوں۔“ اسے مسکراتا پڑا۔

”بس اسٹاپ پرتم ہی تھے ناں.....؟“ وہ جانتی بھی تھی پھر بھی پوچھ رہی تھی۔ شاید تصدیق کرنا چاہ رہی تھی۔

”میں ہی تھا..... آپ کو شک ہے کیا.....؟“ ذی شاہ سنجیدگی سے بولا تب وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔

”مجھے یوں لگا، میں نے پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے، خصوصاً تمہاری آنکھیں۔“ افریشم کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے وہ کسی کو یاد کرنے لگی تھی، جیسے کسی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔

”اچھا.....“ اب کہ ذی شاہ کچھ حیران ہوا تھا۔

”شاید تمہیں ایسا لگا ہو..... خیر، کچھ کھاؤ گی؟“ اسے پھر سے افریشم کی نازک حالت کا خیال آیا تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر آئی افریشم کے گھر چلی جانی تھیں اور پیچھے ایل کا منہ بن جاتا تھا۔

”نہیں شکریہ.....“ وہ بہ مشکل مسکرائی تھی تب ذی شاہ کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔

”تم آج کل کیا کرتے ہو؟“ افریشم کے سوال سے حیران کر رہے تھے۔ یعنی وہ گفتگو کو طول دینا چاہتی تھی پھر وہ خود ہی اس سے چیدہ، چیدہ سوال پوچھتی رہی تھی۔ کہاں سے ہو؟ پاکستان کے کس شہر سے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ فیملی کہاں ہے؟ شادی ہوئی یا نہیں کچھ ہی دیر میں وہ خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی اس کا پورا ڈیٹا معلوم کر چکی تھی۔ ویسے تو ذی شاہ اتنی جلدی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتا تھا مگر ایل اور افریشم میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ دونوں بہنیں بلا کی خوش مزاج، بے تکلف اور باتونی تھیں۔ اسے افریشم کی کمپنی بہت اچھی لگی تھی۔ بیچ میں ایک مرتبہ اس کے شوہر کا فون بھی آیا تھا۔ پھر اس نے شاید کسی ملازمہ کو ہدایت بھی دی تھی۔

”عیسیٰ کی طبیعت ٹھیک نہیں، میں سوچ بنا آئی ہوں، عیسیٰ اٹھے تو اسے سوپ دینا..... اور دیکھو، کچن میں گڑ بڑ نہیں ہونی چاہیے۔“ افریشم کے لہجے میں واضح دھمکی تھی۔ یقیناً وہ کسی میڈ سے مخاطب تھی اور اپنے شوہر کے لیے بہت تشکر بھی تھی۔

”میں می کی طرف آئی ہوں، کچھ دیر ہو جائے گی۔ تم کھانا کھا لینا تاہم عیسیٰ کو ڈسٹرب مت کرنا۔“ ذی شاہ بھی نہ لگاتا۔ شور عیسیٰ کو پسند نہیں۔“ افریشم نے کچھ اور ہدایات دے کر فون بند کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ ذی شاہ کو جیسے اس پر رشک آیا تھا۔ علی عیسیٰ کی بیوی..... خوش باش، خوش حال ہر کوئی اتنا بانصیب تو نہیں ہوتا؟ وہ یہی باتیں سوچتا اپنے کمرے میں آ گیا تھا جب اس کے موبائل کی بپ بجی تھی۔ فون بندیا کا تھا جو خاصی پرجوش لگ رہی تھی۔

”جرمنی سے ایک خط آیا ہے۔“ اس نے مارے مسرت کے چیختے ہوئے بتایا تھا۔

”اچھا..... تو کیا لکھا ہے خط میں؟“ وہ ذرا چونکتے ہوئے دیوار پر لگے کیلینڈر کو دیکھنے لگا۔ تاریخوں کے حساب سے بالکل ٹھیک وقت پر یہ خط پہنچ گیا تھا۔

”مالا کے نام ہے، اس کی خیریت پوچھی گئی ہے، ذی بھائی! کیا پتا یہ عیسیٰ نے خط بھیجا ہو؟ آخر جرمنی میں عیسیٰ کے علاوہ اور کون ہے؟“ بندیا کے جوش کی وجہ سے آتی تھی، ظاہر ہے، اس کے نزدیک ذی تو خط بھیج نہیں سکتا تھا کیونکہ فون پر جو بات ہو جاتی تھی پھر یہ خط بھلا کون بھیج سکتا تھا؟ یقیناً عیسیٰ ہی۔

”یہ خط میں نے لکھا ہے، مالا کے لیے۔“ اس نے بندیا کا سارا جوش پانی میں بہا ڈالا تھا۔ وہ جیسے اپنا سامنے لے کر رہ گئی تھی۔

”تم نے..... مگر کیوں؟“ اب کے بندیا نے بھی کچھ آواز میں پوچھا تھا۔ ساری خوشی جو ملیا میٹ ہو گئی تھی۔ وہ جو سمجھ رہی تھی۔ ذی بھائی کے جاتے ہی عیسیٰ کی طرف سے رسپانس آ گیا ہے۔ ایک دم بچھ کر رہ گئی تھی۔

”بس مجھے تم یہ بتاؤ کہ مالا نے کیا رد عمل ظاہر

کیا؟ وہ خوش ہوئی؟“ اس کا سوال نظر انداز کر کے ذی شاہ نے بے تابی سے پوچھا۔

”ہاں، بہت..... حد نہیں..... پھر رونے لگی، پھر بے ہوش ہو گئی۔ مگر ہوش میں آنے کے بعد بھی اس نے مجھ سے خط کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ بہت پرجوش تھی۔“ بندیا اب مالا کی کیفیات اور اس کے رد عمل کے متعلق بتا رہی تھی۔ ذی شاہ جیسے مطمئن ہو گیا تھا۔ گویا محنت وصول ہو گئی۔ اس نے اسی مقصد کے تحت تو مالا کو خط لکھا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مالا کے وجود پر چھایا جو دو ٹوٹا ہے یا نہیں.....؟ اس میں کوئی تبدیلی آئی یا نہیں؟ اور بندیا بتا رہی تھی کہ اس میں بہت تبدیلی آئی تھی۔ جانے کیوں ذی شاہ کو اپنی دونوں بہنوں سے بہت محبت تھی، مالا تو اپنی پیاری، پیاری عادتوں کے باعث دل سے بہت قریب تھی جبکہ تانبہ عرف بندیا بھی نہ کھٹ سی شرارتی ہونے کی وجہ سے اسے بہت پیاری تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے اپنی محبت بہنوں پر پہلے کبھی ظاہر نہیں کی تھی جو کہ اب خود بخود ظاہر ہو رہی تھی۔

”اور کیا دیکھا تم نے؟ مالا نے کچھ اور پوچھا؟“ وہ بڑے محتاط انداز میں بندیا سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں..... پوچھا بھی اور لفافے پہ لگے ٹکٹوں کو بڑی سنجیدگی سے دیکھتی رہی تھی۔ گویا تصدیق کر رہی تھی کہ جرمنی سے ہی خط آیا ہے ناں.....؟“ بندیا نے سابقہ جو شیلے لہجے میں بتایا تھا۔ ذی شاہ شانت ہو گیا تھا۔ گویا اس کو پہلی کامیابی نصیب ہوئی تھی، بندیا نے اسے بتایا کہ خط پڑھنے کے بعد مالا بولتی بھی رہی اور عیسیٰ کی باتیں بھی کرتی رہی۔ حالانکہ اس سے پہلے ان لوگوں کے سروں کی ٹھیکریاں اڑ گئی تھیں مگر وہ عیسیٰ کے متعلق کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ جیسے وہ ابھی تک شاک میں تھی کہ علی عیسیٰ نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا، کیا وہ اس سب کی حقدار تھی؟

”کیا، کیا باتیں ہوئیں؟“ ذی شاہ نے بے چینی سے پوچھا تھا۔ تب بندیا روانی میں کچھ بتاتے، بتاتے ایک دم جھینپ کر خاموش ہو گئی تھی۔ شاید بھائی سے

ترک وفا

شرم آ گئی تھی۔ بھلا وہ ذی شاہ کو عیسیٰ کی محبتوں کے متعلق کیسے بتاتی؟ مالا نے جو اتنے سال بعد قفل کھولا تھا، سو بہن سے کچھ بھی نہ چھپایا، عیسیٰ کی محبتوں کا ایک، ایک صفحہ کھول، کھول کر سنایا مگر جدائی کی گھڑیوں تک وہ تہنچ نہیں سکی تھی۔ بندیا خود بھی اس کو دور عروج میں ہی رکھنا چاہتی تھی۔ بھی مالا کے زوال کی طرف اس کا دھیان آنے نہیں دیتی تھی۔ ادھر بندیا کی خاموشی سے جیسے ذی شاہ خود بخود کچھ سمجھ گیا تھا۔ سو مزید سوال نہ کر سکا۔ بس اس نے بندیا سے یہ کہا۔

”تم مالا سے کسی طرح علی عیسیٰ کا حلیہ تو پوچھ لو..... اور اسے کہو، گھر کا ایڈریس بتائے یا پھر کوئی ایک آدھ تصویر علی عیسیٰ کی مجھے سینڈ کر دو.....“ وہ شدید مضطرب ہو گیا تھا۔ جیسے اس کے دل میں کچھ وسوسے سر ابھارے تھے۔ اس کی چھٹی حس کچھ ہنٹ دے رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا، ہیرنخ میں ملنے والا علی عیسیٰ ہی اس کی بہن مالا کا مجرم ہو سکتا ہے اور یہ افریشم اس کی بیوی تھی۔ ذی شاہ کی بہن کو برباد کر کے کیسی عالیشان زندگی گزار رہا تھا۔ اتنی حسین ہم سفر کی موجودگی میں اسے مالا کیا یاد آتی ہوگی؟ پھر اب بچہ بھی ہو رہا تھا۔ یعنی علی عیسیٰ کو سب کچھ مل گیا۔ پھر سے بیوی بھی مل گئی اور بچہ بھی..... جبکہ مالا کے حصے میں کیا آیا تھا؟ صرف ذلت.....؟ رسوائیاں؟ دکھ؟ آنسو؟ تم؟ کرب؟

ذی شاہ کے اندر باہر بھانہ بھنڑ جلنے لگے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ہر چیز کو آگ لگا دے... سڑک فی الوقت اسے ضبط کے مراحل سے گزرنا تھا۔ جب تک بندیا اسے عیسیٰ کی تصویر نہ بھیج دیتی..... یا اس کا حلیہ نہ بتا دیتی۔ کم از کم تب تک وہ منہ سے کچھ پھوٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی جلد بازی میں کوئی غلط قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ کوئی فضول اور چیپ حرکت کر کے افرایشم کی نگاہ سے گرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کیا خبر اس کے خدشے غلط ہوں؟ وہ علی عیسیٰ کوئی اور ہو.....؟ افریشم کا شوہر عیسیٰ اس کی بہن کا مجرم نہ ہو..... پھر بھلا وہ بغیر تصدیق کے افریشم کی



نرک وفا

تب ایک کمزور، نسوانی آواز سنائی دی تھی۔ اس کا دل لمحے بھر کے لیے آگے پیچھے ہوا تھا۔ یہ آواز منکشی کی تھی۔  
 ”دائیں سمت گلاس وال کے قریب کارز ہیلف پہ لیپ رکھا ہے۔“ وہ اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ گویا اندھیرے میں بھی وہ ذی شاہ کی آواز پہچان چکی تھی۔ اس کی خوشی اور غرور کے لیے یہی کافی تھا۔ وہ تو جیسے نہال ہی ہو گیا۔ لمحے بھر میں یہاں آنے کا فیصلہ درست لگنے لگا تھا مگر یہ اندھیرا، بے ترتیبی، گھٹن، جگہ جگہ بکھرا سامان، یہ لڑکی اتنی گندی، بے ترتیب اور بے حس تھی؟ اسے گندگی، غلاظت اور گھٹن سے الجھن نہیں ہوئی تھی؟ وہ مزید بھی شاید کچھ سوچ لیتا مگر منکشی کی آواز نے اسے ایک مرتبہ پھر نہال کر دیا تھا۔  
 ”ذی شاہ.....! اب آپکے ہو تو اندھیرے سے مانوس ہونے مت کھڑے ہو۔ یہ اندھیرے صرف میرے لیے ہیں۔ ان میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔“ وہ بھیگی آواز میں بول رہی تھی۔ ذی شاہ تو اسی بات پر سرشار ہو گیا تھا کہ اسے ابھی تک اس کا نام یاد تھا۔ یقیناً وہ نہیں جانتا تھا کہ سامنے یا آس پاس موجود لڑکی کی... یادداشت غضب کی تیز تھی۔ اس کے قریب کوئی گلا کھنکھار کے گزر جاتا تو وہ بنا دیکھے اس شخص کی آواز سے اسے پہچان سکتی تھی چاہے وہ آدمی دس سال بعد اس کے قریب سے گلا کھنکھار کے گزرتا۔ وہ قیامت کا ذہن رکھنے والی لڑکی تھی مگر اب اسے بہت سی باتیں بھولنے لگی تھیں۔  
 وہ جیسے سانس روکے محض منکشی کو محسوس کر رہا تھا وہ روشنی میں اس اندھیرے کا طلسم توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ روشنی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ منکشی کی سانسیوں کا ردھم سن رہا تھا۔ دل بے تاب کی نہ جانے کیا حالت تھی! کوئی اس پل ذی شاہ کے اندر اتر کر تو دیکھ لیتا۔  
 ”ذی شاہ! سنتے نہیں ہو؟“ منکشی جیسے تھک کر بول رہی تھی۔ وہ لمحے بھر میں ٹھنک سا گیا۔  
 ”منکشی! تم کہاں ہو؟“ ذی شاہ بے تابی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ جیسے نٹول، نٹول کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

ولیں ہاؤس پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم ٹھنک گیا تھا۔ اندھیرے میں ڈوبا سفید مکان، آس پاس سبزے کے جھنڈے بے ترتیب کھر دردی شاخیں، پھولوں کے خوفناک مکٹ، جو اندھیرے میں خاصے بھیا نک لگ رہے تھے۔  
 اس نے انگلیوں پر حساب کیا تھا، پورے تین دن گزر چکے تھے، منکشی دوبارہ دکھائی نہیں دی تھی۔۔۔ وہ سوچے سمجھے کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر لاؤنج کے یاہل کے داخلی دروازے پر رک سا گیا۔ اس نے آس پاس گھنٹی تلاشنا چاہی تھی مگر گھنٹی کہیں نہیں تھی۔  
 اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھلتا چلا گیا تھا۔ ”اوہ میرے اللہ..... ایسی بے پروائی.....“ کھلے دروازے کو دیکھ کر اسے اچھٹا ہوا تھا۔ پھر جیسے وہ آگے بڑھتا گیا، مگر یہ کیا؟ جگہ جگہ رکاوٹیں تھیں..... اسٹول، کرسیاں، بے ترتیب اندھی پڑی تھیں۔ گیلری میں کیزن (ٹیکے) چادریں، کمبل فرش پر گرے پڑے تھے، کچھ آگے بڑھنے پر اس کے قدموں تلے رکابیاں اور جھجے بھی آنے لگے۔ وہ بیچ بچا کر آگے بڑھا تو زور دار ٹھوکر لگی تھی، یہ کوئی کانچ کا گلاس تھا جوڑھلکتا ہوا نہ جانے کس طرف کھسک گیا تھا۔ پورا گھر بھلا، بھلا کر رہا تھا۔ اتنی خاموشی اور سناٹا تھا جیسے وہ کسی غار میں غلطی سے گھس آیا تھا۔  
 ”اللہ اکبر..... کیا یہاں انسان نہیں بستے؟“ اس نے بیرونی سنانے سے گھبرا کر اونچی آواز میں کہا تھا۔ اسے اپنی ہی آواز کانوں میں گونجتی سنائی دے رہی تھی۔ ہال، گیلری اور یہ شاید سنگ روم تھا۔ وہ کچھ آگے بڑھا، اب سامنے پورچین طرز کا ہی کچن نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف گھٹن ہی گھٹن تھی۔ ملگجاسا اندھیرا اب گہرے اندھیرے میں بدل گیا تھا۔ ذی شاہ تو جیسے اک جادوگری میں آکر پھنسا رہا تھا۔ وہ کیونکر یہاں چلا آیا؟ پھر جیسے گھبراہٹ نے اس کے دل پر نیچہ مار دیا تھا۔ اتنا اندھیرا تھا کہ حد نہیں..... اس نے آگے بڑھ کر انداز سے سے سوچ بورڈ تلاش کرنے شروع کر دیے تھے۔

اپنا وقت ضائع کرتا رہوں گا۔ یاد رکھنا، یہ سوالات بہت ضروری ہیں۔ انہی کی بدولت میں علی عیسیٰ تک پہنچا پاؤں گا۔“ ذی شاہ کا لہجہ بلا کا سنجیدہ اور دھیما ہو گیا تھا۔ دوسری طرف بندیا ہمد تن گوش تھی۔ اور بہت دھیان سے اسے سن رہی تھی۔  
 ”تم فکر مت کرو بھائی! میں مالا سے باتوں باتوں کے دوران پوچھ لوں گی..... اب وہ زیادہ درجہ چپ نہیں رہتی۔ بولتی بھی ہے اور می کے قریب سے ہنسی بھی نہیں۔ می کا خیال بھی وہی زیادہ رکھتی ہے۔ اس میں تبدیلی آ رہی ہے۔ وہ صدے کے اثر سے نکل رہی ہے۔“ بندیا نے جیسے اس کے اندر بھتی امید کو زندہ کر دیا تھا۔ وہ جیسے پھر سے پُر امید ہو گیا۔  
 ”یہ خوش آئند عمل ہے۔“ اس نے جوش کا مظاہرہ کیا۔  
 ”ہاں، می بھی حیران اور خوش ہیں۔“ بندیا خوش دلی سے بتانے لگی۔  
 ”تم خیال رکھنا می اور مالا کا..... اور زیادہ سے زیادہ مالا کو وقت دینا، دیکھو، اسے تہامت چھوڑنا کسی بھی وقت کسی بھی لمحے۔“ وہ ہدایات دیتا رہا۔ بندیا سے بات کر کے وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ آج کی رات اسے بہت اطمینان سے نیند آ سکتی تھی۔ مالا کے اندر ہونے والی تبدیلی بہت خوشگوار تھی۔ وہ بدل رہی تھی۔ صدے کے اثر سے نکل رہی تھی۔ حقیقت کو قبول کر رہی تھی۔ ذہن کے جالوں کو صاف کر رہی تھی۔ مہند سے نکل رہی تھی۔  
 ☆☆☆  
 وہ واک کے لیے اکیلا ہی باہر نکلا تھا، کچھ دیر بعد ایمل بھی آگئی تھی پھر وہ لہاراؤنڈ لے کر ایسی تھکی کہ بھاگ کر واپس گھر میں چلی گئی۔ ذی شاہ البتہ فٹ پاتھ پر چلتا ڈوبتے سوچ کا سنہرا زعفرانی پن دیکھ رہا تھا۔ بھلا اس منظر سے بڑھ کر بھی کچھ حسین ہو سکتا تھا؟ ڈوبتا ہوا سورج اور زعفرانی تاروں کا بکھرا جال..... زمین جیسے سونے میں بھیگ رہی تھی۔

ازدواجی زندگی میں کوئی شعلہ بھڑکا دیتا؟ اس کے شوہر پر الزام لگاتا، اسے اپنی بہن کا بنا تصدیق کیے مجرم ٹھہراتا تو یقینی طور پر... افریقہ کی زندگی بری طرح متاثر ہو جاتی..... کیا خبر اس کا گھر ٹوٹ جاتا؟ وہ دوبارہ اپنے شوہر پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ اگر افریقہ شرم کی زندگی اس کی وجہ سے خراب ہوتی تو کیا افریقہ، ذی شاہ کو معاف کر سکتا تھا؟ اس کی بہن اجڑ کر گھر آ جاتی؟ کچھ بھی متوقع تھا، کچھ بھی ہو سکتا تھا؟ سو ذی شاہ کو ہر قدم پھونک، پھونک کر اٹھانا تھا۔ تول، تول کر بولنا تھا اور سوچ سمجھ کر چلنا تھا۔ اس کا کوئی بھی انتہائی قدم بہت سارے لوگوں کی زندگیاں تباہ کر سکتا تھا۔ اور وہ اتنا سنگدل، خود غرض یا مطلبی نہیں تھا کہ اپنے دوست کے گھرانے کو انجانے میں بھی ذرا سی ٹھیس پہنچا دیتا۔  
 سوچوں کے تار نہ جانے اسے کہاں تک لے جاتے جب ہوا کے دوش پر لہراتی بندیا کی آواز اسے حال کی دنیا میں واپس اٹھالائی تھی۔  
 ”کہاں چلے گئے؟ ہیلو..... ہیلو۔“ بندیا نے.... بے تابی سے کہا تھا تب وہ بے ساختہ چونک گیا۔  
 ”آں..... ہاں..... ہمیں ہوں.....“ ذی شاہ جیسے گڑ بڑا گیا تھا پھر کچھ سوچتے ہوئے بندیا کو ذرا کام کی باتیں سمجھانے لگا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ پاکستان سے علی عیسیٰ کے متعلق تمام کوائف جمع کر کے لاتا مگر تب مالا کچھ بتاتی نہیں تھی۔ اب جو اس نے لبوں کا قفل توڑا ہی تھا تو ذی شاہ، بندیا کو مزید ایک سوال نامہ تمہارا تھا۔ یہ بہت ضروری قسم کی ہدایات تھیں۔  
 ”سنو بندیا.....! تم نے اب... مالا سے کیا، کیا سوالات کرنے ہیں..... ان کو بھی ابھی سے اپنے ذہن میں ترتیب دے لو۔ تم مالا سے پوچھو، عیسیٰ کی پسندیدہ کوئی ایسی چیز جس کے بغیر اس کا رہنا مشکل ہو، اس کی پسندنا پسند، اس کا مزاج، عادتیں، اس کے دفتر کا اتا پتا..... یا کوئی ایسی جگہ جہاں وہ کثرت سے جانا پسند کرتا ہو؟ مجھے کچھ ہنٹ چاہیے۔ کچھ ٹھوس ثبوت چاہیے۔ ورنہ میں یہاں اندھیرے میں ٹانک ٹونیاں مارتا بس



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شکار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے  
 ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں  
 ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کم ذی شاہ کسی روتی ہوئی عورت کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اور پھر وہ عورت جو اپنے تمام تر بے ڈھنگے پن، گندگی اور بے حسی کے باوجود اس کے حواسوں پر چھا چکی تھی۔ بھلا اسے کیسے روتے دیکھ سکتا تھا؟ وہ اندازے سے چلتا گلاں وال ٹولنے لگا۔ پھر اسے جلد ہی لیمپ کا بنن نظر آ گیا تھا۔ لیمپ تک پہنچنے کے دوران نہ جانے کتنی ہی چھوٹی، چھوٹی چیزیں اس کے پیروں سے ٹکرانی تھیں۔ تاہم وہ لیمپ کا بنن آن کر ہی چکا تھا۔ ایک بنن دبانے سے پورا لاؤنج روشنی سے بھر گیا تھا۔ زرد مگر آنکھوں، چہروں اور چیزوں کو واضح کرتی روشنی..... جیسے گھر کی ایک، ایک الٹی پٹی پڑی چیز دکھائی دینے لگی تھی۔ گندے کپڑوں کے ڈھیر، میلی جرابیں، جوتے، چپلوں کا ایک پہاڑ صوفے کے قریب پڑا تھا۔ دوسرے صوفے پر میلے ملبوسات کی گٹھڑی رکھی تھی جس سے کپڑے ابل، ابل کر باہر گر رہے تھے۔ یہ کرا ڈانگ روم تھا۔ اس سے آگے کھلا کچن جو تھوڑا اونچا بنایا گیا تھا۔ چار پانچ اسٹیپ چڑھ کر کچن میں داخل ہوتے تھے اور وہ تیسرے پریٹی تھی اور جیسے ریگ کر کوڑے کے مانند اوپر جا رہی تھی۔ اسے شاید کچن تک جانا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی خالی بوتل تھی، جس میں ایک آدھ قطرہ یقیناً پانی کا موجود تھا۔ وہ ڈھکن کھول کر بے تابی سے پانی کا ایک قطرہ زبان پر پھینکنے لگی۔ ذی شاہ جیسے دنگ رہ گیا تھا۔ وہ شدید پیاسی تھی اور پانی کے لیے شاید مر رہی تھی۔ فی الوقت وہ ذی شاہ کی موجودگی بھلائے اپنے خشک روکھے، حلق کو تر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی خاموشی سے ذی شاہ سمجھ گیا تھا۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ چڑی زدہ خشک ہونٹ، قحط زدہ سی شکل، نحیف کمزور بے جان ہوتا وجود..... بکھرے، الجھے گندے پال..... جانے وہ کب سے بالوں کو گندار کھے ہوئے تھی۔ جوڑے کی شکل میں الجھے بالوں کا گولا گردن سے لٹک رہا تھا۔ وہ مورگن روک (رات کے چوٹے) میں ملبوس تھی، شاید پنک کمر کا ڈریسنگ گاؤن تھا جو فی الحال اپنی اصلی رنگت کھو چکا

”میں یہاں..... وہاں، کہاں، جہاں..... جہاں تم محسوس کرو، میں وہیں موجود ہوں گی۔“ آواز میں بوجھل پن اور قیامت کی اداسی اتر آئی تھی۔ ذی شاہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پایا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں غضب کا تلاطم تھا۔ ہر دھڑکن بڑے ترنگ کے عالم میں کچھ انوکھا راز منکشف کر رہی تھی۔

”میں تو یہاں، وہاں، ہوں تمہارے دل میں ہر جگہ، ہر کونے میں۔“ کوئی اس کے اندر بڑے جذب کے ساتھ بکارتا تھا۔ اس پکار پہ ذی شاہ کے لبوں پر جیسے مسکراہٹ آ گئی تھی۔

”ہاں، تم یہاں ہو۔“ اس کا روم، روم بکارتا تھا، اس نے اپنے مقام دل پر ہاتھ رکھا۔ منکشف جیسے اپنی جگہ پہنچ گئی تھی۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ ادھر دیوانگی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ وہ جیسے دیوانوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی تھی۔ اسے روشنی چاہیے تھی مگر روشنی کہاں تھی۔

”ذی شاہ! سامنے آؤ ناں.....“ اس التجاہ وہ فنا نہ ہو جاتا..... ذی شاہ کے اندر باہر روشنیاں بھر گئی تھیں۔ اب بیرونی اندھیرے کیا معنی رکھتے تھے؟ سفر محبت میں وہ تنہا کہاں تھا؟ یہ گندی سندی خبیثی سی لڑکی بھی تو اس کے ہمراہ تھی۔ وہ بھی تو پہلی نظر کے عشق میں گرفتار ہونے والی تھی۔ وہ بھی تو بنا سوچے عشق کے پل صراط پر چلنے والی تھی۔ جیسے کچھ پل کے لیے قیامت خیز سی خاموشی ماحول پر چھا گئی تھی۔ پھر کوئی ٹوٹے لہجے میں آرزوگی سے بولا تھا۔

”ہر دفعہ میرے لیے امتحان بن جاتے ہو۔ سامنے ہو کر بھی سامنے نہیں آتے۔ میں سایوں اور خوابوں میں تمہیں تلاش کر کے تھک چکی ہوں۔ تم ایسے الوٹرن ہو جو میرے دل کا ناسور بن گئے۔“ وہ کسی دیوار سے ٹیک لگائے بے آواز رو رہی تھی اور ذی شاہ سے اس کی آواز میں گھلے آنسوؤں کی اذیت محسوس نہ کی گئی پھر بھی جیسے اس کا دل مٹھی میں آ رہا تھا۔ ہاں، عورت کے آنسو دیکھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے، کم از



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ترک و ہفا

سکتا ہے؟ اللہ نے خاندان، رشتے، بہن، بھائی، ماں، باپ، عزیز واقارب اور دوست وغیرہ اسی لیے تو بنائے ہیں تاکہ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ ایک دوسرے کے کام آسکیں۔

”دکھ اور سکھ میں۔“ وہ جیسے زیر لب بڑبڑایا تھا۔ اسی دکھ کی سانچھ بنائی گئی ہے تاکہ آدمی تنہا سسک، سسک کر مر نہ جائے۔ کوئی تو ہو جو دو یونہی پانی ہی حلق میں پٹکا دے، ماں، باپ، بہن، بھائی، اولاد، دوست، شوہر، اللہ نے ہر انسان کو بے شمار رشتوں سے نوازا ہے اور پھر بھی اس کروڑوں، اربوں، کھربوں لوگوں کی دنیا میں کوئی بد نصیب منکسے جیسا اکیلا بھی ہوتا ہے۔ جس کے دکھ اور سکھ کی سانچھ کرنے والا کوئی نہیں جو اسے دو یونہی پانی ہی پلا دے۔ کوئی انسان اتنا بھی فلاں نہیں ہوتا کہ اس کے پاس کوئی رشتہ ہی نہ ہو؟ کیا خبر منکسے کے پاس رشتوں کی قلت ہو مگر کوئی دوست، عزیز ملنے ملانے والا بھی نہیں تھا؟ جو اس کی بیماری کے دنوں میں مدد کروتا؟ حتیٰ کہ کوئی پڑوسی ہی..... ذی شاہ جیسے دم بخود سوچ رہا تھا۔ ہکا بکا اور متحیر..... بے چین اور مضطرب سا..... اور وہ نڈھال سی لڑکی جیسے اس کی سوچ میں اتر گئی تھی۔

”میرا کوئی بھی نہیں..... میں تنہا ہوں، لاوارث ہوں، میرا کوئی وارث نہیں۔“ وہ میز کی گرد آلود سطح پر سر رکھے پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔ تب ذی شاہ نے بے قراری سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ منکسے کا کڑانا اس سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ اس کا دل سیال بن کر منکسے کے آنسوؤں میں بہ رہا تھا۔ وہ جیسے بے بس ہو گیا۔

”تمہارے ماں، باپ.....؟“ اس نے منکسے کے سر پر ہاتھ پھیرا..... اس کے بال گرد میں لتھڑے تھے جیسے سالوں سے انہیں شیونیں کیا گیا تھا۔ وہ اپنی اصلی اور حقیقی رنگت کھور ہے تھے۔

”نہیں ہیں۔“ وہ تڑپ، تڑپ کر رو رہی تھی۔

”بہن، بھائی.....؟“ اس کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ جیسے کسی غبار میں جکڑ گیا تھا..... جیسے کسی بھاری سل

تھا۔ اپنی تمام تر گندگی کے باوجود وہ بلا کے ساحر ترین نقوش رکھنے والی لڑکی تھی۔ خصوصاً اس کی اندر تک اتر جانے والی لانی گہری آنکھیں، سفید بے داغ رنگت..... وہ مغربی عورتوں والی سفید گلابی جعلی نمارنگت نہیں رکھتی تھی بلکہ بے انتہا کشش بھی تھی۔ ترشی ہوئی مغرور سی ناک، بھرے بھرے تراشیدہ ہونٹ..... خوب صورت چہرہ مگر انتہائی اذیت سے پُر۔ ذی شاہ نے بے تابی سے اس کا پیر دیکھا تھا جس کی بینڈ تاج تبدیل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی تھی۔ خون سے چٹی خشک اور اکڑ چکی تھی تو کیا اس نے دوبارہ بینڈ تاج نہیں کروائی؟ وہ جلنے پھرنے سے قاصر تھی اور ضرورت کے لیے فرش پر رہتی تھی۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ وہ کس قدر اذیت اور تکلیف میں تھی اس کی بے بسی، درد اور اذیت نے ذی شاہ کی آنکھوں میں نمی بھر دی تھی۔

”انسان اتنا بے بس ہو جاتا ہے؟“ وہ اسے ریگ کر فریج تک جاتے دیکھ رہا تھا پھر جیسے وہ ہوش میں آ کر منکسے کی طرف لپکا تھا۔ لمحے کے ہزاروں حصے میں وہ فریج تک پہنچ گیا تھا پھر اسے وہیں روک دیا اور سہارا دے کر اسٹول پر بٹھایا اور فریج کھول کر اندر سے جائزہ لیا..... مگر یہ کیا.....؟ فریج بھاں، بھاں کر رہا تھا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک پانی کی بوتل تک نہیں تو کجا کوئی کھانے کی چیز وہ حیران ہوتا ترک کر کے نکلے تک آیا..... گلاس میں پانی بھر کے دوبارہ اس کے لبوں سے لگا رہا تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس چڑھا گئی تھی پھر منکسے نے اور پانی مانگا۔ کم از کم چار گلاس پانی پی کر جیسے وہ سر تھامے میز پر ڈھے گئی تھی۔ نہ جانے وہ کب سے پیاسی تھی؟ چلنے پھرنے سے معذور ہونے کے باعث پیاس سے نڈھال پڑی تھی اور جب پانی کے بغیر نہ رہا گیا تو وہ ریگ، ریگ کر پانی لینے چلی گئی۔ انسان اپنے خاندان اور گھر بار والوں کے بغیر کیسے ہوتا ہے؟ اگر بیمار پڑ جائے تو تنہائی میں رہنے والا کلوڑا بن جاتا ہے۔ انسان لوگوں کے بغیر تنہا کیسے رہ





ترک وفا

نہیں جا رہا.....“ وہ میز پر سر رکھے نیم جاں سی ہو گئی تھی، ذی شاہ کا سر گھوم گیا تھا۔

”تین دن سے بھوکی.....؟“ وہ جیسے خود پر لعنت بھیجتا کیبنٹ دھڑ دھڑ کھولنے لگا۔ وہ تین دن سے بھوکی تھی، فریح خالی پڑا تھا۔ گھر میں کچھ تھا نہیں، وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھی، شاید کل وہ رینگ رینگ کر سڑک تک گئی ہوگی اسی امید پر کہ شاید ذی شاہ اسے دیکھ لے

تھی۔ وہ تو بڑی عجیب ترین کہاوٹ سنار ہی تھی۔

اس نے ذی شاہ کو کہاں دیکھا؟ شاید سامنے والے گھر میں کہیں آتے جاتے؟ وہ اس بحث یا گہرائی میں نہیں پڑا تھا۔ اس نے سوال اور نکتے نہیں اٹھائے تھے۔ اس کی خوشی، فخر اور انبساط کے لیے اتنا ہی کافی تھا، سزجبت میں وہ اکیلا نہیں، ڈار سے چھڑی یہ کوچنگ اس کے ہمراہ تھی۔ وہ اسی بات پر جیسے دل بادشاہ کے سامنے تعظیماً جھکا ہوا تھا۔

”میں حیران ہوں، تم میرے سامنے مجسم بیٹھے ہو پھر بھی بے یقینی ختم نہیں ہوتی۔“ اب وہ خود سے ہی مسکراتی تھی۔ بڑی حیران کر دینے والی مسکراہٹ تھی پھر وہ حیران کیسے نہ ہوتا۔

”میری منزل کہیں نہیں تھی، رستہ انجانا تھا، میں پھر بھی بھاگتی رہی، اندھا دھند، بنا رستوں کی کٹھانیاں دیکھے..... آبلے پیروں میں بڑے۔ پاؤں فگار ہوئے، آنکھیں پھوٹیں، رشتے ٹوٹے مگر میں پھر بھی نہ رکی۔ کتنی اجنبی میں، انجانے رستوں پہ بھاگتی رہی، اس بات سے بے خبر کہ اوپر تدبیر کرنے والا منزل کو اپنے وقت پر میرے سامنے لاکھڑا کرے گا مگر میں انجان تھی، سمجھ ہی نہیں پاتی۔ اپنے طور پر تدبیر کی تو وہی تدبیر میرے منہ پر الٹ دی گئی۔“ وہ ہنستے، ہنستے پھر سے رونے لگی تھی۔

”نہیں اسے اب رونا نہیں، بالکل نہیں..... یا اللہ بس یہ چپ کر جائے۔“ اس کا دل پھر سے... گڑگڑانے لگا تھا۔ پھر جیسے وہ خود ہی چپ کر گئی تھی۔ شاید رونے نے اس کو ٹھہرا لیا تھا۔ اس کی پوری طاقت جیسے نچر گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے غبار چھانے لگا۔ ذی شاہ گھبرا گیا تھا۔ اس نے منکسے کا کندھا ہلایا۔

”کیا پانی چاہیے؟“ وہ بھاگ کر گلاس پھر سے بھرنے لگا تھا۔ منکسے ایک دو تین اور پھر چوتھا گلاس بھی پئی گئی پھر اس نے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے کہا۔

”ادھر میرے کمرے میں یا لاؤنج میں یا پھر ادھر کیبنٹ میں کوئی بسکٹ، نمکویا کچھ کھانے کی چیز ڈھونڈ دو، میں تین دن سے بھوکی ہوں..... مجھ سے بولا

”اللہ یہ پاگل تو نہیں؟ یقیناً افرایم نے ٹھیک کہا تھا، یہ پاگل ہے، بھلا میری اور اس کی ملاقات کب ہوئی؟ کبھی نہیں، گنتی کے چند دن پہلے تو میں نے اسے دیکھا ہے اور اس نے مجھے تو پھر یہ جنم، جنم کی باتیں؟“

”میں پاگل نہیں.....“ منکسے بنا اس کی طرف دیکھے جیسے ذی شاہ کی سوچ پڑھ رہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر دم بخود رہ گیا تھا۔

”تم حیران ہو رہے ہو۔ اور سمجھ رہے ہو میں پاگل ہوں، ایسا کچھ بھی نہیں، کاش میں پاگل ہو جاتی..... مگر یہ ممکن نہیں..... میری سزا میرے حواس ہیں جو میرا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں گے..... چلو اس بات کو جانے دو..... میں تمہیں اپنی محبت کا بتاتی ہوں، تمہاری محبت میرے لیے پوائزن کے مانند ہے، اس نے مجھے بیٹھا بنانے کے بجائے زہریلا کر دیا۔“ وہ اونچی آواز میں پھر سے رونے لگی تھی۔

”یہ میری زندگی کا بہت بھیانک سچ ہے۔“ اس نے رونا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ تو اندر کے میل کیل، غلاظتوں اور کٹافوں کو بہا رہی تھی پھر کیسے رونا ترک کر دیتی؟

”کیا یہ بھی سچ ہے؟ کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟“ وہ سراپا سوال بن گیا تھا۔ سامنے بیٹھی عجیب لڑکی نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ ابھی بچھلے ایک سو پینتالیس گھنٹوں میں وہ یہ سوچتا رہا تھا وہ اس خطی آنکھ سے کبھی اظہار محبت کر بھی سکے گا؟ اور کیا وہ اس کی محبت پہ یقین کرے گی؟ اور اس کی سوچوں، وسوسوں، خدشوں سے الگ یہاں سب کچھ الٹ ہو رہا تھا۔ اتنا الٹ کہ اس کی اپنی عقل دنگ رہ گئی تھی۔

”میں نے تمہیں دیکھا اور تم میرے حواسوں پر چھا گئے؟“ وہ ذی شاہ کو بتا رہی تھی، وہ ایک مغربی لڑکی تھی۔ اظہار کے معاملے میں جھجک نہیں سکتی تھی اور وہ ایک مشرقی لڑکا تھا۔ اگرچہ تھوڑا بے باک ہی سہی..... مگر پھر بھی اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی لڑکی سے بہت عجیب طرح کی باتیں اور اظہار محبت سن رہا تھا۔ وہ عام لڑکیوں سے ہٹ کر آئی لو یو والی کہانی نہیں دہرا رہی

کے نیچے دب گیا تھا۔

”نہیں ہیں۔“ منکسے اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔ اس کے آنسو جیسے کسی نے ٹوٹی کا پیٹل کھول دیا ہو..... یا کسی کوہ سے پھوٹنے والا مسلسل چشمہ..... ”اللہ! یہ چپ کیوں نہیں ہو رہی؟“ وہی بے بسی..... منکسے کے آنسو اس کا اضطراب بڑھا رہے تھے۔

”کوئی دوست، کوئی عزیز.....؟“ ذی شاہ نے بے قراری سے پوچھا تھا۔

”نہیں ہے۔“ وہ اور اونچی آواز میں رونے لگی تھی۔ اپنا سر میز پر پٹخ، پٹخ کر رہی تھی۔ اور ذی شاہ کے دل کو دھچکے لگ رہے تھے۔ ”یا اللہ.....! اس کے آنسو رکتے کیوں نہیں۔“

”اور کوئی پڑوسی؟“ اس کی اپنی آواز بھی تھکنے لگی تھی۔ کوئی رشتوں کے معاملے میں اتنا بھی مفلس ہوتا ہے؟ اتنا بھی غریب ہوتا ہے؟ جس کے پاس ایک اچھا ہمسایہ بھی نہیں ہو جو مرتے وقت اس کی خبر گیری کر لے۔ کوئی اتنا کنگال بھی ہوتا ہے؟ وہ جیسے خاک خاک ہو گیا تھا اور وہ کسی کٹی پٹنگ کی طرح ڈولتی جا رہی تھی۔

”نہیں ہے، میرا کوئی بھی نہیں، صرف تم ہو، مجھے تمہارا قرونوں (صدیوں) سے انتظار تھا اور تم میرے پاس چلے آئے، میں شانت ہو گئی۔ میں کنگال ہو کر بھی مالا مال ہو گئی۔“ اس نے عجیب دیوانگی کے عالم میں ذی شاہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ وہ کسی خواب کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ مدہوش، حیران اور کم صم.....

”مجھے یقین نہیں آتا..... تم میری طرف لوٹ آئے ہو۔“ اس نے پاگل پن کی انتہا کر دی تھی۔ ذی شاہ جیسے دم بخود رہ گیا تھا اور وہ حیرت زدہ کیوں نہ ہوتا منکسے تو یوں بات کر رہی تھی جیسے ان کا جنم جنم سے ساتھ تھا پھر سچ میں جدائی آگئی..... اور اب دوریوں کے بعد پھر سے ملاقات ہو رہی تھی۔ وہ اسے دم قدم حیران ہی تو کر رہی تھی۔ وہ اس سے اپنی بے تابیوں کی باتیں کیے جا رہی تھی اور وہ حیران تھا۔

**قارئین متوجہ ہوں**

**پرچا نہیں ملتا**

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ **بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔**

☆ **شہر اور علاقے کا نام۔**

☆ **مکان ہوتو بک اسٹال کا PTCCL یا سولیا گل فون نمبر**

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

**نصر عباس**  
03012454188

جاسوسی نا افسانہ پبلسیشنز

سٹریٹ، جاسوسی، پاکیزہ سٹریٹ

011-263-11263

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com



جسکے جواب بے پروائی سے بھر پور تھا۔  
 ”نہیں..... ڈرم میں الٹ دی تھیں۔“ وہ اب اسے مٹھی، مٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔  
 ”اللہ، یہ قاتل نظریں!“ ذی شاہ کا دل ڈول گیا۔ وہ حتی المقدور کوشش کر رہا تھا کہ منکھے کی طرف نہیں دیکھے کیا قیامت خیز نظریں تھیں۔  
 ”اللہ اکبر.....“ اس نے برہم ہو کر اسے گھورا..... ”اس سے بہتر یہ نہیں تھا کہ تم دوائی اس کیسٹ کے یا میرے ہی منہ پر مار دیتیں۔ وہ بے چارہ خواہ مخواہ کپسولز میں کوٹا ہوا سفوف بھر رہا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی، اس کی بنائی ساری دوائیاں لوگ ڈرم میں الٹ دیتے ہیں۔“ وہ بھگو بھگو کر مار رہا تھا اور منکھے قاتل نظروں سے دیکھتی مسکرا رہی تھی۔  
 ”خدا یا ان قاتل نگاہوں پر کوئی دفعہ نہیں لگتی؟ ہزاروں مارتی اور ہزاروں گرانی ہوں گی، یہ قاتل آنکھیں، یہ پاگل آنکھیں۔“ وہ جیسے دل کی حالت زار پر بے بس سا سوچ رہا تھا۔ دوسری طرف مسکراہٹوں سے اس کا کام تمام کیا جا رہا تھا۔ پہلے آنسو اور اب مسکراہٹوں کا ہتھیار پکڑ لیا تھا۔ دونوں صورتوں میں گت ذی شاہ کی ہی بننے والی تھی۔  
 ”میں نے دوائیاں ڈرم میں الٹ دی تھیں جسکے تمہارے دیے ٹشو سنبھال لیے۔“ وہ اس کو مزید حیرتوں کے سمندر میں دھکیل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تحیر پھیل گیا۔  
 ”کہاں سنبھالے.....؟“ ذی شاہ نے چونک کر پوچھا تھا تب اس نے مورگن روک کے کھلے گھیر میں موجود ایک جیب میں سے ٹشو نکال کر دکھائے مسلے ہوئے مسلے کھیلے ٹشو..... ذی شاہ کا جی متلا گیا۔  
 اس کا خیال تھا زکام زدہ ٹشو حیرت منہ نے چونے میں اڑس رکھے تھے مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا تھا۔  
 ”یہ نزلے والے نہیں، میرے آنسوؤں میں بھیکے ہیں، مجھے بھگی اور گیلی چیزیں پسند نہیں..... مجھے گیلے شہروں، گیلی آنکھوں سے نفرت تھی، مجھے من ہائیم سے بھی نفرت تھی۔ ادھر سر ما میں بہت برف پڑنی اور

میں جیسے اسے یقین نہیں آ رہا تھا، وہ اپنے سامنے اپنے خوابوں کے شہزادے کو دیکھ رہی تھی۔ مشرق کی سرحدوں کے پار سے آنے والا شہزادہ جو مغرب کی ایک پاگل، پاگل لڑکی کا اسیر ہو گیا تھا۔ ان دونوں نے اپنے، اپنے انداز میں بڑی انوکھی محبت کی تھی۔  
 وہ اپنا کام ختم کر چکا، تب اس کے پیر کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ بھگی بیٹی اب خشک ہو چکی تھی اور خون کی وجہ سے اکڑ چکی تھی۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر فینچی دریافت کی تھی۔ لاؤنج کے بکھرے پھیلاوے کو پھاندتا منکھے کی نشاندہی پر کسی کپ بورڈ سے فرسٹ ایڈ باکس بھی نکال لایا تھا۔ اب فینچی کی مدد سے بینڈیج کاٹ رہا تھا۔ اگرچہ منکھے اپنے زخم پر مرہم لگوانے کے حق میں نہیں تھی مگر ذی شاہ کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔  
 اس نے زخم کا جائزہ لیا تو وہ پہلے سے بگڑا نظر آیا۔ ایک آدھ ٹانگا تو اس کے چلنے پھرنے کی کوشش کے باعث اکھڑ چکا تھا۔ اور وہ ایسی باہمت اور دیدہ دلیری تھی کہ زخم کا جی جان سے تکلیف سہہ کر مقابلہ کر رہی تھی۔ وہ تاسف سے اس کا پیر دیکھ کر بولا۔  
 ”زخم کا بروقت علاج نہ کیا جائے تو وہ ناسور بن جاتا ہے۔“ اب وہ باریک بینی سے زخم کا جائزہ لیتا سوچ رہا تھا کہ مزید کیسے ٹریٹمنٹ دے..... کاش کہ وہ ڈاکٹر ہوتا؟ کم از کم منکھے کی تکلیف دور کر دیتا۔  
 ”ناسور تو بن چکا.....“ وہ جیسے اذیت سے مسکرا دی تھی۔ ”تم رہنے دو نا..... یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“ اسے مٹھی نظروں سے دیکھتی وہ بے پروائی سے بولی تھی۔ تب ذی شاہ بگڑ گیا تھا۔  
 ”خود کیسے ٹھیک ہوگا؟ جب تک علاج نہ ہو؟“ اس کے تیور برہم تھے۔ اب وہ کسی ڈاکٹر کو بلوانا چاہتا تھا کیونکہ صرف بینڈیج نہیں کرنا تھی، زخم کی صفائی اور ایک آدھ ٹانگے بھی دوبارہ لگنے تھے۔ اسے زخم کی گہرائی میں پس بھری بھی دکھائی دے رہی تھی۔  
 ”ڈاکٹر نے جو میڈیسن دی تھیں تم نے استعمال کیں؟“ ذی شاہ نے خاصے متشکر لہجے میں پوچھا تھا۔

گیا تھا۔ اور وہ ابھی تک اسی اسٹول پر دونوں ہاتھوں میں اس کی رسٹ واچ کسی مقدس تیرک کی طرح عقیدت کے ساتھ تھامے بیٹھی تھی حیران، گم صم، متحیر اور بے خودی کے عالم میں دیکھتی ہوئی۔ وہ نومنت سے پہلے واپس آچکا تھا۔ حالانکہ اتنی دیر میں وہ سمجھ چکی تھی۔ شاید وہ اب دوبارہ غلاظتوں کے ڈھیر میں واپس نہیں آئے۔ مگر اس کا خیال غلط ثابت ہو گیا تھا۔ وہ واپس آیا مگر اتنا سامان اٹھا کر..... کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو اسے پاگل کرنے لگی تھی۔ وہ بغیر کسی اور چیز کی طرف دھیان دیے جیسے کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔  
 مچھلی، چوزے کے گوشت کا سالن اور گرم گرم چاول اس نے سر پلیٹ میں گھسا دیا تھا۔ وہ چمچے، کانٹے کا تکلف کیے بغیر ہاتھوں سے کھانا کھا رہی تھی۔ جبکہ ذی شاہ اسی غم میں آدھا ہوا جا رہا تھا جانے اس نے ہاتھ دھوئے بھی یا نہیں۔  
 ”ہاتھ دھلے ہوئے صاف تھے۔“ اس نے تلی ہوئی مچھلی کا بڑا سا پیس کھاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ وہ کھانے کی طرف متوجہ تھی پھر بھی اس کی سوچ میں گھس گئی تھی۔ وہ بے انتہا حیران ہوا تھا۔ منکھے ابھی تک اسے حیران ہی کرتی آئی تھی۔ وہ منکھے کی پرت در پرت شخصیت کے الجھاوے میں الجھ رہا تھا۔  
 ”کھانا بہت مزیدار تھا۔ بہت شکریہ اے اللہ.....“ اب وہ اوپر کی طرف نگاہ اٹھائے غم آنکھوں سے کہہ رہی تھی۔ پورے چار منٹ سے بھی پہلے وہ کھانا ختم کر چکی تھی۔ اب گوشت کی باقیات یعنی ہڈیاں بچی تھیں یا پھر مچھلی کا ایک آدھ قتل..... جسے ذی شاہ نے احتیاط سے پلیٹ میں ڈھک کر فرنیچ میں رکھنا چاہا مگر فرنیچ بھی گندا تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے ایک صافی گوگرد پانی سے بھگو کر گزارے لائق فرنیچ صاف کر ہی دیا تھا پھر ایک، ایک چیز فرنیچ میں ترتیب سے رکھ دی۔ وہ اس دوران دونوں کہنیاں میز پر سجائے ہاتھوں کے پیالے میں منہ رکھے بڑی محویت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسی بے خودی اور دیوانگی کے عالم میں..... اسی سرشاری اور خواب کی سی کیفیت

مگر ذی شاہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ بس ایمل نے اسے دیکھا مگر ترس کھا کر اندر چلی گئی۔ اس کی مدد نہیں کی، مٹی اور افرایم کے خوف سے، وہ فرمانبردار لڑکی تھی، منکھے کی مدد کیسے کرتی؟ ذی شاہ کو اپنی غفلت پر غصہ آ رہا تھا۔ بھلا اس نے خود منکھے کی خبر گیری کیوں نہیں کی؟  
 کینٹ سارے خالی تھے، لیکن میں راشن نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ حتیٰ کہ چینی، پتی تک بھی نہیں تھی۔ یہ لڑکی مسافروں کی طرح اس گھر میں رہ رہی تھی؟ مگر مسافر بھی تو اپنے زندہ رہنے کا سامان ساتھ رکھتا ہے۔ اسے منکھے کی بے بسی اور بے پروائی پر بھی تاؤ آیا تھا۔ پھر اس نے دو چار باتیں اسے سنا بھی دی تھیں۔  
 ”یہ گھر ہے یا کوئی غار.....؟ جہاں زندہ رہنے کے لیے خوراک کا ایک ٹکڑا تک نہیں۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتا ایک کینٹ سے سکٹ کا چورا نکال لایا تھا۔ جو ہوں نے کتر، کتر کر سکٹ کا سفوف بنا ڈالا تھا۔ اسے گھن سی آئی تھی جبکہ منکھے خوراک دیکھ کر جانوروں کی طرح پیکٹ پر چبھی تھی۔  
 ”مجھے یہی دے دو.....“ وہ ندیدوں کی طرح پیکٹ چھین لینا چاہتی تھی مگر ذی شاہ نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس نے پیکٹ والا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا پھر جیسے بہت محبت اور نرمی سے بولا۔  
 ”یہ میری گھڑی اپنے پاس رکھو اور وقت نوٹ کرتی جاؤ، میں پورے نومنت بعد یہاں آ جاؤں گا۔ تم اس دوران یہاں سے لینا مت.....“ اس نے گھڑی منکھے کے ہاتھ میں پکڑائی تھی پھر پیکٹ کو ڈسٹ بن میں پھینکنے کی غلطی کیے بغیر لیے، لیے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ رستے میں اس نے ڈرم دیکھ کر گندا بدبو داؤد سکٹ کے چورے والا پیکٹ پھینک دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا یہ گندا چورا منکھے ڈسٹ بن سے نکال نہ لے۔ خوراک دیکھ کر اس کی حالت کچھ ایسی ہی لگ رہی تھی۔ اس نے بیکری سے کئی چیزیں لیں اور ساتھ ہی ناشتے کا کچھ سامان..... اور پھر ایک چھوٹے سے ہوٹل سے کھانا پیک کروا کر وہ نومنت سے بھی پہلے واپس ویس ہاؤس پہنچ



ترک و وفا

مسکراہٹ تھی اوس گلاب کی پنکھڑیوں سے گرتی اتنی حسین لگتی ہے؟ ذی شاہ کی نگاہ بھی جیسے منجمد ہو گئی تھی۔

”تم رک جاؤ.....“ غنودگی میں اس نے جیسے التجا کی تھی۔ یا اس کی بے آرامی کے باعث کہہ رہی تھی یا پھر بارش میں بھیگ جانے کی وجہ سے؟ وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔

”سر ما کی پہلی خطرناک بارش ہے، بیمار پڑ جاؤ گے۔“ اسے ذی شاہ کی فکر تھی، وہ جیسے نہال ہو گیا۔

”میں بیمار نہیں پڑتا..... بڑا سخت جان ہوں۔ یہ نرم بوندیں کیا کہیں گی۔“ اس نے مسکرا کر کندھے اچکائے تھے پھر بڑے شرارتی انداز میں پوچھنے لگا تھا۔

”تمہیں مجھ سے ڈر نہیں لگے گا؟“ اس کی آنکھوں میں بھی شرارت بکھر گئی تھی۔ تب اس نے اپنی نم آلود، بوجھل اور موتیوں سے بھاری پلکوں کو بہ مشکل اٹھا کر ذی شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

”نہیں.....“ وہ بڑی سنجیدگی اور مستحکم انداز میں بولی۔

”کیوں.....؟“ ذی شاہ حیران ہوا۔ ”تم تو کمزور بھی ہو، تنہا ہو، بے بس ہو سکتی ہو پھر مجھ پر اتنا اعتبار کیوں؟ میں فرشتہ ہرگز نہیں؟ یہ تم سوچنا بھی

مت..... میری ہمدردی، خلوص اور ان عنایتوں سے یہ مت سمجھنا، میں کوئی نیک روح، فرشتہ قسم کا انسان ہوں۔“ وہ جیسے اپنے خبردار کر رہا تھا اور منکشف اس پر کچھ اور منکشف کر رہی تھی۔

”میں نہیں سمجھتی، تم کسی ہمدردی، ترس یا خلوص میں اتنی عنایتیں کر رہے ہو..... یہ تو صرف محبت ہے، جسے میں نے تمہاری آنکھوں میں کھوج لیا..... ورنہ اس گھٹن زدہ، بد بودار، غلیظ ماحول میں تم کبھی نہ نکلتے۔

میں جانتی ہوں، تم بڑے ہی نفیس، تروتازہ اور خوشبوؤں میں بے رہنے والے انسان ہو اور تمہیں یہاں انسانیت کی تکمیل کرنے، ترس کھانے اور ہمدردی جتانے نے نہیں روکا۔ تمہیں تو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔“ منکشف نے کیسے دھڑ دھڑا دھڑ اس کے دل کی جاگیر پر اپنے قدموں کی دھمال ڈال دی تھی۔ وہ کتنی عجیب گہری ذہین اور اندر تک کھوج لینے والی لڑکی

تھم سا گیا تھا۔

”اے ابر کرم..... ذرا تھم کے برس.....“ اس نے ٹائیلوں کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا..... مینہ چھا جوں چھا ج برس رہا تھا۔ باہر گہری رات نے پر پھیلا رکھے تھے، اتنا وقت بیت چکا تھا، اسے گھر بھاگنے کی بے چینی ہوئی۔ اب تک افزائیم بھی آچکا ہوگا؟ اس نے بے تابی سے سوچا تھا۔ اس کی lexus گیرج میں کھڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ذی شاہ نے گردن موڑ کر پردے برابر کردے تھے پھر فرنیچ سے پانی کی بوتل، دودھ، جوس اور کچھ پھل وغیرہ نکال لایا تھا۔ جسے اس نے قریب ساؤنڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”یہ تمہارے لیے رات کا سامان، صبح ناشتا میں لے آؤں گا۔ تم اٹھنے کی زحمت نہ کرنا۔“ اسے زبردستی دوائی دے کر ذی شاہ نے کچھ ہدایات کی تھیں پھر جیسے مینہ رکنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگلے پانچ منٹ تک بارش رک جائے گی۔ مگر اس کی امید بارش مزید تیز تر ہوتے دیکھ کر بجھ گئی تھی۔ اس نے پردہ ہٹا کر جیسے التجا کی تھی۔

”اے ابر کرم..... آج اتنا برس، اتنا برس کہ وہ اونچی آواز میں درخواست پیش کر رہا تھا۔ پھر جیسے پیچھے سے آواز آئی تھی۔ مدہم، مسکراتی، ہوش اڑانی آواز.....

”اے ابر کرم..... آج اتنا برس، اتنا برس کہ وہ جانہ سکے۔“ وہ ہتھیلیوں پر نگاہ جمائے کبل سینے تک اوڑھے دوائی کے زپر اثر ٹیم غنودگی میں تھی۔ ذی شاہ کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا تھا۔ وہ جیسے لمحے بھر کے لیے ساکت ہو گیا۔

”میں نے غلط نہیں کہا..... ویسے بھی بارش رکنے والی نہیں۔“ لمبی پلکوں کی جھالیں عارضوں پر گرائے وہ کسی منہ بند گلاب کی کٹی جیسا تاثر دے رہی تھی۔ حسین، پرکشش، اوس میں جھگی..... ہاں، اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو گر رہے تھے۔ قطرہ، قطرہ، بند پلکوں کے جال میں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور اس کے ہونٹوں پر بڑی دل آویز

”از دیر آؤ اکثر ہو کین اسپیک انگلش.....؟“ اس نے احتیاطاً پوچھ لیا تھا کیونکہ یہاں عام طور پر کچھ بولتی ہی بولی جاتی تھی۔ منکشف نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر انگریزی بولنا جانتا ہے سو اس نے قریبی ڈاکٹر کو فون کر کے بلوایا تھا۔ جس نے اگلے پندرہ منٹ میں اس کے زخم کی صفائی کر کے بیڈنگ کر دی تھی پھر ذی شاہ کی طرح ہی بکھرے پھیلاوے سے بچتا بچاتا بڑی عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھتا آگے بڑھ گیا تھا گویا آنکھوں میں اسے جتا کر گیا تھا۔ ”تم دونوں میاں بیوی بہت بد سلیقت پھوڑ، اور گندے ہو۔“

ڈاکٹر کی نگاہوں نے اسے پانی، پانی کر دیا تھا۔ وہ جیسے اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

”بہت خبیث ڈاکٹر تھا۔“ وہ بھی زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ تب ذی شاہ اسے پکڑ کر کارٹر والے کمرے تک لے آیا تھا۔ اس کمرے کا حال بھی بہت برا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جسے وہ اپنے کمرے کی گلاس ونڈو سے دیکھا تھا۔ کھڑکی کے سامنے مخصوص دو پردے لٹکے تھے، ایک سفید جالی دار ٹائیلوں کا پردہ اور دوسرا سلک کا پھولدار ریشمی..... اور سوائے پھولوں سے بھری ٹوکریوں کے کمرے کی ہر چیز بے ترتیب اور غلیظ تھی۔

گندے برتنوں سے لے کر کمرے کی آرائشی چیزوں تک اور بیڈ شیٹ تو جیسے سالوں سے دھوئی نہیں گئی تھی۔ اس کا جی بری طرح ادب گیا تھا۔ کہاں اس کا وہ بیڈ روم جو افزائیم نے سنوارا اور سجایا تھا۔ انتہائی شفاف، خوشبو دار اور امپورٹڈ فرنیچر سے سجا..... غسل خانہ اتنا چمکیلا، دودھیانکوں اور شیشوں سے جگمگاتا ہوا۔ اگر فرنیچر یہاں کا بھی بہت اعلیٰ تھا ہر چیز امپورٹڈ تھی، بس صفائی، نفاست اور ترتیب کہیں نہیں تھی۔

وہ گھر جانے لگا تو باہر ایک دم چم، چم مینہ برسنے لگا تھا۔ یہاں کی بارشیں سادوں کی بارشوں کو مات کرتی تھیں۔ جب دل کیا، برس پڑیں..... وہ لمحہ بھر کے لیے

بارشیں تو اتر سے ہوتیں۔ سڑکیں، گھر، لان، درخت، پودے سب بھیگ جاتے..... بارش کی وجہ سے شہر بہت گیلا اور برف کی وجہ سے غلیظ ہو جاتا ہے۔ مجھے بس بواریا پسند تھا۔ آہ، میرا بواریا مجھ سے چھن گیا۔“ وہ بولتے، بولتے کہیں کھوئی تھی۔ کالج سی حسین رنگ بدلتی آنکھوں کا عکس اس کی روح تک میں پھیل رہا تھا۔ اس نے نشوونگی وضاحت کر کے جتا دیا تھا کہ وہ جو سوچ رہا ہے ٹھیک نہیں، یہ نشوونگام زدہ نہیں بلکہ آنسوؤں میں بھیلے تھے خیر، اب تو خشک بھی ہو چکے تھے۔ اب وہ بواریا کے دکھ میں مدہوش ہو گئی تھی۔

”اے یہ بواریا اب کون تھا؟ کسی کا اسم شریف یا؟“

”مجھے گیلی آنکھوں، غمزہ چہروں سے بھی نفرت تھی۔ میں دوسروں کے آنسوؤں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ حقارت کسی بھی صورت میں ہو، تکبر کی ایک شکل ہوتی ہے اور تکبر اللہ کو پسند نہیں..... اسی لیے آنسو میری سزا بن گئے اور عمر بھر کے لیے میری آنکھوں سے پھوٹ پڑے..... کبھی نہ رکنے کے لیے.....“ وہ پھر سے بے آواز رو رہی تھی۔ اسے رونے کے لیے آواز کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر سات، آٹھ، دس یا پندرہ منٹ بعد اس کی آنکھیں خود بخود گیلی ہونے لگتی تھیں۔ من ہائیم کی منکشف اور اس کی گیلی آنکھیں اسے گیلے شہروں اور گیلی آنکھوں سے نفرت تھی پھر وہ کیوں اس گیلے شہر میں رہ رہی تھی؟

”من ہائیم کو چھوڑ بھی دیتی تو کیا فرق پڑتا تھا؟ یہ گیلی آنکھیں تو ساتھ تھیں جنہیں خود اپنے ہاتھ سے پھوڑنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔“ منکشف بیٹھی نظروں سے دیکھتی اس کے تاثرات پڑھ رہی تھی، وہ نہ بھی دیکھتی تب بھی ذی شاہ کا چہرہ اور سوچ پڑھنا مشکل تو نہیں تھا؟ کھلی کتاب جیسا چہرہ، جس پر ایک، ایک لفظ لکھا تھا۔

”تم اتنی بہادر ہو کہ یہ کام بھی کر سکتی ہو۔“ ذی شاہ اس کے پیر کو چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر بکھری چیزوں سے بچتا بچتا فون تک گیا تھا۔ تو فون تو نہیں تھی پھر بھی اسے گیلی فون ڈائریکٹری مل ہی گئی تھی۔ اس نے سب

89

88

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM



تو کہ وفا

کردی تھی۔ ورنہ اس سوڑی نے پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔  
”اور تاجدار داری کر کے آگے؟ اور وہ بھی زندہ سلامت.....؟“ ایمل نے ڈیلے گھما کر چالاکی سے کہا تھا۔ وہ اسے گھور کر رہ گیا تھا۔ ”اللہ، یہ یورپین تیز طرار، چالاک، ہوشیار، بے بیچے..... با بے آدم کے وقتوں کی باتیں بھی کر لیتے ہیں؟ تو بہ تو بہ۔“

”نظر نہیں آ رہا تمہیں؟“ وہ ڈپٹ کر بولا تھا۔  
”یقین نہیں آ رہا..... نظر تو بہت کچھ آ رہا ہے.....“ اس نے معنی خیزی کی انتہا کر دی تھی۔ ذی شاہ کے ڈیلے اہل کر باہر آ گئے۔

”ہیں..... کیا، کچھ..... دیکھ لیا تم نے چھپکلی.....! بہت چالاک ہو تم تو بیچ کر رہنا پڑے گلڈوہ جیسے خود کو آنے والے حالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ورنہ یہ سفید چھپکلی تو آنکھوں میں گھسنے والی تھی۔“

”مجھے بھی تو پتا چلے.....؟ کیا کچھ نظر آ رہا ہے؟“  
ذی شاہ چبا چبا کر بولا تھا۔ تب وہ بے اختیار ہنسنے لگی۔  
”غصہ کیوں کرتے ہو، میں تو تمہاری دوست ہوں..... مجھ سے بھی پردہ داری..... ویسے میری بہن افریشم کی لوائسٹوری بھی میرے ہاتھوں انجام کو پہنچی تھی۔“ وہ قہقہہ، قہقہہ ہنسنے لگی تھی۔ یعنی پوری طرح جاسوسی کر کے اب دلائل سے بات کر رہی تھی۔

ذی شاہ نے سر تھام لیا تھا۔ وہ ایمل کے ہاتھوں لاجواب ہو چکا تھا اور ایمل صاحب اپنے منگے پر اترائے جا رہی تھیں۔

”میں نے دیکھ لیا تھا تم اتنے پیسے خرچ کر کے اس ناکارہ اور بیروزگار خبیثی لڑکی کے لیے راشن کا ڈھیر خرید کر لائے تھے۔ پھر ڈاکٹر بھی اسے چیک کرنے آیا تھا۔ ڈاکٹر کو فیس بھی تمہی نے دی ہوگی۔ یہ سب ایسے تو نہیں کیا جاسکتا.....“ ایمل نے کھلکھلاتے لہجے میں بتایا تھا۔ جیسے ذی شاہ کی چوری پکڑ کر بہت خوش ہو رہی۔

وہ ایک دم جھنجھلا گیا تھا۔  
”انسانی ہمدردی بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ وہ بے چاری تین دن سے بھوکی پیاسی مر رہی تھی۔“ اسے دکھ

کرنے لگا تھا۔ ”کچھ سوچ کر ذی شاہ نے وضاحت

”نت..... تم آ بھی گئے؟“ ایمل بوکھلا گئی تھی۔  
تجھی اناسیدھا بول گئی۔ حالانکہ وہ اپنے یہاں کھڑے ہونے کا کوئی جواز بھی دے سکتی تھی مگر واہ ری قسمت..... اوہ پکڑی جا چکی تھی۔ کچھ اور نہیں بلکہ ذی شاہ کی جاسوسی کرتی۔

”مجھے آنا ہی تھا..... ہمیشہ کے لیے تو نہیں گیا تھا؟“ ذی شاہ نے خاصی ناگواری سے اپنی لاڈلی فرینڈ کو دیکھا تھا۔ تب ایمل نے بوکھلاتے ہوئے وضاحت کی تھی۔

”میرا مطلب ہے بیچ کر آ گئے.....“ اب وہ بڑی مسرور نظر آ رہی تھی۔ گویا وہ اس کے لیے متفکر تھی۔ ذی شاہ غصہ بھلا کر مسکرا دیا تھا۔ حالانکہ اسے مسکرانا نہیں چاہیے تھا۔ وہ ویس ہاؤس سے نکل کر آ رہا تھا۔

رات کے پچھلے پہر، اگر پاکستان ہوتا تو اب تک نسانہ بن چکا ہوتا۔ ایک جوان لڑکی کی تاجدار داری کر کے آنے کا جرم معمولی تو نہیں تھا۔

”ہاں، چھپکلی.....! بس بیچ کر آ گیا..... اس رین کوٹ کی بدولت..... ورنہ بارش تیز تھی۔“ اس نے مسکرا کر وضاحت کی تھی۔ ہمیشہ کی طرح ذی شاہ کے چھپکلی کہنے پر اس نے وضاحت نہیں مانتی تھی اور نہ چھپکلی کے معانی پوچھے تھے۔ ورنہ وہ اس کے پیچھے ہی پڑ جاتی تھی۔ مگر اس وقت خاصی مد نظر آ رہی تھی جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔

”بارش کی بات کون کر رہا ہے؟ وہ تو اندھوں کو بھی رین کوٹ نظر آ سکتا ہے، جس کی بدولت بارش کے قطرے ذرا بھی نہیں بھگوتے۔ میں تو لیڈ بزرگ رین کوٹ دیکھ کر کچھ حیران ہوں..... تم خبیثی آنٹم کے گھر سے آ رہے ہو، پھر اس کے ہاتھوں زندہ کیسے بیچ گئے؟“

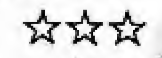
محترمہ نے آنکھیں میچ کر جیسے اس کے ہاتھ سے سارے طوطے، کبوتر، اڑا دیے تھے، صحیح معنوں میں چودہ طبق روشن کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ ذی شاہ گڑ بڑا کر رہ گیا تھا پھر جیسے سنبھل کر اسے ڈپٹتے ہوئے بولا۔

”خبیثی آنٹم کوئی درندہ صفت انسان نہیں..... بے ضروری بیمار لڑکی ہے۔ میں اس کی احوال پر ہی کرنے لگا تھا۔“ کچھ سوچ کر ذی شاہ نے وضاحت

بیچا سکتا تھا۔ تاہم اسے بہن کر افرایم کے گھر جانے تک کا حوصلہ کرنا بڑا مشکل اور کٹھن ترین تھا۔

”مجبوری میں کچھ بھی کیا جاسکتا ہے۔“ منگھے کیل میں منہ چھپا کر آخری مرتبہ بڑ بڑائی تھی پھر شاید گہری نیند میں چلی گئی۔ وہ اس کے سو جانے کی تسلی کر کے دروازہ اچھی طرح بند کرتا برستے آسمان کے نیچے آ گیا تھا۔

”اے محبت.....! بس تیری خاطر.....“ وہ بھیکتا ہوا بھاگ کر روڈ کر اس کر کے سامنے والے گھر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جبکہ دو آنکھیں اس کے اوچھل ہونے تک کھڑکی کے ساتھ چپکی رہی تھیں۔



وہ چپکے سے لاؤنج میں داخل ہوا تھا یوں کہ کسی کو پتا نہیں چل سکے۔ افرایم کے گھر کا لاک اندر باہر سے مخصوص نمبروں پہ کھلتا تھا جو اسے بتا دیے گئے تھے سو وہ بے آسانی اندر آ چکا تھا۔ نیچے والے کمرے اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ آٹنی اور افرایم دن بھر کے تھکے ہارے تھے بھی جلدی سو چکے تھے۔ افریشم ابھی یہیں تھی جبکہ ایمل بیٹنی طور پر سو چکی تھی۔ وہ دے قدموں سینرھیال چڑھ کر اوپر آ گیا تھا۔ رین کوٹ اتار کر اس نے اپنے بازو پر رکھ لیا تھا۔ اس بدبودار کوٹ نے ذی شاہ کو بھینکنے سے بچا لیا تھا۔ سو وہ اسے بڑی پیار بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ ویسے بھی یہ منگھے کا کوٹ تھا۔ چاہے جتنا بھی غلیظ اور بدبودار ہوتا، اسے تو پیار ہی لگتا تھا۔

وہ اپنے دھیان میں گن گیٹ روم کی طرف جا رہا تھا جب اچانک ہال کی گلاس وال سے چپکلی ایمل۔ اس کی نگاہ پڑی تھی۔ وہ ایک دم ٹھنک کر رک گیا۔ ایمل گلاس وال سے ناک چپکائے ابھی تک باہر جھانک رہی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ ویس ہاؤس سے نکلتا ذی شاہ اتنی جلدی اور تیزی کے ساتھ اوپر آ جائے گا۔ تجھی وہ بڑی معنی خیزی کے ساتھ دیدے گھمائی باہر جھانک رہی تھی۔ مگر یہ کیا.....؟ بھاری بوٹوں کی آواز اس کے پیچھے آنے لگی۔ وہ گڑ بڑا کر پیچھے ہٹی تو نگاہ ذی شاہ پر پڑی تھی۔

تھی؟ ذی شاہ جیسے دم بخود ہو گیا تھا۔ وہ سوچتا رہ گیا تھا، کیسے؟ کس طرح.....؟ اور کیوں تکر اپنی محبت کا صفحہ اس لڑکی کے سامنے کھولے گا جس سے ذی شاہ کو پہلی نظر کی محبت ہو گئی تھی۔ وہ اسے کیسے یقین دلانے گا؟ کس طرح بتائے گا؟ مگر وہ تو سارے پانسے اٹنے بیٹھی تھی۔ اظہار کی نوبت ہی نہیں آسکی..... اور وہ دونوں ایک دوسرے کو بن کہے پڑھنے لگے تھے۔ لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف، صفحہ بہ صفحہ.....

”اب تم جا سکتے ہو..... مگر دھیان سے جانا، ٹھہرو، وہ سامنے صوفے پر ایک گھڑی رکھی ہے، اس میں سے رین کوٹ نکال لو، باہر بہت تیز بارش ہے، تم بیمار پڑ گئے تو میں بھوکی مر جاؤں گی۔“ وہ آنکھوں پر بازو رکھے تمام تاثرات محفوظ کر گئی تھی۔ ذی شاہ کو اس کا مشورہ بھا گیا تھا۔ اس نے باہر نکل کر لاؤنج میں صوفے پر پڑی گھڑی کھولی تو ہر رنگ کے کپڑے اہل کر باہر آ گئے، گندے، غلیظ اور بدبودار..... اس نے ناک پر ہاتھ رکھے بیڈ پر لیٹی منگھے کو گھورا تھا۔

”کاج تو تمہارے پیر میں تین دن پہلے چھا ہے، یہ کپڑوں کا ڈھیر تو یوں لگتا ہے پچھلے ایک سال سے نہیں دھلا۔“ وہ اتنا نہیں، باسلیقہ اور خریلا تھا کہ حد نہیں۔ ذرا سی گرد برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب پورے ایک گھنٹے سے اتنے کٹھن زدہ اور گندے ماحول میں جھلس کر رہا تھا۔ اس کا طنز محسوس کر کے منگھے بند آنکھوں سے مسکرا دی تھی۔

”دو ماہ پہلے لائٹری گئی تھی پھر وقت ہی نہیں مل سکا۔“ وہ جیسے صفائی پیش کر رہی تھی۔ وضاحت دے رہی تھی، ذی شاہ نے تیور بگاڑ کر جواب دیا۔

”تم ڈوچ لینڈ کی وزیر اعظم ہو جو وقت نہیں مل سکا..... یہ کہو، انتہائی پھو ہڑ خاتون ہو، ایک دم کام چور..... میری بہن بندیا کی طرح.....“ ذی شاہ زیر لب.....

بڑبڑاتا کپڑوں کو چھانٹتا..... اب بالآخر ایک عدد رین کوٹ ڈھونڈ ہی چکا تھا۔ لیڈ بڑا سائل میں یہ غلیظ اور بو سیدہ باس چھوڑ رین کوٹ فی الوقت اسے بھینکنے سے

90 ماہنامہ پاکیزہ اکتوبر 2014ء



سا ہوا تھا۔ محبت ایک طرف، وہ منکشف کی بے بسی پر اندر تک تھرا گیا تھا۔ اس قسم کے حالات سے اگر ذی شاہ کو گزرنا پڑتا تب.....؟ بس یہاں آکر اس کی سوچ بلاک ہو جاتی تھی۔

”اور ”محبت“ وہ کس چیز کا نام ہے؟ تم مجھے چکما نہیں دے سکتے؟“ ہر وقت تو آنکھیں چپکائے گلاس ونڈو میں کھڑے اسے تاڑتے ہو، جاگنگ پہ جاؤ یا واک کرنے، آتے جاتے ویس ہاؤس کی زیارت ضرور کرتے ہو..... پھر میں بھلا کیوں نہ سمجھوں.....“

ایمل نے آنکھیں گھما کر جیسے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ یورپ کی لڑکی تھی، مغرب کی پیدائش، انٹرنیٹ کے دور کی..... انتہائی تیز طراز ذہن رکھنے والی پھر وہ اس سے کیسی امید رکھ سکتا تھا؟ ایمل کوئی پاکستان کے کسی دیہات سے نہیں آئی تھی۔ وہ یہاں کی مٹی سے گوندھی گئی تھی۔ تیز رفتار لوگ، تیز رفتار زندگی جینے والے، تیز ترین ذہن رکھنے والے لوگ..... بھلا اس کا موازنہ وہ اپنے ہاں کے کسی تیرہ چودہ سالہ بچے کے ساتھ کر سکتا تھا۔ اور اب تو اس کے ویس، وطن اور پیارے پاکستان کے بچے بھی فطری معصومیت سے انٹرنیٹ اور آزاد میڈیا کی وجہ سے مبرا ہو چکے تھے پھر ایمل تو یہاں کا کرشمہ تھی۔ کیسے نہ ہوشیار کی کے کرشمے دکھائی۔

”اب جب کیوں کھڑے ہو؟ جلدی سے پھوٹ بھی چکو.....“

”مجھٹی آنکھیں تمہاری فریون ون (محبوبہ) ہے ناں..... تم اس سے لو کرتے ہو؟ بھی اتنا خیال رکھتے ہو.....“ وہ سر سے لے کر پیروں تک پریقین کھڑی تھی پھر ذی شاہ کیسے انکار کر دیتا..... اس کے کندھوں تک آتی بانس جھٹی لمبی اس گوری ذرا زرد زردی پیلی نیلی لڑکی نے ذی شاہ کو گھما ڈالا تھا۔ جھوٹ بولنے کا فائدہ کوئی نہیں تھا پھر وہ کیسے غلط بیانی کرتا؟

”ہاں..... ناں..... پر پلیز..... تم کسی کو مت بتانا.....“ اس نے احتیاطاً التجا کر دی تھی۔

”نہیں بتاؤں گی..... پر تم نے دل غلط جگہ پر اٹکا لیا۔“ وہ خاصی منہ پھٹ اور باتونی تھی۔ سو فوراً اس کی

ہمدردی میں بولی تھی۔ وہ کچھ چونک گیا تھا۔

”کیا مطلب.....؟“ ذی شاہ چونکا۔

”وہ لڑکی بہت خطرناک..... ہے، یقین کرو، تمہیں کوئی نقصان نہ دے۔ آئنا آل ہمارے مہمان ہو تم۔“ ایمل نے خلوص سے کہا تھا۔ اسے ذی شاہ کی فکر تھی۔ وہ اس کے بھائی کا دوست تھا۔ اور بھائی جیسا ہی پیارا ہو گیا تھا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا.....“ اس نے پیار سے ایمل کے گال تھپتھپائے تھے۔ ”پیاری چھپکلی! اب تم جا کر آرام کرو۔ باقی جاسوسی بعد میں کر لینا۔ رات بہت ہو چکی ہے۔“ ذی شاہ رین کوٹ کو دوسرے بازو پر منتقل کرتا مسکرا دیا تھا تب ایمل کچھ چل گئی تھی۔

”پہلے بتاؤ، چھپکلی کے کہتے ہیں؟ اس کا مطلب کیا ہے؟“ ایمل اب اسے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ ذی شاہ کو جان بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر وہ کچھ سوچ، سوچ کر بتانے لگا تھا۔ جیسے دیواروں سے چسکی مخلوق کا نقشہ کھینچنے لگا۔

”ہمارے ہاں..... ایک زردی، کچھ سفید اور لہجی سی ایک مخلوق ہے، دیکھنے میں بڑی کیوٹ نظر آتی ہے، لڑکیاں عموماً اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ مگر مجھے ڈر نہیں لگتا..... بہت کیوٹ لگتی ہے، تمہاری طرح.....“ وہ بہ مشکل مسکراہٹ روکے بڑی سنجیدگی کے ساتھ بتا رہا تھا جبکہ ایمل نہال ہوتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ذی شاہ جان چھڑا کر گیٹ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جب ایمل بھی سیڑھیاں اترتے ہوئے اونچی آواز میں بولی تھی۔ وہ بہت پرجوش اور خوش نظر آ رہی تھی۔

”اب کہ پاکستان سے آئے ناں..... تو میرے لیے چھپکلی کا ایک بچہ لے آنا۔ میں اسے ملی کے ساتھ ہی سنبھال کر پالوں گی۔ جیسے پھلیاں پالتی ہوں.....“

ایمل کی فرمائش اسے قہقہہ لگانے پر مجبور کر گئی تھی۔ وہ بیڈ پر اوندھا لیٹا نہیں، ہنس کر بے حال ہو گیا تھا۔ ایمل اس کی چھوٹی سی دوست، افرایم کی بہن اور بندیا جیسی

مشرقی، کھوجی اور حاضر دماغ یورپ کی کچھ، کچھ ہوشیار لڑکی..... مگر معصومیت اور بھولپن کمال کا۔ وہ ایمل کے لیے اب رائے بدل چکا تھا۔

ایمل کی اکثر عادتیں بندیا سے ملتی تھیں، وہ بندیا کی طرح کچھ کچھ جھگڑالو، دوسروں کی ٹوہ میں رہنے والی مگر فطرتاً پر خلوص لڑکی تھی۔ ایمل اگر افرایم کی بہن نہ ہوتی تو ذی شاہ کا دل بھی یہاں نہ لگتا..... وہ جلد ہی ہوٹل میں شفٹ ہو جاتا..... مگر ایمل کی وجہ سے اس کا خوب دل لگ گیا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری، ہنس مکھ، شوخ اور مزاجیہ.....

آئی کہتی تھیں، ایمل کی عقل گھٹنوں سے ہوتی ہوئی ٹخنوں میں چلی گئی ہے۔ جبکہ ذی شاہ کے نزدیک وہ خاصی ذہین اور عقلمند تھی۔ اکثر اسے بڑے کمال کے مشورے دیتی تھی اور کبھی، کبھی منکشف کے متعلق چونکا دینے والی باتیں کرتی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے معلومات کا خزانہ تھی تاہم ویس ہاؤس کے بارے میں اکثر اپنی رائے محفوظ کر لیتی تھی۔

رات بھر بارش خوب برس کر صبح کو نہ جانے کس دیس سدھاری تھی۔ اگلا دن چمکدار تھا۔ گیلی سڑکیں خشک ہونے لگی تھیں۔ سبزہ دھل کر پہلے سے زیادہ شفاف ہو چکا تھا۔ ہریالی جو بن پر تھی۔ پھول پودے کھڑے چکے تھے۔

وہ تازہ دم ہو کر پرفیوم اسپرے کرنے کے بعد آئنا شیشیوں میں منہ پر لگا رہا تھا جب افرایم اندر چلا آیا۔

”سلامتی ہو..... پھر صبح اٹھ گئے، ہماری تو مجبوری ہے، تم تو سوتے رہا کرو۔“ وہ سلام بھیج کر بڑے خوشگوار لہجے میں بول رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی افرایم کی آنکھوں میں ستائش بھر گئی تھی۔ اور یہ ستائش ذی شاہ کے لیے نئی نہیں تھی۔

”تم پر بھی سلامتی ہو، ایس..... یہ کیا؟ میں کیوں پوسٹیوں کی طرح بستر میں گھسا رہوں؟ صبح خیز ہوں، اپنی عادتیں خراب نہیں کر سکتا۔“ اس نے جواباً مسکراتے ہوئے وضاحت کی تھی۔ وہ سر ہلا کر جیسے تائید

**ترک و وفا**

کرنے لگا۔ پھر جس کام کے لیے آیا تھا، اسی کے متعلق پوچھنے لگا۔ اسے دفتر سے دیر ہو رہی تھی۔ اسی لیے جلدی جلدی بات ختم کرنا چاہتا تھا۔

”ڈونچ سیکھنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ وہ سنجیدہ تھا، ذی شاہ نے بھی سنجیدگی سے کندھے اچکا کر کہا تھا۔

”ٹھیک خیال ہے، اس دن ہیئرنگ کا ڈائریکٹر بھی یہی کہہ رہا تھا۔“ وہ افرایم کو دیکھتا بال بنانے لگا۔ افرایم نے سر ہلا دیا تھا۔

”ڈونچ سیکھنا یہاں رہنے کے لیے ضروری ہے۔ ایک دو ہفتے لگا لو کسی انسٹی ٹیوٹ میں، تم جلدی امپروو کر جاؤ گے۔“ افرایم نے مسکرا کر کہا تھا۔ وہ جلدی اس کا ایڈمیشن بھی کروانے والا تھا۔

”ویسے انسٹی ٹیوٹ جانا ضروری نہیں، تمہارے اپنے گھر میں اتنا بڑا انسٹی ٹیوٹ موجود ہے۔“ اس کا اشارہ ایمل کی طرف تھا۔ وہ جیسے سمجھ کر مسکرا دیا تھا۔

”ہاں، یہ تو ہے..... ایمل سے کلاسز لے لو، ایک دم ایلیکٹریٹ ہو جاؤ گے۔“ افرایم بھی اسی کے انداز میں بولا تھا تب جیسے ذی شاہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

”میری ڈونچ خاصی امپروو ہو چکی ہے، ایمل کی کلاسز میں شاید اتنی نہ ہوتی جس قدر اس کی کہنی فائدہ مند رہی۔“ وہ ایمل کو سراہ رہا تھا۔ افرایم نے جیسے ڈر کر کہا۔

”اب اس کے سامنے تعریف نہ کر دینا..... محترمہ اگلے تین سال تک اتراتی رہیں گی۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ ایمل کے مزاج سے سب ہی واقف تھے۔ ایمل اپنی تعریفوں پر گردن اٹھاتی تھی پھر یہ کلف سالوں تک نہ اترتی۔

”میں ایسی عظیم غلطی کا مرتکب کیسے ہو سکتا ہوں۔“ ذی شاہ بھی جواباً مسکرایا تھا تب اسے چونگی مرتبہ مردد دیکھتے ہوئے افرایم گویا چڑ گیا تھا۔ وہ کب سے اسے بار بار مردد دیکھتا، بال سنوارتا، کالر ٹھیک کرتا دیکھ رہا تھا۔ اب چڑ کر رہ نہ سکا۔

”سنسنگار مکمل ہو گیا ہے تو گرما گرم ناشتا کرو۔“



ترک و وفا

دل جیسے بچھ گیا تھا اور دماغ گرم ہونے لگا۔ مگر منکشی کی نازک حالت اسے غصے کا بھرپور اظہار کرنے نہیں دے سکی تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ نڈھال تھی۔ چلتی تو چکرا کر گر پڑتی۔ وہ لمحے کے ہزاروں حصے میں سمجھ چکا تھا۔ وہ بھوکے رہنے کی وجہ سے گرتی پھر رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر ہزار نعمتوں کے باوجود کچھ نہیں کھاتی تھی، چاہے کھانا ہوتا یا نہ ہوتا پھر اگر خوراک کو پھپھوندی لگ جاتی یا کھانا باسی ہو جاتا تب کہیں مرنے کے قریب پہنچ کر اسے خوراک کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ جیسے اب اتنے دن بعد اسے خوراک کی ضرورت تھی۔ جبکہ کھانا اتنے دن کا اب کھانے کے قابل نہیں تھا۔ باسی شدہ۔۔۔ بدبودار اور خراب ہو چکا تھا۔ کھانا ریٹورنٹ سے آنا بند ہو چکا تھا کیونکہ ذی شاہ نے نئی بکنگ ابھی نہیں کروائی تھی۔ یہاں آ کر اتنا مزہ کھانا ڈرم میں اٹتے ہوئے اس کا دل بہت برا ہوا تھا۔ نعمتوں کی ایسی ناقدری اور ناشکری؟ اب جبکہ کھانے کو کچھ نہیں تھا، بریڈ۔۔۔ اور کیک وغیرہ باسی ہو چکے تھے، کھانا ڈرم میں الٹا جا چکا تھا۔ اب اسے خوراک کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور وہ رس بھری کا جار پکڑے نڈیدوں کی طرح مر رہا کھا رہی تھی، جیم اور مرے کے علاوہ گھر میں اور کچھ نہیں تھا۔ خالی معدے میں کچھ اترتا تو منکشی کے حواس بحال ہو گئے تھے۔ وہ شیرے سے لٹھڑے ہونٹ چوستی ذی شاہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”اتنے دن سے کہاں غائب تھے؟ جیسے بھول ہی گئے تھے۔“ وہ سر جھکائے شکوہ کر رہی تھی۔ اداس، غمگین اور نمتاک۔۔۔

”تم کوئی رف ہوئی فائل نہیں جسے بھول جاؤں۔“ وہ ناراضی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا گھر میں بکھرے پھیلاوے کو دیکھ کر غصہ دو چند ہو رہا تھا۔ وہ تندرست ہونے کے باوجود گھر کی صفائی اور پھیلاوا نہیں سمیٹ سکتی تھی۔ منکشی اتنی بے حس اور بے پروا کیوں تھی؟ اسے بھلا غصہ کیوں نہیں آتا؟ ایک تو کھانے کی ایسی بے حرمتی اور دوسرا گھر کی بے

پچتا بجاتا کارنوالے کمرے تک گیا تھا۔ توقع کے عین مطابق بیڈروم کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔ منکشی کا کبل زمین کو سلامی دے رہا تھا۔ نیچے، کشن، زمیں بوس تھے، دودھ کی بوتل جوں کی توں پڑی تھی تاہم پانی کی بوتل خالی تھی۔ فروٹ بھی ویسا جیسا تپسیا پڑا تھا، یعنی محترمہ نے کھانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کھاتی تھی جس سے زندہ رہ سکے۔ مگر یہاں آ کر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ تب کھاتی تھی جب مرنے کے قریب ہو جاتی، وجود بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو جاتا، طے پھرنے میں دشواری۔۔۔ آ جاتی، کمزوری کی وجہ سے چکر آنے لگتے۔ وہ ذی شاہ کی زندگی میں آنے والا عجیب۔۔۔ کردار تھی۔ اور اپنی حرکتوں سے اسے حیران کر رہی تھی۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اتنی عجیب لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے ذی شاہ کے بے انتہا اصرار اور مجبور کرنے پر بھی ناشتا نہیں کیا تھا۔ وہ اسے بھوک نہیں ابھی کہہ کر ناشتا رہی تھی۔ سو وہ مزید اصرار کیے بغیر خود ڈٹ کر ناشتا کر کے ایک ڈیڑھ گھنٹا گزارنے کے بعد واپس آ گیا تھا۔

اگلے کچھ دن وہ تین وقت کا کھانا ریٹورنٹ سے بکنگ کے ذریعے منگواتا رہا تھا۔ ہوم ڈیلیوری سروس کی بدولت کھانا تین وقت ویس ہاؤس میں ڈیلیور ہو جاتا تھا۔ وہ اگلا ڈیڑھ ہفتہ ویس ہاؤس جا ہی نہیں سکا۔ انٹی نیوٹ کی مصروفیت نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ تاہم وہ اتنا ضرور جانتا تھا منکشی کا پیرا اب ٹھیک ہے، اسے چلنے پھرنے میں دشواری کا سامنا نہیں۔۔۔ کھانا بھی اسے تین وقت مل رہا تھا، اپنے تئیں وہ بڑی ذمے داری کے ساتھ اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ مگر یہ تو اسے چھٹی کے دن پتا چلا تھا کہ اس کا بھیجا تمام کھانا اور کھانے پینے کا سامان کچھ تو پھپھوندی لگ کے خراب ہو گیا تھا اور کچھ کچھ جوہوں نے اپنے پیٹ میں اتار لیا تھا۔

ذی شاہ کو منکشی کے اس عمل نے دھوکا پہنچایا تھا۔ یعنی اسے ذی شاہ کے جذبات کی کوئی پروا نہیں تھی؟ وہ اس کی محبت اور خلوص کو ایسے خاک کر رہی تھی؟ اس کا

اگرچہ بہت سرسری انداز میں عام لہجے اور بے پروائی سے پوچھ رہا تھا پھر بھی افرایم ڈرارک گیا۔ اس کے رکنے کی وجہ موبائل کی وائبریشن تھی۔ اس کا فون بج رہا تھا یعنی کوئی آفیشل کال آگئی تھی۔ پھر وہ ذی شاہ سے ایکسکوز کرتا اپنے آفس چلا گیا تھا اور ذی شاہ سر جھٹک کر ڈائٹنگ روم میں آ گیا۔ افرایم کی میچن میں تھیں، افریشم فون پر بات کر رہی تھی جبکہ ایمل کھانے میں مصروف تھی۔ اس نے مشترکہ طور پر سب کو سلام بولا تھا تب ایمل کریم کیک کھاتے ہوئے تاگ (ہیلو) کہنے کے بعد دوبارہ سے اپنے شغل میں مصروف ہو گئی تھی۔ افریشم کچھ غلٹ میں دکھائی دے رہی تھی۔ اسے مسکرا کر سلام کہا اور پھر فون پہ مصروف ہو گئی۔

”عیسیٰ نے ناشتا کر لیا؟ اس کی طبیعت کیسی ہے؟ میں بس نکل رہی ہوں، عیسیٰ کو فون پکڑاؤ۔۔۔“ افریشم اشارے سے سب کو چیوس بولتی باہر نکل گئی تھی۔ تب آئی اور ایمل بھی اس کے پیچھے بھاگیں۔

”بیٹا۔۔۔ تمہارا ناشتا میز پر لگا دیا ہے۔ میں اور ایمل ذرا افریشم کو چھوڑنے جا رہی ہیں۔ تم دھیان سے ناشتا کر لینا۔“ آئی نے معذرت خواہانہ انداز میں اجازت چاہی تھی۔ پھر وہ اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی تھیں۔ ذی شاہ نے ان کے چلے جانے کے بعد گہری سانس لی پھر جیسے ہی سجائی میز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ قدرت نے اسے ایک سنہرا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ جیسے نہال ہو کر ناشتے کے لوازمات پیک کرنے لگا۔ آج اس نے بیڈروم کی کھڑکی کا جالی دار سفید مہین پردہ اٹھا کر ویس ہاؤس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ سیدھے طریقے سے جاسکتا تھا تو پھر خود کو انتظار کی کوفت میں جتلا کیسے کرتا؟

منکشی کا رین کوٹ کدھے پر لٹکائے وہ ٹفن میں ناشتا پیک کیے دوسرے ہی لمحے ویس ہاؤس میں موجود تھا۔ بالکل کل والا ہی منظر، گندگی، بے ترتیبی، پھیلاوا۔۔۔ جوتے، کپڑے، جرابیں، بکھری پڑی تھیں۔ برتن، کشن، کتابیں، اخبار تک کارپٹ پر گرے تھے۔ وہ

میں اب آفس کے لیے نکلتا ہوں۔“ افرایم نے اس کا کدھا ہلایا تھا۔ پھر بازو بوجھتی بچے آنے لگا تب اس کی نگاہ زنا ندرین کوٹ پر پڑی تھی۔ وہ ایک دم ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

”یہ رین کوٹ کس کا ہے؟“ سوال میں سادگی نہیں تھی البتہ لہجہ ضرور سادہ سا تھا۔ ناول اسٹینڈ پر لٹکا رین کوٹ سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

”آں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔“ ذی شاہ رک سا گیا۔ ”یہ کل میں لایا تھا۔۔۔۔۔“ اس سے بات نہیں بن پڑی تھی۔ مگر پھر بھی افرایم اتنی سی دلیل پر مطمئن سا ہو گیا تھا۔ اس نے مزید کوئی سوال نہیں پوچھا تھا۔ بلکہ جاتے جاتے صرف اتنا کہا۔

”ہیرنج کا ڈائریکٹر، میرا بہنوئی تمہیں پسند آیا؟ میں نے اسے تمہارا نہیں بتایا۔ ورنہ شاندار پروٹوکول دیتا۔ تم نے منع جو کر رکھا تھا۔“ افرایم کو قلع سا ہوا۔ کیا تھا جو ذی شاہ بتانے دیتا۔ اس کے بہنوئی کی جرات تھی جو وہ صرف پرو فیشنل ڈیلنگ کرتا۔۔۔۔۔ مگر یہ روڑیہ جان دینے والا اس کا دوست۔۔۔۔۔ اس نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کاروبار میں رشتے داروں کے ٹیلنے نہیں بجانے۔۔۔۔۔ ورنہ تو صورت حال کچھ مختلف ہوتی۔

”بہت اچھا کیا تم نے۔۔۔۔۔ اور ویسے تمہارا بہنوئی بہت شاندار ہے۔ ایک دم چاکلیٹی ہیرو۔۔۔۔۔ بس تھوڑا سنجیدہ تھا۔“ اس کی آنکھوں کے سامنے علی عیسیٰ کا شاندار سراپا جگمگا گیا۔ کیا تھا جو افرایم کے بہنوئی کا نام علی عیسیٰ نہ ہوتا۔۔۔۔۔ کچھ اور ہو جاتا مگر علی عیسیٰ نہ ہوتا۔۔۔۔۔ مگر اس کے چاہنے سے بھلا کیا ہو سکتا تھا؟ ہر خواہش پوری ہونے کے لیے تو نہیں ہوتی۔

”سنجیدہ تو نہیں۔۔۔۔۔ خیر آفیشل ایٹوز پر بے انتہا سنجیدہ ہو جاتا ہے۔“ افرایم کچھ سوچ کر بڑے پیار سے علی عیسیٰ کا ذکر کر رہا تھا۔ تب ذی شاہ اس کے برابر چلتے ہوئے ذرا سرسری سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”ہیرنج کے علاوہ کوئی اور کمپنی ایسی نہیں، جس کا مالک پاکستانی ہو اور جس کا نام بھی علی عیسیٰ ہو۔“ وہ



**نہیں رہا اب**

آج غیر کی محفلوں میں وفا کا پیکر بنا ہوا ہے کبھی وہ اپنا بھی راز داں تھا، نہیں رہا اب اسی کے دم سے ہماری سانسیں رواں دواں تھیں ہمارا دلبر، ہماری جاں تھا، نہیں رہا اب غم جدائی کو رفتہ، رفتہ تھپک تھپک کر سلا دیا ہے جو درد آنکھوں سے عیاں تھا، نہیں رہا اب ہمارا ہر اک شوق سلامت تھا اس کے ہوتے ہمارے سر پہ بھی سائبان تھا، نہیں رہا اب زمانے کی ہر بلا سے ہم کو چھپا کے رکھتا، پچا کے رکھتا جیاجی اپنا وہ کل جہاں تھا، نہیں رہا اب شاعرہ: سیدہ جیابا عباس، تلہ گنگ

جذباتی لڑکی کیا کرنے والی تھی؟ وہ اسے سنک کی طرف بڑھتا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ پھر اس نے صابن سے رگڑ، رگڑ کر ہاتھ دھوئے تھے۔ پھر ہاتھوں کو خشک کیا اور الماری سے کھینچ کھانچ کر صاف دھلا ہوا کپڑا نکال کر کہیں اندر چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اس نے سینے سے کچھ لگا رکھا تھا۔ اور وہ گیلے چہرے کو رگڑتی اس کے سامنے تن کے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ کیا کرنے والی تھی؟ اس کا ارادہ کیا تھا؟ دو سینڈ پیلے ذی شاہ کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

”مقدس قرآن کی کھاؤ قسم! تم مجھ سے نفرت نہیں کرو گے، کسی بھی صورت میں، کسی بھی حال میں..... تم مجھ سے محبت کرو گے اور مجھے اکیلا نہ چھوڑو گے کم از کم میرے مرنے کی مدت تک۔“ منکھے اس کے سامنے سفید کپڑے میں لپٹا قرآن لیے کھڑی تھی، وہ جیسے سراپا حیرت بن گیا تھا۔ یہ منکھے کیا کہہ رہی تھی؟ اس کا دماغ تو ٹھیک تھا؟ حواس تو قائم تھے؟ جیسے قرآن کی ہیبت اس کے دل پر طاری ہو گئی تھی۔ وہ سرما

ہو سکتیں۔“ وہ جیسے بے بس سا ہو گیا۔

”تم..... تم بہت اچھے ہو، میرے خیالوں سے بڑھ کے مگر میں اچھی نہیں ہوں۔“ اس کے بوجھل پن کی وجہ ذی شاہ کو سمجھ آ گئی تھی۔ وہ خود ترسی کا شکار تھی۔ تنہائی نے اس کی مثبت سوچوں کو نگل لیا تھا۔ اس کے اندر تحریک پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ذی شاہ کو لگا تھا اس کے سامنے ایک اور مالا آکھڑی ہوئی ہے، زندگی سے بیزار، دیران اور جیسے اپنی سانسیں پوری کرتی ہوئی۔ اس عمر میں یہاں کی لڑکیوں کے بے شمار کام اور بے انتہا مصروفیات ہوتی تھیں۔ بوائے فرینڈز، پارٹیاں، پنگاے، فنکشن، پکنک ٹرپ مگر یہ لڑکی ہر چیز سے بیزار تھی۔ خود سے بھی، ماحول سے بھی اور زندگی سے بھی آخر ایسا کیوں تھا؟

”یہ صرف تمہاری سوچ ہے اگر تم اچھی نہ ہوتیں تو میں تمہارے قریب نہ بیٹھا ہوتا، مجھے انسانوں کی زیادہ نہ سہی، کچھ تو پہچان ہے۔“ ذی شاہ نرمی سے مسکرایا۔

”تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“ وہ بے آواز رونے لگی تھی، گیلی آنکھیں، مکھن کی نکیہ جیسا چہرہ..... ذی شاہ کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ گندی سندی یہ لڑکی اسے کتنی عزیز ہو چکی تھی۔ وہ اسے کس طرح سے بتاتا؟ کس طرح سے سمجھاتا۔

”میں جاننے کے لیے ہی تو تمہارے پاس آیا ہوں۔“ وہ پھر سے مسکرا رہا تھا۔ نرم سی حوصلہ افزا مسکراہٹ تھی۔ منکھے کے دل کو ڈھارس سی پہنچی۔

”جان کر کیا کرو گے؟ مجھ سے نفرت.....؟ جو میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔“ اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ وہ اپنے ننگے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ پیروں کے ناخن کتنے بڑھ چکے تھے۔ اسے کاٹنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ اسے تو کبھی کسی بات کا خیال نہیں آتا تھا۔

”ایسا کبھی نہیں ہوگا.....“ ذی شاہ کا لہجہ مستحکم تھا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، من ہائیم کی خطی لڑکی اس سے اتنا بڑا پہاڑ جتنا عہد لینے کھڑی ہو جائے گی۔ وہ لہجہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا تھا۔ بھلا یہ پاگل، جنونی اور

بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا جیسے اٹھنے کے لیے پر توں رہا تھا۔ کیونکہ اپنا رنر حلیہ اسے الجھن زدہ کر رہا تھا۔ وہ تو ہر لمحہ اتنا بن گھن کر تیار شیار رہتا تھا جیسے ابھی کسی کا ولیمہ اٹینڈ کر کے آیا ہو۔ نہایا دھویا، تروتازہ، ہیکیل، خوشبودار..... بہترین لباس زیب تن کیے، جس پہ منگن ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی تھی اور اب خوب میلا، میلا ہو رہا تھا مگر اسے اپنے حلیے پہ قطعاً افسوس نہیں تھا۔ وہ اپنی خوشی سے یہ سب گر چکا تھا۔ در پردہ منکھے پر یہ جتنا مقصود تھا کہ وہ کس قسم کا ماحول اپنے آس پاس بنائے ہوئے ہے؟ ایسے حالات رہے تو کون یہاں جھانگے گا؟ وہ خود ہی ایک دن دھول مٹی ہو جائے گی اور یہ کہ اپنی زندگی کی بے ترتیبی کو اسے خود ہی بدلنا ہوگا۔ وہ جیسے لفظ جوڑ رہا تھا۔ جب منکھے اپنی گیلی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے اس کا کندھا ہلانے لگی تھی۔

”یہ سب جو تم نے کیا؟“ وہ اتنی بے خود اور حیران تھی کہ اس سے بات کرنا بھی محال تھا۔ جیسے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ جیسے وہ بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

”یہ سب..... مجھے کرنا ہی تھا۔“ ذی شاہ اسی کے انداز میں بولا تھا۔ ”تا کہ تمہیں بتا سکوں، بے ترتیبی مجھے پسند نہیں۔ گندی سے مجھے نفرت ہے اور ایسے کام پاکستان میں میرے گھر کے نوکر کیا کرتے ہیں۔“ اس نے منکھے کی گیلی آنکھوں میں خوشی اترتی دیکھی تھی۔ وہ سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ رہی تھی۔ لکیروں میں کیا لکھا تھا؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ وہ بددل ہو گئی تھی۔

”یہاں سے تمہیں کیا ملے گا؟“ اس نے گردن موڑ کر منکھے کی ہتھیلی پر نظر جمائی۔ ”اگر کچھ پانا چاہتی ہو تو عمل کی طرف توجہ دو..... عمل کے بارے میں مجھ جیسا ریٹیکل بندہ ہی تمہیں بتا سکتا تھا۔ خود اپنے ہاتھوں سے عمل کر کے..... جب کل میں آؤں تو یہاں، وہاں کچھ بکھرانہ ہو۔“ وہ جیسے اسے تنبیہ کر رہا تھا۔ منکھے نے سر جھکا لیا۔ گیلی آنکھیں ایک تو اتر سے بہ رہی تھیں۔

”اللہ یہ اس کی آنکھیں کبھی خشک نہیں

ترتیبی..... اس کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ اوپر سے محترمہ کے شکوے کمال کے تھے۔

”تو پھر کہاں غائب تھے؟“ آنسو بلا وجہ ہی گرنے لگے تھے۔ پلوں کی گھنی جھالروں میں اٹکنے لگے تھے۔ سمندر آنکھیں قطرہ، قطرہ بہ رہی تھیں۔

”کام میں مصروف تھا۔“ وہ چڑ کر بولا۔ پھر جیسے اس پر کوئی بھوت سوار ہو گیا تھا۔ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر لاؤنج سے لے کر چکن تک، ایک، ایک چیز سمیٹ ڈالی تھی۔ کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر لاؤنج کے لیے رکھ آیا تھا، جوتے سارے کینٹ میں گھسائے۔ برتن چکن میں سنک کے اندر رکھ کر ٹوٹی چلائی اور سارے برتن دھو دھلا کر حلیف میں سجا دیے تھے۔ فرنیچ اور کینٹ تک کو دھو ڈالا۔ الماریوں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے بیڈ شیٹ نکالی کارنروالا کراچک دک گیا تھا۔ باقی کمرے لاکڈ تھے۔ بس لاؤنج، کارنروالا کراچک روم کھلا تھا جس کی حالت انتہائی خراب تھی اور اب جیسے کسی نے جادو کی چھڑی پھیر کے منظر بدل دیا تھا۔

وہ نہ جانے کتنے دن سے مورگن روک پہنے ہوئے تھی۔ ڈھیلا ڈھالا سالہا چوڑھ چوہروں میں الجھ رہا تھا مسللی ہوئی سلوٹ زدہ جگہ جگہ سے اکھڑی جھالریں جھول رہی تھیں، کچھ فرش پر لنگ رہی تھیں۔ اس کے بال اتنے بوسیدہ اور گندے تھے جیسے صدیاں بیت چکی تھیں اور انہیں شیمپو نہیں کیا گیا تھا۔ الجھے، بے رونق مگر انتہائی لمبے، یقیناً بالوں کا رنگ بلوٹی تھا مگر خیال نہ رکھنے کی وجہ سے اپنی اصلی رنگت کھو چکے تھے۔

وہ ہکا بکاسی چکن کو جاتے اسٹپس پر بیٹھی اسے ادھر ادھر گھوم کر کام کرتے دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں تیر اور خوشی کے آنسو تھے، گیلی آنکھوں والی لڑکی منجھ پیٹھی جیسے سفید برف کا کوئی مجسمہ ہو۔

اور ذی شاہ ایک طائرانہ نظر ڈال کر جیسے مطمئن اور پرسکون ہو کر اس کے قریب آخری کونے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اگرچہ اس کا اپنا حلیہ بگڑ چکا تھا تاہم اس کے آس پاس کا ماحول شانت کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ



کے آغاز میں پسینہ، پسینہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی لہر اتر گئی۔

”قرآن پر سچے مسلمان، سچی قسم اٹھاتے ہیں۔“ منکھے کسی دیوار کی طرح تن کے کھڑی تھی، جیسے جواب لیے بغیر ملنے والی نہیں تھی۔ وہ وحشت کے عالم میں دنگ کھڑا تھا۔ جیسے نہ پیچھے ہٹ سکے گا، نہ آگے بڑھ سکے گا اور منکھے کی گیلی آنکھوں میں دھیرے، دھیرے استہزائیہ پھیلنے لگا تھا۔ جیسے اس کے بودے عہد کی کرچیاں اسے لہو، لہو کر رہی تھیں۔ وہ اندر سے خود بھی ٹوٹ رہی تھی۔

”ایسا دعویٰ کیوں کرتے ہو، جس پر قائم نہ رہا جاسکے۔ تم مجھ سے نفرت کرو گے اور ضرور کرو گے۔“ منکھے نے مقدس قرآن کو سینے سے چٹایا اور پلٹنے لگی تھی جب وہ کسی غیر مرئی قوت کے زیر اثر منکھے کے سامنے تن کر آکھڑا ہوا تھا۔ لمحے کے آخری حصے میں فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب بس عہد کو مہرانا تھا اور قسم کا بار اٹھانا تھا۔

”سچے مسلمان..... قرآن پر سچی قسم اٹھاتے ہیں۔ قسم ہے قرآن کی، جو محمد پر اترتا..... جن کے بعد نہ کوئی نبی آیا اور نہ آئے گا..... میں قرآن کو گواہ بنا کر کہتا ہوں..... انسانوں سے نفرت کا کوئی اختیار نہیں رکھتا..... ہر بندہ خود اپنے عمل کا سزاوار ہے اور میرے پاس جزا اور سزا کا کوئی اختیار نہیں..... میں تمہیں چھوڑ دوں؟ یہ وقت پر منحصر ہے، تم مجھے مل جاؤ تو یہ میرا نصیب ہے۔ بہر حال تم سے محبت تو میں کرتا رہوں گا۔ جان رہے یا نہ رہے..... گریقیں کر سکتی ہو تو کر لو.....“

ذی شاہ نے بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ مقدس قرآن کو اس کے ہاتھ سے لے کر چوما اور آنکھوں سے لگایا تھا پھر وہ اندر کہیں جا کر کسی الماری کی سب سے بلند جگہ پر قرآن کو جزدان میں لپیٹ کر رکھ آیا تھا۔ جب وہ واپس آیا تب بھی منکھے کسی بت کے مانند ساکت کھڑی تھی۔ دم بخود ساکت اور متحیر..... اتنی حیران کہ ہاتھ لگانے سے بھی نہ چوکتی، جھنجھوڑنے سے بھی نہ چوکتی، ہلانے سے بھی نہ چوکتی۔

”میں نے زندگی بھر میں اتنے حسین الفاظ کبھی

نہیں سنے۔“ وہ کسی خواب کی کیفیت میں تھی۔ وہ بادلوں کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ اس کے پیر زمین پر نہیں تھے۔ وہ نرم گولوں کے رتھ پر سوار تھی۔ وہ زمین پر آنا چاہتی تھی مگر وہ خواب کے سفر میں تھی۔ وہ آنکھ کھولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

”تم بہت اچھی ہو اور اس سے بھی زیادہ اچھے الفاظ کی حقدار ہو۔“ اس کے ہونٹوں پر مسکان اتر آئی تھی۔ ”میں اچھی نہیں ہوں۔“ وہ جیسے جھٹکا کھا کر آسمان سے اتر کر زمین پر آگئی تھی۔ اس کے دل پر قیامت کی گھڑی اتر آئی۔

”یوں مت کہا کرو۔“ ذی شاہ نے نرمی سے ٹوکا تھا۔ ”یہ سچ ہے۔“ وہ ترختی تھی۔

”یہ سچ نہیں ہے۔“ اس کی حلاوت کا کوئی انتہا نہیں تھا۔

”تم نہیں جانتے۔“ منکھے بے بس ہو گئی۔

”میں جانتا بھی نہیں چاہتا۔“ وہ سنجیدہ تھا۔

”مگر مجھے بتانا ہے تمہیں..... بہت کچھ.....“ منکھے نے دونوں آنکھوں کو پھر سے رگڑا..... گیلی آنکھیں اسے الجھن میں گرفتار کر رہی تھیں۔ وہ جھنجھلا رہی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر غصہ آ رہا تھا۔

”مجھے نفرت ہے ان گیلی آنکھوں سے۔“ وہ جیسے اپنی آنکھوں کو نوچ لینا چاہتی تھی۔ ”من ہائیم میں برسات ہوتی تو میں بوار یا بھاگ جاتی تھی۔ نفرت تھی مجھے بارشوں اور گیلی بستیوں سے..... اور آنکھوں کے آنسوؤں سے۔“ وہ زہر خند ہو رہی تھی۔

”تو پھر یہاں کیوں رکی ہو، بھاگ کیوں نہیں جاتیں؟“ اس نے حیرانی کے عالم میں پوچھا تھا۔

”یہ میری سزا ہے، جس چیز سے نفرت کروں، وہیں رہوں، مجھے تو یہ ویسے ہاؤس بھی پسند نہیں۔ پھر بھی یہاں ہوں.....“ منکھے زخم، زخم سی بولی تھی۔ کالج سی سرخ آنکھوں میں جیسے کوئی کہانی تیر رہی تھی۔

”تم خود ساختہ سزاؤں اور احساس جرم میں مبتلا ہو، تم شاید ماضی کے اثر میں ہو۔“ وہ گویا لمحوں میں

منکھے کے اندر تک اتر گیا تھا۔ وہ تھم سی گئی تھی۔ پھر اپنے بالوں کو کھینچ تان کے نوپنے لگی۔ ذی شاہ سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا تھا۔

”خود پر ظلم کیوں کرتی ہو؟ اللہ نے تمہیں اتنی نعمتوں سے نوازا رکھا ہے۔“ وہ ٹوکے بنا رہ نہیں سکا تھا۔ منکھے جیسے لرز کر رہ گئی تھی۔ بھیا تک ماضی نے چہرہ کرایا تھا۔ وہ لٹھے کے مانند سفید پڑ گئی۔

”ہاں..... میں ناشکری تھی، مجھے اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر کرنا نہیں آیا۔“ اس نے پھر سے رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھ گئی بے آواز روتی ہوئی۔ ذی شاہ کو بے انتہا تکلیف ہوئی تھی، وہ اپنے دل سے قریب کسی بھی عورت کے آنسو دیکھ نہیں سکتا تھا۔

”اللہ، اس کے آنسوؤں میں، میں بہہ جاؤں گا۔“ وہ انتہا کا بے بس ہوا تھا۔ منکھے چپ چاپ روتی رہی تھی۔ پھر جیسے تھک ہار گئی۔

”اب کہ میں آؤں تو مجھے ایسی مت نظر آنا.....“ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا تھا جبکہ منکھے ساکت رہ گئی تھی۔

”تم مجھے کیسا دیکھنا چاہتے ہو؟“ منکھے پوچھنا چاہتی تھی مگر وہ نظر سے اوجھل ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر قدم اور ٹپٹپے کے سامنے آ کر رکی..... اسے اپنی صورت دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اپنی انگلیوں پر کٹی تو حیران رہ جاتی۔ جانے آخری مرتبہ اس نے آئینہ کب دیکھا تھا؟ کیا یہ منکھے تھی؟ طلحی، غلیظ، ویران، قحط زدہ سی..... اسے اپنی صورت سے وحشت ہونے لگی۔

☆☆☆

عام تعطیل کے دن افرایم کی فیملی نے ہائیڈل برگ جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ ذی شاہ اگرچہ جانا نہیں چاہتا تھا مگر ایمل اور افرایم کی خاطر چپ سا کر گیا۔ یہ تفریح کا پروگرام ان لوگوں نے ذی شاہ کے لیے ہی تو بنا رکھا تھا۔ وہ منع کرتا تو ان لوگوں کے دل برسے ہو جاتے اور ننھی چھپکلی ناراض ہو جاتی۔ جس کی خفگی اسے گوارا نہیں تھی۔

## ترک و ہفا

وہ اتنے دن سے ویسے ہاؤس بھی نہیں جاسکا تھا۔ جانے منکھے کس حال میں تھی؟ انسٹی ٹیوٹ کی مصروفیت نے اسے چکرار کھا تھا۔ اب صرف چند دن باقی تھے پھر اسے ہیرنچ کو جوائن کرنا تھا۔ اور افرایم چاہتا تھا اس دوران وہ تھوڑا بہت تو جرمنی میں گھوم پھر لے، آخر اس کا جرمنی اتنا حسین جو تھا۔

ہائیڈل برگ کا صرف نام ہی بہت تھا۔ دریائے نیگر کے اس پار..... یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا.....

اپنی قدامت، حسن، جمال کے باعث ہر آنکھ کو سحر زدہ کرتا..... ہائیڈل برگ کا تاریخی قلعہ اور یہاں کی قدیم ترین یونیورسٹی..... تنگ سے گنجان بازار مگر انتہائی صاف شفاف، خوش پوشاک، باوقار چلتے پھرتے لوگ، مرسکون ماحول، نہ شور نہ ہنگامہ..... اپنی، اپنی دھن میں جیسے گن، کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ افرایم اسے جرمنی کی قدیم ترین یونیورسٹی دکھانے لایا تھا۔ اپنی قدامت سے لوگوں کو متوجہ کرتی یہ یونیورسٹی بہت جلال، رعب اور شان سے کھڑی تھی اور اس کے طلبہ اور طالبات جیسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک دوسرے میں گم، مگن، مدہوش کچھ کتابیں پڑھ رہے تھے، کچھ اپنی، اپنی محبوباؤں کی بانہوں میں بانہیں ڈالے گھوم رہے تھے..... اور کچھ تو..... جیسے انہوں نے حد ہی کر دی تھی۔

ذی شاہ جیسے کانوں تک سرخ ہو گیا تھا۔ اگرچہ مغرب میں ایسے مناظر کچھ اچھنبے کا باعث تو نہیں تھے مگر تدریس گاہوں کے کچھ اصول، لحاظ اور قواعد ہوتے ہیں پھر ایسی حرکتوں کے لیے نائٹ کلب، بار، ہب جو موجود ہیں پھر یوں سرعام..... اللہ اکبر..... اس نے گردن موڑ کر ساتھ چلتی ایمل کو دیکھا تھا۔ زیادہ محنت ایمل کی وجہ سے اٹھانی پڑ رہی تھی۔ بچی کے ذہن میں کیا سوچ ابھرنی ہوگی۔ وہ بے چارہ خواہ مخواہ بدحواس ہو رہا تھا۔ بچی کو جیسے پروا نہیں تھی اور افرایم بھی بے نیاز تھا۔ جیسے یہ منظر ان کی آنکھوں کے لیے نئے نہیں تھے۔ سوائس کوئی پروا نہیں تھی۔ ایمل بھی ایسے چل رہی تھی گویا کچھ دکھائی نہیں دیا ہو۔ اس نے اپنی بلی اٹھا رکھی تھی۔ اسی کی سیوا



میں مصروف تھی۔ ذی شاہ کے دل کو تسلی ہوئی۔ اس نے فوراً یہاں سے چلنے کی بات کر ڈالی تھی۔

اب وہ مولکن کور پر کھڑے یہاں کا تاریخی قلعہ دیکھنے کے لیے چل رہے تھے۔ اگرچہ مغربی جرمنی کا حسن ایسا نہیں تھا جس کے سحر سے اتنی جلدی آزاد ہوا جاسکتا مگر پھر بھی اس کا من تو ویس ہاؤس کی طرف اڑا، اڑا جا رہا تھا۔ وہ جلد ہی تفریح سے بیزار ہو گیا۔ افرایم اس کی بے دلی کو نوٹ کرتا ریٹورنٹ سے کھانا کھلا کرواپسی کے سفر پر گامزن ہو گیا تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا، ذی شاہ تھک چکا ہے، تھکاوٹ تو ایل کو بھی ہو گئی تھی۔ سو وہ تمام رستہ سوتی رہی تھی۔ گھر آ کر بھی نیند میں دھت ہو گئی۔

افرایم بھی سونے کے لیے چلا گیا تھا مگر آنٹی نے اسے روک لیا۔ حالانکہ وہ بھی شاور لے کر سونا چاہتا تھا۔ مگر آنٹی کا موڈ کچھ باتیں کرنے کا تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں..... عشق اور مشک چھپائے نہیں چھتے تو آج معاملہ بھی کچھ یوں کھلا تھا۔ اسے نہادھو کر منٹے کی طرف جانے کی جلدی تھی اور آنٹی اسے رک جانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ نیند کا تو بہانہ تھا۔ وہ خواہ مخواہ جمائیاں لے رہا تھا... اور آنٹی جیسے اس کی جمائیوں کو نظر انداز کرتی کچھ اور کہنے کے موڈ میں تھیں۔

”تم آج کل ویس ہاؤس بہت جاتے ہو؟ وہ لڑکی..... کیا نام ہے اس کا.....؟“ آنٹی نے جیسے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کی نیند کو آنکھوں سے ایک جھٹکے کے ساتھ نوج لیا تھا۔ وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور حیران ہوا، یہ آج آنٹی نے کیا قصہ چھیڑ دیا تھا؟

”منٹے.....“ اس نے سر جھکا کر جیسے اعتراف جرم کر لیا۔ آنٹی کچھ پل کے لیے چپ ہو گئی تھیں۔ جیسے کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو گئیں۔

”ہاں..... تو وہ لڑکی..... بیٹا کچھ ٹھیک نہیں وہ، تم میرے لیے افرایم جیسے ہو..... میں تمہیں کچھ غلط کرتا..... یا کنویں میں گرتا نہیں دیکھ سکتی۔“ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ کیسے نرم، نرم الفاظ میں اسے منع کرتیں۔ وہ ان کے بیٹے کا بہت پیارا دوست تھا۔ وہ

اسے کسی مشکل میں گرفتار نہیں دیکھ سکتی تھیں اور منٹے کی طرف اس کے بڑھتے قدم کو روکنا بھی محال تھا۔

”نہیں آنٹی..... ایسا کچھ بھی نہیں، منٹے بہت اچھی لڑکی ہے، بیمار ہے تو میں نے انسانی ہمدردی.....“ ذی شاہ سے بھی بات بن نہیں پائی تھی۔ وہ جھوٹ بولتے، بولتے رک گیا تھا۔ جیسے جھوٹ بولنا اسے مناسب نہیں لگا تھا۔ وہ محض انسانی ہمدردی میں تو ویس ہاؤس نہیں جاتا تھا۔ یہ تو محبت کا قصہ تھا، جسے آنٹی کے سامنے چھیڑنا مناسب ہرگز نہیں تھا۔ پھر آنٹی احتیاطی تدابیر پہ لیکچر دینا شروع کر دیتیں۔ ویسے وہ نہ بھی بتاتا تب بھی آنٹی ایک عمر کا تجربہ رکھتی تھیں۔ انہیں بھی بہت کچھ نہ سہی، کچھ تو نظر آ رہا تھا۔

”انسانیت کے ناتے مدد کرنا غلط نہیں..... پر وہ لڑکی بہت بڑی ساحرہ (جادوگرنی) ہے۔ ایک نمبر کی ڈراما باز ہے، بہت مکار اور ہوشیار..... تم اس سے دور رہو بیٹا!“ آنٹی نے بڑی محبت اور خلوص سے جیسے اسے سمجھانے اور خبردار کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ بھلا سمجھانے سے سمجھنے والا تھا؟ اسے لگتا، وہ روکنے اور روکے جانے کی اسٹیج سے آگے نکل گیا تھا۔ کوئی منٹے کے بارے میں کچھ بھی بتا دیتا۔ کیا وہ اس پر یقین کر سکتا تھا؟ وہ منٹے پر غلط گمان کر سکتا تھا؟ شاید کبھی نہیں، اس کا دل گواہی دے رہا تھا۔ آنٹی اسے منٹے کے پاگل پن، جنون اور ڈراموں کی کہانیاں سنارہی تھیں اور اس کا ذہن منٹے میں الجھا تھا۔ جانے اس نے کھانا کھایا یا نہیں.....؟ وہ بھوکی ہوگی؟ کہیں کوچ نہ کر گئی ہو؟ آخر تین چار دن سے وہ اسے دیکھ بھی نہیں پایا تھا۔ جانے منٹے کس حال میں تھی؟ اسے یاد کرتی ہوگی؟ خفا ہوگی؟ مس تو لازمی کرتی ہوگی۔ روتی بھی ہوگی۔

”دیکھو بیٹا! تمہیں سمجھانا میرا فرض تھا۔ یقین مانو وہ لڑکی اچھی نہیں۔“ آنٹی کچھ بتاتے، بتاتے رک گئی تھیں پھر ان کا دھیان جیسے بٹ گیا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی ذی شاہ کی خلاصی کروا گئی تھی۔ وہ آنٹی کو فون سناتا دیکھ کر چپکے سے اٹھ کر بیٹھوں کی طرف جا رہا تھا جب آنٹی کی

خوشی سے سرور آواز اس کے کانوں تک پہنچی تھی۔ جانے کس کا فون تھا؟ وہ رک سا گیا تھا۔

”عیسیٰ کا فون ہے..... افرایم اسپتال میں ہے، بیٹا ہوا ہے۔“ وہ مارے مسرت کے رو پڑی تھیں۔ افرایم کی طبیعت خراب رہتی تھی۔ بی پی پر اہلیم تھا۔ بھی آنٹی کو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اب جیسے سارے وسوسے اڑ چھو گئے تھے۔ وہ خوشی سے بے حال افرایم کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد گرتی پڑتی ایل بھی آگئی۔ خوشی سے کودتی، جھلاٹیں لگاتی، افرایم، آنٹی اور ایل اسپتال کے لیے نکل گئے تھے۔ انہیں خوشی ہی بہت عظیم ملی تھی۔ رات سے پہلے واپسی ممکن نہیں تھی۔ اس کے کانوں میں آنٹی کی سرور آواز اتر رہی تھی۔ جیسے اس کے اندر کوئی بھالے اتار رہا تھا۔

جیسے قطرہ، قطرہ زہر اتار رہا تھا۔ وہ اپنے اندر کرب کی لہروں کو اٹھتا محسوس کر رہا تھا۔ عیسیٰ بہت خوش تھا۔ ”آنٹی افرایم کو بتا رہی تھیں۔ ان کا چہرہ جذبات سے تہمتار ہا تھا۔ اس نے جیسے آنکھیں میچ کر اس منظر سے نگاہ چرائی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہی ٹھنڈا ٹھار، روشن، معطر، صاف ستھرا گیٹ روم اس کے ذہن پر بوجھ لدا گیا۔ دل بوجھل اور اوپ رہا تھا۔ جیسے عیسیٰ کی خوشی اسے اندر سے کاٹ رہی تھی، جیسے اس کی خوشی آگ لگا رہی تھی۔ وہ سر تھامے بیڈ پر ڈھے گیا۔ بنا کسی ٹھوس ثبوت کے عیسیٰ پہ ہاتھ ڈالنا کچھ ناممکن تھا؟ جوش جذبات میں کوئی بھی غلط قدم اسے خود اپنی ہی نظر سے بھی گرا سکتا تھا۔ وہ جذبات میں آکر کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غصے، جوش، جذبات معاملات بگاڑ سکتے تھے۔ اور یہ تو ویسے بھی رشتوں کا بل صراط تھا۔ اسے سوچ سمجھ کر چلنا تھا۔ ایک طرف مالا تھی اور دوسری طرف افرایم کی فیملی پھر عیسیٰ کا افرایم کی فیملی سے بہت گہرا تعلق لگتا تھا۔ بلکہ جو اسے نظر آ رہا تھا، اس پر یقین کرنے کو دل نہیں کرتا تھا۔

علی عیسیٰ، افرایم اور اب ان دونوں کا بیٹا..... ایک ہنستا، ہنستا خوشحال گھر..... وہ کیسے پنا ثبوت کے اس

## ترک وفا

گھر کی عمارت پر ضرب لگا دیتا؟ تھوڑا انتظار تو کرنا ہی تھا۔ کم از کم بندیا کی کال آنے تک..... اور یہ اس کی خوش نصیبی تھی جو آج ہی بندیا کی کال آگئی تھی۔ اس نے بے تابی سے مہی اور مالا کے بارے میں پوچھا تھا۔ تب بندیا نے اسے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں جو اسے جھنجھوڑ کر رکھ گئی تھیں۔ بندیا نے بتایا تھا بلکہ وہ بہت سوچ، سوچ کر بول رہی تھی۔ جیسے مالا کی گفتگو کو ذہن میں دہرا رہی تھی۔ ”عیسیٰ کی کوئی تصویر نہیں مل سکی۔“ وہ مایوس پھر بھی نہیں تھی جبکہ ذی شاہ جیسے بچھ گیا تھا۔

”اور کچھ.....؟“ ذی شاہ نے مایوسی کی لہر اپنے اندر اترتی محسوس کی تھی۔ جیسے وہ ایک دم ڈھے گیا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ وہ کم از کم عیسیٰ کو دیکھے بغیر کیسے ڈھونڈ سکتا تھا؟ ضروری تو نہیں تھا یہی علی عیسیٰ افرایم کا بہنوئی ہوتا اور وہی مالا کا مجرم ہوتا۔ کیا خبر، اس کی نظر دھوکا کھا رہی ہو؟ کچھ بھی تو متوقع تھا۔ کچھ بھی غلط یا صحیح ہو سکتا تھا۔ جبکہ جلد بازی اور عجلت سوائے نقصان کے کچھ نہیں دے سکتی تھی۔ اور وہ کوئی نقصان اٹھا کر بھائیوں جیسے دوست افرایم کی نظر سے گرنے نہیں چاہتا تھا، نہ اسے کوئی دکھ دینا چاہتا تھا۔

”اور بہت کچھ ہے۔“ بندیا جیسے اس کی خاموشی کو محسوس کر کے مڑ جوش ہو گئی تھی۔ وہ کچھ چونک گیا تھا۔ ذرا ٹھنک گیا تھا۔

”کیا.....؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا، اس کا روال، روال کان بن گیا۔

”مالا نے بتایا ہے، علی عیسیٰ کے پاس ایک گاڑی ہے۔ اس کی لاڈلی benz جو اسے بہت پیاری ہے اور یہ کہ علی عیسیٰ کو بواریا سے بہت محبت ہے، اس کی ایک بہن مومن کے متعلق بھی مالا نے بہت کچھ بتایا ہے۔ ذرا رکو میں تمہیں بتاتی ہوں۔“ بندیا تھوڑے وقفے کے بعد پھر سے بولنے لگی تھی۔ شاید فون کان سے لگائے کچن میں چلی گئی تھی۔ کھٹ پٹ کی آوازوں سے وہ یہی اندازہ لگا سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ لائن پر دوبارہ آگئی..... اس کی آواز میں



ترک وفا

تھی مگر وہ جیسے دھاڑ کر رہ گئی۔ ذی شاہ پھر ہم گیا تھا۔ اگرچہ یہ سہنا مصنوعی تھا پھر بھی.....

”ہاں..... میں نے بھی یہی کہا تھا۔ اتنا معصوم بچہ شیر اودھ چیتا کیسے ہو سکتا ہے۔ منا تو چھپکلی جیسا ہے۔ واٹ اور جگلا سا..... اس بات پر مجھے افریٹم نے تھپڑ مارا..... افریٹم بھٹا گیا اور عیسیٰ ہنستا رہا۔ میں رو پڑی تھی تو تب افریٹم کو اور غصہ آ گیا۔ اس نے کہا..... اتنی گندی مخلوق سے میرے بچے کو تشبیہ کیوں دی؟ کیا یہ دیواروں سے چپکا، ڈراؤنی چھپکلی جیسا ہے؟ تب..... تب مجھے عیسیٰ کے ہنسنے کی وجہ سمجھ آ گئی۔ اور افریٹم کے غصے کی بھی۔ میرا دل چاہا، میں تمہارا قیرہ بنا دوں؟“ ایمل آگ بگولا ہو کر چیخی تھی۔ تب ذی شاہ کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ اور پھر وہ ہنس، ہنس کر بے حال ہو گیا۔ اسے لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ کر ایمل کو اور بھی غصہ آ گیا تھا۔ اس نے کشنز کے ڈھیر کو نگاہوں کی زد میں کر لیا تھا۔

”تو کیا میں چھپکلی جیسی ہوں؟“ اس نے کشن کی برسات کر ڈالی تھی۔ ذی شاہ دم دبا کر بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگ نہ سکا۔ ایمل کے نشانے بڑے ٹھیک لگ رہے تھے۔ اسے بجاؤ کرنا مشکل ہو رہا تھا اور ایمل کی بے عقلی اور اپنے راز کھلنے پر ہنسی آرہی تھی۔

”نہ..... نہ میری پیاری بہن تو شہزادی ہے۔“ اگلے آدھے گھنٹے تک وہ ایمل کی جھوٹی سچی تعریفوں میں رطب اللسان رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایمل کا موڈ بہتر ہو گیا۔ بالآخر اس نے غصہ تھوک دیا تھا۔ اور دوبارہ سے سنے کے عشق میں فنا ہونے لگی تھی۔ جب ذی شاہ کو اچانک بندیا کی باتیں یاد آ گئیں۔ علی عیسیٰ کی بہن مون، اس کی لاڈلی benz اور بواریا..... وہ کڑی سے کڑی ملاتا رہا۔ مگر پھر بھی کچھ مسنگ تھا۔ کچھ ادھورا تھا۔ کہیں خالی پن ضرور تھا۔ کچھ نگاہ سے اوجھل بھی تھا۔ کچھ پردے کے پیچھے بھی تھا..... کچھ ایسا ضرور تھا جو کھل کر سامنے نہیں آیا تھا۔ معا سے خیال آیا..... ایمل سے محتاط ہو کر بھی پوچھنا

ذی شاہ کی آنکھوں میں کالج چھینے لگے تھے۔ موبائل اسکرین پر روشن وہ یونان کے دیوتاؤں جیسا روپ سروپ رکھنے والا علی عیسیٰ محبت پاش نظروں سے منے سے بچے کی پیشانی چوم رہا تھا۔ اس کے اندر باہر جسے آگ بھڑکنے لگی تھی۔ کوئی ایک بھی منظر اس کی آنکھوں میں جم کر نہ دیا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اب وہ ایمل کی طرف متوجہ تھا جو اسے کچھ بتا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب کچھ، کچھ برہمی اور غصہ تھا۔ ذی شاہ سمجھ ہی نہیں پایا۔ ایمل کو اچانک کچھ یاد آ گیا تھا۔

”میں نے منے کا نام پہلے ملی رکھا، واٹ کیوں..... جو کسی کو پسند نہیں آیا۔ پھر چوزا رکھا..... یہ بھی کسی کو پسند نہیں آیا..... افریٹم نے کہا ہمارا منا تو شیر جیسا ہے، بھلا شیر کوئی کیوٹ ہوتا ہے؟“ ایمل نے ناگواری سے منہ بنا، بنا کر بتایا تھا۔ ان لوگوں نے اس کے رکھے نام ناپسند کیے تھے بھی وہ بھی ان کے رکھے تک نیم رنجیکٹ کر رہی تھی۔ ذی شاہ ذرا دھیان دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اگر ایمل کی بات یہ غور نہ کرتا تو وہ اور بھی ناراض ہو جاتی اور ایمل کی ناراضی سہنا کچھ آسان نہ تھا۔ جبکہ فی الحال وہ سخت غصے میں لگ رہی تھی۔

”پھر عیسیٰ بولا، ہمارا منا تو چیتے جیسا ہے، ہونہ..... چیتا بھی کوئی کیوٹ ہوتا ہے؟ چوزے، بلیاں اور چھلیاں پیاری ہوتی ہیں۔“ ایمل جیسے تمام باتیں پھر سے دہرا رہی تھی۔ اب کہ اس کی نیلی آنکھوں میں شدید غصہ بھر گیا تھا۔ ذی شاہ ہم سا گیا اور اس کی اداکاری کو محترمہ نے کھانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ اور وہ اسے ہی گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

”پھر میں نے کہا..... شیر اور چیتے تو خونخوار اور درندے ہوتے ہیں، ہمارا منا ایسا نہیں۔“ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے پکپکا کر بول رہا تھا۔

”تم نے ٹھیک کہا..... منا، شیر اور چیتا کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنے معصوم سے بچے کو شیر اور چیتے سے تشبیہ دینا مناسب نہیں۔“ اپنے تئیں اس نے ایمل کی حمایت کی

روشن ہوا تھا۔ اسے علی عیسیٰ کی ہنستی مسکراتی مہری آنکھوں میں نئی نظر آ گئی تھی۔ کچھ سوز کچھ درد، کچھ خوشی میں ڈوبی مسکراہٹ..... ایمل نے کھٹ کھٹ کئی پکچرز دکھائی تھیں۔ افریٹم، آئی، افریٹم اور کچھ مزید لوگ بھی تھے۔ یقیناً ان کے ملنے ملانے والے..... مگر وہ تو ایک تک علی عیسیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ ایک پکچر میں وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ بچے کو دیکھتا کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک تصویر میں وہ بچے کے کان میں اذان دے رہا تھا۔ ذی شاہ کو جیسے وحشت ہونے لگی تھی۔ اس کے اندر بھانپنے جلنے لگے۔ دھواں نکلنے لگا۔ آگ بھڑکنے لگی۔

”عیسیٰ نے منے کا نام محمد موسیٰ رکھا ہے۔“ ایمل سرشاری بتا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ موبائل سے بچے کو نکال کر چوم، چوم کر حشر کر ڈالتی۔ پھر وہ موبائل اسے تھما کر اپنی شاپنگ دکھانے لگی تھی۔ وہ بچے کے لیے ڈھیروں کھلونے، کپڑے اور نہ جانے کیا کچھ اٹھالائی تھی۔ اپنے منے سے بھانچے کے لیے وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ ایمل تو اسپتال سے آنا بھی نہیں چاہتی تھی مگر افریٹم اسے زبردستی لے آیا۔ ذی شاہ سے کچھ بھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جالے آنے لگے۔ وہ ایمل کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا مگر پھر بھی وہ اسے سن رہی تھی۔ ہنستی، مسکراتی، کھلکھلاتی، اس کا بس چلتا تو بچے کو افریٹم کی گود سے کھینچ لاتی اور ذی شاہ کو زبردستی دکھاتی۔

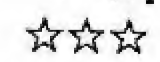
”موسیٰ مجھ پر پڑا ہے، اتنی کیوٹ ہوں میں اور اتنا کیوٹ ہے وہ۔“ وہ جھوم، جھوم کر بتا رہی تھی۔ انتہائی خوش اور ہرجوش.....

”عیسیٰ کو اتنی فکر تھی، میں منے کو لاڈ کر کے بے ہوش نہ کر دوں۔“ ایمل نے ننھے منے کھلونوں کو کارپٹ پر بیکھیر دیا تھا۔ اب وہ ایک، ایک چیز کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ذی شاہ کی نگاہ کے سامنے مالا کا چہرہ آ گیا۔ پارک میں بچے کی طرف لپکتی مالا، اسے چومتی، لاڈ کرتی۔ پھر بچوں کی ڈھیروں شاپنگ کھلونے، کپڑے، منے منے جوتے، جن کا عیسیٰ نے اتنا مذاق اڑایا تھا۔

دریائے نیکر کی لہروں جیسی سنجیدگی تھی۔

”عیسیٰ کی بہن مون، مالا سے شدید نفرت کرتی تھی اور اسی کی وجہ سے.....“ بندیا آگے کی تفصیل بتا رہی تھی۔ اس نے وقفے، وقفے سے جو مالا سے باتیں اگلوئی تھیں، وہ اب ذی شاہ کے گوش گزار کر رہی تھی۔ ذی شاہ جیسے سانس روکے سن رہا تھا۔

”تو گویا سارے فساد کی جڑ یہ مون تھی۔“ ذی شاہ نے بہت دیر کی خاموشی کے بعد نفرت سے کہا تھا۔ اگرچہ مالا نے پوری تفصیل نہیں بتائی تھی تاہم یہ بندیا کے اپنے اندازے تھے۔ جس پر تصدیق کی مہر ذی شاہ لگا رہا تھا۔ بندیا سے بات کرنے کے بعد اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ تو گویا کہانی کچھ، کچھ اسے سمجھ آرہی تھی۔ مگر ابھی بہت سی الجھنیں باقی تھیں... اور بہت سے انکشافات ہونے کا وقت نہیں آیا تھا۔ تاہم اتنا وہ جان گیا تھا کہ علی عیسیٰ اور مالا کی طلاق میں مون حسیب کا بہت اہم کردار رہا تھا۔ اس کا خون جیسے ابلنے لگا تھا۔ رگوں میں کھولنے لگا تھا۔ نفرت اور غصے کا زہر اس کے دماغ پر چڑھ رہا تھا۔ علی عیسیٰ سے نفرت کا گراف کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ کانوں کا کچا مرد..... عورت کے اشارے پر ناپنے والا..... بہن کا تابع..... اس کے اندر آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ شعلے بھڑکتے جا رہے تھے۔ اس آگ میں جل کر کون، کون خاکستر ہونے والا تھا؟ اس بات سے سب ہی انجان تھے۔



رات کو ایمل اور افریٹم واپس آ گئے تھے۔ اور وہ جو اتنے گھنٹوں کی ذہنی اذیت کے بعد اب ویس ہاؤس کی طرف جا رہا تھا۔ اپنے ارادے کو پس پشت ڈال گیا تھا۔ ایمل اسپتال سے آ کر بہت خوش تھی۔ بار بار موبائل میں کھینچی تصاویر دکھاتی۔ پہلے تو وہ بے دلی سے دیکھتا رہا تھا۔ پھر جیسے ٹھنک گیا۔ ہر تصویر میں علی عیسیٰ واضح تھا۔ ننھے سے بچے کو گود میں لیے، کنبل میں لپٹا نو مولود بھلا کون دیکھ رہا تھا؟ وہ تو ہکا بکا علی عیسیٰ کو دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے ایک دم ذہن میں کچھ کلک سے



ترک و وفا

”یہ عیسیٰ ہے، حسیب چاچو کا بیٹا..... اتنا حسین..... اور یہ بچہ کون ہے؟“ بندیا نے ایک ہی سانس میں کئی سوال اٹھل دیے تھے۔ وہ بار، بار علی عیسیٰ کو دیکھے جا رہی تھی۔ حیران، متحیر، ستائشی نگاہوں سے۔ رشک کرنی اور دکھی ہوتی، روتی ہوئی۔

”سنو بندیا! میری بات دھیان سے سنو..... میں علی عیسیٰ تک سمجھو پہنچ چکا ہوں، وہ افرایم کا بہنوئی ہے، اس کی بہن سے دوسری شادی کر چکا ہے، یہ بچہ عیسیٰ کا ہے۔ مگر مالا کو کچھ مت بتانا..... بس مجھے تصدیق کرنی ہے، کیا یہ واقعی وہی علی عیسیٰ ہے؟ تم مالا کو تصویریں دکھاؤ۔“ کچھ دیر بعد ذی شاہ نے بہت بوجھل انداز میں بندیا سے کہا تھا۔ پھر لیپ ٹاپ آف کر کے بیڈ پر ڈھے گیا۔ اب اسے بندیا کی کال کا انتظار تھا۔ وہ لمحہ، لمحہ بے قرار سا انتظار کرنے پر مجبور تھا اور اس کا روم روم جیسے التجا کر رہا تھا۔ دعا کر رہا تھا۔ درخواست کر رہا تھا، ہنسنا کر رہا تھا، گڑگڑا رہا تھا۔

”اللہ، وہ مالا کا علی عیسیٰ نہ ہو..... میرا وہم بس وہم رہے۔ وہ افریشم کا ہی علی عیسیٰ ہو۔“ اس کے اندر سنانے کو بج رہے تھے۔ خاموشی تڑپ رہی تھی۔ اضطراب ٹھائیں مار رہا تھا اگر اس کے تمام خدشات درست نکلے تب وہ کیا کرے گا؟ کون سا قدم اٹھائے گا۔ افرایم کو سچ کیسے بتائے گا؟ ان کی خوشیاں تہیں نہیں کیسے کرے گا؟ افریشم کی زندگی تباہ کیسے کرے گا؟ آنٹی، ایمیل اور افرایم کا سامنا کیسے کرے گا؟ وہ سچ بتا کر ان لوگوں کی ہنسی کا گلا کیسے گھونٹے گا۔ گرجو علی عیسیٰ مالا کا مجرم نکلتا ہے.....؟ ہاں تب وہ افرایم کو سچ بتا دے گا۔ علی عیسیٰ کی زندگی میں زہر گھول دے گا۔ اس سے اپنی بہن کے ایک، ایک آنسو کا حساب لے گا۔ قیامت آتی ہے تو بے شک آئے، اسے کسی کی پروا نہیں تھی، نہ افرایم کی، نہ آنٹی کی نہ افریشم اور ایمیل کی۔ اسے بس مالا کے مجرم کو سزا دینا تھی۔ اس کا اتنا لمبا سفر رانگاں چلا جائے۔ یہ ذی شاہ کو گوارا نہیں تھا۔ وہ علی عیسیٰ سے حساب لینے آیا تھا۔ پھر کیسے نہ حساب لیتا؟ بنا

آئے۔ افرایم بتاتا ہے، پاکستان میں بھی ایک علاقہ بواریا جیسا موجود ہے۔“ ایمیل بھی بواریا کے عشق میں مبتلا تھی۔ جرمنی کے سرسبز دیہات، جو پاکستانی دیہاتوں سے انتہائی مختلف تھے۔ ہر طرح کی سہولیات سے مزین..... جدید، عمدہ.....

”عیسیٰ کو بواریا سے بہت محبت ہے، پر اب وہ بواریا نہیں جاتا۔ تعلق جو ٹوٹ گئے۔“ ایمیل کے باتونی پن نے جیسے اس کے بے شمار مسئلے حل کر دیے تھے۔ بے شمار جالے ہٹ چکے تھے۔ بے شمار راز کھل چکے تھے۔ اب تو کوئی شک نہیں رہا تھا۔ علی عیسیٰ، اس کی مالا کا مجرم تھا اور خود ایسی خوشحال زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی بہن کو نا کردہ گناہوں کی سزا دے کر وہ کیسے چین پاسکتا تھا؟ کیسے سکھ سے جی سکتا تھا؟ وہ اس کی زندگی جہنم بنا کر جانے گا۔ اسے تڑپا تڑپا کر مارے گا۔ اس کے سکھ چین کو چین کر جائے گا۔ اسے عمر بھر کے لیے ایسا مزہ چکھائے گا کہ زخموں پر کبھی کھرند نہ چڑھ سکیں گے۔

اس کا خون ایلنے لگا تھا پھر ایمیل کے اٹھتے ہی اس نے موبائل اٹھایا۔ بلیو ٹوٹھ آن کر کے عیسیٰ کی تصویر اپنے موبائل پر سینڈ کی۔ یہ خیال ابھی، ابھی اس کے ذہن میں آیا تھا۔ اب وہ ایمیل کا سیل وہیں رکھ کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ لاک کر کے اس نے لیپ ٹاپ آن کر لیا۔ اب وہ تمام تصویریں موبائل سے لیپ ٹاپ میں منتقل کر رہا تھا۔

آخر یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟ عیسیٰ کی تصویریں ایمیل سے مانگی بھی تو جاسکتی تھیں مگر اس کام میں رسک تھا۔ اب تو ایمیل کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ذی شاہ نے اس کے موبائل سے صرف علی عیسیٰ کی تصویریں اڑائی ہیں۔

بندیا کو علی عیسیٰ کی تصویریں سینڈ کر کے اسے ارجنٹ کال کی تھی اور فوراً آن لائن ہونے کو کہا تھا۔ بندیا نے حکم کی فوری تعمیل کی تھی۔ عیسیٰ کی تصویریں دیکھ کر وہ شاکڈ رہ گئی۔ دنگ رہ گئی تھی، کئی لمحوں تک منجمد رہی تھی۔ اس سے بولنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

پھر سے اٹھا لیا تھا۔ تصویریں پھر سے روشن ہو گئی تھیں۔ علی عیسیٰ اس کے دل کا ناسور..... وہ زہر خند ہونے لگا۔ آنکھوں میں ہر عکس چھینے لگا تھا۔ اندر زہر اترنے لگا۔

”تھی ناں..... بہت پہلے..... پھر جل گئی۔“ ایمیل ایک دم دکھی سی ہو گئی تھی۔ ”عیسیٰ کو benz سے بڑا پیار تھا۔ پھر خود ہی جلادی.....“ اس کی آنکھوں میں دکھ ہلکورے لے رہا تھا۔ عیسیٰ نے benz کیوں جلائی؟ ایمیل نے یہ نہیں بتایا تھا جبکہ ذی شاہ اندر تک ساکت ہو گیا تھی۔ بندیا نے بھی یہی بتایا تھا۔ علی عیسیٰ کو benz سے بڑا پیار تھا۔ benz اس کا دوسرا عشق..... جسے اس نے خود اپنے ہاتھ سے راکھ راکھ کر دیا تھا کیوں؟ کس لیے؟ عیسیٰ نے بیسز کو کیوں جلا دیا تھا؟

”اچھا یار..... تم Audi, ford, opel کو چھوڑو، مجھے بواریا کے متعلق بتاؤ..... بواریا کون ہے؟ کسی کا اسم شریف ہے؟“ وہی بے پروا سا، بے نیازانہ اسٹائل، وہ ایمیل کو چونکا نے کارسک نہیں لے سکتا تھا۔ جیسی بڑے محتاط لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ ذرا بے پروا، ذرا سرسری اور ذرا بے نیاز سا، ادھر ایمیل قل، قل ہنسی جیسے اس کی لاطمی برچوٹ کر رہی تھی۔ اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اور بواریا کو اسم شریف کے اسٹائل میں پوچھنے پر یا کوئی خاتون سمجھنے پر ہنس رہی تھی۔

”تمہیں بواریا کا نہیں پتا؟“ ایمیل نے آنکھیں گھما کر جیسے اس کی عقل پر ماتم کیا تھا۔ ”ارے..... تم نے بواریا نہیں دیکھا تو سمجھو کچھ نہیں دیکھا..... جرمنی کا صوبہ ہے اور اس کے بے شمار حسین سرسبز دیہات.....“ وہ افرایم کی زبان میں اسے بتا رہی تھی۔ وہ چونک اٹھا۔ بواریا کا ذکر منکھے نے بھی کیا تھا۔ ہاں، وہ بھی بواریا کی بات کر رہی تھی۔

”آہ..... بواریا جانے کے لیے تو سب ہی تڑپتے ہیں۔ وہ جنت کا کوئی خطہ ہے، اتنا حسین کہہ آنکھیں بھر جائیں۔ پر منظر ختم نہ ہوں..... عیسیٰ کا سارا ننھیال بواریا میں تو ہے۔ ہم بھی عیسیٰ کے ساتھ بواریا گئے تھے۔ جسم واپس لے آئے، روح وہیں چھوڑ

تھا۔ پھر جیسے وہ موضوع گفتگو بدل کر گاڑیوں کی بات کرنے لگا۔ نئے اور پرانے ماڈل کی گاڑیاں.....

”تمہیں کون سی گاڑی پسند ہے؟“ اس نے منے کے کھلونوں میں سے ایک کار کو اٹھا کر ایمیل کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ کار پٹ پہ مختلف رنگوں کی کاریں بکھری پڑی تھیں۔ ہر رنگ اور ہر ماڈل کی کار..... ایمیل کو گاڑیوں کا شوق تھا۔ جیسی کھلونوں میں کاروں کا ڈھیر اٹھالائی تھی۔ یقیناً یہ ایمیل کا پسندیدہ ٹاپک تھا۔ وہ کچھ، کچھ مڑجوش ہو چکی تھی۔ اور بکھری کاروں کو بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے..... ferrari پسند ہے۔ آئی لو فراری..... افرایم کو hummar پسند تھی۔ پھر lexus اٹھالایا۔ بڑی مشکل سے اتنے پیسے جمع کر کے خریدی تھی۔ گاڑی کی ضرورت بھی تھی اور شوق بھی۔ افریشم کا دل infinity پر آ گیا تھا مگر ہم لوگ لے ہی نہ سکے۔ افریشم نے اب اپنا شوق پورا کر لیا ہے۔ اس کے پاس دو، دو گاڑیاں ہیں..... bmw اور infinity جیسی..... جب میں شادی کروں گی تو اپنے شوہر سے کہوں گی مجھے فراری لے کر دے..... تم دعا کرنا مجھے اتنا امیر شوہر مل جائے۔“ وہ ایک پیر کار پٹ پر رکھے، گھٹنا فولڈ کر کے صوفے پر رکھے، پتیلی کو گھٹنے پر جما کر منہ اس کے اور سرجائے بڑے جوش کے عالم میں کہہ رہی تھی۔ تب ذی شاہ کی آنکھیں ذرا پھیل گئی تھیں۔

”افرشم کے پاس دو، دو گاڑیاں ہیں..... اور وہ پھر بھی بس سے پہاں آتی ہے؟“ اسے مطلب کی بات بالآخر مل ہی چکی تھی۔ انتہائی عام سے لہجے میں بات کرتا وہ خاصا بے پروا نظر آ رہا تھا۔ اسے اچانک بس اسٹاپ کا منظر یاد آیا تھا۔ افریشم کا بس پر آنا؟

”جب گھر میں نہ ہوں تو بس پر بھی آ جاتی ہے۔“ ایمیل اس سے بھی زیادہ بے نیازی سے کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی تفتیش کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔

”اچھا تو عیسیٰ کے پاس benz نہیں تھی؟“ اس نے بے پروائی سے کہتے ہوئے ایمیل کا موبائل



توک وفا

تھی۔ ذی شاہ کا رُواں، رُواں کان بن گیا تھا۔  
 ”میں نے بہت گناہ کیے ہیں۔“ منکشف نے سر  
 جھکا کر جیسے پہلا انکشاف کیا تھا۔ وہ ذرا بھی نہیں  
 چونکا۔ بس اسے سننا چاہتا تھا۔ ذی شاہ جان گیا تھا، وہ  
 اپنے دل پر کوئی بوجھ لیے پھر رہی ہے۔ اسے کسی ایسے  
 سامع کی ضرورت تھی جو اس کے دل کا بوجھ اتار لیتا۔  
 معاً منکشف نے ذی شاہ کو بری طرح ٹھنکا دیا تھا۔ وہ اس  
 سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ کوئی سوال کر رہی تھی۔  
 ”تمہارے نزدیک گناہ کیا ہے؟“ اب وہ اسے  
 بولنے پر اسکا رہی تھی۔ وہ جیسے لحظہ بھر کے لیے متحیر رہ گیا  
 تھا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد بولتی رہی تھی۔ پھر ذی شاہ  
 نے گناہوں کی ایک فہرست ذہن میں ترتیب دی تھی۔  
 اسے جواب تو دینا ہی تھا۔

”شراب، جوا، جھوٹ، غیبت، چوری، ڈاکا،  
 حرام کاری، یہ سب بھاری گناہ ہیں، کیا تم ان گناہوں  
 کے بوجھ سے شرمسار ہو؟“ اس کا دل رک رک کر چلنے  
 لگا تھا۔ ”جانے وہ کیا بولتی؟ آخر مغربی لڑکی تھی۔ یہاں  
 کیا کچھ نہیں ہوتا تھا؟ گناہ و ثواب سے قطع نظر.....  
 موت کے خوف سے دور، بس آزادی کا ناجائز  
 استعمال، تو جانے یہ کس قسم کے بھاری گناہ کے بوجھ  
 تلے دلی تھی۔“ کاش کہ وہ یہ سوال نہ ہی کرتی..... وہ  
 جیسے خود بھی کسی بوجھ تلے دب گیا تھا۔

”نہیں۔“ اس کے ایک لفظی جواب نے ذی  
 شاہ کو اندر تک شانت کر دیا تھا۔ وہ لمحہ بھر میں ہر بوجھ  
 سے آزاد ہو گیا..... اب وہ کچھ اور پوچھ رہی تھی۔ سر  
 جھکائے گم صم سی، کھوئے کھوئے لہجے میں، بے خودی۔  
 وہ اپنے آپ میں کہاں لگتی تھی۔

”کیا تمہارے نزدیک یہی بڑے گناہ ہیں؟“ اس کا  
 سوال، اسی کی طرح عجیب تھا۔ ذی شاہ پھر سے ٹھنک گیا۔  
 ”ہاں.....“ اس کے ذہن میں گناہوں کی فہرست  
 اب خالی ہو چکی تھی۔ تبھی اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔  
 ”کیا کسی کو قتل کرنا گناہ نہیں؟“ گیلی آنکھوں  
 والی لڑکی اسے دہلانے آئی تھی یا ہلانے آئی تھی؟ وہ لمحہ

”جب سے تم آئے نہیں..... نودن ہو گئے، پانی  
 اور بسکٹ..... ہاں، تمہارے لیے زندہ رہنا تھا۔ ورنہ یہ  
 بھی نہ کھاتی..... مجھے تم تک آنا تھا۔ تمہیں کچھ بتانا  
 تھا۔“ منکشف نے گیلی آنکھیں زور سے رگڑیں۔ وہ رو  
 نہیں رہی تھی پھر بھی آنکھوں سے بہتا پانی..... اس کے  
 اندر آنسوؤں کا شاید چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔  
 ”اللہ، یہ گیلی آنکھیں..... دم نہ نکال لیں۔“ وہ  
 گم صم سا ہو گیا تھا۔ لمحے بھر کے لیے معنی خیز خاموشی کا  
 جال تن گیا۔ وہ بالکل چپ بیٹھی تھی۔ جیسے کوئی ساکت،  
 بے جان مجسمہ ہو، ذی شاہ کو خود ہی مخاطب کرنا پڑا تھا۔  
 اس نے مجسمے کا کندھا ہلایا۔ اسے اپنی طرف متوجہ کیا  
 تھا۔ اس کی خالی آنکھوں میں جھانکا۔

”منکشف! تم خود اپنے ساتھ کتنا ظلم کر رہی ہو،  
 بھوکی رہ، رہ کر کسی دن مرجانا، کوئی دفنانے بھی نہیں  
 آئے گا۔“ وہ کرب انگیز لہجے میں بولا تھا۔ اس کی  
 آنکھیں لبالب بھر گئیں۔ مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ  
 بے خودی کے عالم میں آنکھیں رگڑ رگڑ کر اسے دیکھ رہی  
 تھی۔ جیسے دیکھ، دیکھ کر دل نہیں بھر رہا تھا۔ ذی شاہ  
 جھنجھلا گیا تھا۔ کیسی بے خود، شرابی سی قاتل نظریں تھیں۔  
 ”ایسے کیوں دیکھتی ہو؟“ وہ بڑبڑا ہوا گیا۔

”تو کیسے دیکھوں؟“ منکشف اداسی سے مسکرا دی  
 تھی۔ وہ چپ سا رہ گیا تھا۔ معاً خیال آنے پر چونکا۔  
 ”تم نے کچھ بتانا تھا؟“ اسے جیسے کچھ یاد آیا  
 تھا۔ وہ بھی جانے کیا بتانے کے لیے بے چین بیٹھی تھی۔  
 اس کے توجہ دلانے پر چونک گئی تھی پھر جیسے لمبی، لمبی  
 سانس لینے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی نا کارہ  
 انجن دھواں چھوڑ رہا ہے۔ اس کا وجود بھی جھٹکے کھانے  
 لگا تھا۔ شاید کمزوری کے باعث وہ کانپ رہی تھی وہ بنا  
 سونے کے نکل آئی تھی۔ ذی شاہ کو جیسے ہی احساس ہوا تھا  
 اس نے اپنی چادر اتار کر اسے پہنا دی تھی۔ حالانکہ  
 کمرے میں ہیٹر بھی لگا تھا۔ پھر بھی وہ بری طرح سے  
 لرز رہی تھی۔ لحظہ لحظہ ہونٹ کاٹی منکشف کتنی مضطرب، بے  
 حال اور بے قرار لگ رہی تھی۔ جانے وہ کیا بتانے والی

افراہیم ابھی پہنچا نہیں تھا۔ ذی شاہ نے سوچا، وہ خود ہی  
 ڈسپارچ شیٹ بنا کر گھر چلا جاتا ہے۔ آخر اس نے  
 افراہیم کے گھر سے کوچ کرنے کی بھی تو تیاری کرنا  
 تھی۔ اب تو وہ لمحے بھر کے لیے بھی ادھر نکلنے والا  
 نہیں تھا۔ افراہیم کے گھر رہنے کا مطلب تھا، افریشم،  
 عیسیٰ اور اس کے بچے سے بار بار سامنا ہوتا جو اس کی  
 برداشت سے باہر تھا۔ پھر یہاں سے جا کر ہی وہ  
 افراہیم کے سر پر بھی دھماکا کرنا چاہتا تھا۔ عیسیٰ کے  
 کالے کروتوت بتا کر..... وہ بیڈ سے اتر کر کسی نرس یا  
 ڈاکٹر کو تلاش کرنا چاہ رہا تھا۔ جب کوئی چپکے سے  
 دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ ذی شاہ نے گردن موڑ  
 کر دیکھا تو دھک سے رہ گیا..... زمین جیسے گول، گول  
 گھونٹے لگی تھی۔ وہ جیسے کسی قبر سے اٹھ کر اس کے  
 سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ وہی غلیظ سی مورگن روک  
 پہنے، پہلے سے بھی بد حال، نڈھال اور کمزور، چلتی تو چلا  
 نہ جاتا دیوار پکڑ، پکڑ کر بڑھ رہی تھی۔ پھر جیسے چکر اکر گرنے  
 لگی تھی جب ذی شاہ نے ہاتھ بڑھ کر اسے تھام  
 لیا۔ وہ کوئی ذی شاہ کی منکشف تھی؟ اسے یقین ہی نہیں  
 آیا۔ اتنی بد حال، نڈھال، کمزور، اس سے بولا نہیں  
 جا رہا تھا، وہ اس کی عیادت کرنے آئی تھی یا ایڈمٹ  
 ہونے؟ جانے کتنے دن کی بھوکی تھی؟ اس کا دل اچھل  
 کر حلق میں آ گیا۔ اس نے سہارا دے کر منکشف کو بیڈ پر  
 بیٹھایا تھا۔ پھر جوس کا گلاس بھر کے تھمایا..... اس کا دل  
 مٹھی میں آ رہا تھا۔

”اللہ پہلے کیا مسئلے کم تھے جو یہ ایک نیا امتحان  
 محبت..... اس پرچے میں کہیں نکل نہ ہو جاؤں۔“ وہ افسردہ  
 سا سوچ رہا تھا۔ منکشف کی حالت سخت تشویشناک تھی۔ اس کا  
 بی پی بھی بہت لو لگتا تھا اور آنکھیں جیسے بھتی جا رہی تھیں۔  
 ”کتنے دن سے بھوکی ہو؟“ وہ جیسے بہت غصے  
 اور کرب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ منکشف کی گیلی آنکھیں،  
 پھڑی زدہ ہونٹ، بالوں کا گھونسلا، کمزور وجود..... اس  
 کے دل پر گھونسا سا پڑا تھا۔ وہ فق بیٹھا اسے دیکھے جا رہا  
 تھا، حیران، متحیر.....

کتا بچے کھولے کیسے ناکام لوٹ جاتا۔ وہ اپنے اندر کا  
 سارا زہر علی عیسیٰ کے من میں اتار کر ہی جانے والا تھا۔  
 وہ علی عیسیٰ کو زمین میں زندہ درگور کر کے ہی جانے والا  
 تھا پھر جیسے انتظار کی گھڑیاں تھم گئی تھیں۔ وقت کی نبضیں  
 رک رک گئیں۔ پاکستان سے بندیا کا فون آ گیا تھا۔ وہ  
 قیامت کی خبر لائی تھی۔ ذی شاہ کی سانس تک رک گئی۔  
 دھڑکن تک تھم گئی تھی۔ وجود کے روٹنے کھڑے  
 ہو رہے تھے۔ درد انگڑائیاں لینے لگا تھا۔  
 ”ادھر تو قیامت آگئی ذی بھیا.....! وہ مالا کا علی  
 عیسیٰ ہے، اس نے پیمان لیا اور پچھاڑیں کھا کر بے  
 ہوش ہو گئی۔ ہم مالا کو اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔“  
 بندیا نے روتے ہوئے اس کے جسم سے روح کو کھینچ لیا  
 تھا۔ فون بند ہو گیا اور جیسے ذی شاہ کا دل بھی بند ہو گیا۔

☆☆☆  
 ایک دو تین اور چار دن گزر گئے۔ اسے ایسا بخار  
 چڑھا کہ کئی دن ہوش نہیں آیا۔ افراہیم کی فیملی جیسے  
 دیوانی ہو گئی۔ آئی کی جان کو غم لگ گیا۔ بروسی بچہ خیر  
 سے گھر جائے۔ یہاں کیوں بیمار پڑ گیا۔ انہیں جیسے پورا  
 یقین تھا وہ بس ہاؤس کی ساری نحوست کا اثر ذی شاہ کی  
 جان پر پڑا تھا۔ وہ منکشف کو جی بھر کر کوستی تھیں۔ ایمل اور  
 افراہیم اس کی پٹی سے لگ گئے تھے۔ بیچ میں افریشم بھی  
 اس کی احوال پر سی کے لیے آئی تھی۔ مناسا بچہ اٹھا کر،  
 ذی شاہ کا دل چاہا وہ افریشم کی گود میں سوئے بچے کی  
 ننھی سی گردن دبوچ ڈالے کچھ ایسی نفرت سی ہو چکی تھی  
 اسے علی عیسیٰ اور اس کے بچے سے۔ دل چاہتا تھا، پوری  
 دنیا کو آگ لگا دے۔ جس دن اسے ڈسپارچ ہونا تھا۔  
 یہ اسی دن کی بات تھی۔ وہ جو یہاں سے جانے کے بعد  
 اگلا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا۔ ایک دم منکشف کے لیے بے  
 قرار ہو گیا۔ جانے وہ کس حال میں تھی؟ زندہ بھی تھی یا  
 مر چکی تھی؟ اور اب تو اتنے دن ہو چکے تھے اس کی لاش  
 تک گل سڑ چکی ہوگی۔ ذی شاہ کے دل پر بوجھ آ پڑا  
 تھا۔ وہ اندر تک کھوکھلا ہو گیا۔ منکشف کی صورت جیسے دل  
 پر پنبہ جما گئی تھی۔ یوں ہی اتنا ڈھیر سا وقت بیت گیا۔





ناولٹ



تیرکے وقت

نایاب جیلانی

دسواں حصہ

دریائے نیکر کی پرسکون لہروں میں اچانک طغیانی آگئی تھی۔ نیکر کا پانی جو کسی حساس، سوگوار ندی کی طرح خاموش، صابر اور پرسکون رہتا تھا جو ہائیڈل برگ کی پہچان تھا..... اور خدا کی اس سرسبز زمین میں سے دنیا کی حسین ترین وادی کے نشیب میں بہتا تھا۔ جسے نرم گداز اور سفید بادل جالوں کے مانند ڈھانکے رکھتے تھے۔ جس کے کنارے پرگندوں والے میناروں، عجائب گھروں، گرجوں اور چھ سو سال پرانی یونیورسٹی کی

50 ماہنامہ پاکیزہ نومبر 2014ء





عمارت والا شہر آباد تھا۔ جس کے ایک طرف تہا، اداس، نمکین، بوجھل، لٹا پٹا اور صدیوں پرانا نموں اور حواریات کا شکار سرخ قلعہ تھا۔ وہی نیکر جو ہائیڈل برگ کے کنارے بہتا تھا۔ ہائیڈل برگ جیسا قدیم شہر، جس کی چھتیں ایک دوسرے کے ساتھ ہونٹوں کے مانند باہم ملی تھیں۔ شہر کو مقدس پہاڑی سے ملانے کے لیے ایک خاص قدیم پل تھا۔ پل کی طرف جانے سے پہلے ایک قدیم وضع کے دروازے میں سے گزرنا ہوتا تھا اور پل کے ایک سرے پر دائن، ڈینیوب، نیکر اور موزیلے دریاؤں کے جھمے تھے اور دوسرے پر نیکی، انصاف، زراعت اور تجارت کے بت استادہ تھے۔ طوفان آتے جاتے رہتے تھے، موسم بدلتے رہتے مگر دریائے نیکر اپنی ذہن میں مگن سکون کے عالم میں رواں تھا۔ جیسے اسے تہذیب کے ہنگاموں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بدلتے موسم اسے چونکاتے نہیں تھے، اس کے پانی سے درخوش آب (عمدہ چیکلے موتی ٹٹکتے تھے۔ اس کے جنب، چھپاؤ اور گہرائی میں گئی طرح کے راز پڑے گہری نیند سوس رہے تھے اور وہ اپنے اندر کسی کو اترنے نہیں دیتا تھا۔ پانی کی خاموش لہریں درمیان میں حائل تھیں۔ اس کے اندر اترنے کے لیے کمال کا حوصلہ درکار تھا۔ وہ جو ایک ہی حالت میں بہتا تھا، کبھی کبھار ہواؤں کے شور پر ناگواری محسوس کر لیتا۔ اسے ہنگامے اور شور پسند نہیں تھا اور کوئی اس کی لہروں کو منتشر کرتا تو اسے بہت غصہ آتا۔ تب وہ اپنے ٹھیا (مقام) سے ہٹ کر جوش کھانے لگتا تھا۔

ہوا کبھی سا ہو (دوست) بن جاتی تھی اور کبھی نیکر کو غصہ دلا دیتی۔ اسے فاسد ہواؤں پر تاؤ چڑھتا تھا۔ اس کی سرشت میں بے صبر اپن نہیں تھا مگر آتے جاتے موسم اس پر اپنا اثر ضرور چھوڑ جاتے تھے۔ جیسے اب بھی نیکر کے پُرسکون پانیوں میں تھر تھراہٹ ہونے لگی تھی۔ لہروں نے جوش کھایا تھا اور پانی کو غیظ چڑھ گیا۔ نیکر کی پُرسکون، حلیم اور پُرسن ندی میں

بالآخر طغیانی آگئی تھی۔ شفاف پانی کی لہروں میں پہلا نیکر کس نے پھینکا تھا؟ اس نے گزرتے سے سے رک، رک کر اور ٹھہر، ٹھہر کر پوچھا تھا اور جواب جیسے اس کے اپنے اندر سے آیا۔ من ہانیم کی پاگل، پاگل منکھے نے جو ڈار سے پھڑی کوچ کی طرح تھی، اداس، ویران، خاموش، ٹڈھال اور بد حال۔ دریائے نیکر کی پُرسکون لہروں میں پہلا نیکر منکھے نے پھینکا تھا۔ وہ پہلے نیکر کے ساتھ ہی نیکر کی گہرائیوں سے کئی سال پہلے کا کھوپا ہوا، ڈوبا ہوا، گمشدہ راز نکال کر باہر لے آئی تھی۔ وہ بڑی باہمت، دلیر اور ٹڈر لڑکی تھی۔ تبھی نیکر کے گہرے پانیوں میں بے تحجک اتر گئی تھی۔ وہ سچ در سچ خمدان، ٹھنکرائی اور مرغول بات کر رہی تھی۔ عقل انسانی کو منجمد کر دینے والی بات کر رہی تھی۔ سوچ کو دنگ کر دینے والی بات کر رہی تھی۔ ذہن کو کرنٹ لگا دینے والی بات کر رہی تھی۔ وہ کیسے یقین کر لیتا۔ وہ کس طرح مان جاتا؟ اس کی سوچ جیسے ٹھم کر رہ گئی تھی جبکہ وہ اسے یقین دلانے کے لیے مرقومہ (تخریر شدہ) سچ بھی دکھانے پر تیار تھی۔ اور معیار (آلہ) پیمانہ، کسوٹی پر سونے جیسے سچ کو کھرا اور کھوٹا ثابت کرنے پر بھی تیار تھی۔ وہ جیسے اندر تک جس اور ٹھن سے معمور تھی۔ ان دیکھے بوجھ تلے خود کو ہر اذیت سے نجات دلانے کے لیے اس کے سامنے اپنا دل کھولنے آئی تھی۔ اس کا یقین بڑا گہرا اور پختہ تھا جیسے ذی شاہ کبھی انکاری ہو ہی نہیں پائے گا۔ وہ ایسی ناشی ہی بن کر تو آئی تھی، وہ چاہ کر بھی اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنے دل کو آمادہ کر لیا تھا، وہ اس ناشی کی ہر بات سننے پر دل سے رضامند ہو گیا۔ اس کی سنے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا اور منکھے جیسے نام بہ نام راز کھولنے آئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے ذی شاہ کی چچازاد مومن حسیب کا نام لیا تھا۔ تو گویا پہلا راز وہ مومن کے متعلق اگلنے والی تھی۔

ترک و وفا

منکھے کیا کہہ رہی تھی؟ وہ اس کی مختار کاری کیسے کر سکتا تھا؟ وہ تو ایک سا ہو کار تھا، سودا گراور تاجر تھا، وہ کسی کی وکالت کرنا نہیں جانتا تھا اور وہ ذی شاہ کو اپنا مختار خاص بنانا چاہتی تھی۔ کیا یہ ممکن تھا..... اگرچہ یہ ممکن ہرگز نہیں تھا۔ پھر بھی اسے منکھے کا وکیل تو بننا تھا۔ اپنے دل کے مجبور کرنے پر۔ اب منکھے گیلی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے وقوع سے پہلے کے واقعات بتانے والی تھی، واردات سے پہلے مومن حسیب کے وقوع جرم کی کہانی سنانے والی تھی۔ اس کا ڈھانچے جیسا وجود دھیرے، دھیرے کانپ رہا تھا۔ چہرے پر پھر سے وحشت ناپنے لگی تھی۔ آنکھوں سے خوف چھن، چھن کر نکل رہا تھا۔ جیسے اپنی ہلاکت کا خود سے ذکر کرنا اس کے لیے انتہائی عذاب ناک تھا۔ سم قاتل کا جام بالآخر اسے پینا ہی پڑا۔ زہر ہلاہل اس کی رگوں کو کاٹ رہا تھا۔ سانس مشکل تھی پر لینی تو تھی ناں..... اگرچہ ہفت اندام پہ خنجر چل رہے تھے، خون رگوں سے پھوٹ رہا تھا، پھر بھی..... پھر بھی زندہ تو رہنا تھا۔ وہ جتنے بھی مخدرات (سن کر دینے والی اشیاء) کا استعمال کرتی۔ محل الحواس نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے حواس ہی اس کی اصل سزا تھے۔ وہ اس حقیقت کو دیر سے سہی مگر جان ضرور گئی تھی۔ لمحے چپ چاپ بیتے رہے، صفحے کھلتے رہے، وہ کہانی کی ابتدا سے پہلے کچھ بتا رہی تھی جیسے ذی شاہ کے پیروں تلے سے زمین کھسکا رہی تھی۔ مومن حسیب کیا تھی؟ اس کا ذہن کتنا طاقتور تھا؟ اور اسے کچھ ایسی قوتیں عطیہ خداوندی کے طور پر ملی تھیں۔

”میں نے مومن حسیب کو قتل کر دیا تھا..... وہ انتہائی خطرناک، ذہن رکھتی تھی۔ ماہر انتقال افکار تھی۔ اسے ایسا علم خدا نے عطا کیا تھا کہ جس کا تعلق انسان کی غیر مادی قوت متحرک سے تھا۔ مگر اس سے بھی پہلے تم مومن حسیب کی ذات میں اترنا چاہو گے؟ چلو آؤ..... میں تمہیں مومن حسیب کی زندگی کا ایک،

علی عیسیٰ سے وابستہ اس کے گھر کے متعلقین، کسے، رشتے داروں میں سب سے پہلے مومن حسیب کا ذکر کیا گیا تھا۔ وہ مومن حسیب سے ہوئی ہوئی علی عیسیٰ تک آنے والی تھی اور اس کے بعد مالا کے دکھ کا ہر باد ہاں جیسے کھل جاتا۔ کوئی راز، راز نہ رہتا۔ ذی شاہ کو بس انتظار کرنا تھا، منکھے کی ہر بات مکمل ہونے تک کا۔ وہ غلت اور بے صبرے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر منکھے پل صراط پر چلنے کا فیصلہ کر کے آئی تھی تو پھر وہ اسے تباہی صراط پہ چلنے کے لیے کیسے چھوڑ دیتا۔

پھر اس نے منکھے کے چہرے پر وحشت ناچتی دیکھی تھی۔ وہ کوئی وحشت ناک بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، اس کے چہرے کا ہر تاثر وحشت انگیز اور ہولناک تھا۔ وہ کچھ حواس باختہ، گہرائی، خبیثی، بلکہ مجنون سی بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کی وحشت بھری گیلی آنکھوں سے کئی راز گر رہے تھے۔ وہ کسی وحوش (صحرائی جانور) کے مانند دکھنے لگی تھی۔ پھر اس نے ذی شاہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جیسے اپنے دل کو تقویت دینا چاہتی ہو۔ اس کا گداز کپکپاتا ہاتھ ذی شاہ کے ہاتھ پر جما تھا۔ انتہائی مضبوطی سے، بڑے بھروسے کے ساتھ جیسے ذی شاہ ”کچھ بھی“ سن کر اس کا ہاتھ ہرگز نہ جھٹکے گا۔ وہ اس کے عہد کو ذہر رہی تھی، جو مقدس قرآن پر ہاتھ رکھ کر ذی شاہ نے منکھے سے کیا تھا۔ اس کا دل دجج کا گڑھ بن رہا تھا، جس سے ہر طرح کا درد اور تپس اٹھ رہی تھی۔ اس نے انتہائی درد میں ذوبی آواز کے ساتھ کہا تھا۔ جیسے وہ قطرہ، قطرہ پھل چکی تھی اور اب مزید پھلنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

”میں نے جو بھی کیا..... اپنے ہر عمل کی سزا بگھٹنے کو تیار ہوں۔ شرط یہ ہے کہ تم میری اپنی گہری (یعنی وکالت) کرو گے۔ منکھے کی آواز اسے نیکراں سوچوں کے سمندر سے کھینچ لائی تھی۔ وہ لمحے بھر کے لیے پھر سے شاکد رہ گیا تھا۔ یہ



لے کر قرآن حفظ کرنے تک وہ اتنے ہی بے پروا اور بے نیاز رہے تھے۔ جیسے مون نے قرآن پڑھ لیا تھا اور ایک ذمے داری ختم ہو چکی تھی۔ اب دوسری ذمے داری دنیاوی تعلیم کی تھی۔ عیسیٰ، مون سے بڑا تھا۔ وہ بہت سلجھا ہوا فرمانبردار بچہ تھا۔ اپنے اسکول وقت پر جاتا، ٹائم سے گھر آتا، کھانا کھاتا، آرام کرتا پھر کھیلنے کے لیے کلب چلا جاتا تھا۔ وہ لڑکا تھا اس کی ایکٹوٹیوٹیز لڑکیوں سے مختلف ہی ہونا تھیں مگر مون کی ایکٹیوٹیز عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھیں..... وہ لڑکیوں کے کھیل نہیں کھیلتی تھی، اس کی کوئی سہیلی نہیں تھی، اسے گراؤنڈ میں جانا بھی پسند نہیں تھا۔ فی وی میں دلچسپی نہیں تھی۔ گیم کا موڈ نہ ہوتا پھر وہ اسکول سے آکر کیا کام کیا کرتی تھی؟ مریم اور حبیب کبھی جان نہیں سکے تھے۔

وہ دونوں صبح دفتر کے لیے نکلے، دونوں بچوں کو ان کے اسکولوں میں چھوڑتے، انہیں لٹچ کرنے کی ہدایت دیتے، پیار کرتے اور آفس چلے جاتے تھے۔ واپسی ہمیشہ رات کو ہوتی تھی۔ سچ میں مریم گھر آ کر بچوں کو ہوم ورک کرواتی، کھانا وغیرہ دیتی اور پھر سلا کر دفتر نکل جاتی تھی۔ وہ شوہر پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی، ان کا کام میں ہاتھ بٹائی تھی۔ ان دونوں کی انتھک محنت کا نتیجہ ہیرنگ کی بہترین اور مضبوط ساکھ تھی۔

مریم کے دوبارہ دفتر چلے جانے کے بعد عیسیٰ تو آرام سے سو جاتا تھا مگر مون کیا کرتی تھی؟ وہ ماں کو مطمئن کرنے کے لیے آنکھیں بند کر کے سوتی بن جاتی تھی۔ پھر مریم چپکے سے مون کے سر کو چومتی اٹھ جاتی۔ پردے برابر کرتی، دروازہ بند کرتی اور آفس کے لیے روانہ ہو جاتی۔ اس دوران مون آنکھیں موندے رکھتی تھی پھر جیسے جیسے مریم کی ہیل ٹک، ٹک کرتی دور ہوتی تھی اس کی پلکیں دھیرے، دھیرے کھلتی جاتی تھیں۔ وہ ہیل کی ٹک، ٹک سے اندازہ

بچوں کی طرح سبق یاد نہیں کرتی، نہ رٹا مارتی ہے۔ نہ اونچی آواز میں پڑھتی ہے۔ بس ایک نظر دیکھ کر سپارہ بند کر لیتی ہے مگر پھر بھی اسے سبق یاد ہو جاتا ہے اور پھر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ سبق کو دوبارہ بھولتی نہیں۔

اتالیق کی گفتگو نے حبیب احمد کو پہلے تو حیران کیا تھا پھر ان کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔ ان کی بیٹی کلاس کے ہر بچے سے زیادہ ذہین، لائق اور جلدی قرآن پڑھنے والی بچی تھی۔ ان کا سینہ فخر سے کیوں نہ پھولتا! انہوں نے اتالیق کی حیرانی پر غور نہیں کیا تھا اور نہ اس کی پوری بات پر توجہ دی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ مون نے عیسیٰ سے بھی پہلے قرآن پڑھ لیا تھا۔ اگرچہ عیسیٰ بھی ذہین تھا مگر مون کا مقابلہ ان کی پوری نسل کا کوئی بچہ نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں تب اس کا احساس نہیں ہوا تھا..... بلکہ بہت سال تک انہیں پتا ہی نہیں چلا۔ ان کی بیٹی کیسا قیامت کا ذہن رکھتی ہے۔

وہ اپنے تئیں سارے فرائض ادا کر رہے تھے۔ بزنس اور گھر کو بھر پور توجہ دیتے..... مون انہیں جتنی پیاری تھی عیسیٰ اس سے دگنا عزیز تھا بلکہ عیسیٰ میں ان کی جان بندھی، شاید یہ بات مون نے بہت کم عمری میں ہی محسوس کر لی تھی اور وہ سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔ مون رفتہ، رفتہ اپنے دور سفر کم سنی ہیں ہی ان سے بہت دور چلی گئی تھی۔ وہ چیزوں کو بڑی جلدی اور انتہائی شدت کے ساتھ محسوس کرتی تھی وہ اپنے دور کے ہر بچے سے مختلف تھی۔ اور عجیب بات تو یہ تھی، مون حبیب کے ماں، باپ اپنی بیٹی کی اس اعلیٰ پائے کی انفرادیت کو سمجھ ہی نہیں سکے تھے۔

اتالیق کے وقتاً فوقتاً بلاوے ان کے ذہن سے نکل گئے تھے اور مون حبیب قرآن حفظ کر کے اسکول جانے لگی تھی۔ حالانکہ آٹھ سال کی عمر میں قرآن یاد کرنا اتنا معمولی واقعہ نہیں تھا مگر مریم اور حبیب نے توجہ ہی نہیں دی۔ اس کی رسم بسم اللہ سے

حبیب احمد اپنے حسین، فرمانبردار خوب صورت بچوں میں گمن دن رات کاروبار کی ترقی میں لگ چکے تھے۔ مریم، بچوں کی دیکھ بھال کرتی، ان کا خیال رکھتی، اچھی تربیت کرتی اور اس کے ساتھ، ساتھ وہ آفس میں بھی ان کی بہت مدد کرتی تھی۔ ان کا کاروبار دنوں میں پھلتا پھولتا گیا تھا۔ یہ مریم کی مدد، انتھک کوشش اور بھرپور ساتھ کا کرشمہ تھا۔ وہ بڑے کم عرصے میں شہر کے نامور بزنس مین بن گئے تھے۔ اگلے پانچ سال تک انہیں جرمنی کا پاسپورٹ جاری کر دیا گیا تھا۔ اب وہ دیگر ممالک میں بغیر ویزا کے آ جاسکتے تھے۔ کاروبار کی ترقی کو دیکھ کر ان کا دل اور زیادہ محنت کے لیے چمکتا تھا۔ وہ رات دن کا فرق بھلائے انتھک محنت کر رہے تھے مگر اس دوران وہ اپنے بچوں سے غافل نہیں رہے تھے۔ مریم کی اعلیٰ تربیت اور سختی کی بدولت ان کے دونوں بچے نہایت فرمانبردار اور باتمیز تھے۔

عیسیٰ اسکول جاتا تھا اور مون گھر میں کلاسز لیتی تھی۔ ان دونوں نے انگلش اور عربی میں ایک، ایک مرتبہ قرآن بھی پڑھ لیا تھا بلکہ مون نے تو حفظ کیا تھا۔ دراصل مون کی غیر معمولی ذہانت نے پہلی مرتبہ انہیں ٹھنکایا بھی اسی وقت تھا جب اس نے قرآن کی کلاس میں جو سبق لیا وہ اسے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ پھر ہر روز وہ اپنا سبق دہراتی تو اس کے ذہن میں جیسے جم جاتا۔ جیسے کمپیوٹر کی طرح ہر لفظ، ہر سبق یا روزمرہ کی چھوٹی موٹی بات فیڈ ہو جاتی تھی۔ وہ قرآن ناظرہ پڑھتی تھی مگر اسے زبانی یاد ہونے لگا تھا۔ پہلی مرتبہ اس کے اتالیق نے حبیب احمد کو اپنے اسلامک سینٹر میں بلا بھیجا تھا۔ یہ چھوٹی سی قرآن اکیڈمی تھی۔ یہاں بچے اور بچیاں قرآن سیکھتے، سمجھتے اور اسے یاد کرتے تھے۔

حبیب احمد، اتالیق کے بلاوے پر قرآن اکیڈمی آئے تو اتالیق نے بڑے حیران کن انکشافات کیے تھے۔ اتالیق نے بتایا تھا۔ مون عام

ایک صفحہ پڑھاتی ہوں پھر چاہے تو ان غلیظ صفحات کو نذر آتش کر دینا اور چاہے تو دریا برد کر دینا۔ تمہیں اختیار ہے۔ جو دل چاہے کرنا۔“ اس نے سر جھکا کر کہنا شروع کیا تھا۔ ذی شاہ نے سانس تک روک رکھی تھی۔ وہ آج بس منکھے کو سنتا چاہتا تھا۔ کوئی سوال اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

اور منکھے نے سلسلہ کلام وہاں سے جوڑا تھا جب مون حبیب، علی عیسیٰ کے بعد اس کے چاچو حبیب احمد کی دعا بن کر اس دنیا میں آئی تھی۔

وہ من ہائیم کے بجائے بوار یا میں پیدا ہوئی۔ وہ ایک حسین صبح تھی۔ سرسبز، تروتازہ اور انتہائی خوشگوار..... یہ صبح حبیب احمد کے لیے کامیابیوں کے دروا کر گئی تھی مگر سچ تو یہ تھا کہ ان کے ہاں ایک بلند بخت بچی نے جنم لیا تھا۔ اس کی پیدائش کے ایک گھنٹے بعد حبیب احمد کو پہلی خوشخبری ملی تھی، انہیں ایک سپورٹ پروموشن بیورو کی رکنیت کا سٹوڈنٹ مل گیا تھا۔ اب وہ جرمنی میں قدم جما کر کاروبار کر سکتے تھے۔ ڈوئچ لینڈ میں مستقل رہائش کے باوجود شہریت آسانی سے نہیں ملتی۔ شادی اور بچے ہو جانے کے باوجود شہریت ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کئی کے چند تارکین وطن جرمنی کی شہریت رکھتے تھے۔ ان میں جلد ہی حبیب احمد کا بھی شمار ہو گیا تھا۔ مون کی پیدائش کے ایک سال بعد انہیں رہائشی ویزا حکومت نے جاری کر دیا تھا۔ بینک سے گھر خریدنے کے لیے قرضہ بھی مل گیا تھا جو انہوں نے اگلے دو سالوں میں اتار بھی دیا تھا۔ مون کی چوٹی سا لگرہ پر وہ اپنی ذاتی کار کے مالک بن گئے تھے اور اس کی پانچویں سالگرہ پر انہوں نے اپنی ذاتی فرم ہیرنگ کے نام سے من ہائیم میں خرید لی تھی۔ جیسے مون کی پیدائش کے بعد ان پر بہن برسے لگا تھا۔ ان کی اکلوتی بیٹی بہت بلند بخت تھی۔ بڑی بانصیب تھی۔ آسمان پر چمکتے چاند کی طرح حسین اور اونچے نصیب والی۔



طرح جرم بھی چھوٹا ہو یا بڑا؟ ہوتا تو جرم ہے۔ غلطی یا جرم میں کامیابی حوصلہ بڑھاتی ہے۔ اور حوصلہ بڑھ جائے تو آگے کی طرف قدم خود بخود اٹھتے ہیں پھر روکے سے نہیں رکھتے۔ مون کا حوصلہ ان ننھی، ننھی شیرازوں اور انتقام کے باعث بڑھتا جا رہا تھا۔ مجال بھی جو کوئی اسے ڈانٹ پڑاتا۔ جب تک وہ بدلہ نہ لے لیتی اسے چین نہیں پڑتا تھا۔ وہ انتہائی ضدی، خاموش طبع اور مستحکم مزاج بن چکی تھی۔ وہ کم بولتی اور کم ہنستی تھی۔ لوگوں کی طرف کم متوجہ ہوتی تھی۔ ہاں، لوگ ایسی عجیب سی بچی کو دیکھ کر خوب چونکتے تھے۔ وہ عام بچوں سے بہت مختلف تھی۔ کھاتی نہ کودتی نہ کوئی ہنگامہ کرتی..... ٹھیک ہے، ایسے بے شمار بچے ہوتے ہیں، مریم کو اگر کوئی احساس دلاتا تب وہ بے نیازی سے کہہ دیتی تھی۔

”میری بھانجی سوزی بھی فطرتاً کم گو، خاموش طبع اور سنجیدہ بچی ہے۔“ مریم کے لیے مون کی عادتیں حیران کن نہیں تھیں۔ وہ سوزی کو دیکھتی تو مون کی طرف سے مطمئن ہو جاتی۔ مریم کی بھانجی سوزی بھی بہت کم گو تھی۔ کھلنے کو دینے سے زیادہ دوسرے کاموں میں دلچسپی لیتی تھی۔ مذہب سے اسے لگاؤ تھا۔ ثانی کے ساتھ چریج جاتی، سروس میں حصہ لیتی اور مقدس انجیل پڑھتی تھی۔ خود مریم بھی بہت سنجیدہ مزاج رکھتی تھی اور بچپن کی عادتیں بدلتی نہیں۔ اس کے لیے مون کا رویہ اجنبی کا باعث نہیں تھا۔ یہاں تک بات ٹھیک تھی، مریم کے گھر رہنے کے دوران وہ عموماً اپنے کمرے میں ٹھکی رہتی۔ اسٹوری بکس دیکھتی اور کبھی کوئی گیم کھیل لیتی۔ مسئلہ تو تب پیدا ہوتا جب مریم اور حبیب گھر سے چلے جاتے تھے۔ تب مون کو ان دیکھی آزادی مل جاتی تھی۔ اس کا دماغ ہر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ وہ اپنا کوئی بھی پسندیدہ کام کر سکتی تھی۔ عیسیٰ کو زچ کرتی، اسے تنگ کرتی، ستاتی مگر بغیر اسے بتائے۔ جب وہ اپنا کوئی

چھٹی حس کہتے ہیں جو خطرے سے پہلے خبردار کرتی ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے انسان کے لیے ایک اور اعلیٰ قسم کی نعمت ہوتی ہے جس طرح انسان اللہ کی باقی تمام نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا اسی طرح چھٹی حس جیسی اعلیٰ پائے کی نعمت پر بھی شکر ادا نہیں کرتا بلکہ مون کی طرح اترانے لگتا ہے۔

یہ چھٹی حس مون کے اندر عام انسانوں سے زیادہ قوت رکھتی تھی اور جلد اسے معاملے کی تک پہنچا دیتی۔ جیسے ہی وہ خطرہ محسوس کرتی فوراً اس کا ذہن اگلی ہدایت دینے لگتا کہ۔۔۔ اب یہ کرنا چاہیے؟ اب یوں کرنا چاہیے۔

اس نے عیسیٰ کا اٹھ جانا محسوس کر لیا تھا۔ اس کے اندر زور، زور سے الارم بجنے لگا تھا تب وہ فوراً اسٹوڈیو میں اپنے اثرات مٹانی کمرے میں بھاگ آئی تھی۔ تب اس نے عیسیٰ کو چکما دے دیا تھا، وہ اس کی ادھوری پینٹنگ کو مکمل کر آئی تھی۔ وہ جانتی تھی عیسیٰ اپنی چیزوں کے معاملے میں کتنا پٹی ہے۔ وہ اپنے اسکول بیگ سے لے کر سائیکل تک کسی چیز کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا اور مون کی شروع سے عادت تھی وہ اپنی اعلیٰ، قیمتی اور انتہائی اہم اور نڈ چیز چھوڑ کر عیسیٰ کی منتخب کی ہوئی چیزوں پر ہاتھ رکھ دیتی تھی۔ اس کی یہ عادت ماما کو پسند ہی نہ پاپا کو..... وہ اسے منع کرتے، ڈانٹتے، روکتے اور سمجھاتے تھے مگر مون کو ان کا منع کرنا برا لگتا، وہ ضد میں آ کر وہی کام کرنے کی کوشش کرتی جس سے اسے روکا جاتا تھا۔

کل رات ممانے اسے عیسیٰ کے اسٹوڈیو میں گھسنے سے منع کیا تھا۔ یقیناً عیسیٰ نے شکایت لگائی تھی اور آج وہ عیسیٰ کو اس شکایت کا مزہ چکھا چکی تھی۔ وہ جان نہیں پایا تھا، اس کی ادھوری پینٹنگ کس نے مکمل کی تھی؟ وہ کبھی جان ہی نہیں سکتا تھا۔ مون جرم کر کے پھر اثرات بھی مٹا دیتی تھی اور یہ بھی تو ایک ننھا سا جرم تھا، گناہ چھوٹا ہو یا بڑا..... ہوتا تو گناہ ہے، اسی

تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرسایمگی ابھرتی، خوف مچلتا، حیرت پھلتی اور پھر جیسے وہ شک کی بنیاد پر مون کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکتا تھا۔

اس کے سونے سے پہلے پینٹنگ ادھوری تھی، سونے کے دوران مکمل ہو گئی مگر کس طرح.....؟ جبکہ مون بھی اپنے بستر میں گم نظر آرہی ہوتی تھی۔ وہ شک سے نکل کر حیران ہوتا پھر ذرا خوف زدہ سا ہو کر پلٹ جاتا تھا۔ جانے یہ ماجرا کیا تھا؟ وہ سمجھ نہ پاتا۔

اور ادھر مون چپل کی چاپ سے اندازہ لگاتی۔ عیسیٰ اس کے کمرے میں آیا تھا، کچھ دیر کا رہا پھر باہر چلا گیا۔ باہر کہاں؟ لاؤنج میں، لیکن میں یا اسٹوڈیو میں..... چپل کی چاپ کا رخ لاؤنج سے باہر کی طرف ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ بالکل ٹھیک ثابت ہوتا۔ عیسیٰ کیراج سے اپنی سائیکل نکال کر باہر نکل جاتا تھا۔

تب وہ دھیرے، دھیرے پلکیں کھول لیتی تھی۔ جیسے جان بچ جانے پر مسکرا اٹھتی۔ عیسیٰ کو چکما دینے میں وہ کامیاب ہو چکی تھی۔ اور اس طرح وہ بے شمار لوگوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتی تھی، اکثر تو ماما، پاپا بھی لپیٹ میں آ جاتے تھے۔ بہت عرصے تک خطرے سے پہلے اپنے اندر بجتے الارم کو وہ کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔ ایک مدت بعد اسے پتا چلا تھا کہ اس کے اندر جو گھنٹی سی بجتی ہے وہ ESP کی حامل کوئی قوت ہے۔ جسے عرف عام میں چھٹی حس بھی کہتے تھے۔

☆☆☆

چھٹی حس کیا تھی؟ اس کا ننھا ذہن جو اتنا ننھا... رگز نہیں تھا..... تب بالکل سمجھ نہیں پاتا تھا۔ بہت عرصے تک اسے چھٹی حس کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ حالانکہ چھٹی حس ہر انسان میں موجود ہوتی ہے، مون میں تھی تو اس میں کیا نیا پن تھا؟ ہر انسان کے اندر کسی مشکل یا انہونی گھڑی میں گھنٹی بج اٹھتی ہے اس گھنٹی کو

لگاتی تھی۔

”ماما کمرے سے نکل گئیں..... ماما اب لاؤنج میں ہیں..... ماما لیکن میں ہیں۔ ماما عیسیٰ کے کمرے کی طرف جا رہی ہیں۔ ماما دوبارہ لاؤنج میں سے گزر رہی ہیں..... اور ماما اب لاؤنج کے دروازے سے نکل کر ڈرائیور دے پر چل رہی ہیں..... ماما کیراج میں پہنچ گئیں۔ ماما گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ کیراج سے گاڑی اب تیزی سے نکل گئی.....“ تک، تک کی آواز اس کے دماغ سے دور ہوتی چلی جاتی تھی پھر وہ مطمئن سی چادر پھینک کر بستر سے اٹھتی۔ اپنی روک کو جھاڑتی، بال سنواری پھر کوٹ شوژ پہن کر باہر نکل آتی، اس کا رخ عیسیٰ کے اسٹوڈیو کی طرف ہوتا تھا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے تک آرام سے عیسیٰ کی پینٹنگ کے ادھورے پن کو ختم کر دیتی پھر جیسے ہی گھڑی ڈیڑھ گھنٹے کا الارم بجانی، اس کے دماغ میں کلک سے کچھ روشن ہوتا تھا۔

وہ ”کچھ“ کیا تھا؟ بہت عرصے بعد مون کو اس ”کچھ“ کی سمجھ آئی تھی۔ اس سے پہلے وہ کلک کی اس آواز کو سمجھ نہیں پاتی تھی۔ وہ کوئی غیبی قوت تھی، کوئی ایسی طاقت جو اسے خطرے سے پہلے الرٹ کر دیتی تھی۔ جیسے ہی عیسیٰ کی آنکھ کھلتی، اسٹوڈیو میں موجود مون کے ہاتھ سے برش گر جاتا تھا۔ پھر وہ بستر سے اٹھتا تب مون برش کو اٹھا کر اپنی جگہ پر رکھ دیتی، کلرز سمیٹتی..... گلوڑ اتارتی، لائنس آف کرتی دوبارہ اپنے کمرے میں ٹھس کر بستر پر لیٹنے کے بعد آنکھیں موند لیتی تھی۔

عیسیٰ چپل پہن کر واش روم سے ہو کر آتا، بال بناتا، بستر سمیٹتا، بیڈ شیٹ کی شکنیں دور کرتا پھر لیکن میں سے جوس کا کین اٹھاتا اور پھر دھیرے، دھیرے اپنے اسٹوڈیو میں ٹھس جاتا تھا۔ لائنس آن کرنے کے بعد اس کی آنکھیں کھل جاتیں، عیسیٰ کی ادھوری پینٹنگ انتہائی صفائی کے ساتھ مکمل ہوئی نظر آتی



# سرگزشت

ماہنامہ

## مقتول آزادی

اسلامی ممالک کے صدور میں سے ایک  
مقتول صدر کی دلچسپ روداد زندگی

## کم سن جنگجو

مغربی ممالک نے ہی بچوں کو میدان جنگ  
میں استعمال کرنے کی شروعات کیں

## تباہ کن

ننھے سے ذرے کا تذکرہ جو ایک پل میں  
لاکھوں لوگوں کی جان لے سکتا ہے

## تلاش

ایک انوکھے مگر انتہائی دلچسپ سفر کی روداد

## احسان

طوائف کو لوگ برداشت کرنے پر تیار  
نہیں بھلے ہی وہ شریفانہ زندگی گزارے



معرکتہ الآرا، لہو گرم کر دینے والی طویل سرگزشت  
سرب فلم اور ادب کی دنیا سے کبھی ان کبھی داستا نہیں  
”فلمی لف لیلہ“ کیسپ سفر کہانی ”الوداع“ اور  
بھی بہت سی کیسپ سچ بیانیاں، سچے قصے، سبق  
آموز واقعات جسے آپ ضرور پڑھنا چاہیں گے

آج ہی مزد کی بک اسٹال پر پرچہ پیش کرالیں

معنوں میں اسے سوزن سے بہت پیار تھا۔  
اس پارٹی میں پاپا کے دوستوں نے مون کو  
جان محفل کہا تھا۔ وہ اتنی حسین خوب صورت اور  
مغرور لگ رہی تھی جیسے کسی ریاست کی شہزادی ہو۔  
سلک کا پیروں تک آتا میکی نما ستاروں سے سجا  
فراک پہنے..... لے حسین سیدھے بلوئی پالوں کی  
اوپنی سی پونی بنائے سر پر ہیروں اور یا قوت کا  
کراؤن رکھے وہ کسی اسٹیٹ کی وکٹوریہ یا کسی جاگیر  
کی مہارانی لگ رہی تھی۔

پارٹی جب تک چلتی رہی مون اور سوزن  
باتوں میں گم رہیں..... پھر مون اسے راج ہنسوں کی  
جوڑی دکھانے لگی۔ وہ تالاب کے کنارے آرٹکی  
تھیں۔ برقی قلموں سے سجا گارڈن جگمگ جگمگ  
کر رہا تھا اور وہ دونوں لوگوں کے جھرمٹ سے الگ  
تھلگ بیٹھی تھیں۔ تب پانی پر تیرتے سفید راج ہنس کو  
دیکھ کر مون نے سوزنی کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”عیسیٰ کو دیکھو، کتنا برا لگ رہا ہے، منہ ایسے  
پھولا ہے جیسے غبارہ ہو۔“ مون نے نخوت سے سر  
جھٹک کر عیسیٰ کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی  
عیسیٰ اس کی اہمیت سے بہت جلیس ہو رہا ہے۔ تب  
سوزن نے گردن موڑ کر عیسیٰ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ  
کچھ کچھ بیزار نظر آ رہا تھا۔ سوزنی حیران رہ گئی تھی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ اب وہ اسی حیران  
چہرے کے ساتھ مون کی طرف رخ کیے بیٹھی تھی جس  
کی تمام تر توجہ پانی پر تیرتے راج ہنس کی تیراکی پہ  
تھی۔ اس نے سوزنی کی طرف دیکھے بنا جھکی آنکھوں  
کے ساتھ جواب دیا تھا۔

”وہ بیزار ہے..... کیونکہ پاپا نے اس کے  
وائٹن بجانے کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی خواہش تھی وہ  
وائٹن بجائے مگر پاپا نے اس کی بات پر وہیمان  
نہیں دیا۔ وہ بس میری تعریف کرتے اور سنتے رہے  
اور مجھے اپنی تعریف اچھی لگتی ہے۔“ مون نے سابقہ

وہ اپنے اندر کون سی اہم قوت عام انسانوں سے بڑھ  
کر پالی تھی؟ انسان کی زندگی میں روح کی حیثیت  
رکھنے والی چھٹی حس..... دیکھا جائے تو یہ حس انسانی  
زندگی کی محافظ ہوتی ہے۔ اس کا بروقت، مناسب اور  
درست استعمال بے شمار لوگوں کی زندگیوں کو خطرات  
سے بچا سکتا ہے۔ یہ حس انسان کو خطرے سے پیشگی  
خبردار کر دیتی ہے اور وہ مضرتوں میں جنہیں انسانی آنکھ  
دیکھ نہیں سکتی۔ ان سے محفوظ رکھتی ہے۔ جب کوئی  
حادثہ، سانحہ یا واقعہ اپنے وقوع پر پہنچنے سے پہلے  
انسانی دل میں، ذہن میں کوئی کھٹکا یا الارم بجادے تو  
اس الارم کو چھٹی حس کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی  
انسان اس خدا داد صلاحیت سے آگہی پا جائے اور  
اس کے تمام ہنسن (اشاروں) کو بروقت سمجھ جائے  
تو وہ اپنی زندگی میں بے شمار کامیابیاں پاسکتا ہے بلکہ  
اپنے عزیز واقارب، بہن بھائیوں اور دوستوں کو بھی  
پیشگی اطلاع دے کر جو حیرت کر دیتا ہے۔

مون حسیب کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ تھی کہ  
وہ اس اعلیٰ پائے کی قوت کو جان ہی نہیں پائی۔ وہ سمجھ  
ہی نہیں سکی۔ پھر ہوا کچھ یوں کہ جب ادراک کا وقت  
آیا تب تک اس کی طنائیں غلط ہاتھوں میں چلی گئی  
تھیں وہ غلط کوج سمجھ کر اسی کی پیروی کرنے لگی تھی۔  
وہ خود کو عقل کل کی مالک سمجھتی تھی مگر عمر بھر  
نادانیاں کرتی رہی۔

یہ بہت سال پہلے کی بات ہے، جب اس نے  
پہلی مرتبہ اپنے ماں، باپ کو چانک چونکا ڈالا تھا۔ وہ  
دن اتوار کا تھا۔ اس روز ان کے گھر میں چھوٹی سی  
پارٹی تھی۔ پاپا کے چند دوست مدعو تھے۔ ماما کی فیملی  
سے گروی اور سوزن آئی تھیں۔ تانبے ان دنوں اپنے  
شوہر کے ساتھ جھگڑوں میں مصروف تھی، ان کی طلاق  
کا کوئی چکر چل رہا تھا۔ گروی کے ساتھ سوزن آئی تھی  
اور سوزن اس کی دیوانی تھی، مون بھی اپنا فطری نخرہ  
اور غرور بھلا کر سوزن کو بہت کمپنی دیتی تھی۔ حقیقی

الٹا ہوا کام دیکھتا پھر سخت جھنجھلا! تب مون بہت حظ  
اٹھاتی تھی۔ اسے عیسیٰ کو ستا کر لطف آتا تھا۔ وہ مون  
سے زیادہ پاپا کے قریب تھا۔ مون کو اس بات پر سخت  
قسم کی جلیسی ہوتی تھی مگر اس نے کبھی ظاہر ہونے  
نہیں دیا تھا۔

معاملات ایچتے تب ہیں جب ان پر توجہ نہیں  
دی جاتی۔ بچے بگڑتے تب ہیں جب ان پر نظر  
نہیں رکھی جاتی۔ اگر دیکھا جائے تو مریم اور حسیب  
کے بچے فرمانبردار تھے، سلجھے ہوئے سے، جھگڑاؤ  
نہیں تھے۔ بڑھائی میں بہترین تھے۔ غیر نصابی  
سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ مجموعی طور پر ان  
میں کوئی کجی نہیں تھی۔ سو مریم اور حسیب مطمئن تھے۔  
ان کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ مون کے ذہن  
میں کیسی، کیسی تحریک چلتی ہے۔ یا اس کا مینٹل لیول  
بہت آگے تک کسی غیر مادی قوت متحرک سے ملتا ہے۔  
یا وہ انسانی سولہ حواس میں عام لوگوں سے زیادہ  
محسوس کرنے کی، کھوجنے کی، سراغ لگانے کی یا  
چانچنے کی قوت رکھتی ہے۔ ماہرین روحیت کے  
مطابق انسانی حواس سولہ شمار کیے جاتے ہیں۔ عام  
طور پر لوگ پانچ حواسوں کے بارے میں جانتے  
ہیں۔ باصرہ، سامعہ، لامسہ، ذائقہ، شامہ اس سے  
آگے کتنے جہان ہیں؟ ان پر توجہ کوئی نہیں دیتا جس  
حرارت پیا، حس توازن، حس قربت، حس اعضائی  
حس وزن اور سب سے اہم ترین چھٹی حس..... ان  
حواسوں کے ذریعے ادراک جو نتیجہ اخذ کرتا ہے اسے  
”عقل“ کہتے ہیں۔

تو کیا مون حسیب عقل کے لحاظ سے بہت  
آگے تھی؟ اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا وہ غیر معمولی  
ذہن کی مالک نہایت منفرد بچی تھی مگر اس کی اصل  
ذہانت کو کوئی کھونج نہیں پایا تھا۔ اسے کوئی رہنما مل  
سکتا تھا۔  
دراصل مون حسیب کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ اور



نخوت سے ناک چڑھا کر جیسے وضاحت کی تھی۔ تب سوزن کا منہ اتر گیا تھا۔

”تو کیا عیسیٰ وانکن نہیں بجائے گا؟“ اس کی آنکھوں میں بھی مایوسی تیرنے لگی تھی۔ جیسے وہ خاص طور پر علی عیسیٰ کے وانکن کی مٹھاس بھری دھنیں سننے آئی تھی۔ اہل یوار یا موسیقی کے دیوانے تھے۔ مون کی مٹھاسی اچھا وانکن بجالتی تھیں مگر عیسیٰ کو بہت اعلیٰ قسم کا وانکن بجانا آتا تھا۔ پینٹنگ، فیدر بال، سائیکلنگ کے علاوہ اسے وانکن بجانے کا بہت شوق تھا۔ یقیناً وہ وانکن بجانے کی خواہش رکھتا تھا مگر پاپا نے اس لیے منع کر دیا کہ ایک مرتبہ موسیقی کی طرف سب متوجہ ہو گئے تو پھر تین، چار گھنٹے تک انھیں گے نہیں جبکہ حبیب احمد کو اگلی صبح ڈورٹ منڈ جانا تھا۔ کاروبار کے لیے دوسرے شہروں میں ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اب تو وہ فن لینڈ، ڈنمارک، آسٹریا اور ہالینڈ تک بھی جاسکتے تھے۔ سوطعام کی دعوت کا جلد ہی اختتام کر دیا تھا مگر پھر ہوا کیا؟

محفل میں موجود کوئی بھی شخص جان نہیں سکا تھا، تالاب کے کنارے سے اٹھ کر وہ مغرور لڑکی بلی کی چال چلتی ہوئی گھر کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی تھی۔ پھر اس نے بڑے احتیاط بھرے انداز میں عیسیٰ کا ریکارڈ پلیر اٹھا کر ویوالدی اور یوڈھے باخ کی دھنیں سنی تھیں۔ تین یا چار منٹ کی یہ کوشش مون کے دماغ میں سرکی لے کر جم گئی تھی۔ اب وہ پورے اعتماد کے ساتھ ویوالدی کی دھن وانکن پر چھیڑ سکتی تھی۔ اس نے بلی کی چال چلتے ہوئے ہال کا رخ کیا تھا۔ ہال کی گلاس وال کے ایک طرف عیسیٰ کا وانکن رکھا تھا۔ وہ بڑے رُسکون انداز میں گلاس وال کی سلائیڈ ہٹائے اسٹول تھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ وال کی شفاف سطح پر سفید جالی دار نائیلون کا مہین سا پردہ پڑا تھا اور دوسری طرف سلک کا پھولدار..... سامنے کی طرف پھولوں کی ٹوکریاں لٹکی تھیں۔ پھولوں سے

بھری بہار دکھائیں، فضا کو معطر کرتیں..... جن کی بھینی، بھینی مہک ماحول کو خوشبودار بنا رہی تھی۔

اس نے ویوالدی کا پہلا سُر بکھیرا تو لان میں موجود ہر نفس کی سانس تک رک گئی۔ یہاں کے لوگ موسیقی کے دیوانے تھے اور موسیقی ہو یا عبادت ہر کام میں دلچسپی اور ذوق دکھاتے تھے۔ اس نے اطالوی موسیقار ویوالدی کے سُر کی نقل بکھیری تھی۔ ویوالدی وہ موسیقار تھا جب وہ دھن کے سان مارکو گر جا گھر میں وانکن بجانا تب لوگ اسے سرخ بالوں والا پادری کہتے تھے اور جہاں کھڑے ہوتے وہیں جم جاتے تھے۔ ویوالدی کے عشق میں تو جرن موسیقار دیوہن سیبٹین باخ بھی مبتلا تھا اور اس چھوٹی سی لڑکی نے ویوالدی کی دھن کو اتنے مکمل، با اعتماد اور بھرپور انداز میں چھیڑا تھا کہ گارڈن میں موجود ہر فرد گردن اچکا کر گلاس وال کی طرف دیکھنے لگا۔ شہر کی کریم اس وقت ان کے گارڈن میں موجود تھی۔ سب کی نگاہوں کا فوکس وہ ہی گلاس وال تھی جس کے سلائیڈ اس وقت ہٹے ہوئے تھے اور سفید جالی دار نائیلون کے مہین پردے اٹ رہے تھے۔ ہوا کے دوش پر لہرا رہے تھے اور اندر سے وہ روح میں اتر جانے والی دھن ماحول کو ساکت کر رہی تھی۔ جیسے عالم پہ لمحے بھر کے لیے سکتے طاری ہو گیا تھا۔

گارڈن میں موجود ہر تنفس حیران تھا انہوں نے عمر بھر کے طویل سالوں میں ایسا انتقال کوئی نہیں دیکھا تھا۔ جس نے ویوالدی کی دھنوں کو کمال طریقے سے چرایا تھا۔

پھر..... ویوالدی کے بعد اس نے باخ موسیقاروں کے سُر فضا کے سپرد کیے تھے۔ ایک نفیس ردھم کے ساتھ ایک اعلیٰ ترین، کمال کی مہارت کے ساتھ وہ سُر، دھنوں اور نکالیسی۔ موسیقی کے ساتھ کھیلتی رہی تھی۔ یہ لوگ باتھنڈیب، منظم اور تعلیم یافتہ تھے۔ موسیقی کے آداب سے اعلیٰ پائے کی

واقفیت رکھتے تھے اور موسیقی کے درمیان بات کرنے کو گناہ خیال کرتے۔ یہ طلسم بالآخر ٹوٹ گیا تھا جب سپرباخ کے سُر اپنے اختتام کو پہنچے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنا میکی نما فراک لہرائی بڑے تفاخر سے لبوں پر مسکراہٹ لیے شان بے نیازی کے ساتھ سٹریٹیاں اترتی نیچے آگئی تھی تب لان میں موجود ہر شخص گویا خواب کی کیفیت سے ہڑبڑا کر نکلا تھا پھر تالیوں کی گونج سنائی دی تھی۔ اور دیر تک لوگ تالیاں بجا، بجا کر اسے سراہتے رہے تھے۔ پھر کسی نے جھومتے ہوئے ایسے چراغ شب کا نام دیا تھا۔ وہ ایسے ہیرے کے مانند تھی جو رات بے چراغ کا کام دے سکتی تھی۔

مون نے بڑے غرور کے عالم میں ماما اور پاپا کو دیکھا تھا، ان کے چہروں پر خوشی اور تمنا ہٹ گئی پھر اس نے سوزن کو دیکھا تھا۔ وہ بے خودی کے عالم میں تالیاں پیٹ رہی تھی۔ مون کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اب وہ عیسیٰ کو دیکھنا چاہتی تھی مگر عیسیٰ کہاں تھا؟ اس نے ایک طائرانہ نگاہ پورے لان پر ڈالی۔ عیسیٰ اسے دکھائی دے گیا تھا مگر اس کے چہرے پر غصہ نہیں تھا، برہمی نہیں تھی، بس حیرت تھی، ایسی حیرت جس نے مون کو بھی درط حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کچھ دیر پہلے جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ اس کی توقع کے خلاف تھا۔ مون اسے غصے میں دیکھنا چاہتی تھی، وہ اسے زچ کرنا چاہتی تھی، جلانا چاہتی تھی مگر وہ صرف حیران تھا..... مون جیسے بدول ہو گئی جیسے برہم ہو گئی۔ ساری محنت اکارت گئی تھی۔ اس کی توقع کے خلاف ہوا تھا۔ عیسیٰ کو غصہ نہیں آیا تھا بلکہ اس کی حیرانی مون کو غصہ دل رہی تھی۔

☆☆☆

وہ حیران نہیں شکا کڈ تھا، مون نے ویوالدی کے سُر کی نقل اتاری تھی مگر کیسے.....؟ اس کی حیرانی بس انہی دو سوالیہ نشانوں کے گرد گھوم رہی

تو کہ وفا

تھی۔ ویوالدی کے سُر کی نقل اتارنا کوئی معمولی معرکہ تھا؟ پھر اس صورت میں جب مون نے پہلے سے کبھی ویوالدی کو سنا ہی نہیں تھا..... تو پھر کس طرح.....؟ وہ اتنی اچھی، عمدہ اور اعلیٰ ترین نقل کیسے اتار رہی تھی؟ اس کا ذہن جیسے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پارہا تھا۔

پارٹی ختم ہو گئی، لوگ مون کی شان میں تصدیق پڑھ کر اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے، محفل برخاست ہو گئی تھی۔ گروسی واپس چلی گئیں اور سوزی بیٹیں رک گئی۔

ماما، پاپا انہیں روم تک چھوڑ کر ایک، ایک دودھ کا گلاس تھمانے کے بعد اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ پاپا نے سفر پہ صبح نکلتا تھا سو وہ جلدی سونا چاہتے تھے۔ گھر پر کچھ ہی دیر میں ہو کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ مون اور سوزی کمرے میں چلی گئی تھیں جبکہ عیسیٰ دے قدموں چلتا ہوا پہلے اپنے اسٹوڈیو کی طرف آیا۔ لائٹس آن کر کے وہ اپنی پینٹنگ کو دیکھنے لگا تھا۔ ادھوری تصویر جو ایک دوپہر کو نیند کے دوران مکمل ہو گئی تھی مگر کس طرح؟ وہ کئی دن تک اسی شاک میں رہا تھا پھر جیسے بھول گیا تھا۔ اب اگر دوبارہ سوچتا تو جیسے کئی پر تیں کھانے لگتیں۔

وہ پینٹنگ کو ہاتھ سے چھو رہا تھا۔ یہ ایک مشکل سا منظر تھا۔ آپس کا کوہستانی سلسلہ، ڈوہتا ہوا سورج اور ساتھ گرتی بڑی برف دکھانا بہت کٹھن کام تھا۔ ایک طرف کوئیں اڑ رہی تھیں۔ پہاڑوں کی ٹوکوں پر پھر اچانک ایک کوچ ڈار سے چھڑ گئی تھی اور اب اس کوچ کو اداس، دیران حالت میں دکھانا تھا۔ وہ بس آپس کے پہاڑ بنا کر ہی تھک گیا تھا اور جانتا تھا کہ ایک ہی دن میں پینٹنگ مکمل کبھی نہیں ہوگی، اس کے لیے دو تین دن مخصوص کرنا ہوں گے۔ وہ یہی سوچ کر سو گیا تھا پھر جب اٹھا تو منظر جیسے مکمل تھا۔ یہ منظر مکمل کس نے کیا تھا؟ اب کوئی راز، راز نہیں رہا تھا۔ وہ جان گیا



میں مخالفت ہوا تھا۔ وہ پھر سے جیسے تصدیق کر رہا تھا اور مون اس کے حواس ازار ہی تھی۔

”تم اپنا ریکارڈ پلیئر اٹھلاؤ، موسیارت کی موسیقی سنو، مجھے چارمنٹ کا وقت دینا..... میں پیانو بجا کر تمہیں موسیارت کی نقل اتار کر دکھاؤں گی.....“ مون نے بڑے قفاخر کے ساتھ جیسے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اتنی پراعتماد تھی جیسے یہ کام اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ عیسیٰ کو دھچکا لگا..... پھر جیسے مون کو جھٹلانے کی خاطر وہ اپنا ریکارڈ پلیئر اٹھالایا تھا۔ اس نے موسیارت کی دھن سیٹ کی۔ ریکارڈ پلیئر سے سر بکھرنے لگے تھے۔ چارمنٹ گزر گئے، اب وہ ریکارڈ پلیئر آف کر رہا تھا پھر جیسے اس نے چیلنج بھری نظروں سے مون کی طرف دیکھا تھا گویا کہہ رہا ہو..... ”اب کر کے دکھاؤ۔“

مون کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ بکھر گئی تھی پھر جیسے اس نے عیسیٰ کا دیا چیلنج قبول کر لیا تھا۔ اس نے پیانو بجا یا اور موسیارت کی دھن عیسیٰ کی سماعتوں میں اترنے لگی تھی۔ مون کی قوت سامعہ بہت شارپ اور حساس تھی۔ وہ جیسے دم بخود رہ گیا تھا پھر مون نے عیسیٰ سے بڑے غرور بھرے لہجے میں کہا۔

”اب تم بجا کر دکھاؤ۔“ وہ چاکلیٹ کھاتی بڑی مسرور تھی۔ جیسے اسے یقین تھا کہ عیسیٰ بھی اس کا دیا چیلنج پورا نہیں کر سکے گا اور وہ حقیقتاً ناکام ہو گیا تھا۔ کیونکہ مون اسے جتا، جتا کر شرمندہ کر رہی تھی کہ وائلن کا کون سا سرفلاں نوٹ سر سے ہٹا ہوا تھا۔ کہاں روہم ٹوٹا، کہاں موسیقی کی لہریں بے ہنگم شور سنانے لگی تھیں۔

اگر موسیارت صرف تین برس کی عمر میں پیانو کے سر سمجھنے لگا تھا، چار برس کی عمر میں وائلن کے بے ترتیب نوٹ سر پر چونکنے لگا تھا پانچ برس کی عمر میں بڑے اعتماد کے ساتھ پیانو بجانے لگا تھا اور چھ برس کی عمر میں موسیقی کمپوز کرنے لگا تھا تو بلاشبہ وہ ایک

آیا تھا۔ بالآخر وہ عیسیٰ کو چونکانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب اسے دھیرے، دھیرے اپنے آس پاس موجود ہر ایک فرد کو چونکانا تھا جیسے اسے اچانک اپنی کچھ پوشیدہ خوبیوں کا ادراک ہو گیا تھا۔ دراصل آج کی محفل میں پاپا کے فرینڈز نے اس کی بے تحاشا تعریفیں کر کے اسے احساس دلادیا تھا کہ اس میں کچھ خاص ضرور ہے۔

”کچھ دیر پہلے..... وائلن بجانے سے چارمنٹ پہلے.....“ مون نے شان بے نیازی سے کہا تھا۔ عیسیٰ ہکا بکارہ گیا۔

”تم نے ویوالدی کی دھن کہاں سے سنی؟ اور کیسے نقل اتاری.....“ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، میں بھی بے یقین ہوں۔“ عیسیٰ نے چاکلیٹ کا ریبڑ پھاڑے بغیر سینٹرل ٹیبل کی طرف اچھال دی تھی۔ اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ پچھلے دو سالوں سے ویوالدی کی دھنوں کو سن رہا تھا مگر ایک مرتبہ بھی اس کی نقل نہیں اتار سکا تھا جبکہ مون اسے شکا کڈ کرنے پر تلی تھی۔ صرف چارمنٹ کے دوران وہ ویوالدی کی ہرزمن کو کیسے ذہن میں ترتیب دے چکی تھی! یہ مقام حیرت تھا، وہ کیسے نہ دم بخود ہوتا۔

”تمہیں یقین نہیں آئے گا، میں تمہیں موسیارت (جرمن موسیقار) کی کوئی بھی دھن سنا سکتی ہوں۔“ مون نے عیسیٰ کی آنکھوں میں دیکھے بغیر بڑے اعتماد سے کہا تھا۔ یہ اس کی سب سے بڑی انفرادیت تھی۔ وہ لوگوں کو دیکھے بنا بات کرتی تھی۔ اس کے سامنے کوئی بھی ہوتا، وہ کسی کی نگاہ میں نگاہ ڈال کر بات کرنے کی عادی نہیں تھی۔ وہ اپنے دور کی نہایت عجیب بچی تھی۔ حالانکہ وہ بچپن چھوڑ رہی تھی، لڑکپن کی حدود میں داخل ہو رہی تھی مگر اس کے چہرے کی سنجیدگی کسی بائیس سالہ دو شیزہ سے کم نہیں تھی۔ اس کی بات سن کر عیسیٰ جیسے ٹھنک گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا، مون نے موسیارت کا ہی نام لیا ہے؟ اسے جیسے سننے

طرف آئے گا..... سو وہ انتظار کرنے لگی تھی۔ عیسیٰ آچکا تھا، اب ناک کر رہا تھا پھر ہینڈل گھما کر اندر آ گیا تھا۔ مون نے آنکھیں کھول لیں، وہ جیسے عیسیٰ کی منتظر تھی۔

”مون تم جاگ رہی ہو تو باہر آ جاؤ، مجھے نیند نہیں آرہی۔ باتیں کرتے ہیں، یہاں سوزی ڈسٹرب ہوگی۔ سفر کر کے آئی ہے۔ یقیناً تھکی ہوگی۔“ عیسیٰ نے ہمیشہ کی طرح بڑے مہذب انداز میں بات کی تھی۔ وہ اسی لیے ماما پاپا کی آنکھوں کا تارہ تھا۔ وہ بہت نرم اور شائستہ لہجے میں بات کرتا تھا اور عیسیٰ یہ جانتا نہیں تھا کہ مون بھی غیر محسوس انداز میں اس کی نقل کرنے لگی تھی۔ کم گوئی، سنجیدگی اور آنکھ جھکا کر بات کرنا کچھ تو فطرتاً یہ وصف اس میں بدرجہ اتم پائے جاتے تھے اور کچھ وہ عیسیٰ کی کاپی کرتی تھی..... مگر یہ بات عیسیٰ نہیں جانتا تھا۔

مون نے کچھ دیر سوچا اور پھر آرام سے بستر کو چھوڑتی اٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنے ڈرائنگ گاؤن کا ہم رنگ اسکارف سر پر لپیٹا اور باہر آ گئی۔ وہ دونوں بہن، بھائی اب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ عیسیٰ نے لمب جلا دیا تھا۔ لاؤنج میں زردی ہلکی روشنی پھیل گئی تھی۔ اب وہ اس سے اوہر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ مون جانتی تھی، وہ عنقریب موضوع کی طرف آ جائے گا۔ سو وہ جلد ہی موضوع کی طرف آ گیا تھا۔ مگر اس سے پہلے وہ فریج سے کوک اور چاکلیٹس لانا نہیں بھولا تھا۔

”مون! تم نے کیسے (violin) بجانا کہاں سے سیکھا؟ اور کب سیکھا؟“ اس نے کوک کاٹن مون کو پکڑا کر حیرت سے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں حیرانی کوٹ، کوٹ کر بھری تھی۔ مون کے اندر بڑی مزیدار کھد بھونے لگی۔ وہ ایسی بے چینی تو عیسیٰ کی آنکھوں میں، اس کے اندر دیکھنا چاہتی تھی۔ کتنے انتظار کے بعد یہ خوب صورت وقت

تھا کہ یہ مون کی کارستانی تھی۔ پروہ اتنی کم مدت اور کم وقت میں اتنا مشکل منظر کیسے پیش کر سکتی تھی؟ اصل حیرانی بس اسی بات پر تھی..... اور اب یہ حیرانی دو چند ہو گئی تھی۔ اوپر ہال کی طرف جاتے ہوئے اس نے اپنا ریکارڈ پلیئر دیکھا تھا۔ تو گویا مون نے پہلے ریکارڈ پلیئر کو استعمال کیا تھا..... یعنی ویوالدی کے سر سے تھے پھر ان کی نقل اتاری؟ مگر اتنی کم مدت اور مختصر سے وقت میں اس نے اتنی اعلیٰ پائے کی نقل کیسے اتاری تھی؟ وہ پندرہ۔ لہ لڑکا جیسے چکرا کر رہ گیا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی، اس کی بہن غیر معمولی ذہن رکھتی ہے، وہ جس چیز کو ایک مرتبہ دیکھ لیتی یا سن لیتی، وہ چیز اس کے ذہن سے عمر بھر کے لیے نکل نہیں سکتی تھی۔

وہ جیسے شکا کڈ سا لٹے قدموں نیچے کی طرف آ گیا..... اب وہ مون کے بیڈروم کا دروازہ ناک کر رہا تھا۔ پھر وہ ہینڈل گھما کر اندر آ گیا۔ کمرے میں نائٹ بلب آن تھا..... سوزی سنگل بیڈ پر گہری نیند سو رہی تھی تاہم مون ابھی تک جاگ رہی تھی۔ وہ جاگ نہیں رہی تھی تب بھی عیسیٰ اسے اٹھانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے اندر اتنی بے چینی تھی کہ وہ صبح ہونے تک کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

مون نے اپنے تیز اندازوں سے سمجھ لیا تھا کہ جب سب سو جائیں گے ماما، پاپا اپنے کمرے میں چلے جائیں گے تب ضرور عیسیٰ اس کے کمرے میں آئے گا، وہ اسی لیے جاگ رہی تھی۔ وہ فی الحال سونا نہیں چاہتی تھی۔ اسے بھی عیسیٰ کی بے چینی سے لطف اندوز ہونے کا موقع مل رہا تھا سو اس موقع کو کیسے گنوا دیتی پھر جیسے ہی اس کی چھٹی حس نے الارم بجایا، وہ ایک دم الٹ ہو گئی تھی۔

عیسیٰ اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ عیسیٰ اب اسٹوڈیو کی طرف جا رہا تھا، عیسیٰ اب میٹھیوں چڑھے گا پھر وائلن کو دیکھے گا، ریکارڈ پلیئر چیک کرے گا اور پھر اٹنے قدموں مون کے کمرے کی



گئے تھے پھر جیسے اپنی الجھن مٹانے کی غرض سے بولے۔ ”واٹ ہیپنڈ؟“ ان کے چہرے پر تھکر کے سائے پھیل گئے تھے۔ تب اس نے جوس کا گلاس واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ آج سفر نہ کریں۔“ اس کی آنکھوں میں ہلکی، ہلکی پریشانی تھی، جس نے ماما، پاپا کے ساتھ عیسیٰ اور سوزن کو بھی ٹھنکا دیا تھا۔ پاپا کے بجائے ماما نے قدرے برہمی سے پوچھا۔

”کیوں..... کیا وجہ ہے؟“ وہ ناشتا کر رہی تھیں۔ ایک دم خفا ہو کر کہنے لگیں۔ گویا صبح بدشگون کی بات انہیں پسند نہیں آئی تھی۔

”بس مجھے لگتا ہے، پاپا کا آج سفر کرنا مناسب نہیں۔“ مون نے دو ٹوک بات کر کے دوبارہ سے جوس پینا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی ESP کی حامل قوت کا ذکر کیسے کرتی؟ کیا یہاں بیٹھے افراد اس کی بات پر یقین کرنے والے تھے؟ حالانکہ ابھی ابھی پاپا کا سفری بیگ دیکھ کر اس کے اندر مخصوص الارم بجا تھا۔ پاپا کہاں جا رہے ہیں؟ پاپا کیوں جا رہے ہیں؟ پاپا کو ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ تم از کم آج کے دن نہیں۔

”تمہیں کیوں لگتا ہے؟ کیا تمہیں الہام ہوا ہے؟ یا کوئی بھی نیک خواب دیکھا ہے؟“ اب کہ مریم کا لہجہ برہم نہیں تھا۔ وہ خاصی نرمی سے پوچھ رہی تھیں۔ تاہم ناشتے سے مریم نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ وہ ایک دم دوسو سے کا شکار ہو گئی تھیں۔ کیا خبر، مون نے کوئی پسندیدہ دیکھا ہو؟ بھیانک پسنا.....

”خواب نہیں دیکھا..... پر میرا دل کہہ رہا ہے جیسے آج کچھ ہو جائے گا۔ پاپا کو نہیں جانا چاہیے۔“ مون نے کچھ بے چینی سے اپنی بات مکمل کی تھی تب پاپا نے بڑے پیار سے ان دونوں ماں، بیٹی کو سمجھایا تھا۔

”وہم نہیں کرو، کچھ بھی نہیں ہونے والا۔“ وہ

تھے۔ اور اکثر جاتے رہتے تھے۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پاپا کے آفیشل ٹورز کے دوران ماما ان کے آفس کو دیکھتی تھیں۔ وہ پاپا کی بہت مدد کرتی تھیں۔ وہ ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں تھیں اور بڑے منظم طریقے سے دفتر اور گھر کو دیکھتی تھیں۔

جب پاپا ”سی یوسون“ بول کر دونوں بچوں کو پیار کر کے جانے لگے تب اچانک مون نے انہیں روک لیا تھا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں پاپا؟“ وہ جوس بیٹی اچانک بولی تھی۔ جیسے ان کی تیاری کو بڑی حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور ان کے اٹھنے سے پہلے اس نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ پاپا کہیں جانے کے لیے اتنا تیار بیٹھے ہیں اب جو اس نے دھیان دیا تو پاپا کے سفری بیگ پر بھی نظر پڑ گئی تھی جیسے مریم آخری مرتبہ سرسری انداز میں چیک کر رہی تھی کہ آیا کوئی چیز رہ تو نہیں گئی تھی۔

”ڈورٹ منڈ..... تم لوگوں کے چاکلس آجائیں گے۔“ انہوں نے باری، باری، باری اور مون سے کہا تھا۔ جیسے انہیں یقین تھا کہ وہ چاکلس کی فرمائش ہی کرے گی۔ ان دنوں مون کو چاکلس کھانے کا جنون تھا۔

”کیا جانا ضروری ہے؟“ اس نے ایک مختلف بات کی تھی۔ وہ کچھ حیران ہوئے پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی، وقت آگے کھسک رہا تھا ان کی فلائٹ کا ٹائم قریب، قریب تھا۔

”بہت ضروری ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر بیٹی کی پریشانی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے سرخ، سنہری بال منہ پر گر رہے تھے۔

”کتنا ضروری ہے؟“ مون نے ایک بھوں اچکا کر پوچھا تھا۔ اب کہ اس کے سوال نے انہیں چونکا دیا تھا۔

”اٹس ویری امپورٹنٹ.....“ وہ کچھ، کچھ الجھ

نی طرز کی تازگی محسوس کرتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ ایک شائستہ کھیل تھا۔ تہذیب، لیاقت، قابلیت، اخلاق انسانیت، خوش خلقی اور زیبائش سے آراستہ..... اس کھیل میں کسی کا کوئی نقصان نہیں تھا..... وہ محض اپنی ذات کی تسکین چاہتی تھی۔ اس کھیل میں وہ لوگوں کی نگاہوں میں انفرادیت پانے لگی تھی۔ لوگ اسے دیکھ کر چونک جاتے تھے، سرگوشیاں کرتے، اسے دیکھ کر اشارے کرتے اور اسے اپنی نگاہوں میں اعلیٰ مقام دیتے۔ وہ بہت جلد اپنے حلقہ احباب میں مقبولیت پانے والی تھی۔ اس کی قسمت کا ستارہ بہت بلند تھا اور وہ بہت چھا جانے والا مقام حاصل کرنے والی تھی۔

پھر ہوا یوں کہ عیسیٰ حیران، حیران اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور مون بڑے تفاخر سے مسکراتی ہوئی اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر بھی موجود تھے۔ مون، عیسیٰ، سوزن اور پاپا..... ماما ناشتا بنا رہی تھیں۔ آج نئی اپنی ماں کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ اس کی ماں اکثر بیمار رہنے لگی تھی اور وہ ماں کی جگہ کام پر آتی تھی۔ ماما نے اپنی سہولت کے لیے انہیں رکھا ہوا تھا۔ ویسے ان کے گھر میں اتنا پھیلاوا نہیں ہوتا تھا۔ مون اور عیسیٰ بڑے نفیس اور مہذب بچے تھے۔ گندگی سے دور رہتے اور عام بچوں کی طرح پھیلاوا نہیں ڈالتے تھے۔ گھر کا کام صفائی وغیرہ نئی کی ماں کے ذمے تھا اور اس کی بیماری کے باعث اب نئی کام پر آتی تھی۔ ماما کھانا خود بناتی تھیں اور اس معاملے میں بہت کانشس بھی رہتی تھیں۔

ہاں، تو ذکر ہو رہا تھا۔ اس انوکھی صبح کا جو اسے اصل ڈھنگ سے ہی طلوع ہوئی تھی۔ اس صبح میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ عام دنوں کی طرح عام سی سویر تھی۔ مگر یہ سویر عام کہاں تھی؟ اس صبح پاپا نے ڈورٹ منڈ جانا تھا۔ وہ آفیشل کام کے لیے جا رہے

حیران کن تخلیق کار تھا جبکہ اس کی بہن اگر ویوالدی اور موتسارت کی نقل اتار لیتی تھی اور ہٹا غلطی کیے ان کی دھن بجالیتی تو یہ بھی کم حیرانی والا مقام نہیں تھا۔ علی عیسیٰ جیسے ششدر رہ گیا تھا۔

”یہ حیران کن ہے۔“ بالآخر جیسے اس نے تسلیم کر ہی لیا تھا۔ تاہم آنکھوں میں حیرت اب بھی بھری تھی۔ ماما سے خیال آیا تھا۔

”تم نے ہی میری گمبھدے (پینٹنگ) کو مکمل کیا تھا؟“ اس کی آنکھوں میں پھر سے الجھن تیرنے لگی۔

”یقینی طور پر اسے میں نے ہی مکمل کیا تھا۔“ مون کا تفاخر بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کو متاثر کرنے اور چونکا نے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ عیسیٰ جیسے رک سا گیا۔

”اتنے کم وقت میں کیسے.....؟ میں تو صرف ڈیڑھ گھنٹے تک سویا رہا تھا۔“ وہ کچھ سوچ، سوچ کر بول رہا تھا۔ تب مون نے فخریہ انداز میں اپنا کارنامہ بتایا تھا۔

”میں نے ایک گھنٹا اٹھائیس منٹ میں پینٹنگ مکمل کر دی تھی۔“ مون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جیسے علی عیسیٰ کی حیرت اسے محظوظ کر رہی تھی۔ یہ بہت انوکھا تجربہ تھا۔ لوگوں کو چونکا کر انہیں درط حیرت میں ڈالنا اور پھر ان کی حیرت سے لطف اندوز ہونے میں اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی شایان طریقے سے ماما، پاپا کو بھی توخیر کر سکتی تھی اور اپنے کلاس فیلوز اور ٹیچرز کو بھی حیران کر سکتی تھی۔ تو کیا اسے اور لوگوں کو بھی چونکا کر حظ اٹھانا چاہیے؟ جیسے فیصلہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے اندر موجود حس لطیف کو تسکین پہنچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی اور اس کچھ بھی میں بہت کچھ شامل تھا۔ مون کے لیے یہ ایک منفرد قسم کی ایکٹیوٹی تھی، ایک انوکھی طرز کا کھیل تھا۔ جسے کھیلنے میں اسے خوب لطف آنے لگا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ اس کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ وہ ہر نئے دن میں



**قومی زبان و شخص کی اہمیت**

کیا آپ کو معلوم ہے کہ 1945ء میں جب جاپان پر تاریخ کا بدترین وقت آیا اور اس کے شہنشاہ ہیرو ہیتو کو امریکی جنرل میک آر تھر کے سامنے لاچار انداز میں بیٹھ کر آئندہ کے لیے امریکا، جاپان تعلقات کے معاملات طے کرنا پڑے تو ہیرو ہیتو نے واحد شرط کیا رکھی تھی؟ جی ہاں ہر میت خوردہ شہنشاہ ہیرو ہیتو نے کہا تھا۔

”میرے نظام تعلیم اور جاپانی زبان کو نہ چھیننا۔“ یہ انتہائی دانشمند اور دور رس نتائج کا حامل فیصلہ تھا اور اس فیصلے کے ثمرات دیکھیے کہ کتنی جلد جاپان دنیا کا مضبوط ترین معیشت کا حامل ملک بن گیا۔ دانشمند قوم کے دانشمند رہنما ایسے ہی فیصلے کرتے ہیں۔ قائد اعظم بھی ہمارے دانش مند رہنما تھے۔ سبھی انہوں نے... ددو لک انداز میں اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کا کھل کر اظہار کیا تھا۔

چین 1949ء میں آزاد ہوا تو وہاں بے شمار ایسے اسکول و کالج تھے جہاں انگریزی رائج تھی۔ ماؤزے تنگ نے آزادی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ ذریعہ تعلیم بھی صرف چینی زبان ہوگا۔ چین کی ترقی آج ہمارے سامنے ہے۔ فرانس میں لفظ برگر جیسے الفاظ تک ادا کرنے پر پابندی ہے اور جو بھی الفاظ فرانسیسی زبان میں دستیاب ہوں ان کی جگہ انگریزی کا لفظ منتخب کیا جائے تو ایسے شخص پر جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے۔ اسرائیل کے قیام کے فوراً بعد ہی عبرانی زبان کو رائج کر دیا گیا حالانکہ یہ قوم پوری دنیا میں تقریباً ڈھائی سو سال در بدر رہی۔

انتخاب از۔ کالم جواں فکر تحریر ڈاکٹر نوید اقبال  
مرسلہ: تفسیر آرا، یو اے ای۔

ایکڈنٹ کا خدشہ ہوگا۔“ وہ ذرا چڑ گئے تھے۔ سب کی ایک ہی نگرانی نے انہیں عاجز کر دیا تھا۔

”اللہ نہ کرے.....“ مریم دہل گئی تھی۔  
”بائی اتر جا رہا ہوں..... پھر کس لیے ٹینشن ہے؟ آرام وہ سفر ہوگا۔ زیادہ طویل بھی نہیں۔“ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے تھے۔ تو گویا وہ قطعاً رکنے والے نہیں تھے۔ مون سخت مضطرب ہو گئی تھی۔ وہ کیسے پاپا کو روکے؟

”پاپا! میرا دل کہہ رہا ہے، آج کچھ ہو کے رہے گا۔ آپ نہ جائیں پاپا پلیز.....“ مون کچھ بچی ہو گئی تھی۔ پاپا ان کے دوسوں اور وہوں کو بے بنیاد کہہ رہے تھے۔ شاید ان کے وہم بے بنیاد ہی تھے۔

پاپا نے ان سب کو الوداعی مسکراہٹ سے نوازا تھا پھر مون کو خصوصی پیار کر کے باہر نکل گئے تھے۔ مریم کچھ افسردہ ہو رہی تھی، جیسے اس کا دل بچھ رہا تھا۔

مون، پاپا کے چلے جانے کے بعد دوبارہ ناشتے میں مصروف ہو گئی تھی۔ گویا اس کا تکرار ختم ہو چکا تھا۔

وہ انہیں خبردار کر چکی تھی۔ اب پاپا کے عمل کی ذمے داری ان کے اپنے سر تھی۔ مریم کو اب مون کی

نیازی پسند نہیں آرہی تھی۔ برتن سمیٹتے ہوئے مریم کن آنکھوں سے مون کے ہمیشہ والے ساٹ تاثرات کو

دیکھ رہی تھی پھر عیسیٰ اور سوزن کے اٹھتے ہی وہ مون کے برابر آ بیٹھی۔ گویا مریم کے اندر بھی کھد بد ہو رہی

تھی۔ دراصل وہ مون کے دوسرے اور وہم کی کھوج کرنا چاہتی تھی۔ آخر مون نے آج کیا محسوس کیا تھا؟

”مون بیٹا.....! یہ جو تم نے پاپا کو روکا، تم نے آخر کیوں روکا؟ تم نے کیا دیکھا؟“ مریم کے لہجے

میں دبا، دبا جس اور تکرار بھی تھا۔ وہ ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ ہو چکی تھی۔ اسے مون کی بات بہت غیر معمولی لگی تھی۔ مون کے تاثرات بھی اس لمحے کچھ

ایسے ہی تھے۔  
”میں نے غلط کیا جو پاپا کو روکا، اب آپ سب

احتیاط ضروری ہے، آپ نے کبھی نوٹ کیا؟ ہمارے اندر کسی انہونی کے وقت کچھ گونج جاتا ہے۔ جیسے دل بچھ سا جاتا ہے یا ہلکے ہلکے دوسرے چنگیاں بھرتے ہیں۔ میرے ساتھ ایسا ضرور ہوتا ہے؟ جانے آپ کے ساتھ ہوتا ہے یا نہیں۔“ مون نے اتنی گہری بات بہت عام سے لہجے میں ان کے گوش گزار کر دی تھی۔ حسیب اور مریم کے ساتھ عیسیٰ بھی ٹھنک کر مون کو دیکھنے لگا تھا جبکہ سوزن پہلے ہی درط حیرت میں مبتلا بیٹھی تھی۔ اس کی اکلوتی کزن ہمیشہ سے اسے چونکا تی آئی تھی۔ آج بھی اسے چونکا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ کوئی انہونی بات ہی کرتی تھی جسے عقل تسلیم ہی نہیں کرتی..... مگر وہ ہو کر رہتی تھی۔

”میرے ساتھ بھی ایسا ضرور ہوتا ہے، میرا دل بھی کہہ رہا ہے آپ نہ جائیں۔“ مریم نے گویا فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ جیسے بے بس ہو گئے تھے۔ اگرچہ ان کا اپنا دل کچھ بوجھل سا تھا۔ طبیعت ہزار تھی مگر وہ اس بوجھل پن کو نیند کی کمی سے عبارت کر رہے تھے۔

رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے شاید طبیعت مضطرب تھی۔ ان کے دل میں بھی کچھ عجیب سی بے چینی تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے پارہے تھے۔ مگر مریم اور

مون اس بے چینی کو خطرہ قرار دے رہی تھیں۔ تو کیا انہیں اپنی بیوی اور بیٹی کی بات مان لینی چاہیے؟ وہ تذبذب کا شکار کھڑے سوچتے رہ گئے تھے۔

”پاپا آپ نہ جائیں۔ ماما اور مون منع کر رہی ہیں۔ نقصان ہوتا ہے تو ہوتا رہے، کیا خبر یہ سزا آپ کے لیے ٹھنک نہ ہو۔“ بہت دیر بعد عیسیٰ نے بھی لب

کشائی کی تھی۔ جب مون اتنا اصرار کر رہی تھی تو پھر بحث بیکار تھی۔ کیا پتا، وہ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس نے کوئی خواب دیکھا ہو یا پھر اس کے دل کا دوسرے بے بنیاد نہ ہو۔ کچھ بھی تو متوقع ہو سکتا تھا۔

”اف..... تم بھی۔“ پاپا زچ ہواٹھے تھے۔  
”میں کون سا خود کار ڈرائیو کرنے والا ہوں جو

مطمئن تھے اور اب اپنا کوٹ پہن رہے تھے۔ یعنی وہ رکنے والے نہیں تھے۔ مون مضطرب سی کھڑی ہو گئی تھی پھر اس نے ماں کو اشارہ کیا۔

”آپ پاپا کو روک لیں ماما.....“ مون التجا کر رہی تھی۔ مریم بے چین کھڑی تھی جبکہ عیسیٰ کسی بھی چیز کی طرف دھیان دینے بغیر صرف مون کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ایک نلک، حیرانی کے عالم میں جیسے کچھ کھوجتا چاہ رہا تھا۔ مگر مون کے تاثرات ایک دم سپاٹ تھے۔ کچھ بھی اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ وہ جیسے ناکام سا ہو گیا۔

”حسیب! آپ ڈورٹ منڈ نہ جائیں۔“ مریم نے مون کے دل کی بات چھین لی تھی۔ وہ

مون کے وہم کا شکار ہو گئی تھیں اور مریم نے حسیب کو روکنے کی پہلی کوشش بالآخر کر ہی دی تھی۔

”مریم! تم بھی.....“ وہ جیسے زچ ہو گئے تھے۔ مون تو بچی ہے، تم تو سمجھدار ہو، جانتی بھی ہو،

میرا جانا کتنا اہم ہے۔“ وہ جھنجھلا کر رہ گئے تھے۔ گویا ان ماں، بیٹی نے انہیں گہری کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ آگے جانے اور رک جانے کے درمیان پھنس گئے تھے۔

”زندگی سے زیادہ اہم“ کچھ نہیں ہوتا پاپا!  
ان کی چھوٹی سی بیٹی نے جیسے ایک مرتبہ پھر انہیں

ٹھنکا دیا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے ختم سے گئے تھے۔ مون نے کتنی گہری اور اہم بات کی تھی۔ اتنی سی عمر

میں اتنی سنجیدہ بات..... جیسے وہ کسی تجربے کی روشنی میں کہہ رہی ہو۔

”میری زندگی کو بھلا کیا خطرہ ہے؟“ حسیب نے مذاقاً گفتگو کو ختم کرنے کے لیے کہا تھا۔ مگر مون مذاق کے موڈ میں کہاں تھی۔ وہ ان کی بات سن کر

عجیب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔ انہیں کم از کم مون کی نظریں کچھ عجیب ہی لگی تھیں۔

”پاپا! حادثے بتا کر نہیں ہوتے..... پھر بھی



والی بات نہیں تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔  
 ”یہ کیا ہوا.....؟“ سب سے پہلے مریم نے  
 سنبھل کر چیخ کا گلا گھومتے ہوئے لب کشائی کی تھی۔  
 ”اڑ کریش.....“ عیسیٰ زیر لب بڑ بڑایا تھا۔  
 ڈورٹ منڈ جانے والی ڈومیسٹک فلائٹ حادثے کا  
 شکار ہو گئی تھی۔ یہ لوگ جیسے بے جان بت بن گئے تھے۔  
 پتھر میں ڈھلے اور حسیب احمد صوفے پر ڈھے گئے۔ ان  
 کے اپنے الفاظ جیسے ان کا منہ چڑا رہے تھے۔  
 ”میں بائی اڑ جا رہا ہوں..... کون سا خود کار  
 ڈرائیو کرنے والا ہوں جو ایک سیڈنٹ کا خدشہ ہو۔“  
 انہوں نے اپنا سر تھام لیا تھا۔ بڑے بول جو منہ پر  
 آپڑے تھے۔ دل کی حالت غیر تھی جو سنبھلنے میں نہیں  
 آرہی تھی۔ باقی لوگ الگ الگ شاکڈ تھے۔ ٹی وی پر  
 حادثے کی تفصیلات چل رہی تھیں اور ان کے کانوں  
 میں مون کے سوسے گونج رہے تھے۔  
 ”میرا دل کہہ رہا ہے، آج آپ سفر نہ کریں۔“  
 انہوں نے گردن موڑ کر اپنی لاڈلی بیٹی کی طرف  
 دیکھا تھا جس کی بجٹ نے انہیں بہت دیر کرا دی تھی  
 ورنہ وہ ٹائم سے جہاز میں سوار ہو جاتے اور اب تک  
 ان کی ہڈیاں بھی جل چکی ہوتیں۔ جانے کیوں ان  
 کے اندر عجیب سی نخر یہ لہراٹھی تھی۔ ایک ٹھانٹھیں مارتا  
 عجیب سا طوفان جوش کھانے لگا تھا۔ وہ اپنی جگہ  
 سے اٹھ کر مون کی طرف آئے تھے پھر انہوں نے  
 مون کو اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا۔  
 ”میری پیاری بیٹی.....! تمہاری وجہ سے،  
 صرف تمہاری وجہ سے میں لقمہ اجل بننے سے رہ گیا۔“  
 وہ آنسو بھری آنکھوں سے مون کا سر چوم رہے  
 تھے۔ ان کے لہجے میں واضح تشکر تھا۔ وہ اللہ کا شکر  
 ادا کر رہے تھے جو وہ واپس صح سلامت اپنے بچوں  
 میں پہنچ چکے تھے اور ادھر مون کے دل کی حالت  
 عجیب تھی۔ اس کا وہم، سو۔ یا ESP کی حالت  
 قوت کا اشارہ ایک ٹھوس حقیقت بنا سامنے کھڑا تھا۔

گھر میں ڈونچ نہیں بولی جائے۔ اردو بولی جائے  
 تاکہ ان کی اردو زیادہ امپرو ہو سکے۔ ورنہ اردو  
 سیکھانے کے لیے الگ سے ٹیوٹر رکھنا پڑتا مگر اب وہ  
 محض پاپا کو چڑانے کے لیے اونچی آواز میں سوزن  
 سے ڈونچ میں مخاطب تھی۔  
 سوزن نے کچھ حیران ہو کر ڈونچ میں ہی  
 جواب دیا تھا۔ تب تک پاپا اندر آ چکے تھے اور مون کی  
 بات بھی سن چکے تھے۔ بھی ان کے چہرے پر خشکی  
 نمایاں تھی۔ جیسے وہ سمجھ چکے تھے کہ مون انہیں غصہ  
 دلانے کے لیے ایسا کر رہی ہے کیونکہ انہوں نے گھر  
 میں ڈونچ بولنے پر سخت پابندی لگا رکھی تھی۔  
 ”مجھے افسوس ہے۔“ انہوں نے بہت برہم  
 لہجے میں مون کو مخاطب کیا تھا۔ وہ جیسے ان کے کچھ  
 بولنے کی ہی منتظر تھی۔  
 ”واپس آنے پر یا ڈورٹ منڈ نہ جانے پر؟“  
 مون چمک کر بولی تھی۔ اس نے بیگ میں کتابیں رکھ  
 لی تھیں۔ اب زپ بند کر رہی تھی۔  
 ”ڈونچ بولنے پر.....“ تب سوزن زیر لب  
 بڑبڑائی۔ اس کی آواز بدہم تھی۔ حسیب احمد اپنا بریف  
 کیس صوفے پر رکھ کر مریم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے  
 جو ان سے واپسی کی وجہ پوچھ رہی تھی۔  
 ”فلائٹ نکل گئی۔ تم لوگوں نے صبح ہی صبح بجٹ  
 اتنی لگا رکھی تھی..... گھر سے ہی لیٹ نکلا تھا میں۔“  
 اب وہ فون اٹھا کر ٹرین کے ٹائم کا پوچھ رہے تھے۔  
 یقیناً ٹرین سے ڈورٹ منڈ جانے والے تھے۔  
 ”ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔“ مریم نے نرمی  
 سے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ عیسیٰ اب ٹی وی لگا  
 کر شوژ پین رہا تھا۔ جب اچانک بریکنگ نیوز نے  
 ان سب کو چونکا دیا تھا۔ مریم کے ہاتھ سے گلاس  
 چھوٹ گیا تھا جبکہ سوزی ہکا بکا رہ گئی۔ عیسیٰ اور حسیب  
 احمد دم بخود تھے۔ البتہ مون کے تاثرات سب سے  
 الگ تھے۔ اس کے لیے بریکنگ نیوز میں کوئی دلچسپی

کچھ دیر بعد پاپا داخل ہونے والے تھے۔ سوزن  
 کے تاثرات ان سب سے مختلف تھے۔ اس کے  
 انتہائی سرخ پھولے اور چکنے گالوں پر مسکراہٹ کے  
 ننھے گڑھے پڑ رہے تھے۔ کانوں میں پڑی  
 بالیاں جھول رہی تھیں۔ جن کے نیچے موٹا سا سنہری  
 موتی لٹک رہا تھا۔ وہ جیسے بے یقین نظروں سے  
 مون کو دیکھ رہی تھی۔  
 ”انکل نے تمہاری بات مان لی۔“ سوزن  
 اب بھی حیران اور بے انتہا حیران تھی۔ تب مون نے  
 چونک کر اپنی بے ضروری کزن کو دیکھا تھا پھر جیسے سر  
 جھٹک کر بولی۔  
 ”لگتا ہے پاپا کی فلائٹ مس ہو گئی۔“ مون  
 کے تاثرات اب بھی ساٹ تھے۔ وہ دوبارہ سے اپنا  
 اسکول بیگ چیک کرنے لگی تھی۔ گویا اسے پاپا کے  
 آنے یا نہ آنے سے فرقی نہیں پڑا تھا۔ انہوں نے  
 کون سا اس کی بات مانی تھی۔ اب اگر واپس آئے  
 بھی تھے تو اپنی مرضی سے..... سو وہ کندھے اچکا کر  
 سوزن کی طرف متوجہ ہونے کے بعد موضوع گفتگو  
 بدل رہی تھی۔ آج سوزن کا ایڈمیشن مون کے اسکول  
 میں ہونا تھا۔ گروی اسے یہاں اسی مقصد کے تحت  
 چھوڑ گئی تھیں۔ بواریا میں گھر کے کاموں اور تانی کے  
 باڑے میں الجھ کر وہ بڑھائی نہیں کر سکتی تھی اسی لیے  
 تانی اسے یہاں چھوڑ گئی تھیں تاکہ وہ پوری یکسوئی  
 کے ساتھ پڑھ سکے۔ مون نے سوزن سے پڑھائی  
 کے متعلق بات کرنا شروع کر دی تھی۔ در پردہ پاپا پر  
 جتنا بھی مقصود تھا کہ وہ اس کی بات نہ مان کر چلے  
 گئے تھے اور اب واپس اپنے ہی کسی کام کی وجہ سے  
 آئے تھے۔ مون کی بات کے احترام میں نہیں۔  
 ”تمہارا پسندیدہ مضمون کون سا ہے؟“ وہ پاپا  
 کو اندر آتا دیکھ کر سوزن سے مخاطب تھی۔ عموماً ان  
 کے گھر میں اردو بولی جاتی تھی۔ سوزن بھی بہت اچھی  
 اردو بول لیتی تھی پھر پاپا نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ

میرے پیچھے بڑ جائیں گے۔ ابھی تو عیسیٰ اور سوزن  
 کی بھی تفتیش جھگڑتوں کی۔“ مون نے بگڑ کر انتہائی  
 بدتمیزی سے کہا تھا پھر اپنی اسکرٹ کو جھاڑتی سخت  
 سے بولتی ہوئی اٹھ گئی تھی جبکہ مریم کچھ ہکا بکا ہو گئی۔  
 یہ مون کو بھلا کیا ہوا تھا؟ وہ ایسی تو نہیں تھی؟ مریم دق  
 سی بیٹھی اپنی لاڈلی کو جاتا دیکھتی رہ گئی تھیں۔  
 مون نے مریم سے جو کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔  
 اسے عیسیٰ اور سوزن کی بھی تفتیش جھگڑتا پڑی تھی۔  
 جب وہ تیار ہو کر اسکول جانے لگی تب عیسیٰ نے  
 مون سے پوچھا۔  
 ”تم نے پاپا سے ایسی بات کیوں کہی؟“ وہ  
 بھی حیران تھا مگر زیادہ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ جیسے  
 مون کی بات کے پس پردہ کسی وجہ کو کھوجنا چاہتا تھا۔  
 پہلے سے چڑی مون کچھ اور چڑ گئی تھی۔  
 ”ایک جرم سرزد ہو گیا تھا مجھ سے..... آئندہ  
 ایسی غلطی نہیں کروں گی.....“ مون بھنائی، بھنائی  
 سی اپنا اسکول بیگ چیک کرنے لگی تھی۔ جب پاپا  
 کی کار کا ہارن سنائی دیا تھا۔ مون کے بیگ  
 میں کتابیں رکھتے ہاتھ رک سے گئے تھے۔ عیسیٰ  
 ٹائی کی ٹاٹ لگا تاٹھم گیا تھا۔ سوزن اسکول شوژ  
 پہن رہی تھی۔ لیسز بند کرتی حیران رہ گئی تھی۔ مریم  
 کچن سے متحیر سی باہر نکل آئی۔  
 ”حسیب واپس آ گئے.....“ مریم نے جیسے  
 سکون سے بھری سانس خارج کی۔ دل کی ساری  
 بے چینی سمٹ کر ایک نکتے میں ڈھل گئی تھی۔ مریم جیسے  
 مطمئن ہو گئی۔  
 ”پاپا آ گئے.....؟“ عیسیٰ کے تاثرات بھی کم و  
 بیش مریم جیسے تھے۔ وہ ٹائی کو پکڑے، پکڑے انٹرنس  
 ڈور تک گیا تھا۔  
 ”تو کیا واقعی پاپا آ گئے.....؟“ مون نے  
 بیگ کو ایک طرف رکھ دیا تھا۔ وہ منتظر نظروں سے  
 لاؤنج کے انٹرنس ڈور کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں سے



بھر میں متغیر ہو گئی۔  
 ”مجھے کسی کو اپنا محتاج بنانے کی ضرورت نہیں..... اور تم..... کیوں میری اپورٹنس سے جلتے ہو؟“ مون نے انتہائی تلخ لہجے میں بہت سچ بات کی تھی، اب کہ عیسیٰ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔  
 ”میں کیوں جلتوں گا؟ تمہاری حرکتیں خود تمہیں مشکوک بنا رہی ہیں..... مگر تم اپنے تکبر میں کچھ سمجھتی نہیں..... جو کچھ تم کر رہی ہو، غلط ہے، اپنی اس چھٹی حس کو سمجھاؤ..... تم ہر ایک کو وہم میں مبتلا کر رہی ہو..... جو کہ ٹھیک نہیں، ہر بندہ اپنا کام چھوڑ کر نہیں بیٹھ سکتا..... مگر تمہارے چھوڑے ہوئے دوسرے نماشوٹے ذہنوں کو الجھا دیتے ہیں۔ کام نہ بھی بگڑنا ہو تب بھی بگڑ جاتا ہے۔“ عیسیٰ نے کھر درے انداز میں اپنی بات مکمل کی تھی۔ مریم ان دونوں کو جھگڑتے دیکھ کر ہونق ہو رہی تھی۔ پھر ایک دم دونوں کو ڈپٹ کر بولی۔  
 ”کیا فضول ٹکرا رہے..... بس کرو اب، خواہ خواہ بات کو طول دیتے ہو۔“ مریم کو غصہ آ گیا تھا۔ وہ دونوں کچھ پل کے لیے چپ کر گئے تھے۔ مون کی آنکھوں میں شدید غصہ تھا۔  
 ”ایک تو میں تم سب کا بھلا کرتی ہوں، اوپر سے باتیں بھی مجھے سنائی جاتی ہیں۔“ مون نے زپرب لب بڑبڑا کر کہا۔  
 ”ہمیں ایسا بھلا نہیں چاہیے..... جو ہمیں ہمارے مقصد سے ہٹا دے۔ جو ہونا ہوتا ہے، ہو کر رہتا ہے، تم کچھ کہو یا نہ کہو..... یا پاپا کی فلائٹ نے ہر صورت مس ہونا تھا تم کچھ کہتی یا نہ کہتیں..... ان کا سفر بائی ائر نہیں، بائی روڈ لکھا تھا اور دوسرے اوپر سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ اول روز سے ہی، ہمارا ہر اچھا اور ہر برا۔“ عیسیٰ اب کے کچھ رساں سے بولا تھا۔ ماں کے چہرے پر لکھی ناگواری اسے نظر آرہی تھی۔ انہیں شاید ان دونوں کی ٹکرا رہی نہیں آرہی تھی۔

عمل کرنے لگی ہیں۔ اور وہ ہر نیا کام کرنے سے پہلے مون کو بتانا ضروری سمجھتی تھیں، اگر مون اوکے کرتی تو وہ کام کیا جاتا۔ مون اس اہمیت پر بہت مسرور تھی۔ جیسے تمام کیمروں کا رخ اس کی طرف ہو گیا تھا اور وہ گھر کے ثانوی فرد سے مرکزی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اس خوبی پر وہ اترا تری پھرتی تھی۔ پہلے پاپا، عیسیٰ کو اپنے زیادہ قریب رکھتے تھے اور وہ کم عمر نا بزرگ بہ کار ہونے کے باوجود بزنس کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ پاپا کو کئی بہترین مشورے بھی دیتا مگر مون کی اس اضافی خوبی کے باعث اب اس سے بھی کچھ نہ کچھ مشورہ ضرور کرتے۔ عیسیٰ، مون کی اہمیت پر جینٹلس نہیں تھا مگر وہ مون کی چھٹی حس سے ضرور خار کھانے لگا تھا۔ شاید ان دونوں بہن، بھائیوں کے درمیان دراڑ بھی اسی ESP کی حامل قوت کی وجہ سے آئی تھی کیونکہ مون نے یہ دتیرہ بنا لیا تھا، جب بھی کوئی ایونٹ ہوتا، کوئی ضروری کام ہوتا، کسی نے سفر پر جانا ہوتا وہ ضرور کوئی نہ کوئی شو شا چھوڑ دیتی جو ہر دفعہ نہ کسی مگر پھر بھی خوب نشانے پر درست لگتا تھا۔ اکثر تو مون، عیسیٰ کو بھی حیران کر دیتی تھی۔ اور وہ اگرچہ مون کے متاثرین میں دھیرے، دھیرے شامل ہو رہا تھا مگر تسلیم کرنے سے کتر اتار ہا تھا۔  
 ”اوکے..... میں ماہر فلکیات نہیں، نہ مجھے الہام ہوتے ہیں مگر میرا دل پھر بھی کہہ رہا ہے کہ آج کچھ ہو کر رہے گا۔“ وہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی اور بہت غصے میں کہہ رہی تھی۔ جیسے عیسیٰ کی بات اسے سخت بری لگی تھی۔  
 ”کچھ بھی نہیں ہونے والا۔ تمہارا دل، تمہاری باتیں اور تمہاری اسٹوڈنٹ چھٹی حس، ہم سب کو محض اپنا محتاج کر لینا چاہتی ہے..... ہم تمہارے اشاروں پر ناچیں، تم سے مشورہ لے لیں اور جو تم کہو، اسے درست مانیں۔“ عیسیٰ نے محل سے جیسے جتا، جتا کر اس کے غصے کا گراف بڑھا دیا تھا۔ مون کی رنگت پل

نئی کی ماں بھی نہیں آرہی تھی۔ سو وہ آج من بائیم جانے کا ارادہ رکھتی تھی مگر مون نے روکا تو جیسے کسی خدشے کے تحت رک سی گئیں کیونکہ مون جب بھی کسی بات سے منع کرتی تھی تب کچھ نہ کچھ ضرور ہو جاتا تھا۔ سوئے اتفاق عیسیٰ بھی اس وقت ان دونوں کے قریب بیٹھا تھا اور ماں، بیٹی کی باتیں سن چکا تھا۔ بھی مریم کی طرف دیکھ کر زری سے بولا۔  
 ”آپ چلی جائیں ماما.....! پاپا کو مسئلہ ہوگا۔ ہم کل شام تک آجائیں گے۔“ عیسیٰ ماں کے تذبذب کو جان گیا تھا۔ کیونکہ مون نے جو ایک دو مرتبہ درست نکلے مار کر انہیں ہراساں کیا تھا سو وہ اب در پردہ مون کی باتوں کو بہت اہمیت دینے لگی تھیں جو عیسیٰ کو مناسب نہیں لگتا تھا۔ مریم کے ذہن میں مون کی باتوں کا اثر گہرا ہونے لگا تھا۔ اس کو لگتا، مون جو بھی کہتی ہے، وہ سو فیصد نہ سہی مگر کچھ تو درست ہوتا ہے۔ اب بھی مون کے روکنے پر وہ رک گئی تھیں جبکہ عیسیٰ چاہتا تھا، وہ چلی جائے۔ مریم چلی جائیں تو مون کے روکنے والا وہم بھی جاتا رہتا۔ مگر مریم جاتی تو تب ناں..... وہ تو مون کے دوسروں کا شکار ہونے لگی تھیں مریم کو لگ رہا تھا مون کی چھٹی حس جو کہہ رہی ہے، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ان کا جانا مناسب نہیں..... کیا خبر، کچھ ہونہ جائے۔  
 ”نہیں جاتی، کچھ زیادہ ضروری بھی نہیں..... کیا پتا آج کے دن میں سفر مناسب نہ ہو۔“ مریم نے کچھ سوچ کر جواب دیا تھا۔ تب عیسیٰ چڑ کر رہ گیا۔  
 ”یہ ماہر فلکیات نہیں، جو دنوں، ہفتوں اور ستاروں کا حساب لگا کر لوگوں کو بتاتی ہے آج کا دن کیسا ہوگا؟ نہ اسے الہام ہوتے ہیں..... آپ اس کی باتوں میں نہ آئیں ماما! اگر ایسی بات ہے تو بھی تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ وہ شدید ناگواری کے عالم میں بولتا چلا گیا تھا۔ اسے لگتا جیسے روز بروز ماما، سوزی، پاپا اور تانتے وغیرہ مون کے نادر مشوروں پر

وہ خود بھی متحیر رہ گئی تھی۔ اس نے صبح، صبح الارم کی گھنٹی اپنے اندر سن، سن بجتی محسوس کی تھی۔ اسے لگا، آج کا دن اس کی فیملی کے لیے اچھا نہ ہوگا..... یا اس کے پاپا کسی نقصان سے دوچار ہونے والے تھے۔ اگرچہ نقصان ان کا اب بھی ہوا تھا۔ ایک بڑا ٹینیڈر ہاتھ سے نکل گیا تھا مگر جب اللہ نے جان بچا دی تھی تو پھر جہان تول ہی سکتا تھا۔  
 ایک غرور بھری مسکراہٹ لیے مون نے حاضرین کے چہروں کو دیکھا تھا۔ وہ سب جیسے ستائشی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ مون کی گردن لیے بھر میں تن ہی گئی تھی۔ جیسے کلف نے اسے اکڑا دیا تھا۔ غرور نے ان سب لوگوں میں مون کو ممتاز کر دیا تھا۔ آخر جو الارم مون کے اندر بجاتا تھا، وہ عیسیٰ، سوزن یا ماما کے اندر کیوں نہیں بجتا؟ وہ لوگ تو زیادہ پڑھے لکھے تھے، خصوصاً ماما، پاپا..... اور عیسیٰ بھی بہت ذہین تھا۔ پھر اس کی ذہانت نے اسے حادثے سے پہلے خبردار کیوں نہیں کیا۔ یہ الارم صرف مون کے اندر ہی کیوں بجاتا تھا، اس کا مطلب تھا، مون کے اندر کوئی خاص خوبی تھی اور اسی نادر دیدہ خوبی نے اسے اتراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا اور یہ اتراہٹ آگے جا کر اس کے لیے کتنی خطرناک ثابت ہوئی تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا پھر یوں ہوا کہ گھر والوں کے علاوہ مون کے آس پاس جتنے بھی قریبی لوگ تھے سب اس کے اندازوں اور سو فیصد درست نکلنے پر ہی ٹھکنے لگے تھے۔  
 ایک دفعہ بوار یا میں ان کے قیام کی مختصر مدت کے دوران مریم کو بھی کچھ دن ان کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ جس دن مریم واپس آرہی تھی، اس دن مون نے اسے روک لیا۔  
 ”ماما! نہ جائیں، آج رک جائیں، کل اکٹھے نکلیں گے۔“ وہ لوگ چھٹیاں گزارنے آئے تھے۔ مریم کو پہلے جانے کی جلدی تھی کیونکہ وہ حبیب کے لیے بہت متفکر تھی۔ انہیں کھانے پینے میں مسئلہ نہ ہو۔



**ہار اور جیت**

کسی کی سب سے بڑی ہار.....  
کسی کی آنکھوں میں آنسو آپ کی وجہ سے

اور

زندگی کی سب سے بڑی جیت  
کسی کی آنکھوں میں آنسو آپ کے لیے

مرسلہ: نفیہ نہال، لاہور

**اجنبی بات**

کسی کو کچھ دینا ہے تو اسے اچھا وقت اور دعا  
دو کیونکہ تم ہر چیز واپس لے سکتے ہو مگر کسی کو دیا ہوا  
اچھا وقت اور دعا نہیں لے سکتے۔

مرسلہ: ابرار حسین، لاہور

مشکل میں پھنس جائے گی۔ یہ حسین آنکھوں اور  
خطرناک ذہن والی اس کی کزن اندر گھس کے دل کی  
تہوں میں چھپے اس راز کو بھی نکال لے گی جسے سوزن  
نے خود سے بھی چھپا رکھا تھا۔ وہ جیسے مون کے ذہن  
اور اندر تک کھوجتی آنکھوں سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اور  
اسی خوف نے سوزن کو بچ بولنے پر اکسایا تھا۔

”ہاں، میں نے عیسیٰ کی برتھ ڈے کا گفٹ لیا  
ہے۔ اپنی پاکٹ منی جمع کر کے۔“ سوزن کی آواز  
کپکپا گئی تھی۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔ مون کی کھوجتی  
نظر اس کے آرا پارا تر رہی تھیں۔

”صرف عیسیٰ کے لیے۔ میرے لیے تو آج  
نیک کچھ نہیں لیا۔ عیسیٰ کے لیے اتنا تردد.....؟ پاکٹ  
منی جمع کی پھر گفٹ خریدا، کوئی خاص بات ہے  
کیا.....؟“ مون نے معنی خیزی کی انتہا کر دی تھی۔

وہ جیسے پھنس کر رہ گئی۔ اب بھلا کیا جواب دیتی۔ جو  
دل کی دھڑکنیں شور کر رہی تھیں، وہ شور مون کو سنائی  
نہیں دے سکتا تھا پھر بھی مون نے اس کے پیروں  
تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔

”عیسیٰ کے لیے ہی کیوں.....؟ میرے لیے

میں مصروف تھی اور جانوروں کی دیکھ بھال کر رہی  
تھی۔ مون پہلے تو باڑے کی طرف آئی پھر مویشیوں  
کی گندگی کو دیکھتی واپس اندر چلی گئی تھی۔ اس کی  
نفاست پسند طبیعت پر گندگی سخت گراں گزرتی تھی۔

وہ میوزک سنتی سوزن کے کمرے میں ٹہل رہی  
تھی۔ جب اس کے منی باکس پر مون کی نگاہ پڑی  
تھی، کچھ تجسس ہو کر مون نے سوزی کا منی باکس

کھول لیا تھا۔ اسے اندر سے کچھ سکے ملے..... وہ  
حیران نہیں ہوئی تھی۔ اس نے منی باکس کو بند کر دیا تھا  
پھر اسے اٹھا کر دراز میں رکھ آئی۔ جب اس نے  
دراز کھولی تب اس کی نگاہ ایک اور باکس پر پڑی۔

مون نے باکس اٹھا کر کھول لیا۔ ایک خوب صورت  
جگمگاتی رست و اچ نکل آئی تھی۔ مردانہ طرز کی یہ  
گھڑی مون کو حیران کر گئی۔ سوزن کے کمرے میں  
نئی نکور چمکتی مردانہ گھڑی کیوں رکھی تھی۔ فطری تجسس  
جیسے عود آیا تھا۔

”یہ کس کے لیے ہے؟“ اس نے گھڑی کو اٹھا  
کر ہاتھ میں لیا تھا۔ ”بھلا یہ کس کے لیے ہو سکتی  
ہے؟“ مون کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی  
تھی۔ جیسے ٹلک کے ساتھ کچھ روشن ہو گیا تھا۔ سوزن

اور عیسیٰ تو کیا سوزی نے یہ گھڑی عیسیٰ کے لیے لے  
رکھی ہے؟ اسے معاملے کی تہ میں جانے کے لیے  
پندرہ سال کی عمر میں بھی بہت سوچ بچار اور گہرائی  
میں اترنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ گویا

لحلوں میں معاملہ سمجھ گئی تھی۔ پھر سوزی جب کمرے  
میں آئی تو مون نے بغیر جھجکے دو ٹوک لہجے میں سوزن  
سے سوال کیا تھا۔

”یہ تم نے عیسیٰ کے لیے خریدی ہے؟“ اس کا  
حملہ اتنا اچانک تھا کہ سوزی ہٹا بکا رہ گئی تھی۔ اس  
سے کچھ بات ہی نہیں بن پائی تھی۔ وہ شاید کوئی  
جھوٹ بول لیتی یا بات کو گھما ڈالتی مگر مون نے اسے

موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اسے لگا، وہ سچ نہیں بولے گی تو

پر دو ٹوکول دینا شروع کیا تھا، اس کا مزاج ساتویں  
آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ خود کو کوئی الگ قسم کی مخلوق سمجھنے  
لگی تھی اور مون کا خیال تھا کہ عیسیٰ اس کی اہمیت سے  
جلتا ہے۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ عیسیٰ تو اس کے

غور سے خوفزدہ رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا، مستقبل قریب  
میں مون بہت خسارہ اٹھانے والی تھی۔ بس یہی  
چھوٹی، چھوٹی وجوہات تھیں جن کی بنا پر دونوں بہن

بھائی ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ وہ  
جب بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتا، مون الٹا ضد  
میں آ کر وہی کام کرتی۔ جھگڑا کرنے کی دونوں کو  
عادت نہیں تھی، نہ شور کرتے نہ ہنگامہ کرتے، بس وہ

اسے سمجھاتا اور مون اسے تاؤ دلانے کے لیے بڑے  
سلیقے کے ساتھ وہی کام کر لیتی۔ اس نے اب بھی  
سکے مارنے اور شوشے چھوڑنے ترک نہیں کیے تھے  
بلکہ اس دن مریم کو من بائیم جانے سے روک کر وہ

ایک مرتبہ پھر گھر والوں کی نگاہوں میں اونچا مقام  
پانگئی تھی۔ سوئے اتفاق نانی کو شام کے قریب انجانا  
کا بلکا سا ایک ہو گیا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ  
ایسویٹس بر وقت نہیں پہنچ سکتی تھی۔ مریم کی گاڑی

موجود تھی۔ سو گروی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور  
بر وقت اسپتال پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے بھی یہی کہا وہ لوگ  
ذرا سی دیر کرتے تو نقصان کا خدشہ تھا۔ ادھر تو جیسے  
کمال ہی ہو گیا۔ تانتے اور ممانے مون کو سینے سے

چمکا کر بھر پور تشکر کا اظہار کیا۔ مون نہ روکتی یا اس کی  
چھٹی حس الارم نہ بجاتی تو مماتیقینا من بائیم پہنچ چکی  
ہوتیں۔ دنانی کا بچنا بھی محال تھا۔ ان کی تکلیف

بڑھ جاتی۔ خیر، اس واقعے کے بعد عیسیٰ نے مون  
سے بحث کرنا چھوڑ دی تھی۔ ان دنوں مون نے  
چونکہ سب کی نظروں میں الگ سا مقام پایا تھا۔ سو  
سوزن بھی اسے بڑی قابل احترام سستی سمجھتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ مون نے ایک دن سوزن کی  
ذاتی تجوری پر حملہ کر دیا تھا۔ اس دن سوزن باڑے

”اوپر سب کچھ لکھا جا چکا ہے..... اس سے کون  
انکاری ہے؟ لیکن تم میری چھٹی حس کو جھٹلا نہیں سکتے۔  
عام لوگوں سے زیادہ میرے اندر یہ قوت پائی جاتی  
ہے۔ اور پاپا کی فلائٹ مس ہونا ہی نہیں، اللہ نے

انہیں حادثے سے بچانا تھا مگر وسیلہ تو میں بنی.....  
میں نے پاپا کو روکا تھا۔“ مون نے زہر خند انداز  
میں جیسے اسے جتلا یا تھا۔

”ہونہہ..... تم نے روکا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے آج  
تم گوسے کو چھوڑ کر علم نجوم اور اس کی فلاسفی، برج اور  
شخصیت، برجوں کا طلسم کدہ، پریکٹیکل پاستری اور  
خواہوں کی تعبیر وغیرہ جیسی چیزوں پر ریسرچ کر رہی

ہو؟“ عیسیٰ استہزائیہ بولا تھا۔ حقیقتاً اسے مون پر  
شک تھا کیا خبر وہ لائبریری سے لے کر اس قسم کی  
کتابیں پڑھتی ہو۔ ویسے تو اسے گوسے کو پڑھنے کا  
جنون تھا۔ اس نے گوسے کا رزیہ دراما ”گوزوان

۔ بریشن جن“ اور اس کی خودنوشت پر مشتمل ناول  
”دی ساروز آف یگہ“ پڑھ رکھا تھا۔ گوسے چھ  
زبانیں جانتا تھا اور اس نے ایچ کرافٹ، طبیعیات،  
فلکیات، فلاسفی اور سائنسز سے متعلق کئی کتابوں کا

جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ کل تک مون  
گوسے، موسارت، ویوالدی، ویلن ٹائٹا ولاڈی اور  
رونالڈ کی طرح کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دینا چاہتی  
تھی مگر اب نہ جانے فلکیات، علم نجوم اور علم لاعداد

سیکھنے کے جنون میں مبتلا ہو گئی تھی۔ حالانکہ عیسیٰ کے  
یہ اندازے بالکل غلط تھے۔ مون نے تو کبھی اس قسم  
کی کوئی کتاب دیکھی تک نہیں تھی۔ حقیقتاً اس کے اندر

ایسی قوت ضرور تھی اور کچھ حس الارم عام انسانوں  
سے بڑھ کے تھے۔ جو خطرے سے پہلے ٹن، ٹن گھنٹی  
بجا دیتے تھے۔ یہ ایک خدا داد صلاحیت تھی۔ اس  
میں کسی کی ذاتی کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ بس

عیسیٰ کو اس کی اتراہٹوں اور نخوت پر غصہ آتا تھا۔  
جب سے تانتے، پاپا، ماما، گروی نے اسے الگ قسم کا



ترک و وفا

مقتا طوسی طاقت رکھنے والی عجیب گہری آنکھیں  
 پروفیسر بشر کو جیسے اپنا گوہر مقصود اچانک مل گیا تھا۔  
 ذہن کی پراسرار قوتوں کو کھوج نکالنے والے ایک  
 ماہر کے سامنے اس کا گوہر مقصود بیٹھا تھا۔

اس نے جیسے بیٹھے بیٹھے سائے بیٹھی لڑکی  
 کے ذہن کی اعلیٰ اور ادنیٰ سطح کو جاننے کا فیصلہ کر لیا  
 تھا۔ اس نے اپنے دماغ سے ہر سوچ کو جھٹک کر  
 مون کو ذہنی پیغام دے کر اسے پرکھنے کا فیصلہ کر لیا  
 تھا۔ اس دوران پروفیسر بشر نے اس بات میں  
 احتیاط کی کہ عیسیٰ اور حبیب احمد میز سے اٹھ جائیں۔  
 اس کی توقع کے عین مطابق حبیب احمد کی کال آگئی  
 اور علی عیسیٰ کو اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرنا تھی۔ وہ  
 دونوں اٹھ کر چلے گئے تھے۔ اب ڈاننگ ہال میں  
 تین نفوس بیٹھے تھے اور تینوں ہی ایک دوسرے سے  
 بے نیاز تھے۔ سوزن، مون اور پروفیسر..... تینوں سر  
 جھکائے کھانا کھا رہے تھے۔

پروفیسر کے لیے یہ موقع بڑا اہمیت کا حامل تھا۔  
 اس نے سنہری مواقع کبھی گنوائے نہیں تھے سو اب  
 بھی اپنی نگاہوں کو مون کے کراؤن پر جما کر وہ  
 یکسوئی کو سمجھ رہا تھا۔ ذہن کی یکسوئی اس کے عمل کی  
 کامیابی کا اہم مہرہ تھی۔ اور اک ماورائے حواس کی  
 تمام تر بنیاد یکسوئی اور توجہ پر قائم تھی کیونکہ ہر وہ کام  
 جن کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے اور ذہن کے تخلیقی  
 حصوں سے جڑا ہوتا ہے اس وقت تک انجام نہیں  
 پاسکتے جب تک پوری طرح ان کے مقاصد کے لیے  
 ذہنی یکسوئی اور توجہ پیدا نہ کر لی جائے۔ محویت،  
 استغراق اور ذہنی یکسوئی کے بعد شعور کی باقی  
 سرگرمیوں کو بلاک کرنا ہوتا ہے۔ وہ ماہر انتقال افکار  
 تھا۔ اور یہ کام اس کے لیے اتنا معمولی تھا جیسے کون  
 آئس کریم کھاتے ہوئے اس کا کچھ حصہ پگھل جانا یا  
 چاکلیٹ کا رپیر اتارنا..... محض لمحے بھر کی دیر میں۔

انسانی ذہن جو ایک اخباری دفتر کی طرح ہوتا

کی تھی۔ اسے ڈیڑھ سال تک چھپائے رکھا۔ پھر اس  
 کے پیپر بنوائے اور اب وہ کھل کر جرمنی میں گھوم پھر  
 سکتا تھا۔ چاہتا تو کاروبار کر لیتا یا پھر جاب وغیرہ  
 کر لیتا۔ پاپا اس کی ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ کر چکے  
 تھے۔ وہ ہر پاکستانی کی یوں ہی مدد کیا کرتے تھے۔  
 اس میں کوئی انوکھا پن نہیں تھا۔

کھانے کی میز پر پاپا نے پروفیسر بشر سے ان  
 سب کا تعارف کروایا تھا۔

”یہ میری جند جان، میرا بیٹا..... میرا عشق،  
 میری جان، میرا علی عیسیٰ..... اور یہ میری انتہائی  
 خطرناک بیٹی..... اس سے ذرا بچ کر رہنا..... بہت  
 خوفناک انکشاف کرتی ہے اور یہ میری بیوی کی  
 بھانجی سوزن.....“ پاپا نے مسکراتے ہوئے تعارف  
 کی رسم نبھائی تھی۔ بڑا مختصر مگر بڑا ہی جامع تعارف تھا۔  
 پروفیسر ایک، ایک چہرے کو غور سے تکتا لمحے بھر  
 کے لیے مجھ رہ گیا تھا۔ حبیب احمد کیا کہہ رہے تھے؟  
 اس نے دوبارہ غور کیا۔

”اور یہ میری انتہائی خطرناک بیٹی، اس سے  
 ذرا بچ کر رہنا..... بہت خوفناک انکشاف کرتی  
 ہے۔“ پروفیسر بشر بڑے غور اور گہرائی میں جا کر اس  
 کم عمر، خطرناک دو شیزہ کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ پھر جیسے  
 وہ ٹھنک گیا۔ اگرچہ حبیب احمد نے مذاق بات کی تھی  
 مگر پروفیسر بشر جیسے ٹھنک کر مجھ ہو گیا تھا۔ وہ  
 خطرناک چہرے والی خطرناک لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔  
 اس کے ٹھنکنے کی وجہ مون کا نونیز حسن ہرگز نہیں تھا۔  
 حسن کی پروفیسر بشر کے نزدیک کوئی اوقات تھی اور نہ  
 کوئی اہمیت تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار  
 حسین چہرے دیکھے تھے۔ اسے حسن کبھی متاثر  
 نہیں کرتا تھا۔ اور جو چیز اسے متاثر کرتی تھی وہ  
 پروفیسر بشر کو اس لڑکی کی آنکھوں میں بخوبی نظر آ رہی  
 تھی۔ مقابل کو تخیل کر لینے والی چمک، انوکھا سا.....  
 بیخبر چہرہ..... ذہانت چھلکاتی عجیب تر آنکھیں.....

ایسی لڑکی تھی جسے ایک گھر کی خواہش تھی۔ اسے محبت  
 بھر پر سکون ماحول چاہیے تھا۔ اور مون کا گھر اتنا اس  
 لحاظ سے بہت آئیڈیل تھا۔ ان کے ماں، باپ کی  
 محبت، سکون، ایک دوسرے کا احترام، اس کے علاوہ  
 بچوں سے خصوصی لگاؤ قابل ستائش تھا۔ وہ مون کے  
 گھر کا ہمیشہ کے لیے حصہ بن جانا چاہتی تھی اور مون  
 نے اس کی خواہش کو اور بھڑکایا تھا۔ وہ اس کا ساتھ  
 دینے پر جیسے تیار ہو گئی تھی۔ مگر اس دوران ایک اور  
 عجیب واقعہ رونما ہوا تھا۔ اتنا حیران کن، عجیب اور  
 انوکھا کہ مون کی پوری ہستی بل کر رہ گئی تھی۔ جیسے وہ  
 تھرا اٹھی تھی۔ سوزن کو محبت کی راہوں پر اندھا دھند  
 بھاگنے کا مشورہ اور ساتھ دینے کا وعدہ کر کے وہ محبت  
 جیسی ٹرپش آنچ سے خود بھی محفوظ نہیں رہ سکی تھی۔

محبت جو دیکھنے میں پرکشش تھی  
 جس کی لذت میں مٹھاس تھی  
 جو شبنم، صندل، اور چاندنی میں گوندھ کر  
 سامنے آتی

سنہری پتوں میں لپٹ کر بچتی  
 مندروں کی گھنٹیاں بجانی اور مسجدوں میں  
 گھنٹے بجاتی

غنجوں میں کھلتی پھر صحراؤں میں بھٹکتی  
 بن سنور کے آتی اور ویران اجاڑ کر دیتی  
 محبت جو ہر روپ میں مون حبیب پر اچانک  
 چھٹی تھی یوں کہ وہ حواس باختہ رہ گئی۔ بھلا یہ محبت  
 اسے ہوئی کب تھی؟ اور کس سے؟  
 من ہانیم پر یہ صبح اپنے معمول سے وارد ہوئی۔

بڑا مصروف سا دن تھا اور بڑی مصروف سی شام  
 گزری تھی۔ کھانے سے کچھ دیر پہلے پاپا کے ساتھ  
 کوئی نوجوان آیا تھا۔ خوش شکل، سنجیدہ اور بڑا ہی  
 پراسرار..... یہ پروفیسر بشر تھا۔ غیر قانونی طریقے سے  
 جرمنی آنے والا۔ خیر، اب تک تو سیٹلڈ ہو چکا تھا۔ یہ  
 انہیں بعد میں پتا چلا۔ پاپا نے پروفیسر بشر کی بہت مدد

کیوں نہیں؟ وہ تن فن کر رہی تھی۔ نخوت سے بول رہی  
 تھی۔ سوزن کا سر اور بھی جھک گیا تھا اور مون اسے بھگو  
 بھگو کر مار رہی تھی۔ بالآخر وہ نم آواز میں بول ہی پڑی۔  
 ”عیسیٰ مجھے اچھا لگتا ہے..... بہت اچھا لگتا  
 ہے۔“ سوزن نے گویا اعتراف جرم کر لیا تھا۔ ”وہ  
 میرے دل کو بہت اچھا لگتا ہے..... اتنا کہ حد  
 نہیں..... میں چاہتی ہوں، وہ میری آنکھوں کے  
 سامنے رہے۔“ وہ ہونٹ کپکپ رہی تھی جیسے بہت  
 غمگین تھی۔ بہت اداس تھی اور اپنے دل کی.....

اختیاری پر خود سے بھی نالاں تھی۔ پندرہ سال کی عمر  
 میں محبت کرنا اور پھر اس محبت کا اظہار کر دینا، اس  
 ملک میں کچھ انوکھا یا عجیب نہیں تھا۔ سوزن کی ہم عمر  
 لڑکیوں کے بے شمار بوائے فرینڈ تھے۔ ان میں سے  
 ایک آدھ تو شادی بھی کر چکی تھیں۔ اب اگر سوزی کو  
 محبت ہوئی تو یہ کون سا انوکھا معاملہ ہوا تھا۔ مسئلہ تو یہ  
 تھا جو اسے عیسیٰ سے محبت ہوئی تھی۔ سوزن کے  
 اعتراف محبت نے خلاف توقع مون کو غصہ نہیں دلایا  
 تھا بلکہ وہ بہت خوش ہو رہی تھی۔ سوزی جیسی دیو،  
 مسکین اور اس کی شخصیت کے سامنے ماند پڑتی بھابی  
 تو اسے کہیں مل ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی  
 مون کے کنٹرول میں رہتی۔ اس کے حصار میں، اس  
 کی خوبوں کو سراہتی ہوئی۔ مون کے سامنے جھکی  
 ہوئی۔ وہ بھی مون کا اور اپنا موازنہ یا مقابلہ نہ کرتی۔  
 مون کو ایسی ہی بھابی کی تو ضرورت تھی۔ اس پہلو پر  
 غور کیا تھا اس نے، کچھ دن پہلے بھی..... اور اب جیسے  
 اس کی سوچوں کو کنارہ مل گیا تھا۔

عیسیٰ کی شخصیت کے سامنے ماند پڑتی سوزن  
 ان دونوں بہن، بھائی کے سامنے عمر بھر سر اٹھا نہیں  
 پائے گی۔ تو پھر یہ سودا کوئی خسارے کا نہیں تھا۔  
 ویسے بھی سوزن اپنے ماں، باپ کے جھگڑوں، طلاق  
 اور غربت کے باعث بہت سنجیدہ، افسردہ اور چپ  
 چپ رہنے لگی تھی۔ وہ اندر سے ٹوٹی جا رہی تھی۔ وہ



**ترک و فنا**

تھا۔ بقول پروفیسر اس کا باپ پنجاب کے ایک زمیندار کا بیٹا تھا۔ وہ آگرہ گھومنے کے لیے گیا اور وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ پروفیسر کی ہسٹری سے مون کو برگز دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم پروفیسر کی اپنی شخصیت نہایت دلچسپ تھی۔

اگلے چند دن تک پروفیسر ان کے گھر آتا رہا تھا۔ وہ عموماً اس وقت آیا کرتا تھا جب مون اسکول سے آچکی ہوتی۔ پھر وہ ایک لمبی نشست کے بعد گھر کو لوٹتا تھا۔ اس نے ”بیدی نوگ“ کے نام سے ذاتی اکیڈمی بنائی تھی۔ جس میں نہ جانے وہ کس قسم کی باقاعدہ تعلیم دے رہا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد مون بیدی نوگ کی باقاعدہ ممبر بن گئی تھی۔ اور بشرنے پارٹنرشپ پر یہ کام آگے بڑھا دیا۔۔۔۔۔ بیدی نوگ ایک لیکچرنگ اسٹی ٹیوٹ تھا جس میں بے شمار زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کچھ عرصہ یونہی گزر گیا اور مون کو بیدی نوگ کی اصل حقیقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس پراسکون رواں ندی میں پہلا کنکر آخر کب پڑا تھا؟

جب ایک رات پاکستان سے مون کے تایا پہلی مرتبہ ان سے ملنے چلے آئے تھے۔ تایا ذوالفقار جو مون کے پاپا جانی کے سگے بھائی تھے اور جنہیں مون نے پہلی مرتبہ اپنے رو برو دیکھا تھا۔ تایا اس کے لیے ایک عام سی شخصیت تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر اتنی ہی کٹھور اور روکی رہی تھی جتنا اسے ہونا چاہیے تھا تاہم عیسیٰ بے انتہا خوش تھا۔ تانتے اور گروسی کے بعد پہلا فریبی اور عزیز ترین پاپا کی طرف سے رشتہ میسر آیا تھا۔ وہ تو جیسے تایا سے مل کر یا گل ہو رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اسکول چھوڑ کر تایا کے گھنٹے سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ تایا کی محبت میں ایسی دیوانگی کہیں دیکھی سنی نہیں لگتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو ڈانگنگ ٹیبل پر بیٹھ کر تایا کو نوالے بنا، بنا کر کھانا بھی خود کھلاتا۔ ان دنوں تایا کی پسند سے مینو ترتیب دینے میں اسے کتنا کھینا پڑتا تھا۔ وہ ماں سے الجھ پڑتا۔

اس کے سچے گئے پیغام کو ایک سو اسی میل فی گھنٹا کی رفتار سے بھی پہلے مون کا وصول کرنا اسے بری طرح چونکا گیا تھا۔ گویا وہ ایک قوی دماغ رکھنے والی لڑکی تھی۔ مگر ماہیت افکار میں ماہر نہیں تھی۔ سو اس نے جواب بول کر دیا تھا۔ اگر اس کے ذہن کو بالمش کر دیا جاتا تو وہ ایک دنیا کو اپنے ذہن سے تسخیر کر سکتی تھی۔

”انسانی دماغ اپنے اندر بے شمار حیرت انگیز صلاحیتیں رکھتا ہے اور ان صلاحیتوں میں چھپی ہوئی برسر ارتوتیں کبھی کبھار اپنا اظہار کر کے ہمیں دنگ کر دیتی ہیں۔ میں نے اپنے سامنے ایک کندن دماغ کو دیکھا ہے، میں ابھی تک درطہ حیرت میں مبتلا ہوں۔“ پروفیسر بشر کی آواز اسے سوچوں کے اخروہام سے بچھ لاتی تھی۔ جس بھر پور انداز میں وہ مون کو سراہ رہا تھا۔ جس طرح سے تعریف کر رہا تھا۔ مون کے لیے یہ سب بہت منفرد اور انوکھا تھا۔ تعریف بھلا کے بری لگتی ہے! اور مون کو تو ویسے بھی تعریفوں کا فویا ہو گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی پرستاروں کی طویل قطار اس کے دائیں بائیں ہو اور وہ ان کے درمیان کسی ملکہ کی طرح گردن تان کر چلتی رہے۔ کہتے ہیں تعریف اور شہرت کا نشہ، دونوں ہی زہر گھا امرت ہے۔ جس کو چڑھ جائے تباہ کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ مون کو بھی تعریفوں کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ پہلے گھر والے کیا کم تھے جو اب ایک اجنبی شخص کی تعریف نے اسے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ پروفیسر ایک ماہر فلکیات بھی تھا۔ وہ خود کو پاکستان کا پیشہ کھلاتا تھا تاہم پانچ سال پہلے وہ جرمنی غیر قانونی طریقے سے داخل ہوا تھا۔ جب اس نے اپنا ملک چھوڑا تب وہ ایک مقامی یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اس کے پچھلے پاسپورٹ اور آئی ڈی کارڈ کی کاپی سے پتا چلتا تھا وہ انڈین شہریت رکھتا ہے تاہم وہ خود کو پاکستانی کہلواتا تھا۔ اسے اپنے باپ کی وجہ سے خود کو پاکستانی کہلوانا پسند نہیں

پروفیسر نے اپنی مشقوں، تجربات اور سیکھنے کے مراحل میں بے شمار سائنسدانوں کے قول حفظ کیے تھے جیسا کہ الائنٹ من کہتا ہے۔ روشنی، بجلی، حرارت اور مقناطیسیت یہ سب مادے کی مختلف اور بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ اور ان کو توانائی کی لہروں کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح انسانی خیال بھی لہروں کی شکل میں سفر کرتا ہے۔ گوہم خیال کی لہروں کو نہ دیکھ سکتے ہیں چھو اور نہ سونگھ سکتے ہیں تاہم محسوس ضرور کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے احساس کا قوی ہونا بے حد اہم ہے۔ ہر شخص میں احساس کو محسوس کرنے کی قدرت اور صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ اب سامنے پیشگی خطرناک ذہن رکھنے والی لڑکی میں احساس کو محسوس کرنے کی کتنی صلاحیت موجود تھی؟ اس بات کو جاننے کے لیے پروفیسر نے ایک پیغام نشر کیا تھا۔ ہلکا سا۔۔۔۔۔ بے ضرر پیغام۔۔۔۔۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ بچے پر نگاہ جمائے بیٹھی لڑکی کا ذہن کتنا قوی اور مضبوط تھا؟ کیا وہ پروفیسر کے پیغام وصول کر سکتی تھی؟

پروفیسر جو مون کے چہرے پر نگاہ جما کر بیٹھا تھا، لمحے بھر میں اس کے تاثرات بدلتے دیکھ کر ٹھنک پھر جیسے مون نے چیخ ہاتھ سے رکھ کر کچھ چوکھتے ہوئے پروفیسر بشر کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ یہ خیر مقدمی مسکراہٹ تھی۔

”میں ٹھیک ہوں اور پڑھتی ہوں۔“ اس نے جس انداز میں انتہائی پرسکون، خاموش ماحول میں گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ اس چیز نے پروفیسر کو نہیں البتہ سوزن کو ہکا بکا کر دیا تھا۔ وہ ایسی نظروں سے مون کو دیکھ رہی تھی جیسے اس کا دماغ چل گیا تھا۔ اس سے بھلا یہ سوال پوچھا ہی کس نے تھا؟ جس کا جواب مسکرا کر دے رہی تھی۔ ابھی سوزن انہی سوچوں میں غم تھی جب پروفیسر نے انتہائی پرجوش آواز میں ”اعلیٰ چیٹ“ بولا تھا۔ اس کے چہرے پر ستائش ابھر رہی تھی۔ جیسے وہ حیرانی کے سمندر سے نکل کر آ رہا ہو۔

ہے جس کے ٹیلی پرنٹر پر ہر وقت طرح، طرح کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ جسم کا ہر عصب دماغ سے ہمہ وقت کانٹیکٹ میں رہتا ہے۔ آنکھیں، کان، ناک، ہر عضو اپنا، اپنا تاثر دماغ تک پہنچاتے ہیں پھر شعور تمام پیغامات وصول کرنے کے بعد اپنے طور پر ان کا تجزیہ کرتا ہے اور تراش خراش کرنے کے بعد اہم فیصلے کرواتا ہے۔

پروفیسر جانتا تھا۔۔۔۔۔ انسانی شعور کی سرگرمیاں بے حد وسیع اور متنوع ہیں۔ جیسے کسی بڑے کمیشن ایجنٹ یا اسٹاک بیورو کا صدر دفتر ہو۔ اس میں دنیا جہان سے منڈی کے اتار چڑھاؤ کی رپورٹیں وقتاً فوقتاً آئے جاتی ہیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ چار طرف سے ٹیلی پرنٹر آتے ہیں۔ ہر لمحہ نئی رپورٹ نئی خبر آتی ہے۔ ایسے میں اسٹاک بیورو کا پورا اسٹاف اپنا، اپنا کام چھوڑ کر کسی اور کام میں محو ہو تو سارا نظام بگڑ جائے گا۔

سو اس کے لیے احتیاط بہت ضروری تھی۔ وہ دس سالوں کی ریاضت کے بعد چاکلیٹ سے رپر اتارنے والی پوزیشن تک آیا تھا۔ اب یہ کام اس کے لیے بالکل معمولی تھا۔ اتنا عام اور ہلکا سا۔۔۔۔۔ جیسے وہ پھونک سے کوئی کاغذ اڑانے والے انداز میں ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پیغام پہنچا رہا تھا۔

انتقال افکار کی زد میں وہی خیالات آتے ہیں جن کی کوئی تصویر یا مجسمہ نہیں بن سکتا۔ یہ خیال کائنات سے اخذ کیا جاسکتا ہے اور جس کو چاہے بھیجا جاسکتا ہے۔ ہر خیال اپنی بناوٹ کے لحاظ سے روشنی اور آواز کے مانند ہے۔ جس طرح روشنی اور آواز کی لہروں کو ٹیلی فون اور ٹی وی کے ذریعے بھیجا اور وصول کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح خیالات کی لہروں کو بھی نشر، اخذ اور دوسرے دماغ تک پہنچایا جاسکتا ہے۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



رشتوں سے دور تھے۔ عیسیٰ کے دل میں اپنے پیارے رشتوں سے محبت کی ہڑک اچانک بیدار ہو گئی تھی۔ اور مون کو خواہ مخواہ غصہ آنے لگتا تھا۔ اسے عیسیٰ کی جذباتیت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی جبکہ تایا کا عیسیٰ پر فدا ہونا تو دیکھا ہی نہیں جاتا تھا۔ تایا کو بھی عیسیٰ کے علاوہ کچھ اور نہ سوجھتا..... وہ تین دن رات کے رہے تھے اور ان تین دنوں میں تایا اور عیسیٰ ایک جان دو قالب ہو گئے۔

پھر یوں ہوا کہ تایا کی موجودگی کے دوران ہی ایک مرتبہ پروفیسر بشران کے گھر چلا آیا تھا۔ تایا کو وہ پراسرار آدمی ذرا نہ بھایا۔ انہوں نے پروفیسر کے اٹھتے ہی اپنی ناگواری ظاہر کر دی تھی۔

”یہ کون آدمی تھا حسیب..... مجھے تو ذرا اچھا نہیں لگا۔ اسے باہر تک ہی محدود رکھو.....“ تایا کی تجربہ کار نظروں نے نہ جانے کیا محسوس کر لیا تھا۔ جو وہ بگڑ کر کہہ رہے تھے۔ مون نے دیکھا تھا، عیسیٰ کے چہرے پر بھی ناگواری تھی۔

”تایا جان! مجھے بھی یہ آدمی اچھا نہیں لگتا۔“ وہ بھی کہہ بنا نہیں رہ سکا تھا۔ تب حسیب احمد فوراً بولے تھے۔

”میں نے اس کی بہت مدد کی ہے بھائی صاحب! اب بھی کچھ نہ کچھ پوچھنے آ جاتا ہے، عجیب سوڑا ہو گیا ہے۔ جان نہیں چھوڑتا۔“ گویا پایا بھی پروفیسر بشر سے بیزار تھے اور اس سے کسی نہ کسی طریقے سے جان چھڑوانا چاہتے تھے۔ مون کو اس لمحے پایا کچھ اچھے نہیں لگے تھے۔ جو بندہ اس کی پسندیدگی کے مرتبے پر فائز ہو جاتا اسے عموماً عیسیٰ اور پایا ہجیکٹ کر دیتے تھے۔ نہ جانے یہ مون کے ساتھ کیسا المیہ تھا۔

”اسے پہلی فرصت میں گھر آنے سے منع کرو۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگا۔“ تایا اپنی ناپسندیدگی کی وضاحت نہیں کر پارے تھے۔ سچ تو یہ تھا اس آدمی کا

”مما! تایا بھیکے کھانوں کے عادی نہیں ہیں۔ یہ بد مزہ ڈشز وہ کسے نگلیں گے؟ وہ تو دیسی کھانوں کے عادی ہوں گے، کہیں...۔۔۔ پیارے پیارے نہ پڑ جائیں۔“ عیسیٰ کی جیسے جان پر بن آتی تھی۔ مریم خود پریشان ہو جاتی۔ سمجھ نہیں آتی تھی جیٹھ صاحب کی اعلیٰ ترین تواضع کیسے کرے؟ ایک طرف پیٹا بوکھلائے دیتا تھا۔ کچھ ان دنوں مریم کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ سینے میں ٹیس اٹھتی تو گھنٹوں وہ درد سے بے حال رہتی۔ تنگ آ کر ٹیسٹ کر دلائی تھی۔ ابھی رپورٹس نہیں ملی تھیں اب جیٹھ صاحب پہلی مرتبہ آئے تھے۔ وہ کیسے بیمار بن کر بستر سنبھال لیتی۔ وہ بھلا کیا سوچتے..... اور ادھر عیسیٰ کو کچھ بھی تایا کے شایان شان نہیں لگتا تھا۔ حالانکہ وہ بہت سادہ مزاج انسان تھے مگر عیسیٰ تو.....

”پھر کیا کرنا ہے؟“ مریم الجھ کر پوچھتی۔ ”ہوٹل سے کھانا منگوا لیتے ہیں۔“ اس کے ذہن میں پاکستانی ریسٹورنٹ گھومنے لگتے۔ عیسیٰ فوراً انکار کر دیتا۔

”نہیں ممما! تایا کیا سوچیں گے، وہ ایک آدھ دن کے لیے آئے اور ہم انہیں گھر کا کھانا بھی نہیں کھلا سکے۔“ وہ مریم کو اور بھی بوکھلا دیتا، مریم پریشان ہو جاتی۔ اب کوئی اور آپشن بچتا نہیں تھا۔ پھر عیسیٰ نے ہی اس کا محسوس حل نکالا۔ کوکنگ کی بکس اٹھالایا۔ ایشین فوڈز ریسپیو..... جس کی مدد سے ان ماں، بیٹے نے پرنکلف ڈنر تیار کیا تھا۔ جسے میز پر سجا دیکھ کر تایا حیران ہی تو رہ گئے تھے۔ پھر ان کے دل میں مریم کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ان کا افسوس کچھ اور بھی بڑھ گیا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا حسیب! مریم اور بچوں کو ہم سے دور رکھا،“ تایا شکوہ کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ عیسیٰ کا دل بھی رنج سے بھر گیا تھا۔ وہ اپنے پیارے تایا سے پہلے کیوں نہیں مل سکا۔ وہ لوگ کتنے عظیم



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ریو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تو کہ وفا

احساس ہوا تھا۔ وہ جیسے تھرا اٹھی تھی۔ جبکہ تائیا نے بہ مشکل سیز فائر کروایا تھا مگر انہیں مون کی بدزبانی اور پروفیسر کے لیے فضول کی تکرار بہت بری لگی تھی۔ اگرچہ انہوں نے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا پھر بھی عیسیٰ جانتا تھا انہیں مون کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کٹ سا گیا تھا۔ مگر مون کو کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ یہ بھی نہیں کہ اس کا یہ غیر مہذبانہ عمل اس کی آئندہ زندگی کے لیے بہت بڑا پہاڑ ثابت ہونے والا تھا مگر وہ کچھ سوچ لیتی تو تبت ناں.....

پھر رات کو موقع پا کر عیسیٰ نے مون کی پھر سے کلاس لی تھی۔

”یہ تم تائیا کے سامنے اتنی بک، بک کیوں کر رہی تھیں؟“ اس کی آنکھوں میں غصہ بھر گیا تھا۔ حالانکہ وہ خود کو بہت سمجھا بھجا کرتا تھا۔ وہ مون سے تلخ کلامی نہیں کرے گا مگر پھر بھی.....

”کون تائیا؟ میں کسی تائیا کو نہیں جانتی..... نہ جانے کہاں سے رشتے دار اٹھ کر آجاتے ہیں۔“ وہ بھی تمام ہتھیاروں سے لیس بیٹھی تھی اور کوئی بھی وار خالی نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ وہ دونوں اس وقت سنگ روم میں موجود تھے اور وہ نہ ہی اس بات سے بے خبر تھے کہ سنگ روم سے ملحقہ لاؤنج میں تائیا بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں جو ان کے جھگڑے کی آواز پر چونک گئے تھے۔

”بکواس نہیں کرو..... تمہیں جانے کیا ہو گیا ہے؟ تم تائیا کے لیے کیسے الفاظ استعمال کر رہی ہو.....؟ اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ تو تائیا آئے ہیں۔“ عیسیٰ کو شدید صدمہ پہنچا تھا۔ وہ جیسے کچھ بول ہی نہیں پایا گنگ سارہ گیا تھا۔

”میرے سامنے اس بڑھے کا ذکر مت کرو۔ جانے کون سا مفاد لے کر آیا ہے۔ بھوکے، ننگے پاکستانی..... سالوں بعد بھائی کی یاد آگئی۔ اپنے کسی بیٹے کا ویزا لگوانا ہوگا۔“ مون زہر خند ہو کر چلا اٹھی

83 ماہنامہ پاکیزہ نومبر 2014ء

مون کو تازتا نہیں حد سے زیادہ برا لگا تھا۔ پھر تائیا نے محسوس کیا تھا وہ صرف مون سے ہی بات کرنا چاہتا تھا اور اسی کے ارد گرد طواف کرتی نظروں کا حصار کھینچے ہوئے تھے۔ تائیا کی پروفیسر کے بارے میں رائے اگرچہ بالکل درست تھی مگر مون کو تائیا اس لمحے حد سے زیادہ برے لگے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی برہمی چھپا نہیں پائی تھی۔

پروفیسر بہت ناس ہے۔ آپ کو شاید پروفیسر کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ مون کی حمایت نے عیسیٰ کے چہرے کا رنگ متغیر کر دیا تھا۔ اسے مون پر بے انتہا غصہ آیا۔ اسے کیا ضرورت تھی بڑوں کے درمیان بیٹھ کر ان کی درست بات کو غلط کہنے کی..... ان کے ناپسندیدہ بندے کو پسندیدگی کی سند دینا..... اسے بڑوں کا کچھ تو لحاظ ہونا چاہیے تھا مگر وہ تو بڑی بے دید بیٹھی تھی۔ عیسیٰ کو بے انتہا غیظ چڑھا تھا اور مون اپنی اہمیت کا گراف کم از کم عیسیٰ کی نظر سے گرا رہی تھی۔

”تم نہیں جانتی بیٹھے!“ تائیا نے بڑے شہد آگس لہجے میں جیسے مون کو ٹوکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں چپ رہنے کی سیرزٹس کی تھی مگر وہ مون ہی کیا جو سمجھ کر خاموش ہو جاتی۔

”وہ ہمارا گیسٹ تھا تائیا! آپ اس کے بارے میں ایسے الفاظ مت بولیں۔“ مون کی بکواس نے عیسیٰ کو تاؤ دلا دیا تھا۔ اس کے تور بگڑ گئے تھے۔

”جسٹ سنٹ اپ!“ وہ بچھی آواز میں چیخا تھا۔ ”انھہ کر جاؤ تم۔“ عیسیٰ بہ مشکل ضبط کر رہا تھا ورنہ شاید اس کا ہاتھ ہی اٹھ جاتا پھر بات زیادہ بھی بگڑ سکتی تھی۔

”تم..... مون کو بھی غیظ چڑھ گیا۔“ یہ تم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟“ وہ جیسے دہاڑی تھی۔ ”بکواس بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔“ عیسیٰ نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔ پھر بھی اسے شدید توہین کا





# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چینلنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](http://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](http://twitter.com/paksociety1)



وہ اپنا بدلہ چکا رہی تھی۔  
”تایا کے بیٹے ماشاء اللہ سے اسٹیلنڈ ہیں۔  
ذیشان امریکا سے پڑھ کر آیا ہے۔ ذی شاہ اور شامی  
بھی بیرون ملک آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان کے  
لیے جرمنی میں کوئی چارم نہیں۔“ عیسیٰ نے جیسے جگلا  
کر اس کا منہ بند کروانا چاہا تھا مگر اس کا منہ بند نہیں  
ہوسکتا تھا۔

”ہونہہ..... تم نہیں سمجھ سکتے.....“ مون زچ  
ہو کر چٹی۔  
”تم تو خوب سمجھتی ہوتی..... بنا کچھ جانے  
بکواس کرنے کا انجام..... اچھا نہیں ہوتا۔“ وہ تھک  
ہار کر بولا۔  
”مجھے پروا نہیں۔“ مون نخوت سے سر جھک  
کر رہ گئی۔

”اس بات پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔“ اس  
نے گہرے درد بھرے لہجے میں کہا۔  
”اور یہ کام تم اچھی طرح سے کر سکتے ہو۔“  
اب وہ مسکرا رہی تھی۔ جیسے اپنی بھڑاس نکال کر فریض  
ہو چکی تھی۔  
”میں تمہیں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔“ عیسیٰ

بس سا ہو کر اٹھ گیا تھا۔ اس کا دل خوب بھر بھر آ رہا  
تھا۔ مون کی بکواس نے اسے اپ سیٹ کر دیا تھا۔  
جب وہ لاؤنج سے گزرتا تھا اپنے روم کی طرف  
جا رہے تھے۔ گیٹ روم جو ان کے لیے تیار کیا گیا  
تھا۔ عیسیٰ کچھ پل کے لیے سن سا ہو گیا۔ کیا تایا نے  
ان کی نگرانی کی تھی؟ وہ لاؤنج سے اٹھ کر جو جا رہے  
تھے۔ عیسیٰ کے بدن سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ  
اپنی ہی نظر سے جیسے گر گیا تھا۔

مون کی اہلیہ نے کہا کیا اثر ہونے  
والا تھا؟ کیا یہ مالا کی زندگی کسی  
تباہی کا آغاز تھا؟ یہ سب ضرور  
جانیے لیکن اگلے ماہ.....

تھی اور عیسیٰ کے کانوں میں سے دھواں نکلنے لگا تھا۔  
وہ ہکا بکارہ گیا تھا۔ یہ مون ہی بول رہی تھی کیا.....؟  
”زبان اتنی لمبی ہو گئی ہے تمہاری؟ یہ تمہارا  
کر رہی ہو؟ تایا کے لیے ایسے گندے الفاظ.....؟“  
عیسیٰ نے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا جو پہلے  
کی طرح مطمئن اور بیشاش بیٹھی تھی۔

”ہاں، کچھ غلط نہیں کہا میں نے..... وہ اپنے  
کسی مفاد کے لیے آئے ہیں۔ آخر پہلے کیوں نہیں  
آئے؟ اب وہ زہر پھونک کر مطمئن سی بول رہی  
تھی۔ عیسیٰ پھر سے سن ہو گیا۔  
”ان کا کوئی مفاد نہیں..... ہماری محبت میں  
چلے آئے ہیں، تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تایا کے لیے  
اتنے غلیظ الفاظ بولو۔“ اس نے اپنے اندر شکر کی لہر  
دباتے ہوئے بہ مشکل کہا تھا۔

”ہونہہ تایا! دیکھ لینا..... اپنے کسی بیٹے کا  
مستقبل سنوارنے آئے ہوں گے۔“ وہ ابھی تک  
اپنی بات پڑٹی ہوئی تھی۔  
”وہ کوئی بھوکے تنگے نہیں..... اپنی ذاتی فرم  
چلا رہے ہیں۔“ عیسیٰ کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ اس  
کی گردن ہی مروڑ ڈالتا۔

”یعنی ہمارے پاپا کا حصہ بھی کھا رہے ہیں۔“  
مون بڑی دور کی کوڑی لائی تھی۔ وہ بھٹا اٹھا تھا۔  
”مون! ذرا بھی خوف خدا نہیں تمہیں.....  
ایسے گھٹیا الزام.....“ وہ کانوں تک سرخ ہو گیا تھا۔  
”دیکھ لینا..... بات یہی نکلے گی۔ تایا یا تو  
پیسوں کی امداد لینے آئے ہیں یا اپنے بیٹوں کے  
اسپانسر ویزوں کی بات کریں گے۔“ مون گویا تایا  
کے اندر سے ہو کے آئی تھی۔ حالانکہ وہ یہ بکواس محض  
عیسیٰ کو تپانے کے لیے کر رہی تھی۔ اس میں یقیناً کوئی  
صداقت نہیں تھی۔ وہ اتنا تو جانتی تھی کہ تایا کوئی فٹ  
پاتھ سے اٹھ کر نہیں آئے مگر پھر بھی اپنی بھڑاس نکال  
رہی تھی۔ تاکہ لاؤنج میں موجود تایا سن لیں۔ در پردہ



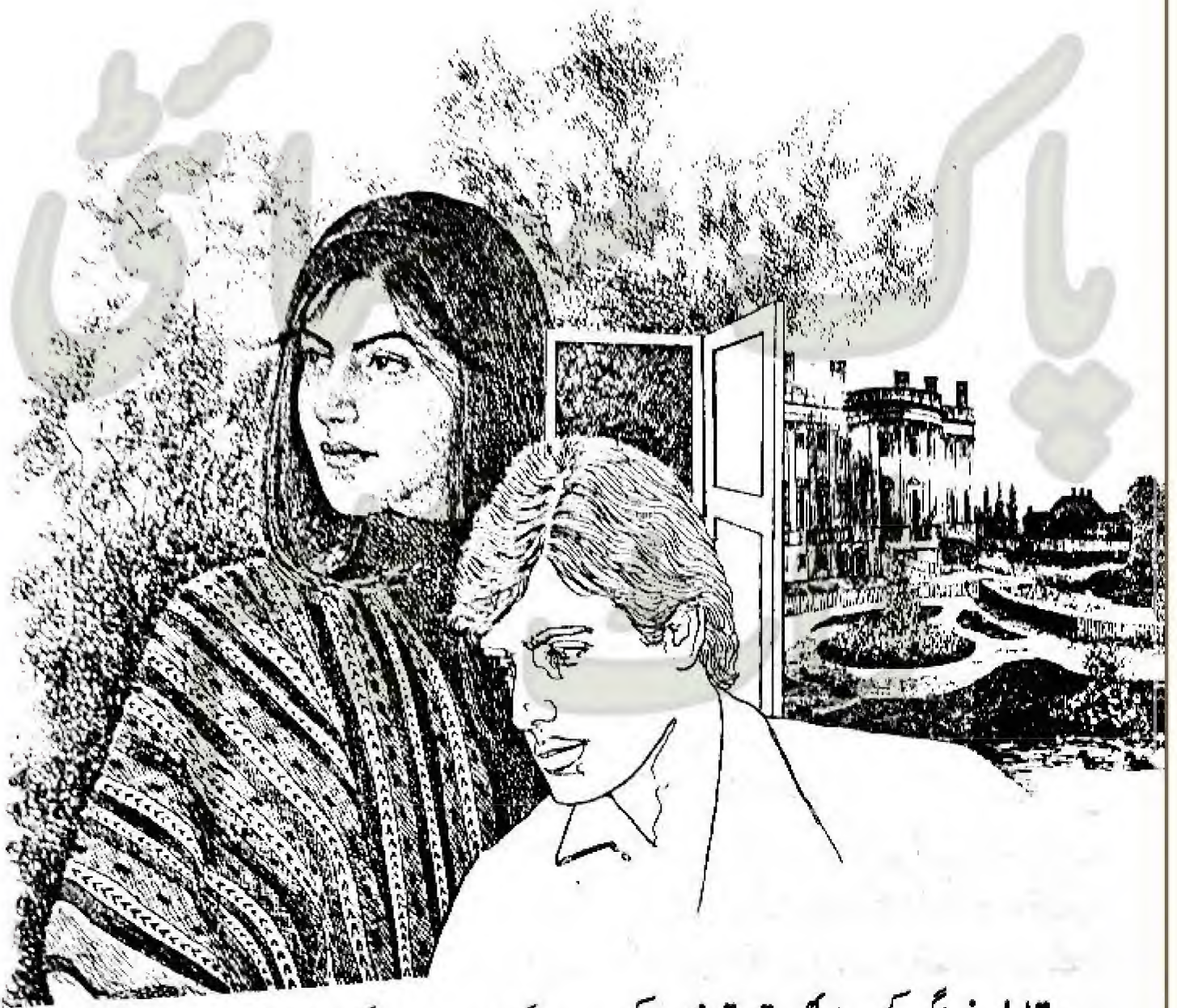
# تیرک ونا

نایاب بیانی

ناولٹ



گیارہواں حصہ

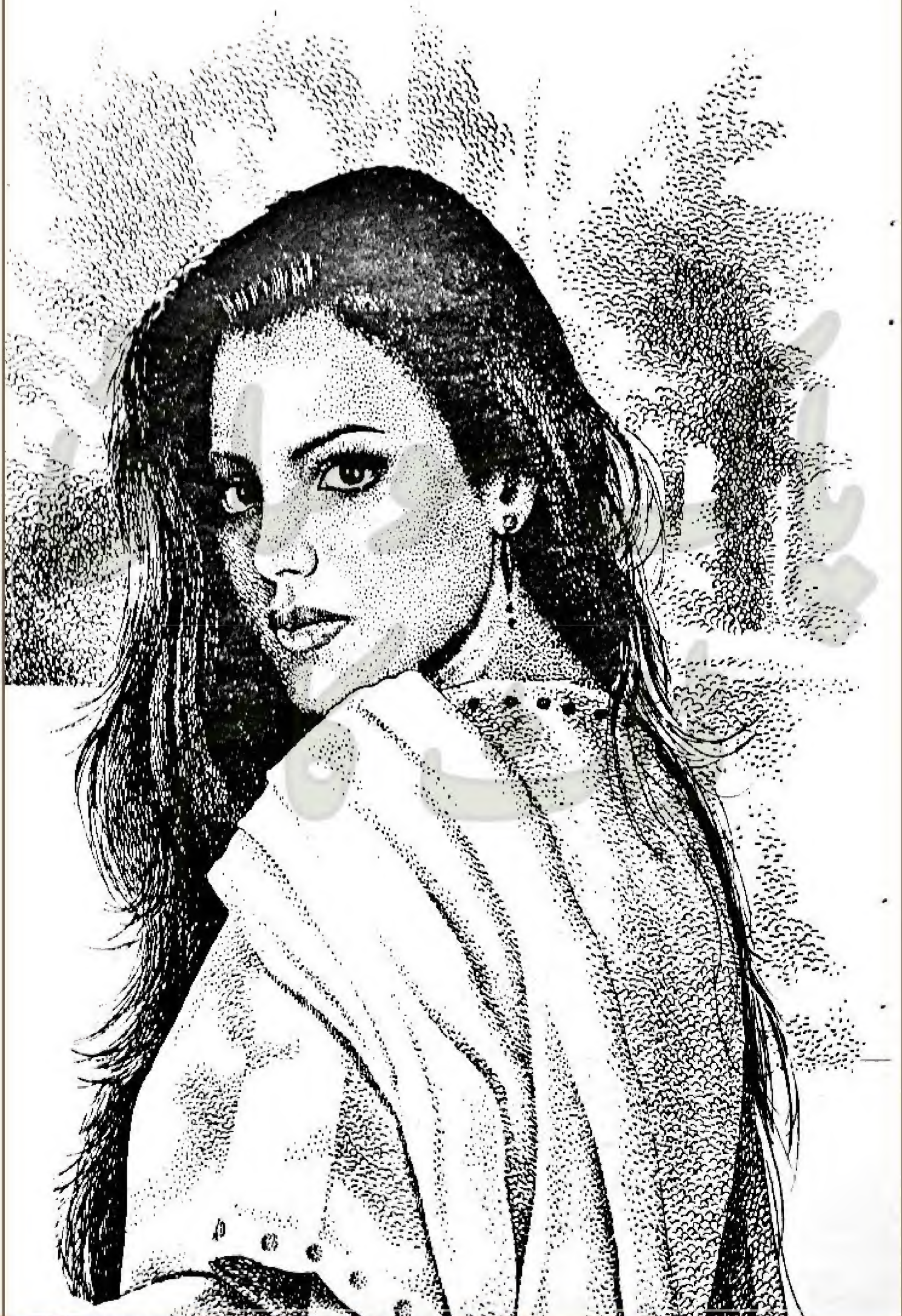


تایا نے اگر کچھ سنا بھی تھا تو ظاہر کچھ نہیں ہونے دیا۔ عیسیٰ کے خدشے بے بنیاد ثابت ہوئے تھے۔ وہ دل ہی دل میں شکر کرتا رہا، اگر تایا کچھ سن لیتے تو بھلا وہ کیسے ان سے نگاہ ملا سکتا تھا؟

حالا کہ اندر سے وہ کچھ بچھ سا گیا تھا۔ مون کی .... خود مرانہ باتیں اسے غصے میں مبتلا کر چکی تھیں مگر اب اس غصے پر بے بسی حاوی تھی۔ ممان دنوں اچانک بیمار ہو گئی تھیں۔ ان کی صحت گری، گری تھی مگر وہ تایا اور

52 ماہنامہ پاکیزہ ۷ ستمبر 2014ء







شاہ اور وہ ان ایک دوسرے کے ساتھ مل سکیں گے۔ وہ بھی مزاحاً کرم ہے اور وہ ان بھی لمبوں۔ جبکہ عیسیٰ اور مالا ایک ہی لڑی کے موتی ہیں۔ ٹنڈے، ٹیلے اور مدغم..... مجھے امید ہے، بہت اچھا زندگی کا سفر طے کریں گے ایک ساتھ۔ انہوں نے کو بیانات ہی تم کر دی تھی مگر پاپا نے بہت ہش کی۔ وہ مون کی بکواس سے واقف جو نہیں تھے۔ جو کچھ تایا سن چکے تھے اس کے جواب میں ان کی مون کے لیے اتنی حلاوت بھی عیسیٰ کے لیے اچھے کا باعث تھی۔ انہوں نے مون کی شکایت بھی نہیں کی تھی، بس کہا تو صرف اتنا.....

”حیب ابی کی شادی میں تاخیر مت کرنا۔“ ان کے لہجے میں جو واضح تشبیہ تھی اسے عیسیٰ بخوبی سمجھ چکا تھا۔ وہ مون کے رنگ ڈھنگ سے خوفزدہ تھے۔ مگر پاپا ان کی بات کو سمجھ نہیں سکے۔ وہ اپنی ضد پر اڑے رہے تھے۔

”آپ ذی کو ادھر بھیجیں گے تب ہی مون کا کچھ سوچ سکوں گا۔ میں نے مون کو کہیں اور نہیں صرف ذی شاہ سے ہی بیاہنا ہے۔“ پاپا کا لہجہ بھی اٹل تھا۔ ان کا انداز بچوں جیسا ضدی تھا۔ جیسے وہ ہر صورت اپنی بات منوانا چاہتے ہوں۔

”اس طرح تو دتہ سٹ ہو جائے گا۔“ تایا بھی بے بس سے ہو گئے۔

”تو کیا فرق پڑتا ہے.....؟“ پاپا کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔

”تم فی الحال اس بات کو رہنے دو..... صرف عیسیٰ اور مالا کی بات کرو.....“ تایا نے بڑی محبت سے جیسے التجا کی تھی۔ وہ چپ کر گئے تھے پھر کافی دیر کی خاموشی کے بعد بولے۔

”ٹھیک ہے..... پھر میں عیسیٰ اور مالا کا رشتہ پکا سمجھوں.....؟“ انہوں نے آس بھری آواز میں کہا۔

”ہاں..... کیوں نہیں.....“ تایا بھی مسکرا دیے۔ ”مگر عیسیٰ سے تو پوچھو.....“ انہوں نے بڑی

تسکی کے لیے فریش نظر آتی تھیں۔ ہلا تاپا کیا سوچتے؟ وہ کبھی بکھار ان کے گھر آئے تھے اور ہاؤس فراؤ بنار پڑ گئیں۔ مہمان نوازی کی خاطر مریم کو ہشاش بشاش رہنا پڑ رہا تھا ورنہ وہ تو اچانک اندر سے ڈھے گئی تھی۔

پھر انہی دنوں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا تھا..... دراصل عیسیٰ کے لیے یہ ایک واقعہ یا پھر خوشگوار حادثہ تھا۔ اس دن وہ اسکول سے گھر آیا تو پاپا اور تایا کو اسٹڈی روم میں دیکھ کر ادھر ہی چلا آیا تھا مگر اندر سے آتی آوازیں سن کر ٹھنک گیا۔ پاپا اور تایا کسی اہم موضوع پر بات کر رہے تھے۔ آخر موضوع کیا تھا؟ وہ جیسے سن کھڑا رہ گیا۔ وہ لوگ تو عیسیٰ کی شادی کے متعلق بات کر رہے تھے مگر شادی ہو کس سے رہی تھی؟

”میری تو خواہش ہے مالا اور علی عیسیٰ کی شادی ہو اور مون کا جوڑ ذی شاہ سے بنتا ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں بھائی صاحب.....؟“ پاپا بے تاب سے بول رہے تھے۔ عیسیٰ جیسے ٹھنک گیا تھا۔ ”مالا اور علی عیسیٰ..... مالا یعنی تایا جان کی بیٹی.....“ اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ جیسے کوئی کھنٹی سی ہوا کے جھونکے سے اچانک بج اٹھی ہو۔

”مالا اور عیسیٰ تو ٹھیک ہیں..... عیسیٰ تو جان ہے اپنی..... پر مون کی بات رہنے دو۔“ تایا کی آواز سنجیدہ تھی۔ جیسے وہ بہت تول تول کر بول رہے تھے۔

”مون کی بات کیوں رہنے دوں..... کیا آپ کو میری بیٹی بطور بہو پسند نہیں آتی؟“ پاپا بچوں جیسی ضد سے بولے تھے۔ جیسے تایا کے انکار نے ان کے دل کو نہیں پہنچائی تھی۔ مگر عیسیٰ تو جان گیا تھا، تایا کس وجہ سے انکار کر رہے تھے۔ مون کی زبان کے جوہر دیکھ کر انہیں انکار ہی کرنا چاہیے تھا۔

”یہ بات نہیں.....“ تایا نے سابقہ سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا۔ ”مون مجھے بہت پیاری ہے۔ تمہاری بیٹی بہت خوب صورت ہے پر مجھے نہیں لگتا ذی



## نرک و وفا

رشتہ طے پا جاتا مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا..... تایا نے  
وٹے سٹے کا بہانہ کر کے ایک طریقے سے پاپا کو نال  
دیا تھا۔ وہ مون کو اپنی بہو ہرگز نہیں بنانا چاہتے تھے۔  
شاید ان کی زیرک نظری اور ووراندہ شی نے بعد کے  
حالات بھی دیکھ لیے تھے۔ یقیناً انہیں لگتا تھا مون  
کبھی ان کے بیٹے کا ساتھ نہیں دے سکتی پھر رشتے  
داری خراب کرنے سے بہتر تھا، وہ لوگ یہ نیا رشتہ  
کرتے ہی نہیں۔ شاید تایا کا فیصلہ درست تھا مگر پاپا کو  
بھلا کون سمجھاتا..... وہ تو ہر صورت مون اور ذی شاہ  
کا رشتہ بھی جوڑنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دونوں بچوں  
کا مستقبل روشن اور محفوظ دیکھنے کے خواہش مند تھے  
اور یہ خواہش بے جا نہیں تھی۔

تایا کو جانے سے پہلے فوٹو والا الیم دکھانا یاد آیا  
تھا۔ انہوں نے الیم عیسیٰ کو پکڑا کر شرارتا کہا۔

”اسی الیم میں اپنی بھی فوٹوز لگا دینا.....  
پاکستان والے بھی دیکھنے کو بے تاب ہوں گے۔“  
انہوں نے مسکراتے ہوئے عیسیٰ کو چھیڑا تھا اور وہ ہنستا  
ہوا الیم پکڑ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسے اپنے  
کزنز کو دیکھنے کی بہت بے چینی تھی۔ عیسیٰ دروانہ...  
بند کر کے بیڈ پر آ بیٹھا..... پھر اس نے الیم کھول کر  
جلدی سے دیکھا۔ دراصل یہ بیٹھا، بیٹھا اٹھنے والا  
اضطراب صرف مالا کو دیکھنے کے لیے اسے بے قرار  
کر رہا تھا۔ اسے مالا کو دیکھنا تھا جو سمندروں کے  
فاصلے پر بیٹھی تھی مگر عیسیٰ کو لگتا اس کے آس پاس ہی  
کہیں ہے۔ یہ کیفیات بہت اچانک رونما ہوئی  
تھیں۔ وہ اپنے محسوسات میں تبدیلی پاتا تھا۔ یوں  
لگتا جیسے اندر کا پورا سسٹم ہی بدل گیا ہے۔ پھر مالا کو  
دیکھنے کے بعد تو جیسے وہ اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔  
اس کا دل، دھڑکنوں کا ردم بدل گیا تھا۔ حالانکہ وہ  
کوئی بہت حسین نہیں تھی۔ عام سی لڑکی تھی مگر عیسیٰ کو  
ہمیشہ خاص لگتی تھی۔ اس کا دل جیسے اس کے بس میں  
نہیں رہا تھا۔ وہ مالا کی محبت میں بن دیکھے گرفتار ہو گیا

اہم بات کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”میرا بیٹا، میری ہر بات مانتا ہے۔“ پاپا کا  
سینہ بے انتہا فخر سے پھول گیا۔

”یہ تو ٹھیک ہے..... عیسیٰ کی رضامندی زیادہ  
اہم ہے۔“ تایا بھی ہلکے پھلکے سے مسکرا دیے..... جیسے  
کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔

”وہ تو اب بھی شادی کے لیے تیار ہوگا... آپ  
بے شک بلا کر پوچھ لیں۔“ پاپا یقیناً دروازے کے پیچھے  
کھڑا سے دیکھ چکے تھے۔ بھی شرارتی انداز میں  
بولے تھے جبکہ عیسیٰ ایک دم جھینپ گیا تھا۔ اب چھپنے  
کا فائدہ نہیں تھا۔ وہ دونوں اسے دیکھ چکے تھے۔

”سامنے آ جاؤ سرکار.....“ پاپا نے ہانک لگائی  
تھی۔ وہ جھینپا جھینپا سا اندر آ گیا۔

”باتیں تو سن چکے ہو تمام..... اب بتاؤ، کیا  
رائے ہے تمہاری؟“ پاپا نے اسے چھیڑا تھا۔

”جیسے آپ کی مرضی.....“ عیسیٰ نے مشرقی  
بچوں کو بھی شرمانے میں مات دے ڈالی تھی۔ وہ  
دونوں بھائی اس کی حالت سے حفا اٹھا رہے تھے۔

”صاحبزادے! ہم آپ کی مرضی پوچھ رہے  
ہیں؟“ تایا بھی اسے تنگ کرنے لگے۔

”مجھے آپ کی ”مرضی“ سے بھی اختلاف نہیں.....“  
اب وہ ذرا چر اعتماد ہوا تھا۔ وہ دونوں اس کی....

جی داری پر ہنس پڑے۔

”دیکھ لیا..... اب کیا کہتے ہیں.....! رشتہ پکا  
سمجھوں.....؟“ پاپا نے ہتھیلی پر سرسوں جما ڈالی تھی۔

”بالکل جناب! اب میں کیا کہوں.....؟ تم  
باپ بیٹا بڑے جلد باز ہو.....“ تایا سرشار سے

ہوئے۔ گویا لاک گونا سکون محسوس کر رہے تھے۔ تب  
علی عیسیٰ اور مالا کی زندگی کا فیصلہ بڑے اچانک

حالات میں ہوا..... اور مون کی بات سچ میں رہ گئی  
تھی۔ مون کی بکواس اگر تایا نہ سن چکے ہوتے تو شاید

حالات مختلف ہوتے اور مون کا بھی ذی شاہ سے



تاکہ وہ تایا کے منہ پر اس رشتے سے انکار کر دے۔  
آخر تایا کی مطلب پرستی کھل کر سامنے آ ہی گئی تھی۔  
بیٹا نہ سہی بیٹی کو جرمنی بھیجنے کا منصوبہ کامیاب ہو ہی رہا  
تھا۔ مون ایسا ہرگز بھی نہیں ہونے دے گی۔ اس نے  
فیصلہ کر لیا تھا۔ آخر اس کے خدشے اور چھٹی حس کے  
اشارے بے بنیاد نہیں تھے۔

یوں ہی کمرے میں چکراتی میون کی نگاہ تکیے کے  
نیچے الہم تک گئی تھی۔ اس نے کچھ تجسس کے عالم میں  
تکیے پیچھے ہٹا کر دیکھا۔ نیچے ایک الہم پڑا تھا۔ وہ حیرانی  
کے عالم میں تصویریں ایک، ایک کر کے دیکھنے لگی۔

”تایا اور ان کے نیچے.....“ مون نے زپر لب  
بڑبڑا کر ایک اور ننھا سا لفاظہ کھولا۔ اس میں الگ سے  
آٹھ دس تصویریں رکھی تھیں۔ وہ تجسس کے عالم  
میں دیکھتی چلی گئی۔

”یہ کون ہے.....“ اس کا دل جیسے دھک،  
دھک کر رہا تھا۔ وہ ایک، ایک تصویر کو ساکت بیٹھی  
دیکھ رہی تھی۔ اندر دور کہیں اکھاڑ پچھاڑ ہو رہی تھی۔  
دل کی عمارت پر دھڑا دھڑا کچھ گر رہا تھا۔ کیا.....؟  
شاید اس کے بڑے بول..... شاید تکبر بھرے لفاظ،  
شاید حقارت، نفرت اس نے تایا کو کیا کچھ نہیں سنایا  
تھا۔ اپنے بیٹوں کا مستقبل سنوارنا چاہتا ہے۔ ان  
کے دیزے لگوانا چاہتا ہے۔ اور جانے کیا کیا.....؟  
اس کے کہے ایک، ایک لفظ نے جیسے مون کا منہ  
چڑانا.. شروع کر دیا تھا۔ ادھر دل کے اندر قیامت کا  
تلاطم پاتا تھا۔ اور مون کی پوری ہستی تہ خاک ہو رہی  
تھی۔ اس نے تصویر کو اٹھا کر منہ بار دیکھا۔ اس کا  
دل نہیں بھر رہا تھا۔ وہ اس چہرے کو بار بار دیکھنا  
چاہتی تھی۔ مون حسیب کو آخر ہو کیا رہا تھا؟ کیا ایسا  
ہونا چاہیے تھا؟

ہاں، ایسا ضرور ہونا چاہیے تھا۔ اس کے غرور کی  
سزا یہی تھی۔ اسے تایا کے اسی بیٹے سے محبت ہوتی،  
جس کے لیے انہیں مون قطعاً نامناسب لگی تھی اور

تھا۔ جیسے اسے پیلے کی کلیوں سے گندمی بہت معصوم سی  
مالا سے محبت ہو گئی تھی۔ یہ رشتہ پاپا اور تایا نے طے کیا  
تھا۔ مگر ماما کو کچھ اختلاف ہوا..... انہوں نے دے،  
دے لفاظ میں انکار کرنا چاہا تھا۔ وہ سوزن کو اپنی بہو  
بنانا چاہتی تھیں اور یہ بات عیسیٰ کے کانوں تک بھی  
پہنچ گئی تھی۔

ایک طرف پاپا کی خواہش تھی اور دوسری طرف  
مما کی..... وہ تو جیسے بے بس ہو گیا تھا۔ اگر ماما زیادہ  
مجبور کرتیں تب وہ بھلا انکار کر سکتا تھا؟

وہ تایا کا دیا فوٹوز والا الہم کھولے افسردہ سا  
ہو گیا۔ اس الہم میں مالا کی صرف ایک تصویر تھی۔ دو  
چار بندیا کی تھیں۔ ذیشان، ذی شاہ اور شامی کی  
زیادہ تھیں بلکہ ذی شاہ کی زیادہ تھیں شاید تایا وہ  
تصویریں مون کے لیے لائے تھے۔ اسے ذی شاہ کو  
دیکھ کر مون کی بد نصیبی پر دکھ سا ہوا۔ کاش کہ یہ رشتہ  
بھی طے ہو جاتا مگر ہر خواہش پوری ہونے کے لیے تو  
نہیں ہوتی۔ مون کی جلد بازی، تلخ کلامی اور  
زہریلے لفاظ نے تایا کو اس سے بد دل کر دیا تھا۔

مون، عیسیٰ اور مالا کے رشتے کا سن کر شا کڈرہ  
گئی تھی۔ اس کا ذہن جیسے سن ہو کر رہ گیا۔ مون نے تو  
عیسیٰ اور سوزن کے متعلق سوچ رکھا تھا پھر یہ مالا بیچ  
میں کہاں سے آ گئی تھی؟ مون کے اندر باہر آگ لگ  
گئی۔ تایا کی جالا کی پہ اسے سخت تاؤ آتا رہا مگر اب تو  
اسے تایا جیسے مطلق انسان پر گویا زہر چڑھ رہا تھا۔ تایا  
گھر میں ہوتے تو وہ ان کو ایسی، ایسی باتیں سناتی کہ  
اپنی بیٹی کا رشتہ دشتہ سب بھول جاتے۔ مگر تایا کہیں  
نکلے ہوئے تھے۔ اور عیسیٰ جانے کہاں تھا؟ وہ عیسیٰ کی  
تلاش میں آگ بگولا ہوتی اس کے کمرے میں آئی تو  
عیسیٰ وہاں بھی نہیں تھا۔ مون کو زہرا گلنا تھا۔ اس کے  
سامنے کوئی بھی ہوتا تو بیچ نہ پاتا۔ وہ کمرے میں  
چکراتی غصہ پھونک رہی تھی۔ وہ عیسیٰ کے سارے  
طبق روشن کرنے آئی تھی اور اسے مجبور کرنے آئی تھی



نورک و ما

روشنی نہیں بھتی، ناروا تغافل کی دل شکن اداؤں سے  
 جذبہ ہائے الفت کو ماند کر نہیں سکتی  
 اور پھر ”بوئے گل“ کی کہاں تھی! فصیلیں توڑ،  
 توڑ کر سرچڑھنے لگی۔ نشہ بن کر مدہوش کرنے لگی تھی۔  
 خواب بن کر آنکھ میں اترنے لگی تھی۔ وہ خود کو جھٹلا،  
 جھٹلا کر تھک گئی تھی اور بوئے گل کو روک، روک کر  
 لاچار ہو گئی۔ محبت نے اپنا پنجہ اس کے دل پر بالآخر  
 جما ہی دیا تھا اور اسے تایا کے ذی شاہ سے بڑی پاگل  
 کر دینے والی محبت ہو گئی تھی۔

وہ ایک عجیب لڑکی تھی، اس کی زندگی عجیب تھی،  
 اس کے احساسات عجیب تھے، اس کی محسوس کرنے  
 والی ہر حس عجیب تھی اور اس عجیب لڑکی کو بڑی عجیب  
 سی محبت ہو گئی تھی۔

اس نے ذی شاہ کی تصویر کو اٹھا کر اپنی آنکھ کے  
 سامنے کر لیا تھا۔ وہ اس کا ایک، ایک نقش کھوج رہی تھی  
 بھلا کوئی چہرہ اتنا پُرکشش اور مقناطیس جتنی صلاحیت  
 رکھتا ہے؟ جو دل، جذبات اور احساسات کو بیک وقت  
 کھینچ سکے؟ وہ دم بخود بے جان تصویر کو دیکھ رہی تھی مگر  
 اسے لگتا تھا، تصویر سے نکل کر کوئی مجسم اس کے سامنے  
 آکھڑا ہوا ہے۔ اس کا دل جیسے توے پر رکھے مکھن کی  
 نکیہ کا ایک کونا تھا جو لحظہ لحظہ پھلتا جا رہا تھا۔

اسے اپنے متکبر الفاظ یاد آ رہے تھے..... نخوت  
 اور غرور میں لپٹے..... ”کیا کبھی کوئی اتنا بھی بے بس  
 ہو جاتا ہے؟“ اس نے اپنے پرانے ہوتے دل سے  
 سوال کیا..... محبت جس میں فنا ہو رہی تھی۔ اور وہ  
 اپنے آپ میں نہیں تھی۔ کیا سزائیں اتنی جلدی بھی ملا  
 کرتی ہیں؟

مون کی چھٹی حس کہہ رہی تھی۔ محبت اس کے  
 دل پر کوئی سزا بن کر یا عذاب بن کر نازل ہوئی ہے۔  
 ہاں، محبت اس کے لیے بن سنور کر نہیں آئی تھی، وہ  
 اس کا امتحان لینے آئی تھی۔ اس کے تکبر کو مٹی میں  
 رو لے آئی تھی۔ اسے تہ خاک کرنے آئی تھی۔ اسے

ماہنامہ پاکیزہ 1 ستمبر 2014ء

57

مون کے ساتھ کتنا انہونا واقعہ رونما ہوا تھا۔  
 کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے؟ تصویر دیکھ کر کسی سے  
 محبت ہو جانا؟ تصویر دیکھ کر سوچیں، دل، جذبات،  
 احساسات بدل جانا اور اس محبت میں سالوں کی  
 مسافت طے کرنا۔

وہ ذی شاہ کے نقش، نقش کو دیکھ کر، دل کے  
 اندر بسا رہی تھی..... مگر آنکھ تھی کہ ہنتی نہیں تھی اور دل  
 تھا کہ بھرتا ہی نہیں تھا۔

اس نے خود کو بارہا مجبور کیا..... سمجھایا، بچھایا  
 تاویلیں اور دلیلیں دیں..... جیسے نگاہ بچا، بچا کر اور  
 رستہ بدل، بدل کر گزرتا چاہا تھا مگر اس کے ہر رستے  
 میں انوکھی سی یہ محبت دیوار بن کر آکھڑی ہوئی تھی۔  
 ان دونوں بہن، بھائی کو بڑی عجیب سی محبت ہوئی  
 تھی۔ وہ صرف تصویر دیکھ کر عین عشق کی سیڑھیاں  
 چڑھنے لگے تھے۔ بھلا ایسے بھی کبھی ہوتا ہے؟ بھلا  
 اس طرح بھی ہوتا ہے؟ مگر ان دونوں کے ساتھ  
 بالکل ایسا ہی ہوا۔ عیسیٰ کا معاملہ پھر بھی الگ تھا مگر  
 مون کے ساتھ تو بہت ہی عجیب ہوا۔ وہ لمحوں  
 میں پرانی ہو گئی تھی۔ جیسے کچھ بھی اس کا اپنا نہیں رہا  
 تھا۔ دل سمندر پار تایا کے اس بیٹے کے حصار میں چلا  
 گیا، جو کل تک اس کی نظر میں کچھ نہیں تھا۔ اور آج  
 پورا عالم سیٹھ بیٹھا تھا۔

مون نے چاہا کہ وہ خود کو جھٹلا دے مگر بوئے  
 گل نے کہا۔ میں روکے سے نہیں رکتی۔ بڑی عجیب  
 محبت ہوں، نشے کی طرح چڑھتی ہوں، عمر بھر نہیں  
 اترتی.....

راستے بدلنے سے دل کہاں بدلتے ہیں  
 شہر کی فصیلوں کی جس قدر بلندی ہو  
 بوئے گل نہیں رکتی آنکھ موند لینے سے  
 جو نمی ہو آنکھوں میں وہ کبھی نہیں چھپتی  
 ہاتھ کے کواڑوں سے چاندنی نہیں ملتی  
 بے رحم ہواؤں سے پیار کے چراغوں کی



ہی تھی۔ وہ جیسے ٹھنک کر منجمد ہو گئی تھی۔ وہ دونوں کیا بات کر رہے تھے؟ دونوں بے انتہا سنجیدہ تھے۔ مون سانس رو کے دروازے کے باہر کھڑی ہو گئی پھر جیسے دھیرے دھیرے اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

”مون کی بات مت کرو، میں نے پہلے بھی تمہیں منع کیا ہے حسیب.....“ تایا نے بے انتہا سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا۔ پھر پاپا کی بے بس سی آواز سنائی دی تھی۔ مون کی سانس تک رک گئی۔

”کیوں نہ کروں.....؟ میری بیٹی میں کیا کمی ہے؟“ انہیں گہرا دکھ سا ہوا۔

”میں نے کب کہا ہے مون میں کوئی کمی ہے۔ بس ذی شاہ نہیں مانے گا۔“ صاف لگ رہا تھا وہ مجھے لہجے میں بولتے ہوئے نال رہے تھے۔

”کیوں نہیں مانے گا؟ آپ اسے ایک مرتبہ ادھر بھیجیں تو سہی.....“ پاپا نے افسردگی سے کہا تھا، جیسے ان کی بات مانی نہیں جائے گی۔

”وہ یہاں بھی نہیں آئے گا، بڑا مختلف مزاج ہے اس کا..... اور مون بھی کم نہیں..... یہ رشتہ غیر مناسب ہے۔“ تایا گویا تول، تول کر بول رہے تھے۔ وہ کس کے رشتے کی بات کر رہے تھے؟ مون اور ذی شاہ کی.....؟ وہ جیسے تھرا اٹھی تھی۔ تو تایا اسے رنجیکٹ کر رہے تھے؟

”شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آپ بات تو پکی کریں۔“ پاپا کی لجاجت پر وہ مہتمم سی گئی تھی۔

پاپا اپنی بیٹی کے لیے گڑ گڑا رہے تھے۔ کیا بوائے گل پاپا تک بھی پہنچ گئی تھی؟ کیا مون کی محبت کا اعلان ہو گیا تھا۔ خوشبو بکھر رہی تھی؟ مہک نکھر رہی تھی؟

”کچھ ٹھیک نہیں ہوتا، نہ ہوگا..... رشتے داری میں دراڑ آ جائے گی۔“ تایا بے بس ہو گئے۔

”نہیں آئے گی..... بس میں نے کہہ دیا ہے عیسیٰ اور مالا..... مون اور ذی شاہ..... چند سال گزر

برباد کرنے ہی تو آئی تھی۔ اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں کو تصویر پر جمایا۔

پھر اس نے ذی شاہ کی تمام تصویروں کو اسی لفافے میں بند کر دیا۔ شاید وہ تصویروں کو نظر سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ خود سے جدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

خواب پوش آنکھوں میں  
آنسوؤں کا بھر جانا  
حسرتوں کے ساحل پر  
تلیوں کا مرجانا  
جس کی ہواؤں میں  
خوشبوؤں کا ڈر جانا  
دل کے گرم صحرا میں  
حشر ہی بپا ہونا  
درِ دلاوا ہونا  
کیا بہت ضروری ہے  
اب تیرا جدا ہونا

اس کا دل جیسے کٹ، کٹ کر گرنے لگا تھا۔ وہ اپنی کیفیات پر دم بخود تھی۔

☆☆☆

گردشِ دوراں نے اسے کس موڑ پر لاکھڑا کیا تھا.....؟ وہ نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی، نہ آگے بڑھ سکتی تھی۔ عقل، عمر کی محتاج نہیں ہوتی۔ پھر بھی وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ کرے کیا..... ابھی وہ انہی الجھنوں میں گرفتار تھی جب تایا کی واپسی کا دن آ گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ جانے سے پہلے تایا کا دل اپنی طرف سے صاف کر دے گی اور اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگ لے گی۔ خود غرض تو وہ بلا کی تھی۔ اپنے مفاد کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔

سو رات کو وہ خود کو سمجھا بچھا کر گیٹ روم کی طرف لے آئی تھی۔ مگر یہ کیا..... اندر سے پاپا اور تایا کی آوازیں آرہی تھیں۔ موضوع گفتگو مون کی ذات



### مہکتی کلیاں

☆ اگر آپ اپنے احباب کو ایسے واقعات سناتے ہیں جن سے آپ کے دوستوں کو نیچے گرایا جائے تو آپ خود ایک گری ہوئی شخصیت ہیں۔

☆ یتیم وہ نہیں جس کے والدین نہ ہوں بلکہ وہ ہے جو حسن اخلاق سے محروم ہو۔

☆ کنجوس آدمی دولت کا مالک نہیں ہوتا بلکہ دولت اس کی مالک ہوتی ہے۔

☆ مٹ جانے والی چیزوں کو چھوڑ دو اور باقی رہ جانے والی چیزوں کو اختیار کرو۔

مرسلہ: انجم گلزار، کراچی

### ابدی نیند

ہر گھر کے کشادہ سخن میں  
کتنے کمرے اک آتے ہیں

پھران کروں کے باسی  
چپکے چپکے، دھیرے دھیرے

اپنا رستہ جن لیتے ہیں  
دور دہلیں میں جا بستے ہیں

جاتے جاتے طفل تسلی کی ایک گٹھڑی  
بوڑے ہاتھوں میں دے کر

اشک بھری آنکھوں سے نظریں چرا کر  
چل دیتے ہیں

ایک دن ایسا آتا ہے کہ  
بوڑھی آنکھیں، رستہ نکلتے تھک جاتی ہیں

چوکھٹ پر ہی سو جاتی ہیں  
شاعرہ: حجاب عباسی

مرسلہ: افتخار شوق، میاں چنوں

جانے دیں..... بچے پڑھ لکھ جائیں پھران کی شادیاں کر دیں گے۔" پاپا نے عجلت پسندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ شروع سے ہی جلد باز تھے۔ تایا کا مسلسل انکار کرنا مون کو اذیت سے دوچار کر رہا تھا مگر پاپا اصل حقیقت سے واقف نہیں تھے۔ وہ تو مون کی بدلتی کیفیت سے بھی واقف نہیں تھے۔

"تم کیوں نہیں سمجھتے حسیب! اذی شاہ نہیں مانے گا۔" تایا نے انتہا کی سنجیدگی بھرے لہجے میں کہا۔  
"آخر نہ ماننے کی کوئی وجہ تو ہو....." پاپا کو غصہ آ گیا۔

"تمہاری بیٹی کا مزاج مختلف ہے۔" تایا پھر سے بے بس ہو گئے۔ وہ کیسے بھلا مون کے مزاج کی تشریح کرتے؟ انہوں نے مون کو دیکھ کر ہی جانچ لیا تھا۔ وہ ان کی بہو بننے کے قابل نہیں تھی۔

"شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔" پاپا کی وہی ایک ضد..... مون کو لگا وہ اب چکرا کر گرنے ہی والی ہے۔ تایا کے الفاظ اسے دھڑام، دھڑام ز میں بوس کر رہے تھے۔

"کبھی نہیں ہوگی..... وہ انتہائی بد تمیز اور۔۔۔

بد لحاظ بچی ہے، تم نے اس کی تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پھر بھی مجھے لگتا ہے وہ تمہارا امتحان بن کر دنیا میں آئی ہے۔ بعض بچے والدین کو آزمانے کے لیے ہی آتے ہیں۔ وہ تمہارے لیے بہت اذیت کا باعث بنے گی۔ میں دیکھ رہا ہوں، مجھے خوف ہے..... وہ بہت خسارے اٹھانے والی ہے۔" تایا کی

آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی تھی۔ دراصل وہ مون کی سرکشی اور خود سری کی انتہا کو کھونچ چکے تھے۔ وہ بہت زبردست انسان تھے۔ مون کی ذات میں موجود کجیوں کو جانچ چکے تھے۔ اور ادھر مون کے سر پر جیسے پہاڑ آگرے تھے۔ وہ آخری سیرمی سے منہ کے بل گر پڑی تھی۔ تو کیا پاپا کے اس بھائی نے مون کو اپنے

بیٹے سے رشتے کے قابل نہیں سمجھا تھا؟



اور پاپا مستقبل کے سہانے سننے بن رہے تھے اور مون ان کے سپنوں کو تار، تار کرنے کی پلاننگ کر رہی تھی۔  
”عیسیٰ اور مالا..... کبھی نہیں، ہرگز نہیں.....“

میں انہیں کبھی ایک ہونے نہیں دوں گی..... اگر ایسا ہو بھی گیا تو غضب کی جدائی ڈالوں گی۔ عمر بھر کی ایسی ذلت، جدائی اور رسوائی کہ داغ کبھی نہ دھل پائیں گے۔“ مون نے گویا اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ اس کے اندر کا غصہ تھا۔ ٹھکرائے جانے کا انتقام تھا۔ جب ذی شاہ اس کے لیے نہیں تھا تو پھر مالا کیسے عیسیٰ کے لیے ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں، قیامت تک نہیں..... فیصلہ تو ہو چکا تھا..... وہ اپنی ذلت کا بدلہ لینے، انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور تاپا کو نیچا دکھانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کچھ بھی میں سب کچھ ہی شامل تھا..... محبت اور جنگ میں اس نے سب کچھ ہی جائزہ کر رکھا تھا۔ تاپا کو اپنی بیٹی کی مشرقیت پر مان تھا اور مون حسیب نے اس مان کو تہ خاک کرنا تھا۔ مالا کی مشرقیت کو ذلتوں میں بدلنا تھا مگر اس کے لیے طویل ریاضت درکار تھی۔ بہت صبر اور ضبط کے ساتھ وقت گزرنے کا انتظار کرنا تھا۔ ہاں، عیسیٰ اور مالا کی شادی تک کا انتظار.....

اور اس کے بعد نیم مالا کے ہاتھ سے نکل کر مون کی طرف آ جاتی۔ شطرنج کی اصل بازی وہ عیسیٰ کی شادی کے بعد کھیلنے والی تھی۔ بساط پر مہرے رکھ دیے گئے تھے۔ اب بس داؤ چلنے تھے۔ مگرچ میں کچھ سفر ابھی باقی تھا۔ عیسیٰ اور مالا کی شادی تک کا سفر..... اور مون اتنے سالوں میں نفرت کے ان جذبات کو نوچنا نہیں بلکہ اور تازہ دم کرنا چاہتی تھی۔ آخر بدلہ لیے بغیر تو وہ رہ ہی نہیں سکتی تھی پھر تاپا کو مزہ بھی تو چکھانا تھا۔ جو پاپا کو اب مالا نامہ کھولے ایک، ایک لفظ کھول، کھول کر سنار ہے تھے۔ جیسے در پردہ مون کو جتا رہے ہوں۔

”مالا اتنی سادہ سی ہے، معصوم، کم گو، شریف...“

”خود سوچنا ذرا..... عیسیٰ مغرب زدہ ہے، مغرب کی پیداوار..... پھر بھی شریک حیات میں مشرقیت کی خواہش رکھتا ہے۔ پھر ذی شاہ تو ہے ہی مشرق کی پیداوار..... وہ مون کی مغربیت کے ساتھ کبھی سمجھوتا نہیں کرے گا۔“ تاپا ج کہہ رہے تھے۔ مگر وہ ان کے سچ کو دھتکار بھی تھی۔ تو کیا تاپا نے اسے ٹھکرا دیا تھا؟ اسے دھتکار دیا تھا؟ آخر انہوں نے مون میں کون سی خرابی دیکھی تھی؟ وہ بد کردار تھی؟ شرابی تھی؟ جواری تھی؟ اس کے غیر لوگوں سے ناجائز تعلقات تھے؟ آخر انہوں نے مون میں کیا دیکھ کر اسے ٹھکرا دیا تھا؟

اس کی زخمی انا منہ کے بل گری دھاڑ رہی تھی۔ ٹھکرائے جانے کی ذلت کوئی معمولی نہیں ہوتی۔ اس کے نفرت بھرے جذبات ابل کر باہر آ گئے تھے۔ غصہ بھانہ بھڑکی طرح جل رہا تھا اور انتقام کے شعلے اسے فنا کر رہے تھے۔ وہ ایک جلد باز باپ کی جلد باز بیٹی تھی۔ اس سے یہ ذلت، یہ ٹھوکر برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ ابھی تو محبت اس کے دل میں اتری ہی تھی جب ذلت کی آگ نے اسے راکھ، راکھ کر دیا تھا۔

اس کا بس چلتا تو پاپا کے اس بھائی کا منہ نوج لیتی۔ اسے گالیاں دیتی..... اور اس کے منہ پر کچھڑ پھینکتی کہ آخر وہ ہوتا ہی کون تھا جو مون کو رت بجھکت کر رہا تھا۔

ذلت، توہین، غصہ، نفرت اور انتقام کی آگ نے اسے جھلسا رکھا تھا۔ بات اتنی بڑی تو ہرگز نہیں تھی مگر مون کی شدت پسندی نے اسے انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ اس سے آگے بس ذلت کا سفر تھا مگر وہ نادانی میں سمجھ ہی نہیں پائی۔

تاپا، اب پاپا کو بڑی محبت کے ساتھ اگلے مرحلوں کے طے کرنے کی تفصیل بتا رہے تھے۔

”عیسیٰ پڑھائی سے فارغ ہو لے..... پھر تم مالا کو آ کر لے جانا..... مالا اب تمہاری بیٹی ہے۔“ تاپا



تھی۔ تاپا نے کتنی معمولی بنیاد پر اسے دھتکارا تھا۔ اس کا اولین محبت کا ذائقہ چکھنے والا دل بہت بری طرح سے کرچی، کرچی ہوا تھا۔ وہ اگر بے باک، نڈر، دلیر یا منہ پھٹ بھی تو یہ کوئی اتنا بڑا عیب نہیں تھا جس کی بدولت وہ سکی بھیجی کو ٹھکرا جاتے۔ مون کے نزدیک تو کوئی بھی عیب نہیں تھا مگر ایک بات پر اسے بھی یقین ہو چلا تھا، یہ جو اس کی چھٹی حس تھی یہ کبھی غلط اشارہ نہیں دیتی تھی۔

وہ جو دل کو بڑا کر کے تاپا سے اپنے سابقہ رویوں کی معافی مانگنے آرہی تھی تب ہی اس کی چھٹی حس نے الارم بجایا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں ہونے والا۔ کچھ غلط اور بہت برا ہوگا..... اور ایسا ہو کر رہا تھا۔

وہ صرف تاپا سے نہیں بلکہ اس شب جان چھڑکنے والے پاپا سے بھی بدظن ہو گئی تھی۔ اس کا باپ اتنا کمزور ثابت ہوا تھا جو بیٹی کے حق میں ذرا سی دلیل بھی نہیں اٹھا کر لایا تھا۔ وہ چاہتے تو تاپا مان بھی سکتے تھے۔ پاپا ان پر داؤ بھی ڈال سکتے تھے مگر پاپا نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ ذرا سی کوشش بھی نہیں کی تھی اگر وہ چاہتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے۔ کم از کم عیسیٰ اور مالا کا رشتہ توڑنے کی دھمکی ہی دے ڈالتے۔ پھر تاپا کی کیا مجال تھی جو وہ انکار کرتے..... اتنا تو مون جان ہی چکی تھی۔ تاپا، عیسیٰ کے لیے.... لیانا تھا حساس ہو چکے تھے اور عیسیٰ کو ہر صورت اپنا داماد بنانا چاہتے تھے۔ عیسیٰ اپنی پیاری، پیاری عادتوں کے باعث تاپا کے دل میں کھب گیا تھا مگر اس کے پاپا نے بغیر لڑے ہی ہتھیار پھینک دیے تھے۔ جاتے، جاتے تاپا انہیں باور کروا گئے تھے۔

”ذی شاہ کے لیے مون کو مت بٹھانا..... جلد از جلد شادی کر دینا..... بیٹیوں کو وقت کے ساتھ ہی رخصت کرنا چاہیے۔“ تاپا کے یہ الفاظ تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے تھے۔ مون کا انتقام اور

با حیا دیکھنا، عیسیٰ تو عمر بھر مجھے اور تمہیں دعائیں دیتا رہے گا۔“ تاپا کے لہجے میں فخر تھا۔ جو مون کو تازیانی کے مانند لگ رہا تھا۔ تو گویا وہ اسے جتلا رہے تھے پاپا کو بتا رہے تھے کہ تمہاری بیٹی ان اعلیٰ مقدس اور پاکیزہ صفات سے مبرا ہے۔ وہ در پردہ اسے کوڑے مار رہے تھے اور مون ذلت و توہین کے احساس سے بھڑبھڑا رہی تھی۔

”ہونہہ..... پاکیزہ..... با حیا..... معصوم..... دیکھوں گی، یہاں آ کر کتنی معصوم، پاکیزہ اور با حیا رہتی ہے؟“ وہ تشرف و حقارت سے زہر آلود ہو رہی تھی۔ اور تاپا کا فخر بڑھتا جا رہا تھا۔

”میری بیٹی بہت بھولی ہے، سکھڑ، سمجھدار، وفا شعار، محبت کرنے والی عیسیٰ کا نام لیا تو سر جھکا کر اپنی رضامندی دے دی۔ ایسی بیٹیاں تو والدین کی آنکھوں اور سینوں میں ٹھنڈک بھرتی ہیں۔“ وہ نم آواز میں کہہ رہے تھے اور مون کے سر پر ہتھوڑے لگ رہے تھے۔ تاپا کا ایک، ایک لفظ اس کے لیے تیزاب کے مانند تھا۔ وہ جیسے سرتاپا جھلس رہی تھی۔ تاپا جانتے نہیں تھے۔ مالا کی بے ضرر تعریفیں اس کے لیے آئندہ زندگی میں کیسی قیامت لانے والی ہیں۔ اگر جان جاتے تو کبھی مالا کی اتنی تعریف نہ کرتے۔

مون جب اٹنے قدموں پلٹ رہی تھی تب وہ پہلے والی مون نہیں تھی۔ وہ تو غصے، حسد، نفرت اور انتقام میں بھری مون تھی جس نے تاپا کو نیچا دکھانا تھا۔ اپنے ٹھکرائے جانے کا حساب لینا تھا۔ حالانکہ بات بڑی نہیں تھی مگر اسے مالا کے مقابل لاکر، مالا کی شخصیت کے ساتھ موازنہ کر کے ریجیکٹ کیا گیا تھا۔ ایسی توہین مون عمر بھر نہیں بھول سکتی تھی۔ تاپا نے اپنی بیٹی کے خاکے میں رکھ کر مون کا جائزہ لیا تھا..... یہ کہاں کا انصاف تھا؟ اب مون، مالا کی طرح سکھڑ نہیں تھی، اس کی طرح ڈبو نہیں تھی، اس کا یہ مطلب نہیں تھا۔ مون میں سرے سے کوئی خوبی ہی نہیں



منہوم عمر بھر نہیں سمجھی تھی کہ سارے معاملے تقدیر کے آگے سرنگوں ہیں اور تدبیر جتنی بھی مضبوط سہی، تقدیر کی رسی اسے اکھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔

محبت کو اس نے امرت نہیں، سم قاتل بنا لیا تھا پھر مرنا تو تھا ہی..... سلگنا تو تھا ہی..... محبت کو شہد سمجھ کر پینے والے ہارے ہوئے انسان بہت کم ہوتے ہیں..... جو ہار کر بھی شہد بنے رہتے ہیں۔ شہد کی دلدل میں عمر بھر ڈوبے رہتے ہیں۔ محبت کے مارے ہوئے اکثر زہر بن جاتے ہیں اور یہ زہر وہ کسی نہ کسی کی رگوں میں ضرور اتارتے ہیں، کسی نہ کسی انتقامی جذبے کے باعث۔

مون کے ساتھ بھی کچھ یوں ہی ہوا تھا۔ تایا چلے گئے مگر مون کے اندر ہمیشہ تازہ رہنے والا زخم چھوڑ گئے۔ اور ان کے چلے جانے کے بعد ان کے گھر کا ماحول بھی کچھ اچھا نہیں رہا تھا۔ ماما اور پاپا کی پہلی مرتبہ زندگی میں بحث ہوئی تھی۔ ماما کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اسی وجہ سے پاپا نرمی برت رہے تھے ورنہ جو ممانے شوراٹھایا تھا وہ انہیں سخت گراں گزر رہا تھا۔ ماما، مالا کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ یہ نہیں تھا انہیں مالا سے کوئی پُر خاش تھی، وہ بس سوزن کے لیے اپنے دل میں کچھ زیادہ نرم گوشہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے پاپا سے پہلی مرتبہ بحث کی تھی۔

”میں سوزی کے لیے موٹر سے بات کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔“ مریم نے مجھے سے انداز میں کہا تھا جیسے اس کی دیرینہ خواہش پوری ہونے سے دور ہو چکی تھی۔ مون اس وقت وہیں تھی اور وہ ٹھہر کر ان کی باتیں سننا چاہتی تھی۔

”مگر بات کی تو نہیں..... اور کرنا بھی نہیں..... میں سوزی کو بہو نہیں بنا سکتا.....“ پاپا کا لہجہ اٹل تھا۔ جیسے وہ فیصلہ کر چکے تھے اور اب اپنے فیصلے سے ہٹنے

بھی بڑھ گیا تھا۔ اب تو وہ کسی بھی صورت تایا اور مالا کو معاف کرنے والی نہیں تھی۔ مالا اس کے دشمنوں کی فہرست میں ایک دم ٹاپ پر چلی گئی تھی۔ اب اسے اپنا انتقام پورا کرنا تھا۔ تایا کو نیچا دکھانا تھا مگر اس کے لیے عیسیٰ اور مالا کی شادی بہت ضروری تھی۔ مون کا منصوبہ بڑا مختصر اور جامع تھا۔ مالا کو بدنام، ذلیل اور خوار کر کے عیسیٰ کی زندگی سے بے دخل کرنا..... پھر اسے ذلتوں کے داغ لگا کر واپس پاکستان بھجوانا..... تاکہ عزت مآب تایا صاحب اپنی لاڈلی کے کرتوت دیکھ کر شرمسار ہو جاتے پھر اپنے ہی کہے الفاظ کے کوڑوں سے لہو لہان ہوتے رہتے۔ ان کی لاڈلی بھولی، با حیا، بادفاہنی کو ذلیل کرنا مون کا اولین مقصد بن گیا۔ اس سے نہ صرف انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی بلکہ تایا کو ان کے تکبر کی سزا بھی مل جاتی جو نیک اور فرمانبردار اولاد پر اترتے پھرتے تھے۔ ایک جامع پلاننگ بناتے ہوئے مون حسیب بھول چکی تھی کہ اس کے پاس جزا اور سزا کا کوئی اختیار نہیں..... ہر شخص اپنے عمل کا بھگتان خود اپنی ذات پہ ہی بھگتنے والا ہے اگر کوئی غرور یا تکبر میں مبتلا بھی تھا تو بھلا مون کون ہوتی تھی اسے سزا دینے والی؟ ذرا سی غلطی، ہلکی سی سرزنش انسان کے لیے عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہے۔ اور مون کے دفتر تو ویسے بھی بھرے پڑے تھے۔ جس صنفے کو بھی کھولتی، اندر سے خسارے اور نقصان کی فہرست نکل آتی تھی مگر انسان ٹھوکر کے بنا کہاں سمجھتا ہے..... اور مون تو ٹھوکر وہ سب کو رکھتی تھی، اسے چھوٹی موٹی ٹھوکر نے کیا کہا تھا؟ اندھا دھند بھاگتے ہوئے انسان رائل روڈ کو بھول جاتا ہے..... پھر جب تک کوئی بریکر نہیں آتا، رکتا نہیں..... اور یہی بریکر چاہے تو گڑھے میں پھینک دے چاہے تو قبر میں.....

اور مون صرف ان دو نقطوں اور ایک لائن کا



تو لہو

والے نہیں تھے۔ اس سے مون کو پاپا بہت ہی برے لگے تھے۔

”سوزی میں کیا برائی ہے؟“ مریم دکھی سی ہو گئی۔

”میں نے یہ نہیں کہا.....“ پاپا برا مان گئے۔  
 ”تو پھر.....؟“ وہ رونے لگی مٹی اور ماں کے آنسو  
 مون کے دل پر گر رہے تھے۔ اس کا دل جاہا، وہ پاپا کو  
 روک دے مگر بے بسی کے باعث کچھ نہیں کر سکی تھی۔

”میں بھائی صاحب سے بات کر چکا ہوں  
 مریم.....“ پاپا بھی جیسے بے بس ہو گئے تھے۔ ماما کے  
 آنسوؤں نے انہیں پگھلا دیا تھا۔

”آپ معذرت کر لینا..... پلیز، میری  
 خاطر..... میں سوزی کو بہت چاہتی ہوں..... وہ بہت  
 اچھی بچی ہے۔ ایک ٹوٹے گھر کا درد اپنے دل میں  
 رکھتی ہے۔ اسے یہاں محفوظ جگہ اور محبت کرنے  
 والے لوگ مل جائیں گے۔“ مریم نے اپنے جذبات  
 پاپا تک پہنچا دیے تھے۔ پاپا سوچ میں پڑ گئے تھے۔

”مریم! تم ایسا کیوں سوچتی ہو..... سوزی کی  
 شادی میں خود کروں گا۔ تم سوزی کی فکر مت کرو۔“ پاپا  
 کے لیے ماما کو روتا دیکھنا بہت مشکل تھا۔ پھر مریم ان  
 دنوں بہت بیمار تھی۔ اس کی رپورٹس کچھ بہتر نہیں آئی  
 تھیں۔ مزید ٹیسٹ وغیرہ کروائے جا رہے تھے۔ ان  
 حالات میں وہ اسے کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتے تھے۔

”سوزی کے لیے عیسیٰ بہت مناسب ہے، وہ  
 بہت تعاون کرنے والا سمجھدار لڑکا ہے۔ سوزی کے  
 ساتھ اچھا رہے گا۔“ مریم، بھانجی کا مستقبل محفوظ  
 دیکھنا چاہتی تھی۔ جبکہ وہ عجیب دورا ہے پر کھڑے  
 ہو گئے تھے۔ ایک طرف بھائی کو زبان دے رکھی تھی  
 اور دوسری طرف بیمار بیوی کی خواہش تھی۔ کچھ سوچ  
 کر انہوں نے مریم کو مڑوہ جاں نزاں دیا تھا۔

”ٹھیک ہے مریم.....! تم عیسیٰ سے پوچھ  
 لو..... میری بات..... چلو، خیر ہے، میں اپنے بھائی کو

سمجھا لوں گا۔ پر تمہاری خواہش کیسے رو کر دوں۔“ پاپا  
 عجیب ٹوٹے سے لہجے میں بولے تھے۔ مون کے لیے  
 پاپا کے الفاظ بہت حیران کن تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں  
 سکتی تھی پاپا، ماما کی خاطر تاپا کو جواب دے دیں  
 گے۔ اسے پاپا کی یہ کوئی سازش ہی لگتی تھی۔ شاید وہ  
 ماما کا دل نہیں توڑنا چاہتے تھے۔ اور یہ بھی جانتے  
 تھے کہ عیسیٰ خود ہی انکار کر دے گا۔ کیا خبر، پاپا کی یہی  
 پلاننگ ہو..... فی الوقت مون کوئی حتمی رائے قائم  
 نہیں کر سکی تھی۔ پر پاپا کی دورانندی پشیمانی ضرور  
 کرانھی تھی۔ جیسے انہوں نے ماما کو چکما دے دیا تھا۔  
 اب وہ انتظار میں تھی کہ ماما کب عیسیٰ سے بات کرتی  
 ہیں مگر اس سے بھی پہلے ماما کی بھیانک رپورٹس  
 آئیں۔ انہیں کینسر تشخیص ہوا تھا۔ شاید پاپا کے مان  
 جانے کی وجہ بھی ماما کی بیماری تھی۔ وہ ماما کی تکلیف  
 بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ مون نے غور کیا تو اسے  
 احساس ہوا تھا، پاپا بہت دنوں سے بہت اجڑے،  
 اجڑے ویران لگ رہے تھے۔ جیسے ماما کی بیماری کا  
 انہیں پہلے سے ہی شک تھا۔ پاپا کی حالت ایک  
 طرف، عیسیٰ بھی بہت اذیت میں تھا اور خود مون بھی  
 ماں کی بیماری کا سن کر اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔ مریم کی  
 اذیت، درد اور بیماری نے انہیں پھر سے جوڑ دیا تھا۔  
 اور مریم کی بیماری کا موضوع ایسا تھا جس پر مون  
 اپنے تمام اختلافات اور بابا کے لیے دل میں موجود  
 عناد کو بھی بھلا کر بات کر لیا کرتی تھی۔ ان دنوں بس  
 مریم کی صحت اور زندگی ان سب کے لیے اہم ہو گئی  
 تھی۔ باقی ہر بات ثانوی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ماما  
 کا مہنگے سے مہنگا علاج جاری تھا۔ بابا کا دوبار بھلا کر  
 ماما کی پٹی سے لگ گئے تھے اور عیسیٰ کو اپنا کالج تک  
 بھول گیا تھا۔ دن رات ماں کے گرد گھومنے کے سوا  
 اس کا کوئی اور دوسرا کام نہیں تھا۔ جیسے وہ کسی خدشے  
 کا شکار تھا کہ جوں ہی وہ ماما کی نگاہ سے اوجھل ہوا۔  
 ماما ان کے درمیان نہیں رہیں گی۔



شہ رگ سے بھی قریب تھا۔ کیسے نہ عیسیٰ کی پکار پہ پہنچتا.....! جیسے فیصلے کی مشکل ساعت اس کے لیے آسان ہو گئی تھی۔ جیسے وہ پل صراط سے آنکھیں موند کر ہی گزر گیا تھا۔ دماغ نے ایک دلیل دی تھی اور دل نے اس پر مہر ثبت کی۔ وہ ماں کی ہتھیلیاں چومتا، ماں کے پیروں پر جھک آیا تھا۔

”آپ کی خواہش سر آنکھوں پر ماما! جو آپ چاہیں گی، وہی ہوگا مگر پہلے آپ ٹھیک تو ہو جائیں۔“ اس کے الفاظ نے بستر مرگ پر پڑی مریم کو نہال کر دیا تھا۔ وہ جو دنوں میں بیماری کے ہاتھوں چت ہو گئی تھی۔ جانے کب سے کینسر جیسا ناسور اس کے اندر پلٹا رہا تھا۔ وہ چھوٹی موٹی تکلیف کو نظر انداز کرتی آئی تھی۔ جس کا نتیجہ آج بھگت رہی تھی۔ فی الوقت علی عیسیٰ کے الفاظ نے مریم کے اندر زندگی کی برقی لہر دوڑا دی تھی۔ اس نے بیٹے کی پیشانی چوم کر کہا۔

”اتنی مہلت نہیں میری جان.....! بس سوزی کی زندگی کو محفوظ دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ بہت اچھی اور شفاف لڑکی ہے۔ مجھے خوف ہے بھنگ نہ جائے۔“ مریم نے جیسے اپنے اندر کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ اس لیے بھی سوزی کو بہو بنانا چاہتی تھی کہ کہیں ماحول کا طلسم اور حالات کی کٹھنیاں اسے دلبرداشتہ نہ کر دیں، وہ بھنگ نہ جائے۔ یہاں کے رنگ میں رنگ نہ جائے۔ اس کا خالص پن کھو نہ جائے۔ محبت میں ناکامی اس کی راہیں نہ کھوئی کر دے۔ وہ سوزن کے جذبات سے باخبر تھی مگر مومن کے جذبات سے قطعاً بے خبر تھی۔

”سوزی نہیں بھنگے گی ماما! آپ اس وہم میں نہ پڑیں۔ وہ سچی اور اچھی لڑکی ہے۔ اپنے مذہب پر ثابت قدمی سے چل رہی ہے۔ کوئی کچھی رکاوٹ اسے ڈگمگا نہیں سکتی۔“ عیسیٰ نے نرمی سے کہا تھا۔ درپردہ اس نے مریم کو احساس دلایا تھا۔ وہ سوزن کی مذہبی روح کو نظر انداز نہ کریں۔ سوزی اپنے مذہب

اور ادھر مومن کی مشہور زمانہ چھٹی حس بھی خطرے کا الارم بجار ہی تھی۔ اسے لگتا تھا، عیسیٰ کا خدشہ مجسم کھڑا ہونے والا ہے۔ ان کے دل جس خوف کا شکار تھے۔ وہی خوف موت کی آہٹیں لیے دیرے، دیرے ان کے گھر میں قدم رکھ رہا تھا۔ وہ عیسیٰ سے اپنے دل کی بات کہنا، عرصہ پہلے چھوڑ چکی تھی۔ ان کے درمیان تایا کے موضوع پر آخری مرتبہ جو بحث ہوئی تھی، اس کے بعد کوئی تکرار نہیں ہوئی۔ مومن خود ہی عیسیٰ سے بچ گئی تھی اور اس سے دور، دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ حالانکہ اس نے بار بار محسوس کیا تھا، عیسیٰ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے، یقیناً ماما کے موضوع پر بات کر کے اپنا دل ہلکا کرنا چاہتا تھا مگر مومن اس کی خواہش کو پیروں تلے روندتی رہی تھی۔ اس نے عیسیٰ سے جو فاصلہ روارکھا تھا اس میں کمی نہیں آنے دی تھی بلکہ اسے اور ہی بڑھا لیا تھا۔

مالا کے لیے ان کے گھر میں جو چھوٹی موٹی جہز ہیں ہوئی تھیں ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ ماما کی بیماری کے ساتھ ہی گویا ہر موضوع خود بخود بند ہو گیا تھا مگر ایک روز جب ماما کو اسپتال ایڈمٹ ہوئے چوتھا دن تھا ماما نے خود ہی عیسیٰ کو بلا کر سوزن کے متعلق بات کر لی تھی وہ جیسے اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھیں اور بیٹے کی زندگی کا کوئی فیصلہ کر لینا چاہتی تھیں۔ ادھر عیسیٰ جیسے عجب مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ایک طرف ماما تھیں، ان کی آخری خواہش تھی اور دوسری طرف پاپا اور اس کی پہلی محبت..... فیصلہ مشکل تھا، انتہائی پُر اذیت تھا۔ جیسے رشتوں کا پل صراط.....! آخر وہ کس کا انتخاب کرتا؟ کسے چھٹنا؟ ماں کی آنکھوں میں امید بھتی دیکھنے کا بھی حوصلہ نہیں تھا اور پاپا کا سر جھکانے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ یہ وہ گھڑی تھی جب اس نے بڑی شدت کے ساتھ اپنے اللہ کو پکارا تھا۔ وہ ٹھیک فیصلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتا تھا۔ اسی لیے اللہ سے مدد مانگ رہا تھا..... اور اللہ جو



## نوک و ہوا

آیا تھا اور جسے حبیب احمد نے روبرو بلا کر دونوں کو انداز میں اپنے گھر آنے سے منع کر دیا تھا۔ پاپا نے اپنے بھائی کی تنبیہ کو بھلایا نہیں تھا۔ مون کو پاپا کا رویہ برا لگا تھا۔ گھر آئے مہمان کو بے عزت کرنے کا انہیں کیا حق پہنچتا تھا۔ وہ اس وقت تو خاموش رہی تھی مگر بعد میں پاپا سے بھی الجھ گئی تھی۔ اس نے انہیں ٹھوس لفظوں میں کہا تھا کہ وہ پروفیسر کے خلاف دل میں تایا کی وجہ سے بغض نہ رکھیں..... دراصل تایا، پروفیسر کو ناپسند کر گئے تھے۔ اب زمین ادھر سے ادھر ہو جاتی۔ پاپا نے کبھی پروفیسر کو پسندیدگی کی سند نہیں بخشا تھی۔ اور جسے تایا اور پاپا ناپسند کر چکے تھے، مون بس انہی کی ضد میں اس شخص کو اچھا ثابت کرنے پر تل گئی تھی۔ پاپا نے اس کی خاطر تایا سے جنگ نہیں کی تھی بلکہ ہتھیار پھینک دیے تھے اور تایا نے اسے دھتکارا تھا، اپنے بیٹے کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ سو یہ دونوں شخص مون کے لیے باعثِ اذیت بنے تھے۔ وہ ان دونوں کو تکلیف دے کر حظ اٹھانا چاہتی تھی۔ وہ کیسی نادان، احمق اور خسارے اٹھانے والی تھی۔ خود کو عقل کل سمجھ کر بھی نادانیاں کرتی رہی.....

فی الحال پاپا نے اسے پروفیسر کی حمایت پہ جھاڑا نہیں تھا۔ دراصل ماما کی بیماری نے ان کی سدھ بدھ بھلا رکھی تھی۔ وہ بے شمار گھریلو معاملات سے دور ہو چکے تھے۔ ان دنوں پاپا کو ماما کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں تھا۔ اور عیسیٰ بھی ہمہ وقت اسپتال میں رہتا تھا۔ یہ وہی دن تھے جب پروفیسر نے مون حبیب کے گرد اپنی ہمدردیوں کا جال پھینک کر اسے اپنے بس میں کر لیا تھا۔

پروفیسر روزانہ ان کے گھر آ جاتا تھا۔ وہ دو تین گھنٹے بیٹھتا اور مون سے ہر ٹاپک پر بات کرتا۔ یوں ہی باتوں، باتوں میں اس نے انتقالی افکار کی برقی لہروں کے باعث مون سے بہت کچھ اگلا لیا تھا۔ وہ کم عمر اور نادان تھی۔ پروفیسر ایک گھاگ شکاری

پہ کچھ بھی قربان کر سکتی ہے۔

”یہ تم نے ٹھیک کہا۔“ مریم جیسے گہری سوچ میں پڑ گئی تھی۔ یہ پہلو ایسا نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا جاتا اور یہ بھی سچ تھا۔ وہ عیسیٰ کی بہولانے کے حق میں نہیں تھی۔ وہ عیسیٰ کے بچوں کو کسی گڑھے میں کیونکر پھینکتی۔ آخر شادی کے بعد بچے تو ہونے تھے پھر ماں اور باپ کے درمیان لنگی تلوار کو کیسے ادھر ادھر کرتے۔ مذہب جو واضح حقیقت تھا۔ ایک طرف باپ ہوگا..... صوم صلوٰۃ کا پابند..... ایک کھرا اور سچا مسلمان..... اور دوسری طرف ماں ہوگی۔ ایک کٹر مذہبی، عیسیٰ.. بچے آخر کسے درست سمجھیں گے؟ کیا یہ باریکیاں نظر انداز کرنے والی تھیں؟ مریم لمحہ بھر کے لیے گم صم رہ گئی تھی۔ لوہا گرم تھا..... پھر ذرا سی چوٹ سے اور نرم ہو جاتا۔ علی عیسیٰ نے سابقہ نرم، حلیم اور محبت بھرے لہجے میں ماں سے کہا۔

”مجھے سوزی سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں..... شرط یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کر لے۔ جیسے آپ نے اسلام قبول کیا تھا پھر اسی رستے کو سچا تسلیم کیا..... اور اسی راہ پر چلتی رہیں.....“ عیسیٰ نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ مریم خاموش ہو کر اسی پہلو پر سوچتی رہی۔ عیسیٰ کی ڈیمانڈ کچھ غلط نہیں تھی۔ اس نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ مریم دل سے قائل ہو گئی..... پھر اس نے اپنی ماں سے بات کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر اس سے بھی پہلے بلی کی چال چلنے والی مون نے ان ماں، بیٹے کی پوری بات سن و عن سن کر سوزن کو فون کھڑکا دیا۔ وہ کب سے سوزن کے روبرو بیٹھ کر بات کرنا چاہتی تھی مگر ماں کی بیماری کی وجہ سے اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کا نخرہ، غرور، نخوت یا پاپا اور عیسیٰ پر غصہ ایک طرف، ماں سے مون کو بھی شدید قسم کی محبت تھی..... اور مریم کی تکلیف نے اسے کچھ عرصے تک کے لیے بہت کچھ بھلا رکھا تھا۔ حتیٰ کہ پروفیسر بشر کو بھی..... جو مریم کی عیادت کے بہانے کئی مرتبہ



زمیں بوس نہیں کر سکتی۔“ سوزن کا جواب نہایت ٹھوس تھا۔ مون کو شدید غصہ آ گیا۔ اس پہلے اسے سوزن کی بکواس، انا، خودداری اور عزت نفس پر بھی شدید تاؤ چڑھا تھا۔

”تو پھر عیسیٰ کو گنوا دینا۔“ مون نے چیخ کر کہا۔  
 ”وہ نصیب میں ہو تو ضرور ملے گا۔“ سوزن کا یقین بھی ہلکا نہیں تھا۔ مون لال انکار ہو گئی تھی۔

”تمہارا صبر..... تمہیں لے ڈوبے گا۔ جانے کس خمار میں ہو تم..... خود سے کوشش نہیں کرو گی تو عیسیٰ تمہارے قدموں میں نہیں گرے گا۔“ مون کو زہر چڑھ گیا تھا۔ یہ پروفیسر کی پڑھائی پٹیاں تھیں جنہیں وہ دُہرا رہی تھی۔

”صبر کسی کو لے کر نہیں ڈوبتا..... کیسی سوچ ہے تمہاری، جانے کن لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگی ہو، پہلے تو ایسی نہیں تھیں۔“ سوزن جیسے حیرانی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مون کی پیشانی پر سلوٹس پڑ گئیں۔  
 ”میں پہلے بھی ایسی ہی تھی۔“ اسے غیظ چڑھ گیا تھا۔

”نہیں..... اب بدل گئی ہو.....“ سوزن جیسے سوچ، سوچ کر بول رہی تھی۔ مون اسے موضوع سے ہٹا دیکھ کر بگڑ کر بولی۔

”کام کی بات کرو، جو تم کرنا نہیں چاہتیں..... عیسیٰ کا رشتہ پاپا نے طے کر دیا ہے۔“ اپنے تئیں اس نے دھماکا کیا تھا مگر سوزن جیسے نارمل ہی رہی..... بڑے کمال کا صبر رکھتی تھی۔ ایک کلمہ پڑھ لیتی تو سیدھی جنتی ہوتی مگر اس نے کہا بھی تو کیا۔

”جانتی ہوں میں..... پر کیا کر سکتی ہوں۔“ پہلی مرتبہ اس کی آواز میں نمی بھر گئی تھی۔ مون کو جیسے حوصلہ ہوا۔

”بہت کچھ کر سکتی ہو..... اگر تم چاہتی ہو تو.....“ مون کا لہجہ پُر جوش تھا۔ جیسے وہ سوزن کو بہترین حل بتانے والی تھی۔ دوسری طرف سوزن

تھا۔ وہ مون کی کچی کلی جیسی محبت کی بو بھی پانچ گیا تھا۔ اپنے پاپا، بھائی، تایا اور ہونے والی بھابی کے لیے مون کی بیزاری، بدگمانی اور نفرت بھی جانچ گیا تھا پھر اس نے مون کے گرد اپنی ہمدردی کا جال پھینکا تھا۔ وہ پوری دنیا میں پروفیسر کے علاوہ کسی اور کو اپنا ہمدرد نہیں سمجھتی تھی حالانکہ اس کی چھٹی حس اپنا مخصوص خطرے والا الارم بجاتی رہی تھی اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا جو اس نے چھٹی حس کے الارم پر کان نہیں دھرے تھے۔ حالانکہ یہ اللہ کی طرف سے اسے جو صلاحیت ملی تھی وہ اس کی زندگی کو امان میں رکھے ہوئے تھی۔ خطرات سے پہلے اسے الرٹ کرتی تھی اور اس کے اعصاب کو آنے والے حالات کے لیے پہلے سے تیار کر دیتی تھی مگر یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا جو اس نے الارم کی آواز سن کر بھی اپنے کان بند کر لیے تھے۔ جس کا مطلب تھا، وہ کچھ سننا ہی نہیں چاہتی۔

پروفیسر کو گفتگو کا فن آتا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لاکر مریم کی طویل عمری کے لیے دعائیں کرتا۔ مون کے ساتھ بیٹھ کر دیکھی ہوتا اور اس کی تنہائی پر افسوس کرتا تھا۔ ماما کی بیماری کے مہینوں میں پروفیسر، مون کے دل میں اپنا ایک الگ مقام پاچکا تھا۔ اب وہ پروفیسر سے ہر قسم کا مشورہ کرنے لگی تھی اور گھر کی ہر بات اسے ضرور بتاتی تھی۔

عیسیٰ اور ماما کے درمیان ہونے والی گفتگو کو اس نے پروفیسر سے شیئر کیا تھا اور پروفیسر کے مشورے پر ہی اس نے سوزن کو فون کھڑکا دیا تھا۔ دراصل پروفیسر نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ سوزن کو عیسیٰ سے اظہارِ محبت کرنے پر مجبور کرے..... اس طرح سوزن بھی مون کو اپنا خیر خواہ سمجھے گی مگر جب مون نے سوزن کو نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ مشورہ دیا تو وہ ہتھے سے ہی اکھڑ گئی۔ سوزن نے اس کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

”عیسیٰ سے محبت اپنی جگہ..... مگر میں اپنی انا کو



**ترک وفا**

ہو جاتی تھیں۔ وہ سوزن کے لیے اتنی محنت کر رہی تھی مگر سوزن.....؟

”میں صرف اپنے اندر ضمیر رکھتی ہوں۔“  
سوزن کے جواب نے مون کے منہ پر طمانچہ مارا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے بھونچکی رہ گئی۔ اس سے کوئی اور بات نہیں بن پائی۔ بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ دھیرے سے بولی۔

”تم پاگل ہو یقیناً.....“ مون کی آواز سرگوشانہ قسم کی تھی۔ سوزن کے لبوں پر مسکراہٹ ریگ گئی۔

”میرا جواب وہی ہے۔ سوزن باضمیر ہے۔“  
اس نے آنکھ کے کونے صاف کر لیے تھے۔ جب فیصلہ ہو چکا تو پھر پچھتانا کیسا.....؟ اس نے اس محبت کو سر کا بھوت نہیں بنایا تھا شاید اسی لیے مطمئن تھی۔

”ہونہہ..... جھوٹ مت بولو..... تمہاری محبت ہی پانی کا بلبلہ ہے۔ دراصل اہل مغرب کی عورتوں کو محبت کرنا ہی نہیں آتا۔ اگر کرتی بھی ہیں تو محض ڈھکوسلا.....“ مون نے زہر خند ہو کر کہا تھا۔ کہاں تو عیسیٰ پر وہ جان دارتی تھی۔ اوائل عمری سے ہی چپکے چپکے اسے چاہنے لگی تھی۔ بہت سالوں سے عیسیٰ کے لیے اپنے من میں محبت کا جذبہ رکھے ہوئے تھی۔

اور اب ضمیر کا نٹننا لگا کر جیسے جان چھڑوانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید سوزن کی نظر کسی اور پر پڑ گئی تھی۔ وہ میکس وان یا پھر کوئی اور ایرا غیرہ..... بھی تو آج نگاہیں بدل گئی ہیں۔ لگتا ہے، سوزن نے کوئی اور تار لیا ہے جو عیسیٰ سے بڑھ کر شاندار ہوگا.....؟ یہ مون کے اپنے اندازے تھے جو کسی کیچڑ میں لتھڑے جوتے کی طرح ہی مون کے منہ پر آپڑے تھے۔ اس کے کانوں نے سوزن کی آواز سنی تھی۔ وہ جیسے لمحے بھر کے لیے دم بخود رہ گئی۔

”میں عیسیٰ کی خاطر ہر قربانی دے سکتی ہوں..... میں علی عیسیٰ کی خاطر عیسیٰ اور مقدس انجیل کو

ضبط کی گہری سانسیں کھینچ رہی تھی۔ اس محبت پر صبر کرنا آسان کہاں تھا؟

”کیا.....؟“ سوزن غائب دماغی سے بولی۔  
”تم عیسیٰ سے کہو کہ تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتیں اور تم خود کشی کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔“ مون نے بڑا ٹھوس حل اسے بتایا تھا۔ وہ لمحے بھر کے لیے چپ سی کر گئی تھی۔ اس کی خاموشی نے مون کو کچھ اور شہ دی تھی۔

”عیسیٰ اتنا نرم دل ہے کسی کو اپنی وجہ سے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ تم مرنے کی دھمکی دو گی تو وہ آسانی سے مان جائے گا۔ مجھے یقین ہے۔“ مون اسے نئی راہ دکھا رہی تھی۔ یہ راہ نسبتاً آسان بھی تھی..... صرف دھمکی تو دینا تھی۔ عمل تو نہیں کرنا تھا اور سوزن کو یقین تھا، یہ دھمکی بہت کارگر ثابت ہو سکتی تھی۔ عیسیٰ کا دل بڑا ہی نرم تھا۔ بہت نرم، سچا اور خالص دل..... وہ اپنی وجہ سے سوزن کو قبر میں بھی نہ اترنے دیتا..... وہ مالا سے محبت بھلا کر سوزن سے شادی بھی کر لیتا پھر عمر بھر کبھی جتنا بھی نہیں کبھی طعنہ بھی نہ دیتا..... مگر سوزن بھلا اپنے ضمیر کا کیا کرتی؟ جو اسے دن رات کچوکے لگاتا۔ راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ ذہنی طور پر اسے بے آرام کرتا اور پھر سوزن بھلا عیسیٰ کے ساتھ سے کیا خوشی پائی؟

”میں اسے خود کشی کی دھمکی نہ بھی دوں تب بھی تانتے (مریم) کی خاطر وہ مجھ سے شادی کے لیے رضا مند ہو جائے گا۔ مگر کیا ہے مون کہ میں نے عیسیٰ سے خود شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“ بہت دیر مون کی تقریر سن لینے کے بعد سوزن نے گویا بم مون کے سر پر بلاسٹ کیا تھا۔ وہ جیسے ہکا بکا رہ گئی تھی۔

”تم نے انکار کر دیا..... تم پاگل تو نہیں؟“  
مون جیسے بیچ بڑی تھی۔

”میں پاگل نہیں.....“ وہ مطمئن تھی۔

”تو پھر کیا ہو.....؟“ مون کو پھر سے غیظ چڑھ گیا تھا۔ سوزن کی حرکتیں کبھی کبھی ناقابل برداشت



ہو گیا۔ یہ صدمہ مون کے لیے بہت بھیا تک تھا۔ وہ مہینوں ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہی تھی باقی پاپا اور عیسیٰ پر کیا بیت رہی تھی۔ ایک بیٹی اور بہن ہونے کے ناتے بھی اسے مہینوں پتا نہ چلا..... عیسیٰ شدید بیمار پڑ گیا تھا۔ ماما کی جدائی نے اسے ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب کر دیا تھا۔ پاپا، ماما کا غم بھول کر عیسیٰ کی فکر میں لگ گئے تھے مگر وہ سنسنی میں نہیں آ رہا تھا۔ اسپتال سے گھر آ کر سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتا پھر اسٹوڈیو میں وقت گزارتا..... پاپا کے لیے عیسیٰ کی تکلیف بہت

اذیت ناک تھی پھر انہوں نے عیسیٰ کا دل بہلانے کا یوں سامان کیا کہ اسے گروسی کی طرف بوار یا بھجوادیا تھا۔ خود وہ اتنے مہینوں بعد دفتر کیا گئے کہ پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اگرچہ وہ مون سے بے نیاز ہرگز نہیں تھے مگر مون خود ہی ان سے کترائی، کترائی رہتی تھی۔ باپ سے ایسی بدگمان ہوئی کہ دوبارہ ان کے قریب آ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ بھی خسارے میں جاتے کاروبار کے غم میں گھلنے لگے تھے۔ عدم توجہی کے باعث کاروبار میں خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ بزنس کی فکر نے انہیں گھر سے دور نہیں کیا تھا۔ وہ مون کے لیے دن میں کئی مرتبہ فون کرتے تھے۔ نینی سے پورے دن کی رپورٹ لیتے..... مون کیا کرتی ہے؟ اسکول سے کب آتی ہے؟ اور گھر میں تعزیت کے لیے کون، کون آ رہا ہے؟ گھر اور کاروبار کو ایک ساتھ دیکھنا بہت مشکل تھا مگر پھر بھی زندگی کی گاڑی آگے بڑھنے لگی تھی۔

یہ وہی حالات تھے جب مون نے پروویسیر سے باقاعدہ بات چیت کا آغاز کر لیا تھا۔ پروویسیر بھی کبھار گھر بھی آ جاتا۔ مگر مون نے نینی کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ پاپا کو پروویسیر کے متعلق کچھ نہیں بتانا۔ وہ نینی کا منہ نوٹوں سے بھر دیتی تھی سو نینی بھی لالچ میں آ کر پاپا سے بہت کچھ چھپا لیتی۔

عیسیٰ ابھی تک بوار یا میں تھا..... اس کا دل

نہیں چھوڑ سکتی۔ عیسیٰ کہتا ہے میں اسلام قبول کر لوں جبکہ میں اسلام قبول نہیں کر سکتی۔ میرے اور عیسیٰ کے رستے جدا ہیں۔ ہم کبھی مل نہیں سکتے۔ اور میں اجنبی راہوں پر اندھا دھند دوڑنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“ سوزن نے بہت ٹھوس، مفصل اور جامع جواب دیا تھا۔ مون جیسے اپنا سامنہ لے کر رہ گئی تھی۔

”جہنم میں جاؤ۔“ جب کچھ اور نہ سوچھا تو مون نے غیظ کے عالم میں فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

سوزن کا معاملہ جہاں سے شروع ہوا تھا وہیں ختم ہو گیا۔ مریم نے سوزن کو بہت سمجھایا تھا۔ مگر اس کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ وہ اپنے مذہب کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے محبت کو مذہب پر قربان کر دیا تھا۔ وہ بوار یا کی عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی، اس نے سپر لکڑری لائف کو ٹھوکر مار دی تھی۔ اور گروسی کے باڑے میں اپنے لیے مصروفیت ڈھونڈ لی..... چرچ کے علاوہ گروسی کا باڑا اس کی واحد پناہ گاہ تھا۔ وہ خود کو بھینسوں اور بکریوں کے ساتھ مصروف رکھتی۔

مون نے اپنے تئیں سوزن پر لعنت بھیج دی تھی، جب اسے اپنی محبت کا خود احساس نہیں تھا تو پھر مون کیوں کڑھتی..... مگر پروویسیر بشر نے اسے ہتھیار پھینکنے سے منع کر دیا تھا۔ پروویسیر کا خیال تھا، سوزن وقتی طور پر جذباتیت کا شکار ہے۔ جلد اسے اپنی غلطی کا ادراک ہو جائے گا مگر تب تک کوئی رستہ نہیں بچے گا۔

سو مون کو چاہیے وہ پتھر میں سوراخ کرتی رہے۔ اور سوزن کو عیسیٰ کے حوالے سے قائل کر لے..... مون نے اپنے کریہہ منصوبے کو پروویسیر سے بھی شیئر کیا۔ مالا اور عیسیٰ کی شادی کے بعد ان کی طلاق اور پھر عیسیٰ کو سوزن کی طرف مائل کرنا..... پلاننگ ایک دم مضبوط تھی۔ کہیں بھی جھول نہیں تھا۔ وہ یقیناً جلد کامیابی پا جاتے مگر ایک صبح اچانک مریم کا انتقال



## نرک و فدا

کو اسے فون کرنا چاہیے تھا؟ آخر وہ اس کی سنگیتر تھی..... اور ماما کی وفات کا ایک تعزیتی فون تو کر دیتی، اس کا حق یا فرض تو بنتا تھا مگر اس نے شاید ضروری نہیں سمجھا ہوگا۔ باقی لوگوں نے تو فون کے ہی تھے مگر مالا کی طرف سے کوئی خصوصی کال نہیں آئی تھی۔ وہ چاہے دوبارہ کبھی بات نہ کرتی مگر ایک مرتبہ ماما کے لیے تو ضرور کرتی؟ عیسیٰ کے ذہن میں بھی یہ سوچ بالآخر ابھر آئی تھی..... اگر چہ سوزن کا مقصد اسے مالا سے بدگمان کرنا نہیں تھا۔ وہ تو صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ آیا عیسیٰ اور مالا کے درمیان کوئی نیکی فونک رابطہ ہے یا نہیں.....؟

”تو کیا خط لکھی نہیں لکھا؟ فون کرتے ہوئے شاید وہ شرماتی ہو۔ مگر خط تو ضرور لکھتی۔“ سوزن نے بے پروائی سے ٹیولپ کے ڈھیروں پھول بڑے سے ٹوکے میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ مشین کے ذریعے پھولوں کی کٹائی کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ٹرک آجاتا اور پھر انہی پھولوں کو مختلف کیمیکل لگا کر سائنٹیفک طریقے سے محفوظ کر کے مختلف شہروں اور ملکوں میں بھیجا جاتا تھا۔ وہ اپنے کام میں بہت مصروف تھی تاہم اس کا دھیان عیسیٰ کی طرف بھی ضرور تھا۔ جو ایک دم ذرا گم صم سا ہو گیا تھا۔ سوزن کو کچھ افسوس ہوا۔ اس نے مالا کا ذکر کر کے عیسیٰ کو افسردہ جو کر دیا تھا۔

”اچھا، یہ بتاؤ، واپس کب جاؤ گے؟“ سوزن نے فی الفور گفتگو کا موضوع بدل دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، اس نے عیسیٰ کو دکھی کر دیا ہے۔ وہ خود کو ملامت کر رہی تھی۔

”لگتا ہے، تم بیزار ہو چکی ہو مجھ سے۔“ عیسیٰ پھیکے سے لہجے میں مسکرا رہا تھا۔ حقیقتاً مالا کے متعلق سوچتے ہوئے وہ کچھ ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ یعنی مالا کے نزدیک اس کی اتنی بھی اہمیت نہیں تھی؟ پھر عیسیٰ نے سوچا، کیا خبر..... وہ شرماتی ہو..... اور پاکستان

گروسی کے گھر میں خوب لگتا تھا۔ پھر گروسی ہمہ وقت مریم کی باتیں کرتی رہتی تھیں..... ”میری ایسی تھی، میری کو یہ ناپسند تھا، میری بہت باہمت لڑکی تھی، وہ شادی سے پہلے میرے ساتھ بواریا میں بہت کام کرتی تھی..... چھٹیوں میں گھر آتی اور میرے مہینے بھر کے کام کر جاتی۔“ گروسی کے لیے بھی بیٹی کی جدائی کا صدمہ معمولی نہیں تھا۔ وہ مریم کی یاد میں آبدیدہ رہتیں..... عیسیٰ بھیگی آنکھوں کے ساتھ ماما کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا، وہ ہر وقت ماما کی باتیں کرے..... ماما کی باتیں سننے..... کبھی کبھار تانتے بھی گفتگو میں حصہ لے لیتی۔ تانتے شوہر سے علیحدگی کے باعث اب مستقل یہیں آچکی تھی۔

سوزن کا رویہ البتہ بہت مختلف تھا۔ وہ روزمرہ کام سرانجام دیتے ہوئے چپکے، چپکے علی عیسیٰ کو دیکھتی رہتی۔ عیسیٰ کی بھیگی آنکھیں..... ضبط کی شدت سے سرخ چہرہ سوزن کو بہت اذیت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اس کا دل چاہتا، وہ کوئی ایسا گیت گائے، کوئی ایسا نغمہ سنائے کہ علی عیسیٰ کی آنکھوں میں مسکراہٹ بھر جائے..... مگر اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی یہ خواہش ہمیشہ ادھوری ہی رہی۔ ایک دن آبشار کی طرف جاتے ہوئے پھولوں کے کھیت میں سے گزرتی سوزن نے عیسیٰ سے سوال پوچھا۔

”کیا مالا نے تمہیں میری تانتے کی وفات کے لیے تعزیتی فون کیا.....؟“ وہ دونوں پھولوں کی مختلف قسموں پر بات کر رہے تھے۔ وہ بلب کی شکل کے ٹیولپ کو دیکھ رہا تھا جب سوزن نے موضوع کے برخلاف ایک انوکھی بات کہی تھی۔ تب عیسیٰ قدرے حیران رہ گیا تھا۔

”نہیں تو.....“ وہ جو آبشار کی گھنٹیاں بجاتی آواز سن رہا تھا ایک دم ٹھنک سا گیا۔ ”ہماری کون سا کبھی بات ہوئی ہے جو وہ مجھے فون کرتی۔“ عیسیٰ کو وضاحت دیتے ہوئے اپنا لہجہ کھوکھلا سا لگا تھا۔ کیا مالا



سنجھانے کے بجائے خود بھی جیسے بوجھ بنا پھر رہا تھا۔ انہی سوچوں کے درمیان الجھتا جب وہ گھر پہنچا تو پہلا ٹاکرا نینی سے ہوا تھا۔ جو عیسیٰ کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ جیسے اسے عیسیٰ کے چلے آنے کی امید نہیں تھی۔ عیسیٰ اس کی گھبراہٹ کو نظر انداز کرتا آگے بڑھا تو لاؤنچ سے آتی پروفیسر کی بلند آواز پر ٹھنک گیا۔

”یہ پھر یہاں آیا ہوا ہے.....؟“ عیسیٰ کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ دراصل پروفیسر کو دیکھ کر اسے پہلے بھی اتنا ہی غصہ آیا کرتا تھا مگر تب وہ مردوتا خاموش ہو جاتا۔ مگر اس وقت پروفیسر کو دیکھ کر اس کا بھڑک جانا فطری عمل تھا۔ پاپا اور عیسیٰ کی غیر موجودگی میں اول تو وہ آتا ہی نہیں..... آیا بھی تھا تو پاپا کو نہ پانچ کر واپس چلا جاتا۔ مون کے پاس بیٹھنے کی اسے ضرورت کیا تھی؟ اور پھر مون نے اسے بٹھایا ہی کیوں تھا؟ وہ جانتی بھی تھی کہ پاپا اور عیسیٰ دونوں کو پروفیسر سے سخت نفرت ہے۔ وہ پروفیسر بشر کے سوڑے سے جان چھڑاتے پھر رہے تھے۔ اور مون نے اسے گھر بٹھا رکھا تھا پھر بھلا عیسیٰ کو غصہ کیوں نہ آتا۔

”تمہیں منع بھی کیا تھا، تم پھر منہ اٹھا کر پہنچ گئے ہو۔“ عیسیٰ نے غضبناک تیور لیے پروفیسر کو گھورا تھا۔ وہ ایک دم بوکھلا کر صوفے سے اٹھ گیا۔ اسے امید نہیں تھی، علی عیسیٰ اچانک آجائے گا۔ تبھی شدید گھبراہٹ میں بٹھلا ہو گیا تھا۔

”میں مون کی خبر گیری کرنے آیا ہوں..... بیچاری ماں کے بعد بہت اکیلی ہو گئی ہے۔“ پروفیسر نے مون کے لیے گہری ہمدردی جتائی تھی جبکہ اس کے الفاظ نے عیسیٰ کو اور بھی آگ بگولا کر دیا تھا۔

”بکواس بند کرو اپنی..... مون کی خبر گیری کے لیے اس کا بھائی اور باپ ابھی زندہ ہے۔ سو تمہیں تردد کرنے کی ضرورت نہیں..... نکلو میرے گھر سے۔“ عیسیٰ کا چہرہ لال بھسوکا ہو چکا تھا۔ اس نے پروفیسر کا گریبان

میں شادی سے پہلے فیانسی (منگیتر) سے بات کرنے کو برا خیال کیا جاتا ہو۔

”ایسی بات تو نہیں..... میں تو مون کے خیال سے کہہ رہی ہوں..... وہ آج کل بہت عجیب ہو چکی ہے۔“ سوزن نے مون کا ذکر چھیڑ کر علی عیسیٰ کو.... بے قرار کر دیا تھا۔ اپنے صدمے میں گم وہ مون کو تو یکسر بھول چکا تھا۔ آخر مون کا غم بھی تو کم نہیں تھا۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی.....؟ کیا کرتی ہوگی؟ وہ تو جیسے لمحوں میں بے تاب ہو گیا تھا۔

”میں آج واپس جا رہا ہوں.....“ اس نے کھڑے، کھڑے جیسے فیصلہ کر لیا تھا۔ سوزن قدرے متشکر ہوئی۔

”اتنی جلدی.....؟ میں نے تو ایسے ہی ایک بات کہی تھی۔ تم ابھی کچھ دن تو رہو.....“ سوزن نے نرمی سے کہا تھا۔ وہ اس کی بات سن کر اچانک تیار ہو جائے گا، یہ تو سوزن نے نہیں چاہا تھا۔

”نہیں، مجھے گھر جانا ہے۔ نہ جانے مون کس حال میں ہوگی؟“ وہ بے قرار سا گھر کی طرف چلنے لگا تھا۔ سوزن مشین بند کر کے اس کے پیچھے بھاگی آئی تھی مگر عیسیٰ پھر بھی رکنا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ گردی اور تانتے نے بھی اسے بہت روکا تھا مگر وہ اسی سہ پہر گھر چلا آیا تھا۔ سارے رستے بھی مون کے لیے سوچتا رہا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن ماما کے بعد کتنی اکیلی تھی اور وہ اپنے صدمے میں گم اس کی فکر بھلائے بوار یا کی... ہر یالیوں میں ماں کی یادیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ حالانکہ زندہ لوگوں کو اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ پاپا جو ماما کے بعد بکھر گئے تھے اور خود کو سنبھالنے کے بجائے عیسیٰ کے غم میں بٹھلا ہو گئے تھے۔ اسے اچانک پاپا کی تنہائی اور مون کے اکیلے پن کا احساس بے قرار کر گیا تھا۔ اگر سوزن احساس نہ دلاتی تو وہ ابھی تک اپنے صدمے میں ہی گمن رہتا۔ اسے اب خیال آرہا تھا۔ پاپا اور مون کو اس کی کس قدر ضرورت تھی اور وہ ان کو



## ترک وھا

بھرنہ بھول پائے گا۔“ پروفیسر چیخ، چیخ کر نکل گیا تھا جبکہ علی عیسیٰ اپنے ہاتھ جھاڑتا اندر آ گیا۔ جہاں مون خوشخوار تیور لیے بیٹھی تھی۔ اس کے انداز بہت غیظ بھرے تھے۔ جیسے وہ عیسیٰ پر پھٹنے ہی والی تھی۔

”تم نے گھر آئے مہمان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ مون نے خون رنگ آنکھیں علی عیسیٰ پر جمادی تھیں۔ جو بڑے برہم تیور لیے مون کو گھوٹنے لگا تھا۔ اسے مون کا پروفیسر کی حمایت میں بولنا آگ بگولا کر گیا تھا۔

”اسے مہمان کون کہتا ہے؟ وہ تو شیطان ہے..... ایک دم ذلیل، پاپا نے تو انسان سمجھ کر انسانیت کی خاطر مدد کی تھی اس کی اور وہ تو شیطان نکل آیا.....“ عیسیٰ نے غیظ کے عالم میں وضاحت کی تھی۔

”تم نے اسے مار کر اچھا نہیں کیا..... وہ پولیس کو بلوا لے گا۔“ مون اسے دھمکا رہی تھی۔ یعنی اپنے بھائی کو دھمکا رہی تھی۔

”تو بلوا لے..... مجھے پروا نہیں..... اور اب ایک بھی لفظ پروفیسر کی حمایت میں مت بولنا..... ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ وہ دہاڑ کر مون کو خبر دار کر رہا تھا مگر مون بھلا سمجھنے والی کہاں تھی؟ عیسیٰ کے الفاظ اسے آگ بگولا کر گئے تھے۔

”تم کیا کر لو گے؟“ مون نے بے خوفی کے عالم میں عیسیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لی تھیں۔ عیسیٰ کو جیسے دھچکا لگا تھا۔ مون کی بد لحاظی اسے ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

”میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔“ عیسیٰ نے زہر خند لہجے میں کہا۔ وہ صرف اسے خاموش کروانا چاہتا تھا مگر مون.....

”اور میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گی۔“ مون ایک مرتبہ پھر اسے دم بخود کر چکی تھی۔ اس کے الفاظ نے عیسیٰ کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا۔

”کیا بکتی ہو؟ تمہیں ذرا شرم، لحاظ نہیں.....“

پکڑ کر اسے زور سے جھٹکا دیا تھا۔ پروفیسر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پایا تھا۔ بھی منہ کے بل گر پڑا۔ عیسیٰ نے جھک کر اس کی کمر پر مکار سید کیا تھا۔

”اب دوبارہ اپنی شکل دکھائی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ پروفیسر کی جھکی کمر پر لائیں، گھونٹے اور مکے رسید کر کے وہ ہانپنے لگا تھا۔ دراصل پروفیسر تو توازن برقرار نہ رکھ سکنے کی وجہ سے اب اپنا بچاؤ بھی نہیں کر پایا تھا اور عیسیٰ کے ہاتھوں بری طرح سے پٹ رہا تھا۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ مون دم بخود رہ چکی تھی۔ وہ عیسیٰ کو روکنا چاہتی تھی مگر روک نہیں پائی۔ بے بسی کے عالم میں پروفیسر کی ڈرگت بنتی دیکھ رہی تھی۔

”اپنا یہ شیطانی وجود لے کر یہاں سے گم ہو جاؤ۔ دوبارہ کبھی مجھے کہیں بھی دکھائی مت دینا۔“ عیسیٰ کو جنون چڑھ گیا تھا سو پروفیسر کا بچنا مشکل تھا۔ وہ پروفیسر کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ تب پروفیسر بھی جوانی حملے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مکے اور گھونٹے مارے تھے مگر پروفیسر کو چونکہ زیادہ چومیں لگی تھیں تبھی وہ جلدی نڈھال ہو گیا تھا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا عیسیٰ..... میں تمہارا وہ حشر کر دوں گا، تمہیں پاگل کر دوں گا..... تمہیں بھی اتنا ہی ذلیل کروں گا جتنا تم نے مجھے کیا.....“ وہ خون آلود ناک کو پکڑے ہوئے دہاڑ رہا تھا۔ جیسے کسی زخمی کتے کی طرح بھونک رہا تھا۔ عیسیٰ نے اسے ٹھوکریں مار، مار کر سڑک پر پھینک دیا تھا۔

”یہ ذلت تمہیں ہمیشہ یاد رہے گی۔ ویس ہاؤس کی طرف اب تمہی قیامت تک رخ نہ کرنا۔“ عیسیٰ اپنی شرٹ جھاڑتا پروفیسر پر تھوک کر اندر چلا گیا تھا جبکہ پروفیسر باہر آدھا گھٹنا بھونکتا رہا۔

”اس ذلت کو میں کبھی بھلاؤں گا نہیں..... اور تمہیں بھی اتنا ہی ذلیل کروں گا۔“ پروفیسر خون کی تھوکیں سڑک پر پھینکتا رہا تو میری دی گئی ذلت کو عمر



تھا..... اب وہ عیسیٰ کی ترب کا مزہ لے رہی تھی۔  
 دراصل پروفیسر سے ہر بات تھمیر کرنے کا ایک فائدہ  
 تو یہ ہوا تھا اسے موقع کی مناسبت سے پتے کھیلنے کا فن  
 ضرور آ گیا تھا۔

”کیا بکو اس ہے یہ؟ یہاں مالا کا کیا  
 ذکر.....؟“ عیسیٰ بھونچکا رہ گیا تھا۔ اسے مون کے  
 دماغ چل جانے کا اب پورا یقین ہو چکا تھا۔

”مالا کا ذکر تو ضروری ہے، تم مالا کو بھول جاؤ،  
 میں پروفیسر کی بات نہیں کروں گی..... تم سوزن سے  
 شادی کر لو۔“ اس نے دوسرا پتا بھی آرام سے  
 پھینک دیا تھا۔ وہ عیسیٰ کی متغیر رنگت کو دیکھ کر لطف  
 اندوز ہو رہی تھی۔ جیسے اس کھیل کا مزہ تو اب ہی  
 دوبالا ہوا تھا۔

”سوزن سے کیسے شادی کر لوں؟ تم جانتی تو  
 ہو.....“ وہ برہم ہو کر چیخا تھا۔

”اپنی شرط واپس لو..... ضروری نہیں سوزن  
 اسلام قبول کر لے..... یہاں کتنے پاکستانیوں نے  
 عیسائی اور یہودی لڑکیوں سے شادی کر رکھی ہے۔ تم  
 بھی کر لو گے تو قیامت نہیں آجائے گی۔“ مون بھی  
 جیسے پھنکاری تھی۔

”جتنی تمہاری عمر ہے، بس اتنی بات کیا کرو،  
 میں پاپا کو بتاؤں گا۔ تم تو پاگل ہو چکی ہو۔“ عیسیٰ کو  
 پھر سے غیظ چڑھ گیا تھا۔ مون کی بکو اس اس کا دماغ  
 پھر سے گرما گئی تھی۔ آخر مون کو ہوا کیا تھا؟ یہ خناس  
 اس کے دماغ میں کس نے بھرا تھا؟ اس کے یواریا  
 رہنے کے دوران آخر ادھر کون سا انقلاب آیا تھا جو  
 مون سر تباہ کر گیا تھا۔ اتنی بد زبان سرکش، باغی اور  
 خود سر ہو چکی تھی۔ عیسیٰ کو لگا، اس کے دماغ کی کوئی  
 شریان تو ضرور پھٹ جائے گی، اگر مون اس کے  
 سامنے رہی تو یا وہ خود کو مار ڈالے گا یا مون کا گلا  
 گھونٹ دے گا۔ فی الوقت اس کے دماغ پر ایسی ہی  
 گرمی چڑھ رہی تھی۔

میں تمہارا بڑا بھائی ہوں۔“ عیسیٰ کا ہاتھ غصے اور  
 جذباتیت کی انتہا میں اٹھ گیا تھا اور مون جیسے پتھر کا  
 مجسمہ بن گئی تھی۔ اس کی لمحے بھر کے لیے سانس تک  
 رک گئی تھی۔ کیا عیسیٰ نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا؟ اسے  
 مارا تھا؟ کیوں.....؟ کس لیے؟ وہ جیسے صدمے اور  
 نفرت کے جذبات سے راکھ ہو گئی تھی۔ ماما کے بعد  
 اس پر یہ بھی وقت آنا تھا؟ آج ایک تھپڑ مارا تھا، کل  
 کئی تھپڑ مارنے لگتا..... عیسیٰ کا ہاتھ جیسے کھل گیا تھا اور  
 مون کی زبان بھی کھل گئی تھی۔

”میں اسی طرح بکتی رہوں گی، اب مجھ پر  
 ہاتھ اٹھایا تو پولیس کو بلوا لوں گی..... جہاں تک  
 پروفیسر کا تعلق ہے تو وہ یہاں آتا رہے گا۔ وہ میرا  
 اتالیق ہے اور میں عنقریب اس سے ہیومن سائنس اور  
 اسٹراٹجک پاور کا علم لوں گی۔ تم کون ہوتے ہو مجھے  
 روکنے والے.....؟“ مون نے جیسے بے خوفی کے  
 عالم میں عیسیٰ کو منہ توڑ جواب دیا تھا، وہ جیسے کم صم رہ  
 گیا۔ بہت دیر تک اس سے کچھ بولا نہیں گیا تھا۔ آخر  
 مون کو ہوا کیا تھا؟ ماما کے بعد اس کا دماغ صدمے  
 سے چل تو نہیں گیا تھا؟ سوزن بھی ٹھیک ہی کہہ رہی  
 تھی۔ مون بہت عجیب ہو چکی تھی۔

”تم پروفیسر سے نہیں ملو گی..... یہ میرا حکم  
 ہے..... تمہارے بڑے بھائی کا حکم.....“ بہت دیر  
 بعد جیسے عیسیٰ نے سنبھل، سنبھل کر بہ مشکل کہا تھا۔  
 دراصل مون کی بے خوفی نے اسے اندر سے سہا دیا  
 تھا۔ وہ بظاہر بہت مضبوط نظر آ رہا تھا مگر درحقیقت وہ  
 اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ یہ مون اس کی بہن تو نہیں تھی،  
 یہ تو کوئی سرکش، باغی اور خود سر لڑکی تھی جسے کم از کم علی  
 عیسیٰ نہیں جانتا تھا۔ وہ تو کوئی اور ہی روپ لیے اس  
 کے سامنے کھڑی تھی۔

”ٹھیک ہے..... میں پروفیسر سے نہیں ملوں  
 گی..... پر تم بھی مالا سے مل سکتی توڑ کر سوزن سے شادی  
 کرو گے.....“ مون نے ترب کا پہلا پتا پھینک دیا



## ترک و وفا

پھر بابا اور عیسیٰ اسے منانے کے لیے آئے تھے۔ حتیٰ کہ عیسیٰ نے کئی مرتبہ فون کر کے معافی بھی مانگی تھی..... مگر مون نے پھر ایسا دل کو پتھر کیا کہ کسی نرمی، آنسو اور محبت نے اس کے دل کو پگھلایا نہیں تھا۔ وہ فیصلہ کر کے آئی تھی پھر اس فیصلے کو بابا کی التجائیں تک اکھاڑ نہیں سکی تھیں۔ بابا اور عیسیٰ کئی مرتبہ آئے اور ہر دفعہ مایوس ہو کر چلے گئے تھے۔ مون کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

وہ اپنے باپ اور بھائی سے ایسی بدگمان ہوئی کہ دوبارہ اس نے اپنا دل صاف ہی نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی اب سفر کچھ پالینے کے لیے تھا۔ پروفیسر نے اسے بڑے خوش آئند خواب دکھائے تھے اور وہ نئے، نئے جہان فتح کرنے کی کوشش میں مختلف ایڈونچرز کرتی رہی..... اس کی نیچر میں بحسب تھا، اس کی جبلت میں بے چینی تھی۔ اس کے اندر کچھ مقناطیسی قوتیں اور دنیا کو تسخیر کرنے کا جذبہ تھا۔ پروفیسر نے دراصل اسے اندر تک کھوج نکالا تھا۔ اس نے ایک ہیرے کی بالکل ٹھیک پہچان کی تھی۔ وہ مون حسیب کی پرکھ میں سو فیصد کامیاب ہوا تھا۔ اسے جیسا اپنا گوہر مقصود مل گیا تھا۔

بواریا کے ہی ایک علاقے میں پروفیسر کی چھوٹی سی اکیڈمی تھی جسے مون کے تعاون سے وہ گروسی کے گاؤں میں اٹھالا یا تھا۔ بیدی نوٹنگ کے نام سے اس ادارے کو پروفیسر بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہا تھا۔ بظاہر یہ ایک لیتکوٹیج اسٹیٹ ٹیوٹ تھا مگر اس کنویں میں اترنے کے بعد مون کو اندازہ ہوا تھا کہ بیدی نوٹنگ بالآخر ہے کیا.....؟

یہ مون کے لیے بڑی ہی دلچسپ دنیا تھی۔ ایک الگ سا جہان تھا۔ بڑی مختلف سی زندگی تھی۔ یہاں سکھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ وہ حیران کچھ اس لیے بھی تھی کہ اس نے جو یہاں دیکھا، جانا اور سیکھا تھا وہ کہیں بھی نہیں تھا نہ کسی اسکول میں نہ کسی تعلیمی

”تم بابا کو کچھ مت بتاؤ..... یہ تروڈ میں خود کر چکی ہوں اور اگر تم بھی میری بات مان کر سوزن سے شادی نہیں کرو گے تو پھر میرا فیصلہ بھی اٹل ہوگا۔“ مون نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ ممکن ہی نہیں.....“ علی عیسیٰ نے مستحکم اور ٹھوس لہجے میں اپنی بات مکمل کی تھی..... اور مون حسیب جیسے اس کے آس پاس ایسی دھماکے کرتی تھیں، تنک کی آواز پیدا کیے، ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔

”تو پھر بابا کو بتا دینا..... میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ مجھے ایسی جگہ پر نہیں رہنا۔ جہاں میری کسی خواہش کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہو۔ جہاں میری بات کو رد کر دیا جائے۔“ وہ ساڑھے سولہ سال کی عمر میں ایک معمولی بات کو پہاڑ بنا کر اپنے باپ کا گھر چھوڑ گئی تھی۔ گھر تو اسے ہر صورت چھوڑنا تھا۔ کیونکہ وہ اس گھر میں کبھی رہنا ہی نہیں چاہتی تھی جہاں ذی شاہ کی بہن راج کرنے عنقریب آنے والی تھی۔

ذی شاہ جو اس کے دل کا ناسور تھا، اس کی پہلی محبت تھا اور جسے خبر ہی نہیں تھی، من ہائیم کی مون حسیب اس کے عشق میں خود کو فنا کرنے والی تھی۔ اور پھر تاریخ گواہ تھی مون حسیب نے اپنے دل کے زہر کدے میں خود کو ڈبو کر فنا بھی کر لیا تھا۔

اس نے بڑی عجیب سی محبت کی تھی۔ کروڑوں لوگوں کی دنیا میں وہ ایک عجیب لڑکی پیدا ہوئی تھی اور اس عجیب لڑکی نے اپنی زندگی کے ساتھ بھی بڑے عجیب و غریب معاملے کیے تھے۔ بڑے عجیب و غریب کھیل کھیلے تھے۔ وہ عجیب تھی تو اس نے کچھ نہ کچھ عجیب ہی کرنا تھا۔

☆☆☆

پھر یوں ہوا کہ مون حسیب ہمیشہ کے لیے اپنا گھر چھوڑ آئی تھی۔ اس کا پہلا بڑا او گروسی کا مکان تھا۔ وہ اپنا سامان اٹھا کر یہیں چلی آئی تھی۔ اگرچہ تانتے، گروسی اور سوزن نے اسے بہت سمجھایا تھا۔



کا لہجہ مدہم ہو گیا تھا۔ سینے کے بائیں جانب سے اچانک ٹیسس اٹھنے لگی تھیں۔ ان کا پورا وجود پسینہ، پسینہ ہو گیا تھا۔

”میری بات کا جواب دیں..... فضول بات نہ کریں۔ میرے پاس وقت نہیں.....“ مون نے انتہائی خود سری سے کہا تھا۔ پاپا جیسے بالکل ختم ہو گئے تھے۔ کیا یہ ان کی بیٹی مون ہی تھی؟

”میں تمہیں حصہ ضرور دوں گا..... مگر تمہاری شادی کے بعد.....“ بہت دیر سوچنے کے بعد انہیں... یہ مشکل جواب سوجھا تھا۔ اور مون دوسری طرف بھڑک اٹھی تھی۔

”مجھے آپ کی شرط منظور نہیں.....“ وہ دہاڑ کر بولی تھی۔ مون بہت دھیمّا مزاج رکھتی تھی پھر اسے اب کیا ہوا تھا؟ اس میں اتنی تبدیلیاں کیسے آگئیں.....؟ کیا ماں کی جدائی نے اس کے ذہن پر برا اثر ڈالا تھا؟ وہ جتنا بھی سوچتے، اتنا ہی الجھتے..... مون انہیں کس دوراے پر لے آئی تھی؟ وہ ان کے لیے آزمائش کیوں بن رہی تھی؟ وہ ان کے لیے امتحان کیوں بن رہی تھی؟ اور حبیب احمد تو جانتے ہی نہیں تھے، وہ ان کے لیے سزا ہی تو بن رہی تھی۔

مون کی یہ فون کال ان کے پہلے ہارٹ ایکٹ کا سبب بنی تھی مگر وہ اتنی کٹھور تھی کہ سن کر بھی علی عیسیٰ کے بے حساب اصرار پر بھی باپ کو دیکھنے نہیں آئی تھی۔ باپ کی بیماری کا سن کر بھی اس کا مطالبہ ختم نہیں ہوا تھا۔ پروفیسر نے کہا تھا، وہ اپنا حق کبھی نہ چھوڑے..... اور مون نے پروفیسر کی یہ بات بھی گروہ میں باندھ لی تھی۔

پھر جب وہ بیدی نوٹنگ میں مالکانہ حقوق کے ساتھ داخل ہوئی تو اس کا دماغ کچھ اور آسمان پر چڑھ رہا تھا۔ بیدی نوٹنگ ایک سرسبز و شاداب اور پُراسرار دنیا تھی۔ جو اس دنیا میں ایک مرتبہ داخل ہو جاتا تو پھر عمر بھر نہ نکل پاتا۔ دراصل یہ۔

ادارے میں۔

پروفیسر نے مون سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ پارٹنرشپ کر لے..... وہ بلڈنگ کو خریدنا چاہتا تھا۔ اور اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا..... مون کو پروفیسر کی بات پسند آئی تھی۔ وہ کسی بھی ادارے میں کام ضرور کرتی مگر مالکانہ حقوق کے ساتھ..... اگر پاپا کی ہیرنچ عیسیٰ کے لیے تھی تو مون بھی بیدی نوٹنگ کے ذریعے اپنا ایک الگ نام اور مقام بنانا چاہتی تھی اور اسی مقصد کے تحت اس نے پاپا سے براہ راست بات کر لی تھی۔

”مجھے آپ کی پراپرٹی میں اپنا حصہ چاہیے.....“ مون نے اگلے ہی دن پاپا کو فون کھڑکایا تھا۔ اگرچہ بات غلط نہیں تھی..... مگر اس کا طریقہ کار سراسر غلط تھا..... حبیب احمد کو جیسے دچکا سا لگا۔ پہلے وہ گھر چھوڑ گئی تھی اور اب پراپرٹی میں حصہ مانگ رہی تھی۔ وہ کیوں نہ اپ سیٹ ہوتے..... انہیں لگتا جیسے مریم کے چلے جانے کے بعد ان کی زندگی میں بدبختی نے اودھم مچا دیا تھا۔ جیسے سارا سکون و چین اور سکھ وہ اپنے ساتھ ہی سمیٹ کر لے گئی تھی۔ ان کے پاس سوائے بے سکونی، دکھ اور صد مات کے کچھ نہیں بچا تھا۔

”میرا سب کچھ تم دونوں کا تو ہے.....“ بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ بہ مشکل بول پائے تھے۔ حالانکہ یہ شاک اتنا معمولی نہیں تھا جو وہ سنبھل پاتے مگر پھر بھی انہوں نے مون کو جواب دیا تھا۔ اگرچہ بولنا ان کے لیے آسان ہرگز نہیں تھا۔ ان کی بیٹی کیسے ان کے برابر آکھڑی ہوئی تھی۔ انہیں یقین نہیں آیا تھا۔

”آپ صرف میری بات کریں..... مجھے حصہ دے رہے ہیں یا نہیں.....؟“ مون نے انتہائی... بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ سنبھلتے، سنبھلتے بھی ڈھے گئے تھے۔

”یہ تم کس لہجے میں بات کر رہی ہو.....؟“ پاپا



## تذکرہ وفا

دریافت ہوتے ہیں۔ ایسا آلہ (کمپیوٹر) جیسا دماغ جو پہلے سے مہیا کردہ منظم معلومات کو بوقتِ ضرورت فراہم کرتا ہے..... بھلا ایسے دماغ کوئی معمولی ہو سکتے ہیں اور ان کی پہچان کرنا، انہیں دریافت کرنا بھی معمولی ہرگز نہیں تھا۔

مگر پروفیسر بشر کے پاس قیراط جیسا آلہ موجود تھا۔ وہ قیمتی پتھروں اور سونے کو ناپ سکتا تھا۔ وہ ہیرے، سونے کے پتھر اور تانبے کی پہچان کر سکتا تھا اور اس نے مون حسیب جیسے ہیرے کو کھوج لیا تھا۔

وہ مون کو اپنے انداز، طریقے، اسلوب اور مرضی کے ساتھ تراشنا چاہتا تھا..... اور اس ضمن میں اس نے مون کو پہلی کلاس میں پہلا سبق پڑھایا تھا۔ مون کے لیے یہ سب بہت مختلف، منفرد اور انتہائی دلچسپ تھا۔

پروفیسر بشر جان گیا تھا کہ مون حسیب کا دماغ کوئی معمولی دماغ نہیں ہے..... بلکہ کولس، ڈالٹن اور سر جوزف جیسا غیر معمولی اور انتہائی نایاب قسم کا دماغ ہے..... اب پروفیسر بشر پر ڈیپنڈ کرتا تھا کہ وہ مون حسیب کے دماغ سے کس قسم کا کام لینا چاہتا تھا اور وہ مون حسیب کے دماغ کو کس طرح سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

پہلی کلاس میں پروفیسر بشر نے مون حسیب کو اس کے اندر موجودہ پوشیدہ غیر مادی قوت متحرک کے متعلق بتا کر چونکا دیا تھا۔

”نفسیاتی لحاظ سے بہت خاص لوگوں میں پائی جانے والی سپرفزیکل قوت، جو تمہارے اندر بدرجہ اتم موجود ہے، جسے بس تھوڑا سا پالش کرنا ہوگا..... یہ نئی قوتوں کی وہ معجزاتی قوت ہے جو اپنے مادی وجود کو چھوڑ کر غیر مادی یا روحانی وجود میں منتقل ہو کر غیر فانی کام انجام دینے کی صلاحیت سے بھر پور ہوتی ہے..... اور اس سے لاکھوں ناممکن کام بغیر کسی سہارے کے ممکن ہو جاتے ہیں۔ یہ ایسی قوت ہے

پراسراریت کی دلدل تھی جو اس میں جتنا اترتا، اسی قدر دھنسا چلا جاتا۔

وہ یہاں کچھ سیکھنے کے لیے آئی تھی۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے آئی تھی۔ اس نے زمانے میں اپنی ایک الگ پہچان بنانی تھی۔ ایک مختلف مقام بنانا تھا۔ خود کو بہت اعلیٰ اور بلند مقام پر دیکھنا تھا۔ اسے سراسرے جانے کا نشہ تھا۔ انفرادیت پر وہ جان دیتی تھی اور خود کو کولس جیسی پہچان، عزت و مرتبے تک پہنچانا چاہتی تھی۔

وہ پراسراریت کی ایک عظیم الشان دنیا میں پہنچ گئی تھی۔ بیدی نوٹنگ خوابوں کا سرسبز کھیت تھا..... جس میں ذہانت، علم اور سوچ کی فصل کاشت ہوتی تھی۔ بیدی نوٹنگ میں بڑے اعلیٰ شاہکار موجود تھے۔ وہ لوگ جو آنکھوں سے گفتگو کرتے تھے اور مقابل کی سوچ تک میں گھس جاتے..... مقناطیسی نگاہوں سے اندر تک کھوج لیتے۔ برقی لہروں سے دماغوں میں گھس جاتے تھے۔

بیدی نوٹنگ میں اعلیٰ ذہانت کی، اعلیٰ سوچ اور حد درجہ صحت مند دماغ کی اعلیٰ فصل تیار ہوتی تھی۔ جیسے سفید دھنگی ہوئی روئی سے تصوراتی مجسمے تیار کرنا اور پھر ان مجسموں سے برقی لہروں کے ذریعے کسی بھی انسان کے اندر تک اتر جانا..... دراصل یہ کام معمولی ذہنوں کا نہیں تھا۔ یہاں صحت مند، تروتازہ اور بہترین لہریں چھوڑنے والے دماغ تھے۔ ایسے اعلیٰ دماغ جو مثبت رخ پر بہتے تو جارج کی طرح ائیر بریک، کارل بینر کی طرح آٹوموبائل، کولس کی طرح نظام شمسی، جان ڈالٹن کی طرح ایٹمی نظریہ، سر جوزف کی طرح مصنوعی فابریک، ولیم کی طرح زمین کی مقناطیسی قوت، جیمز کی طرح مشین کن اور ولیم ایشٹن کی طرح ایکٹرک ٹرانسفارمر جیسی اعلیٰ ترین ایجادیں یاد ریافتیں کرتے۔

ایسے اعلیٰ دماغ سالوں میں نہیں صدیوں میں



تھا۔ انڈیا میں طویل عرصہ رہ کر آیا تھا۔ اردو اور ہندی میں ایکسپٹ تھا۔ اس کی جرمن کمزور تھی اور وہ یہاں لیکن کوچ کورس کے لیے ہی آیا تھا مگر بیدی نوٹنگ کی... پڑاسراریت میں ایسا جکڑا کہ یہاں سے دور جا ہی نہیں سکا تھا۔ پروفیسر نے ٹھیک کہا تھا، یہ بڑی مسکور کن دنیا تھی۔ وہ اس کے سحر سے کبھی نکل ہی نہیں سکتی تھی، یہی حال میکس وان کا بھی تھا۔ وہ آیا تو کسی اور مقصد کے لیے تھا مگر پروفیسر کی شخصیت نے اسے بھی اپنے حصار میں کر لیا تھا۔ پھر پروفیسر خیالات اور تصورات کی ایسی حسین دنیا کا ذکر کرتا تھا جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان کے ذہن پر قابض ہو سکتا تھا۔ وہ اس کی سوچ میں گھس سکتا تھا اور اس کے خیالات کو جان سکتا تھا۔ پروفیسر نے کہا تھا۔

”تم میں سے کون، کون دلوں اور دماغوں کو...“  
تسخیر کر کے پورے عالم پر راج کرنا چاہتا ہے؟“  
قریب، قریب ہر اسٹوڈنٹ نے ہاتھ بلند کر لیا تھا مگر مون کو جیسے کوئی غیر مرئی طاقت ہاتھ اٹھانے سے روکتی تھی۔ اس کے اندر وہی الارم بجنے لگتا تھا۔ جیسے وہ ایک بڑا خطرہ مول لے کر غلطی کر رہی ہے۔ اس کے بد اثرات بھی تو ہو سکتے تھے۔ اندر بجاتے الارم کو نظر انداز کر کے وہ بھی آہستہ، آہستہ ہی سہی، ان اسٹوڈنٹس میں شامل ہو گئی تھی جو روحانی طاقت یا غیر مادی قوت متحرکہ کی بدولت لوگوں کے ذہنوں کو تسخیر کرنا چاہتے تھے۔

دراصل یہ دنیا بڑی سحر انگیز اور پرکشش تھی۔ کچھ ہی عرصہ گزرنے کے بعد مون کو اس علم کے اسرار میں کمال درجے کا لطف اور کشش محسوس ہونے لگی تھی۔ البتہ میکس وان بہت الجھتا تھا۔ شروع، شروع میں وہ بھی بہت پرجوش تھا مگر مون نے محسوس کیا تھا وہ آئندہ آنے والے دنوں میں بیزار نظر آنے لگا ہے۔ جیسے وہ بہت بچار میں پڑ گیا تھا۔ بہت سوچتا، الجھتا اور سوال کرتا تھا پھر ایک دن کلاس کے

جس کا کام بندے کو مادی وجود سے الگ کر کے، ماورا کر کے کائنات کے روحانی وجود سے ملاپ کرانا اور غیر اجسام میں زندگی بیدار کر کے ان سے ناممکن العمل کام لینا ہے۔ یہ لافانی قوت جہاں انسان کو بہت بلند، اعلیٰ اور منفرد ترین مقام سے نوازتی ہے تو دوسری طرف انسان کو اس کے اصل مقام سے گرا کر شیطان بھی بنا دیتی ہے۔“ پروفیسر بشر کلاس کے بیس اسٹوڈنٹس کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ سپرفزیکل قوت کا تعارف دے رہا تھا۔ ان میں موجود مون حسیب جیسے سانس روکے سن رہی تھی۔ اس کے دل کی کیفیت بہت عجیب تھی اور اندر کہیں چھٹی حس خطرہ، خطرہ ہے کا الارم بھی بجا رہی تھی مگر دل کہتا تھا کہ اس نئے جہان کو دریافت کر کے ہی دم لو..... وہ جیسے دم سادھے سن رہی تھی۔

”میں تم لوگوں کو انتقال انکار (tele pathy) کا پہلا اور ابتدائی سبق دوں گا۔“ پروفیسر نے پہلا ہتھ پھینک دیا تھا..... اب وہ اسٹوڈنٹس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کم حیران اور زیادہ مطمئن لوگ تھے تاہم مون حسیب کے لیے کم از کم یہ انکشاف کسی دھچکے سے کم نہیں تھا۔ وہ جیسے دم بخود سانس روکے پروفیسر کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
”تو کیا ہمیں بیدی نوٹنگ میں ٹیلی پتھی کے اسرار و رموز سکھائے جائیں گے؟“ اس کے عجیب اور احمقانہ سوال نے پوری کلاس کو متحیر کر دیا تھا۔ وہ جیسے گردن موڑ، موڑ کر اس نئی احمق ترین اسٹوڈنٹ کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

”میرا خیال ہے ہم لوگ یہاں ٹیلی پتھی کے معانی ہی سمجھنے آئے ہیں۔“ ایک لڑکے نے اٹھ کر مون کو جواب دیا تھا۔ یہ کلاس کا سب سے خوب صورت لڑکا تھا اور پروفیسر کے ساتھ اس کی گاڑھی چھٹی تھی۔ مون کو بعد میں پتا چلا تھا یہ لڑکا میکس وان



توک و ما

پڑھ کر یہ اندازہ لگانا پڑتا ہے کہ وہ کس کیفیت یا سوچ میں ہے؟ پھر ٹیلی پیتھی کا تیسرا درجہ شروع ہوتا ہے۔ جس میں ایک انسان اپنے خیال کو دوسرے کے ذہن میں منتقل کر سکے..... اور اس کے بعد ایک آخری درجہ شروع ہوتا ہے جس میں خیالات کی قوت میں دوسروں کو اپنا مفعول بنا لینا ہوتا ہے۔ یعنی اس میں دوسروں کے ذہن پر قبضہ جما کر اسے مجبور کرنا ہوتا ہے کہ وہ آپ کے خیال کے عین مطابق کام کرے۔..... یہ ٹیلی پیتھی کا کامیاب ترین مرحلہ ہے۔“

پروفیسر اپنے جادو اثر الفاظ کا سحر پھونک رہا تھا۔ وہ لوگ پھر سے ایسی ہی کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔ جیسے کبھی سانس تک نہ لے سکیں گے یا بول نہیں سکیں گے۔ پروفیسر ان پر ایسا ہی کوئی جادو کر دیا کرتا تھا۔ سوال ان کے اندر ڈوبنے لگتے تھے اور وہ چاہ کر بھی پروفیسر سے اختلاف نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اس کی بات ماننے، سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے تھے۔

”یہ ٹیلی پیتھی آخر چیز کیا ہے؟“ پروفیسر ایک ضخیم کتاب کھولے کلاس کی طرف متوجہ تھا۔

”اوپے درجے کا کشف و ادراک رکھنے والا علم.....؟“

”چھٹی حس ESP کی حامل قوت..... یا پھر ایک سپر سائیکلک قوت جو ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں معلومات حاصل کر پائے یا شاید انسان کی اندرونی توانائیوں اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے والی قوت.....؟“ یہ اور اس طرح کے بے شمار خیالات ان لوگوں کے ذہنوں میں تھے یا پھر مسحور کر دینے (hypnotism) اور غیب دانی (clairvoyance) کا علم یعنی پیتھی ٹیلی گرانی جس کے ذریعے دور بین سے بھی زائد دوری تک انسان دیکھنے کی قوت عمل اور علم، جن کو ماہرین نفسیات انسان کی تیسری آنکھ سے مشابہت

دوران ہی میکس نے پروفیسر سے کچھ سوال کیے تھے۔ جن کے جوابات دیتے ہوئے پروفیسر گھبرایا نہیں تھا۔ وہ جیسے پورا ہوم ورک کر کے ہی میدان میں اترتا تھا۔

”یہ ٹیلی پیتھی ہے کیا؟ میں کس طرح کسی دوسرے انسان کی سوچ کو پڑھ سکتا ہوں اور کیسے امواج خیال کے ذریعے جان سکتا ہوں کہ مجھ سے دور بیٹھے شخص کے ذہن میں کیا ہے؟“ میکس کے اس سوال نے پوری کلاس کو بے چین کر دیا تھا۔ دراصل یہ سوال تو قریب، قریب ہر طالب علم کے ذہن میں کھدبہد مچاتا تھا مگر پروفیسر کی باتوں کا سحر کچھ اتنا طاقت ور ہوتا تھا کہ دوران کی پھر وہ لوگ صرف سنا کرتے تھے۔ بول سکنے کی قوت جیسے مفلوج ہو جاتی تھی۔

ٹیلی پیتھی کے فن میں ماہر کرتا پروفیسر انہیں جیسے پیمانائز کر دیا کرتا تھا۔ ٹیلی پیتھی کے معانی روحانی رابطے کے ہیں۔ اصطلاح میں اسے خیالات کی منتقلی کا نام دیتے ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے۔ کافی دور سے کسی چیز کو محسوس کرنا یا ایک قلب کا بغیر کسی مادی وسیلے کے دوسرے قلب پر اثر کرنا۔“ پروفیسر بشر میکس کا سوال سن کر بڑے جذبات بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔ جیسے میکس کا سوال اسے اپنے لیے خطرہ محسوس ہوا تھا اور وہ تمام اسٹوڈنٹس کے ذہنوں سے آج رنگ اتار دینا چاہتا تھا تا کہ پھر کوئی ٹیلی پیتھی کے حوالے سے شبہات میں نہ پڑے۔ اسے محسوس ہوا تھا، اس کے یہ بیس بائیس اسٹوڈنٹس غیر معمولی ذہین تھے۔ وہ ان پر جلد اپنا رنگ اور تسلط جمالینا چاہتا تھا، وہ انہیں بیزار کر کے بیدی نوٹنگ سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”مختلف ڈاکٹرز، ماہر نفسیات، سائنس دان، یوگی، فلاسفر اور ماہرین ٹیلی پیتھی کی تعریف کچھ یوں کرتے ہیں کہ یہ ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک خیال کی منتقلی ہے۔ اس میں انسان کے خیالات کو



دیتے ہیں۔

آخر یہ ٹیلی ویٹھی کوئی حقیقت بھی تھی یا محض لفاظی اور کتابیں پڑھنے تک کا صرف کتابی علم.....؟  
 پروفیسر جو کہتا تھا جو بتاتا تھا آخر اس میں سچائی کتنی تھی؟ کیا وہ انہیں محض بے وقوف بنا رہا تھا؟ یا پھر وہ لوگ جلد کوئی جادوئی علم سیکھنے والے تھے؟  
 وہ لوگ ابھی حقیقت سے دور کتابوں کے علم تک محدود تھے۔ پروفیسران کے سامنے کوئی پریکٹیکل (عملی کارنامہ) نہیں کر پایا تھا پھر جس دن میکس نے پروفیسر کو اس نکتے کی طرف متوجہ کیا تھا، یہ اسی دن کی بات تھی۔ پروفیسر نے پوری کلاس سے کہا تھا کہ کل کوئی بھی غیر حاضر نہ ہو..... وہ ان کو سکھائے گئے علم کی حقیقت کو سامنے لانے والا تھا۔ آخر پروفیسر کل کیا کر دکھانے والا تھا؟“

گروسی کے گھر میں اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑے ہو کر..... پھولوں کے سنان کھیتوں کو دیکھتی وہ سوچ رہی تھی۔ پھولوں کی کٹائی ہو چکی تھی اور اب کہیں بھی خوشنما پھولوں کی چادر نہیں تھی۔ پھول اپنے موسم کے حساب سے مدت پوری کر چکے تھے۔ جیسے انسان اپنی عمر کے حساب سے مدت پوری کرتا ہے۔ بالآخر اسے اپنے ٹھکانے کی طرف جانا ہوتا ہے مگر اس بات سے واقف ہونے کے باوجود کچھ لوگ عمر بھر نادانیاں کرتے رہتے ہیں۔ وہ انہی خیالوں میں گم تھی معاً اس کے موبائل کی بیپ بج اٹھی۔ اس نے چونک کر فون اٹھایا تھا۔ عیسیٰ کی کال تھی وہ بہت اپ سیٹ تھا اور مون کو گھر آنے کے لیے بہت مجبور کر رہا تھا۔

”غصہ جانے دو مون..... پلیز، گھر آ جاؤ، کسی کے گھر کتنے عرصے تک بھی رہیں، آخر اپنے گھر واپس تو آنا ہوتا ہے۔“ عیسیٰ کی آواز بھر رہی تھی۔ وہ اپنی تنہائی اور اکیلے پن کی وجہ سے سخت عاجز لگ رہا تھا۔ اسے مون کی یاد آ رہی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت

بلے چین تھا۔

”یہ کسی اور کا گھر نہیں..... میری نانی کا گھر ہے۔“ مون جیسے جتا کر بولی تھی۔

”اپنا گھر پھر بھی نہیں.....“ عیسیٰ نرمی سے بولا تھا۔ وہ مون کو واپس گھر لانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اسے فون کالز کے ذریعے مجبور کرنا یا خود آ کر لے جانا، وہ نہ مانتی تب بار بار چکر لگاتا، کبھی تو وہ عاجز آ کر اس کے ساتھ چل پڑتی۔ اگر امید پر دنیا قائم تھی تو پھر عیسیٰ اپنی امید کو ختم کیوں کرتا۔

”میرا تو کوئی گھر نہیں۔“ مون جیسے رو پڑی تھی۔ مگر اس نے ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ عیسیٰ پر اپنی کمزوری کیوں ظاہر کرتی۔

”ایسے مت کہو، مجھے تکلیف ہوتی ہے مون ایسے گھر تمہارا اپنا ہے، تم کیوں ایک معمولی ضد میں ہمارا چین سکون ختم کر چکی ہو۔“ عیسیٰ اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔ وہ اب تلخ کلامی کر کے مون کو خفا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر مون کون سا کسی کے جذبات کو سمجھتی تھی۔ اب بھی ازلی کٹھور پن سے بول رہی تھی۔

”میں نے کسی کا چین سکون ختم نہیں کیا، میں تو آپ کی زندگیوں سے نکل آئی ہوں تاکہ آپ لوگ ڈسٹرب نہ ہوں۔“ وہ زہر خند سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ عیسیٰ کے دل کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔

”ایسی بات کہو گی تو سراسر تکلیف دو گی..... مگر تمہیں احساس کہاں ہے۔“ عیسیٰ نے افسردگی سے کہا تھا۔ مون کا کٹھور پن اسے کتنی اذیت دیتا تھا۔ وہ اس حقیقت سے واقف نہیں تھی۔

”اور تمہیں بہت احساس ہے کیا؟“ وہ بھی غضبناک ہو گئی تھی۔

”احساس ہے تو فون کر رہا ہوں ناں۔“ عیسیٰ کی آواز مدہم ہو گئی تھی۔ دل پر جیسے بوجھ لد گیا تھا مون ہمیشہ دل دکھانے والی ہی بات کرتی تھی۔ اب بھی مزید اس کی سنے بغیر فون بند کر چکی تھی حالانکہ



نوک ونا

وہ پروفیسر جیسی طاقت رکھتی تھی؟ کیا وہ کسی کو پھناتا کر سکتی تھی؟ کیا وہ کسی کا ذہن کھوج سکتی تھی؟

پروفیسر اس کے دل کی بدلی کیفیات سمجھ رہا تھا۔ جیسے گرم لوہے پہ پہلی چوٹ پڑی تھی۔ کلاس میں مون کے علاوہ ایک اور لڑکی ڈیزی تھی جو مون کی طرح ہی پروفیسر سے اس کا سارا علم سیکھ لینا چاہتی تھی۔ مون کو یہ بات بھی بعد میں پتا چلی تھی۔ ڈیزی، پروفیسر کی ٹور بھی تھی اور پروفیسر کی خاطر کچھ بھی کر سکتی تھی۔ البتہ پروفیسر کے دل میں ڈیزی کے لیے کیا جذبات تھے اس بات سے کوئی واقف نہیں تھا۔

پروفیسر نے میکس کو پھناتا کر کے کلاس کے تمام طالب علموں کا دل جیت لیا تھا۔ اب انہیں لگتا تھا وہ محض کتابی باتیں نہیں پڑھتے بلکہ کچھ عملی طور پر بھی سیکھنے والے ہیں۔

”امواج خیال کی کوئی مشق ہمارے سامنے کی جائے۔“ ایک دن ڈیزی نے پروفیسر سے

یہی ابھی اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ مون کے لیے عجیب و غریب باتیں سن رہا تھا کہ مون نے نہ جانے کس قسم کا ادارہ جو اُن کر رکھا تھا جس کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی مگر ہمیشہ کی طرح مون نے فون بند کر دیا تھا۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے تھے۔ پروفیسر نے انہیں پہلا کامیاب عمل کر کے دکھایا تھا جس میں اس نے میکس وان کو پھناتا کر کے پوری کلاس جیسے دم بخود رہ گئی تھی۔ پروفیسر نے میکس کو پھناتا کر کے اور اسے جو جو کچھ دیتا رہا، میکس اسے وصول کر کے وہی بولتا رہا۔ یہ پہلا پُراسرار عمل تھا کم از کم ان لوگوں کے لیے اسے پُراسراریت ہی کہنا تھا۔ یہ پُراسراریت ہی کی کوئی قسم تھی۔ گویا پوری کلاس بھی مسرنا ہو گئی تھی۔ پروفیسر نے جیسے انہیں کوئی جادو کر کے دکھایا تھا۔ پروفیسر جیسے کوئی شعبہ باز تھا۔

مون کے لیے یہ ایک دلچسپ ترین تجربہ تھا کیا

### سیلاب لے گیا

ریلا چاہے آنسوؤں کا ہو یا پانی کا اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے جاتا ہے..... آخری صفحات پر لہروں کی روانی **منظر امام** کے قلم سے

### عشق ناتمام

ویسے تو اس جہان میں کچھ بھی مکمل نہیں ہوا لیکن عشق کی کوئی قسم نہیں ہوتی..... تاریخ کے گلش لحات کا قصہ..... ابتدائی صفحات پر **انیاس سیتاپوری** کا انداز

### سودانے جنوں

امت مسلمہ کے خلاف صیہونی سازشوں کی تباہ کاریاں ڈاکٹر **عبدالرب بھٹی** کے قلم سے ایک عبرت اثر داستان

### ماروی

محبت کی حیرت انگیز کشش اور دشمنوں کی چالوں کو مات دینے کے لیے بھٹکے ہوئے مسافروں کی جنگ..... محسن **الذین نواب** کے قلم سے اگلا پڑاؤ

### دسمبر 2014 کی سرورائوں کا حق

خوبصورت کابینوں کا مجموعہ  
**سپر سٹار**  
ماہنامہ **پاپلس**



مزید

خطوط کی محفل،  
محفل شعر و سخن اور  
ملک صندریا جیات کی آفتیش

1000 روپے

طاہر جاوید مغل، کاشف ذہیر باہر نعیم  
سلیم انور، تنویر ریاض اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحاریر



پر جا کر استعمال کیا تھا، جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی نکلا..... مگر تب وہ نئے جہان دریافت کرنے کے شوق میں کچھ نہیں سمجھتی تھی اور جب تک اسے ادراک ہوا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

پھر ایک سبق کے دوران پروفیسر بڑے موڈ کے عالم میں تھا۔ اس دن بواریا پارش میں بھیگ رہا تھا اور مون حسیب کو گیلے پن سے ابھرنے ہوتی تھی۔ اس نے سوچا، وہ کلاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جائے۔ جب تک بارش نہ رکے وہ کمرے میں ہی رہے گی مگر پروفیسر کے سبق نے مون حسیب کو پھر سے سحر زدہ کر دیا تھا۔ وہ کلاس سے اٹھ ہی نہیں سکی تھی۔ آج پروفیسر انہیں علم تسخیر کے فائدے بتا رہا تھا۔

اس سے بہ آسانی انسان بری عادتیں ترک کر لیتا ہے۔ برائیوں اور بیماریوں کا بہترین علاج ہے یہ عمل..... والدین اپنے شرارتی بچوں کو کنٹرول کر کے انہیں تابع فرمان بنا سکتے ہیں۔

طالب علم قوتِ یادداشت، علم بصیرت اور یکسوئی حاصل کر کے اپنے، اپنے شعبے میں مہارت اور ترقی پاسکتے ہیں۔ یہ ذہنوں میں رسائی، قبضہ اور سوچ تک پہنچنے میں معاون ثابت ہے۔

شعبدے بازی کے کرشمے اور کئی طرح کے کمالات حاصل کر کے بے تحاشا دولت بھی کمائی جاسکتی ہے۔ اپنے دل پسند مرد یا عورت کی محبت، توجہ اور دوستی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اسے قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ پینانزم کے بے شمار فوائد تھے مگر مون حسیب اس آخری بات پر جیسے اٹک گئی تھی۔ اپنے

دل پسند مرد سے محبت اور اس کی توجہ حاصل کرنا..... مون کے اندر جیسے محبت کی کلی چمکنے لگی تھی۔ امید کی ننھی سی کرن چمکنے لگی تھی۔ ایک تصویر روشن سی ہو گئی۔ اس کا معمول تھا، وہ گھر آ کر ٹیلی پیٹھی کی مشق ضرور دہراتی تھی گھر میں پہلے تو کوئی اس کے معمولات کو سمجھ نہیں سکتا تھا مگر مون کو لگتا تھا کہ سوزن

سوال کیا۔ ڈیزی کا سوال ان سب کے دل کی آواز بھی تھا تب میکس نے کلاس میں اٹھ کر ایک عجیب سوال کیا تھا۔

”پروفیسر! تم ٹیلی پیٹھی کے بہترین عامل ہو، تم ہمیں عمل کر کے دکھاؤ کہ ایک ذہن سے خیال دوسرے کے ذہن میں کیسے اترتا ہے؟“ میکس کا سوال چونکا دینے والا تھا۔ مون کے ساتھ ڈیزی بھی ٹھنک گئی تھی۔ میکس چاہتا تھا یہ عمل کلاس کے اسٹوڈنٹس کریں کیونکہ ٹیلی پیٹھی اور پینانزم کی یہ آخری مشقیں جاری تھیں۔ پروفیسر کی انتھک کوششوں کے بعد..... کلاس کے بیس اسٹوڈنٹس میں سے صرف مون اور ڈیزی ہی اس کی توقعات پر پوری اتری تھیں۔ فائنل ایگزامز تک صرف تین لوگ... نثریاتی مابلے کا پہلا تجربہ کر سکتے تھے۔ ان میں مون، ڈیزی اور ایک لڑکی ڈیانا تھی۔ باقی میکس سمیت تمام لوگ فیل ہو چکے تھے اور درجہ اول کی کلاس میں صرف ڈیج سیکھنے چلے گئے تھے۔

اب یہ تین لوگ بیدی نوٹنگ کا حقیقی ماڈل تھے۔ مون، ڈیزی اور ڈیانا..... پروفیسر انہیں شعور کی سرگرمیوں سے لے کر انتقالِ افکار، حقیقتِ احوال، امواجِ خیال اور اس کی رفتار، انتقالِ افکار کا فن، دماغی میکانزم سے لے کر جیٹن اور آٹو جیٹن تک پڑھا۔ چکا تھا۔ آٹو جیٹن یعنی خود تسخیری میں مون نے کمال درجے کی مہارت حاصل کر لی تھی اور پوسٹ پیناننگ جیٹن میں اسے اس سال کا ایوارڈ دینے کا اعلان کر دیا تھا۔

پوسٹ پیناننگ جیٹن کا مطلب معمول کو... پینانزم کے دوران ایسی ہدایات دینا ہے جن پر معمول سے بعد میں عمل کروانا مقصود ہوتا ہے کیونکہ جو ہدایت اس عمل کے دوران معمول کو دی جائے گی بعد میں وہ اس پر لازمی عمل کرتا ہے۔ پوسٹ پیناننگ جیٹن کو مون حسیب نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے انتہائی حد



نے خود کو پہلی بحیثیت دی تھی۔

”میں اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ رہی ہوں۔“

مون نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ نگاہ جما کر پہلا سوال دہرایا تھا۔

”اور میں اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ رہی ہوں۔“ اس نے متعدد بار یہی لائنیں دہرائی تھیں۔

”میرے جسم پر استراحت طاری ہو رہی ہے۔“ مون نے اپنے جسم پر واضح استراحت اترتی محسوس کی تھی۔

”اور میرے ذہن پر بھی استراحت طاری ہو رہی ہے۔“ اس نے کئی مرتبہ یہ لائن دہرائی تھی۔

بغیر پلکیں جھپکائے اسکرین کی طرف دیکھنا ایک کٹھن

مرحلہ تھا مگر مون حسیب نے بالآخر طے کر لیا۔ وہ

کروڑوں لوگوں کی اس دنیا میں بڑا اعلیٰ قسم کا دماغ

رکھتی تھی۔ اس کا ذہن اتنی میل فی گھنٹا کی رفتار سے

پیغام وصول کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔ اس کے

اعصاب بہت مضبوط تھے اور قوت ارادی پہاڑوں

جیسی سخت تھی۔ مون حسیب کو آسانی کے ساتھ ڈھایا

نہیں جاسکتا تھا۔ یہ تو پروفیسر تھا جو اسے نہ جانے کس

مقتلطیس سے باندھ کر ادھر لے آیا تھا اور اب مون

اسی مقتلطیسی طاقت کے زیر اثر کئی لوگوں کو پیناٹائز

کر سکتی تھی۔ اور خود کو پیناٹائز کرنا اس کے لیے کچھ

مشکل نہیں تھا پھر مون نے خود کو ایک اور بحیثیت دی۔

”میرا جسم اور ذہن خوشگوار طور پر بوجھل ہو رہا

ہے۔“ وہ سکون کی لہروں کو اپنے دماغ میں اترتا

محسوس کر رہی تھی۔ مون جیسے بادلوں کے رتھ پر سوار

تھی۔ وہ ہواؤں کے سنگ تیر رہی تھی مگر یہ کیا.....؟

”میرے تمام اعضا وزنی ہوتے جا رہے

ہیں۔“ وہ ہل بھر کے عرصے میں بادلوں کو چھوڑنی کسی

جزیرے میں تیر رہی تھی۔

”میری ٹانگیں بھاری ہونے لگی ہیں۔“ اس

نے پیروں پر واضح بوجھ پڑنا محسوس کیا تھا۔

کچھ، کچھ شکوک و شبہات میں پڑ گئی ہے۔ مگر فی الحال

اسے براہ راست ٹوکا نہیں تھا۔ نہ اس موضوع پر بات

ہوئی تھی۔

مون نے سیلف پیناسز میں خود کو کئی مرتبہ

کامیاب طریقے سے پیناٹائز کر لیا تھا۔ پروفیسر اسی

لئے تو اس کے متاثرین میں شامل تھا۔ وہ پروفیسر کی

پہلی اسٹوڈنٹ تھی جو بہت جلد کامیابی اور ترقی کے

مراحل طے کر رہی تھی۔ پروفیسر نے اپنے گزشتہ

لیکچرز کے درمیان اسے بہت کچھ سمجھایا تھا۔ جیسے ضمیر

کا زندہ رکھنا اور اس علم سے کسی کو نقصان نہ پہنچانا اور

ملک و قوم کی خدمت وغیرہ..... دراصل اس فن کو

سیکھنے سے پہلے یہی بنیادی اصول تھے جن پر ہر، ہر

صورت ایک ماہر انتقال افکار کو عمل کرنا ہوتا ہے۔ مگر

اکثر لوگ اسے اپنے غلط مقاصد کے لیے استعمال

کرنے لگتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ لوگ بہت جلد

اپنی اس صلاحیت سے ہاتھ بھی دھو بیٹھتے تھے۔ کیا

مون حسیب بھی انہی لوگوں میں سے تھی؟

فی الوقت وہ یہ اٹھارویں مشق اپنے بیڈروم کو

لاک کر کے دہرا رہی تھی۔ self -

hypnosis میں اس نے کئی کامیاب تجربے

کر لیے تھے۔ اپنے تئیں اس نے کئی جہان فتح

کر لیے تھے۔ یہ بڑی دلچسپ، پرکشش اور انتہائی

دل بھانے والی دنیا تھی۔ عامل خود کو کچھ لمحوں کے

لیئے اس جہان سے الگ سمجھنے لگتا ہے جیسا کہ وہ کسی

اور ہی دنیا میں مجھ پر واز ہو۔

جب وہ عام لوگوں کو پیناٹائز آسانی کے ساتھ

کر لیتی تھی سو خود کو پیناٹائز کرنا کہاں مشکل تھا؟ اس

نے پہلی مرتبہ پروفیسر کی دی گئی بحیثیت کے مطابق خود

کو پیناٹائز کر لیا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ پہ کچھ سوال

ترتیب دیے تھے پھر لیپ ٹاپ کو اونچی جگہ پر رکھ کر

خود ایک آرام کرسی پر ٹیم دراز ہو گئی تھی۔ یوں کہ

لیپ ٹاپ اس کی آنکھوں کے عین سامنے تھا پھر مون



کارکردگی سے متاثر تھا۔ پروفیسر کا خیال تھا، وہ جلدی کامیابی پا کر اس سے بھی زیادہ انتقال افکار میں مہارت رکھتی ہے پھر ایک دن پروفیسر نے انہیں انسیات اور ہینا نزم کے اتالیق میڈیکل کے طالب علموں کا ایک تجربہ بتایا تھا جو پوسٹ ہینا تک تھیشن میں غیر اخلاقی، ہنسی یا نظریاتی نقطہ نظر سے انتہائی پست، کریہہ اور غلیظ تھا۔ پروفیسر نے ایک مثال بھی دی تھی مگر لڑکی اس عمل کے کرنے والے لڑکوں کے ناپاک عزائم سے بچ.... گئی تھی۔ عین وقت پر اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی کوئی بھی علم تعمیر بھی ہوتا ہے اور تخریبی بھی جب شیطان تو میں غالب آنے لگیں تو وہی علم منفی رخ اختیار کر لیتا ہے۔ شاید یہی سب کچھ مون حسیب کے ساتھ ہوا تھا۔

وہ ایک ٹھوس قسم کا تجربہ کرنا چاہتی تھی مگر بیدی نوٹنگ کے اسٹوڈنٹس سے ہٹ کر.... ایک دن وہ مرکز کی مارکیٹ میں سے گزر رہی تھی۔ جوتوں کی دکان کو دیکھ کر اس کے ذہن میں کلک سے کچھ روشن ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دکان کے اندر تھی۔ اسے انتہائی خوب صورت اور کم عمر مالکن کو پہنا ٹائز کرنا تھا۔ وہ یہاں سے ایک جوتا چرانا چاہتی تھی۔ اگرچہ اس کا پاؤچ نوٹوں سے بھرا تھا اور وہ کوئی عادی چور بھی نہیں تھی۔ اسے تو صرف ایک تجربہ کرنا تھا اور وہ اس کے لیے خاصی پرجوش تھی۔

دکان کی مالکن زیٹا یعنی زیتون تھی۔ اس کا شوہر آغا ایک پاکستانی لڑکا تھا۔ وہ ابتدائی معلومات کے بعد دکان میں گھسی تھی۔ اس وقت گاہک نہیں تھے اور آغا بھی اس پاس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مون کا مقصد..... دکان کی مالکن کو پہنا ٹائز کرنا تھا، چوری کرنا نہیں..... اور اس ضمن میں مون نے ایک چمکتی دکتی انتہائی خوب صورت پین لائٹ پاؤچ میں پہلے سے رکھی تھی۔ مگر مون کا ارادہ زیتون (زیٹا) کو پین لائٹ سے پہنا ٹائز کرنے کا نہیں تھا۔

”میرے کندھے بھی بھاری ہو رہے ہیں۔“  
مون کے شانوں پر بھی وزن لدرہا تھا۔  
”میرا ذہن بوجھل ہو رہا ہے۔“ مون کی پلکوں پر بھی وزن اتر آیا تھا۔

”اب میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی تھی۔

”جب میری آنکھ بند ہو جائیں گی تب میں گہری نیند میں چلی جاؤں گی۔“ کوئی پلکوں کو مقناطیس کی طرح پھوٹوں کی طرف کھینچ رہا تھا۔

”میں تین گنوں کی اور نیند میں اتر جاؤں گی۔“  
اس نے خود کو آخری ہدایات دیتے ہوئے کہا تھا۔

”میں اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتی ہوں۔“ وہ خود کو آخری تھیشن دے رہی تھی۔

”میں جب جا ہوں اپنے آپ کو بیدار کر سکتی ہوں۔“ اس کا عمل مکمل ہو چکا تھا وہ ٹائمنگ کے مطابق نیند میں چلی گئی تھی۔ اور سیٹ ٹائمنگ کے ساتھ ہی بیدار ہو گئی۔ سلیف ہینا سز کے ذریعے

جسمانی اور ذہنی تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ مون حسیب نے خود کو تروتازہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

اب وہ پوری طرح چاق و چوبند تھی اور ایک کامیاب تجربے کی خوشی محسوس کر رہی تھی۔

پھر اس نے بیدی نوٹنگ کے اسٹوڈنٹس سے ہٹ کر عام لوگوں کے چہرے چھاننے شروع کر دیے تھے۔ پروفیسر نے کہا تھا، مون ڈیزی اور ڈیانا کے ساتھ مل کر ایک دوسرے پہ تجربے کریں مگر

مون ان سب سے کچھ الگ کرنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی پروفیسر کا سکھایا علم کہاں تک عملی زندگی میں

کارگر ثابت ہوتا ہے۔

مون، پروفیسر کے اسٹوڈنٹس میں سب سے کم تعلیم یافتہ تھی۔ ڈیزی اور ڈیانا تو یونیورسٹی کی پوزیشن

ہولڈر تھیں۔ خود پروفیسر بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا مگر پھر بھی ڈیزی اور ڈیانا سے زیادہ مون کی دماغی

تعلیم یافتہ تھی۔ ڈیزی اور ڈیانا تو یونیورسٹی کی پوزیشن

ہولڈر تھیں۔ خود پروفیسر بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا مگر پھر بھی ڈیزی اور ڈیانا سے زیادہ مون کی دماغی



نرک وفا

کر باہر نکل گئی تھی جبکہ زیٹا کچھ حیران، کچھ متحیر سی خود کو دیکھنے لگی۔ وہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی تروتازہ اور ہشاش بشاش ہو چکی تھی۔ جیسے کھڑے، کھڑے ہلکی سی نیند نے اسے اتنا فریش اور تروتازہ کر دیا تھا۔ زیٹا کو خیال آیا۔ وہ پچھلی رات سے جاگ رہی تھی۔ آغا کچھ سامان لینے شہر سے باہر گیا تھا۔ رات سے زیٹا ڈیوٹی پہ تھی کافی تھکی ہوئی، اندرونی طور پر بڑا مردہ تھی مگر بظاہر ہنس، ہنس کر بات کرنے پر مجبور تھی۔ مگر ان چند سیکنڈ میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اس کے لبوں پر ابھی تک کچھ الفاظ تھے۔ وہ الفاظ کیا تھے؟

”کسٹمر یہ جو تا خرید چکا ہے اور بل میرے پاس ہے۔“ زیٹا جیسے دھک سے رہ گئی تھی۔ گویا ہوش میں آگئی ہو۔ کسٹمر جو تا اڑا کر لے جا چکا تھا مگر بل اس کے پاس نہیں تھا۔ اسی بل آغا اندر داخل ہوا تھا۔ اور شاید اس نے زیٹا کی بڑ بڑا ہٹ سن لی تھی۔

”کسٹمر نے کون سا جو تا خریدا ہے؟ کہو جی میرے سوہنے! کدھر ہے بل؟“ آغانے مسکراتے ہوئے دھواں، دھواں چہرے والی زیٹا سے پوچھا تھا۔ جو ابھی تک چینی کی مورت بنی کھڑی تھی۔

”بل نہیں ہے۔“ زیٹا نے رو دینے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ جیسے ہڑ بڑا کر بول رہی تھی۔

”تو پھر جو تا کہاں گیا؟“ آغانے حیرت سے پوچھا، وہ سفر سے آ رہا تھا آتے ساتھ نقصان کا سن کر متوحش ہو گیا۔

”وہ تو کسٹمر لے گیا۔“ زیٹا اب منہ بنا کر آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ارے کیسے؟“ آغا دھک سے رہ گیا۔ تو گویا سچ میں نقصان ہو چکا تھا۔

”جانے کیسے، میں سو گئی تھی شاید.....“ وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ آغا کا منہ کھل گیا۔

”تم سو گئی تھیں؟ پھر تو سمجھو، ایک کے بجائے کئی جوتے غائب ہوئے۔“ آغا سر تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ پینا ٹاک میٹھ کے تین بنیادی طریقوں میں سے ایک یعنی ٹنگلی ہاندھ کر زیٹا کو پینا ٹاک کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اس نے زیٹا پر پہلی نگاہ ڈالی تو تیز، تیز بولتی بلا کی ہنس کھڑی ہوتے، ہنستے ایک دم رک سی گئی۔ وہ مون کی آنکھوں میں دیکھتی لمحے بھر کے لیے ٹھنکی تھی پھر جیسے مون کی آنکھ میں دیکھنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ کاؤنٹر پر دو چار جوتے رکھے مون کو ہنس، ہنس کر بتا رہی تھی۔ یعنی اپنے جوتوں کی اعلیٰ کوالٹی کے بارے میں معلومات دے رہی تھی۔ مگر اب کسی چینی کی مورتی جیسے ساکت ہو چکی تھی۔ پینا ٹاک جھیکے مون کی سحر طراز آنکھوں میں دیکھنا ایک کوشش تجربہ تھا۔ شاید ہی زیٹا نے اپنی زندگی میں اپنی گہری اور مقناطیسی آنکھیں دیکھی تھیں۔

پروفیسر نے ایک مرتبہ مون کو بتایا تھا کہ تمہاری آنکھیں قدرتی طور پر پینا ٹاک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مون کو اس لمحے یقین آ گیا تھا۔ ابھی اس نے کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی پھر بھی جیسے زیٹا پینا ٹاک ہو چکی تھی۔ اس نے زیٹا کو پہلا حکم دیا..... اور اسے معمول کی کارروائی کے بعد حالت نیند میں لے آئی تھی۔

”مجھے یہ جو تا پیک کر دو.....“ وہ حکم دینے کے دوسرے سیکنڈ میں پیک شدہ جو تا اٹھا رہی تھی۔ زیٹا نے کسی معمول کی طرح اس کے حکم پر جو تا پیک کر دیا تھا۔ پھر مون نے اسے دوسری ہدایت دی تھی۔

”میں یہ جو تا پسند کر چکی ہوں۔“ مون کے ہونٹ پہلے تھے اور آواز زیٹا کی سماعتوں میں اتر گئی تھی۔ اب وہ زیٹا کو ایک مختلف ہدایت دے کر بولنے پر اکتا رہی تھی۔

”کسٹمر یہ جو تا خرید چکا ہے۔ اور بل میرے پاس ہے۔“ مون نے اسے آخری میسج دی تھی اور اس کے بعد ہلکا سا اشارہ دے کر زیٹا کی نیند کو توڑ دیا تھا۔ اب وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گلاس ڈور کھول



لے کر اس پر کام کیا تھا اور ایک بڑے ٹینک پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یوں بیدی نوٹک کو راتوں رات شہر تل کئی تھی اور کئی فیئر ملی ایجنسیاں ان سے کانٹاکٹ کی کوشش میں رہتی تھیں۔ مون پر بن بے سے لگا تھا اور پروفیسر اس دولت سے خوب فائدہ اٹھا رہا تھا بلکہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔

انہی دنوں سوزن کو مون کی خفیہ کارروائیاں جاننے کا موقع ملا تھا۔ دراصل ہوا کچھ یوں تھا کہ پاکستان سے ایک لڑکا آفاق، عیسیٰ سے نکل گیا۔ وہ لڑکا خاصا سختی تھا اور اپنے مستقبل کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ کوئی پاکستانی عیسیٰ کے کانٹیکٹ میں ہوا اور وہ اس کی مدد نہ کرے..... یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ علی عیسیٰ نے اسے اپنے باپا کی خواہش پر گھر میں ہی ٹھہرا لیا تھا اور اب اس کے لیے کسی انسٹی ٹیوٹ کا بندوبست کر رہا تھا۔ انہی دنوں سوزن نے عیسیٰ کو مشورہ دیا تھا کہ آفاق کا مون کے انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمشن کروادے۔ تاکہ وہ جرمن زبان پر عبور حاصل کر لے۔ عیسیٰ نے آفاق کو بواریا بھیج دیا تھا۔ یوں آفاق کی مون سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ پہلی نظر میں ہی اس ساحرہ سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ وہ بیدی نوٹک کے جس حصے میں پڑھ رہا تھا وہاں صرف ڈیج سکھا کی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اتفاقاً وہ میکس وان (جو اس کا کلاس ٹیچر تھا) کے ساتھ ایک دوسرے ڈپارٹمنٹ میں آیا تھا کارڈور سے گزرتے ہوئے وہ ایک ہال کمرے میں آگئے تھے..... مگر یہاں کا منظر دیکھ کر آفاق دنگ رہ گیا تھا۔ یہاں کوئی عجیب سا پراسرار ماحول طاری تھا۔ آفاق کے دل پر جیسے ہیبت طاری ہو گئی تھی۔

”نہیں، صرف ایک ہی جوتا.....“ زینا نے ادھر ادھر دیکھ کے جیسے اپنی تسلی کر لی تھی پھر اس نے باہر نکل کر دیکھا تھا۔

گلاس ڈور کے ایک طرف رکھی کورپ (اسٹ بن) میں پیک شدہ جوتا پڑا تھا۔ زینا کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔

”آغا جوتا یہ رکھا ہے۔“ وہ بے ساختہ خوشی سے چیخ پڑی تھی۔ آغا بھی بھاگا بھاگا باہر کی طرف آیا۔

”ارے..... یہ کہاں سے آگیا؟“ آغا جو نقصان کا سن کر پڑمردہ ہو چکا تھا ایک دم کھل اٹھا۔

”وہ لڑکی یہاں رکھ گئی ہے۔ کہیں پاگل تو نہیں تھی، پہلے چوری کی اور اب.....“ وہ دونوں خوشی،

خوشی جوتا اٹھا کر اندر لے جا رہے تھے۔ جب سڑک کے پار موجود ایک کیفے کی گلاس وال سے انہیں دیکھتی مون مسکرا رہی تھی۔ کافی پیتے ہوئے اپنے

دوسرے کامیاب تجربے سے لطف اٹھانے کا اٹنا ہی الگ مزہ تھا۔ وہ سرورسی شیشے کے بار کا منظر دیکھتی

رہی تھی۔ وہ چوری کرنے نہیں آئی تھی جو کام وہ کرنے آئی تھی اسے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا تھا اب

اسے دوبارہ زینا کی شاپ پر کبھی نہیں آنا تھا۔ ایک بات تو طے تھی۔

☆☆☆

مون کو گھر چھوڑے اسی طرح کئی سال گزر گئے تھے۔ شاید پانچ یا چھ سال..... وہ اپنی زندگی میں بہت مطمئن تھی اور اب پروفیسر کے ساتھ مل کر بڑے بڑے اہم پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی۔ سیکنڈ ٹائم میں ٹیلی پیٹھی کی کلاسز لیتی تھی۔ بیج معنوں میں مون نے پروفیسر کا سارا علم گھول کر پی رکھا تھا۔ وہ مون کو اپنا جانشین سمجھتا تھا۔

اس نے کچھ ہی عرصے میں بڑے کامیاب تجربے کیے تھے اور پروفیسر کے ساتھ مل کر ایک غیر ملکی ایجنسی کے لیے ایک بڑا اہم پروجیکٹ ہاتھ میں

کیا مون حسیب نے اسی ٹیلی پیٹھی کے ذریعے عیسیٰ اور مالا کی زندگی میں دراڑ ڈالی مگر اس کا انجام کیا ہوا یہ جاننے کے لیے پڑھیے آخری قسط انشاء اللہ اگلے ماہ!